گیان سنگھ شاطر

ناول

از گیان سنگھ شاطر

گیان سنگھ شاطر

جملہ حقوق بحق گیان سنگھ شاطر محفوظ ہیں

۹۳۱

Acc-No-
379

سنہ اشاعت : ۱۹۹۴ء

طباعت : اُشاناک اینڈ اروند، نئی دہلی

فون ۳۲۷۲۹۹۰، ۳۲۸۰۱۲۵

کتابت : عارف حیدرآبادی

قیمت : ۳۰۰ روپے

ناشر : گیان سنگھ شاطر

ملنے کے پتے

۱۔ جناب پریم گوپال متل، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۲۔ جناب اسد یار خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم، اردو گھر، دین دیال اپادیا مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مصنف کا پتہ

اے، ۵۰۱۔ ستیہ اپارٹمنٹ، مانصاحب ٹینک حیدرآباد، ۵۰۰۰۲۸

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۴۳۸

گیان سنگھ شاطر

A. H. O.
379

اسلمؔ اور سلیمؔ کے نام

جن کی رفاقت، سخاوت کا سرچشمہ ہے۔

گیان سنگھ شاطر

جن کا مقصود ہو کمالِ حیات
حادثوں کے وہ گھر بناتے ہیں
وہ مسیحا نفس نہیں ہوتے
جو صلیبوں سے لوٹ آتے ہیں

یوں ہی مت جان جو آندھی میں فروزاں ہو چراغ
اُس کے پردے میں کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

○

باب نمبر — پہلی کتاب — صفحہ نمبر

۵	نہ جانے کتنے ہوئے اِس جہان میں شاؔطر بِساطِ زیست پہ سب اپنی اپنی چال چلے	۴۰
۶	میری ہستی ہے جستجوئے تمام اِک یہی وصف مجھ میں کیا کم ہے	۵۸
۷	مَیں نے عنواں دیا ہے ہر شَے کو زندگی کیا ہے ؟ میرا طرزِ بیاں	۶۹
۸	نغماتِ پُر بہار ہیں ، شاداب ہے چمن لیکن پھٹے پھٹے سے ہیں پھولوں کے پیرہن	۷۶
۹	اِتنی سی سرگزشت ہے بزمِ حیات کی کوئی ہنسا خوشی سے کوئی غم سے رو دیا	۸۱
۱۰	شاطِر نگاہِ شوق کا محرم ازل سے ہوں آدم ہوں کوئی لالۂ صحرا نہیں ہوں مَیں	۸۹
۱۱	پاتا ہوں اپنے پرتوِ ہستی سے کم اُسے گرمی تو ہے شعور نہیں آفتاب میں	۹۷
۱۲	ہر گام پہ ٹھوکر سے گرا دیتا ہے ہر بزم سے بے فیض اُٹھا دیتا ہے جس میں نہ ہنر ہو یہ زمانہ اُس کو مانندِ غلط حرف مِٹا دیتا ہے	۱۰۸

۱۳ ۱۲۱

اِک شخص سے رستے میں مُلاقات ہُوئی
دِل چسپ طریقے سے مدارات ہُوئی
شرما کے نگاہوں کو جُھکایا پہلے
پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہُوئی

۱۴ ۱۳۹

آندھی میں گِھرا ہُوا شجر ہو جیسے
طُوفان کی زد میں کوئی گھر ہو جیسے
اُف شورشِ انفاس بہ ہنگامِ وصال
کُہسار سے ندّی کا گُزر ہو جیسے

۱۵ ۱۴۵

اپنے عمل کا جس نے کیا تجزیہ صحیح
دیکھا ہے اُس نے بھر کے نظر آفتاب میں

۱۶ ۱۵۱

ابھی تک قلبِ مُضطر سے صدائے غم نکلتی ہے،
ہُوئی مُدّت کہ چھیڑا تھا کسی نے دِل کے تاروں کو

۱۷ ۱۷۱

خُدا کیسا! کہاں کا دیر و کعبہ
یہ آدم ہی نے سب فتنے جگائے

۱۸ ۱۷۲

ہجومِ شوق کے پردے سے شاطِر
کوئی کیسے حقیقت دیکھ پائے

۱۹ ۱۸۷

وَصل میں بے خُودی کا وہ عالَم
گویا خُود سے جُدا ہو گئے تُم

٢٠ — ١٨٩

طاری ہے اک جمود سا بزمِ حیات پر
مرنے کا حوصلہ ہے، نہ جینے کا بانکپن

٢١ — ٢٠٥

ہر نئے زخم کی قسم شاطر
ترِ زندگانی سے اور پیار جتا

٢٢ — ٢١۴

شاطر نہ درندے سے نہ حیواں سے ڈرو
دوزخ کے عذابوں سے نہ شیطاں سے ڈرو
ہر فتنۂ دُنیا کا ہے ماخذ اِنساں،
ڈرنا ہے اگر تم کو تو اِنساں سے ڈرو

٢٣ — ٢٢۴

اپنے لہو میں جب نہ رہی گرمیِ وفا
کیوں عذرِ سرد مہریِ دُنیا کرے کوئی

٢۴ — ٢٢٩

اُسی نے گھول دیا زہر سا خیالوں میں
اُسی کا ذِکر مجھے زندگی سے پیارا ہے

٢۵ — ٢٣٣

کوئی یقین کرے اِس پہ یا ہنسے شاطر
وہ زندگی ہے مری جس نے مجھ کو مارا ہے

٢٦ — ٢٣٨

زندگی کی بساط پر شاطر
چال اپنی نہ کوئی کام آئی

٢٧

چراغِ منزلِ نو ہیں وہ شاطر
وُہی جو نقشِ پا ہیں خُوں چکاں سے

۳۶ اِک مرے چاہنے سے بنتی نہیں بات کوئی ۳۱۱
تم بھی کچھ بات بناؤ تو کوئی بات بنے

۳۷ بنایا آئینہ جس نے یہ اُس کا مقصد تھا ۳۲۴
ہُنر میں اپنے کوئی عیب ہو تو دیکھ سکے

۳۸ زندگی کے ہزار پہلو ہیں ۳۲۷
اور کوئی نہیں کسی سے کم

۳۹ جس نے لڑ لڑ کے اندھیرے سے اُجالا چھینا ۳۳۶
اُس پہ یہ راز کھُلا کون خُدا ہوتا ہے

۴۰ یہ میرے دل کی آبادی کہ بربادی کے ساماں ہیں ۳۴۲
مرا شوقِ نمو آواز دیتا ہے بہاروں کو

یُوں ہی مت جان جو آندھی میں فروزاں ہو چراغ
اُس کے پردے میں کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

قارئین ! کچھ لوگ وقت سے پہلے یا مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں، میں اُن میں سے کسی ایک زُمرے سے تعلق رکھتا ہُوں۔

میرے لئے زندگی بیدار مغزی اور حقیقت پسندی کا دُوسرا نام ہے۔ جو آدمی ان عناصر سے بیگانہ ہے، وُہ دُوسری انواعِ حیات کی طرح بہ حُسنِ حادثہ نوعِ آدم سے مُتعلق ہے۔ اُس کا وجُود حشرات الارض کی طرح ہے، جو رنگینیِ طلُوعِ سحر سے بے بہرہ ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ کی روایت حُسنِ موجُودات ہے اور اسی طرح بیدار مغزی اور حقیقت پسندی۔ خُود فریبی فطرتِ انساں ! اپنی جگہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ وُہ بیدار مغز اور حقیقت پسند ہے لیکن اصلیت اس کے برعکس ہے۔ وُہ فریبِ نفس میں مُبتلا ہے۔

کیا میں بھی فریبِ نفس میں مُبتلا ہوں ؟ ——— ؟

نہیں ! قارئین نہیں !! ——— اور اسی لئے میں اپنی شخصیت کا محرمِ راز اور حقیقت شناس ہُوں۔ میں نے اپنی شخصیت کو گیان سنگھ شاطر کی صُورت بیان کرنے کا تہیّہ کیا ہے۔ گیان سنگھ شاطر کی حقیقت بیتابیِ رُوح، شوقِ آگہی، شدّتِ جذبات عینِ اعمال اور حیاتیاتی کیفیت کا ایسا ہیجان خیز طوفان ہے جس کا ردِّ عمل فکر و اعصاب پر ہوگا اور تغیّر کو جنم دے گا۔ جو قاری اس حیرت انگیز تحریک کی لذّت سے ناآشنا ہے، وُہ پُورے ہوش و حواس کے ساتھ ان سطروں سے آگے بڑھے، ورنہ یہیں رُک جائے۔ میں تاکید کرتا ہوں اور میری تاکید میں تنبیہ کی آمیزش ہے کیوں کہ میری کہانی سراسر حقیقت ہے اور حقیقت، دروغ سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور نفرت انگیز ہوتی ہے۔

کذبِ انسانیت کی سب سے بڑی تکذیب ہے۔ جو کوئی اس سے نجات پانے میں ناکام رہتا ہے، وُہ نہ خُود پنپتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو پنپنے دیتا ہے۔ حقیقت کی آفاقی خُوبی وقتی طور پر بھیانک لگتی ہے لیکن اس کے دیرپا اثرات خُوش گوار اور رُوح پرور ہوتے ہیں۔ انسانوں کی اکثریت کوتاہ بین ہوتی ہے۔ حقیقت سمجھنے کے لئے سمجھ بُوجھ کی حیثیت کُلّی ہونی ضروری ہے، جس کے لئے مخصُوص قسم کی ضمیر بینی

درکار ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اِس لئے حقیقت کو بیان کرنا، آفات کو دعوت دینا ہے۔

مجھے بچپن ہی سے طرح طرح سے گمراہ کیا گیا، بے جا تقلید پر مجبور کیا گیا، روایت پرست بنایا گیا لیکن میرے تحمّل کی خود اعتمادی اور اعتبار افزائی! میں اپنی ہی طرح بڑا ہوا، اپنی ہی سمت چلا اور ہوتے ہوتے اِس سچائی کا قائل ہوا کہ زندگی کی بنیادی خصوصیات ہیں کہ وُہ مجسّم صحت مند اور سرکشی کی حد تک خود رو ہو۔ جو زندگی ان اوصاف کی حامل نہ ہو، وُہ زندگی بیمار ہے، انحطاط پذیر ہے۔ اور کسی کے رحم و کرم پہ جینے والا کمزور ہوتا ہے! وُہ اُس شان و شوکت سے بھی بیگانہ ہوتا ہے جو خود بیداری اور خود نموئی کی آبرو ہے۔ ایسی زندگی کو فریبِ نفس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اُس کی ذہنی کیفیت بندریا کی ممتا جیسی ہوتی ہے جو اپنے مُردہ بچے کو زندہ جان کر چھاتی سے لپٹائے رکھتی ہے۔

میں زندگی کا نہیں اِس کی سچائی کا احسان مند ہوں۔ جہاں زندگی موقتی ہے وہاں اِس کی سچائی دائمی ہے۔ اپنی سچائی کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ میرے مرنے کے بعد بھی نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ تاریخ کا ایک باب بنے گی۔ میں اپنے اِس یقین کو اپنی تقدیر کہوں کہ کچھ اور؟ میرے نام کے ساتھ کئی دوسرے ناموں کی سچائی بھی زندہ رہے گی۔ کہنے کو وُہ لوگ آئے گئے ہو گئے لیکن اپنی سچائی میرے ساتھ چھوڑ گئے۔ اُن کی سچائی میرا ورثہ ہے۔ میں اُسے جیسے چاہوں، جہاں چاہوں ظاہر کروں! وُہ اِسے اپنے حق میں مداخلتِ بے جا خیال کریں تو یہ اُن کی نادانی ہوگی۔

میرے قارئین! اپنی کڑوی سچائی کی طرح میں آپ کو اپنے کڑوے انداز میں انتباہ دیتا ہوں۔ میری حقیقت جان کر آپ کی وُہی حالت ہوگی جو سیلاب سے تاخت و تاراج دھرتی کی ہوتی ہے۔ وُہ وقتی طور پر لُٹ جاتی ہے لیکن سیلاب تھمتے ہی اُس تغیّر سے رُوشناس ہوتی ہے جو خود خیزی کی خوبی ہے۔

میری ذہنی اُپج کے ساتھ یہ تہذیب کا کرشمہ ہے کہ میں آپ سے قریب بھی ہوں اور مخاطب بھی، ورنہ یہ کاروبارِ دُنیا اور کروڑوں اربوں کا اِزدحام! اور میں اِس بھیڑ میں اکیلا کھڑا ہوں! نہ کوئی میرا پیش رو تھا اور نہ کوئی میرا جانشین ہوگا!

خدا کے بارے میں اہلِ مذہب ہزاروں صدیوں سے دُہراتے آئے ہیں،

"خدا کا نام نعمت ہے"!

"خدا کا نام برکت ہے"!

قارئین! کیا خدا کا نام واقعی نعمت اور برکت ہے؟ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آدمی، خدا کا نام جپتا اور خوش و خرّم رہتا۔ کیا ایسا سمجھنے اور سمجھانے والے نیرنگیٔ خیال میں مُبتلا اور اِرتقائے حیات کے

تقاضوں سے بے بہرہ نہیں ہیں؟

آدمی نظریہ ساز اور مصلحت سوز ہے اِس لئے براہِ راست نشیب و فراز سے منسلک ہے، جو اِس سے بندھی ٹکی قدروں کی توقع کرتے ہیں، وہ گوناگونیِ حیات کو اسیرِ نفس دیکھنا چاہتے ہیں۔

مَیں اپنی حقیقت سمجھتا ہُوں اِس لئے مَیں اپنا وکیل اور گواہ اور منصف ہُوں، اور زندگی کو بے نقاب کرتے ہُوئے کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہُوں۔ اپنے جذبات و افعال اور حادثات و احوال کی تفصیل بیان کرتے ہُوئے، مَیں نے لفظوں میں نرمی اور سنگینی کو یکساں برتا ہے تو اس کی وجہ ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ نشاط و غم کے جن طُوفانوں سے مَیں گزرا ہُوں، آپ حضرات بھی اُن حادثات کو اُسی شدّت سے محسوس کریں تاکہ آپ میری رواداری اور غیر جانبداری کا صحیح تجزیہ کر سکیں۔ میرے اِس بیان سے جُڑا ہُوا میرا ایک اِحساس ہے۔ میرا ہر لفظ میری سچّائی کا مظہر ہے اور اِس کا ایسا اہم اور لطیف حصّہ ہے جیسا کہ دِل کی دھڑکن خرامِ حیات کا۔ آپ کا ہر لفظ پر غور نہ کرنا دِل کا دھڑکن سے چُوکنے کے برابر ہوگا، اِسی لئے مَیں نے اپنی سرگزشت کا آغاز آپ حضرات سے مُخاطب ہو کر کیا ہے۔

میرے نزدیک فطرت نے دُنیا کو خُوبصورت بنایا ہے لیکن ساتھ ہی اِس خُوبصورتی کا غارت گر بھی پیدا کر دیا ہے۔ وُہ غارت گر کوئی اور نہیں، آدمی ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ آدمی اپنی تمام تحقیر آمیز صِفات کے باوجود ایک لحاظ سے فطرت سے برتر ہے۔ وُہ یُوں کہ جہاں کاروبارِ فطرت نہاں ہے، وہاں کاروبارِ آدم عیاں ہیں۔ فطرت تخلیق کرتی ہے لیکن اپنی تخلیق کو نام نہیں دے سکتی۔ آدمی تخلیق کرتا ہے اور اپنی تخلیق کو نام دیتا ہے اور پھر اُسے صوت و معنی کی کیفیت دے کر سوز و گُداز سے حظ اُٹھاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہنگامۂ تخلیقِ فطرت میں کوئی کیا ہوتا؟ یہ کوئی نہ جانتا کیوں کر اس کے تعلّق سے بیان کرنے والا کوئی نہ تھا۔

قارئین! مَیں آپ کی بصارت و سماعت کو نئے دیدہ و گوش دے رہا ہُوں اِس لئے مَیں آپ کی پُوری توجّہ چاہتا ہُوں۔

باب ۱

ہر اک زمین پہ ہوتا ہے قتل انساں کا
یہ کیا ضرور ، زمیں وہ زمینِ مقتل ہو

جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے ، میری ماں کا بیاہ اُس کے باپ کے ناپسند کردہ خاندان میں ہُوا تھا ۔ اپنے بیاہ کا حادثہ وُہ کچھ اِس طرح بیان کرتی ہے ۔

"تیرے نانا اپنی بہن کے وسیلے سے تیرے ہونے والے دادا کے ہاں پہنچے ۔ پُورے گھر میں خشتی ردّے گنتی کے ہوں گے ۔ اِس بیٹھک کی جگہ کچّی بھینسوں کا بے روشندان مکان تھا ، جس میں پائے تک نہ تھے ۔ کڑیاں ، داسوں پر رکھی تھیں ۔ بلّیوں اور سرکنڈوں کی چھت ، سر سے کچھ ہی اونچی تھی ۔ دروازہ اندر کو کھُلتا تھا اور ہتھ کُل سے بند ہوتا تھا ۔ دروازے سے دُور کچھ ڈھونڈنا ہوتا تو دِن کو چراغ جلانا پڑتا ۔ بھیتر چمگادڑیں لٹکی رہتی تھیں ، جو اندھیرا ہوتے ہی اندر سے باہر اور باہر سے اندر تیروں کی طرح اُڑتیں ۔ اُن سے ٹکرا جانے کے ڈر سے گھونگٹ نکالنا پڑتا ۔ اندر گھُٹن ایسی تھی کہ دروازے کے سامنے ہی سانس بوجھل ہو جاتی تھی ۔ ایک تو تیری دادی کی بینائی کمزور تھی ، دُوسرے وُہ تھی بھی پھوہڑ ! تو نے دیکھا تو ہے ۔ اُس نے بالٹی بھر دُودھ میں شکّر ملائی اور جوں کی توں لے جا کر تیرے نانا کے سامنے رکھ دی ۔ اُس نے بالٹی کے ساتھ پیتل کا گلاس رکھا ، وُہ کتّے سے ہرا تھا اور دُودھ پر چُوہے کی مینگنیاں تیر رہی تھیں ۔ وُہ گندگی دیکھ کر تیرے نانا کو قے ہو گئی ۔ تیرے بھائیا جی گھر میں نہ تھے ، تیرے نانا ، اُن کا اِنتظار کئے بغیر اُٹھ کر چل دیئے ۔ اُنہیں خبر نہ تھی کہ وُہ جس گھر کو ٹھکرا کر جا رہے ہیں ، وہیں اُن کی بیٹی ، بہو بن کر آنے والی ہے ۔"

"تقدیر !" میری ماں آہ بھر کر خاموش ہو جاتی اور آنکھیں نیچی کر لیتی جیسے اپنے کلیجے پر اُن زخموں کو دیکھتی جن پر وقت کی کھپری جم گئی تھی لیکن جو اندر سے ہرے تھے ۔

"تیرے نانا گلی سے گزرتے ہُوئے ہریانہ کی جانب مُڑے تو نکڑ پر تیرے بھائیا جی سے ٹکرا گئے ۔ اِتنے میں تیرے دادا نے بتایا کہ وُہی اُن کا لڑکا ہے ، جسے دیکھنے کے لئے وُہ آئے ہیں ۔ تیرے نانا نے اُنہیں آغوش میں لیا ، وہیں شگن کا رُوپیہ دیا اور گھر چلے آئے ۔ جب تک میرا بیاہ نہ ہُوا ، تیرے نانا ، تیری نانی سے کہتے رہے ، ایسر یئے ! مَیں نہ چاہتے ہُوئے بھی میلو (میری ماں کا نام) کا رِشتہ وہاں پکا کر آیا ہُوں ! مَیں ، رتن سنگھ کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا ! اُس کا رنگ رُوپ چڑھتا ہُوا سُورج ہے ! ویسے گھر میں اندھیرا ہی ہے ! روشنی ہو جائے تو تیری لڑکی کا اپنا بھاگ ہے !"

"میں بیاہی آئی تو گھر میں گنڈو بامن ساہوکار کا آنا جانا تھا۔ ایک دن میں روٹی پکا رہی تھی کہ وہ کھانسے کھنکارے بغیر اندر گھس آیا اور چولہے کے آگے ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے روکا تو وہ مجھ پر بگڑنے لگا۔ تیری دادی نے اُس کی حمایت کی اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگی۔ اُس وقت یہ کہاوت مُروّج تھی۔

گرو بناں گت نہیں

شاہ بناں پت نہیں

تیرے بھایا جی نے شاہ اور اُدھار کی پھٹکار کا ارتھ اپنے انداز میں سمجھا۔ اُنہوں نے گنڈو کو ٹھونکا اور گھسیٹ کر باہر گلی میں پھینک دیا۔ تیرے دادا سادھو سبھاؤ تھے اور کچھ نہ بولتے تھے۔ تیری دادی نے واویلا کیا۔ اُنہوں نے اُسے بھی دھر لیا۔ اُسی دن میرا سارا زیور بیچ کر اُدھار چکایا اور فیصلہ کیا کہ بھوکے مر جائیں گے لیکن اُدھار نہ کھائیں گے۔ ہم نے کئی مہینے بیجھڑ کا پھُلکا، لُون مرچ کی چٹنی اور لسّی سے کھایا اور سنتوکھ کیا۔ اُس کے بعد ہماری حالت اچھی سے اچھی ہوتی گئی لیکن تیرے بھایا جی کی عادت بُری سے بُری۔ اُن کے دماغ میں یہی بات بیٹھ گئی کہ مار دھاڑ ہی ہر مُشکل کا حل ہے۔"

باب ۲

آباد ہیں یہ مجھ سے جہانِ خراب میں

میں ہی نہ ہوں تو فرش و فلک کس حساب میں

میں ۲۳ فروری ۱۹۳۶ء میں ڈڈیانہ کلاں میں پیدا ہوا۔ پنجاب کا یہ چھوٹا سا گاؤں ہوشیار پور میں واقع ہے، اور ہریانہ سے شام چوراسی جانے والی سڑک پر دو میل کی دُوری پر ہے۔ اس پُرسکون آبادی کو فطرت کی فراوانیِ رائگاں کی سعادت حاصل تھی۔ دائمی آب جُو کے کنارے سبزہ زاروں اور درختوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی بستی اس قدر حسین اور خواب آور تھی کہ یہاں گردشِ شام و سحر رُکی رُکی سی دکھائی دیتی تھی۔ بلبلوں کے نغمے، فاختاؤں کی ٹٹروں ٹوں، کوئلوں کی کُوکُو، موروں کی کوکویں، پپیہوں کی پی کہاں، ٹٹیریوں کی ہم یہاں، خود رو پھولوں کی بہار جنگلی پھلوں کی بھرمار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، رنگ رنگ فضا...... زمین کا یہ گوشہ کیا تھا! دوشیزۂ فطرت کا دل نواز گہوارہ تھا۔

اور شاید میں یہاں بزمِ فطرت کے قانونِ توازن کی تجدید کے لئے پیدا ہوا۔ میری پیدائش منحوس ثابت ہوئی اور یہ فضائے نغمہ و رنگ درہم برہم ہو گئی۔ اُس کی وجہ مجھ پر طاری رحمِ مادر کا فسُون تھا جسے دُنیاوی شور و غل توڑ نہ سکا تھا۔ سنتی دائی نے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر اُلٹا لٹکایا، میرے مُنہ میں پھونکا، چپتیں لگائیں، چٹکیاں توڑیں....

لیکن میرے بے جان ماس میں جان نہ پڑی۔ ہر کوئی مجھے رو پیٹ چکا تھا، لیکن میری دائی مجھ سے مایوس نہ تھی۔ وہ میری ہی طرح خاموش تھی لیکن اپنا کام کئے جا رہی تھی۔ آخر وہ جلتا ہوا پانی تھا جس نے میری دنیائے قرار کو پھونک دیا۔ میری دنیا لٹتے ہی دوسروں کی دنیا آباد ہو گئی اور میری چیخوں میں سب کی چیخیں ڈوب گئیں۔

میری زندگی کی سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ میری بدبختی، لاعلمی اور بے کسی کے باوجود میرا نام، گرو گرنتھ میں سے استخارہ دیکھ کر گیان سنگھ رکھا گیا۔

میری ماں ہر بھریائی، بچہ خیز تھی۔ میں رینگنا ہی سیکھ رہا تھا کہ میری جگہ ایک دوسری بچی نے لے لی۔ ماں کی گود کیا چھٹی! میرا ہر سہارا چھوٹ گیا۔ میں بھرے گھر میں اکیلا ہو گیا اور رغبت و محبت سے محروم، جس کی مجھے اپنی سانسوں کی طرح ضرورت تھی۔

بچے کا نہ ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل، اس کا صرف حال ہوتا ہے اور وہ اسی کی حفاظت کرتا ہے۔

میری بہن دودھ چونگھتی اور میں ماں کے پاس بیٹھا اسے حسرت سے دیکھتا۔ وہ مجھ پر ترس کھاتی، مجھے پہلو میں بٹھاتی اور دوسری دودھی میرے منہ میں ڈال دیتی۔ دودھی میرے منہ میں ہوتی لیکن میں اسے چونگھ نہ سکتا۔ میں رقابت کی آگ میں جلتا ہوا اپنی بھوکی رقیب کو دیکھتا جو ہڑپ ہڑپ دودھ چونگھتی ہوئی غوطے کھاتی جان پڑتی۔ اپنا حق چھینے جانے کے غم میں۔ میں مشکل سے دو ایک اوپری اوپری چسکیاں ہی لے پاتا کہ میری دشمن اپنا حصہ چونگھ نچوڑ کر رونے لگتی۔ آخر کار میری ماں کو اسی کی تسلی منظور ہوتی اور وہ میرے منہ سے دودھی کھینچ کر اس کے منہ میں ٹھونس دیتی۔ میں اپنی آزردگی میں اپنے حصے کی حفاظت کرتا اور اپنی دشمن پر جھپٹتا۔ ماں اسے مجھ سے بچاتی اور مجھے پرے دھکیل دیتی۔ میرے سنتاپ کو بڑھانے کے لئے یہی کافی ہوتا۔ میں گلے تک منہ پھاڑ کر روتا، ایڑیاں رگڑتا اور سر کے بال نوچتا۔ وہ مجھے پچکارتی، چکنی چپڑی باتوں سے بہلاتی، ڈھارس بندھاتی اور میرے قریب سرک کر مجھے پیار کرتی۔ میں نفرت سے باؤلا ہوتا اور اس کے ہاتھ لگاتے ہی اسے کاٹ کھاتا۔ وہ اپنی تکلیف سے گھبرا کر مجھے پرے دھکیلتی اور غصے سے کہتی "جا رے مر!" میں زمین پر گر کر بسمل کی طرح لوٹتا۔ میرے آنسوؤں کا غلبہ ہچکیوں کی گہرائی تک پہنچ جاتا اور میں الجھے الجھے سانس لیتا جیسے رگِ جاں میں گرہ پڑ گئی ہو۔

ایک بار میری ماں میری بہن کو میرے پاس لٹا کر اندر چلی گئی۔ بال ایر کھا! میں نے اپنی بہن کا منہ نوچ لیا اور اسے لہولہان کر دیا۔ اس دن بڑی کڑی سزا مجھے ماں کے ہاتھوں ملی۔

میری ماں مجھے اوپرا دودھ پلاتی جسے دیکھتے ہی میرے حلق میں کانٹے اگ آتے۔ میں منہ نہ کھولتا اور اس کی دودھی سے دودھ پینے کی ضد کرتا۔ وہ لاڈ لڈاتی ہوئی مجھے گود میں لیتی اور ڈبی دودھ پینے کی ترغیب دیتی جس سے مجھے رغبت نہ تھی۔ میں کسی طرح نہ پسیجتا اور منہ بند رکھتا۔ وہ اپنی انگلی سے میری باچھیں پھاڑ کر کھولتی اور میرے حلق میں دودھ

اُنڈیلتی۔ مَیں دُودھ اُگل دیتا تو وہ مجھے پیٹتی۔ مَیں ڈر کے مارے دُودھ نہ اُگلتا لیکن گلے سے نیچے بھی نہ اُتارتا۔ وہ میری ناک پکڑ کر میری سانس روکتی، مجھے مُنہ سے سانس لینے پر مجبُور کرتی اور یوں مجھ سے گلے میں دُودھ اُتروا تی۔ وہ ہر بار میرا مُنہ دُودھ سے بھرتی اور ہر بار یہی رویّہ اختیار کرتی۔ وہ دُودھ پینا ایسا عذاب تھا جس کا ڈر وا بھی تک تازہ ہے۔ بھرتے بھرتے پیٹ بھر جاتا لیکن مَیں تسکین سے محرُوم رہتا۔ میں اپنے مظلوم خوابوں میں دیکھتا کہ میں ماں کا دُودھ پینے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ مجھے باز رکھتی ہُوئی میری بہن کو دُودھ پلا رہی ہے۔ مَیں تڑپ کر نیند سے بیدار ہوتا اور پھر روتا روتا سو جاتا۔ میری محرُومی نے مجھے اس قدر ہٹیلا بنا دیا تھا کہ میں کسی صُورت نہ بہلتا تھا۔ مجھے بہلانے کے لئے تایا جی مجھے چُسنی بنا کر دیتے۔ مَیں اُسے اِس شدّت سے چُوستا کہ چند ہی دِنوں میں اُس کی کرچیں نکل آتیں جو میرے مُنہ کو مجرُوح کرنے لگتیں۔ میرے بچپن کا سب سے اہم اور کام کا کھلونا، رہڑُو تھا جو مجھے تایا جی نے بنا کر دیا تھا۔ وہ مجھے وہ تحفہ نہ دیتے تو شاید مَیں چلنا نہ سیکھ سکتا۔

مجھے زبان مِلی تو مَیں نے ہکلانا سیکھا اور ہکلانا بھی اِس غضب کا کہ مَیں دو لفظوں کا ایک جُملہ نہ بول پاتا۔ مَیں لفظوں میں ایسے اُلجھ جاتا جیسے جالے میں مکھی۔ مَیں بے بس، بے اختیار بھِیں بھِیں، بِھن بِھناتا۔ کوئی دُوسرا میرے سامنے بات کرتا تو مَیں اُسے حسرت سے دیکھتا اور اُس کی زبان کی روانی اور بے ساختگی پر حیران ہوتا لیکن مَیں بات کرتا تو اپنی پریشاں خاطری کو دعوت دیتا۔ میرے بچپن کی کہانی گُلِ تر کی سی ہے۔ اُس کی نازک پنکھڑیاں باد و باراں کے تھپیڑے کھاتی ہیں لیکن کراماتی طور پر ٹُوٹنے سے بچی رہتی ہیں۔

بدگُمانی اور بے تسکینی اور ناکامی میری گھُٹّی میں پڑی۔ میری پرورش حسد کی مٹّی میں بوئے گئے بیج کی طرح ہُوئی۔ میں ہر کسی سے اپنی ہی بات منواتا اور ہر چیز پر اپنا حق جتاتا۔ مَیں اپنے مَن کی مُراد نہ پاتا تو روتا اور آنسوؤں کے سیلاب میں ایسے سانس لیتا جیسے کوئی پانی میں ڈُوبے، اُبھرے، ڈُوب کر اُبھرے۔ کوئی دِلاسا مجھے رام نہ کرتا۔ ہر کوئی مجھے نفرت سے دیکھتا اور مجھ سے دُور رہتا۔ مَیں ایڑیاں رگڑتا اور مُسلسل رگڑتا۔ اُن سے خُون بہنے لگتا تو ماں اُن پر پٹیاں باندھ کر میری ٹانگیں جکڑ دیتی۔ مَیں ایڑیاں رگڑ کر نہ رو سکتا تو میرا اُبال اُس کڑھی کی طرح ہوتا جس کے نیچے آگ کی لپک تیز ہو۔ میرا چلن نئے جنمے بچے کا سا تھا جو چِلّانا اور فقط چِلّانا جانتا ہے۔

مَیں بھائیا جی کے سوائے کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ وہ عام طور پر گھر میں نہ رہتے، رہتے تو کسی قسم کا شور پسند نہ کرتے۔ وہ خُوں خواری کی حد تک شور شکن تھے۔ گھر میں کوئی چِڑیا گھونسلا بناتی، وہ ٹوکرے کا پھندا بنا کر اُسے پکڑ لیتے اور اُس کی گردن مروڑ کر پرے پھینک دیتے۔ اُس خُوں خرابے سے سہم کر مَیں کونے میں دبک جاتا اور دیر تک گُم سُم پڑا رہتا۔ مَیں روتا ہُوا اُنھیں دیکھ لیتا تو ایسے چُپ ہو جاتا جیسے میری چیخوں سے جُڑی ہُوئی تانتیں ٹُوٹ گئی ہوں۔ میری گتّی اُس تازہ ذبح شُدہ جانور کی سی ہوتی، جو مرتا ہُوا تڑپ نہ سکے۔ وہ مجھے بسورتا ہُوا دیکھتے، سیدھے میرے اُوپر

آتے، مجھے گلے سے دبوچ کر ہوا میں جھلا دیتے اور جب تک میرے دیدے ابل نہ پڑتے، مجھے زمین پر نہ رکھتے۔ میں پاؤں پر ایسے ڈھے پڑتا جیسے ان کے نیچے سے سہارا کھسک گیا ہو۔

میری ماں مصروف ترین گرہستن تھی۔ شاستروں کی رو رعایت سے اس کی پدوی بھگوان کے دوسرے درجے پر سہی لیکن حقیقت میں وہ بندھوا نوکرانی سے بدتر تھی۔ وہ میرے باپ کے اشاروں پر ناچتی تھی، اس کے نفسِ حیوانی کا شکار ہوتی تھی، بچے جنتی تھی اور اپنے مالک اور اپنی مخلوق سے رگیں بھی نچڑواتی تھی۔ میرے ملعون بچپن میں اگر کوئی قابلِ فخر بات ہے تو وہ یہ کہ میرے نتھنے شیشے کی طرح صاف رہتے تھے، جو شاید میری ماں کے دودھ کا چمتکار تھا۔

درندے مصیبت میں ہوں تو اپنے حریفوں سے دوستی کر لیتے ہیں کچھ وہی نفسیات غریبوں کے بچوں کی ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بے یار و مددگار مر جاتے۔ میرے بچپن میں اس صورتِ حال کو بڑا دخل رہا ہے۔ مجھے مٹی کھانے کی عادت پڑ گئی۔ میری گندی عادت چھڑوانے کے لئے ماں مجھے گڑ کی ڈلی دیتی لیکن میں گڑ لے کر بھی وہی کرتا جو مجھے کرنا ہوتا۔ تایا جی کی بڑی بہو بے انت کور بھسور کھایا کرتی تھی، وہ اس کی ڈلی، دو ڈلی جیب میں رکھتی، مجھے اکیلا دیکھ لیتی تو ایک آدھ کنی میرے منہ میں ڈال دیتی۔ یہ مٹی دوسری مٹی سے زیادہ سواد اور خستہ تھی۔ مجھے جوں ہی اس کے ذخیرے کا علم ہوا، میں نے چولہے کا پایہ توڑا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔

کہتے ہیں کہ بچہ اکیلا چپ چاپ بیٹھا ہو تو سمجھو کوئی گل کھلا رہا ہے۔

بھائیا جی میرے پیچھے سے دبے پاؤں آئے اور مجھے مٹی کھاتے پا کر میرے گلے پر جھپٹے۔ میرا اوپر کا دم اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نون دانی پاس ہی پڑی تھی، انھوں نے اس میں سے مرچوں کی مٹھی بھری اور میرے منہ میں ایسے جھونکی جیسے وہ مویشی کی باچھیں پھاڑ کر اسے نون دیتے تھے۔ میری سانس رک گئی، مجھے الٹی ہوئی تو میری سانس کھلی۔ مرچیں اڑیں، آنکھوں میں پڑیں، ناک میں چڑھیں، مجھے ہچکیاں آنے لگیں اور ساتھ ہی چھینکیں، میرے اندر اور باہر آگ لگ گئی، میں اسے تھوک تھوک کر بجھاتا اور کبھی پونچھ پونچھ کر۔ میں تڑپتا اور لوٹتا ہوا ایسے چلا رہا تھا جیسے کسی کو بار بار، لگاتار چرکا دیا جا رہا ہو۔

میری عمر دو ڈھائی سال کی ہوگی لیکن وہ حادثہ مجھے کل کے واقعے کی طرح یاد ہے۔ لوٹتے لوٹتے، روتے روتے، چھینکتے چھینکتے، ہچکیاں بھرتے بھرتے میرا دم الٹ رہا ہے۔ بھائیا جی اپنا پاؤں اوٹے پر رکھے، ہاتھ گھٹنے پر دھرے، کچھ آگے جھکے مجھے اس سکونِ مضطرب سے دیکھ رہے ہیں جو بکرے کی گردن مار کر قصائی کے چہرے پر ابھر آتا ہے۔ میرے آنسوؤں کی دھند میں وہ مجھے، وہ راکشش نظر آ رہے ہیں، جو گنہ گاروں کو اٹھا اٹھا کر دوزخ کی آگ میں جھونکتا ہے۔

ہمارے گھر میں دوزخ کی ایک تصویر تھی جس میں دھرم راج کے بھیانک قسم کے کارکن، گناہ گاروں کو اذیتیں دیتے دکھائے گئے تھے۔ وہ کہیں آگ میں جلائے جارہے تھے، کہیں دیگوں میں اُبالے جارہے تھے، کہیں لال سلاخوں سے کچوکے دے دے کر ستائے جارہے تھے۔

میری چیخ و پکار تائی رَلی کے گھر تک پہنچ گئی اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے دوڑی آئی۔ میری بُری حالت دیکھ کر وہ، بھائیا جی پر برس پڑی، "پاپی! اِسے ویسے ہی مار ڈال! تڑپا کیوں رہا ہے۔؟"

وہ مجھے اُٹھا کر غسل خانے میں لے گئی، مجھ پر پانی کی بالٹی اُنڈیلی، میرے مُنہ پر پانی چھپاکا، اُنگلی سے میرے مُنہ کا اندرونی حصّہ صاف کیا، باچھوں میں پانی ڈال کر انہیں بار بار دھویا اور مجھے اپنے دوپٹے میں لپیٹ کر اپنے گھر لے جانے کے لئے اُٹھایا۔ بھائیا جی نے اُس کا راستہ روک کر مجھے، اُس سے چھینتے ہُوئے کہا، "اِسے مرجانے دے، یہ مردُود اِسی قابل ہے!"

مجھے اُن سے بچاتی ہُوئی اور اُن کے اِرادے کو رَد کرتی ہُوئی، تائی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اُس نے مجھے چارپائی پر لِٹایا، گھی شکّر کھِلایا اور میرے بِنڈے پر نِرا گھی ملا۔ جو آگ، پانی سے نہ بجھی تھی وہ گھی سے بجھی۔ تائی کی ممتا! اُس نے مجھے چھاتی سے دُودھ پلایا۔ اُس کی چھاتی میں دُودھ نہ تھا لیکن مَیں اُسے چُونگھتے چُونگھتے سوگیا۔ وہ سَب مجھے اِتنا اچھا لگا کہ تائی کا دُودھ چُونگھنا میرا معمُول ہوگیا۔ وہ مجھے دُودھ چُونگھاتی اور پیار سے میرے کیسوں میں اُنگلیاں پھیرتی۔ میری خُود فریبی! مَیں سُوکھی چھاتی کو ایسے چُونگھتا جیسے وہ ہری ہو۔ ایک معجزہ ہُوا، اُس کی سُوکھی چھاتی ہری ہوگئی۔ وہ اِتنی خُوش ہُوئی کہ اُس نے اپنے دروازے پر بندھنوار لٹکا دیا اور دہلیز کے آگے اَیپنا (چاولوں کے آٹے سے بنائی ہُوئی چِتر کاری) بنا لیا جیسے اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا ہو۔ میری خُوشی لاثانی تھی! مَیں اُسی کے پاس رہتا، کھیلتا اور جب چاہتا پِتا (وہ دُودھ جو محبّتِ مادری سے کُنواری لڑکی کی چھاتی میں اُتر آئے) پیتا۔ ہمارے رِشتے کو نیا عنوان مل گیا۔ مَیں اُسے تائی ماں کے نام سے بُلانے لگا اور وہ مجھے چھوٹے بیٹے کے نام سے۔ وہ مجھے کہانیاں سُناتی، پیروں پر بِٹھا کر جھُولا جھُلاتی اور لوری سُناتی۔

جھُونٹے مائیاں دے
لیف تلائیاں دے
بُڑھیے مائیے
چرخہ چُک لے
آندھی آئی
بادل آیا

گج گج گج ، گج گج گج

لوری کی آخری لے کے ساتھ وہ پیروں کو اوپر جھلاتی اور وہیں روک لیتی اور مجھے گدگدا دیتی ۔ میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر اُس کی گود میں جا گرتا ۔

میری صحت بڑھنے لگی ، چڑچڑاہٹ گھٹنے لگی اور کھیل کود میں چالاکی آنے لگی ۔ تائی ماں میرے ایک ہاتھ میں کوئی چیزی دیتی تو میں دوسرا ہاتھ آگے بڑھا دیتا ، وہ اس پر چیزی رکھتی تو میں منہ کھول کر "ام ام" کرتا ۔ وہ خوشی سے میری مٹھی لیتی اور منہ میں چیزی ڈال کر کہتی ، "تو ننھا منھا بدماش ہے !"

مجھے چھیننے کے لئے تائی ماں الگ ، پرکاش کور الگ اور سورن کور الگ چیزی دیتی ۔ زیادہ میٹھا کھانے سے پھنسیاں پیدا ہو گئے ۔ میں پھوڑے کھجلاتا اور تکلیف سے چلاتا ۔ تائی میرے پھوڑوں میں اُپلوں کی راکھ گھساتی اور کہتی ، "اور کھا چیزی !" میری چیزی بند کر دی گئی ۔ میں جس سے چیزی مانگتا وہی مجھے جن جنوں کے نام سے ڈراتا اور چیزی کھانے سے روکتا ۔ بال ہٹ ، بال ہٹ ہے ! مجھے چیزی نہ ملتی تو میں دو طرح سے حاصل کرتا پہلے رٹ لگا کر ، تائی ماں چیزی دو ، تائی ماں چیزی دو ، تائی ماں چیزی دو ، دوسرے رو کر ۔

تائی ماں کے چار بچے تھے اور چاروں مجھ سے بڑے تھے ۔ میری تایری بہنیں سورن کور اور پرکاش کور مجھے جی جان سے چاہتی تھیں ۔ وہ میری مالش کرتیں ، مجھے نہلاتیں اور مکھن کھلاتیں ۔ ان کے حسنِ سلوک سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سارے میرے گھر والوں سے اچھے ہیں ۔ میں اپنے گھر ، ماں کے بلانے پر ہی جاتا اور وہ بھی بسورتا ہوا ۔ تائی ماں کے گھر میں بھونپو والا گراموفون تھا جسے سب باجا کہتے تھے ۔ باجے کے بھونپو پر کتے کی تصویر بنی ہوئی تھی ، جو اپنے کولھوں پر بیٹھا بھونپو کے اندر دیکھتا جیسے کچھ سنتا ہو ۔ گراموفون ریکارڈز پر بھی کتے کی سفید تصویر بنی ہوئی تھی ۔ ریکارڈ بجتا ، میں تائی ماں سے پوچھتا ، "تائی ماں ! یہ گانا کون گا رہا ہے ؟"

"بھونپو کے اندر جو کتا بیٹھا ہے ، وہ گا رہا ہے" تائی ماں کہتی ۔

میں حیران ہو کر بھونپو کے اندر جھانکتا ۔ کتا چپ چاپ بیٹھا ہوتا لیکن گیت برابر سنائی دیتا اور جب ریکارڈ ختم ہو کر رکتا ، گیت بھی بند ہو جاتا ۔ بھونپو اتار کر باجا بجاؤ تو ساؤنڈ بوکس میں سے گیت کی ہلکی ہلکی آواز آتی تھی ۔ میں اپنے طور پر سوچتا کہ ریکارڈ والا کتا ہولے ہولے گاتا ہے جسے بھونپو والا کتا سن کر اونچے سُروں میں دوہراتا ہے ۔ ایک دن میں نے یہی بات تایا جی سے کہی جیسے میں نے بہت بڑا راز پا لیا ہو ۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ، "کتا بھونکتا ہے ، گیت تھوڑے ہی گاتا ہے !" میں نے انہیں اپنی بات منوانی چاہی تو وہ گاتے ہوئے کتے کو دیکھنے کے لئے میرے ساتھ چل پڑے ۔ باجا بجنے لگا ۔ تایا جی نے کہا ، "ادھر دیکھ ! یہ کتا گاتا ہے تو اِس کا منہ ہلنا چاہیے لیکن یہ چپ چاپ بیٹھا ہے !"

"لیکن تائی ماں کہتی ہے کہ کُتّا گاتا ہے !"

"وہ جھوٹ کہتی ہے"

"پھر یہ گاتا کون ہے"

"اِس ریکارڈ میں گانا بھرا ہُوا ہے جو ساؤنڈ بوکس اور بھونپو کے وسیلے سے بجتا ہے۔"

"یہ کُتّا یہاں کیا کرتا ہے ؟"

"یہ ریکارڈ اور گراموفون بنانے والوں کا ٹریڈ مارک ہے۔"

"ٹریڈ مارک کیا ہوتا ہے ؟"

"تو بڑا ہوگا تو سمجھے گا۔"

اُن کی بات سے میرے جذبۂ تلاش کی تسکین نہ ہُوئی لیکن گانا سُننے میں میری دلچسپی برابر رہی۔ مجھے گیتوں کے کئی انترے یاد ہو گئے۔ میری ناکامی ! مَیں گانا چاہتا تو گا نہ سکتا لیکن اُس کی تان کو رگوں میں تیرتی اور تھرکتی محسوس کرتا۔

مَیں وُہ ہر کام کرتا جو میرے سامنے کیا جاتا۔ مجھے روکا جاتا، مَیں اُتنی ہی دیر کے لئے رُکتا جتنی دیر روکنے والا میرے پاس ہوتا اور پھر وُہی کام کرنے لگتا۔ تائی ماں نے چرخے کا تکلا سیدھا کیا اور اُٹھ کر اندر پونیاں لینے گئی۔ مَیں نے آنکھوں سے دیکھا ہُوا طریقِ کار ہاتھوں سے آزمایا اور تکلا اِتنا ٹیڑھا کر دیا کہ وُہ گھومتا ہُوا دائرہ بنانے لگا۔

تائی ماں کھیتوں کو جاتی تو مَیں اُس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ مَیں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا تو میرے جذبات مِلے جُلے ہوتے، کئی بار مجھے خوف کا اِحساس ہوتا، کئی بار کمتری کا اور کئی بار نارسائی کا۔ وُہ چھوٹے قدم زندگی کے بڑے سفر تھے۔ مَیں گھر سے چہکتا، لہکتا اور اِدھر اُدھر بھاگتا چلتا جیسے گائے کے ساتھ بچھڑا۔ ہمارے زیادہ کھیت کچھار کے پار تھے، جن کا راستہ ریت، دلدل، پانی، گھاس، اُتار، چڑھاؤ، دُھوپ، چھاؤں میں سے گزرتا تھا۔ تائی ماں احتیاط سے چلنے کو کہتی لیکن میری خُوشی بے احتیاطی میں ہوتی۔ مَیں جان بُوجھ کر ریت میں گرتا، دلدل میں لتھڑتا، پانی میں بھیگتا اور ڈھلوان پر پھسلتا۔ میری ترنگ میری حرکت تھی۔ تائی ماں کے ساتھ مَیں چارہ کاٹتا، کھیتی گوڈتا اور ہرا نکالتا۔ بچّوں کے لئے کھیتی باڑی کے چھوٹے اوزار تھے۔ مَیں نے اپنی رمبی (چھوٹا رمبا) اور چوری (چھوٹی درانتی)، چُن رکھی تھی، اور کسی دُوسرے کو اُن سے کام نہ کرنے دیتا تھا۔ کوئی اُنہیں دیکھنے کے لئے بھی اُٹھاتا تو مَیں اُس سے چھین لیتا اور دعویٰ کرتا کہ یہ میرے ہیں۔ گیان سنگھ کے ! مَیں کام کرتا کرتا چوٹ کھاتا، درد سے روتا، تھوڑی دیر رُکتا اور پھر وُہی کام کرنے لگتا جو میری تکلیف کا باعث ہُوا تھا۔ مجھے

کھلے آسمان کی سختی سے بچانے کے لئے تائی ماں مجھے درخت کے سائے میں بٹھاتی، درخت پاس نہ ہوتا، وُہ چادر وغیرہ سے اوٹ کرکے سایہ کرتی لیکن میری ضد! میں نِٹھلا نہ بیٹھتا اور کام کرنے پر مُصر رہتا۔ اپنی نااہلی اور ناتجربہ کاری کے باوجود مجھ میں برتری کا جذبہ تھا اور میں باہم مقابلے کا جوہر رکھتا تھا۔ تائی ماں برات (کئی شیاڑوں کو ایک ساتھ کاٹنا) کاٹتی اور میں ایک شیاڑ۔ میں پیچھے رہنے لگتا تو اُٹھ کر آگے بیٹھ جاتا اور اپنے پیچھے اُسے ایسے دیکھتا جیسے اُسے ہرا دیا ہو۔ وُہ چارے کی بھری (گٹھا) اُٹھائے کھیتوں سے گھر آتی اور میں اپنے سر پر پُولی۔ اُن مٹھی بھر تنکوں کو میں تائی ماں کی بھری سے الگ رکھتا اور اِس خیال سے تسکین پاتا کہ میں نے اُس سے زیادہ کام کیا ہے۔ پٹھے کُترنے کا وقت آتا، میں اِصرار کرتا کہ میری پُولی الگ کُترو اور بچھڑے کو ڈالو۔

ہمارے خاندان کے سب افراد میں سے صرف تایا جی بچّوں سے تعلیمی اور تربیتی انداز میں پیش آتے تھے اور اُن سے صبر و تحمّل برتتے تھے، باقی سارے بچّوں سے بڑوں کی سی سمجھ داری کی توقّع رکھتے تھے اور اُنہیں ڈانٹنے، پیٹنے میں فخر محسُوس کرتے تھے۔ کوئی جدّت بیزار تایا جی کے نیارے رویّے پر حجّت کرتا، وُہ کہتے۔ "بچّے، بڑوں سے زیادہ تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو، اِن کے تجسُّس کی تسکین کرنی چاہیئے تاکہ یہ زندگی کو اپنے طریقے سے سمجھ سکیں۔"

چاندنی راتوں کی تین باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ تایا جی کی کہانیاں، دُھوپ چھاؤں کا کھیل، ترنجن کے گیت (وُہ گیت جو لڑکیاں گروہ میں بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہُوئی گاتی ہیں)۔ میں جہاں ہوتا مُکمّل طور پر وہیں ہوتا اور اُن کے عمل سے اپنے علم میں اضافہ ہوتا ہُوا محسُوس کرتا۔ تایا جی کہانی سُناتے ہُوئے پٹ سن بھی نکالا کرتے تھے۔ وُہ کوئی بات نہ کرتے ہوتے تو اُن کی خاموشی اُن کی متانت ہوتی۔ اُن کے چہرے کی دِلکشی! میں اُنہیں ایسے دیکھتا جیسے کوئی خُوبصُورت منظر کی خُوبصُورتی میں کھو کر خُود کو بھُول جائے۔ وُہ میرے تصوّر میں دھارمک کتھاؤں کے رِشی مُنی ہوتے جو شہزادوں کو علم و ہُنر سکھایا کرتے تھے۔ جیسے بھیرویں کی خُوبی آس کی مدھرتا ہے ویسے ہی اُن کی آواز میں خُوش آثری تھی۔ اُن کے لب و لہجے میں وُہ معنی تھے جن کی تفسیر لکھنا اُن کو گھٹانا ہے۔ اُن کا دِماغ اِس قدر لبریز اور زرخیز تھا کہ وُہ کسی مُتجسّس سے بات کرتے ہوتے تو لفظوں کو از سرِ نو تشکیل دینے لگتے۔ "لفظ لافانی ہے اور عمل فانی، اِس کے باوجُود پہلا، دُوسرے کا بدل نہیں ہے کیوں کہ عمل، لفظ کا مُوجد ہے اور مُجدّد بھی۔ میں کتنی ہی تفصیل میں جاؤں بہت کچھ ناگُفتہ رہے گا جسے کوئی دُوسرا بیان کرے گا اِس لئے کہ وُہ اپنے عمل سے لفظ کو نئے معنی دے گا۔"

میں اُن سے سُوال کرتا اور وُہ میری تسلّی ہونے تک میرے سُوالوں کے جواب دیتے اور برہم نہ ہوتے۔

"تایا جی! یہ کیا ہے؟"

"اکری ہے۔"

"اِسے آری کیوں کہتے ہیں ؟"

"کسی نے اِسے یہی نام دیا ہے اور ہر کوئی اِسے اِسی نام سے جانتا ہے۔"

"اِسے یہی نام کیوں دیا ہے ؟"

"ہر چیز کی پہچان کے لئے اُسے نام دیا جاتا ہے جیسے تجھے نام دیا گیا ہے، گیان سنگھ۔"

"مجھے یہ نام کیوں دیا گیا ہے۔؟"

"ہم اُمید کرتے ہیں کہ تو بڑا ہو کر گُنی گیانی بنے گا۔"

"گُنی گیانی کیا ہوتا ہے ؟"

"جو الفاظ کے صحیح ارتھ اور چیزوں کے صحیح گُن سمجھتا ہو۔"

باب ۳

آپ اپنی تلاش کرتا ہُوں
نقشِ فرضی میں رنگ بھرتا ہُوں (شاطر)

میری کہانی کی ہزاروں تفصیلات کسی کی نظر میں غیر ضروری ہو سکتی ہیں لیکن میرے پاس اِن کی بڑی اہمیت ہے۔ میں اِن تفصیلات سے گریز کروں گا تو اپنے نشیب و فراز کی واضح تصویر نہ کھینچ سکوں گا کیوں کہ نشیب و فراز زندگی سے ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے منزل سے راستے۔

اِس سے پہلے کہ میں بڑا ہوتا اور لفظوں کے معنی صحیح طریقے سے سمجھتا، میری سُوجھ بُوجھ کو رُسُوم و روایات اور شکوک و توہمات نے داب لیا۔ میرے ہکلے پن سے چھٹکارا دِلانے کے لئے میری ماں مجھے گرودوارے لے جاتی، مجھ سے گرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹکواتی، منّت ماننے کی ترغیب دیتی اور خود بھی منّت مانتی، "میرے گرو میرے بیٹے کا ہکلانا ٹھیک کر دے، میں تیری درگاہ میں سوا رُوپے کا پرساد چڑھاؤں گی۔"

میں اپنے طور پر دُعا کرتا اور وہ جسمانی خوبی حاصل کرنے کی آرزو کرتا جس کی مجھ میں پیدائشی کمی تھی مجھ میں اعتقاد پیدا کرنے کے لئے میری ماں مجھے ایسی دھارمک کتھائیں سُناتی جن کا مُول مُدّعا میری تمنّا کا حاصل ہوتا۔ جیسے کہ فلاں سِکھ نے گرو کی خدمت سے یہ پایا اور فلاں نے یہ۔ اُس نے یہ کہانی مجھے کئی بار سُنائی تھی کہ ایک لنگڑا لُولا کوڑھی، گرو کرپا سے صحت مند اور شکیل نوجوان بن گیا تھا۔ اِس کہانی کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ

کوڑھی، راجکماری کا کنت تھا۔ اُن دونوں کا بیاہ کسی حادثے کا نتیجہ نہ تھا، راجکماری کے باپ کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا کیوں کہ دھرم شیل (خدا ترس) راجکماری، اپنے ادھرمی باپ کے پوچھنے پر کہ وہ کس کا دیا کھاتی ہے، بے دھڑک بول اُٹھی تھی کہ میں بھگوان کا دیا کھاتی ہوں اور وہی میرا سچا باپ ہے۔ میں گردوارے میں جھاڑو لگاتا، سنگت کے جوتے صاف کرتا اور اُس میں اپنی محرومی کا علاج ڈھونڈتا۔ میں اپنے سے بڑوں اور اچھے بھلوں کو گرو گرنتھ کے آگے سر جھکاتے اور ور مانگتے دیکھ چکا تھا۔ میں ویسا کرتا تھا تو اپنے آپ کو سرب شکتی مان (مختارِ کُل) بھگوان کے قریب سمجھتا تھا۔ میں اپنے ہم عصروں سے کمزور تھا اور باہمی جھگڑوں میں ہمیشہ پٹتا تھا۔ اپنی ماں کی سکھائی ہوئی پرارتھنا کے ساتھ میں نے ایک پرارتھنا اور جوڑلی، اپنے دھاکڑ اور تکڑے ہونے کی پرارتھنا۔ میری محرومی کا دائرہ جیسے جیسے بڑھنے لگا ویسے ویسے میری دعاؤں کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ دعائیں اتنی بڑھ گئیں کہ میں اُن کا حساب سانسوں سے کرنے لگا اور یہ عین مذہبی کہاوتوں کے انُسار (مطابق) تھا۔ کوئی میرے سامنے بھگوان کا نام لئے بغیر کچھ کرتا تو میں اُسے ٹوکنے میں کارِ ثواب سمجھتا۔

میری ماں سینیچر کے دن میرے کیس نہ دھوتی اور نہ ہی تیل استعمال کرنے دیتی۔ وہ اِسے اشبھ سمجھتی تھی اور بیماری کا گھر۔ بھکاری سینیچر کو سینیچر دیوتا کے نام کی الکھ جگاتے پھرتے، سینیچر ولی، دے تیل دی پلی، سب بلا ٹلی۔ کئی اور ایسی ہی باتیں روزمرّہ کا درس و تدریس تھیں۔ گھر سے باہر کام پر جاتے وقت کسی کا چھینکنا، پیچھے سے پکارنا، بلّی کا راستہ کاٹ جانا بدشگونی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے، بڑوں سے زیادہ جویا اور بے اختیار ہوتے ہیں۔ میں کئی بار اِس بات پر سزا پاتا کہ میں بڑوں سے پوچھ لیتا، آپ کہاں جا رہے ہو۔ ایک تایا جی تھے جو ایسی پوچھ تاچھ پر برہم نہ ہوتے تھے۔ وہ سوال کا جواب خوشی سے دیتے تھے اور پیار سے بات بھی کرتے تھے۔ میں اُن کے الگ برتاؤ سے متاثر ہو کر اُن سے پوچھتا، "تایا جی! آپ جس سوال پر خوش ہوتے ہیں دوسرے اُسی پر ناخوش، ایسا کیوں؟"

"جاہل، وہم پرست ہوتا ہے اور خود اعتمادی سے عاری۔ وہ اپنے ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ ہر جگہ، ہر وقت بدبختی اُس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اس سے نپٹنے کے لئے۔ وہ بندھے ٹکے توں کا سہارا لیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اسی میں اُس کا بچاؤ ہے۔ جو کوئی اُس کی رسم پرستی میں مخل ہوتا ہے، وہ اُسے بُرا لگتا ہے۔"

"وہم پرست اور خدا پرست دلیل کرنے کے نا اہل ہوتے ہیں اس لئے وہ خود کو دوسروں پر لادتے ہیں، اور اُنھیں اپنی تنگی کے معاون بناتے ہیں۔"

تایا جی ایسے لوگوں کی حقیقت بیان کرتے۔

میں نے ماں کا دودھ چونگھنا چھوڑا نہ تھا جب بھایا جی نے گاؤں کے اطراف کی اُمرباں خریدیں۔ اُنھوں نے کئی رشتے داروں کو بلا لیا جن میں سے میری نانی اور ماما نہندر سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔ میری نانی میرے لئے

لکڑی کی رنگین کٹوری اور پیالی لائی۔ میں انہیں ہر کسی کو دکھاتا، اپنی ملکیت جتا کر خوش ہوتا اور انہیں اتنا عزیز رکھتا کہ سوتے وقت سرہانے رکھ کر سوتا۔ میری ماں مویشیوں کو قبروں والے باغ میں لے گئی اور وہیں رہنے لگی۔ میں نانی ماں کے گھر سے باغ میں نہ جاتا تو ماما جی مجھے اُٹھا کر لے جاتے۔ وہ مجھے پیٹھ پر لاد کر کبھی دُلکی لگاتے چلتے اور کبھی پھدکتے، میں خوشی اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ باغ میں جھولا ڈالا ہوا تھا۔ میری نانی مجھے جھولا جھلاتی اور ملہار گاتی۔

ہمرے دیس پکے امریاں، ٹھنی ٹھنی پینگاں پیاں
کسی بہانے آمل سیاں

اُن دنوں ڈڈیانہ کلاں کے ساتھ جنت نشاں کی صفت لگائی جاتی تھی۔ باغ سے کچھ قدم کی دوری پر آب جو بہتی تھی۔ شبنم سا شفاف آبِ رواں۔ تل پر بنتی بگڑتی ریت کی دھاریاں، تیرتی لہراتی رنگ برنگی مچھلیاں، بلوروں کی سی کول مول بٹیاں۔۔۔ وہاں گھونگے، ہیرے تھے اور سیپ، یشب کی طشتریاں۔ میں اُس کھلے پن گھر میں ماما جی کے ساتھ نہاتا، چہلیں کرتا، سیپ اور گھونگے اکٹھے کرتا اور مچھلیاں پکڑتا۔ وہ ہوشیار اور سبک رفتار میرے ہاتھ کہاں لگتیں! میں اُن کے پیچھے بھاگتا، پانی میں گرتا، غوطہ کھاتا لیکن مجھے سنبھالنے کے لئے ماما جی وہیں موجود رہتے تھے۔ میں ماما جی اور نانی ماں کا اِس قدر گرویدہ ہو گیا کہ میں نے تائی ماں کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ وہ مجھے دُودھ پلانے کے لئے بار بار آتی اور کوستی۔ ”پرایا مال، پرایا ہی ہوتا ہے! میری کوکھ کا جنا ہوتا تو یوں نرموہا نہ ہوتا۔“ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی۔ میں اُس کی گود سے اُتر کر نانی ماں کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ مجھے لینے لگتی، میں نانی ماں کے گلے لپٹ جاتا اور اُس کے کھینچنے پر ”نانی ماں! نانی ماں!“ چلانے لگتا۔

”نانی ماں کا خصم!“ تائی ماں مجھے پھٹکارتی اور رُوٹھ کر گھر چلی جاتی لیکن پھر دُودھ چُونگھانے ضرور آتی ایک دن وہ کچھ دِنوں کے بعد آئی اور میں دُودھ چونگھنے کے لئے اُس کی گود میں چڑھ گیا۔ اُس نے پیار سے میری ٹھُڈی لی اور دُکھ بھری ہوئی بولی۔ ”دُودھ سُوکھ گیا ہے، میرے ننھے!“

اُس کے لہجے کی افسردگی کچھ کھو کر پانے کی سی تھی۔ وہ انداز میری خود غرضی کے معصوم مظاہرے تھے اور مصلحت ساز ضمیر کے دلچسپ نمونے۔ رُوحِ تغیرِ زمانہ مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی اور اُس کا مشاہدہ کرتے ہوئے کئی مجھے چھوٹا بدمعاش کہنے لگے تھے۔

میری نانی مجھے تھپک کر سلاتی ہوئی کچھ اِس طرح کی لوری دیتی۔

تو بڑا ہو گا!

ہونہار ہو گا!

ہُنر سیکھے گا !
جواں مرد بنے گا !
بیاہ کرے گا !
دیس بدیس جائے گا !
کمائے دھمائے گا !
اپنا پریوار پالے گا !
ماتا پتا کی سیوا کرے گا !
میری نانی میری بہن کو جیسی لوری دیتی اُس کے معنی الگ ہوتے۔
تُو بڑی ہو گی !
گھر کی لاج بنے گی !
کھانا پکانا سیکھے گی !
سینا پرونا سیکھے گی !
کاتنا بُننا سیکھے گی !
سُسرال جائے گی !
لڑکے جنے گی
سُہاگن جئے گی

میری نانی میری دادی کے برعکس میری ماں کی حمایت کرتی، اُس کے گھریلو کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتی اور سب کے بعد ماں کے ساتھ کھانا کھاتی۔ دال اور سبزی نہ بچتی تو وہ اچار، چٹنی، ملانجی (بھونے ہوئے آموں کا کھٹا میٹھا رس) سے روٹی کھا کر بھی خوش ہوتی۔ میری ماں کے ساتھ اُس کا رویہ میری دادی سے الگ تھا۔ ضرورت پر وہ بچوں کی گندگی تک دھو دیتی جب کہ میری دادی کسی ایسے کام کے لئے ماں کو بُلاتی، وہ بھاگی بھاگی نہ جاتی تو اُسے کھری کھوٹی سُناتی۔

باغوں میں مکھیوں اور مچھروں کی ریل پیل تھی۔ سرِ شام گیلی گھاس سُلگائی جاتی جو ساری رات دُھواں دیتی رہتی۔ مچھر اتنے زہریلے تھے کہ جہاں لڑتے، ددوڑے پڑ جاتے۔ ماں کو دودھ دوہنا ہوتا: وہ بھینس کو دھوئیں کے پاس لے آتی ورنہ بھینس اکھڑ جاتی۔ ماں کٹڑے کو ایک تھن دودھ چُونگھا کر اُسے پکڑ لیتی، بھینس کے آگے باندھ دیتی اور باقی سارا دودھ دوہ لیتی۔ کٹڑا 'ماں ماں' کرتا اپنی ماں کے تھنوں پر لپکتا لیکن رسّا چھوٹا ہونے کے کارن وہاں تک

پہنچ نہ سکتا۔ بھینس، کٹڑے کو چاٹتی جیسے اُس کی محرومی میں اُسے دلاسا دیتی۔ مَیں اُس کے ننھّے دِل کی زبان سمجھتا، اُسے پیار کرتا، ہمدردی جتاتا اور ماں سے ضد کرتا کہ وُہ اُسے اور دُودھ دے۔ وُہ مجھے طرح طرح سے سمجھاتی، "کٹڑا گھاس کھانے لگا ہے، اِسے اَور دُودھ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بھینس، کٹڑے کے لئے ہمیشہ دُودھ چُرا لیتی ہے اور وُہ دُودھ اُسی وقت اُتارتی ہے جب کٹڑا چونگھتا ہے۔"

لیکن مَیں ماں کی بات سمجھنے سے اِنکار کر دیتا اور اپنی بات پر اَڑا رہتا۔ میرا بس نہ چلتا، مَیں نانی ماں کی مدد لیتا۔ وُہ میری دِل جوئی کے لئے ماں کو مجبور کرتی اور کٹڑے کے لئے اَور دُودھ چھُڑوا دیتی۔ میری ماں مجھ سے کہتی، "تیرے حِصّے کا دُودھ کٹڑے کو دے دِیا ہے، تجھے رات کو دُودھ نہیں ملے گا۔"

اُس وقت مَیں خُوشی خُوشی مان جاتا لیکن جُوں ہی ماں دُودھ گرم کر کے اُس میں میٹھا مِلاتی، مَیں اپنا کٹورا لئے سب سے آگے ہوتا۔

توتے کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک توتا گھاں اُجاڑتا ہے، اَور وہاں توتوں کے غول تھے۔ اُن کو باغوں سے بھگانے کے لئے جیسے طریقے اِستعمال کئے جاتے تھے، قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ رہکلے چلائے جاتے تھے۔

۲۔ درختوں کے دو شاخوں میں خالی پیپے لٹکا رکھے تھے جو رسّیاں کھینچ کر بجائے جاتے تھے۔

۳۔ تھال بجائے جاتے تھے۔

۴۔ آوازے لگائے جاتے تھے۔

۵۔ ڈھیلے مارے جاتے تھے۔

لیکن توتے اِتنے ڈھیٹ تھے کہ 'ٹیں ٹیں، ٹیں ٹیں' کرتے یہاں سے اُڑتے وہاں جا بیٹھتے اور وہاں سے تہاں۔ آخر بھائیا جی نے توتے مارنے کی حِکمت لڑائی۔ وُہ توتے کے بِل پر نظر رکھتے، رات کو اُس میں ہاتھ ڈال کر اُسے پکڑ لیتے اور مار دیتے۔ جہاں کوئی بِل گہرا تھا، اُنہوں نے اُس میں ڈاٹ مار دیا اور یُوں باغوں کے بِلوں کے علاوہ قُرب و جوار کے بِلوں پر دھاوا بول دیا۔

رات کو سونے سے پہلے میری نانی کچھ پڑھ کر بچّوں پر پھُونکتی۔ مَیں پُوچھتا کہ وُہ کیا کرتی ہے تو وُہ کہتی، "بانی پڑھ کر پھُونک رہی ہُوں تاکہ اَلا بَلا دُور رہے!"

"نانی ماں! اَلا بَلا بچّوں ہی کے پاس کیوں آتی ہے؟" مَیں ڈر کر پُوچھتا۔

"بچّے معصوم ہوتے ہیں اور اپنی حِفاظت نہیں کر سکتے، اِس لئے۔"

"بچے معصوم کیوں ہوتے ہیں؟"

"تو زیادہ باتیں نہ بنا، چپ چاپ سو جا! ورنہ 'کوکو' پکڑ لے گی!"

اور میں ڈر کر چپ ہو جاتا لیکن کبھی کبھار پوچھتا، "نانی ماں! 'کوکو' کیا ہوتی ہے؟"

اوّل تو میری نانی ماں چپ رہتی، کبھی بولتی تو وہ "کوکو" کا نقشہ کچھ اِس طرح کا بیان کرتی۔ 'کوکو' بھینس کی طرح ہوتی ہے، بڑے بڑے سینگوں والی، بڑے بڑے پنکھوں والی۔ میں کئی بار خواب میں دیکھتا کہ ہماری بھینس کے پنکھ اُگ آئے ہیں اور وہ منہ کھولے مجھ پر منڈلا رہی ہے۔ میں اُس سے ڈر کر چلاتا اور کبھی بار بستر پر اُٹھ بیٹھتا جب تک کوئی نہ کوئی جاگ پڑتا، جو مجھے تھپک کر سُلا دیتا۔

باغ میں گھریلو کام کم تھے اور باہر کے کام زیادہ۔ میری نانی اور ماں ٹوکروں کے لئے جالیاں بُنتیں، بودو رام اور بنتا رام، شہتوت کی چھڑیوں سے ٹوکرے بناتے۔ باغ میں کوئی کام ایسا نہ تھا جس کا تعلق آموں سے نہ ہو۔ کوئی آم چگتا، کوئی آم ہلوتا (ٹہنی ہلا کر پھل گرانا)، کوئی پتے توڑتا، کوئی کھڑکا ہلاتا اور کوئی رہکلا چلاتا۔ ٹوکرے لگانے کا اہم کام بھائیا جی خود کرتے تھے۔ وہ ٹوکرے کی تہ میں بھرتی کا مال بھرتے اور اوپر بڑھیا قسم کے آم چُنتے، ٹوکرے کے منہ پر سیاہی مائل ہرے پتے بچھا کر جالی یوں کستے کہ سنہری اور سیندوری آم پتوں میں سے جھانکنے لگتے۔ میری نانی نے مجھے چھوٹا سا چھینکا بنا دیا تھا، جس میں تین چار آم آتے تھے۔ درختوں سے آم بھد بھد گرتے اور دور دور تک بکھر کرتے لیکن میں صرف وہی آم اکٹھے کرتا جو مجھے اچھے لگتے۔ سیندوری اور سیبی آم میری پسند تھے۔ میں سیندوری آم لے کر نانی ماں کے پاس جاتا اور اُسے گال سے لگا کر کہتا، "نانی ماں! آم زیادہ سیندوری ہیں کہ میرے گال؟"

"میرے راجہ بیٹا کے گال زیادہ سیندوری ہیں!" وہ خوشی سے میرا منہ چومتی اور کھل کر ہنستی۔

اُس خوبصورت ماحول میں کوئی شے بدصورت تھی تو وہ تھی میری بڑی پھوپھی۔ دُبلی پتلی، کھونڈی پھوپھی۔ اُس کی پنڈلیوں، رانوں اور باہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ شلوار گھٹنوں تک اُٹھا کر بیٹھتی تو گھٹنے کی پپنی اُس پھوڑے کی طرح نظر آتی جس کا منہ نہ نکلا ہو۔ اُسے ناس لینے کی لت تھی۔ وہ اپنا ہاتھ سدا ہُلاس دانی میں رکھتی تھی۔ اُس کے نتھنے اُن اُنگلیوں کی طرح گھناؤنے تھے جن سے وہ ہُلاس لیتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو دودھ پیتے پلّے کی طرح لپٹی رہتی تھی اور اُسے بھی ہُلاس کی چٹکی دیتی رہتی تھی۔

میرے کیسوں کا رنگ کرکتا تھا۔ میری نانی میرے کیس سنوارتی ہوئی کہتی، "بیٹا! تیرے کیس سونے کے ہیں!" کنگھے میں سے جتنے بال نکلتے، وہ اُن کی گتھی بنا کر مجھے دیتی اور رازدارانہ لہجے میں کہتی، "اِسے چھپا کر رکھ لے۔ تیرا بیاہ ہوگا تو تیری بیوی کے گہنے اِس سے بنوائیں گے۔"

میری معصومیت ! میں بالوں کی اُن گانٹھوں کو درختوں کی جڑوں میں چُھپاتا اور کبھی تکیوں کے اندر۔
کئی درخت آموں سے اِس قدر لدے ہُوئے تھے کہ اُن کی شاخیں ہاتھ کی پہنچ تک جُھکی ہُوئی تھیں۔
میں اُن سے پکّے آم توڑنے کی خواہش کرتا تو ماما جی مجھے کاندھوں پر اُٹھا لیتے۔ ڈوہک (تازہ توڑے آم کی ٹہر سے رِستا ہُوا رَس) سے میرے ہاتھ منہ زخمی ہو گئے تو ماما جی نے مجھ سے وُہ کھیل چھڑوا دیا۔
ساون آیا تو ٹپکے کا بھر پڑا۔ بھائیا جی نے جا کر بہی کھول لی۔ ننتا رام، شنکر کہار، داسُو باہتی اور کئی دُوسرے آم بطور جاکڑ لے جانے لگے۔ ٹپکے کے گڈّے امرتسر، جالندھر اور ہوشیار پور کو لادے جانے لگے۔ آموں کو کچلے جانے سے بچانے کے لئے، گڈّوں میں ٹوکرے رکھنے کے لئے ایک کے اُوپر ایک اور اُس کے اُوپر کئی خانے بنائے گئے۔ پانی اور ہوا اِکٹھے آتے تو اِتنے آم گرتے کہ درختوں کے نیچے دھرتی دکھائی نہ دیتی۔ ہوشیار پُور کے ندی نالے اپنے اُتار چڑھاؤ کے لئے مشہور ہیں۔ شہروں کو مال جانا بند ہو جاتا۔ اُس کساد بازاری سے مقامی گاہک فائدہ اُٹھاتے۔ آم دو طرح سے بکتے، جنس میں اور نقد میں۔ کئی گاہک آم خرید کر گھر لے جاتے اور کئی آب جُو کے کنارے بیٹھ کر چُوستے۔ آب جُو کا پانی گدلا ہو گیا تھا لیکن لوگ بہتے پانی کو صاف مانتے تھے اور اُسے اِستعمال کرنے سے گُریز نہ کرتے تھے۔ آب جُو کے کنارے گُٹھلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ٹپکے کا کچھ حصہ گِر کر پھٹ جاتا۔ شروع شروع میں جتنا ٹپکا پھٹتا، اُسے گھر کے لوگ چُوس لیتے۔ کسی کی گُٹھلی چٹّی (پُوری طرح چُسی ہُوئی گُٹھلی) نہ ہوتی تو بھائیا جی اُسے ڈانٹتے ڈپٹتے۔ ٹپکے کا بھر پڑا تو پھٹے ہُوئے ٹپکے کی تعداد میں اِضافہ ہو گیا، جیسے سستے داموں بیچا جاتا اور جو نہ بکتا اُس سے اَمرس بنا لیا جاتا۔
آموں کے ساتھ مہمان بھی کم ہُوئے اور پھر ماما جی کے سوائے سب چلے گئے۔ جب تک گُٹھلیاں پُھوٹ آئیں اور ماما جی نے میری خُوشی کا نیا سامان پیدا کر دیا۔ وُہ مجھے پپیّا بنا کر دیتے اور اِس احتیاط سے کہ اُس کا تاج جیسے کا ویسا رہتا۔ میں اُسے بجاتا ہُوا، اُس کے تاج پر نگاہ رکھتا اور پُھولا نہ سماتا۔ وُہ مسرّت بھرے دِن میری زِندگی کے مستانہ اور والہانہ دِن تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے بعد میں اُتنے اَلھڑ جذبات سے نہیں گُزرا ہُوں۔ میرے پپیّے کا تاج ٹُوٹ جاتا یا مرجھا جاتا تو ماما جی مجھے نیا پپیّا بنا دیتے۔ کوئی آرام سے بیٹھا ہوتا، میں چُپکے سے اُس کے پاس جاتا اور کان میں پپیّا پُھونک دیتا۔ وُہ گھبرا کر اُچھل پڑتا اور میں اپنی چالاکی اور شوخی پر ناز کرتا۔ ماما جی اپنا پپیّا سُر میں بجاتے تھے۔ مجھے شک ہوتا کہ اُنھوں نے اپنے لئے مجھ سے اچھا پپیّا بنایا ہے۔ میں اُن سے اُن کا پپیّا لے لیتا اور اُسے بھی بے سُرا ہی بجاتا۔ میں ماما جی کی دیکھا دیکھی گُٹھلی اُکھاڑ کر پپیّا بنانے کی کوشش کرتا۔ وُہ مجھے ڈراتے، "اِن میں سپولیے ہوتے ہیں! اِن کے پاس مت جایا کرو۔"
لیکن میری آرزو بھری تلاش! جُوں ہی میرا داؤ لگتا، میں گُٹھلی اُکھاڑ لاتا اور اُس کا چھلکا اُتار کر اُسے اینٹ پر رگڑنے لگتا۔ میں پپیّا بنا لیتا لیکن وُہ پُھونکنے پر بِتھر سا رہتا۔

کوئی ہے! جس نے کوئل کی سُریلی آواز سے لُطف نہیں اُٹھایا ہے اور وقتی طور پر اپنے آپ کو اُس کا ہم نوا ثابت کرنے کا جتن نہیں کیا ہے! چوں کہ کوئل کا نغمہ، مُطربِ وقت کا سنوارا ہُوا ہے اُس کے سرُود میں ابدی سُرور ہے جس کی مستی کے سامنے مے خانۂ عشرت بے معنی ہے۔

چوں کہ کوئل میری پیاری تھی اِس لیے مَیں کوئل پادے آم اکٹھے کیا کرتا تھا۔ وہ کھٹے ہوتے تھے لیکن مجھے میٹھے لگتے تھے۔ ماماجی کی طرح مَیں بھی کوئل کا حریف تھا۔ ہماری "تُواو، تُواو" کی باہمی جنگ سویرے بیدار ہوتے ہی شروع ہو جاتی اور رات کو بستر پر دراز ہونے تک چلتی۔ کوئل چُپ ہوتی، ماماجی اُسے اُکساتے، کوئلے تیرا کاں (کوّا) مرے تو رنڈی ہو، تُو او۔ وہ چپ رہتی، ماماجی اُسے دوبارہ اُکساتے اور کئی بار سہ بارہ۔ کوئل مَون توڑتی اُس کی اوّل لَے نرم اور چھوٹی ہوتی جیسے وُہ بد دُعا سے سہم گئی ہو۔ پھر اُس کی ہر مُکرّر لَے اُونچی اور سُریلی ہوتی جاتی، تُو او، تُواوو، تُوووا و وو، تُووووو اووو۔

اُس انوکھی جنگ میں کئی بار ماماجی جان بُوجھ کر ہار جاتے، اُس وقت کوئل کی گرم جوشی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ میری ماں اُس جنگ سے لُطف اُٹھاتی اور ماماجی کی حمایت میں کوئل کو ہدایت کرتی، "کوئلے، رنڈی اے، چُپ ہو جا! ایسا نہ ہو کہ بولتے بولتے تُو مر جائے اور اُلٹا کاں رنڈا ہو جائے!"

عدالت یار کوئل کے اِس عجیب و غریب مزاج کی تفسیر اپنے ڈھنگ سے بیان کرتا تھا۔ "علمِ موسیقی کے مُوجدوں نے پنچم سُر، کوئل سے سیکھا تھا۔ کیوں کہ یہ اُسے کوئل کی سی نفاست سے نہیں گا سکتے، وُہ اِن کی نا اہلی اور بے آہنگی پر برہم ہوتی ہے اور طعنہ دیتی ہے، تُم گنوار ہو۔"

سب درخت آموں سے خالی ہو گئے لیکن باغ کے مشرق میں ایک بھدواڑہ (وُہ آم جو بھادوں میں پکتا ہو) آم تھا جو ویسے ہی لدا ہُوا تھا۔ آم ذرا گدرائے تو بھائیاجی نے اُنہیں تُڑوا کر پال ڈال لی اور پھر اُن کو 'پال کے لڈّو' کہہ کر بیچنے لگے۔

باب ۴

بُود جس سے نمُود تک پہنچی
کربِ تخلیق کی ہے رعنائی (شاطر)

مَیں اُسے جدّت پسندی کہوں گا جس نے مُجھے پہلے روندو پھر گُونگے اور پھر ہکلے کا نام دیا۔ بڑے چھوٹے بے لحاظ و بے تمیز میری نقل اُتارتے گویا مجھے کُھنڈی چھری سے کاٹتے۔ مَیں اُن کی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لیتا اور برہم ہو کر بال نوچتا، ایڑیاں رگڑتا، سر پٹکتا اور روتا۔ میری زُود رنجی اور چڑچڑاہٹ پیدائشی تھی میرے

ستانے والے میری بے کسی سے فائدہ اُٹھاتے اور مجھے چڑا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھتے۔

ہمارے گھر سے کچھ ہی دُور عدالت یار کی حویلی تھی جو گھنے درختوں میں گھری ہُوئی پُر اسرار لگتی تھی۔ اُس سے بڑھ کر پُر اسرار چیز تھی نغمے اور ساز کی لے، جو حقیقت میں موجِ مے تھی۔ وہ اُڑتی ہُوئی مستی، میری رگوں میں سرایت کرتی اور مجھے مدہوش بنا دیتی۔ ایک شام میں اسی مدہوشی کی حالت میں عدالت یار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر وہ گاتے گاتے چپ ہو گیا اور پردے پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"تُم کون ہو؟" اُس نے مُسکرا کر حیرت سے پُوچھا۔

"گیان!" اپنے نام کے پہلے حرف میں اُلجھتے اُلجھتے بچتے ہُوئے میں نے جواب دیا۔

"تُم یہاں کیوں آئے ہو؟"

وہ آگے جھک کر مُسکرایا۔

"گ گانا سُننے"۔

میں گ میں اُلجھتے اُلجھتے بچا۔

"تمھیں گانا آتا ہے؟"

اُس کی مُسکراہٹ میں مہک سی بس گئی۔

"نہ نہ نہ نہیں!"

میں ہکلایا اور محسُوس کیا کہ میرا سارا خُون گالوں میں دوڑ آیا ہے۔

"تُم میرے ساتھ گاؤ گے؟"

اُس نے ساز چھیڑ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"٥٥٥٥٥٥ ہاں"

میری کھلبلی میری ہکلاہٹ کو جھن جھناہٹ تک بڑھا گئی۔

"خُوب، گاؤ!"

اُس کا لہجہ تان سے معمُور تھا۔

مجھے دعوتِ نغمہ دے کر وہ جگّا (پنجابی لوک گیت) کی طرز میں سُروں کو چھیڑنے لگا اور گاتے ہُوئے میری آنکھوں میں تاکنے لگا۔ وہ گا رہا تھا اور میں خاموش سُن رہا تھا۔ وہ گھڑی آفاقی گھڑی تھی! عدالت یار کے گیت کی لے میرے روم روم سے ہوتی ہُوئی میری رگوں میں جذب ہو رہی تھی۔ پہلا انترہ وہ بار بار دُہرا رہا تھا اور گاہے گاہے رُک کر مجھے گانے پر اُکسا رہا تھا۔ میں الفاظ زبان پر نہ لا پا رہا تھا لیکن میری کوشش سے میرے اندر خروش پیدا ہو رہا تھا۔

مَیں چُپ تھا لیکن میری رگیں بول رہی تھیں، اُس لَے پر تھرک رہی تھیں جو مُحرِک تھی لیکن متحرک نہ تھی۔ میری زبان میں وُہ بے قراری تھی جو کسی ثابِت کے سیّار بننے سے پہلے اُس کے اجزا میں مَوجزن ہوتی ہوگی۔ زبان پر حروف پھیل رہے تھے جیسے اپنی گہرائی و گیرائی کا جائزہ دے رہے ہوں۔ حُروف زِندہ تھے اور مَیں اُنہیں سانس لیتے ہُوئے محسُوس کر رہا تھا۔ اُن کا وجُود انوکھا مَظہر تھا! میں اُنہیں صوت و معنی سے پہچان رہا تھا۔ میری خاموشی حرفوں کی قوّتِ گُفتار کی حامِل تھی جِسے میرے تحت الشعُور کی تائید حاصِل تھی۔ وُہ اُسی تائید کی تصدیق تھی کہ مَیں عدالت یار کے ساتھ گانے لگا۔

مَیں جگّا گاتا ہوا وہاں سے نِکلا تو ہر کوئی مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مَیں اپنی دھُن میں گا رہا تھا اور گائے جا رہا تھا۔ جگّا گانا میرا معمُول ہوگیا۔ میری نانی ماں جِس دن سویرے میرے گانے کی آواز نہ سُنتی، مجھے دیکھنے چلی آتی۔ وُہ گُمان کرتی کہ مَیں بیمار ہوں۔ میرے پُرانے نام حرفِ مُہمل کی طرح مِٹ گئے اور مَیں جگّا کے نئے نام سے مشہور ہوگیا۔

یہ تغیّر میری زِندگی میں دُوسرا بڑا تغیّر تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو مَیں اُس انوکھے کیڑے کی طرح ہوتا جِسے حالات کے چمتکار نے اِنسان بنا دیا ہو لیکن اُسے زبان کے ہدیے سے نہ نوازا ہو۔

پہلے مَیں نے عدالت یار کو دیکھا نہ تھا۔ اُس دِن سے مَیں اُسے روز دیکھنے لگا اور کئی کئی بار مِلنے لگا۔ ہماری دوستی ہوگئی، نِرالی دوستی! وُہ اٹھائیس تیس کا جوان سال اور مَیں تین چار برس کا نونہال۔ وُہ جہاں مِلتا، مَیں ہُمکتا ہُوا اُس کی جانب لپکتا۔ وُہ آگے بڑھ کر مجھے باہوں سے اُٹھاتا، اُوپر اُچھالتا، مَیں نیچے گرنے لگتا تو مجھے تھام کر گلے سے لگا لیتا۔ اُسے کوئی کام نہ ہوتا، وُہ مجھے حویلی میں لے جاتا اور گانا سکھاتا۔ سنگیت سے میری زبان کی ہم آہنگی! مَیں جو کچھ سُنتا اُسے سُنتے ہی دُوہراتا اور بالکل ٹھیک طرز میں۔ عدالت یار کڑیل جوان تھا۔ اُس کے گٹھیلے پٹھے تاروں سے گُوندھے ہُوئے لگتے تھے۔ اُس کی مٹّی کی خُوبی! اُس کے سخت و کرخت اعضا کی تاثیر نرم و نازک تھی۔ اُس کی آنکھوں میں محبّت کی روشنی، ہونٹوں پر مُسکراہٹ کی تازگی اور زبان میں نغمے کی دِلکشی تھی۔ اُس کی سادھارن سی بات کانوں میں رس گھول کر رگ رگ دپے کی لذّت بن جاتی تھی۔ وُہ اپنی خوش مزاجی اور فیّاضی کی وجہ سے گاؤں والوں کا لاڈلا اور بچّوں کا پیارا تھا۔ اُس کی بانسری کی دُھن، اُس کے کھیتوں کو جانے یا کھیتوں سے لوٹنے کی خُوش خبری ہوتی تھی۔ بچّے اُسے کھیتوں سے لوٹتا دیکھ کر کھیلنا چھوڑ دیتے اور اُس سے لِپٹ جاتے۔ وُہ اِسے کاندھے پر اُٹھاتا اور اُسے باہوں میں، باقی اُس کے ساتھ رگڑ کھاتے ہُوئے چلتے اور مُنہ کی طرف دیکھتے جیسے کسی رِعایت کے خواہش مند ہوں۔ وُہ اُن کے پاؤں سے پاؤں بچاتا ہولے ہولے چلتا اور مویشیوں کو طویلے میں ہانک کر اُن کی طرف دھیان دیتا اور ہر کسی کی جیب جنگلی پھلوں سے بھر دیتا۔ اُن کا موسم نہ ہوتا تو وُہ دہقانی تُحفے بانٹتا جیسے گنڈیریاں، مُونگ پھلیاں وغیرہ۔ کوئی اُس سے پُوچھتا کہ وُہ سب کچھ کہاں سے لاتا ہے تو وُہ مُسکرا کر کہتا، "میرے پاس کام دِھینو ہے!" (کام دِھینو، دیوتاؤں کی ایک گائے جو مانگنے پر ہر اِچھا پُوری کرتی ہے)

گیت میری گرمیِ آواز بننے لگے۔ میری ہکلاہٹ گھٹنے اور خود اعتمادی بڑھنے لگی۔ میں گیت گاتا تو لگتا کہ وقت جھولا جھلا رہا ہے۔ میں سوچتا کہ میں اسی کام کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میں اپنے آپ کو ممتاز گویا سمجھتا۔ میری رسائی اڑوسیوں پڑوسیوں سے بڑھ کر دوسرے گھروں تک ہو گئی۔ میں بڑی بوڑھیوں، خاص کر لڑکیوں کا چہیتا تھا۔ وہ میرے چُمّے لیتیں اور مجھے آغوش میں بھینچ کر پیار کرتیں لیکن وہ سب مجھے اچھا نہ لگتا۔ مجھے یہی اچھا لگتا کہ میں گاتا رہوں اور کوئی سنتا رہے۔ میرے گیتوں سے تنگ آ کر میری ماں مجھے پچکار کر کہتی، "اچھا بیٹا! باہر دور جا کر گا!"

"لیکن وہاں میرا گیت سننے کا کون؟" میں بے اختیار کہتا۔

میری معصوم خود روی میری ماں کو لاجواب کر دیتی اور وہ خوشی سے میرا منہ چوم لیتی۔

انہی دنوں کسی نے مجھے یہ بولی یاد کروادی،

کھٹن گیا کھٹ موں گیا تاں کھٹ کے لیا یا بتاشا

ہوٹی اوہ لینی جہدے ٹِڈھ وچ بولے کاکا

(کوئی کمانے کے لئے گیا اور بتاشا کما کر لایا۔ میں اس سے بیاہ کروں گا جس کے پیٹ میں کاکا بولتا ہو)

کئی بڑی بوڑھیاں مجھ سے سفارش کر کے یہ بولی سنتیں اور پھر پیٹ پکڑ کر ہنستیں۔ میں نے اس بولی کو تب تک گایا جب تک مجھے اس کا ارتھ نہ آیا۔

وقت کے ساتھ ہر چیز بدل رہی تھی، سنور رہی تھی لیکن دادی کی حالت بگڑ رہی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ اندھی ہو گئی تھی۔ ماں نے ویہڑے (صحن) کے ایک کونے میں پردہ کیا اور اسے دادی کی ذاتی حاجتوں کے لئے وقف کر دیا۔ وہ جنگل جانا پسند کرتی جس کے لئے اسے کسی کی اعانت درکار ہوتی جو اسے وقت پر نہ ملتی۔ ایک بار میں اسے باہر لے جا کر لایا۔ اس نے کمر کے گرد باندھی موئی لیر کی گانٹھ میں سے ایک ڈبل پیسہ نکال کر مجھے دیا اور اپنے پاس کھینچ کر آہستہ سے کہا۔ "جگیا! تو مجھے ہر روز باہر لے جایا کر، اسی طرح! کوئی دوسرا میرے ساتھ آتا ہے تو وہ چپ گڑپ رہتا ہے اور میری اندھی آنکھوں کا اندھیرا ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔"

اس دن سے میں اس کی روشنی اور لاٹھی ہو گیا۔ وہ چارپائی سے ایسے اٹھتی جیسے گزری ہوئی زندگی کا سارا بوجھ اس کی ٹانگوں پر ہو۔ وہ آہ بھرتی اور پوپلے منہ سے توتلی آواز میں گاتی۔

پپّل دیا پتیا توں کی کھڑ کھڑ لائی!

پت پرانے جھڑ گئے رُت نمیاں دی آئی

(اے پیپل کے پتے تو کیا کھڑکھڑ شور مچا رہا ہے! پرانے پتے جھڑ گئے ہیں اور اب نئے پتے پھوٹنے کی رت ہے)

وہ ایک پہیلی بجھوایا کرتی تھی، میں آپ کو بجھواتا ہوں۔

کاچے پُھتے ساؤنے، گدریں اور مٹھائیں
اے سکھی وُہ پھل کون سے جو پاکے کڑوائیں؟

وُہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی میرے پیچھے کمزور کمزور چلتی۔ مَیں گیت گاتا ہُوا، اُسے راستے کے اُتار چڑھاؤ بتاتا ہُوا جنگل پھرا کر لاتا۔ مجھے اپنی خدمت کا صِلہ اُس کے چُمّے کی شکل میں مِلتا جو ٹھنڈا، کھُردرا اور گھناؤنا ہوتا۔ اُس کے بے نُور چہرے پر بے رنگ خط و خال ایسے لگتے جیسے ویرانے میں شکستہ آئینے کے ٹکڑے پڑے ہوں۔ اُس کا ماس ہڈیوں سے لٹک رہا تھا اور پھٹے پُرانے کپڑے کی طرح چُرسا ہُوا تھا۔ وُہ مجھے بُرا لگتا۔ مَیں اُس کی باچھیں پکڑ کر ماس کو پیچھے گردن کی طرف کھینچتا، شکن در شکن ماس کھِچ کر کچھ سنور جاتا۔ مَیں خُوش ہو کر اُسے سمجھا دیتا، "دادی ماں! تُم اپنے ماس کو یُوں ہی پکڑ کر رکھا کرو۔ تُم یُوں سُندر لگتی ہو۔"

وُہ اپنی جھُریوں کو بے اِختیار چھُوتی جیسے کسی کے یاد کروانے سے کوئی اپنی بھُولی ہُوئی قیمتی چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھے اور اُسے موجُود پا کر مطمئن محسُوس کرے۔ وُہ میرا ہاتھ چُوم کر فخر سے کہتی "ننھے! یہ جھُریاں نہیں، میرے بڑھاپے کے گہنے ہیں۔"

دادی کی جھُریوں کو گنجِ گراں مایۂ فطرت سمجھیں تو وُہ واقعی گہنے تھے، کہیں سنکھ، کہیں کوڑیاں، کہیں سیپ اور کہیں گھونگے۔

اُس کی توتلی ہنسی اور بے ربط آواز سے گمان ہوتا کہ کوئی بچّہ، بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُس کا منہ خالی آٹے کی طرح تھا جیسے وُہ ہر وقت ہلاتی رہتی اور کچھ کھاتی لگتی۔

"دادی ماں! تُم کیا کھاتی رہتی ہو۔" ایک بار مَیں نے اُس سے پُوچھا۔

"اپنی عُمر!" اُس نے گہرا سانس لے کر کہا، گویا وُہ اُس کی عُمر کا نِوالہ تھا۔ اُس کے منہ کے ساتھ جھُریاں ہل کر ایسے ٹھہر گئیں جیسے ہزاروں ہونٹوں نے بریک زبان اُس کے انوکھے بیان کی تصدیق کی ہو۔

میری دادی کبھی کبھار اُن دِنوں کی باتیں سُناتی جب وُہ جوان تھی اور سارے کام پھُرتی اور خُوبصورتی سے کرتی تھی۔ اُس وقت قیاس ہوتا کہ کوئی زوال اپنے پامال کمال پر فخر کرتا ہے جو کسی وقت اُس کی عظمت کی شوکت تھی اور خُودداری کی رواداری۔ اُس کے چہرے پر مسرت آمیز حسرت دِکھائی دیتی جو اِس احساس کو ظاہر کرتی کہ اُس نے اپنی بُلندی کی پستی بڑی بے بسی اور افسردگی سے دیکھی ہے۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وُہ اُس دُنیا میں پھِر سے لوٹ جاتی جس سے بے رحم وقت نے اُسے مِٹانے کے لئے جُدا کیا تھا۔

اپنے اکیلے پن میں وُہ تنہائی سے بھی تنہا ہوتی جسے آباد کرنے کے لئے وُہ آہیں بھرتی یا اپنے آپ سے باتیں کرتی۔ چھوٹے بچّوں کو کہانی کا لالچ دے کر وُہ اُنہیں اپنے گِرد اکٹھا کر لیتی اور کہانی سُناتی نئے چہروں میں پُرانا چہرہ،

پھولوں بھری کیاری میں ڈنٹھل دکھائی پڑتا جیسے مالی کا سُگھڑ ہاتھ اُکھاڑنا بھول جائے۔

میرا خیال ہے کہ دادی ماں کی کہانیوں میں سے کوئی ایک کہانی بیان کرنا اُچت (برمحل) ہوگا۔

"ایک ماں کے دو بیٹے تھے۔ وُہ بوڑھی ہوگئی اور اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہ رہی۔ ایک دِن اُس نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا، بیٹا! مَیں نے کئی دِن سے اشنان نہیں کیا، مجھے اشنان کرواؤ!"

"بڑا بیٹا اکھڑ مزاج تھا اور بات بے بات ماں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ اُس نے پانی کا کڑاہا اُبالا اور ماں کو اُس میں ڈال دیا۔ وُہ بے چاری جلنے لگی اور بچاؤ بچاؤ کی دہائی دینے لگی۔ اُس کے چھوٹے بیٹے نے اُس کا واویلا سُنا، اُسے کھولتے پانی میں سے نکالا، اُس پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور اُس کی آگ کو بجھایا۔ اُس نے بڑے بیٹے کو سراپ دے دیا جیسے تُو نے مجھے جلایا ہے، بھگوان کرے تو رہتی دُنیا تک جلتا رہے۔"

"اُن دِنوں ست جگ کا زمانہ تھا اور بھگوان ہر دُکھی دِل کی فریاد سُنتا تھا، اُس نے دُکھی ماں کے ظالم بیٹے کو سُورج بنا دیا۔"

"اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو آشیرواد دی۔ تُو نے مجھ دُکھیاری کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔ بھگوان تجھے جُگا جُگ ٹھنڈا رکھے۔"

"بھگوان نے اُس کے رحم دِل بیٹے کو چاند بنا دیا۔"

"دادی ماں! پھر تارے کیسے بنے؟" اُس کے نصیحت آموز جھوٹ پر حیران ہو کر ایک بار مَیں نے پُوچھا۔

"جو لوگ بھگوان کے سچّے بھگت ہوتے ہیں وُہ تارے بنتے ہیں۔"

اُس کا اندازِ بیان اِتنا پُر اعتماد تھا جیسے عرش و فرش کے سارے رُموز اُسی کے دِل میں ہوں۔ وُہ کہا کرتی تھی کہ دھروُو (قطبی سِتارہ) سب سے بڑا بھگت ہُوا ہے اور اُس کے بعد سپت رِشی (سات تارے، مریچ، اُتر، پُلہا، پُل ستیہ، رِتُو، انگیرا، وشِشٹھ)۔ دھروُو کی پدوی اِتنی بڑی ہے کہ سارا برہمنڈ (نظامِ شمسی) اُس کی پریکرما (طواف) کر رہا ہے۔

اُس کی بات سُن کر مَیں تصوّر کرتا کہ مَیں دھروُو سے بھی بڑا بھگت بنُوں گا اور پھر بھگوان سے بر مانگوں گا کہ میری پدوی اِتنی بڑی ہو کہ برہمنڈ کے ساتھ دھروُو بھی میری پریکرما کرے۔

گاؤں میں لودے (چیچک کے ٹیکے) ہُوئے۔ زیادہ تر لوگ بچّوں کو لے کر کھیتوں کو بھاگ گئے۔ وُہ لوگ لودے کروانے کو بیماری مول لینا خیال کرتے تھے اور اُن کی افادیت سے یکسر منکر تھے۔ وُہ کسی چیز کے قائل تھے تو جڑی بوٹی اور ٹونے ٹوٹکے کے۔ وُہ اُن کی ان دیکھی طاقت پر بھروسہ کرتے تھے اور لودوں پر نکتہ چینی۔ "ایک

بیماری دوسری بیماری کو جنم دے سکتی ہے، اُسے مارنی تھوڑا ہی ہے۔"
"ڈاکٹر منتر نہیں پڑھتے، سوئیاں چبھوتے ہیں۔ ایک بار چبھوئی ہوئی سوئی کا اثر عمر بھر کے لئے کیوں کر کافی ہو سکتا ہے!"

وباؤں کی روک تھام کے لئے اکھنڈ پاٹھ اور ہون ہوتے تھے یا ٹونے ٹوٹکے۔ اپنے تحفظ کے لئے لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ وبا کی روک تھام کا ایک طریقہ اور تھا، قربانی! لیکن وبائیں آتی تھیں اور اپنا حصہ لے جاتی تھیں۔

تایا جی دقیانوسی خیالوں کی تردید کرتے تھے اور زندگی کو نئی روشنی کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے پرکاش کور کے حوالے کیا تاکہ وہ مجھے لودے کروا لائے۔ ہمیں راستے میں کمل کور مل گئی اور ہم تینوں رمضان کی حویلی کی طرف چل پڑے جہاں لودے ہو رہے تھے۔ اُدھر سے سویک سنگھ آتا ملا، جو لودوں کے درد سے بلبلا رہا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر میں اڑیل ٹٹو کی طرح پیچھے قدم لینے لگا۔ پرکاش کور نے مجھے لاڈ لڈا کر کہا، "میرے اچھے بیر! تو کیوں ڈرتا ہے؟ تجھے تو وہاں جگا سنانا ہے!"

پھر کیا تھا! میں خوشبو کی طرح تھا جسے اُڑنے کے لئے جھونکے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں حویلی کی طرف بھاگا اور اپنی ساتھنوں سے پہلے لودے کرنے والوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور میرا نام پوچھنے لگے۔ اتنے میں پرکاش کور اور کمل کور آ گئیں۔ "اِن کو جگا سنا دے!"

اور میں اگلی گھڑی کے عذاب سے بے خبر جگا گانے لگا۔

جگا جمیا تاں ملن ودھائیاں
بڑا ہو کے ڈاکے ماردا
جگیا! ہائے، اُوئی نی ماں لے لا!

میں گودنے کے درد سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ پرکاش کور مجھے نہ سنبھالتی تو میں ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ وہ مجھے روتا ہوا اُٹھا کر گھر میں لائی۔ چوں کہ اُس نے مجھ سے دھوکا کیا تھا، میں اُس سے رُوٹھ گیا جو اُس پر گراں گزرا۔ وہ میری تائیری بہن ہی سہی، حقیقی سے پیاری تھی۔ ہم دونوں ماں کو ستانے کے لئے کیسے کھیل کھیلتے تھے! میں دیر تک گھر میں نہ پہنچتا، ماں کو میرے بارے میں تشویش ہوتی، وہ مجھے ڈھونڈھتی اور گلیوں میں آوازے لگاتی۔ میں اُس کی پریشانی سے متاثر ہو کر گھر جانے کے لئے کہتا۔ پرکاش منہ بسور لیتی۔ مجھے اُس کی دل جوئی منظور ہوتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ماں تھک کر چپ ہو جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد پرکاش مجھے کاندھے سے لگائے ماں کے پاس جاتی اور میں سازش کے مطابق گھیسلا (ہوش رکھتے ہوئے بے ہوش ظاہر کرنا) رہتا۔ وہ معصومیت کی دیوی بن کر ماں کو یقین دلاتی، "چاچی جی!

چنگا میرے گھر میں بے سُدھ سویا پڑا تھا۔ میں اندر گئی، اِسے دیکھا اور اُٹھا کر لائی ہوں!"

پرکاش کور نے مجھے منانے کے لئے کیا کیا جتن کئے! میرے لئے کھدّو (سوت کا گیند) بنائی اور اُس کے گرد موٹے دھاگے سے جالی ڈالی، کروشئے سے سفید ٹسر کی بنیان بُنی لیکن اُس کا حاشیہ نیل گوں رکھا۔ وہ یوں نہ بھی کرتی تو کیا فرق پڑتا! معصوم دِل کے رُوٹھنے اور منّنے میں دیر ہی کہاں ہوتی ہے! وہ ایک گھڑی میں رو دیتے ہیں تو ایک گدگدی میں ہنس پڑتے ہیں۔

لودے لال ہُوئے اور بانہہ سُوج گئی اور ہِلانے سے ٹُوٹنے لگتی۔ میں بُخار اور درد سے نڈھال رہتا۔ مجھے بہلانے کے لئے پرکاش کور مجھے کاندھے سے لگائے گھومتی، وہ تھک جاتی تو سورن کور مجھے سنبھالتی۔ میری ہر آہ پر وہ مجھے دِلاسا دیتی اور لوری سُناتی۔ وہ گاتی رہتی تو بانہہ کا درد غائب رہتا لیکن وہ جُوں ہی چُپ ہوتی، درد نئی تُندی سے لوٹ آتا۔ میں اُسے گاتے رہنے پر مجبور کرتا اور اپنے پاس سے ہلنے نہ دیتا۔ اُس کا میلانِ خاطر! وہ مجھے اپنے ساتھ اٹھائے گھومتی جیسے میں اُس کا ٹُوٹا ہُوا انگ تھا۔ اُس کا سارا وقت میری خِدمت گزاری میں صَرف ہوتا۔ وہ گرم گیلے کپڑے سے میرا بدن پُونچھتی، مجھے چارپائی پر لِٹا کر میرے کیس دھوتی، کنگھی کرتی، جُوڑا باندھتی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کِھلاتی۔ وہ لودوں کے گِرد کُھجلاتی، جِس سے مجھے آرام مِلتا۔ اُس کی بے آرامی میں میرا آرام تھا اور اُس کے دُکھ میں میرا سُکھ۔ میں سوتا تو وہ سوتی، میں جاگتا تو وہ جاگتی، مجھ سے پیاری پیاری، میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ مجھے نیند نہ آتی تو وہ میری آنکھیں مُوند کر نیند کو بُلاتی جیسے میری نیند، اُس کی سکھی سہیلی ہو۔

لودے بھر کر بہنے لگے۔ پرکاش مجھے دیوی دوالے لے گئی اور وہاں سے سُرخی لائی۔ وہ اُسے جادو کے طور پر لودوں پر چھِڑکتی اور بہتی ہُوئی پیپ پھاہے سے صاف کرتی۔ لودے سُوکھنے شروع ہوتے ہی سلسلانے لگے۔ میری بے چینی مجھے اُکساتی کہ میں اُنہیں کھجلاؤں اور کھجلاتا رہوں۔ وہ مجھے کھجلانے سے روکتی۔ میں اُتنی ہی دیر رُکتا جتنی دیر وہ مجھ پر نظر رکھتی پھر کھجلانے لگتا۔ میں کھرنڈ اُتارنے کی کوشش کرتا، وہ مجھے لاڈ سے سمجھاتی "کچّا کھرنڈ اُتارنے سے داغ پڑ جاتا ہے۔" کھرنڈ پک کر اُترے لیکن داغ چھوڑ گئے۔ مجھے غُسلِ صحت دینے سے پہلے اُس نے لیٹری سے میرا بدن صاف کیا۔ میں بنیان پہن کر اور کھدّو لے کر کھیلنے نِکلا تو نِرالی ترنگ میں تھا۔ میرے ساتھی میری نئی چیزوں پر رشک کرتے اور انہیں ہاتھ لگا کر دیکھتے جیسے وہ آکاش سے اُتری ہوں۔ اِتنے میں دھیان سنگھ آیا۔ اُس نے مجھ سے دیکھنے کے لئے کھدّو لیا اور دیکھتے دیکھتے اُسے نالی میں گِرا دیا۔ میں نے غُصّے سے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اُس نے مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میں کِھدّو کے اُوپر جا کر گرا۔ میں روتا ہُوا اُٹھا تو وہ ہنس رہا تھا۔ میں اُس سے آنکھیں چُراتا ہُوا، روتا ہُوا گھر چلا آیا۔ میرا یہ رویّہ میری نامردی سے زیادہ اُس محرومی کا نتیجہ تھا جو میرے گرد کی بے رُخی سے میری تقدیر بنی ہوئی تھی۔

باب ۵

نہ جانے کتنے ہوئے اِس جہان میں شاطر
بساطِ زیست پہ سب اپنی اپنی چال چلے (شاطر)

میں سمجھتا ہوں کہ آگے لکھنے سے پہلے مجھے اپنے گھریلو ماحول کے بارے میں لکھنا چاہیئے تاکہ کوئی اُمید پرست میرے بے اعتبار لیل و نہار کو شک کی نظر سے نہ دیکھے۔

جس دِن سے میری ماں نے میرا دُودھ چھڑوایا، مجھے زِندگی کی ہر تفصیل یاد ہے۔ جو قارئین میرے بیان کو مبالغہ آرائی سے موسُوم کریں، اُن کی جانکاری کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ رنج و غم کی نفسیات، نشاط و مسرّت سے الگ ہے اور اُسی طرح اِن کے تاثُر۔ پہلے جتنے دائمی ہیں دوسرے اُتنے ہی وقتی۔

میرے بھائیا جی بُری قسم کے لڑاکے تھے اور بات بات پر پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ وُہ سیدھی سادھی بات بھی کرتے تو للکارتے لگتے۔ اُن کے کڑوے بول گھر میں ایسے بکھرے نظر آتے جیسے تازہ قتل کے بعد خُون کے دھبے۔ اُن کی موجُودگی میں گھر میں بولتے رَن کا سماں ہوتا تھا اور ہر شَے پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھلائی دیتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ زِندگی اُن کی زَد سے کیسے بچ نکلتی تھی؟ وُہ اپنے اکھڑپَن پر فخر کرتے تھے جیسے کوئی مُہذب اپنے تہذیبی وَرثے پر۔ میں اُس طرزِ حیات کا اِتنا عادی تھا کہ گھر میں ہنگامہ نہ ہوتا تو میں ہکّا بکّا در و دیوار کو تکتا اور بھائیا جی کے زِندہ ہونے پر شک کرتا۔ مجھے اپنے گھر سے شدید نفرت تھی! میں وہاں رہتا تھا تو اُس کی وجہ عجیب و غریب ہے۔ مجھے اُس مظلُومیت سے محبّت تھی جو وہاں کے باسیوں کی قسمت تھی۔ میرے بھائیا جی نے مجھے قصُور بے قصُور اِس بے دَردی سے پیٹا ہے کہ اُس کی یاد سے بدن کپکپانے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مہارانا سنگرام سنگھ کے جِسم پر جنگی زخموں کے اَسّی نشان تھے۔ میرے جِسم پر اَسّی نہ سہی! لاٹھیوں اور درانتیوں کے آٹھ نشان ضرور موجُود ہیں! سر پر، ماتھے پر، اُنگلیوں پر، پنڈلیوں پر، ٹخنوں پر۔ یہ داغ دیکھنے کو سطحی اور معمُولی ہیں لیکن اِن کی گہرائی خطرناک گھاٹیوں کی طرح ناقابلِ پیمائش ہے۔

میرے بھائیا جی مجھے بے ضرُورت پلّے کی طرح پیٹتے۔ میں وار بچانے کی کوشش کرتا تو اُن کا ہاتھ پُورا نہ پڑتا۔ اُس صورت میں اُن کا لپکنا جھپٹنا بڑھ جاتا۔ میں مار کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ وُہ میرا پیچھا کرتے، راستوں سے روڑے اور کھیتوں سے ڈھیلے اُٹھا کر مجھے مارتے۔ میری کسمپرسی سارا زمانہ دیکھتا لیکن کوئی بیچ بچاؤ نہ کرتا۔ میرے گِرنے اور ادھ مُوا ہونے تک اُن کا اُبال ٹھنڈا نہ ہوتا۔ وُہ اپنی بھڑاس نِکال کر چلتے بنتے لیکن میں مقامِ حادثہ پر دُکھوں کی گٹھڑی کی طرح پڑا رہتا۔ میں اپنے آپ سے عاجز سینے میں سر چھپائے روتا، روتا اور روتا۔ میرے آنسُو رُک

جاتے لیکن اُن کا سیلاب رگوں میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ اُن بے ڈھارس لمحوں میں مجھے اِنسانی رِشتے بے معنی لگتے اور دُنیاوی کاروبار فضول سی شے۔ اِنسانی زِندگی، جسے مذہبی فِراست میں انمول، قیمتی ۔ ۔ ۔ کہا جاتا ہے، اُس کا مقصد اور مطلب میری سمجھ میں نہ آتا۔

اپنی پستی میں آدمی اپنے مستقبل سے بے خبر ہوتا ہے اور بے تعلّق بھی۔ میری حالت مٹّی کے گیلے ڈھیلے کی سی ہوتی جو اپنے ہی بوجھ سے ٹوٹتا رہتا ہے۔ میرا لہو ٹھنڈا پڑ جاتا، میں برف کی طرح جمنے لگتا تو میری کپکپی میری جدوجہد بن جاتی۔ لیکن میری وہ سعی اُس ملعُون کی سی ہوتی جو اپنے گلے سڑے انگ کو کاٹ کر پھینکنے کے بجائے عزیز رکھے، اُس کی بدبُو میں مست رہے اور اُسے زِندگی سمجھے۔

میں نے درندوں کو اپنے پِلّوں سے کلول کرتے دیکھا ہے، خطرے کے لمحات میں اُن کی جائے اماں بدلتے دیکھا ہے، دُکھ درد میں اُنہیں چاٹتے دیکھا ہے اور اُن کے نقصان میں روتے۔ لیکن میرے بھائیا جی! لاڈ پیار تو دُور کی بات ہے، وہ نرم نگاہی کے لمس ہی سے بیگانہ تھے۔ میں اُس گھناؤنی گھٹن میں تڑپتا ہُوا سانس نہ لے سکتا جو اُن کی بدبخت قُربت کی پیداوار تھی۔ اُن کے جبر و ستم کے آگے میری ماں کی اِحتجاج سے خاموش دست برداری، میرے جنم کے گُناہوں کا بوجھ تھی جس نے مجھے دُور اندر تک کچل رکھا تھا۔ بھائیا جی کی آہٹ پا کر میں اندھیرے گوشے میں چھپ جاتا، اگر سامنا ہو ہی جاتا میں خوف سے کانپتا ہُوا اُس شے کے پیچھے چھُپنے کی کوشش کرتا جس کے پاس کھڑا ہوتا۔ میں چھُپ نہ سکتا تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا اور خود کو محفوظ سمجھتا۔ میرا یہ عمل اندھیرے میں رہنے والے کیڑے کا سا ہوتا جو روشنی دیکھنے سے اندھا ہو جاتا ہے۔ کئی بار یُوں بھی ہُوا کہ میں کانپتا کانپتا پیروں میں دھنس گیا جیسے پانی میں ریت۔ میری ماں میرے پاس نہ ہوتی تو مجھے لگتا کہ میرے جسم کا کوئی اہم حِصّہ غائب ہے۔

میں رات کو صحن میں ماں کے ساتھ لیٹا ہوتا۔ دِن بھر کی تھکی ماندی ماں میری ضد پر کوئی کہانی سُناتی اور سُناتی سُناتی سو جاتی۔ میں خاموش جاگتا رہتا اور آسمان کے دِل میں ٹکر ٹکر دیکھتا اور دادی ماں کی کہانیوں کی روشنی میں چاند ستاروں کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا۔ بھائیا جی دبے پاؤں آتے، ماں کو ہلا کر جگاتے اور کمرے کے اندھیرے میں گُم ہو جاتے۔ میں ڈر کر آنکھیں بند کر لیتا اور اپنے آپ میں کچھوے کی طرح سُکڑ جاتا۔ میری ماں میرے پاس سے اُٹھ کر کہیں چلی جاتی اور دیر کے بعد واپس آتی، جب تک میں سہما ہُوا کروٹ نہ بدلتا۔

گھر میں تقریب تھی اور کوئی چارپائی خالی نہ تھی۔ مجھے جگہ نہ ملی، میں نیند کی جھوک میں فرش پر سو گیا۔ جسے مجھ پر ترس آیا اُس نے مجھے فرش سے اُٹھا کر بھائیا جی کے ساتھ سُلا دیا۔ اُنہوں نے جب مجھے اپنے ساتھ لیٹے دیکھا، اُٹھا کر نیچے پٹخ دیا۔ رات کا سنّاٹا اور میرا واویلا! کیا ہُوا؟ کیا ہُوا؟ ایک شور برپا ہو گیا۔ جس کسی نے جو قیاس دوڑایا وہی سچ سمجھا۔ ماں نے مجھے کلیجے سے لگایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے درد کے گومڑے کو محسُوس اور دوپٹے

کا پھاہا بنا کر مُنہ کی بھاپ سے سینکا اَور مَیں کچھ شانت ہُوا۔ وہ حادثہ راز ہی میں رہتا اَور ہر کوئی یقین کر لیتا کہ مَیں چارپائی پر سے گر پڑا تھا۔ لیکن بھایا جی کے قہر و غضب میں شور و غُل کی مِلاوٹ اُن کی زِندگی کا وصف تھا۔ میری ڈھارس نہ بندھی تھی کہ اُنہوں نے سارے ہنگامے کو سُن کر دیا "اِس ذلیل پِلّے کو میرے ساتھ کس پاجی نے سُلایا تھا؟"

وہ نہ کِسی کو چاہتے تھے اَور نہ ہی کِسی کو پاس پھٹکنے دیتے تھے۔ اِس کے باوجود تمنّا کرتے تھے کہ ہر کوئی اُن کے ناز اُٹھائے اَور فرماں بردار رہے۔ اُن کے لفظوں میں وہ گھر والوں کے اَن داتا تھے۔ "مَیں نہ ہُوں تو تم سب بھُوکے مر جاؤ گے!"

ماں کوئی نئی چیز تیار کرتی اَور پہلے اُن سے جھُوٹی نہ کرواتی تو وہ اُسے نئے نئے طریقے سے ذلیل کرتے۔

"اُس بِستر کو ماں کے جہیز میں دینا ہے جو سنبھال کر رکھ لیا ہے؟"

"تُو نے وہ چیز بنائی تھی، بڑی جلدی ختم ہو گئی! اپنی بہن کے یار کو کھِلا دی کیا؟"

اُن کا نفیس جذبات سے وُہی رشتہ تھا جو ہیجڑے کا قُوّتِ باہ سے ہوتا ہے۔ اُن کو نرمی سے وُہی نسبت تھی جو سُوکھے ٹھنٹھ کو اُپج سے ہوتی ہے۔ اُن کی اَذیّت خواہی لا ثانی تھی اَور ہلاکت خیزی سے سازگاری لاثانی۔ اُن کے تناؤ میں سج سبھاؤ ہوتا تھا جو اپنے وقار میں کسی انجانی تہذیب کا پُرشکوہ انداز لگتا تھا۔ اپنی ظاہری مَن موہنی صُورت کے برعکس، وہ اپنے اَندر کراہت کی حد تک بدہیئت تھے۔ نہ اُنہیں اپنے کا پاس تھا اَور نہ پرائے کا لحاظ! میری ماں جن ذلیل شرطوں پر اُن کے ساتھ رہتی تھی، ممکن ہے رنڈی گریز کرتی۔

عورت کے بارے میں اُن کے خیال نرالے تھے،

عورت اَور زمین اُسی کی ہے جو اِس میں ہل چلاتا ہے اَور وقت آنے پر کھرا بیج بوتا ہے۔

"داسی، داس، پشو اَور ناری، سارے تاڑن کے ادھیکاری"

اُن کی فریب کاری! میری ماں کے سوائے وہ ہر عورت کو عزّت سے بُلاتے اَور اُس پر ڈورے ڈالتے لگتے۔ وہ باتیں جو عورت کی بھرپور تذلیل تھیں، اُنہیں کہاوتوں کی طرح یاد تھیں۔ کس گاؤں میں کون سی عورت اپنے لباس میں کیا سوغات چھُپائے ہے؟ اُنہیں ایسے علم تھا جیسے کھوجی کُتّے کو علم ہوتا ہے کہ کس جھاڑی میں سے کون سا شکار ملتا ہے۔ وہ کسی جوبن ماتی کو دیکھ لیتے تو بے اختیار کہتے، "تیار پڑی ہے"! وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے اَور ایسے سانس لیتے جیسے کوئی کِسی لذیذ چیز کو دیکھ کر للچائے اَور آبِ دہن نکلے۔

اُن کا بڑا بھائی ماڑا سنگھ مر گیا۔ اُس کی بیوہ ابھی سوگ ہی میں تھی کہ وہ اُسے جا پڑے اَور عین اُس وقت جب وہ نہانے کے لئے کپڑے اُتار چکی تھی۔ اُس نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر دُہائی دی لیکن اُسے کہیں سے کوئی مدد نہ ملی کیوں کہ بھایا جی اپنے لنگوٹیوں سے سازباز کئے ہُوئے تھے۔ اُس نازک حالت میں وہ اُن کے حملے سے کیسے بچی!

وہی بہتر جانتی ہے، ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اُسی گھڑی اپنے میکے چلی گئی اور کبھی لوٹ کر نہ آئی۔ میری ماں گھر میں رہتی۔ اُسے خبر ہوئی، وہ کنوئیں میں ڈوب مرنے کے لیے دوڑی، اُسے پنہاریوں نے نہ بچایا ہوتا تو کون جانے ہمارے گھر کا نقشہ کیا ہوتا؟

جہاں تک مجھ سے بن پڑتا، میں ماں کی مدد کرتا اور اُس کے اشارے کو حکم سمجھتا۔ لیکن میں اُس کے دُکھ میں سُکھ کا خیال کرتا تو مجھے ایک ہی حل نظر آتا، اِسے گھر سے بھاگ جانا چاہیے! ان کٹھور لمحوں میں میں ہر کسی کے انجام سے بیگانہ ہوتا۔ میرے جذبے کی شدت! ماں کی کوئی خوبی میری تنگ دلی کا حلقہ نہ توڑ سکتی اور وہ مجھے گھناؤنی لگتی۔ اُس کی اخلاقی خوبی سے کوئی الگ جذبہ ہوگا جس نے اُسے میرے کمینے باپ سے جُدا ہونے سے باز رکھا ہوا تھا۔

ہمارے گھریلو جھگڑے دُوسروں کی خوشی کا باعث ہوتے تھے۔ اُن کے اپنے گھروں میں لگ بھگ وہی حالات تھے لیکن وہ ہمارے عذاب میں فرار پاتے تھے۔ بوٹا سنگھ کے اپنے تینوں بیٹے اُس کی آنکھوں میں کانٹے تھے لیکن وہ ہمیں مشورہ دینے میں پیش پیش تھا۔ "تم اپنے باپ کو سلوتر خانے لے جاؤ اور خصّی کروا لاؤ۔ وہ بچے پال نہیں سکتا تو پیدا کیوں کرتا ہے؟"

شیر سنگھ اپنے اکیلے بیٹے کی صورت دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ وہ اِس دروازے سے اندر آتا اور شیر سنگھ اُس دروازے سے باہر چلا جاتا لیکن اُسے ہمارا غم تھا۔ "تمہارا باپ جس رفتار سے بچے پیدا کر رہا ہے، تمہارے حصّے فی کس ایک ایکڑ زمین نہ آئے گی۔ سوچو! تم گھر کہاں بناؤ گے؟ کاشت کہاں کرو گے؟ اپنے مستقبل کا خیال کرو اور اپنے باپ کا صفایا کر دو۔"

ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ مثالیں دیتا کہ فلاں گاؤں میں فلاں کے بیٹوں نے ایسا کیا ہے اور فلاں فلاں گاؤں میں فلاں کے بیٹوں نے۔

اُس کا یُوں ورغلانا میرے غم و غصّہ میں اضافہ کرتا، میری کدورت کو میرے باپ کے خلاف بھڑکاتا اور میں اُسے مار ڈالنے کے خیالی منصوبے بناتا۔

جاڑے کی کڑی راتیں ہوں یا طوفانی برساتیں، میرے بھائیا جی کسی بات پر میری ماں سے جھگڑتے اور اُسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے، میں روتا اور وہ مجھے اُس کے پیچھے ہانک دیتے۔ وہ جھپٹنے کے سے انداز میں مجھے اُٹھاتی، سینے سے لگاتی جیسے کلیجے میں رکھ لینا چاہتی ہو۔ وہ کچھ دیر رُکتی گویا انتظار کرتی کہ کوئی اُسے روک لے۔ اپنے کسی وہم سے گھبرا کر وہ مجھے اپنے ساتھ سختی سے بھینچتی، میں درد سے بلبلا اُٹھتا۔ وہ اپنی گرفت ڈھیلی کرتی، مجھے تشویش سے دیکھتی جیسے کہ اُس میں میرے کھوئے جانے کا اندیشہ ہو۔ ہمارے گھر کے ساتھ لگا ہُوا تایا جی کا پُرانا طویلہ تھا، گھر سے باہر جانے کا راستہ اُسی میں سے ہو کر جاتا تھا۔ دھتکاری ہوئی میری غریب ماں جُوں ہی وہاں سے گزرتی، تایا جی اُس کا راستہ

روک لیتے، مجھے اُس سے لے کر گود میں اُٹھاتے، اُسے دِلاسا دیتے اور مجھے پُچکارتے۔ اُن کی دِل داری سے اُس کی بے قراری بڑھ جاتی اور وُہ بے تحاشا روتی۔ اُس کی فُغاں سے میرے سکتے کا عالم ٹُوٹ جاتا اور مَیں بے طرح رونے لگتا۔ فرطِ گریہ سے ہر مُردہ شے میں جان پڑ جاتی اور مصرُوفِ فریاد نظر آتی۔ تایا جی ہمیں جیسے تیسے بہلاتے، کمرے میں بٹھاتے اور باہر چلے جاتے۔ اندھیرا کمرہ، کال کوٹھڑی لگتا۔ مَیں ڈر کر ماں کا دامن کھینچتا اور اُسے اپنی جانب راغب کرتا۔ وُہ اپنے غم سے بے حال میری حالت سے بے بہرہ ہوتی۔ کمرے کے اندھیرے میرے معصُوم وہموں کو اُبھارتے، اُنہیں ڈراؤنے ہیولوں میں بدل دیتے اور مَیں چیختا ہُوا ماں سے لپٹ جاتا۔ وُہ مجھے گود میں لیتی اور میری ڈھارس بندھاتی بندھاتی خود بھی سنبھل جاتی۔

تایا جی حویلی میں ہمارے کھانے کا اِنتظام کرتے۔ وُہ کنُویں سے پانی کی بالٹی بھر کر لاتے اور بکری کے چارے کا تسلا صاف کرتے۔ ماں اُن کے ہاتھ سے تسلا چھین لیتی، روٹی پکانے پر راضی نہ ہوتی، بس یہی رٹ لگاتی، "مجھے بھوک نہیں! مجھے مر جانے دیجئے، اِسی میں میرا سُکھ ہے!"

وُہ جیسے تیسے اُسے روٹی پکانے پر راضی کرتے۔ وُہ میری جانب دیکھتی، ٹھنڈی آہ بھرتی، تسلا مانجتی اور آٹا گوندھتی۔ تایا جی اِینٹیں کھڑی کر کے چُولہا بناتے اور پرال سے آگ جلاتے۔ ماں تسلے سے آٹا نکال کر چھاج میں رکھتی اور تسلا چُولہے پر اُلٹا رکھ کر روٹی پکاتی۔ تایا جی کسی چاٹی کا ڈھکن دھو کر اُس میں راب نکالتے، ٹوکرے میں سے پیاز لے کر توڑتے، دبا کر تیزاب نکالتے، چھیلتے اور پھاڑ کر ڈھکن کے کنارے پر رکھ دیتے۔ عین اُس وقت جب روٹی کی خُوشبو، رال بن کر ٹپکتی ہوتی، بھائیاں جی گرجتے ہُوئے آتے اور ماں پر لپکتے۔ وُہ چیخ مار کر پیروں پر ڈھیر ہو جاتی، تایا جی جہاں کے تہاں جم جاتے، حیران مویشی ناندوں سے پلٹ کر دیکھتے اور مَیں ہکّا بکّا آنکھیں پھاڑے۔ بھائیا جی تسلے کو ٹھوکر مارتے، جو جھن جھنا کر اُڑتا ہُوا دُور جا گرتا۔ وُہ چُولہے پر چھلانگ لگاتے اور اکانڈتانڈو ناچ (نفرت اور غصّے سے بھری ہُوئی حرکات جو آدمی خون خرابے کے دوران کرتا ہے) ناچتے۔ دھرتی دھپ دھپ کانپتی اور بھونچال آنے کا منظر پیش کرتی۔ گھاس پھُوس کی آگ پہلے ہی نیم مُردہ ہوتی ہے! راکھ کے ساتھ چند شرارے اُڑتے اور چُولہا ٹھنڈا پڑ جاتا۔

تایا جی افسردہ و رنجیدہ کھڑے وُہ خُونی تماشا دیکھتے۔ اُن کے روم روم سے وُہ آنسو ٹپکتے جو ان پڑتے جو اپنی تندی میں دراڑیں پھلانگ کر رگوں میں جذب ہو گئے ہوتے۔

"مانسا، تیرے کرم! مانسا، تیرے کرم!"

اُن کے چہرے کے تاثر اور آواز کے لہجے سے لگتا کہ وُہ نہایت مجبُور اور بے بس ہیں۔ اُن کا انداز کچھ اور گہرائی اختیار کر لیتا جب وُہ کہتے، "رتن سیاں، تُو مُعافی کے قابل نہیں! لیکن مَیں، تجھے مُعاف کرتا ہوں! مُعاف

کرتا ہوں!"

وہ مجھے گود میں اُٹھاتے اور پیار کرتے۔ مَیں اپنے آنسوؤں کی دُھند میں سے اُنہیں دیکھتا، وہ مجھے آب زدہ آئینہ سے نظر آتے۔ وہ کچھ دیر کشاں کشاں گھومتے اور پھر متانت کی نرمی میں نہا جاتے اور اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے۔ "محبّت وہ لطیف جذبہ ہے جو ہر بدصورتی کو خوبصورتی میں بدل دیتا ہے۔ کاش، تم اِس جذبے کو پہچانتے!"

"ظلم غیر فطری ہے اِس لئے وقتی طور پر پنپتا ہے۔ پھر یہ ظالم ہی کا پیچھا کرتا ہے اور زہریلے سانپ کی طرح اُسی کو ڈستا ہے۔"

"نفرت تو خیر نفرت ہے، حد سے زیادہ محبّت بھی اِنسان کو صحیح راستے سے بھٹکا دیتی ہے!"

تایا جی کی فراست اور جذبے کی نزاکت محض اُنہیں کی تسلّی ہوتی۔ بھائیا جی اُنہیں اُس درندے کی طرح دیکھتے جو گھریلو ماحول میں پلتا ہے اور پوری طرح خوں خوار نہیں بنتا ہے۔ اُن کی ہر ادا میری ماں کو یہ تنبیہ کرتی سُنائی پڑتی، "تو بھٹکے گی تو تجھے پھاڑ کر رکھ دوں گا۔"

تایا جی کی صبر آزمائی اور خوش اُمیدی! وہ ہماری بے کسی پر اُداس ہو کر آسمان کی جانب دیکھتے جیسے ہماری خوں چکاں فردِ حیات میں خوشی کا باب ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ مجھے کاندھے سے لگائے صحن میں گھومتے، دروازے کی زنجیر کو ہلاتے، بَیلوں کو تھپکتے، بچھڑوں کو سہلاتے، اُن سے اور مجھ سے بہ یک وقت مخاطب ہوتے، میری آنکھوں میں جھانکتے، مجھے گُدگُداتے، حتیٰ کہ مَیں ہنسنے پر مجبور ہو جاتا۔

شدّتِ غم سے جمی جمی سی میری ماں پگھلتی پگھلتی پگھل جاتی اور رونے لگتی۔ اُس کی فریاد میں دُعا کی سی اِلتجا ہوتی۔ درد بھری فریاد اندھیرے کو اور بھیانک بنا دیتی اور طویلا ماتم کدے کی طرح ہو نکتا۔ نالے اِتنے گہرے ہوتے کہ اپنا پُرسہ آپ لگتے۔ اندھیرا بڑھ جاتا اور میری ماں کو ایسے ہڑپ لیتا جیسے کوئی بھوکا دیو اپنے شکار کو۔ تایا جی سرسوں کے تیل کا چراغ جلاتے، اُس کی مدھم لَو میں میری ماں آہوں اور اشکوں کا مجسّمہ نظر آتی۔

اُس خوفناک خاموشی کو توڑنے اور ٹھہراؤ میں حرکت پیدا کرنے کے لئے تایا جی گرہنے (سَن کے پُولے) نکالتے۔ جاڑا ہوتا تو سلینگنیوں (سلینگنی، وہ چھڑی جس پر سے سَن اُتار لی گئی ہو) کی دُھونی جلا لیتے ورنہ ایندھن کے لئے رکھ دیتے اور کوئی داستان سُناتے۔ اُس داستان کا لڑکا غم و صعوبت کی زندگی گزارتا، دشمنوں سے لڑتا، حیرت انگیز طریقے سے موت کے مُنہ سے بچتا وہاں جا نکلتا جہاں نامعلوم رعایا اپنے نئے بادشاہ کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ وہ لڑکا، بے گھر اور بے سہارا لڑکا اچانک بادشاہ بنا دیا جاتا اور محل کے عیش و آرام میں بسا دیا جاتا۔ وہ اپنی رعایا کی حسین ترین لڑکی سے شادی کرتا اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرّم رہتا۔ اُس دردناک داستان کا خوش گوار انجام میرے تصوّر میں

اُمید کا جادو جگا دیتا اور میں تایا جی کے زانو پر سر رکھے خیال کرتا کہ میں وہی لڑکا ہوں جو آفتوں سے برسرِ پیکار ہے، لیکن اُس رعایا کی طرف بڑھ رہا ہے جسے اپنے نئے بادشاہ کا انتظار ہے۔

ایسے ابتر اور بے سمت حالات میں تایا جی میری ماں کو کئی طرح نصیحت کرتے، "بیٹیا، اُٹھ اور کوئی کام کر! کام دُکھ کے لئے دوا ہے اور سکھ کے لئے دُعا۔"

"میلے تن کے لئے صابن اور دُکھی من کے لئے کام کی اہمیت ایک سی ہے"

"کام انسانی زندگی کا جلال ہے! یہ مصیبت کے ہر اندھیرے کو نابود کرتا ہے۔"

ایک بار میری ماں نے تایا جی سے پوچھا۔ "بھائیا جی! میں اپنے گھر والے کے لئے وہ سب کچھ کرتی ہوں جو کر سکتی ہوں۔ بدلے میں مجھے ذلت کیوں ملتی ہے؟ میری محنت اور محبت کا اعتراف کیوں نہیں ہوتا؟"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے، "انسان کی فطری کمزوری ہے کہ اسے جہاں سے لگاتار ملتا ہے وہاں اِس کی توقع بڑھ جاتی ہے۔ اور توقع ایسا رذیل جذبہ ہے کہ یہ اپنی انتہا میں اپنے محسن کو ملیا میٹ کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اپنے محسن کی تذلیل اِس کی اِبتدائی صورت ہے۔ بھوکا بچہ پہلے شور مچاتا ہے، اگر دودھ کا سوتا بیچ ہی میں سوکھ جائے تو وہ اپنی لالسا، حرص میں اُسے کاٹ کھاتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائیا جی!"

ماں نے اُن کے بیان کی تصدیق ترنت کی جیسے اُسے ذاتی تجربہ ہو۔

تایا جی جتنے فیاض اور بردبار تھے، تائی اتنی ہی کمینی تھی اور ہٹی بھی۔ اُس کا زندگی سے رشتہ، چولہے سے گیلی لکڑی کا سا تھا جو نہ جلتی ہے، نہ چولہے کو گرماتی ہے اور نہ اپنے پاس بیٹھنے والے کو چین کا سانس لینے دیتی ہے۔ منہ سے پھول جھڑنا، یہ محاورہ کسی پر پورا اُترے کہ نہ اُترے لیکن تائی کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے منہ لگنا اپنا منہ چڑانا تھا۔ جیسے فطرت کا راز و نیاز خاموشی ہے ویسے ہی تایا جی کی صبر آزمائی تھی۔ وہ تائی کی جلی کٹی سنتے لیکن اُسے کچھ نہ کہتے، اُس کی بدتمیزی پر زیادہ دھیان دیتے تو اُٹھ کر کھیتوں کو چلے جاتے۔ وہ اپنے تیہے میں آپ مری جاتی اور اُن پر ملامت کرتی۔ "بالکل سانپ کی طرح ٹھنڈا ہے۔"

تائی جھگڑا سہیڑنے اور اُلاہنا دینے میں ثانی نہ رکھتی تھی۔ وہ اپنا کام جیسے تیسے نکال لیتی لیکن دوسرے کو وقت پڑنے پر اُس کی کانی اُنگلی پر نہ موتتی۔ وہ پڑوسیوں کی آنکھ بچا کر اُن کی بھڑولی (مٹی کا چولہا جو تنور سا ہوتا ہے لیکن اُس میں صرف اُپلے جلائے جاتے ہیں) میں سے دودھ چرا لیتی اور کاڑھنا (دودھ گرم کرنے کا مٹی کا برتن) ننگا چھوڑ دیتی۔ کوئی ہمت کر کے پوچھ لیتا تو وہ اُسی کے سر کی قسم کھا کر کہتی، "میں کیا جانوں! موئی بلی پی گئی ہو گی!" پھر اُس کا حریف بھلے چپ ہو جائے، وہ چپ نہ ہوتی۔ اُس کی برہمی آئینے کے سامنے بیٹھی چڑیا کی سی ہوتی، جو اپنے ہی سایہ کو ٹھونگتی

ٹھونکتی لہولہان ہوتی رہتی ہے۔ کوئی کم بخت بات کو طول دے بیٹھتا، وہ اپنی معصومیت جتانے کے لیے سر کے بال نوچتی اور چھاتی پیٹتی۔ اُس کے نوچوں سے پُرکھوں کی ٹھنڈی چتائیں پھر سے سُلگ پڑتیں۔ اُس کی ستیزہ خوئی نرالی تھی! وہ دوسروں کی کھرلیوں (ناندوں) میں سے چارہ نکال کر اپنی کھرلیوں میں ڈال لیتی۔ ڈھوروں کا گوبر اُٹھا کر لے جاتی اور اُن کے کام میں یوں مین میکھ نکالتی۔ "تم اِن بے زبانوں کی بددعا نہ لو، اِن سے کام لیتے ہو تو انھیں کھانے کے لیے بھی دو۔ بے چارے بھوک کے مارے گوبر تک نہیں کرتے۔"

تائی ہماری بدبختی پر خوش ہوتی لیکن ہمارے ساتھ تایاجی کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر جل مرتی۔ محبت کی طرح نفرت بھی خوش اعتقادی بڑھا دیتی ہے۔ تائی، تایاجی کو جیسے بول بولتی، اُن کو سُن کر ڈوب مرنے کی جائے ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تایاجی اُس کی بکواس کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اُن کی زباں بندی سے گھبرا کر ایک بار اُس نے اُن پر تہمت لگائی، "میں جو کہتی ہوں، سچ کہتی ہوں ورنہ تو میری زبان نہ کھینچ لیتا!"

"تیرے پاس زبان ہے کہاں جسے کوئی کھینچ سکتا! وہ تو تیرے وجود کا کھویا ہُوا حصّہ ہے۔"

اُن کے غیر متوقع جواب سے وہ اور بھڑک اٹھی اور زبان کے پھوڑے کی طرح پھٹ پڑی۔

جیسے تایاجی کی خاموشی باتوں پر بھاری تھی ویسے اُن کی باتیں کتابوں پر۔ اُن کے الفاظ معراجِ عمل کی تفسیر تھے اور اقدارِ حیات کی تعبیر۔ اُن کے سامنے شاستروں کی حقیقت نہ تھی کیوں کہ اُن کا وجود جیتا جاگتا کردار تھا۔ وہ کہتے تھے۔ "الفاظ بے جان جسموں کی طرح ہیں۔ اِن کی اصلیت دیکھنے کے لیے اِن میں عمل کی رُوح پھونکنی پڑتی ہے۔"

"کتابوں کی قربت سے فہم و فراست بڑھتی تو کتب خانوں کے محافظ عظیم دانشور ہوتے۔" اُنہوں نے بات ایک برہمن سے کہی تھی جو ڈینگ مارتا تھا کہ اُس کے گھر میں چاروں وید اور آٹھوں سمرتیاں ہیں۔

تایاجی کی فہم و فراست میں احساس کی لاگ تھی۔ وہ حیوانوں، درختوں، بیجوں، پھولوں، پھلوں کے بارے کہتے تھے کہ یہ ہمارے بغیر جی سکتے ہیں لیکن اِن کے بغیر ہم مر جائیں گے۔ وہ اِن سب کا احترام اپنے طریقے سے کرتے ۔ ضرورت سے کم کھاتے تھے اور جھوٹن نہ چھوڑتے تھے۔ وہ کھانا کھا چکتے تو اُن کی تھالی ایسے صاف ہوتی جیسے نا کھانے سے پہلے۔ وہ کسانوں کو اَن داتا سے بڑھ کر جیون داتا سمجھتے تھے اور مُعاشرے کا سب سے ضروری جزو۔

اور میرے بھاپاجی! وہ اِنسانوں سے حیوانوں جیسا سُلوک کرتے تھے اور حیوانوں سے درندوں جیسا۔ ئی نیا مویشی خرید کر لاتے اور اُسے کھونٹے سے باندھ کر لاٹھی سے پیٹتے۔ وہ بے چارہ درد سے اَڑاتا، جان کی امان ا اور رسا تڑا کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتا۔ اَصیل تو اَصیل ہیں، اُن سے مرکھنے تک ڈرتے تھے۔ وہ کھرلی میں چارہ تے ہوتے۔ مویشی دُور کھڑے تکتے، جب وہ پرے ہٹتے، مویشی آگے بڑھتے، پہلے چند نوالے رُکتے رُکتے اور ڈرتے ے کھاتے۔ اُن کے سامنے میں آر، اُن کی سختی کی تصدیق تھی۔ وہ ہل باہتے ہوتے تو بیل دُم اُٹھائے چلتے اور باگ

کھینچنے پر رُکتے، رُکتے، رُکتے۔

اُن کی حاضر جوابی اور کھری چوٹ کی دھوم تھی اور اُن کے فقرے محاوروں کی طرح دُوہرائے جاتے تھے۔

"پہلے نوالے اور آخری گھسّے کی لذّت مساوی ہوتی ہے۔"

"لنگڑا گھوڑا اور ڈھیلا ... کون پالتا ہے۔"

"بانجھ عورت میرا کچھّا ہی پہن لے تو حاملہ ہو جائے اور جس بچّے کو جنم دے وہ پیدا ہوتے ہی دوڑنے لگے"

"گڑیوں کو ... ہوتیں تو وہ طاق میں نہ رکھی رہتیں۔"

"ایک بار شیر سنگھ نے اُن سے طنزاً کہا" رتن سیاں! تیرے پانچ بیٹے ہیں۔ اِتنوں کے آگے اِتنے اِتنے ہُوئے تو اُن کو گھر میں خانہ خانہ ملے گا۔ اب تُو بن پرست آشرم اِختیار کر لے۔"

"شیر سیاں! اِس کا ایک اور علاج ہے۔" اُنھوں نے اُسے کاٹتے ہُوئے کہا۔

"کیا؟" اُس نے حیران ہو کر سُوال کیا۔

"مَیں اپنے لڑکوں میں سے کُچھ کا بیج بکانے والا ہُوں۔ معاملہ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اُن کی بات گاؤں میں محاورے کی طرح دُہرائی جانے لگی۔ کوئی لڑکا جوان ہوتا، اُس کا باپ اُس کا بیاہ نہ کرتا تو لوگ اُسے چھیڑتے۔ "تیرا باپ تیرا بیج بکا رہا ہے کیا؟"

اور وارث شاہ کا یہ شعر تو اُن کا مُنہ چڑھا تھا جِسے وہ عورت کی زندگی کا نچوڑ سمجھتے تھے۔

وارث شاہ جدوں رن دیال ہووے
بھانڈا مُوت دا کڈھ دکھاوندی اے

(اے وارث شاہ، جِس آدمی پر عورت مہربان ہوتی ہے، اُسے مُوت کا برتن پیش کرتی ہے)

اُن کی باتیں اُن کے نقش و نگار ہی کی طرح دِل میں اُتر جاتی تھیں۔ وہ اپنی شخصیت کا اِظہار یُوں کرتے تھے۔
"رُبّ نے مجھے، اپنی مٹّی سے بنایا ہے۔"

اُن کی یہ بات ہر لفظ کے حرف و صوت تک سچ ہے۔ اُن کے وُجود کا ہر بُنِ مُو اُن کے یکتا ہونے کی ضمانت تھا۔

ایشر سنگھ کا تکیہ کلام تھا، مَیں سچ بولتا ہُوں، بھائیا جی نے اُسے ایک بار کاٹا اور اُن کا فقرہ اِشتہار بن گیا،
"ایشر سیاں! تیرے نیچے چھید ہے ورنہ تُو اُڑ گیا ہوتا!"

کسی کی بات کو کاٹنا اور اپنی بات میں نکتہ پیدا کرنا، اُن کا جُنون تھا جیسے اُسی میں اُن کی مغفرت ہو۔ جہاں وہ ایسا نہ کر سکتے وہاں جھگڑا کھڑا کر دیتے۔ وہ مُسافری سے آئے، اُن کی بھابی جانتی تھی کہ وہ وہاں بڑھئی کا کام کرتے تھے

لیکن اُس نے چھیڑ خانی سے پوچھا، "رتنسیا! تُو پردیس میں کیا کرتا ہے؟"
وُہ اندر گئے، ہتوڑی اَور کیل لائے اَور اپنی بھابی کا لہنگا کھینچ کھینچ کر اُس کے گھیرے میں کیل ٹھونکنے لگے۔ وُہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہُوئی اَور کیلوں میں سے لہنگا نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہُوئی بولی، "موئے! تو وہاں یہ کرتا تھا؟"

"اَور کیا! ایک چوب لگانی باقی ہے۔" انہوں نے اُسے اڑاتے ہُوئے تُرنت کہا۔

وُہ بچّوں کو پیروں کی بیڑیاں کہتے تھے۔ نئے بچّے کی پیدائش پر کوئی بدھائی دیتا، وُہ اُس کا مُنہ چڑاتے، منگلاچار کی کیا بات ہے اِس میں؟ ایک پِلّا اَور آمرا ہے! اِس کا مُنہ بھرنے کے لئے مجھے اَور مرنا کھپنا پڑے گا۔"

وُہ عورت ذات پر برستے، "عورت اَور کُتیا کی نفسیات ایک ہی ہے۔ اِسے روٹی کپڑا دو نہ دو، اِس کے چِڈّے سے لپٹے رہو اَور تھن چُونگھتے رہو۔ یہی اِس کی زندگی ہے اَور یہی آسُودگی۔"

یہ کہہ کر وُہ اپنے آپ کو فخر سے دیکھتے جیسے وُہ دُنیا کے سارے مردوں کے امام ہوں اَور مردانہ جارحیّت کی نظیر۔

اُن کے نزدیک دُنیا کی ہر نعمت فقط مرد کے لئے بنی تھی۔ وُہ بادام، مُونگ اَور گھی سے پنیاں تیّار کرواتے اَور میری ماں کے سامنے بیٹھے بے شرمی سے اکیلے کھاتے اَور اپنے رذیل حق کی سند دیتے۔

تِتَر کھمبی بدلی رن ملائی کھا

اوہ وَرے اوہ اُدھلے وار نہ خالی جا

(کالی گھنی گھٹا اَور تر مال کھانے والی عورت کی صفت ہے کہ وُہ ضرور برستی ہے اَور وُہ ضرور یار کے ساتھ بھاگ جاتی ہے)

وُہ پِنّی کھاتے ہوتے اَور کوئی دُوسرا آجاتا، وُہ اُس کی صلاتیں کرتے، "یہ پِنّی زیادہ مُرغن ہے، تُو کھائے گا تو ہضم نہ کر سکے گا۔ تو کہے تو مَیں تیرے لئے میٹھی لَسّی کا گلاس بنوا دیتا ہُوں۔"

بھائیاجی کے برعکس تایاجی عورت کی حمایت کرتے تھے "عورت میں جذبۂ تصدّق بُنیادی اَور ابتدائی ہے۔ چُوں کہ مردوں کے سماج نے اِس کے ساتھ دُوسرے درجے کا سُلوک کیا اَور علم و ہُنر سے محروم رکھا، اِس کی زندگی کا ہر گوشہ تاریک رہا۔ ہر کسی نے اِسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جب کہ اُس کا اپنا رویّہ لائقِ اصلاح تھا۔"

وُہ عورت کو تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے تھے اَور اُس کی تعریف کئی طرح کرتے تھے۔ "عورت سرشٹی ہے۔ آدمی عورت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے، عورت کی کرپا پر پلتا ہے، عورت سے دوستی کرتا ہے، عورت سے گرہستی بساتا ہے، عورت مر جائے تو دُوسری کی تمنّا کرتا ہے۔ نظمِ حیات میں عورت آشریہ داتا (حاجت روا) ہے اَور آدمی آشرت (حاجت مند)

اِتنے سارے کِردار اُسی کی خُوبی ہوتے ہیں جو تخلیق کار ہو۔ اور تخلیق کار کتنا ہی اَدنیٰ ہو، عام آدمی سے اَعلیٰ ہوتا ہے۔"

ایک بار تایا جی ناری کی تعریف کر رہے تھے کہ اُن کی لڑکی امر کور نے اُن سے رُوٹھنے کے سے انداز میں سوال کیا، "بھائیا جی! آپ ناری کو پُرش سے بڑا مانتے ہیں لیکن مجھے میرے بھائیوں جتنی آزادی کیوں نہیں دیتے؟"

وُہ اُسے پیار سے دیکھتے رہے اور پھر سر پر ہاتھ پھیر کر بولے "بیٹا! ناری سموُچا دھن ہے، اِس لئے!"

"مَیں نہیں سمجھی، ذرا بستار سے کہیے" اُس نے لاڈ لڈاتے ہُوئے کہا۔

"کسان اپنی دھرتی سے زیادہ کھیتی کی رکھوالی کرتا ہے اور اُس سے زیادہ کھلیان کی، کیوں کہ کھلیان، سموُچا دھن ہوتا ہے، جو آسانی سے لُوٹا جا سکتا ہے۔"

یہ راز امر کور ہی جانے کہ وُہ اُن کی بات کہاں تک سمجھی، وُہ خاموشی سے اُنہیں دیکھتی رہی جیسے مزید تفصیل کی تمنائی ہو۔ تایا جی بے کار سے بے کار چیز کو بھی دھن کہتے تھے اور صحیح کہتے تھے۔

ایک بار مَیں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا، مجھے حاجت ہُوئی۔ مَیں پڑوس کے کھیت میں حاجت رفع کرنے جا رہا تھا کہ بھائیا جی نے روک لیا اور کہا۔ "تو اپنا کھیت چھوڑ کر دوسرے کے کھیت میں گوہ پھرتا ہے۔ پاگل! کھیت میں گوہ، دھن ہوتا ہے۔"

تایا جی ناری کو ایک عجیب طریقے سے پُرش سے برتر بتاتے تھے۔ وُہ یوُں کہ اگر کسی حادثے سے دُنیا کے سارے پُرش مر جائیں تو بھی مانس جاتی کا سلسلہ چلتا رہے گا کیوں کہ ناری، پُرش کے بیج کی رکشک ہے۔ ہاں اگر اِس کے برعکس ہو تو مانس جاتی کا سرب ناش ہو جائے گا۔

کوئی بہو یا بیٹی گربھ وتی ہوتی، وُہ اُس کے لئے خاص طور پر سبزیاں لاتے اور رات کو نیت کتھا اَخلاقی کہانی، سُناتے۔ وُہ کہتے تھے "گربھ وتی کی حالت بوئی ہُوئی دھرتی کی سی ہوتی ہے۔ جیسے دُھوپ اور پانی، بیج کی پُورن اُپج سے جُڑے ہُوئے ہیں ویسے ہی حاملہ کی جسمانی اور نفسیاتی ہم آہنگی حمل کی کامل نشوونما کی ضمانت ہے۔"

اور تائی اپنی بہوؤں کے ساتھ جیسا سلوک کرتی تھی، اُس کی ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ تایا جی ہریانہ سے کیلے لائے۔ اکیلی تائی گھر میں تھی اور باقی سارے حویلی میں۔ وُہ جتنے کیلے کھا سکتی تھی، کھائی جو بچ گئے وُہ مسل کر رکھ دیئے۔

میرے بھائیا جی کو شکاری کُتّے پالنے کا خبط تھا۔ وُہ کُتّی کا جھول لیتے، اُس میں سے صرف مادہ پِلّوں کو رکھتے، نروں کو مار دیتے یا کسی کو دے دیتے۔ وُہ کہتے تھے کہ کُتّوں کے ٹٹّے تیز رفتاری میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی منطق کے خلاف صرف ایک بار شکاری کُتّا پالا لیکن آخر اُسے عین منطق کر دکھایا۔ وُہ اُسے سلوتر خانے لے گئے اور اُسے آختہ کروا لائے۔ چُوں کہ وُہ ٹٹّوں کو شجاعت و افزائش سے موسُوم کرتے تھے اِس لئے عورت کو پیدائشی بُزدل قرار دیتے تھے۔ وُہ پِلّوں کو بکری کے دُودھ پر پالتے اور اُن کی راتِب مُقرّر کرتے۔ گھر میں بکری نہ ہوتی تو بکری خرید لاتے،

بکری بوجی ہوتی تو ٹھیک، ورنہ اُس کے کان کاٹ دیتے اور اپنی عقل کی تائید کرتے، "بکری کے لٹکتے کان ڈھیلے کے سے لگتے ہیں۔ بھینس کے دُودھ سے پلّوں کی ٹانگیں موٹی ہو جاتی ہیں اور وہ رفتار کی لپک کھو بیٹھتے ہیں۔"

جُوں ہی پلّے آنکھیں کھولتے، وہ اُن پر اپنا اعتقاد آزماتے، اُنہیں اُٹھا کر تالاب میں پھینک دیتے اور کنارے پر کھڑے ہو کر اُن کی سرگرمی کا منظر دیکھتے۔ جو پلّا کنارے کی طرف بڑھتا، اُس پر آفریں کہتے، جو ڈُوبتا اُسے لائقِ تعزیر سمجھتے اور اُس پر لعنت بھیجتے جیسے کوئی طاقتور کو جینے کا حق دے کر کمزور سے وہی حق چھین لے۔

ہمارے گاؤں کے اطراف جنگل، خرگوشوں کے لئے مشہور تھے۔ کُتیاں بڑی ہوتیں تو وہ اُنہیں شکار پر لگاتے۔ کُتیاں شکار کو ایک کھلے سے دُوسرے میں نہ جانے دیتیں، مستی میں ہوتیں تو شکار سے کھیلتی ہُوئی اُسے شکار کرتیں۔ اُن کی برق رفتاری کی دُھوم دُور دراز تک تھی۔ دُوسرے شکاری، کُتیوں کی روڑ دیکھنا چاہتے تو بھائیا جی کے غرور میں کج روی کا شائبہ ہوتا۔ ہانکے والوں اور کھوجی کُتّوں کا شور آگے بڑھتا، شکاری اپنے کُتّوں کی ڈوریاں سنبھالے چوکنے ہوتے جاتے۔ وہ ایک ہی دُھن میں ہوتے کہ ڈوریاں چھوڑنے میں دیر نہ ہو۔ لیکن بھائیا جی کی چوکسی میں بے پروائی ہوتی۔ وہ اپنی کُتیوں کی ڈوریں سب ڈوروں کے بعد چھوڑتے اور لشکارتے۔ کُتیاں شکار کو دیکھ کر چونکنے لگتیں اور اپنی بے قراری میں اگلے پاؤں اُٹھائے اُڑنے کے سے انداز میں کھڑی ہوتیں۔ صافہ پہ رکھی کُتیاں کھڑے پاؤں ہی سے فرّارے بھرتیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں آگے بڑھتیں، اپنے حریفوں کو پچھاڑ کر شکار پر چوٹ کرتیں، اپنی مار اُٹھاتیں اور اُسے دُوسرے کُتّوں سے بچاتی ہُوئی واپس آتیں۔ بھائیا جی بھاگتے ہُوئے اُنہیں راستے میں ملتے، اُن سے شکار لیتے اور اُس کا کلیجہ کاٹ کر اُنہیں اِنعام میں دیتے۔ وہ اُن کے کارنامے کو سراہتے جیسے اپنے کردار کے کسی بھولے ہُوئے پہلو کا قصیدہ پڑھ رہے ہوں۔ اپنی فتح کے اُن لمحوں میں دُوسرے شکاریوں کو ایسے دیکھتے جیسے وہ بونے ہوں۔

میرے باپ کی دیو قامتی کے سامنے میری ماں کا وجود بونے ہی کی طرح تھا۔ وہ اُن کے پیروں تلے بارہا روندی گئی لیکن یہ ایک معجزہ ہے کہ وہ زندہ رہی۔

قارئین! ڈراؤنے اور گہرے اندھیرے میں مدھم سے چراغ کی روشنی بھی اوہام شکن اور حیات افروز ہوتی ہے۔ میرے بچپن کے تاریک ایّام میں میری ماں کا وجود اُسی روشنی کی طرح رہا ہے۔

میری دادی خوش ہوتی تو کہتی، "میرے گھر میں میلو آئی تو میں نے غریبی کے جنگل سے نجات پائی۔"

اُس کے لہجے میں شکست کے ساتھ اِحسان مندی کا جُز بھی ہوتا، "اُس نے آتے ہی گھر کے سارے کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ ایک لحاظ سے اچھا بھی ہُوا! جب سے رنتے کا جنم ہوا تھا مجھے سُوئی کا ناکا نظر آتا تھا اور نہ ہی مُنہ، ہر کام بیچ ہی میں اٹکا رہتا تھا۔"

جُتائی، بوائی، کٹائی اور گہائی کے وقت بَیلوں پر کڑی گزرتی۔ اُن کی محنت کا خیال رکھتے ہوئے میری ماں آٹا چکّی پر پیستی۔ وُہ اُس مُشکل کام کو سوہلا گا کر آسان کرتی۔ چکّی کا ساز سوہلے میں ایسا سوز بھرتا کہ دَر و دیوار تک سنجیدہ و متوجّہ لگتے۔ اُس کی سی نمر اور سُگھڑ گرہنیاں کہاں ہوتی ہیں! وُہ اِس دھن کی پکّی تھی کہ مَرد، گھر کے کاروبار سے آزاد ہو، تاکہ وُہ رِزق کمانے کا کام بے فکری سے کر سکے۔ سارے گھریلو کام وُہ گجر دم سے پہلے ہی کر لیتی اور تا حدِ امکان باہر کے کام میں بھائیا جی کی مدد کرتی۔ وُہ کھیتوں میں بھائیا جی کے ساتھ شانہ بہ شانہ کام کر رہی تھی کہ فرید خان اُدھر سے گزرا۔ اُس نے رُک کر بے اِختیار کہا۔ "رتن سیاں! یہ بات اَب سمجھ میں آئی ہے کہ تجھے ساہوکار سے کیسے چُھٹکارا مِلا! جب کہ مَیں پھنسا ہُوا ہُوں۔ تیری بیوی تیرا یار و مددگار ہے اور میری مَصارف کا بار!"

چُولہے چَوکے سے وقت بچانے کے لئے، میری ماں دال، توڑی (مٹّی کی ہانڈی) میں بھڑولی (بند چُولہا) میں بناتی، جو نہ کبھی جَل کر راکھ ہُوئی اور نہ کھڑی رہی۔ اُس کی مُسلسل کامیابی کا راز ادھن اور ایندھن کا صحیح اندازہ تھا۔ اُس کی لگا تار مَصروفیت کے باوجُود، اُس کے چہرے پر تھکن دکھائی دیتی اور نہ ہی ماتھے پر بَل، جیسے کام سے اُس کی طاقت کی تجدید ہوتی ہو۔ وُہ کام کو مسرت کا سرچشمہ جانتی تھی اور جو کوئی کام کرتی تھی، اُس کا سوہلا گاتی تھی۔ میرے قارئین شاید حیران ہوں، پنجابی بھاشا میں ہر کام کا سوہلا ہے۔ پہاڑ سا کام ایسے پُورا ہو جاتا جیسے سوہلا، کام کرنے کا جَنتر تھا۔ ماں کی خوش اُسلوبی اور خُوش مزاجی دائمی تھی۔ جیسے نغمے کی دِل کشی اُس کے زیر و بم میں ہے ویسے ہی ماں کی خُوش سلیقگی اُس کے لہجے میں تھی۔ وُہ 'آئی جی' کہہ کر کسی حُکم کی تعمیل کرتی تو محسُوس ہوتا جیسے کام کرنے سے پہلے ہی پُورا ہو گیا تھا۔ اُس کا ضبطِ غم! وُہ اپنی بدنصیبی کا دُکھڑا نہ کسی سے کہتی اور نہ کسی کو سُناتی۔ اُس کی بے نُوری میں نرالا نُور تھا! وُہ روتی روتی اُٹھ کر کسی سے مِلتی تو لگتا کہ سُورج دُھند میں سے جھانک رہا ہے۔ اُس کی ہم عُمر عورتیں بچّے جنتے جنتے مُرجھا گئی تھیں۔ اُن کے پیٹ اُن کی چھاتیوں کی طرح لُڑھک آئے تھے اور پیٹ اور زانو کھاک ہی سے بدنُما لگتے تھے۔ اُن کے سامنے میری ماں کُنواری لگتی تھی۔ وُہ غُسل کر کے کنگھی پٹّی کرتی، سُرمہ کاجل لگاتی، سک مِسّی ملتی اور دُھلے ہُوئے کپڑے پہنتی تو دُلہن لگتی۔ اُس کا رنگ کنول کا سا تھا جس پر ہلکی سی سیندوری چھاپ ہو۔ پانچ بچّوں کی ماں ہو کر وُہ گیان کور سے زیادہ خُوبصورت تھی، جو نئی بیاہی آئی تھی۔ مَیں ماں کو مجبُور کرتا کہ وُہ گیان کور کی طرح دو چوٹیاں کرے، ایک چوٹی آگے رکھے اور دُوسری پیچھے۔ وُہ مُسکرا کر میرا مُنہ چُوم لیتی، اور کہتی، "بیٹا! مَیں نویلی دُلہن نہیں ہُوں جو شہانی مہندی لگائے اور رنگیلی چُوڑیاں پہنے بیٹھی رہُوں!" اُس کے اِنکار سے افسردہ ہو کر مَیں سوچتا کہ کاش میری ماں دُلہن ہوتی! بن سنور کر بیٹھی رہتی اور میری آنکھوں سے لگی رہتی۔ فنُونِ لطیفہ کی ترقّی کے لئے آزادی اور وجاہت کی زندگی ضرُوری ہے۔ مَیں حیران ہُوں کہ روز کے

جھگڑوں، نت نئی کدورتوں، سُلگتی نفرتوں کے درمیان میری ماں کی فنکارانہ وضع داری کیسے قائم رہی؟ وہ دوسری دیہقانی عورتوں کی طرح ستیزہ خو اور عیب جُو کیوں نہ بنی؟ اُس کی انتقامی جبلت کیسے نابُود رہی؟

کوئی مہمان آتا تو ماں کے رنگ رچاؤ دیدنی ہوتے۔ وہ لالٹین کو اِملی مل کر چمکاتی اور چمنی کو راکھ سے چھننی جلا کر بُرش سے رگڑتی اور پہلے ہی صاف برتنوں کو کھٹی لسّی سے دھو کر کپڑے سے سُکھاتی۔ کانسے کے برتن کُندن کی طرح دمک اُٹھتے۔ وہ اُبلتی ہوئی دال سبزی کٹوریوں میں بھرتی، اُن کے کنارے صاف کرتی اور تھال کے اندر کے سِرے کے ساتھ سجا کر رکھتی اور اُن کے بیچ روٹی پروستی۔ غبارے کی طرح گول مٹول روٹی پورے تھال پر چھا جاتی۔ جیسی بھوجن کی سجاوٹ ویسی سُگند، زبان سے پہلے آنکھ اور آنکھ سے پہلے ناک کھانے کا لُطف اُٹھاتی۔ کوئی بے قرار ہو کر جلدی کرتا تو ہاتھ جلا لیتا۔ اُس کے سُگھڑپن کی بات پوری کرنے کے لئے بات دوہرانے کی ضرورت ہے۔ وہ مہمان کے ہاتھ دُھلاتی ہوئی ایک ہاتھ جگ کے دستے پر رکھتی اور دوسرا پیندے پر اور پانی اِتنی دوری سے ڈالتی کہ چھینٹے نہ اُڑتے۔ ایک سے زیادہ مہمان ہوتے تو وہ ہاتھ دُھلاتی اور مَیں تولیا پکڑتا۔ مَیں تولیے کا سِرا بدلنا بھُول جاتا تو وہ یاد کروانے میں کوتاہی نہ کرتی۔ اُس کی طبعِ سلیم! وہ ایسے موقعوں پر سُوکھا بالن چھانٹ کر جلاتی اور گھر کو دُھوئیں کے آزار سے پاک رکھتی۔ بالن گیلا ہوتا اور دُھواں پریشان کرتا تو اُدھر سے دھیان ہٹانے کے لئے وہ کہانی گھڑتی، "جسے دُھواں لگتا ہے وہ اپنی ساس کا چہیتا ہوتا ہے!"

اِس بات کی تصوّر خیز معنویت! مَیں دُھوئیں کی گھٹن میں سکون محسوس کرتا اور اُٹھ کر اُس طرف بیٹھ جاتا جدھر دُھوئیں کا رُخ ہوتا۔

مَیں کسی کارن سکُول سے جلدی لوٹ آتا اور اپنی روٹی ساتھ اُٹھا لاتا۔ وہ باسی روٹی، ماں مجھے کھانے نہ دیتی۔ وہ شگفتہ لہجے میں ترغیب دیتی، "تو ہاتھ مُنہ دھو کر تازہ پانی کی بالٹی بھر لا، تب تک مَیں تیرے لئے ایک چانکی (چاند جیسی بڑی روٹی) سیک دیتی ہُوں، مکھّن سے کھا لینا۔"

چانکی ایسی لذیذ ہوتی تھی کہ بس! ماں روٹی پکانے میں اِتنی ماہر تھی کہ اُس کی پکائی ہُوئی عام روٹی ٹکیا (چِندیا) کے عیب سے پاک ہوتی تھی اور پوری پھُولتی تھی۔ اُس کے دہی کا تو کہنا ہی کیا تھا! دہیرے (دہی کا برتن) کو پرات میں اُلٹو تو پورا دہی چکا بند نکل آئے۔

سورن کور کا بیاہ ہُوا، ماں نے اُس جوڑے کو کھانے پر بُلایا۔ وطن سنگھ کاریگر آدمی تھا۔ اُس کے پتّھر جیسے ہاتھوں کو کھانا قابلِ برداشت لگا۔ اُس نے روٹی سے نِوالا توڑا، گول کیا، دال سے بھرا اور مُنہ میں رکھ لیا۔ وہ منظر دیدنی تھا! وطن سنگھ مُنہ اُوپر کئے "ہا ہا" کرنے لگا اور بھاپ پھُونکنے لگا۔ وہ چاہتا تو نِوالا تھُوک سکتا تھا لیکن اُس نے ایسا نہ کیا، اِس طرح جب تک اُس نے نِوالا حلق سے اُتارا، اُس کا نقشہ ہی بگڑ گیا۔

"بیٹا! تم اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟" اُس کی ہٹ سے متاثر ہو کر ماں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

اپنی غلطی چھپانے کے لئے اُس نے پھر اوپر دیکھا اور کہا۔ "چاچی! میں دیکھ رہا تھا کہ کاریگروں کا گھر اور چھت پر شہتیر اور بالے ان گھڑت!"

"جلدی میں ہر کام خراب ہوتا ہے۔ اِسے پچھلے سال برسات میں بنایا تھا۔" ماں نے مسکرا کر کہا۔

میری ماں سے ڈنگر تک ہلے ملے تھے۔ اُس نے اُنہیں پیارے پیارے نام دے رکھے تھے۔ وہ انہیں بلاتی، ان سے باتیں کرتی تو لگتا جیسے وہ اپنوں سے محوِ کلام ہو۔ وہ ان کی بیماریوں کے علاج جانتی تھی، اُن کی نفسیات پہچانتی تھی۔ کوئی بھینس گابھن ہوتی تو وہ اُس کا خاص خیال رکھتی۔ جوں ہی اُسے ساتواں ماس لگتا، وہ اُسے چراگاہ میں بھیجنا بند کر دیتی۔ اُس کے بچہ دینے، جیر (آنول نال) گرانے اور جیر سمیٹنے تک وہ اُسے آنکھوں کے سامنے رکھتی۔ بچّہ دینے کے سوا مہینے بعد تک وہ اُسے سونٹھ، اجوائن اور گڑ کے کاڑھے پلاتی، پڑوں (مویشی کی دُم سے نیچے اور باکھ سے اوپر کا حصّہ) اور باکھ کو فینائل کے پانی سے دھوتی اور اُسے ناک سے لے کر دُم تک یوں پاک اور صاف رکھتی جیسے سُگھڑ دائی، زچّہ کو۔ جب تک بھینس بولی (پیوسی) دیتی، وہ پاڑے کو پیٹ بھر کر چونگھنے دیتی۔ وہ کہتی تھی کہ اِس سے پاڑے بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔ اُس کی بات کی سچائی عین آزمائی ہوئی تھی۔ اُس کی بھینسوں کے پاڑے مرتے نہ تھے اور تین چار سال میں جوان ہو کر طویلے کی شان بن جاتے تھے۔ اُس کی اِس دُور بینی کی بدولت کبھی یہ نوبت نہ آئی جب کہ بھینس کے آگے کرتی (گائے یا بھینس کے مرے ہوئے بچے کا چمڑا، جس میں بھوسا بھر کر بھینس کو دکھاتے ہیں اور دودھ دوہتے ہیں) رکھنی پڑی ہو۔ ماں کی ہر گائے، بھینس برس بیاؤ تھی اور اُس کے سارے مویشی اُس سے سدھایوں کا سا برتاؤ کرتے تھے اور آواز پر لگے ہوئے تھے۔ دودھ دوہنے کا وقت قریب آتا، بھینس دروازے کی طرف دیکھ کر اڑاتی۔ ماں کو دیر ہو جاتی، وہ بیاکل ہو کر کھوڑو کرتی گویا زور شور سے دودھ دوہنے کی چیتاؤنی دیتی۔ ماں بالٹی لئے نمودار ہوتی، وہ شانت ہو کر جُگالی کرنے لگتی۔ اپنی دودھیل کا دودھ دوہنے کے لئے ماں کو نہ بانٹ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی نیانے کی۔ (نیانا، وہ رسّی جس سے شریر گائے، بھینس کی پچھلی ٹانگیں باندھتے ہیں تاکہ وہ اچھل نہ جائے)۔ دودھیل کی آنکھوں میں وہ سنجیدگی ہوتی تھی جو بچّے کو دودھ پلاتے وقت ماں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اپنے تھنوں پر ہاتھ محسوس کرتے ہی دودھیل ذرا سی دُم اُٹھاتی اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہو جاتی۔ ماں باکھ دھو کر اُسے نہاتی اور آواز لگاتی۔ "لچھمی!" وہ گردن گھما کر ماں کو دیکھتی اور اڑاتی۔ اُس کی آواز کی نرمی اور نازکی کہتی کہ وہ کسی رعایت کی تمنائی ہے۔ وہ منہ کھولتی۔ ماں اُسے دودھ کی دھار دیتی اور پھر دودھ دوہتی۔ لچھمی باچھیں چاٹتی چاٹتی جُگالی کرنے لگتی اور جب تک ماں پورا دودھ دوہ نہ لیتی۔ پاؤں نہ بدلتی۔ ماں اُسے تھپک کر جانے لگتی۔ وہ دُم ہلاتی، تھوتھنی جھٹکتی۔

کان جھکاتی، پہلو بدلتی اور پیاری پیاری، میٹھی میٹھی آوازیں نکالتی جیسے مزید دودھ دینا چاہتی ہو۔ ماں طویلے کے پاس سے گزرتی، مویشی اُدھر کان لگا کر اُس کی چاپ کو سُنتے اور اَڑاتے گویا اُسے بُلا رہے ہوں۔ ہر دودھیل ماں کے ہاتھ پڑی ہوئی تھی (ہاتھ پڑنا، دودھیل کا ایک ہی آدمی کو دودھ دینا اور کسی دوسرے کو پاس نہ آنے دینا) جس وجہ سے وہ کہیں مہمان نہ ہو سکتی تھی۔ کہیں ایسی صورتِ حال پیدا ہو ہی جاتی اور اُسے جانا ہی پڑتا، اُتنے دن دودھیل کا سارا دودھ اُس کے بچے کو چونگھانا پڑتا۔

میری دادی کئی سال تک اندھی رہی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ کبڑی ہو کر جنین کی طرح سمٹی سکڑی رہتی تھی۔ اُس کی مزاج پُرسی بڑی بات ہے، بھائیا جی اُس سے بات نہ کرتے تھے۔ وہ اُسے دیکھ کر منہ بناتے جیسے اچانک کہیں درد اُٹھ پڑا ہو۔ اُن کی چاپ یا آواز پہچان کر اُس کے مُردہ چہرے پر زندگی دوڑ جاتی، افسردہ شکنوں میں خوشی ناچ اُٹھتی اور وہ بے ساختہ لہجے میں اُنہیں بُلاتی لیکن وہ گونگے اور بہرے بنے رہتے، کبھی بات کرتے تو یوں "رذیل!" وہ حروف کو ایسے گھسیٹتے کہ اُن کی طوالت اپنی لغوی رذالت سے کئی درجہ بڑھ جاتی۔ اِس کے باوجود اُن کے فرطِ اذیت کی تسلی نہ ہوتی اور وہ پورا زور لگا کر بولتے، "جانے دے تو اُو کب ب مرے گی ی!"

میری دادی کا چہرہ اینٹھ کر نرم پڑتا جیسے چوٹ کھانے سے ہوتا ہے۔ وہ دِل ہی دِل میں اُن روحانی رِشتوں کو تازہ کرتی لگتی جو اُس کی زِندگی کا حاصل تھے لیکن یک طرفہ ہونے کی وجہ سے نامکمل تھے۔

"اُن کی غیر ضروری برہمی پر حیران ہو کر تایا جی فکرمند سے کہتے، "اِس کے پاس زبان نہ ہوتی تو اِس کی بے رحمی بے اندازہ ہوتی!"

ایک بار ایسا ہُوا کہ بھائیا جی اپنی ماں کی چارپائی کے پاس کھڑے تھے۔ اُس کی ممتا کا اِعجاز! اُس نے اپنی تاریکی میں اُن کی روشنی دیکھ لی اور اُٹھ کر اُدھر چل پڑی لیکن پہلا قدم لیتے ہی گر پڑی۔ وہ منہ بناتے ہُوئے اور خود کو سنبھالتے ہُوئے وہاں سے اُچھل کر پرے ہٹے جیسے کسی غلاظت کی زد میں آ رہے تھے۔

دادی اِتنی کمزور تھی کہ کروٹ لیتے ہُوئے اُس کی ہڈیاں ڈھیلی چارپائی کی طرح کھڑکھڑ کرتی تھیں اور وہ درد سے کراہتی بھی تھی۔ بھائیا جی کی موجودگی کی خوشبو پاتے ہی اُس میں اِتنی طاقت آ جاتی کہ وہ پھرتی سے اُٹھتی اور جدھر وہ کھڑے ہوتے اُدھر منہ کر کے بیٹھ جاتی۔ وہ ایسے منہ کھولتی اور بند کرتی جیسے کوئی خوشی سے بات نہ کر سکے۔ وہ اپنی اندھی آنکھیں جھپکنے سے گریز کرتی جیسے اُس کی چشمِ نظارہ بیں میں خلل پڑتا ہو۔ اُس کی ٹھٹھری آواز سے جذبات کی گرمی چھلکتی اور مُرجھائی جِلد کے نیچے سے تازگی جھلکتی۔ ایک بار اُس نے میرے بھائیا جی سے اپنی ممتا کا اِظہار یوں کیا "رتنیا! مَیں نے تجھے جنم دیا، تیرا گُوہ مُوت اُٹھایا، تجھے بڑا کیا اِس لئے کہ...."

"تُو مجھے جنم نہ دیتی تو اور کیا کرتی؟ ساری عُمر پیٹ میں لئے گھومتی؟ گُوہ مُوت اِس لئے اُٹھایا کہ اُسے

گھر میں رکھنا ممکن نہ تھا۔ اور پڑا تو مجھے ہوتا ہی تھا! اُسے کون روک سکتا تھا؟" انہوں نے اُس کی بات بیچ میں کاٹ کر اپنی منطق بگھاری۔

اُن کے بے حس ردِعمل پر دادی رونے لگی اور مُنہ پیٹنے لگی۔ وُہ وہیں کھڑے رہے اور مُسکراتے رہے جیسے اُس دردناک منظر سے لُطف اندوز ہو رہے ہوں۔ وُہ جب اپنی ماں سے مخاطب ہوتے، اُسے بُڑھیا کہتے اور اکثر بڑھیا کہنے سے بھی گریز کرتے جیسے وُہ حقیر شئے بے نام بھی ہو۔ کئی بار اُن کا روّیہ برف سے زیادہ ٹھنڈا اور پتھر سے زیادہ بے حس ہوتا۔

لیکن وُہ اُسی گھر کی چاردیواری تھی جہاں زمین اور آسمان مِلتے تھے۔

میری ماں میری دادی کی مالش کرتی، اُسے نہلاتی اور ممکن ہوتا تو اُس کا من بھاتا پکاتی۔ دادی کا پوپلا مُنہ ٹھوس غذا کھانے کے ناقابل تھا۔ ماں اُس کے لئے زیادہ تر گُلگلی بناتی ورنہ روٹی شوربے میں مسل دیتی۔ کچھ دیر بھیگے رہنے سے روٹی، گُلگلی ہی کی طرح نرم ہو جاتی۔ اپنے عناصر کی لڑائی میں میری دادی کو اعصاب پر اختیار نہ رہا تھا۔ وُہ بستر پر چرک دیتی اور کبھی پیشاب کر دیتی، پھر اپنی ندامت چُھپانے کے لئے میری ماں پر الزام لگاتی، "تُو وقت پر مجھے اُٹھاتی بٹھاتی تو مَیں ایسا نہ کرتی۔"! میری ماں اُس کی بے کسی سمجھتی اور جانی بُوجھی تُہمت کو نظر انداز کر کے مُسکرا دیتی۔ وُہ اُس کی دیکھ بھال نئے جنمے بچّے کی مانند کرتی۔ اُسے تنہائی کے احساس سے بچانے کے لئے گاہے گاہے آواز دیتی، آتی جاتی اُس کی اوڑھنی درست کرتی، اُس کے پاس بیٹھتی، دوپٹّے کے پھاہے سے اُس کی آنکھوں کو بھپارا دیتی، آنکھیں صاف کرتی اور پاس سے اُٹھ کر جاتی ہُوئی اُس کے گال پر چُٹکی بھرتی جیسے کوئی دُودھ پیتے بچّے کی دِل داری کرتا ہے اور اُسے چُہلیں کرنے پر اُکساتا ہے۔

میری ماں اپنے کام سے کام رکھتی تھی اور لگائی لُتری سے اِجتناب کرتی تھی۔ وُہ کہتی تھی کہ بدگوئی بیکار ذہن کی اُوباشی ہے۔ اُس کا یہ خیال تایاجی کے خیال کا عکسِ ثانی تھا۔ وُہ کہتے تھے۔" کثرتِ حیات سے لُطف اُٹھانے کے لئے لازم ہے کہ اِنسان تنگ نظری اور کم ظرفی سے دُور رہے۔"

میری ماں شاید ہی بیکار بیٹھتی اور کام نہ ہوتا تو کام ایجاد کر لیتی۔ وُہ اناج سکھاتی، اناج صاف کرتی، نمکدان ترتیب دیتی .... اور کپڑے درُست کرتی۔ اُس کی یہ خُوبی کِتنوں کے لئے بے ہُودگی کا درجہ رکھتی تھی کہ وُہ جھاڑی پُونچھی چیزوں کو پِھر سے صاف کرنے لگتی ہے۔ ایک دِن پربھی نے کہا۔" میلو! مَیں تیری طرح صفائی نہیں کرتی پھر بھی میرا گھر گندگی سے پاک ہے۔"

ماں نے اُسے حیرت سے دیکھا اور کچھ دیر سوچ کر کہا،" پربھیئے! صفائی کرنے ہی سے گندگی آتی ہے" پربھی میری ماں کی بات میں اُلجھ گئی اور کہنے لگی،" یہی تو مَیں کہتی ہُوں!"

ہمارے گھر کے بھنڈار کی ترتیب قابلِ ذکر ہے۔ اُس چھوٹے سے کمرے میں ہر وُہ چیز موجود تھی، جو روزمرّہ کی ضرورت ہے جیسے گندم، جوار، باجرہ، چاول، چھلیاں، السی، گڑ، شکر، نمک، مرچ، سرسوں، ماش، ماش کی دال، مسور، مسور کی دال، چنے، چنے کی دال، آٹا، گھی .... مطلوب مقدار کے مطابق مٹیوں، چاٹیوں اور کوزوں میں محفوظ تھا۔ سب سے بڑا برتن نیچے گھڑونچی پر تھا اور سب سے چھوٹا برتن اوپر۔ ہر برتن پر جس پر ڈھکن تھا۔ باقی کے برتن ایک دوسرے کا ڈھکن آپ تھے۔ اوپر سے نیچے بڑھتی ہوئی اور نیچے سے اوپر گھٹتی ہوئی بیل اپنی سج دھج آپ تھی۔ اس بھیڑ بھاڑ میں سے کوئی چیز نکالنی اتنی ہی آسان تھی جتنی مشکل لگتی تھی۔ اس معمے کا حل وہ گھڑونچی تھی جو ایک کونے میں خالی رکھی رہتی تھی۔ اوپر سے برتن اٹھا کر گھڑونچی پر رکھو، مطلوب برتن تک پہنچو، جنس نکالو اور وہی سلسلہ الٹی پھراؤ۔ وُہ ترتیب و ترکیب اِس قدر مکمل تھی کہ اُسے جان بوجھ کر بگاڑو تبھی بگڑتی تھی۔ نہ تو اُسے مزید سنوارنا ممکن تھا اور نہ ہی بگاڑنا۔ وُہ کمرہ کاہ گل سے لیپا پوتا تھا اِس لئے اُس کی سجاوٹ سارے گھر سے الگ اور مقامی تھی۔ اس ذخیرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے کیڑا نہ لگتا تھا۔ اس کی روک تھام کے لئے ماں جیسے طریقے استعمال کرتی تھی، ان کا ذکر برمحل ہے۔ گندم اور چاول تھوڑے پرانے ہو جاتے تو وہ انہیں سُکھا لیتی اور گھی مل دیتی۔ لیکن دالوں کے بارے میں وُہ زیادہ احتیاط برتتی تھی، انھیں ہر ماہ سکھاتی تھی اور ان میں لون کی ڈلیاں رکھتی تھی۔

کوئی آگ لگاؤ عورت میری ماں کو میری دادی کے خلاف اُکساتی یا اس کے بے اختیار روّیے پر حجت کرتی تو ماں دور کی کہتی، "کل مجھے بھی بوڑھی ہونا ہے بہن! میں اپنی ماں کی سیوا کروں گی تو اپنی بیٹی سے امید رکھوں گی!" اس وقت میری ماں کی کوئی بہو نہ تھی لیکن وُہ آنے والی بہو کو بیٹی ہی سمجھتی تھی۔ وُہ مجھ تن اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی تو ماں اسے سمجھاتی، "بچے اور بوڑھے ایک سمان ہوتے ہیں! اِن کی دیکھ بھال ایک سی ذمہ داری سے ہوتی ہے۔"

دادی کی زندگی کے آخری دنوں میں میری ماں نے نرک بھوگا۔ وُہ ہاتھوں اور پیروں اور سانسوں گندگی میں رہی اور اس جان لیوا سیوا کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی رہی۔ کسی نے اُس کے چہرے پر نہ کراہت دیکھی اور نہ زبان پر شکایت۔ دادی کے ساتھ اُس کا لگاتار بہتر سے بہتر سلوک اُس کی روح کی پاکیزگی کا آئینہ تھا جو کبھی نہ دھندلایا۔ میری دادی مری تو کتنوں نے میری ماں کو بدھائی دی۔ "میلو! تو پرساد چڑھا تجھے گلے گلے دکھ سے مکتی ملی ہے۔ میلو، تو شکر کر! ست گرو نے تیرے بندھن کاٹے اور سنکٹ مٹائے ہیں!" لیکن میری ماں ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے اس کا اپنا اکلوتا بچہ مر گیا ہو۔

اور میرے بھائیا جی کی انتہائی ریاکاری کی بات سنیئے۔ سب جانتے تھے کہ وُہ اپنی ماں سے برا سلوک کرتے تھے اور اُس کے سائے تک سے دور بھاگتے تھے لیکن وُہ لوگوں سے کہتے پھرے۔ "میری ماں نے آخری سانس میری گود میں لیا، عین اُس وقت جس وقت میں اُس کے منہ میں گنگا جل ڈال رہا تھا!" انہوں نے اپنی جیب سے

دس روپے گردوارے کو دے کر کہا۔ "میری ماں نے مرت کال کے وقت دان دیا تھا۔" یہ دکھاوا اُن کی کم اصلی کی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے اپنی ماں کی ارتھی پر سے بکھیر پھینکی، چتا میں چندن کا ٹکڑا رکھا اور اسے گائے کے گھی سے سُلگایا۔ اُنہوں نے اُس کے پھولوں کو کیرت پور میں سپرد آب کیا، اُس کی نجات کے لئے پاٹھ کروایا اور غریب غربا کو کھانا کھلایا۔

میں اِس وقت تقریباً آدھی صدی کے بعد اپنی کہانی لکھ رہا ہوں اور یادوں کے درپن میں اپنی ماں کو دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں اُس کی تمام جھرّیوں، تمام سلوٹوں، تمام مرُدنیوں میں اُس تر و تازگی کو تلاش کر رہی ہیں جو اُس کے جسم کی دِلکشی تھی۔ وہ گداز ہونٹ جن کے بوسوں میں ممتا کی گرمی تھی! وہ خوبصورت ہاتھ، جن کی تھپکی میں لوریوں کی ترنگ تھی! وہ سڈول بازو، جن کے جھولے خوشی کی اُڑان تھے! وہ سُندر چہرہ جسے میں دیکھتا نہ تھکتا تھا! وہ بھرپور چھاتیاں، جن سے میں چُسر چُسر دودھ پیتا تھا اور پیٹ کی تسکین چُراتا تھا! وہ تمام اعضا، حیات آفریں اعضا! ڈھینگروں کی طرح سوکھے ہوئے ہیں، اُلجھی آنتوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں، پرانے کپڑوں کی طرح چرے سے ہوئے ہیں۔

میری ماں میرے بچپن کی چند حسین یادوں میں سے ایک تھی۔

افسوس! وہ بھی ایک طرح سے مسخ ہو گئی ہے۔

باب ۶

میری ہستی ہے جستجوئے تمام
اک یہی وصف مجھ میں کیا کم ہے
(شاطر)

کہاوت ہے، سانپ کا بچہ سپولیا ہوتا ہے، لیکن آدمی کے تعلق سے یہ کہاوت بالکل غلط ہے اور تایا جی کا کہا درست، "نباتات و حیوانات میں سے ایک آدمی ہی ہے جسے ترجیح جنس سے نسبت ہے۔"

میں اُن کی فراست کو اپنے طریقے سے بڑھاوا دے رہا ہوں۔ "آدمی کا نشوونما وہ پیچیدہ عمل ہے جس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا بھول کرنا ہے۔ یہ کسی وقت کیسی بھی کایا پلٹ سکتا ہے اور اپنے بارے میں ساری پیشین گوئیاں رد کر سکتا ہے۔"

میرے جسمانی و روحانی نشیب و فراز میرے راہبر تھے، اِس لئے میری زندگی میری ہی طرح پروان چڑھنے لگی۔ میں گلیوں میں، کھیتوں میں، باغوں میں، چراگاہوں میں، گرمی میں، سردی میں، سوکھے میں، برسات میں،

اندھیرے میں، اُجالے میں ... اکیلا گھومتا، گروہ میں کھیلتا، کسی سے دوستی کرتا اور کسی سے دشمنی۔ بار بار نصیحت سُننے کے باوجود کہ چوری کرنا بُری بات ہے، مَیں چوری کرتا، بچ نکلتا تو خوش ہوتا اور اپنی عیاری پر ناز کرتا، مَیں پکڑا جاتا تو سزا پاتا، وقتی طور پر شرمندہ ہوتا اور مکر و فریب کے نئے طریقے سوچتا۔ جس کام سے مجھے روکا جاتا مَیں وہی کرتا کیوں کہ مَیں سمجھتا تھا کہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے جس کا جاننا میرے لئے ضروری ہے۔ مَیں کسی فعل سے باز آتا تو وہ میرے تجربے کی ہدایت کا نتیجہ ہوتا نہ کہ دوسروں کی روک ٹوک کا۔ مَیں مویشی چراتا اور کاندھوں پر ڈنڈا رکھ کر بڑوں کی نقل اُتارتا اور اُنہیں کی طرح مویشیوں کو گالیاں دیتا۔ مَیں بڑوں کے جُوتے پہن کر ٹھپ ٹھپ چلتا اور سوچتا کہ مَیں بڑا ہو گیا ہوں، مجھے وہ سب کرنے کا حق ہے جو بڑے کرتے ہیں۔ میری خود پسندی اتایا جی کی اخلاقی کہانیوں سے مجھے چرواہوں کے فاسق و فاجر قصے زندگی کے قریب اور بھرپور لگتے۔ مَیں اُنہیں زیادہ انہماک سے سُنتا اور اپنی نگرانی سے اپنی روانی میں تسلی پاتا۔ مَیں اُن فطری وجدانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا جن کا مظاہرہ مجھ سے بڑے چرواہے کرتے تھے۔ مَیں یہ بات پسند کرتا اور کبھی وہ، ہر جذبہ عارضی ہوتا اور ہر واقعہ وقتی۔ میری زندگی ایسی سرکشی تھی جو یہاں کچلی جاتی تو وہاں سر اُٹھاتی، وہاں روندی جاتی تو یہاں اُبھرتی۔ میری ملامت میں میری ہٹ تھی اور میری تعریف میں تحریک۔ مویشی چراتے ہوئے مجھے پانی پینا ہوتا تو مَیں ریت میں جھری لگاتا۔ اُس میں پانی رِسنے لگتا اور مَیں درانتی سے نرسل کاٹ کر نلکی بنانے لگتا۔ نلکی تیار ہونے پر میری بے صبری بڑھتی اور مَیں جھری پر بیٹھ کر سیٹرہ کو بے چینی سے دیکھتا جو اپنے ساتھ ریت بہا کر لاتی اور جھری کا دائرہ بڑھاتی۔ میری بے چینی میں کھوج کا عنصر سما جاتا اور مَیں جھری کو غور سے دیکھتا۔ پانی پر ابرق کی نامعلوم سی تہ جمی ہوتی۔ میری پیاس پُراسرار طریقے سے بُجھ جاتی اور مَیں اُن پہاڑوں کو دیکھتا جن پر سے ابرق ملی ریت بہہ کر آتی تھی۔ مَیں پہاڑ دیکھنے کی خواہش کرتا۔ بڑے بُوڑھے کہتے تھے کہ اُس پہاڑ پر شیوجی پاروتی کا مندر ہے۔ پہاڑ کے پیچھے پہاڑ تھا اور اُس کے پیچھے پھر پہاڑ، وہ کس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے تھے، میری سمجھ میں نہ آتا۔ مَیں اپنی جان کاری کے لئے پھر پوچھتا اور وہی جواب سُنتا جو سُنتا آیا تھا۔ میری تحقیق پسند فطرت کی تسکین نہ ہوتی، مَیں کڑھ کر رہ جاتا لیکن میرا تجسس بدستور قائم رہتا۔ اُس تعلق سے مَیں کئی واقعے تفصیل سے بیان کر سکتا ہوں۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ میرے پڑھنے والے موضوع کی یکسانیت سے اُکتا جائیں گے، اِس لئے مَیں ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

"تایا جی! وہ کیا ہیں؟" مَیں لمبی قطار میں اُڑتے پاکھیوں کی طرف اشارہ کر کے پُوچھتا۔

"مہمان پاکھی ہیں، کونجیں۔" تایا جی آسمان پر دیکھ کر کہتے۔

"یہ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ہمالہ سے پرے دُور دیش سے۔"

"آپ پہلے کہتے تھے کہ ہمالہ سے پرے کوئی دیش نہیں ہے؟"

"وہ میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔"

"آپ نے یوں ہی کیوں کہہ دیا تھا؟"

"کئی باتیں بچّوں کو یوں ہی بھی بتائی جاتی ہیں۔"

"آپ مجھے یوں ہی کچھ نہ بتایا کریں، مَیں بچّہ نہیں ہوں!"

مَیں وثوق سے کہہ رہا ہُوں کہ میری تحقیق طلبی میری سَرگرانی رہی ہے، اُس کی شِدّت کچھ بھی ہو۔ جِھری، پانی سے بھر جاتی۔ مَیں گھٹنے ٹیک کر جِھری پر جُھکتا اور نلکی پانی میں رکھتا۔ ابرق کی تہہ کھِنچتی اور جڑ جاتی جیسے اُس کے ذرّوں میں مقناطیسی کشش ہو۔ مَیں نلکی سے ہلکے ہلکے گھُونٹ بھرتا، گہرا گھُونٹ کھینچنے سے پرہیز کرتا اِس لئے کہ تیزی سے چڑھتا ہُوا پانی اپنے ساتھ ریت سمیٹ لاتا۔ مَیں پھیکے شربت کا سا پانی پی کر مُنہ سنوارتا، گھٹنوں پر سے ریت جھاڑتا اور اپنے ڈنگروں کو دیکھتا، وُہ چرتے چرتے دُور نِکل گئے ہوتے۔ مَیں اُن کی جانب بھاگتا، ہاتھوں کو پَرِ پرواز کی طرح پھیلاتا اور اُڑنے کی تمنّا کرتا ہُوا اُوپر اُچھلتا، زمین پر گرتا اور نئی تب و تاب سے اُٹھ کر شترمرغ کی طرح بھاگتا ہُوا لگاتا۔

مَیں اُڑ کے گُراں دے جاواں
جے کھمب مِلدے ہون بزاریں
(اگر پرِ پرواز بازار میں مِلتے ہوں تو مَیں اُڑ کر گُرو کے پاس چلا جاؤں)

میرا شوق مجھے آسمان پر اُڑاتا جو عملی طور پر میری پہنچ سے باہر تھا۔ مَیں تخیّل و عمل سے یکساں مرعُوب تھا۔ دونوں خُوبصورت تھے لیکن تایاجی کی فراست میں الگ الگ معنی رکھتے تھے۔ پہلا دستِ بیزاری تھا اور دُوسرا دستِ کاری۔ مَیں روایتی سکُول سے دُور تھا لیکن میری معلُومات تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ تایاجی ٹھیک کہتے تھے، "زندگی سب سے بڑا مدرسہ ہے اِس لئے کہ علم کی تجربہ گاہ ہے۔"

اُن کی باتوں کی سچائی مَیں بار ہا آزما چکا تھا۔ ایک چھوٹا سا تجربہ بیان کرتا ہُوں کیوں کہ اُسے کئی طرح سے دوہرایا گیا تھا۔ ہماری بھینس منسی نے اپنی زنجیر کھولنے کا فن سیکھ لیا۔ ہر کسی کو تاکید تھی کہ وُہ منسی کو باندھتے ہُوئے زنجیر کو دوہرا اگلاواں دے لیکن منسی کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوگئی اور دوہرا اگلاواں بھی کھولنے لگی۔ بھائیاجی نے ایسا کھُنٹا گاڑا جس کے سَر پر دو شاخہ تھا اور زنجیر کو تالا لگا دیا۔ پہلی مُصیبت دُور ہوتے ہی دُوسری آ پڑی، تالے کی چابی گُم ہو گئی اور تالا توڑنا پڑا۔ بھائیاجی نے ایک تھم گاڑا جس کی اُونچائی منسی کے سَر سے اُونچی رکھی۔ وُہ شریر زنجیر ڈھیلی کر لیتی لیکن اُسے اُٹھا کر تھم سے باہر نہ نکال سکتی۔ اِس سے یہ دشواری پیدا ہُوئی کہ بچّے اُسے تھم سے نہ کھول سکتے اور نہ

باندھ سکتے۔ تایا جی نے اِس مُشکل کا فنّی حل نِکالا اور زنجیر کے کُنڈے میں مزید آنکڑا ڈال دیا جو خُود بخود مُقفّل ہوتا تھا لیکن دبانے سے کھُلتا تھا۔

کالے آم کے پاس ڈِھی میں بھڑوں کے چھتّے تھے۔ وُہ بیساکھ میں پُرانے چھتّے چھوڑ کر نئے چھتّے بناتیں اور انڈے دیتیں۔ جوان بھڑیں پیدا ہوتے ہی نِڈر ہوتیں اور پاس سے گزُرنے والوں پر حملے کرتیں۔ ماگھ میں اُن کا رنگ بدلتا اور وُہ سُست اور تھکی ماندی لگتیں۔ پوس میں اُن کے پیچھے موٹے ہو جاتے، ڈنک گِر جاتے اور وُہ کھُلے کھلانے لگتے میں انُہیں پکڑتا، اُن کی کمر میں دھاگا باندھتا اور کیئوں کو ایک ساتھ اُڑاتا اور خُوش ہوتا۔

مَیں نے کب اور کیسے تیرنا سیکھا! یہ بتانا مُشکل ہے کیوں کہ مَیں نے جب سے ہاتھ پیر نِکالے تھے، پانی سے میری فطری دوستی تھی۔ کڑاکے کی سردی ہو یا جھُلساتی گرمی، غُسل کرنا معمولِ سحر تھا ورنہ ماں سحری نہ دیتی تھی۔ مَیں جاڑے میں آب جُو میں ڈُھم (آب جُو میں تالاب) میں نہاتا یا کنُوئیں پر۔ ڈُھم کا گہرا پانی آب جُو کے بہتے پتلے پانی سے گرم ہوتا لیکن کنُوئیں پر نہانے کا مزہ ہی اور تھا۔ کنُوئیں کا پانی فضا کے مُقابلے میں گرم ہوتا، گیلے بدن سے بھاپ کے مرغولے اُٹھتے جو ایک منظر ہوتے۔ جِس کسی نے برفیلی سردی میں کنُوئیں پر تازہ پانی سے نہایا ہے اُسی نے وُہ لُطف اُٹھایا ہے۔ پانی کا پہلا ڈول ڈالنے سے پہلے جو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ رہتی ہے وُہی ایک ناگوار صورتِ حال ہے، پھر تو جی چاہتا ہے کہ نہاتے جاؤ اور نہاتے جاؤ۔ مَیں گرمی میں آب جُو میں نہانا پسند کرتا تھا۔ یہاں نہانا اوّل سے آخر تک مسرّت تھا۔ مَیں پہلے کوئی خوبصورت مقام چُنتا، کپڑے اُتار کر کنارے پر رکھتا اور پتلے بہتے پانی میں گڑھا کھودتا۔ میرے گڑھا کھودنے کا انداز خُوش طبعی تھا۔ مَیں ایک جگہ پر ناچتا، ناچتا اور ناچتا۔ ریت پانی میں گھُل کر بہتی، میرے ناچ کی تال بدلتی جو گڑھے کی بڑھتی ہُوئی گہرائی کا سُراغ دیتی۔ ایک مخصُوص تال سُنتے ہی مَیں ناچنا بند کرتا اور گڑھے سے باہر نکل کر کھڑا ہو جاتا اور گدلے پانی کو دیکھتا۔ وُہ جِس طرح خُود کو نکھارتا، اُسے دیکھ کر مَیں نہایت لطیف انداز میں سوچتا کہ فطرت میں ہر چیز اپنے آپ کو سنوارنے میں مصرُوف ہے۔

تایا جی مناظرِ فطرت سے لُطف اُٹھاتے ہُوئے کہتے تھے، ”فطرت رنگا رنگ کارواں کی طرح رواں دواں ہے، جِس کا سب سے بڑا ناظر، کِسان ہے۔“

ہمارے گھر سے دو اڑھائی سو گز کے فاصلے پر ہریانہ شام چوراسی سڑک تھی۔ مَیں اُدھر مویشی چرانا پسند کرتا تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اُدھر صاف سُتھرے لوگ دِکھائی دیتے تھے جو ہریانہ کو جاتے آتے رہتے تھے۔ دُوسری وجہ یہ ہے کہ اُدھر بیلا نہ تھا اِس لئے موڑی (ڈنگروں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روکنا) کم لگانی پڑتی تھی۔ سڑک کے پار دُوبی دوالا تھا۔ کہتے ہیں کہ وُہ دوالا اُس گاؤں کا تھا جو ڈڈیانہ کلاں آباد ہونے سے پہلے، کون جانے کب؟ برباد ہُوا تھا۔ اُس دوالے میں صرف باوے جاتے تھے لیکن گاؤں والے اُس کے اطراف کی ہر شے کو مُتبرک سمجھتے تھے۔

اُس کے تالاب میں اِتنی مچھلیاں تھیں کہ کوئی ٹاپ لئے تالاب میں اُترے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا بھر لے لیکن لوگ اُن کو جلالی مچھلیاں کہتے تھے اِس لئے پکڑتے نہ تھے۔ اُدھر سب سے پُراسرار چیز ست رُکھا تھا جس پر آم، جامن، کھجور، بیری، گرونا، بڑ اور پیپل پھلتے تھے۔ اُس کے پھلوں کو لوگ پرساد مانتے تھے لیکن اُوپر سے توڑتے نہ تھے اور گرا ہوا ہی اُٹھا کر کھاتے تھے۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ وہ انوکھا درخت کورَو، پانڈو کے زمانے سے ہے اور بھگوان کرشن کے ہاتھوں کا لگایا ہُوا ہے۔ اِس کی کہانی یہ ہے کہ پانڈو کے اگیات باس (پانڈو کے بَن باس کا تیرھواں سال جو انہوں نے چھپ کر گزارا تھا) میں وہ وہاں آم کھا رہے تھے۔ آم جتنے سُندر تھے اُس سے زیادہ میٹھے! دروپدی کے دِل میں خیال آیا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ آم سِری کرشن بھی کھاتے! اور کرشن آپدھارے اور اپنا حصّہ مانگ کر کھانے لگے۔ دروپدی نے خوش ہو کر پُوچھا "سرب کامی! آم کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے ہیں! ایک پھل میں سات پھلوں کا سواد ہے!" بھگوان کرشن نے خوش ہو کر کہا اور جو آم کھایا تھا اُس کی گٹھلی کو بو دیا اور گنگا میّا کو آواز دے کر کہا۔ "گنگا میّا! ہم ست رُکھا بو رہے ہیں، اِسے ہرا رکھنا!" اور گنگا میّا نے پرگھٹ ہو کر وعدہ کیا، "بھگوان، تیری مرضی میری خوشی ہے!" اُسی دِن سے وہاں گنگا بہنے لگی۔ پنج وٹی (ہوشیار پُور اور اُس کے اُوپر ترائی کا علاقہ) کی رانی کو پتا چلا تو اُس نے وہاں دوالا اور گھاٹ بنوا دیا۔ وہ ہر پُورنیما کو وہاں اشنان کرنے آتی تھی اور دوالے میں پُوجا کر کے جاتی تھی۔

ایک بار برسات میں آبِ جُو نے پیٹا بدلا اور ست رُکھے کی جانب کھار لگا دی۔ باوے کُندن نے افواہ پھیلا دی کہ گنگا میّا، ست رُکھے کے پاؤں چُومنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہے لیکن گنگا میّا نے اُسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔ تایا جی کہتے تھے، "جذبہ پرستش کی نفسیات عجیب ہے۔ یہ اپنے عمل کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے خدا کو قُربانی کا بکرا بناتا ہے۔"

وُہی بات ہوئی، لوگ کہنے لگے کہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔

اُس زمانے کو گزرے ہُوئے زمانہ ہُوا ہے لیکن اُس کے پَل چھِن ذہن میں ایسے آ رہے ہیں جیسے غنچے کھِل کر مہکنے لگیں۔ میری یادوں کی کارفرمائی! مَیں اُن جگہوں کی سیر کرتا ہُوں جو وقت کے جاگرٹ (جگن ناتھ مندر کا رتھ، جس کے بارے میں روایت ہے کہ اُس کے نیچے آ کر مرنے سے مُکتی ملتی ہے) نے روند ڈالی ہیں۔ مَیں اُن چہروں کو دیکھتا ہُوں جو مِٹ کر مٹّی ہو گئے ہیں۔ میرے قارئین شاید حیران ہوں! مَیں اُن ناپائیدار مناظر کو بھی دیکھتا ہُوں جو دیکھتے دیکھتے کُچھ سے کُچھ ہو جاتے تھے اور اپنی ہر بناوٹ میں پہلے سے زیادہ دِل فریب لگتے تھے۔ وہ جِن جاں گُدازیوں کو جنم دیتے تھے، وہ اِس وقت بھی میری رگوں کا تھرکتا ہُوا حصّہ ہیں۔

کبھی کبھی چوپال میں نقّال آتے اور نقّالی کرتے۔

ماں گئی ہے
راگ لیائے گی
چھک چھن نن نن

وہ یہ تینوں مصرعے دوہراتے اور دوہراتے اور بیزاری کی حد تک دوہراتے۔ ان کا ایک آدمی تماش بینوں میں بیٹھا ہوتا، وہ اُٹھ کر ان کو گالی دیتا، "حرام زادو، پھر آگے کیا ہوا؟"

نقالوں کی منڈلی اسی موقعے کی تاک میں ہوتی۔ ان کا اگوا آگے بڑھتا اور منہ لٹکا کر کہتا۔ "چوہدری جی، ماں گئی ہے۔ آئی نہیں! وہ آئے گی تو راگ لائے گی" یہ کہہ کر وہ بندر کی طرح ٹپوسی لگا کر اپنی منڈلی میں جا ملتا اور چھک چھن نن نن، کی رٹ پھر سے شروع کر دیتا۔

ان کو دیکھنے سے لگتا کہ وہ مستی میں بے خبر ناچ رہے ہیں لیکن کوئی بیل دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتا تو وہ اس کا جائزہ ایسے لیتے جیسے گدھ مردار کو دیکھ لیتے ہیں، خواہ کوسوں کی دوری پر ہو۔

"تیرا نام؟" نقالوں میں سے ایک نقال تھانے دار بن جاتا اور وہ کسی دوسرے کے چوتڑوں پر پھٹا ہوا بانس مار کر پوچھتا جو زور سے آواز پیدا کرتا۔

"جوگا جناب!" وہ عاجزی سے جھک جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

"تیرے باپ کا نام؟"

"جوگا جناب!"

"تیرے باپ کے باپ کا نام؟"

"جوگا جناب!"

"تیرے باپ کے باپ کے باپ کا نام؟"

"جوگا جناب"

"تیرے باپ ..."

"جوگا، جوگا، جوگا جناب!"

تھانیدار پریشان اور گھبرایا ہوا کہتا۔ "ہماری سمجھ میں نہیں آیا"

"اِس میں سمجھنے کی کیا بات ہے جناب؟ جیسے گدھے کا بیٹا گدھا، جوگے کا بیٹا جوگا!"

گوگا پیر کے تیوہار پر ماں سویاں بناتی۔ رنگ برنگی جوا سویاں وہ گھڑے کے پیندے کی مدد سے بناتی اور سادہ سویاں گھوڑی سے۔ جوا سویاں بنانے کے لئے میں ماں کی نقل کرتا لیکن ویسی نہ بنا سکتا۔ میری کوشش

کا نتیجہ مَیدے کے بدنُما لوندے ہوتے تھے۔ ماں مَیدے کے گولے سے لمبی ڈوری بناتی، اُسے کھبّے ہاتھ میں پکڑتی، پھر انگوٹھے اور انگشتِ شہادت اور بڑی اُنگلی اور ہتھیلی کی مدد سے اُسے آگے سجّے ہاتھ کی طرف وقفے وقفے سے ایسے سرکاتی کہ ہر بار اُس کی پَتی تُلی لمبائی ہی آگے بڑھتی۔ وُہ اُسے انگوٹھے اور بڑی اُنگلی سے توڑتی مروڑتی اور نیچے چھاج میں گراتی۔ اُس کی سویّاں ایک جیسی لمبی، ایک جیسی موٹی اور ایک جیسی بَل دار ہوتیں۔ مَیں کوشش پر کوشش کرتا لیکن وُہ نہ کر سکتا جو کرنا چاہتا۔ ماں تھوڑی دیر تک مجھے برداشت کرتی اور پھر مجھ سے آٹا چھین لیتی۔ مَیں کڑھ کر رہ جاتا۔ وُہ میرے دِل بہلاوے کے لئے مجھے ترغیب دیتی، "جو اسویّاں بنانی سیکھنی ہیں تو پہلے چُٹکی بجانی سیکھ، یُوں!" وُہ چُٹکی بجا کر دکھاتی۔ مَیں نے چُٹکی بجانی سیکھ لی لیکن مَیں جو اسویّاں بنانے میں ناکام رہا۔ مَیں اپنے اور ماں کے عمل کا تجزیہ کیسے کروں؟ میرے عمل کا حاصل چُٹکی تھی اور ماں کے عمل کا حاصل سویّیں۔

ماں کھوڑی پر سویّاں بناتی تو مَیں خُوش ہوتا کیوں کہ اُسے میری مدد درکار ہوتی۔ مَیں بھاگ بھاگ کر زمین پر چادریں بچھاتا، اُن پر چارپائیاں اُلٹی رکھتا، پایوں کو عمُودی، متوازی، قُطری رسیاں کس کر باندھتا لیکن ماں ہدایت پر ہدایت کرتی جاتی، "رسّی کس کر باندھ!"

"ہاں ماں! مَیں رسّی کس کر ہی باندھ رہا ہُوں۔" مَیں رسّی کو ٹُنکا مار کر اُس کی جانچ کرتا اور وثُوق سے کہتا۔

"اور کس کر باندھ کر!" وُہ آٹا ملتی ہُوئی دُور سے دیکھ کر کہتی جیسے اُس کی نظریں میرے ہاتھوں سے زیادہ مشّاق اور بھروسے مند ہوں۔

مَیں رسّی کھولتا اور اپنا پاؤں پائے کے مُقابِل رکھ کر زور لگاتا اور رسّی کستا۔ ماں دیکھتی اور تشویش بھرے لہجے میں کہتی، "بس! بس! پایہ ٹُوٹ جائے گا۔"

اُس کی نکتہ چینی سے مجھے لگتا کہ چھوٹے جو کرتے ہیں اُس میں نقص نکالنا بڑوں کی عادت ہے۔

مَیں گالا لگاتا تو ماں کھوڑی چلاتی اور مَیں کھوڑی چلاتا تو وُہ گالا لگاتی۔ جو گالا لگاتا وُہی سویّاں توڑ کر پھیلاتا۔ میری سویّاں توڑنے کی باری ہوتی تو مَیں لمبے سے لمبا تار نکالتا لیکن ماں مجھے روکتی، "زیادہ لمبا تار مت نِکال، سویّاں توڑ کر ہی کھانی ہیں۔" اُس کی بات دُرست ہوتی لیکن مجھے بُری لگتی کیوں کہ اُس سے میری ہیٹی ہوتی۔ علاوہ ازیں سویّوں کے لمبے تار مجھے بھلے لگتے تھے۔ جب مَیں بڑوں کے ساتھ ہوتا، عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا۔ کوئی موقع ایسا نہ ہوتا جب میری کارگزاری پر حملہ نہ ہوتا۔ مَیں چُولہا چلانے کے لئے گھاس پھُوس لاتا تو بھی مجھے بُرا بھلا سُننا پڑتا۔ اِتنے سارے پھُوس سے تین بار چُولہا جلے گا! ماں اُس میں سے دو تہائی پھُوس نِکال کر الگ رکھ دیتی اور کہتی، جاؤ، اِسے وہیں رکھ آؤ!

ایک بار ماں نے مجھے چولہا سلگانے کو کہا۔ مَیں نے چولہے میں پرال ڈالی، اس پر لکڑیوں کا اُجھیلنا لگایا، مٹی کا تیل ڈالا اور دیا سلائی سے جلا دیا۔ میری کاریگری بھایا جی نے دیکھ لی۔ وہ چپکے سے میرے پاس آئے اور مجھے ٹانگوں سے اُٹھا کر چولہے میں جھوک دیا۔ مَیں خوف سے دہاڑا، جیسے کیسے اُن کی پکڑ سے چھوٹا، بھاگا اور جا کر ماں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "تُو نے جو کیا ہے اُس سے مجھے اتنا دُکھ پہنچا ہے۔"

گوگا پیر کی چھڑی ایک عجیب چیز تھی۔ جہتر موٹے لمبے بانس کو دُودھ سے نہلاتے اور اُسے چھڑی مُبارک کہتے۔ وہ چھڑی پر جو گیا غلاف چڑھاتے اور پھر اُس سے جو تسمے باندھتے اُس کے ساتھ مُبارک کی اضافت لگاتے جاتے۔ وہ چھڑی کے پتلے سرے پر مور کے پنکھوں کا مُکٹ سجاتے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کلیرے (کلاوے میں پروئے ہُوئے کھوپرے اور کوڑیوں کے ہار) باندھتے اور بیچ بیچ میں رنگ برنگے رُومال۔ چھڑی کو سجا دھجا کر وہ اُسے کسی درخت کے سہارے کھڑی کر دیتے اور باری باری پوست مَلتے، جو پہلے سے بارِش میں بھگویا ہُوا ہوتا۔ وہ پوست ملتے ہُوئے گاتے۔

پوستا وے دِل دوستا وے
تیرا سونے چڑھاواں بُوٹا،
سو سو توں ودھ گلّاں تیریاں
لکھ لکھ توں ودھ جھوٹا،

(اے پوست، تو میرا دِلی دوست ہے۔ تیرے گنوں کے صدقے! میں چاہتا ہُوں کہ تیرے بُوٹے کو سونے کا غلاف پہناؤں۔ تیری بات کرنا تیرے گنوں کو کم کرنا ہے۔ تجھے پی کر جو جھونٹا آتا ہے اُس کی قیمت لاکھوں سے بڑھ کر ہے)

ململ کے کپڑے میں وہ پوست چھانتے، ٹوٹر میں میٹھا ملا کر بانٹ کر کھاتے اور پھر رس پیتے۔ وہ بڑ کے سائے میں لیٹ جاتے اور جُوں ہی پینک محسُوس کرتے، اُٹھتے، گوگے کی جے بُلاتے اور گاؤں کا رُخ کرتے۔

ایک پہلوان قسم کا آدمی گوگا کی چھڑی کو اُٹھا کر گوتھنی (کمر کے گرد باندھنے کا پٹکا، جس میں جیب ہو) میں رکھ لیتا اور اپنے ٹولے کے آگے آگے چلتا۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ ایک کے بعد ایک گھر میں جاتے، گوگا کا قصیدہ گاتے اور خیرات مانگتے۔ عقیدت مند خیرات دیتے اور چھڑی کو منّت کی ڈوری باندھتے اور سجدہ کرتے۔ پیرو کا بیٹا مہندی اتنا دُبلا، پتلا اور لمبا تھا کہ پاجامہ پہنے ہوتا تو پا بانسوں پر چلتا لگتا۔ باپ اور بیٹا ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے تو باپ اپنے بیٹے کی ناف سے کچھ ہی اُوپر پہنچتا۔ مہندی جتنا باسُرا تھا، پیرو اُتنا ہی بے سُرا۔ اُسے عادت تھی

کہ وُہ گاتا ہُوا جھنڈی کے مُنہ کی طرف دیکھتا تھا۔ اُن کی بے جوڑ جُگل بندی میں یُوں لگتا، گیت کے بول جھنڈی کے مُنہ سے پیرُو کے حلق میں گر رہے ہیں اَور وُہ اُنھیں نِگلنے کے بدلے اُگل رہا ہے۔ اُن کے مُختصر سے ساز کانسے کی کٹوریاں ہوتے تھے، جنہیں وُہ ہتھیلیوں پر رکھ کر لوہے کی سلائیوں سے بجاتے تھے۔

ویسے تو گوگا پیر دھرتی پر پَیدا ہُوا تھا لیکن اُس سے مَنسُوب کرامات آسمانی تھیں۔

فصل پکنے کے قریب آتی تو ہریانہ سے برہمن آتے اَور کھیتوں میں کُشا رکھتے پھرتے۔ کُشا ایک قسم کی گھاس ہے، جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ اُس گھاس سے لَو کا بھائی کُش پَیدا ہُوا تھا۔ اِس لئے اُس میں کسی بھی چیز کا حاصِل بڑھانے کی شکتی ہے۔ جب کھلیان تیار ہوتے، برہمن اپنا حِصّہ لینے کے لیے آتے روایات کی فرہنگ میں کُچھ نمبروں کو مُبارک اَور کُچھ کو نامُبارک سمجھا جاتا تھا۔ مُبارک نمبر بار بار بولا جاتا تھا اَور نامُبارک کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ایک کو 'برکت' بولا جاتا تھا، دو کو دو۔ تین کو 'زائد' اَور چار سے لے کر بارہ تک کے نمبر جُوں کے تُوں۔ تیرہ [۱۳] کو بار بار دوہرایا جاتا تھا۔ تیرہ [۱۳] نمبر کو پُوری دُنیا نامُبارک مانتی ہے لیکن سِکھ اِسے مُبارک خیال کرتے ہیں۔ اِس کے بارے میں مشہُور ہے کہ جب گرُو نانک سُلطان لودھی کے ذخیرہ خانے میں نوکر تھے، اُنھوں نے تیرہ، تیرہ، تیرہ کرتے ہُوئے اناج کا پُورا بھنڈار غریب غُربا میں بانٹ دیا تھا اَور پھر جب اُس کی جانچ پڑتال ہُوئی تھی تو اناج حساب کے مُطابق پایا گیا تھا۔

تایا جی ایسے ہر خیال اَور بات کا کھنڈن کرتے تھے جو روایات و کرامات کی تائید کرتی تھی۔ وُہ کہتے تھے کہ ایک بار میرے پاس دَھن راج بامَن آیا اَور کھیتوں میں کُشا رکھنے کا اِنعام مانگنے لگا۔ میں نے کہا "پروہت جی میری فصل کا حاصِل میرے لحاظ سے پچاس مَن کم ہُوا ہے۔ ایک بار پھر کُشا رکھو، منتر پڑھو، گھاٹا پُورا کرو اَور انعام لے جاؤ۔"

"سَردار جی، ایسے کیسے ہو سکتا ہے!" اُس نے کہا۔

"پروہت جی، پھر ویسے کیسے ہو سکتا ہے!" مَیں نے پُوچھا۔

"آپ بڑے ادھرمی ہیں! دھرم پِتا (خُدا) آپ کو ڈنڈ دے گا!" اُس نے سراپ دیا۔

"پروہت جی! اِس سے پہلے کہ آپ کا دھرم پِتا، مُجھے ڈنڈ دے۔ مَیں نے آپ کو دے دیا ہے۔

دَرشت گبر بچّے، باپ کی مُصیبت میں برابر کے حِصّے دار ہوتے ہیں۔" مَیں نے اُسے زندگی کا راز سمجھایا۔

اوہام پرستی کے گھور اندھیرے میں کسی کے پاس اپنی روشنی تھی تو وُہ تایا جی تھے۔ بھگدڑ کے خلاف چلنے میں کُچلے جانے کا یقین ہے لیکن وُہ چلتے تھے اَور اپنے اکیلے ہونے کو حق بجانب قرار دیتے تھے۔

سوچے بُوجھے گیانی ہوئے ⁂ اپنا آپ پچھانے سوئے

(سوچ سمجھ کر کام کرنے والا گیانی ہوتا ہے اَور وُہی اپنی حقیقت کو پہچانتا ہے)

انسان کی کاوشِ تلاش کو وُہ یوں بیان کرتے تھے۔ "فطرتِ کائنات میں جو تخلیقی اکمل ہے، وُہ فطرتِ انسان کا تحقیقی عمل ہے۔ پہلے میں زمانی و لازمانی اصلیت کے اسرار ہیں اور دُوسرے میں زمانی ولازمانی حقیقت کے مظاہر۔ یہ دونوں متوازی قوتیں ہیں جو صرف اپنے نقطۂ کمال پر ملتی ہیں اور پھر الگ ہو جاتی ہیں۔"

تایا جی کی آزادہ روی اور لوگوں کی تنگ نظری یوں تھی جیسے اندھیرے کے ساتھ اُجالا۔ میں اِدھر کھنچتا اور کبھی اُدھر۔ اُن کی باتوں میں تصوّر کا عنصر بالکل نہ تھا لیکن میری محرومیوں نے مجھے تصوّر کا شیدائی بنا رکھا تھا میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھا لیکن اُس ماحول میں ذہانت کو ایسے دخل تھا جیسے چُولہے میں پانی کو۔ وہاں جو طاقتور تھا وُہی ذہین تھا۔ وُہی خوبصورت تھا، وُہی شریف تھا۔ ایک طاقتوری ہزاروں خوبیوں پر بھاری تھی۔ لوگ جہاں بیٹھتے تھے، وہاں بہادروں اور جانبازوں کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے ساکھے اور رزم نامے بجویالوں اگرُودواروں میں سازوں پر گائے جاتے تھے۔ سُننے والے بیر رس سے سرشار جے کارے بُلاتے جیسے اُن تاریخی بہادروں، کی ظفریابی اُن کی ذاتی کامیابی ہو۔ ایسے اثر انگیز ماحول سے متاثر ہو کر تایا جی پہلے اِنسانی زندگی کو شاستروں کے لحاظ سے بیان کرتے اور پھر اپنے طریقے سے۔ شاستروں کے لحاظ سے زندگی نو رسوں سے تعبیر کی گئی ہے۔

۱	شِنگار رس	جذبہ جو آرائشِ ذات کی تحریک ہو۔
۲	ہاسیہ رس	جذبہ جو ہنسی کی تحریک ہو۔
۳	کرون رس	جذبہ جو رحم و کرم کی تحریک ہو۔
۴	رودھر رس	جذبہ جو قتل و غارت کی تحریک ہو۔
۵	بیر رس	جذبہ جو ظلم سے لڑنے کی تحریک ہو۔
۶	بھیانک رس	جذبہ جو بھے کی تحریک ہو۔
۷	ادبھوت رس	جذبہ جو اچنبھے کی تحریک ہو۔
۸	بیبھتسیا رس	جذبہ جو کسی سے نفرت کی تحریک ہو۔
۹	شانتی رس	جذبہ جو شانتی کی تحریک ہو۔

وُہ عمل جو جذبۂ رواداری سے عبارت ہو، تایا جی اُسے بھی شنگار رس کہتے تھے۔ "اپنی بے ضبط طاقت کی مہم آزمائی اور اُس سے لُطف اُٹھانے کی خاطر اِنسان نے کھیل کُود ایجاد کیے ہیں۔ کھیل کُود ایسا ہُنر ہے جو بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔"

میں بیر رس کو پسند کرتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ایشر سنگھ مجھے دیکھ کر کہتا تھا، "کاکا، تیرے میں کچھ ساہ ست (دم خم) نہیں ہے! تُو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟ اپنی ماں سے بول کر تجھے کھلایا پلایا کرے ورنہ

تیشے کلہاڑے کی جگہ کاسہ پکڑنا پڑے گا۔"

مَیں طاقتور اور جانباز بننا چاہتا تھا۔ مَیں تیل مالش اور کسرت کرنے لگا۔ اِس سے کوئی خاص فرق نہ پڑا تو مَیں دُودھ گھی چُرا کر کھانے لگا۔ چُوں کہ مَیں اعتدال پسندی سے ناواقف تھا، مَیں بدہضمی کا شکار رہنے لگا اور میری صحت گرنے لگی۔ آخر ماں نے میری چوری پکڑ لی۔ اُس نے مجھے سزا دی اور کھانے میں اعتدال برتنے کی نصیحت کی۔ "زیادہ کھانے سے آدمی تگڑا نہیں ہوتا۔ جتنا کھاؤ، اُتنا پچاؤ اور پھر کھاؤ، نہ کہ کملے کی طرح کھاتے رہو اور ساتھ ساتھ ہگتے رہو۔"

تایا جی نے اپنے انداز میں سمجھایا: "بدھی مان اِنسان، بلوان سے زیادہ بلوان ہوتا ہے کیوں کہ یہ اپنے بل کو وِگیانک طریقے سے بڑھا لیتا ہے۔ اپنے سہائے کے لئے اِس نے ہل بنایا اور اکیلا کئی معروف ہاتھوں کا کام کرنے لگا۔ تم بڑے ہو کر وِگیان پڑھنا، ہنر سیکھنا اور مُورکھ بلوان کو اپنے ڈھنگ سے پچھاڑنا۔"

ماں اور تایا جی کی بات دُرست سہی لیکن اِنسان ایسی محو بالذّات طاقت ہے جسے بیرونی اَثر سے مُتاثر کرنا نہایت مُشکل کام ہے۔

ایشر سِنگھ کے سارے لڑکے ہٹّے کٹّے تھے اور میرے میلانِ خاطر پر پُورے اُترتے تھے۔ مَیں اُن کے رہنے سہنے کے طور طریقے غور سے دیکھتا اور اُن پر عمل پیرا ہونا چاہتا تاکہ اُن جیسا بن سکوں۔ اُن کے اور ہمارے رہن سہن میں ایک ہی نُمایاں فرق تھا، وہ زیادہ تر پیازوں کی ترکاری کے ساتھ سُوکھی روٹی کھاتے تھے۔ مَیں نے اُن کے ہٹّا کٹّا ہونے کا راز پا لیا اور ماں سے ویسی ہی روٹی اور ترکاری بنانے کو کہا۔ اُس نے مجھے سمجھایا لیکن مَیں نے ضِد کی اور اُسے ویسی روٹی اور ترکاری بناتے ہی بنی۔ مَیں اپنے معمُول سے چار گُنا زیادہ کھا گیا لیکن بھُوکے کا بھُوکا رہا۔ اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کوسا اور چوکے سے اُٹھا دیا اور پھر بھُول کر بھی ویسا کھانا نہ بنایا۔ میرے خبط نے مجھے عبادات و مناجات کا سہارا لینے پر مجبُور کیا۔ مَیں بھیٹ یاد کرنے لگا اور وقت بے وقت گانے لگا لیکن مَیں جِسمانی اِعتبار سے وُہی رہا جو کہ تھا۔

جسّا سِنگھ کی وارتا (رزمیہ) بڑی جوشیلی تھی، مجھے سُنتے ہی یاد ہو گئی۔ مَیں وارتا گاتا ہوا محسُوس کرتا کہ مَیں جسّا سِنگھ ثانی ہُوں، جسے بھگوان نے دُشمنوں کا صفایا کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔

سَنت گُرچرن سِنگھ بھگتی رس کو سب رسوں سے اُتّم مانتا تھا اور دِن رات بھگوان کا نام جپا کرتا تھا۔ تایا جی اُس سے کہتے تھے، "گُرچرن سیاں، کوئی کام کیا کر! کام میں سَرب رس ہیں۔"

تایا جی کہتے تھے، "شنگار رس، سَرب رس ہے اور عِلم و ہُنر اِس کی اعلیٰ ترین صُورتیں ہیں۔ جنم کے وقت بچّے کی جات دیکھتے ہیں، پھر صِحت اور پھر صُورت، بچّہ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے، اُس کی عقل کی

اہمیت بڑھنے لگتی ہے اور پھر ایک مقام آتا ہے جب اُس کی پہچان صرف علم و ہنر سے ہوتی ہے۔"

باب ۷

میں نے عنوان دیا ہے ہر شے کو
زندگی کیا ہے؟ میرا طرزِ بیاں (شاطر)

اجیت سنگھ سے میری گہری دُشمنی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میرے پیٹ میں مروڑے پڑتے، ٹانگیں کانپتیں اور حلق میں پھوڑا سا اُگ آتا۔ میں اُس سے بدلہ لینا چاہتا تھا، اُنگلیاں گھُسانے کا، گچھّوں میں موتنے کا، گال توڑنے کا بدلہ! لیکن میرا اُبال کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ اجیت سنگھ میرے ہمنام گیان سنگھ سے ڈرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اُسی کی طرح تگڑا ہو جاؤں۔ میں اپنی کمزوری کی شکایت ماں سے کرتا تو وہ مجھے ایک سُجھاؤ دیتی، "تم گُرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیکو اور دِل سے دُعا کرو، تمہارے منورتھ پورے ہوں گے!"

میں گُرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیکنے جاتا اور اُس کی جسامت اور شوکت سے اِس قدر مرعوب ہوتا کہ میں خوشی سے سر نِواتا لیکن سر اُٹھاتا ہُوا خوف کھاتا۔ میں ڈرتا کہ اگر میں نے صحیح طریقے سے اور عقیدے کے ساتھ سجدہ نہ کیا تو گُرو، مُجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور مجھے سراپ دے دیں گے۔ میری یہ نفسیات دھارمک کتھاؤں کی پیدا کردہ تھی۔ میں لمبا سجدہ کر کے اُٹھتا اور اپنے آپ کو دیکھتا اور محسوس کرتا کہ میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ میں تھا۔ میرا عقیدہ! میں نِراس نہ ہوتا اور اُمید کرتا کہ گُرو کرپا سے میرا گوہرِ مقصود مجھے مِل کر رہے گا جیسے ہر بھگت کو مِلا تھا۔ چُوں کہ بھگوان سرب شکتی مان تھا وہ ناری کو پُرش، نربل کو بلوان اور کاگ کو ہنس بنا سکتا تھا۔

میرے دُودھ کے دانت ٹُوٹ گئے۔ اپنا کھونڈا پن مجھے بدنما لگتا اور میں ماں سے پوچھتا،

"ماں ماں! میرے دانت کہاں گئے؟"

"چُوہا لے گیا!"

"چُوہا کیوں لے گیا؟"

"تُو زیادہ میٹھا کھاتا ہے اور جو میٹھا زیادہ کھاتا ہے، اُس کے دانت میٹھے ہو جاتے ہیں۔"

"میں میٹھا نہیں کھاؤں گا! چُوہے سے کہو کر میرے دانت مجھے لوٹا دے۔"

"میں گروجی سے کہوں گی کہ وہ چوہے سے کہے کہ تیرے دانت واپس کر دے۔"

"تم گروجی سے کیوں کہو گی؟ سیدھا چوہے سے کیوں نہیں کہتیں؟"

"گروجی سے ساری خلقت ڈرتی ہے؛ اِس لئے اُس کا کہا جلدی مانتی ہے۔"

"گروجی سے ساری خلقت کیوں ڈرتی ہے؟"

"وہ سب سے طاقتور ہے اور سب کا رکھوالا ہے۔"

میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ماں گرو کو دیر سے کہے اور وہ پھر چوہے سے۔ میں گردوارے گیا سجدہ کیا اور عرض گزاری "گروجی، میری بھول مُعاف کرو! میں اب میٹھا نہیں کھاؤں گا۔ آپ چوہے سے کہیئے کہ وہ میرے دانت واپس کر دے۔"

میں ارداس کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھول گیا کہ مجھے میٹھا نہیں کھانا ہے۔ میں میٹھا کھاتا رہا لیکن اِس کے باوجود میرے دانت مجھے واپس مل گئے۔

بیساکھی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں کار سیوا میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہا تھا۔ گردوارے کے احاطے کی نئی دیوار بنائی جا رہی تھی۔ میں اینٹیں تر کر کے چرن سنگھ اور سیوا سنگھ کو پکڑا رہا تھا۔ وہ دونوں دھرم ارتھ کام کر رہے تھے، جس سے میرے جذبات متحرک ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ دُکھ رہے تھے لیکن میں نے بھگوان کو من میں بسا رکھا تھا۔ میں حقیر سے حقیر کام سچّے دل اور سدبھاونا سے کر رہا تھا اور اپنے ایمان سے اُس کے گھناؤنے پن کو خوبصورتی میں بدل رہا تھا۔ میں نے سنگت کے جوتوں کو اپنے سر کے رومال سے صاف کیا تھا اور اُسے ویسے ہی سر پر باندھ لیا تھا۔ یہ دھارمک کتھاؤں کا نفسیاتی اثر تھا۔ سنگت سیوا (خدمتِ خلق) اور نام دان (وہ پُر اسرار کلمہ جو گرو اپنے چیلے کی خدمت سے خوش ہو کر اُس کے کان میں کہتا ہے) سے ایسے ویسے لوگ کیسے کیسے بن گئے تھے۔ گرو اور سکھ کے رشتے کی بُنیاد روحانی اصلاح پر ہے جو اپنے کمال میں خدا سے ملتی ہے اور اُسے قدرتِ کاملہ کی وارث بناتی ہے۔ ایک سکھ نے گرو کی جھوٹن کھائی تھی جس سے اُس میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اُس نے مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے ایسا کر ہی دیا ہوتا اگر گرو نے اُسے وقت پر نہ روک لیا ہوتا۔ یہ کتھائیں نے از سرِ نو سُنیں تو اِس کی جادو اثری اور ہی تھی۔

دلیل کا رشتہ دلیل سے ہے اور اعتقاد کا اعتقاد سے۔ آخری حق و باطل میں فرق مٹا دیتا ہے اور اِنسان کو مشکل کام آسان طریقے سے کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور صحیح مقصد کے لئے غلط طریقہ کار آزمانے پر اُکساتا ہے کیوں کہ اعتقاد کی انتہا یہ ہے، جو ہے، وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے، وہ ہے۔

میں اپنے بھائی کی جھوٹی تھالی میں کھانا نہ کھاتا تھا لیکن جوں ہی لنگر سمایت ہُوا اور جھوٹن ایک جگہ

جھنکی گئی، میں نے جھوٹن کی مٹھی بھری اور کھالی۔ میری نفسیاتی کیفیت! مجھے لگا کہ مجھ میں بے حساب زور بھر گیا ہے۔ میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اور مکّا، ہوا میں لہرانے لگا۔ اُس کی طاقت اور ضرب کچھ اور ہی تھی۔ راج مل کے کارخانے کے باہر اجیت سنگھ کوڑیاں کھیل رہا تھا، میں وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بالکل ڈر نہ لگا جب وہ اپنی باری کھیلنے کے لئے جھک کر کوڑیاں اُٹھانے لگا، میں نے اُس کے پیچھے سے اُسے زور سے گھسّا مارا اور نیچے گرادیا۔ میں اپنی طاقت کے مظاہرے پر خوش ہوا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کپڑے جھاڑتا اور گالیاں دیتا ہوا اُٹھا اور کوڑیاں پھینک کر مجھ پر پلٹا۔ میں نے جے کارہ بُلا کر مکّا لہرایا، اُس میں وہی زور تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے محسوس کیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کے جھٹکے سے میرا وار ناکارہ کر دیا اور مجھے کیسوں سے پکڑ لیا۔ میں بہت کسمسایا لیکن اپنے کیس اُس سے چھُڑوا نہ سکا۔ اُس نے مجھے چرخے کی طرح گھمایا اور دُور پھینک دیا۔ میرا سر زمین سے ٹکرایا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے ہوش آیا تو میرے ماتھے پر گومڑا اُبھرا ہوا تھا۔ میں وہاں اکیلا پڑا تھا، ذلیل کیا ہوا، ہارا ہوا جیسے کوئی بے دست و پا۔ میں نے اپنے سارے عمل پر غور کیا اور اپنی شکست کو اپنی عقیدت کی ناتمامی سے تعبیر کیا۔

بیساکھی کی رات وڈیروں (بزرگوں) کی سمادھی پر چراغ جلایا جاتا تھا۔ دوسری ریت رواج کی طرح تایا جی اِسے بھی واہیات سمجھتے تھے۔ چراغ جلانے کے لئے بھائیا جی جاتے تھے یا تایا ملکھی رام۔ شام ہو رہی تھی اور ماں پوجا کا تھال تیار کر رہی تھی۔ اُس نے تھال کے وسط میں 'ست بجا' رکھا، پانی کی بالٹی میں بھگوئے ہوئے چراغوں میں سے ایک چراغ نکالا، جھٹکا، اُس میں فتیلہ لگایا اور 'ست بجے' کے بیچ میں رکھ کر اوپر سے دبایا۔ چراغ کے اُوپر ہاتھ رکھنے سے وہ 'ست بجے' میں ایسے دھنسا کہ چاروں طرف کناروں تک ڈھک گیا اور یوں لگا کہ اُسے کسی ٹھوس چیز میں سے کھرچ کر بنایا ہے۔ بھائیا جی پیڑھے پر بیٹھے رومال تہ کر رہے تھے اور کبھی تہ بہ تہ رومال کو کھول رہے تھے۔ وہ رومال سے کھیلتے ہوئے اُس اہتمام پر نظر رکھے ہوئے تھے جس کا مظاہرہ ماں بڑے قرینے سے کر رہی تھی۔ تھال میں مُشک پور اور گھی کی کٹوری ساتھ ساتھ رکھی تھی اور اُن سے کچھ دوری پر آگ پیٹی، جسے بھائیا جی ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ ماں نے سر ڈھانک کر پوجا سمگری کو نمسکار کیا اور بھائیا جی کی طرف دیکھا جیسے کہا کہ پوجا کا تھال تیار ہے، آپ لے جا سکتے ہیں۔ بھائیا جی پیڑھے پر سے اُٹھے اور تھال کے پاس جا کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے آگ پیٹی اُٹھا کر جھنکائی اور پھر وہیں رکھ دی جہاں سے اُٹھائی تھی۔ اُنہوں نے رومال پھیلا کر جھٹکا، تھال کو ڈھانکا، بھگوان کا نام لیا اور تھال اُٹھا کر کھیتوں کا رُخ کیا۔ اُنہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے چُنا تھا اور میں گنگا ساگر لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ اُنہیں دیکھ کر میں پانی چھڑکاتے ہوئے آگے چل پڑا اور وہ میرے پیچھے۔ ہم نیائیاں

(گندا) پار نہ کئے تھے اور بھیکو نمبردار کے کھیت کی لمبائی سے نیچے آب جُو میں اُتر رہے تھے کہ وہاں تایا جی کھیتوں سے آتے ملے۔ وہ چادر کی ڈھیلی سی گانٹھ میں تھوڑا سا گھاس سکلٹے کی طرح اُٹھائے جھکے جھکے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ اُنھوں نے اُسے اُتار کر نیچے رکھا اور سیدھے کھڑے ہوکر کہا، "رتن میاں! ساری دھرتی پُرکھوں ہی کی بستی ہے۔ اُن کی مٹّی سے ہم رہنے کے لئے گھر بناتے ہیں اور کمہار کھانے کے برتن۔ ہم اُن کی مٹّی پر کھڑے ہیں! تم کون سی مٹّی کو روشن کرنے جارہے ہو؟ یہ چراغ خود اُن کی مٹّی سے بنا ہوا ہے۔ یہ روشن ہوگا تو اپنے ساتھ ہمیں بھی روشنی دے گا۔ اِسے گھر میں جلاؤ، گھر میں اُجالا ہوگا، راستے میں جلاؤ مُسافر کا بھلا ہوگا! اِسے ویرانے میں جلانے سے کیا فائدہ؟"

"یہ جو ریت رواج ہیں؟" بھائیا جی نے دو دِلی سے پوچھا۔

"یہ آدمی کے دَورِ جہالت اور خوفِ مرگ کی پیداوار ہیں۔ ہم اِن کی پیروی نہ کریں گے تو یہ اپنے آپ مرجائیں گے!" تایا جی نے میرے پاس اُکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا، جب کہ بھائیا جی تذبذب میں کھڑے رہے۔

"یہ بنے کیسے؟" بھائیا جی نے پوچھا۔

"فرضی اوتاروں کے سوا آرتھی سبھاؤ سے! کوئی ہے جو اپنے ماں باپ کی تن، مَن، دھن سے سیوا کرتا ہے؟ لیکن جب وہ بذاتِ خود اُس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اپنی اولاد سے اُس خوبی کی توقع کرتا ہے جو کسی وقت اُس پر فرض تھی۔ ایسے لوگ اِنسان کے اِس مُتضاد برتاؤ سے واقف تھے، اُنھوں نے پِتر پُوجا کی رسمیں ایجاد کیں اور اُن کی تائید کے لئے کتھائیں۔"

"بیٹا! پانی چھڑکانے سے کیا پوتر ہوتا ہے؟ گندگی وہیں کی وہیں پڑی ہوئی ہے۔" تایا جی نے استفساراً پوچھا۔

"مَیں بھائیا جی کے حُکم کا پالن کر رہا ہوں۔" مَیں نے کچھ سوچ کر کہا۔

تایا جی کی یہ بات قابلِ تحسین تھی کہ وہ زِندگی کے راز و نیاز سمجھاتے تھے لیکن کسی کو عملی طور پر روکتے نہ تھے۔ میری بات سُن کر وہ مُسکرائے اور بولے، "تم بڑے ہوگے تو روایت اور حقیقت میں فرق کرنا سیکھنا لکیر کے فقیر نہ بننا۔"

تایا جی اپنا بوجھ اُٹھا کر چلے گئے، بھائیا جی اور مَیں کچھ دیر رُکے، اُن کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے جیسے ہم اُن کے پیچھے جانے کا اِرادہ رکھتے ہوں لیکن پھر اپنی راہ چل پڑے۔

وہ گھڑی لاکھوں گھڑیاں پُرانی ہے لیکن میری آنکھوں میں اُسی کوائف و لطائف سے تھرک رہی ہے۔ چرواہے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی چال میں گھر پہنچنے کی بے قراری ہے۔ وہ اپنے ریوڑوں کو دوڑاتے ہوئے

چلتے ہیں۔ گھسیاریاں گھاس کی گٹھڑیاں اٹھائے جھکتی ہیں اور پانی میں سے گزرتی ہوئی پاؤں گھسیٹ کر چلتی ہیں۔ وہ اپنی شلواروں کو اِس احتیاط سے اوپر اٹھاتی ہیں کہ ان کی ننگی پنڈلیاں پائنچوں تک پانی میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ عدالت یار کی بانسری کی مدھم دھن یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہ آب جو کے اُس پار ہے۔ گیدڑوں کی سلطانی اعلانی شروع ہو گئی ہے اور اُسی طرح جھینگروں کی لے، جس کا مطلب ہے، جہاں آدمی نہیں بستا ہے وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ کچھار کی ہوا میں خوشگوار خوشبو ہے۔ شفق کی آب و تاب قابلِ دید ہے۔ جگنوؤں کی روشنی بے رعونت ہے لیکن اپنی جمال یابی کے لئے گہری تاریکی سے ساز باز کر رہی ہے۔ آسمان پر ایک ہی ستارہ ہے۔ اُس کا اکیلا وجود اُس نقیب کا سا ہے جو اپنے پیچھے آتے ہوئے نئے زمانے کا اعلان کرتا ہو۔

کیار کے کنارے بزرگوں کی سمادھی تھی، جس کی نشان دہی کے لئے اینٹوں کی برجی بنائی ہوئی تھی۔ بھائیا جی نے تھال برجی کے سامنے رکھا، واہگرو کا جاپ کرتے ہوئے تھال پر سے رومال اٹھایا، ان کے چہرے پر نرمی، آگاہی اور سنجیدگی کے ملے جلے جذبات چھا گئے۔ انہوں نے چراغ کو برجی پر جمایا اور اُس کی تہ سے اٹھا ہوا فتیلہ انگلی سے پیچھے دبایا۔ گھی کی کٹوری اٹھا کر انہوں نے اُس کے کنارے سے انگلی لگائی اور اُسے چراغ پر دھیرے دھیرے جھکایا۔ گھی کی پتلی سی دھار انگلی کے ساتھ بہنے لگی اور چراغ میں گرنے لگی۔ چراغ گھی سے بھر کر انہوں نے کٹوری، تھال میں رکھی اور اپنی تر انگلی فتیلے کے منہ پر لگائی، اُس کا منہ سفید سے ریشمی ہو گیا۔ انہوں نے انگلی، داڑھی میں ملی اور اُس کی باقی ماندہ تری، بالوں میں جذب کر لی پھر ست نجا لے کر برجی کے گرد بکھیر دیا۔ انہوں نے آگ پیٹی اٹھائی کھولی، دیا سلائی نکالی، آگ پیٹی بند کی اور دیا سلائی مسالے پر رگڑی۔ اُس نے آگ پکڑی ہی تھی کہ ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا آیا اور اُسے بجھا گیا۔ انہوں نے بجھی ہوئی دیا سلائی پھینکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا، تھوڑا پاسا بدلا، نئی دیا سلائی نکال کر سلگائی اور سلگتے ہی ہاتھوں کے دائرے میں لے لی۔ مسالا جلا، شعلہ تیز ہوا، انہوں نے ہاتھوں کا پردہ پھیلایا اور شعلے کو فتیلے کے منہ کے نیچے کیا۔ اُس نے پڑ پڑ کرتے ہوئے جب تک آگ پکڑی، سلائی لگ بھگ جل چکی تھی اور آگ، ہاتھ جلانے لگی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر اُسے پھینکا تو چراغ کی روشنی مدھم مگر مسلسل تھی۔ انہوں نے جوں ہی مشک پور جلایا، بیساکھ کی گرم خشک ہوا مہک سے چھلک اٹھی۔ وہ لطیف ماحول اُسی لطافت سے میرے ذہن میں موجود ہے۔

بھائیا جی واہگرو کا جاپ کر رہے ہیں اور اپنے خیال میں اڑتے ہوئے لگتے ہیں۔ ان کے الفاظ کی نرمی و نازکی درد مند لمس کی سی ہے۔ وہ اوپر دیکھتے ہیں اور اسی طرح میں۔ آسمان دیا لو دل کی طرح وشال ہے۔ یہ مقام کیسا مقام ہے! مقامِ امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ کائنات گھومتی دکھائی دیتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اُس کا محور، میں ہوں۔ اُفق، تاریکی میں ڈوب گیا ہے لیکن میں چراغ کے اجالے

(گندا) پار نہ کئے تھے اور بھیکو نمبردار کے کھیت کی لمبائی سے نیچے آب جُو میں اُتر رہے تھے کہ وہاں تایا جی کھیتوں سے آتے ملے۔ وہ چادر کی ڈھیلی سی گانٹھ میں تھوڑا سا گھاس گٹھے کی طرح اُٹھائے جھکے جھکے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ اُنہوں نے اُسے اُتار کر نیچے رکھا اور سیدھے کھڑے ہو کر کہا، "رتن سیاں! ساری دھرتی پُرکھوں ہی کی بستی ہے۔ اُن کی مٹی سے ہم رہنے کے لئے گھر بناتے ہیں اور کمہار کھانے کے برتن۔ ہم اُن کی مٹی پر کھڑے ہیں! تم کون سی مٹی کو روشن کرنے جا رہے ہو؟ یہ چراغ خود اُن کی مٹی سے بنا ہوا ہے۔ یہ روشن ہوگا تو اپنے ساتھ ہمیں بھی روشنی دے گا۔ اِسے گھر میں جلاؤ، گھر میں اُجالا ہوگا، راستے میں جلاؤ مُسافر کا بھلا ہوگا! اِسے ویرانے میں جلانے سے کیا فائدہ؟"

"یہ جو ریت رواج ہیں؟" بھائیا جی نے دو دلی سے پُوچھا۔

"یہ آدمی کے دورِ جہالت اور خوفِ مرگ کی پیداوار ہیں۔ ہم اِن کی پیروی نہ کریں گے تو یہ اپنے آپ مر جائیں گے!" تایا جی نے میرے پاس اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا، جب کہ بھائیا جی تذبذب میں کھڑے رہے۔

"یہ بنے کیسے؟" بھائیا جی نے پُوچھا۔

"فرضی اوتاروں کے سوا آدمی سبھاؤ سے! کوئی ہے جو اپنے ماں باپ کی تن، من، دھن سے سیوا کرتا ہے؛ لیکن جب وہ بذاتِ خود اُس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اپنی اولاد سے اُس خوبی کی توقع کرتا ہے جو کسی وقت اُس پر فرض تھی۔ ایسے لوگ اِنسان کے اِس متضاد برتاؤ سے واقف تھے، اُنہوں نے پِتر پوجا کی رسمیں ایجاد کیں اور اُن کی تائید کے لئے کتھائیں۔"

"بیٹا! پانی چھڑکانے سے کیا پوتر ہوتا ہے؟ گندگی وہیں کی وہیں پڑی ہوئی ہے۔" تایا جی نے اِستفساراً پُوچھا۔

"مَیں بھائیا جی کے حکم کا پالن کر رہا ہوں۔" مَیں نے کچھ سوچ کر کہا۔

تایا جی کی یہ بات قابلِ تحسین تھی کہ وہ زندگی کے راز و نیاز سمجھاتے تھے لیکن کسی کو عملی طور پر روکتے نہ تھے۔ میری بات سُن کر وہ مسکرائے، اور بولے، "تُم بڑے ہو گئے تو روایت اور حقیقت میں فرق کرنا سیکھنا لکیر کے فقیر نہ بننا۔"

تایا جی اپنا بوجھ اُٹھا کر چلے گئے، بھائیا جی اور مَیں کچھ دیر رُکے، اُن کو جاتے ہُوئے دیکھتے رہے جیسے ہم اُن کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن پھر اپنی راہ چل پڑے۔

وہ گھڑی لاکھوں گھڑیاں پُرانی ہے لیکن میری آنکھوں میں اُسی کوائف و لطائف سے تھرک رہی ہے۔ چرواہے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی چال میں گھر پہنچنے کی بے قراری ہے۔ وہ اپنے ریوڑوں کو دوڑاتے ہُوئے

چلتے ہیں۔ گھسیاریاں گھاس کی گٹھڑیاں اٹھائے جھکتی ہیں اور پانی میں سے گزرتی ہوئی پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی ہیں۔ وہ اپنی شلواروں کو اس احتیاط سے اوپر اٹھاتی ہیں کہ ان کی ننگی پنڈلیاں پائینچوں تک پانی میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ عدالت یار کی بانسری کی مدھم دھن یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہ آب جو کے اس پار ہے۔ گیدڑوں کی سلطانی اعلانی شروع ہو گئی ہے اور اسی طرح جھینگروں کی لے، جس کا مطلب ہے، جہاں آدمی نہیں بستا ہے وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ کچھار کی ہوائیں خوشگوار خوشبو ہے۔ شفق کی آب و تاب قابل دید ہے۔ جگنوؤں کی روشنی بے رعونت ہے لیکن اپنی جمال یابی کے لئے گہری تاریکی سے سازباز کر رہی ہے۔ آسمان پر ایک ہی ستارہ ہے۔ اس کا اکیلا وجود اس نقیب کا سا ہے جو اپنے پیچھے آتے ہوئے نئے زمانے کا اعلان کرتا ہو۔

کیار کے کنارے بزرگوں کی سمادھی تھی، جس کی نشان دہی کے لئے اینٹوں کی برجی بنائی ہوئی تھی۔ بھائیا جی نے تھال برجی کے سامنے رکھا، واہگرو کا جاپ کرتے ہوئے تھال پر سے رومال اٹھایا، ان کے چہرے پر نرمی، آگاہی اور سنجیدگی کے ملے جلے جذبات چھا گئے۔ انہوں نے چراغ کو برجی پر جمایا اور اس کی تہ سے اٹھا ہوا فتیلہ انگلی سے نیچے دبایا۔ گھی کی کٹوری اٹھا کر انہوں نے اس کے کنارے سے انگلی لگائی اور اسے چراغ پر دھیرے دھیرے جھکایا۔ گھی کی پتلی سی دھار انگلی کے ساتھ بہنے لگی اور چراغ میں گرنے لگی۔ چراغ گھی سے بھر کر انہوں نے کٹوری، تھال میں رکھی اور اپنی تر انگلی فتیلے کے منہ پر لگائی، اس کا منہ سفید سے ریشمی ہو گیا۔ انہوں نے انگلی، داڑھی میں ملی اور اس کی باقی ماندہ تری، بالوں میں جذب کر لی پھر ست نجالے کر برجی کے گرد بکھیر دیا۔ انہوں نے آگ پیٹی اٹھائی، کھولی، دیا سلائی نکالی، آگ پیٹی بند کی اور دیا سلائی مسالے پر رگڑی۔ اس نے آگ پکڑی ہی تھی کہ ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا آیا اور اسے بجھا گیا۔ انہوں نے بجھی ہوئی دیا سلائی پھینکتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑا پاسا بدلا، نئی دیا سلائی نکال کر سلگائی اور سلگتے ہی ہاتھوں کے دائرے میں لے لی مسالا جلا شعلہ تیز ہوا، انہوں نے ہاتھوں کا پردہ پھیلایا اور شعلے کو فتیلے کے منہ کے نیچے کیا۔ اس نے پڑ پڑ کرتے ہوئے جب تک آگ پکڑی، سلائی لگ بھگ جل چکی تھی اور آگ، ہاتھ جلانے لگی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر اسے پھینکا تو چراغ کی روشنی مدھم مگر مسلسل تھی۔ انہوں نے جوں ہی مشک پور جلایا، بیساکھ کی گرم خشک ہوا مہک سے چھلک اٹھی۔ وہ لطیف ماحول اسی لطافت سے میرے ذہن میں موجود ہے۔

بھائیا جی واہگرو کا جاپ کر رہے ہیں اور اپنے خیال میں اڑتے ہوئے لگتے ہیں۔ ان کے الفاظ کی نرمی و نازکی دردمند لمس کی سی ہے۔ وہ اوپر دیکھتے ہیں اور اسی طرح میں۔ آسمان دیالو دل کی طرح وشال ہے۔ یہ مقام کیسا مقام ہے! مقام امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ کائنات گھومتی دکھائی دیتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس کا محور، میں ہوں۔ افق، تاریکی میں ڈوب گیا ہے لیکن میں چراغ کے اجالے

میں کھڑا ہوں ۔ بھائیا جی آنکھیں مُوندے، ہاتھ جوڑے ہرنام سنگھ، صُوبہ سنگھ، شیو سنگھ کے نام لے کر اُن کی مکتی کی دُعا کرتے ہیں ۔ وُہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اُٹھتے نہیں ہیں ۔ مَیں سجدہ کر کے اُٹھ کھڑا ہُوا ہوں اور اُن کے سجدے کی طوالت پر حیران ہوں ۔ وُہ اُٹھتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہیں ۔ اُن کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہُوا ہے لیکن آنکھوں میں شرارے کی چمک ہے ۔ وُہ بیک وقت بے وقر اور خود سر ہیں ۔ اُن کی یہ کیفیت مَیں نے پہلی بار دیکھی ہے ۔ اُن کے چلن میں نرالی کشش ہے ۔ وُہ میری آنکھوں میں سیدھا دیکھتے ہیں اور مَیں اُن کی آنکھوں میں، مجھے اُن سے ڈر نہیں لگتا ہے ۔ اُن کی نظر پُر اسرار ہو گئی ہے ۔ مجھے لگتا ہے کہ وُہ میرے پیچھے دیکھتے ہیں ۔ مَیں گردن پیچھے گھماتا ہوں، تا حدِ نظر ویرانہ ہی ویرانہ ہے ۔ اُس ویرانے میں تہذیب و تمدّن کا کوئی سُراغ ہے تو وُہ ہم سے ہے ۔ مَیں پھر بھائیا جی کی طرف دیکھتا ہوں ۔ وُہ ویسے ہی اُکڑوں بیٹھے بیٹھے میری طرف بڑھتے ہیں اور مجھے کمر سے پکڑ کر میرے سراپے کو دیکھنے لگتے ہیں، تسلیم و تکریم سے، محبت و ضمانت سے ۔

"اِن اینٹوں کے نیچے کوزے میں ہمارے پُرکھوں کی مٹّی ہے ۔ مَیں مر جاؤں تو میری مٹّی لا کر اُن کی مٹّی میں ملانا، اِسی طرح چراغ جلانا اور دُعا کرنا کہ میری کُل کو جلا ملتی رہے اور میری پیڑھی چلتی رہے!"

کل جولائی ۱۹۷۸ء کی چار تاریخ تھی، مَیں نے یہ واقعہ لکھا تو رات سو رہی تھی ۔ مَیں نے آگے لکھنا جاری رکھنا چاہا لیکن مجھ پر بھائیا جی کے سے جذبات مُسلّط ہو گئے اور مَیں تسلیمِ نفس کے سحر میں گرفتار ہو گیا اور اپنی ذات کے عیشِ دوام کے خواب دیکھنے لگا ۔ میرے خواب جُوں ہی میری حقیقت سے ٹکرائے، مَیں بے ساختہ دھاڑ مار کر رو پڑا ۔ بونی (میرا پالتو پومیرین کُتّا) اُچک کر اُٹھا اور چھلانگ لگا کر میرے پاس آیا ۔ مَیں نے اُسے پیار نہ کیا، وُہ مجھ پر بھونکنے لگا گویا اپنی ناراضی کا اِظہار کرنے لگا ۔ اُس کے لگاؤ سے مُتاثّر ہو کر مَیں نے اُسے پُچکارا ۔ وُہ اِسی اِشارے کا مُنتظر تھا، اُچھل کر میری گود میں چڑھ گیا ۔ اُس کی پریشانی نرم نگاہی میں بدل گئی اور اُس کے کان جو تشویش سے کھڑے تھے، بالوں میں بیٹھ گئے ۔ وُہ اپنی محبت کا مُظاہرہ کرتا ہُوا اور ٹھمکتا ہُوا میرے چہرے کی جانب لپکنے لگا ۔ مَیں اُسے روکتا، وُہ پُورا زور لگا کر میرے ہاتھوں سے پھسلتا، میرا مُنہ چاٹتا اور اپنے انداز سے میرا غم بانٹتا ۔ حیوان کے پاس اِتنا شفیق دل ہے! مَیں اِس خیال سے سنبھل گیا اور مطمئن ہُوا ۔ سُریندر اور پُونم دونوں جاگ پڑیں اور گھبرائی ہُوئیں میرے مُطالعے کے کمرے میں آئیں ۔ بونی نے انہیں دیکھا لیکن دُم نہ ہلائی جو اُس کا دِل رُبا معمول ہے ۔ وُہ میری ذات میں کھویا ہُوا مجھے پیار کرتا رہا اور اُن دونوں کو غیر دلچسپ نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔

میرے قارئین میرے رونے کی وجہ جاننا چاہیں گے ۔ یہ مَیں اِس لئے سوچتا ہوں کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ جب سے آپ میری کہانی پڑھ رہے ہیں، آپ سے میرا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا ہے ۔ گمان و یقین کی اِس

دُنیا میں، مَیں دو ہی رِشتوں کا قائل ہُوں، پہلا فراست کا اَور دُوسرا جذبات کا۔ میری اپنی سرشت! مَیں فراست کے رِشتے کو جذبات کے رِشتے سے افضل و دائم مانتا ہُوں۔ لیکن میری بے سر دپائی جذبات! وُہ خُون کے رِشتے کی بات ہے جِس نے مجھے رُلایا ہے، یُوں کہیئے بہکایا ہے۔

وجہ مَیں آگے بیان کروں گا، یہاں بس اِتنا ہی کہوں گا کہ پُونم کی پیدائش کے فوراً بعد مَیں نے دھاگا ڈلوا لیا، میرا مطلب ہے کہ وِسکٹومی اوپریشن کروا لیا۔ رِشتہ داروں اَور دوستوں کے نزدیک مَیں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مار لیا۔ اُس جذباتی ہیجان میں، مَیں سوچنے لگا کہ میرے مرنے کے بعد میرا نام کیسے چلے گا؟ میری نجات کے لیئے کون دُعا کرے گا؟ مجھے کون یاد کرے گا؟ .... ایسے ہی اَور کئی ناقابلِ اعتبار جذبات تھے جِن کی تُندی مجھے اُڑا لے گئی تھی۔

پونی کی غمگساری سے میری جذباتی بدحواسی رُکی اَور میرے خیال کی یک رُخی ٹُوٹی۔ مَیں نے اپنے کھوئے ہُوئے حِصّے کو دوبارہ پایا اَور اپنے رویّے پر غور کیا۔ مَیں نے پہلے خُود کو بُرا بھلا کہا اَور پھر اُن کم ظرفوں کو۔ کاش! وُہ گھُرنڈ کے کیڑے اپنی گھُٹن سے باہر نِکلتے اَور وُسعتِ انسان کو دیکھتے تو مجھے اپنی تنگ دِلی کا نِشانہ ہرگز نہ بناتے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ اُس وقت مَیں کہاں تھا اَور کہاں ہُوں!

"تُم کہاں ہو؟ میرے ضمیر نے مجھ سے سوال کیا ہے۔

میرے غور و فکر میرے بچّے ہیں اَور میرے ہم خیال میرے رِشتے ناطے۔ میرے بچّے حُسنِ نشو و نما سے مُنسلک ہیں، اِس لئے خُوبصورت ہیں۔ علاوہ ازیں اِن کے نقش و نگار وقت نے سنوارے ہیں اَور وقت ایسی دایہ ہے جِس کی گود میں خالص ترین چیز ہی پنپتی ہے۔

اَور یہ خُونی رِشتے! وقتی لگاؤ ہیں، عارضی گھاؤ ہیں۔ اِنسان ہر وقت اَور ہر گھڑی کسی نہ کسی طریقے سے اِن کی بھیڑ میں اپنی آنکھوں تک گھرا رہتا ہے اَور اپنی اَصلیت دیکھ نہیں پاتا ہے۔

بھائیا جی اپنے وہم کے ظُلمت کدے سے نِکلے تو رات کے اندھیرے بڑھ چکے تھے۔ اَور اندھیرا کوئی بھی ہو! اُس کی نفسیاتی ماہیت ایک ہی ہوتی ہے: خوف! مَیں اندھیرے سے ڈرنے لگا اَور بھائیا جی کے ساتھ رگڑتا ہُوا چلنے لگا۔ اُنہوں نے مجھے احساسِ خاطر سے دیکھا اَور میرا ننّھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جیسے وہ چراغِ نَو کی حِفاظت کیئے ہُوئے تھے۔ مَیں اُن کے سہارے چلتا رہا، راستہ جانچتا ہُوا اَور اپنے گِرد نظر دوڑاتا ہُوا، وُہ کھیت جو کُچھ دِن پہلے سر سبز و شاداب تھے، ویران دریاں پڑے تھے۔ یہی ہوتا آیا تھا! پُرانی کھیتی کاٹی اَور نئی کھیتی بوئی جاتی، پت جھڑ جاتا اَور موسمِ بہار آتا، جہاں پُرانا پھُول مُرجھاتا وہاں نیا پھُول کھِل پڑتا۔

باب ۸

ہم اُسے آدمی نہیں کہتے،
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی (شاطر)

قارئین! مَیں اُس خودرَو پودے کی طرح ہُوں جسے حالات پالتے پوستے ہیں لیکن اُس کے پھُول جس کسی کی نظر پڑتے ہیں وہی اُنہیں نوچنے اور کھسوٹنے لگتا ہے۔

دیہقانی کہاوت ہے۔

گورا رنگ نہ کِسے نوں ربّ دیوے!
سارا پنڈ بیری ہو گیا

(خدا کسی کو گورا رنگ نہ دے! اُس کا ہر کوئی چاہنے والا ہو گا اور نتیجے کے طور پر اُس کا دشمن)

اِس کہاوت کے مطابق مجھ پر ظُلم ڈھانے کے لئے میرا گورا رنگ ہی کافی تھا لیکن میری بدقسمتی! میرا چہرہ مُہرہ بھی خوبصورت تھا۔ جو کوئی مجھے دیکھتا، پسند کرتا اور چُومنے چاٹنے لگتا اور جو کوئی ایسا نہ کرتا وہ اپنی آنکھوں کے ذریعے اُڑکر مجھ سے لپٹ جاتا۔ ایسی تاک جھانک سے شرما کر مَیں سکڑ جاتا، آنکھیں جھکا لیتا اور اگر وہاں سے چلا نہ جاتا تو مجھے لگتا کہ دیکھنے والا مجھے دیکھ نہیں رہا ہے بلکہ نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ پُورے گاؤں میں میرا ثانی نہ تھا۔ مَیں آئینہ دیکھ کر اپنی صُورت آنکھوں میں بساتا اور اپنا مُقابلہ دُوسروں سے کرتا۔ اپنے سامنے مجھے ہر کوئی بے تناسب اعضا کا پلندہ لگتا اور تمنائے تخلیق کی ناقص کوشش۔ جو کوئی تھوڑا بہت جچتا، مَیں اُسے غور سے دیکھتا کسی کے ابرُوؤں میں فرق ہوتا اور کسی کی آنکھوں میں، کسی کے نتھنے چھوٹے بڑے ہوتے اور کسی کے ہونٹ ترچھے۔ گالوں کے زاویے تو کسی کے بھی ایک سے نہ ہوتے، جہاں تک کانوں کا سُوال ہے، وہ کسی کے چہرے سے متناسب ہوتے ہی نہ تھے۔

میرا چہرہ ایسا تھا جیسے مُصوّر نے مرکزی لکیر کھینچ کر اُس کے گرد ہر دو نقش حُسنِ تناسب سے بنائے ہوں۔ میری صُورت نے مجھے خود پرست بنا دیا تھا۔ مَیں آئینہ دیکھتا ہُوا خُود پر فریفتہ ہو جاتا اور آئینے کے بوسے لینے لگتا۔ یہ نرالا رشک مجھ پر ایسی کیفیت طاری کر دیتا کہ مَیں خُود کو چھُوتا، پیار کرتا، شوقِ وصل سے بے قرار ہو کر آئینے کے پیچھے دیکھتا اور وہاں کسی کو موجود نہ پا کر غم زدہ ہو جاتا۔ مَیں آئینے کا دلدادہ تھا اور جیب میں اُس کا

ٹکڑا رکھا کرتا تھا۔ وہ پیارا ٹکڑا گم ہوگیا اور دوسرا مجھے مِل نہ سکا۔ اُس کرب سے نجات پانے کا مَیں نے انوکھا طریقہ نِکالا۔ مَیں مویشی چرانے جاتا اور آب جُو کے کنارے ایسے زاویے پر بیٹھتا جہاں سے مَیں خود کو پانی کے آئینے میں دیکھ سکتا۔ ست رُکھے کے کچھ اِدھر شیشم کا کُبڑا درخت تھا جو دُور تک پانی پر جُھکا ہوا تھا اور راس کی طرح ہو کر بھی راس نہ تھا۔ وہ پانی سے موج بھر اونچا تھا اور میرا مَن پسند مقام۔ مَیں وہاں بیٹھ کر پانی کے درپن میں اپنا مکھڑا دیکھتا اور کنول (ہندو دیو مالا کا ایک دیوتا، اُس نے اپنا چہرہ پانی میں دیکھا اور دیکھتے ہی اپنی صُورت پر فریفتہ ہوگیا اور ہر وقت پانی میں بیٹھا رہنے لگا۔ اُسے سوا آتھی پا کر بھگوان نے اُسے سراپ دے دیا جب سے وہ جُون بھوگ رہا ہے) کی کہاوت تازہ کرتا۔

مَیں لڑکیوں کا چہیتا تھا۔ وہ مجھ پر واری واری جاتیں، میرے چاؤ چوچلے کرتیں اور جہاں مَیں ہوتا وہاں سے مجھے اُٹھا کر لے جاتیں۔ پرکاش کور اور سورن کور کے ساتھ یہ مسئلہ درپیش آتا کہ میں کسے خوش کروں اور کسے ناخوش۔ اُن کی خوشی، ناخوشی کا فیصلہ میری قرعہ اندازی پر ہوتا اور مَیں جِس کے حِصّے پڑتا وہ مجھے باہوں میں سمیٹ کر ایسے سوتی جیسے مجھے چور چُرا کر لے جانے والے ہوں۔

کرپال کور میری ہم عُمر تھی اور میری دیوانی بھی۔ وہ میرے بغیر کسی اور سے کھیلتی ہی نہ تھی، جب دیکھو میری تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آئینے کی طرح دیکھتی، چُومتی اور بدن پر پھیرتی۔ مَیں اُس سے پُوچھتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ وہ سراپا اُمید بَن کر کہتی، اِس سے تیرا رنگ مجھ پر چڑھ جائے گا۔ وہ مجھے چُمّے دیتی۔ مَیں اُس کے چُمّے اِس لیے نہ لیتا کہ اُس کا سانولا رنگ مجھ پر چڑھ جائے گا۔ وہ اپنی آرزو پُوری کرنے کے لیے مجھے طرح طرح سے بھرماتی، میرے لیے دانے بُھنا کر لاتی، کبھی دال، کبھی مرمرے، کبھی مرنڈا، کبھی گُڑ کی ڈلی، کبھی گنڈیریاں اور کبھی بیر۔ وہ کچھ نہ لا سکتی تو پھول ضرور لاتی اور اُسے میرے جُوڑے میں سجا کر کہتی، "تو میرا کرشن کنھیا ہے اور مَیں تیری رادھا!"

میں کھڑا ہو کر مُوت رہا تھا۔ اُس کی دِلچسپی! وہ آگے بڑھی اور دریافت طلب نظر سے دیکھنے لگی۔ وہ خوش تھی اور حیران بھی۔ اُس نے میری نقل اُتاری لیکن اُس کی دھار اُس کے پاؤں سے آگے نہ پڑی۔ میرے لیے یہ نرالا انکشاف تھا۔ مَیں نازاں ہُوا اور وہ پشیماں! مَیں نے اُس کے ساتھ کھیلنے کا عہد کیا، "تو میری جتنی دُور دھار مار کر دکھا تبھی مَیں تیرے ساتھ کھیلوں گا!"

میری ہوشیاری اور میری ہٹ، اُس کی اُلجھن بن گئی۔ وہ مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے کوشش کرتی، اپنی جانگھ آگے بڑھاتی، سر پیچھے جُھکاتی اور پُورا زور لگا کر مُوتتی۔ اُس کا رنگ گہرا قرمزی ہو جاتا لیکن اُن کی دھار میری دھار کے آغاز کو بھی نہ پہنچتی۔ وہ جیت نہ سکتی، نراس ہو جاتی اور پُوچھتی، "میرے ہاں تیرے جیسا کیوں

نہیں ہے؟"

"یہ صرف لڑکوں ہی کے ہوتا ہے!" مَیں پھنّو کو ہاتھ لگا کر فخر سے کہتا۔

اُس کی کمزوری جان کر مَیں اُسے کیسے کیسے مرعوب کرتا! مَیں موتتا ہُوا گھومتا، کبھی دھار سے کمانی بناتا اور کبھی دائرہ۔ مَیں پھنّو کا رُخ اُوپر کرتا، سیدھی دھار بلندی کی طرف پرواز کرتی اور پھر قوس کی صُورت نیم دائرے میں بدل جاتی۔ کرپال کور یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ہو جاتی اور جذبہ تجسس سے ایک ہاتھ میں میری پھنّو پکڑ لیتی اور دُوسرا ہاتھ اپنے چڈّے پر پھیرتی اور محرومیت کے احساس سے بُجھ جاتی۔ اُس کی افسردگی زیادہ دیر نہ رہتی، وُہ جذبہ اُمید سے جُھول کر مُجھے ترغیب دیتی کہ مَیں پھنّو اُس کے چڈّوں پر رگڑوں شاید وہاں اُس جیسی کونپل پُھوٹ پڑے۔ میری پھنّو کی گھٹتی اور بڑھتی توانائی کو دیکھ کر اُسے یقین ہوگیا تھا کہ وُہ کوئی پود ہے جسے ایک جگہ سے اُکھاڑ کر دُوسری جگہ بویا جا سکتا ہے۔ وُہ میرے نیچے لیٹنا پسند کرتی، میرے بوجھ سے تکلیف میں پڑ جاتی، اُلجھے اُلجھے سانس لیتی لیکن مُجھے اُوپر سے اُٹھنے نہ دیتی۔ وُہ مُجھے ننگا دیکھ کر خُوش ہوتی۔ مَیں اُس کی خواہش تا حدِ مسرت پُوری نہ کرتا، وُہ شوق سے کہتی، "تیری عریانی مُجھے بہت بھاتی ہے۔ دِل کرتا ہے کہ تُجھے زندگی بھر یُوں ہی دیکھتی رہُوں!"

لشکر سنگھ سرگودھے سے آیا اور چھوٹی سی موٹر لایا جو کمانی کے زور پر چلتی تھی۔ وُہ موٹر بچّوں میں یُوں مقبول ہُوئی کہ ہر کوئی اُسی کا جاپ کرنے لگا۔ اُس کے حویلی سے موٹر نکالتے ہی بچّے کھیلنا چھوڑ کر اُسے گھیر لیتے اور موٹر کی سواری کا مزہ لُوٹنے کے لئے اُس کی مِنّت سماجت کرتے۔ وُہ ہر کسی پر مہربان نہ ہوتا لیکن جن پر ہوتا اُن میں میرا نام سرِ فہرست تھا۔ صُبح کا وقت تھا اور مَیں جنگل سے لوٹ رہا تھا۔ لشکر حویلی کا ایک دروازہ بند کر چُکا تھا، دُوسرا بند کر رہا تھا اور زنجیر ہاتھ میں لئے ہُوئے تھا۔ وُہ مُجھے دیکھ کر زنجیر لگاتے لگاتے رُک گیا اور بڑے پیار سے بولا، "موٹر پر چڑھو گے؟"

اِس میں پُوچھنے کی کیا بات تھی! موٹر ایسی چیز تھی جس پر چڑھنا اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر اُڑنا تھا۔ مَیں بے اختیار دوڑا اور دروازہ دھکیل کر اندر گُھس گیا۔ میرا خروش اِتنا اچانک تھا کہ عین وقت پر لشکر سنگھ زنجیر نہ چھوڑتا تو دروازے کے ساتھ اندر لڑھک جاتا۔ موٹر سامنے برآمدے میں پڑی تھی، مَیں بھاگ کر اُس پر سوار ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وُہ پیاری موٹر پُوری کی پُوری میرے لئے تھی اور مَیں اُس کے لئے۔ مَیں اُس پر جی بھر کر چڑھنا چاہتا تھا اور اُسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن بِھیڑ میں اُوسر ہی نہ مِلتا تھا۔ مَیں موٹر پر سے اُتر کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اُس کی بناوٹ کو سراہنے لگا۔ اُس چھوٹی سی موٹر کے اندر ہُوبہُو بڑی موٹر کا سا منظر تھا۔ شوفر کی سیٹ پر آدمی نما لکڑی کا پُتلا تھا اور دُوسری سیٹوں پر کالے کالے کُک چِپیاں

تھے جو سفید رنگ کے پسِ منظر میں سواریاں لگتے تھے۔ سیٹوں کے بیچوں بیچ دروازے سے لے کر پچھلے حصّے تک فرش پر چوڑی لال لکیر، قالین سے مشابہ تھی۔ چھت کے اوپر لوہے کی چادر لگی تھی جو آئینے جیسی تھی میں اُس میں منہ بنا بنا کر دیکھنے لگا۔ یہ بڑا من ہرن تجربہ تھا! الگ الگ زاویے سے مجھے الگ الگ چہرہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں لشکر سنگھ میرے پیچھے سے میرے پاس آیا اور چٹخارے سے میرا منہ چوم لیا۔ مجھے بُرا لگا، میں نے گال پر سے تھوک صاف کیا اور اُسے غصّے سے دیکھا۔ اُس نے پیار سے کہا، "تجھے موٹر پسند ہے؟"

"ہاں، بہت پسند ہے!" میرا غصّہ جاتا رہا اور میں نے لاڈ سے کہا۔ "مجھے اِس پر بہت سے جھونٹے دو!" میں نے ہاتھ پھیلا کر جھونٹوں کی مقدار بتاتے ہوئے اپنی بات کو پورا کیا۔

اُس نے موٹر کو برآمدے سے باہر نکالا، اُس کا رُخ باہر کے دروازے کی طرف کیا، مجھے اوپر بٹھایا کمانی کسی اور چھوڑ دی۔ موٹر تیزی سے بھاگی، بھاگتی بھاگتی رُکی، میں ہڈیوں کے گودے تک مہک چکا تھا۔ میں موٹر موڑ کر کھڑی کر رہا تھا کہ لشکر سنگھ بھاگ کر آیا اور موٹر کی کمانی کس کر اُسے چھوڑ دیا۔ چوں کہ ادھر ڈھلان تھی موٹر مجھے لے اُڑی اور پہلے سے زیادہ دُور جا کر رُکی۔ جب تک وہ مجھ تک پہنچا، میں موٹر کا رُخ موڑ کر اُس پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مسکرانے لگا اور چابی کو اُس کے دستے کے گرد گھمانے لگا۔ میں نے اُسے موٹر چلانے کے لئے کہا۔ وہ مجھ پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "یہ موٹر، میں تجھے دے دیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟"

میرا دِل خوشی سے اِس زور سے دھڑکا کہ مجھے صاف سُنائی پڑا۔

"مجھے پانچ چُمّے دو!"

اُس نے ہاتھ کھول کر پنجہ دکھایا۔

"ٹھیک ہے!"

میرا ضمیر مجھ سے رخصت ہو گیا اور میں نے گال اُس کی طرف بڑھا دیا۔ میں اِس قدر بے ساختہ تھا کہ اُس کے کہنے اور میرے ماننے میں کوئی وقفہ نہ تھا۔ چُمّے لیتے لیتے اُس نے مجھے نیچے گرا لیا۔ مجھے اپنی ترنگ میں لگا کہ وہ مجھے پیار کر رہا ہے اور میں نے اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا۔

قارئین! بچپن، ناتجربہ کاری اور احساس کی سادگی کا ایسا آئینہ ہے، جس میں کسی کے پیار میں بے ہودگی کا عنصر دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

میرے چوتڑوں میں چیرتا ہوا درد اُٹھا اور مجھے لگا کہ میں سیون پر پھٹ رہا ہوں۔ میں اِتنی زور سے

چیخا کہ سارا ماحول گونج پڑا۔ اُس نے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا اور مجھ سے دُور جا کھڑا ہُوا۔ مَیں روتا ہُوا اُٹھا اور باہر کے دروازے کی جانب چل پڑا۔ وُہ میرا راستہ روکنے لگا اور اپنا وعدہ دہرانے لگا۔ وُہ جوں ہی میرے قریب آتا، مَیں اُس سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا جیسے وُہ کوئی بھیانک درندہ ہو۔ میرا رونا دہشت ناک نہ ہوتا تو شاید وُہ دروازہ نہ کھولتا۔ وُہ میرے سامنے تھا تو مَیں اُس کی شکایت کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا اور بے تحاشا رو رہا تھا۔ اُس سے دُور ہوتے ہی مجھے عجیب سے خوف نے دبوچ لیا اور میرا اُبال ٹھنڈا پڑ گیا۔ مَیں گھر پہنچا تو بیمار سا تھا۔ مَیں نے ایک اندھیرے گوشے میں دیوار کا سہارا لیا اور پھر اُچک کر اُس سے دُور جا کھڑا ہُوا۔ مجھے لگا، مَیں جس چیز کو چھوؤں گا وُہ مجھے مجرُوح کر دے گی۔

وُہ نازک عُمر! وُہ گھناؤنا حادِثہ!! وُہ ضبطِ نفس!!! کیا میری فِطرت کی ریاکاری اِنسانی نُطفے کا جُزوِ ناگزیر تھی؟

مَیں اِس وقت اُس توہین آمیز حادِثے اور بدنام واقعے کی تشہیر کر رہا ہُوں اور یہ میری ریاکار فِطرت کے خلاف ہے۔ مَیں سوچنے پر مجبُور ہُوں کہ یہ کون سا جذبہ ہے جو میری ریاکاری پر غالب آ رہا ہے!

قارئین، یہ کوئی جذبہ نہیں! یہ کربناکی تخلیق کی تُندی ہے جو اپنے وفُورِ خُود نُمائی میں تحریکِ ظہُور بنی ہُوئی ہے! یہ محض اِتّفاق ہے کہ اُس شانِ وجُود کا وسیلہ نمُود، مَیں ہُوں۔ اور یہی شوکتِ اِظہار، دردِ زہ کی مسرّتِ آفرائش ہے۔ اگر اِس میں یہ خُوبی نہ ہوتی تو کوئی ماں اپنے بچّے سے پیار نہ کرتی! وُہ اپنی اذیّت کا بدلہ اپنی تخلیق سے لیتی، اور اُس کے پیدا ہوتے ہی اُسے ہلاک کر دیتی۔

عُمروں کے تضاد اور غیر فِطری جنسی تجربے نے مجھ پر ہیبت طاری کر دی جو ڈھال کی طرح میرے ساتھ رہی اور میری آئندہ زِندگی میں مجھے امرد پرستوں سے بچاتی رہی۔ میرے اِحساس کی صداقت پر کوئی یقین کرے گا! اِس راز کا اِنکشاف کر کے، مَیں اُسی رُوحانی تکلیف سے گُزرا ہُوں جو اُس حادِثے کی خُوں خواری تھی۔ مَیں نے جب جب اِس واقعے کو یاد کیا ہے اِس نے مجھے زہریلے سانپ کی طرح ڈسا ہے۔ اُس وقت میری صُورت میں پری زاد کی سی کشش تھی اور بہاڑی حُسن جیسی معصُومیّت۔ میرا وجُود نرمی و نازکی کا ایسا مظہر تھا کہ مجھے بھُوکا درندہ دیکھتا تو وُہ بھی پیار سے چاٹتا اور کلول کرتا۔ لیکن اِنسانی ہوس وُہ کریہ جذبہ ہے جو اپنے جُنونِ نُمائش میں بھیانک سے بھیانک تصوّر کو حقیر ثابت کر سکتا ہے۔ میری برسوں کی حالات پروردہ قوّتِ برداشت اُس وحشت ناک حادِثے کو نئے سرے سے جانچتی ہے اور اُس اِنسانی دِرندگی کو کِسی طرح تسلیم نہیں کرتی ہے۔ اُس مجرمانہ زیادتی

کے اثرات کتنے بدترین ہو سکتے تھے!

اُس حادثے کا راست اثر یہ ہُوا کہ مَیں کسی سے تحفہ نہ لیتا۔ کوئی مجھ سے بڑا لڑکا مجھے تنہائی میں بلاتا تو مَیں اُس سے دُور بھاگ جاتا۔ مَیں عدالت یار سے بھی تحفہ قبول نہ کرتا۔ وُہ میری ٹھوڑی پکڑ کر میری آنکھوں میں جھانکتا اور قصوروارانہ انداز سے کہتا، "میرا جگا مجھ سے ناراض لگتا ہے۔"!

باب ۹

اِتنی سی سرگزشت ہے بزمِ حیات کی
کوئی ہنسا خوشی سے کوئی غم سے رو دیا (شاطر)

جس طرح کوئی غنچہ موسم کی نرمی و سختی جھیلتا ہُوا کانٹوں کے درمیان کھِل اُٹھتا ہے، کچھ اُسی طرح میری تعلیم کا آغاز ہُوا۔

اُن دِنوں بچّوں کو سکُول میں داخل کروانے کے لئے ماں باپ، سکُول نہ جاتے تھے بلکہ سکُول ماسٹر، بچّوں کے ماں باپ سے مِل کر اُنہیں بچّوں کو پڑھوانے کی ترغیب دیتے تھے۔ ہریانہ میں انگلش میڈیم کے دو سکُول تھے، ڈی۔ اے۔ وی۔ ہائی سکُول اور ہندو مُسلم ہائی سکُول، لیکن بھائیا جی نے مجھے اُردو میڈیم کے ڈسٹرک بورڈ مڈل سکُول میں داخل کروایا۔ اُن کی دلیل تھی کہ جو زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے اُسے پڑھنا فضُول ہے۔

ہریانہ میں ہماری ٹال تھی جہاں میں کئی بار جا چکا تھا، اپنی ماں کے ساتھ، کبھی اپنے بھائیوں اجیت سنگھ اور درشن سنگھ کے ساتھ اور کبھی اکیلا۔ مَیں اپنا ہم سفر آپ ہوتا تو میری ہم سفری میری شانِ تونگری ہوتی۔ مَیں قدم قدم بے قرار ہوتا اور نظر نظر شاہد۔ گاؤں کے فوراً باہر کھجوروں کا جھنڈ، تکیہ کہلاتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں اگن کنڈ تھا، جس کی دیکھ بھال ایک فقیر کرتا تھا اور اُس کی دیکھ بھال گاؤں والے۔ آگ پیٹی کی ایجاد کے ساتھ اگن کنڈ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب وُہ فقیر مر گیا، اُسے وہیں دفنا دیا گیا۔ اب کئی لوگ اُس کی قبر پر پھُول چڑھاتے تھے اور منّت مانتے تھے۔ آب جُو کے پار سڑک پر چھوٹی اینٹوں کا باندھ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں سے نہر نکلتی تھی جو کھیتوں میں سے ہوتی ہُوئی نگّے وال کی سرحد سے کچھ اِدھر پھر آب جُو میں مِل جاتی تھی۔ اُس نہر کا آبیانہ نرالا تھا! ہر سال برسات کے بعد آب جُو پر باندھ باندھنے میں حِصّہ لینا اور نہر کو صاف کرنا پڑتا تھا۔ اُس مُردہ نہر کے شمال

میں آموں کا بڑا باغ تھا ، جسے بھائیا جی نے فیروز شاہ سے خرید کر کاٹا تھا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا بُوٹا بطور یادگار چھوڑا تھا۔ وہ بُوٹا پیوندی تھا اور پھلتا تھا۔ اُس کے آم موٹے رسیلے تھے اور ایک سیر میں دو بھاری تُلتے تھے ۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور شیشم کے درختوں کا سلسلہ ہریانہ تک جاتا تھا۔ ہر درخت کے تنے پر سے چھ اِنچ مربع چھال کاٹ کر اُس میں اُس کا نمبر لکھا ہُوا تھا۔ اب جُو سے آدھی فرلانگ کی دُوری پر بانبی تھی اور وہاں سے دو فرلانگ پر باہتیوں کے کوٹھے ۔ میری ماں ، تائی ماں اور نانی ، بانبی پر گُوگا پُوجنے جائیں تو نایا جی کہتے ،

گھر آئے جے ناگ تاں ماریں
بانبی پُوجن جائیں

باہتیوں کے کوٹھوں سے روڈا ، تُلسی ، داسو ، گوپال (اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کے سانپ لڑ جائے تو سانپ مر جاتا ہے) اور کئی لوڑھی مانگنے آتے تھے اور لاٹھیوں کے تال پر ناچتے ہُوئے ویہڑے (صحن) ہلا دیتے تھے ۔ وہاں سے چند کھیت آگے دوارکا ناتھ کا دو رہٹا (ایک کنُواں جس پر دو رہٹ ہوں) تھا۔ اُس سے دو تین کھیت آگے سڑک کی طرف رانگھڑوں کا رہٹ تھا ، جس کی پیٹری (رہٹ چلانے کے لئے بیلوں کے گھُومنے کی جگہ) کے کنارے پر جامن کا پیڑ تھا جو زمین سے گز بھر اُوپر دو شاخے میں پھیل کر جُھکا جُھکا اُوپر اُٹھا تھا اور شاخوں تک ویسا ہی رہا تھا ، اِس لئے اُس پر چڑھنا اور جامن توڑنا آسان تھا ۔ رہٹ سے پہلے اُس کنُوئیں پر لاؤ چلایا جاتا تھا۔ چرس ، پاٹ کے برابر آتا تو چرسی ، چرس پکڑتا ہُوا 'اللہ بیلی' کا نعرہ لگاتا بیل ہانکنے والا بیلوں کو روک کر جُوئے سے لہاس کھول دیتا اور پھر جوگ (بیلوں کی جوڑی) کو ینچی سے اُوپر پاٹ کی جانب اُلٹے پاؤں لاتا ۔ یہ وقت کھپاؤ عمل تھا اور اِس سے پانی کا بہاؤ لگاتار نہ رہتا تھا۔ اُن کے پاس دُوسری جوگ خالی ہوتی تو وہ دو جوگوں کا اِستعمال کرتے اور جوگ اُلٹے پاؤں پیچھے موڑنے کے بجائے سیدھی آگے نکال لے جاتے اور گھُما کر کنُوئیں کے پاس لاتے ۔ اِس طرح ایک جوگ جُوں ہی ینچی کے آخر میں پہنچتی ، دُوسری اُس کے آغاز میں جُتنے کے لئے تیار کھڑی ہوتی ۔ وہ رانگھڑ ، پاہی تھے اور ہریانہ میں رہتے تھے ۔ اُن کی ایک عورت کی نرالی عادت تھی ! وہ اپنے سیدھے ہاتھ میں مٹی کی ڈلی رکھتی اور اُسے انگُوٹھے سے کُریدتی ہُوئی چلتی ، جہاں ڈلی ختم ہوتی وہاں رُک جاتی اور نئی ڈلی اُٹھا لیتی ۔ اُس کے چلنے اور ڈلی کے کُریدنے میں ایک تال میل تھا ، لگتا تھا کہ انگوٹھا کوئی پُرزہ ہے ، جسے ٹانگیں حرکت دے رہی ہیں ۔ جامن کے پاس سے کبڑا آم صاف دکھائی دیتا تھا ۔ اُس کے پھل ہرے کالے ہوتے تھے ، پک کر ویسے ہی رہتے تھے اور پتوں میں دکھائی نہ دیتے تھے ۔ اُس کی جڑوں میں بھٹ تھا جس میں گوہ رہتی تھی ۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے منوہر سنگھ یاد آتا جو کہتا تھا کہ گوہ کے چمڑے کی جوتی پہننے والا کبھی بیمار

نہیں پڑتا ہے۔ اُس کی بات پر مَیں سوچتا کہ مَیں بڑا ہوں گا، گوہ ماروں گا اور اُس کے چمڑے کی جُوتی بنوا کر پہنوں گا۔
کُبڑے آم سے پانچ پچاس قدم آگے میل تھا اور اُس کے برابر دین دار کا ڈیرا۔ وہاں سڑک کی مٹی چمپئی تھی۔ برسات میں اُس میں سے ننھے مُنھے کھنگر نکلتے اور اپنے نیچے چھپے لاوے کا سُراغ دیتے۔

تایا جی کہتے تھے کہ دھرتی اپنے اندر پگھلے ہوئے لوہے کی طرح ہے، جہاں اِس کی سطح کمزور ہے وہاں یہ اپنے اندرونی دباؤ سے پھٹتی ہے اور بھونچال لاتی ہے۔ اُن کی یہ بات سنت گُرچرن سنگھ کے بیان سے الگ تھی، جو کہتا تھا کہ دھرتی کو گائے نے سینگ پر اُٹھایا ہُوا ہے، وہ تھک کر سینگ بدلتی ہے تو بھونچال آتا ہے۔

مَیں وہاں سے گزرتا اور ناقابلِ ادراک طریقے سے محسوس کرتا کہ دھرتی کا وہ ٹکڑا اُس کے اندر کھولتے لاوے سے سیدھا جُڑا ہُوا ہے۔ بارش میں وہ تیل کی گھانی کی طرح چکنا ہو جاتا تھا اور اُسے پار کرنے کے لیے پاؤں کو پنجے کی طرح گاڑ کر چلنا پڑتا تھا۔ مَیں اپنی لاپرواہی سے وہاں کئی بار پھسلا اور گِرا تھا۔ دین دار کا ڈیرا گھنی اور اُونچی جھاڑیوں میں گھِرا ہُوا تھا، جن کے بیچ میں سے تنگ سا راستہ اندر جاتا تھا۔ راستے کے مُنہ پر کئی کُتے بیٹھے اُونگھتے رہتے تھے۔ کوئی ڈیرے کے پاس سے گزرتا، وہ چوکنے ہو کر بھونکنے لگتے جیسے ڈیرے پر منڈلاتے ہُوئے خطرے کو ٹال رہے ہوں۔ ڈیرے کے اندر کیا ہے؟ دین دار کے سوائے کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے ڈیرے ہی کی طرح پُراسرار تھا۔ وہ ٹخنوں سے نیچے تک لمبا کالا چوغا پہنتا اور سر پر کاسہ نما چوغے کے رنگ کی ٹوپی، جو سر پر تسلسلے سے چپکی ہُوئی لگتی۔ ٹوپی کے رویتے سے اُس کا کھڑکنا پن اُبھر آتا اور کانوں پر اُگے بال ٹِڈی کے مُحاسوں کی طرح دکھائی دیتے۔ وہ گردن اور شانے جھکائے، ہاتھوں کو کمر کے پیچھے پکڑے ہُوئے چلتا اور ایک آدھ گز سے آگے نہ دیکھتا۔ جب اُسے اپنے سے دُور کسی شے کو دیکھنا ہوتا، وہ رُکتا، گردن کا بَل نکالتا، شانے اُوپر اُٹھاتا، آنکھوں پہ ہاتھ رکھتا، دیکھتا اور پھر اِسی عمل کو اُلٹا دُوہراتا۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا، اُس کا چوغا ٹخنوں سے اُونچا اُٹھ جاتا اور اُس کے ٹخنوں پر پیاز کے گنٹھوں جتنے بڑے بھورے گومڑے نمایاں ہوتے جو بصُورتِ دیگر نظر نہ آتے تھے۔ اُس کا چہرہ کدّو جیسا گول تھا اور بھرکٹی بالوں سے بھری ہُوئی ہونے کی وجہ سے اُلّو جیسا لگتا تھا۔ لمبی خضابی داڑھی، سینے پر قوس کی طرح اُٹھی رہتی تھی۔ وہ مُونچھیں منڈواتا تھا اِس لیے ہونٹ صاف دکھائی دیتے تھے۔ اُس کا بالائی ہونٹ اِس قدر آگے بڑھا ہُوا تھا کہ نیچے کا ہونٹ، لکیر سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بات کرتا تو لگتا کہ ایک ہی ہونٹ سے بولتا ہے۔

میل کے اِدھر سڑک میں سے گڈے لیک پھُوٹتی تھی جو آگے چل کر دو لیکوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک لیک سیدھی کوٹھے جٹّاں کو جاتی تھی اور دُوسری ہمارے گاؤں کی سرحد پر سے ہوتی ہُوئی لامبڑے پہنچتی تھی۔ دین دار کا ڈیرا آموں کے باغ میں تھا جو آرائیوں کے ڈیرے سے دس کھیت اِدھر ختم ہوتا تھا۔ اُس ڈیرے کے مشرق میں سیٹھ پیارے لال کی زمین تھی جو ٹوبیاں والا کھوہ، کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ آرائیوں کے ڈیرے سے لگتی ہُوئی گڈے

لیک بُوچڑ خانہ کے قریب سے گزرتی تھی اور ہریانہ میں داخل ہوتی تھی۔ بُوچڑ خانہ سے آگے کی لیک کے دونوں طرف گندگی اور کُوڑا کرکٹ کے بھبھوکتے ہُوئے ڈھیر تھے، جن کے پاس سے آرام سے گزرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ پہلا، ڈُبکی لگاؤ اور آگے نکل جاؤ۔ دوسرا، ناک دبا کر پکڑو اور مُنہ سے سانس لیتے ہُوئے چلو۔ ٹویاں والے کھُوہ سے چار کھیت آگے سنبل تھا، جس کے پاس پہنچ کر میں یہ دوہا ضرور گاتا، من ہی من میں یا اُونچی آواز میں۔

سنبلا گھمان نہ کریں،

پھل نیمیاں رُکھاں نُوں مِٹھے لگدے۔

(اے سنبل! تو اپنے اُونچے اور بڑے ہونے پر گھمنڈ نہ کر۔ یاد رکھ! میٹھے اور رسیلے پھل صرف چھوٹے درختوں ہی کو لگتے ہیں)

سنبل کرگسوں کا گھر تھا۔ اُس کے اطراف ہر طرح کے درختوں کی بھرمار تھی لیکن کرگس ہی جانیں کہ کیوں؟ وہ سنبل پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ اُس کا شاید ہی کوئی پتّا ہوگا جو کرگسوں کی بیٹ سے بچا ہوگا۔ کئی من چلے آپس میں شرط لگاتے تھے کہ جو کوئی مُنہ کھولے اوپر دیکھتے ہُوئے سنبل کے سات چکّر لگائے، وہ یہ انعام پائے۔ سنبل کی مکروہ ہیئت میں ایک خاص دل کشی تھی۔ اُس پر بیٹھتے اور اڑتے گِدھ، اُس کے کچّے غُنچے گراتے جو بنی بنائی بھنبھیریاں ہوتے۔ مئی کے مہینے میں سنبل ایک بڑا ڈھینگر (سُوکھی ہُوئی خاردار جھاڑی) نظر آتا۔ اُس وقت اُس کے ڈوڈے پھٹتے اور فضا میں رُوئی پھینکتے۔ دُور سے دیکھنے سے لگتا کہ برف کے گالے برس رہے ہیں۔ وہاں سے سو قدم پر کھبے ہاتھ کی طرف ڈپٹی کمشنر کا مزار تھا۔ اُس کے اِرد گرد کئی اور قبریں تھیں جو اُس کے سامنے مٹّی کے ڈھیر لگتے تھے۔ وہاں ایک مجاور رہتا تھا جو گہرا سبز لباس پہنتا تھا۔ اُس کے دراز گیسو، پگڑی کے نیچے سے کمر تک لٹکتے رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ اُس نے مؤکل بس کر رکھے ہیں۔ درختوں اور قبروں میں گھِرا ہُوا وہ مقام پُر اسرار تھا جسے مجاور کا حُلیہ اور اُس کا 'اللہ ہُو' کا نعرہ ڈراؤنا بنا دیتا تھا۔ جہاں وہ مزار ختم ہوتا تھا وہاں سامنے ڈی۔ اے۔ وی۔ ہائی سکول شروع۔ سکول سے لگی ہُوئی ایک سڑک تھی جو سکول کے گرد گھومتی اور منشی رام کے بھٹّے کو سکول سے الگ کرتی ہُوئی اُسی سڑک میں جا ملتی تھی جس کی وہ شاخ تھی۔ بھٹّے پر ہمارے گاؤں کا آسا سنگھ حکیم کام کرتا تھا۔ اُس کے پاس جل گھڑی تھی جس سے وہ ایندھن ڈالنے کے وقفے کا تعیّن کرتا تھا۔ وہ جل گھڑی کیا تھی! تانبے کی ایک کٹوری تھی جس کے پیندے میں باریک سا چھید تھا۔ بھٹّے میں تازہ جھوکا دیا جاتا تو کٹوری کو پانی پر تیرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا اور اُس کے ڈوبنے اور تیرانے کے ساتھ جھوکے کا عمل دوہرایا جاتا۔ بھٹّے کے اِرد گرد کے کھیتوں میں پتھیرے لگے رہتے تھے، جو کھویا ایسے کماتے تھے جیسے سگھڑ گرہستن آٹا۔ بھٹّے کے مالک اپنے گاہکوں کو کس سادگی سے فریب دیتے تھے! اینٹیں گنتی سے بچی تھیں اور چکّوں میں رکھی ہوتی تھیں۔ اُوپر کے چیٹے ردّے کو پرمکھ (سَنَد) مان کر عمودی ردّوں

سے ضرب دو تو اینٹوں کی تعداد زیادہ بنتی تھی، نسبتاً اس کے برعکس۔ سکول میں ایک ہال تھا جو اس کی ساری تعمیر پر چھایا ہوا تھا۔ وہاں پر میرا تائیرا بھائی آسا سنگھ پڑھتا تھا۔ پچھلے سال وہ مجھے سکول کے سالانہ جلسے میں لے گیا تھا اور میں نے اس ہال کو اندر سے دیکھا تھا۔ اس کی چھت پر جو گاڈر تھے وہ ایشر سنگھ کے خراس کے گولے سے کئی گنا بڑے تھے۔ گولے کو بیل پایوں پر چڑھایا گیا تھا تو کم سے کم پچاس آدمی لگے تھے۔ اس کے باوجود یہ حادثہ ہوا تھا کہ رمضان علی کا دایاں بازو اس سرکش بوجھ کے نیچے آکر کچلا گیا تھا اور اسے کاٹنا پڑا تھا۔ ان گاڈروں کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا اور میں نے بے اختیار ہو کر آسا سنگھ سے پوچھا تھا، "بھیّا! اتنے بڑے گاڈر اوپر اتنی دور کیسے چڑھائے تھے؟ کتنے آدمی لگے تھے؟"

"یہ گاڈر لیوروں سے اوپر چڑھائے تھے اور زیادہ آدمی نہیں لگے تھے۔ ایک لیور پچاس آدمیوں کا کام کر سکتا ہے۔" اس نے یہ کہہ کر لیور کے موجد یونانی حکیم آرشمیدس کا قول سنایا تھا جس نے مجھے بالکل حیران کر دیا تھا، "میرے پاس اتنا لمبا اور اتنا موٹا لیور ہو تو میں پوری دنیا کو اٹھا سکتا ہوں۔"

اس ہال میں دبے لہجے سے بھی بولو تو آواز گونجتی سنائی پڑتی تھی۔ میرے جی میں آیا تھا کہ میں وہاں زور زور سے بولوں لیکن آسا سنگھ نے مجھے روک دیا تھا۔

شام چوراسی، ہریانہ سڑک رام لیلا کی اب جو میں دو شاخے میں بدل جاتی تھی جو شاخ ہریانہ میں داخل ہوتی تھی اس کے آغاز میں سانیوں کے مکان تھے، پھر سیٹھوں کے گھر اور ان سے کچھ آگے ٹھٹھیروں کا کارخانہ۔ ان کا ہنر، کاریگری اور دشواری کی آپ اپنی نظیر تھی۔ وہ بھٹی کے منہ پر سے ڈھکن اٹھاتے، جس میں سے شعلے لپکتے۔ انہیں خاطر میں نہ لاتے ہوئے، وہ بھٹی میں زنبور نما سنسی گھساتے، کٹھالی باہر نکالتے اور پگھلی ہوئی دھات سانچوں میں ڈالتے۔ اس منظر کو دیکھنا، نظر بھر کر آفتاب دیکھنے کے برابر تھا۔ لیکن ٹھٹھیرے سخت کار تھے اور ساتھ ساتھ روپ کار، اوزار کی دھار کی طرح جو وقتِ عمل اپنی اور اپنی تخلیق کی حفاظت پوری چوکسی سے کرتی ہے۔ جب سانچے ٹھنڈے ہوتے، وہ سانچے توڑ کر ان میں سے برتن نکالتے انہیں چھینی سے تراشتے، خراد پر چڑھاتے، نوک پلک سنوارتے اور راپی سے کھرچ کر ان میں دھندلی چمک پیدا کرتے۔ جیسے جیسے برتن شکل بدلتا جاتا ویسے ویسے اس کا نام، ایسا برتن کورا کہلاتا۔ پھر کورے پر مٹار بندی (پیتل اور تانبے کے برتنوں پر گول نشان) کا کام شروع ہوتا۔ ہر مدھر آواز ہر مون ساز ہے لیکن وہاں برتن، ستار اور ہتوڑا، مضراب تھا۔ ٹھٹھیرے تانبے چون کو بوری پر اکٹھی کرتے لیکن اس کا کچھ حصہ زمین پر بکھر جاتا، جسے اکٹھا کرنا ممکن نہ تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کسی خاص زاویے سے زمین کا وہ حصہ سونے کی کان کا دہن نظر آتا۔

سڑک کی دوسری شاخ، ہندو مسلم ہائی سکول کے سامنے ہوشیار پور، ہریانہ کی پکی سڑک میں مل کر نابود

ہو جاتی ۔ اِن دونوں سڑکوں کے مِلاپ سے جو زاویہ بنتا ، اُسے ہریانہ سے باہر نکلنے والی سڑک کاٹتی اور اُسے مُتساوی الاضلاع مثلث میں بدل دیتی ۔ وہ تکون برابر کے تین حصوں میں مُنقسم تھی ۔ ایک حِصّہ شام چوراسی کی سڑک سے لگتا تھا ، وہ مولے میاں کے قبضے میں تھا اور دُوسرے دو حِصّے میرے بھایا جی کے ۔ ہماری ٹال کے سامنے سادھو رام کا باغیچہ تھا اور پیچھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی ۔ ہندو مُسلم ہائی سکول سے آگے بسوں کے اڈے کی طرف پادری کی کوٹھی تھی ، پھر امرُودوں کا باغ اور پھر سلوتر خانہ ۔ سلوتر خانے اور میرے سکول کے درمیان ایک سڑک تھی جو وزیر دی بسی کو جاتی تھی ۔ میرے سکول کے مغرب میں دیال سنگھ کا کارخانہ تھا جہاں وہ کُھرپیاں ، برنجیاں ، کِل میخ ، نعل بناتا تھا اور تانگوں کے پہیّوں پر ہال چڑھاتا تھا ۔ اُس کے سامنے سڑک کے پار تھانہ ہریانہ تھا ۔ سکول کے شمال میں سرائے تھی جس کی ساری تعمیر چھوٹی اینٹوں پر مبنی تھی ۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُسے شیر شاہ سُوری نے بنوایا تھا ۔

اپنے سکول کے محلِ وقُوع کا رُوح پرور پہلو تو میں بھول ہی چلا تھا ۔ میں خوش ہوں کہ وہ عین وقت پر یاد آیا ہے اور میری رُوحانی مسرت کی پذیرائی کا باعث ہُوا ہے ۔ تھانے کے پیچھے کُھلے میدان میں جسّا سنگھ رام گڑھیا اور اُس کے ارکانِ خاندان کی سمادھیاں تھیں ۔ اُن کی طرزِ تعمیر ، کڑا اور پارہ تھی ، جو سنگ تراشی اور استر کاری اور گُنبد سازی کا کامل نمُونہ تھی ۔ اُن کا زوال بھی یک طرفہ کمال کی کہانی تھی اور اُن کی فراموش شان و شوکت کی بے لوح سرگشتی ۔ چلچلاتی دھُوپ ، کڑکتی سردی ، طوفانی بارش ، تیز آندھی ، ناخواندہ سیلانیوں کی دست درازی .... وہ کون سی بلا تھی جو اُن کے سر پر سے نہیں گزری تھی پھر بھی اُن کے بسنتی رنگ کی چمک پھیکی نہ پڑی تھی ۔ محرابی روشندانوں اور دروازوں کی کمانوں کی لگری کہیں کہیں ٹوٹی ہُوئی تھی لیکن اُس تعمیر کی باقی ساری خوبیاں جُوں کی تُوں تھیں ۔ کوئی اُسے ٹھیک سے جھاڑ پُونچھ ہی دے تو وہ نئی کی نئی لگے ۔ اُس شوکتِ رفتہ سے اپنی نسبت مِلا کر میری نفسیات ہی بدل جاتی ۔ میں دُوسری ذات کے لوگوں کو بدترین اور اَرذل مخلوق شمار کرتا اور یہ خیال کر کے خُوش ہوتا کہ میں کتنے بڑے آبا و اجداد کا وارث ہُوں ۔ وہ سمادھیاں دو سو سال قدیم ہوں گی لیکن مجھے لگتا کہ وہ ست جُگ سے ، تریتا جُگ سے ، دواپر جُگ سے ..... جُگا جُگ سے وہیں ہیں اور کل جُگ بھی اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا ۔ میں اپنی بڑائی میں محسُوس کرتا کہ جُگ ، اِن سے ہیں نہ کہ یہ جُگوں سے ۔ میں اپنے خیال میں اُس دُنیا میں پہنچ جاتا جہاں زندگی اور موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے ، صرف ابدیت ہے ، جس پر ہر مذہبی آدمی اپنے انداز میں ناز کرتا ہے ۔

سکول میں میرا نام نئی جماعت چڑھنے سے پہلے لکھوایا گیا تھا ۔ ہیڈ ماسٹر نبی بخش گھر آئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ بیٹا ہریانہ آنا اور اپنا سکول دیکھ جانا ۔ اور ایک دِن جب سُورج رُوئی کے گالوں سے بادلوں کو برفیلے پہاڑوں کی طرح چمکا رہا تھا اور اُن کا پرتَو دھرتی کو عجیب طریقے سے روشن بنا رہا تھا ، میں اپنے سکول کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا ، "سکُول کے اندر کیا ہوگا ؟"

سکول کی کرسی، سڑک سے قدِ آدم اُونچی تھی، جس کے اُوپر پہنچنے کے لئے سیمنٹ کی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے خاتمے پر دو ستونوں پر محراب تھی جو ہری کالی بیل سے ستونوں کے نیچے تک ڈھکی ہوئی تھی۔ محراب سے آویزاں لانگروں (بیل کی شاخوں) کو محراب ہی کی شکل میں کاٹا گیا تھا۔ میں اُس حُسن کاری سے لُطف اُٹھاتا ہُوا سیڑھیاں چڑھا اور ایک بھرپور منظر میں گھر گیا۔

میں مناظر کا دِلدادہ ہُوں اور مُجھے حسین منظر ایسے پسند ہے جیسے پیٹو کو لذیذ کھانا۔ منظر کا نظارہ کرنے سے مجھے جو خُوشی ملتی ہے اُس کی راحت ابعادِ ثلاثہ کی سی ہے۔ میں اُس کی داد دینے سے اِحتراز کروں تو میری روک میری رُوحانی کوفت بن جاتی ہے لیکن میری طبعی حالت میں میری خُوشی ایک تخلیقی تحریک ہوتی ہے۔

اُس صُورت کی نرالی خوبصورتی یہ تھی کہ وُہ کارسازِ فطرت کے برعکس اِنسانی فکر و کاوش کی پیداوار تھا۔ سروِ سہی کی یک رنگی پر اپنی ہمدرانی ظاہر کرنے کے لئے مالی نے پودوں سے چھتریاں، گُل دان، سپاہی، ہل دار تراشے ہُوئے تھے جن پر اصلی ہونے کا گُمان ہوتا تھا لیکن مہندی کی ٹٹی ہُو بہُو دیوار تھی۔ اُس کی اُونچائی میرے قد سے اِتنی نیچی تھی کہ میں اُس کے پار کیاریاں دیکھ سکتا تھا۔ بڑی روِش سکول کے صحن کو دو حصّوں میں تقسیم کرتی تھی اور پھر چھوٹی چھوٹی روشوں میں ایسے بٹ جاتی تھی جیسے کیاریوں کو آغوش میں لے رہی ہو۔ روِشوں پر اینٹوں کا لال سفوف بچھایا ہُوا تھا۔ وُہ نظرگاہ اپنی جگہ یُوں لگتی تھی جیسے لُطفِ دید کے لئے جسدِ گُلشن کی رگیں کُھلی چھوڑ دی گئی ہوں۔ گیندے کے بڑھکیلے رنگ، آنکھوں کو چندھیا رہے تھے۔ ڈہلیئے مستیِ شباب میں خُود کو سنبھال نہ پا رہے تھے اور آڑواڑوں کے سہارے بھی لڑھکتے لگتے تھے۔ اور گُلاب!

سارے دیساں دے وِچوں دیش پنجاب نی سیئو
سارے پُھلاں دے وِچوں پُھل گُلاب نی سیئو

(اے سکھی، سارے دیشوں میں سے کوئی سُندر دیش ہے تو وُہ پنجاب ہے جیسے پُھولوں کا سرتاج گُلاب ہے)

گُل داؤدیوں کی کیاریوں پر کہکشاں کا گُمان ہوتا تھا۔ کیاریوں کے باہر روِشیں تھیں اور روِشوں کے باہر سبزے کا فرش۔ جہاں بڑی روِش ختم ہوتی تھی وہاں سفیدے کے دو درخت تھے۔ اُن کے تنے ایسے تھے، جیسے اُنہیں خراد پر چڑھایا گیا ہو۔ وُہ سکول نہ تھا، نگارخانۂ حُسن تھا!

میں بیری کے نیچے بیر چُن رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے گرد سیڑھیوں پر سجائے پُھولوں کے گملوں کو سراہ رہا تھا کہ نبی بخش اُدھر سے گزرے۔ اُنہوں نے مجھے پہچان لیا اور میں نے اُنہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اُنہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے۔ اُن کے کہنے پر میں نے

اُنہیں ٹپّے سُنائے۔ میرے ٹپّے سُنانے کا انداز اُنہیں اِس قدر پسند آیا کہ مجھے سُننے کے لئے اُنہوں نے دُوسرے اُستادوں کو بُلایا اور مجھے اُن سے مُتعارف کروایا۔ مَیں سکُول سے واپس آیا تو مَیں اپنے انداز میں فاتح تھا۔

اِس واقعے سے دِلچسپ وُہ واقعہ ہے جس کا تعلُق میرے پہلے سفر سے ہے۔ میری ماں ہریانہ جانے کے لئے تیار ہُوئی۔ مَیں نے اُس کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن وُہ نہ مانی۔ اُس کے اِنکار کی وجہ وُہ بوجھ تھا جو اُسے اُٹھا کر ہریانہ کو لے جانا اور لانا تھا۔ مَیں کسی صُورت رام نہ ہوا تو وُہ اِس شرط پر راضی ہُوئی۔ "مَیں راستے میں گود میں نہ اُٹھاؤں گی! چلنا ہے تو چل!"

مجھے ہریانہ کا میٹھا سا خیال یہ تھا کہ ماں وہاں جاتی تھی اور مٹھائی لاتی تھی۔ مَیں اُس کی منظُوری پر کِھل اُٹھا اور بھاگ کر دروازے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وُہ گھر سے روانہ ہُوئی، مَیں اُس سے آگے تھا اور وُہ میرے پیچھے۔ میرے دِل میں لڈّو پھُوٹ رہے تھے۔ مَیں آگے بھاگتا ہُوا پیچھے مُڑ کر دیکھتا جیسے اُس کی سُست روی پر طنز کرتا۔ مَیں ایسے چہک رہا تھا جیسے اُس دیارِ نو کی رونق بڑھانے جا رہا تھا۔ لیکن جُوں ہی مَیں نے گاؤں کی سرحد کو پار کیا میرا خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا گاؤں، باغوں سے گھِرا ہُوا تھا۔ اپنی جُستجُو میں، مَیں جِس کسی سے پُوچھتا کہ باغوں کے پرے کیا ہے؟ وُہ مجھے کچھ اِس طرح کا جواب دیتا۔

"لامبڑا ہے!"

"سین پُور ہے!"

"کوٹلہ ہے!"

"آدو آل ہے!"

"شیر پُور ہے!"

"ہریانہ ہے!"

ہمارے کھیتوں میں سے کوٹھے جٹّاں اور کوٹھے باہتیاں دِکھائی دیتے تھے اور دُوسرے سارے مقاموں کو مَیں دیکھنا چاہتا تھا۔ باغوں کے پرے ہریانہ نہ دیکھ کر مَیں مایُوس ہو گیا۔ میرا دِل بوجھل اور قدم بھاری ہو گئے اور مَیں نے ماں سے پُوچھا، "ماں، ہریانہ کہاں ہے؟"

"اُن باغوں کے پرے ہے۔" اُس نے اُسی بے توجہی سے کہا جِس کا مُظاہرہ وُہ کرتی آئی تھی۔

ہمارے گاؤں سے ہریانہ تک باغوں کا سِلسِلہ جُڑنے کے لئے ٹُوٹتا تھا۔ مَیں نے گرتے ہُوئے حوصلے کو سہارا دیا، قدموں کو تیز کیا اور اگلے باغوں کے پار جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کچھ نہ دیکھ کر میری ہڑبڑاہٹ بڑھ گئی۔ اُس وقت ہم دین دار کے ڈیرے کے برابر پہنچ چُکے تھے۔ میری حالت پالتو کُتے کی سی تھی جو اپنے علاقے کی بُو نہ پا کر

پریشان ہو جاتا ہے اور کچھ سمجھ نہ پڑے تو چاروں طرف سونگھتا ہوا وہیں دبک کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی سمت مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں بوجھ سے عاجز تھی، وہ میرے اڑیل پن سے بوکھلا گئی اور مجھے کوسنے لگی لیکن میرے ارادے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ گٹھڑی پھینک کر مجھے اٹھا لے۔ اس نے ایسا نہ کیا تو میں ایڑیاں رگڑ کر بات منوانے کا فن آزمانے لگا۔ وہ پھسلاتے پھسلاتے چڑ گئی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ ہریانہ کی دل کشی میری بے دلی میں گم ہو گئی اور میں گر کر لوٹنے لگا۔ وہ کچھ دور جا کر رکی اور مجھے بلانے لگی جس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے ایڑیاں رگڑنے اور چلانے کی رفتار تیز کر دی۔ اتنے میں دین دار کے ڈیرے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ میں نے دہل کر ادھر دیکھا اور ایڑیاں رگڑنا اور رونا بھول گیا۔ کتے بھونکتے بھونکتے میری جانب بڑھے، مجھے لگا کہ مجھ پر لپکے۔ میرا ہٹیلا پن جاتا رہا۔ میں اچک کر اٹھا، ماں کے پیچھے بھاگا اور اسے جا لیا۔ اس کی شرن پا کر میں نے کتوں کو دیکھا، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے باغ کی پہنائی میں گم ہو گئے تھے۔ وہ کتے، نرالے کتے تھے! وہ کہیں چلتے، کہیں بھاگتے، کہیں چھپتے، کہیں سامنے آتے، کہیں خاموش، کہیں بھونکتے، کہیں ہمارے آگے اور کہیں ہمارے پیچھے ہریانہ کی طرف بڑھتے رہے اور سنبل کے پاس سے بوچڑ خانہ کو مڑ گئے۔

میں باقاعدہ سکول جانے لگا تو وہ نگار خانہ، میرے لئے دہشت کدہ بن گیا اور میں آزردہ و افسردہ۔ بڑی جماعتوں کے طالب علم، میرے گالوں پر چٹکیاں بھرتے، میرے چوتڑوں میں انگلیاں گھساتے اور میرے چھلے زبردستی لیتے۔ میں لاکھ چاہتا لیکن اپنی حفاظت نہ کر سکتا۔ میں بے معمور و بے مقدور اپنے بے ہمت اور بے عزت اعضا کو دیکھتا جن پر میرے دشمنوں کے حملے، ڈستے ناگوں کی طرح لپٹے ہوتے۔ میں انہیں جسم سے نوچ کر پھینکنا چاہتا لیکن ویسا نہ کر سکتا، اگر کر سکتا تو میں بہت پہلے اپنے ہی ہاتھوں ختم ہو گیا ہوتا۔ میرے تنہا غم خوار، میرے آنسو تھے لیکن وہ، مجھی کو جلاتے تھے۔

باب ۱۰

شاطر نگاہِ شوق کا محرم ازل سے ہوں
آدم ہوں کوئی لالۂ صحرا نہیں ہوں میں

ماں کے دودھ اور ماں کی زبان کی شیرینی قدرتی طور پر بے مثال ہے۔ پنجابی، میرے لئے ہوا

پانی، روٹی کپڑا، سوچ وچار، تن من، دُکھ سُکھ، آہنگ ترنگ، آنند سوگندھی، مختصر یہ کہ میری زندگی تھی۔ میرے اُستاد پنجابی آمیز اُردو بولتے تھے اور ویسے ہی پڑھاتے تھے۔ اُردو میں میری زبان نہ کھُلی۔ میں اُردو میں بات کرتا جو مجھے کسی اور ہی دُنیا کی زبان لگتی۔ اُردو اور پنجابی میں گڈ مڈ شروع ہوئی اور میں دوغلی زبان بولنے لگا۔ اُردو الفاظ کی ادائیگی کے لئے میں پُورا زور لگاتا پھر بھی صحیح نہ بول پاتا۔ میری زبان کی فطری بے ساختگی جاتی رہتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں کوئی غیر حقیقی کام کر رہا ہوں۔

میرے سکُول کے کمروں میں تختیاں آویزاں تھیں، جن پر طرح طرح کے اشعار لکھے ہوئے تھے۔ چند اشعار جو مجھے پسند تھے، رقم کرتا ہوں۔

ناک میں اُنگلی، کان میں تنکا، مت کر، مت کر، مت کر
آنکھوں میں انجن، دانتوں پہ منجن، نت کر، نت کر، نت کر

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

عیب کا دریافت کرنا ہے ہُنر مندی اسد
نقص پر اپنے ہُوا جو مُطّلع کامل ہُوا

اوّل جماعت کو بطورِ خاص اور باقی طالب علموں کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دُودھ اور گُڑ چنے ملتے تھے۔ میں جب تک پڑھتا رہا مجھے دُودھ ملتا رہا۔ دُودھ اِس قدر گرم ہوتا تھا کہ پھونکیں مار کر پیو تو دُودھ پینے اور گلاس دھوکر رکھنے میں پُوری تفریح گزر جاتی تھی۔

مجھے حُقّے کی گُڑگُڑاہٹ اچھی لگتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سوٹا ماروں اور حُقّہ گُڑگُڑاؤں لیکن مجھے موقع نہ ملتا تھا۔ مسلمان اُستاد حُقّہ پیتے تھے اور مسلمان طالب علموں ہی سے حُقّہ تازہ کرواتے تھے۔ جو کوئی حُقّہ تازہ کرتا وہ فخر سے کہتا، "جیسا میں حُقّہ تازہ کرتا ہوں ویسا کوئی کرکے دِکھائے!" حُقّے کے بارے میں دو الگ الگ مفہوم کی منظوم کہانیاں تھیں۔

حُقّہ ہر کا لاڈلا سب کا رکھے مان
بھری سبھا میں یُوں بھرے جُوں گوپیوں میں کان

اور

حقّہ کفر خدا دا چلم، حقّے دی رن
جتھے حقّہ دیکھئے اوتھے سٹیئے بھن

(حقّہ خدا کا کفر ہے اور چلم، حقّے کی بیوی ہے۔ ان دونوں ملعونوں کو جہاں دیکھو غارت کردو)

مجھے حقّہ تازہ کرنے میں باریکی دکھائی نہ دیتی۔ میں تمنّا کرتا کہ میں بھی حقّہ تازہ کرکے اُستادوں کی خوشنودی حاصل کروں لیکن وہ مجھے موقع نہ دیتے۔ اِس کی وجہ صرف ایک تھی کہ میں سکھ تھا۔ اور سکھوں میں کیا حرام ہے اور کیا حلال ہے؟ اِس کا تو مجھے علم نہیں ہے، ہاں روایتاً حقّہ پینا حرام ہے۔

میں نلکے پر پانی پی رہا تھا کہ حمید حقّہ تازہ کرنے کے لئے لایا۔ اُس نے میری مدد چاہی اور میں نے اُس کی بات بخوشی مان لی۔ اُس نے حقّہ زمین پر رکھا، ایک ہاتھ میں طاس پکڑا، دوسرے میں قُفلی اور دونوں کو ایک دوسرے کے اُلٹ گھمایا۔ نیچہ ڈھیلا ہُوا، وہ حقّہ اُٹھا کر آنکھوں کے برابر لایا اور اُسے کھولتے ہوئے ایسے دیکھنے لگا جیسے بازی گر، منہ میں بانس پکڑ کر بانس کو دیکھتا ہے اور اس کے توازن پر نظر رکھنے کے لئے آنکھ نہیں جھپکتا ہے۔ آخری چوڑی کھول کر اُس نے نیچہ اچھال کر نیچے گرایا اور سُبکدستی سے اُسے درمیان سے پکڑ لیا۔ اُس کی کارسازی میری دلچسپی اور بڑھا گئی۔ طاس، فرش پر رکھ کر وہ نیچہ تازہ کرنے لگا اور میں نلکا چلانے۔ اُس کاروبار میں میری حیثیت ضمنی تھی اور حمید کی پہلی۔ وہ گاہے گاہے مجھے مُسکرا کر دیکھتا جیسے مجھے شہ دیتا۔ نیچے کی مٹھی چاپی کرتے ہوئے وہ نَے میں پانی بھرتا اور گال پُھلا کر اُسے باہر پھونکتا۔ میں نلکا چلانے میں مصروف تھا لیکن میرا دھیان اُس کے ہاتھوں اور آنکھوں میں اٹکا ہُوا۔ اُس نے ایک آنکھ بند کرکے نَے کے اندر جھانکا اور مجھ سے پوچھا

"تجھے معلوم ہے، میں نے نَے کے اندر کیا دیکھا؟"

مجھے کیا معلوم کہ اُس نے اندر کیا دیکھا! اُس کی بات سے میرا شوق بڑھ گیا اور میں نے آگے جھک کر نَے کے اندر دیکھنا چاہا۔ اُس نے نیچہ اوپر اُٹھا لیا جیسے اُس کی دیکھی ہُوئی شے میرے دیکھنے کی چیز نہ ہو۔ وہ نیچہ اُٹھائے ہُوئے باڑ کی طرف گیا اور ہاتھ کے اِشارے سے مجھے رُکنے کا اِشارہ کیا۔ اُس نے باڑ کے اندر باہر دیکھتے ہُوئے لوہے کا تار ڈھونڈ نکالا، اُسے نیچے کی نَے اور ٹیروے میں باری باری فلتڑو کی طرح پھیرا اور پھر اُنہیں دھویا۔ اُن کے اندر سے گاڑھا پیلا پانی نکلا جس میں نیکوٹین کے ذرّے تیر رہے تھے۔ حقّے کی ہلکی ہلکی باس جو مجھے خوشبو سے سُہانی لگ رہی تھی، تیز ہوگئی۔ وہ نَے اور ٹیروے میں باری باری تار گھساتا، نکالتا، پانی بھرتا اور پھونکتا۔ جب تک نیچا دھوَن (آلودگی) اُگلتا رہا وہ اُس عمل کو دوہراتا رہا۔ اُس نے طاس اُلٹا، اُس کا پانی دھوَن ہی

کا نمونہ تھا سوائے اِس کے کہ اُس میں نیکوٹین کے مُتعلق ذرّے نہ تھے۔ طاس تازہ کر کے اُس نے نیچہ لگایا، مُنہنال کو مُٹھی میں دبا کر پُونچھا، ہاتھ منہ دھویا، باڑ میں تار کو چھپایا اور چِلم کے لئے روڑے سے نئی گِٹی تراشنے لگا۔ مَیں جیسے اُسی گھڑی کے اِنتظار میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔ میری بے قراری اور اِشتیاق پذیری اِنتہا کو پہنچ گئی اور مَیں نے لپک کر کش کھینچ لیا۔ پانی کی دھار سیدھی تالو سے ٹکرائی، کُچھ ٹُوٹ کر حلق میں اُتر گئی، کُچھ مُنہ میں پھنس رہی اور کُچھ ناک میں سے باہر نکلی۔ میرے حلق میں پھندا پڑ گیا جِسے مَیں نے کھو کھو کر کے نِکالا۔

"ارے پاگل! حُقّہ ایسے پیتے ہیں کیا؟ طاس بھر کر پہلے اُسے پھونکتے ہیں۔"

حمید نے میرے سامنے حُقّہ پھُونکا، زیادہ پانی نِکالا اور حُقّہ گڑ گڑایا۔ مَیں نے محسُوس کیا کہ اُس لے میں وُہ دِل کشی نہیں ہے جو مُجھے اچھی لگتی ہے۔ اُس نے پھر حُقّہ پھُونکا اور میری حِس کی تصدیق کر دی۔ وُہ حُقّہ پھُونکتا اور گڑگڑاتا، پھُونکتا اور گُڑگُڑاتا رہا، جب تک اُس نے وُہ نغمہ نہ سُنا جِسے مَیں بھی سُننا چاہتا تھا۔

لیمپ سگریٹ کی مُنادی زور شور سے ہو رہی تھی۔ مُنادی کرنے والے لیمپ سگریٹ کے ٹھپّے والے کپڑے پہنے سڑکوں پر گھُومتے اور چھنکنے بجاتے ہُوئے یہ گیت گاتے،

پانی پیئے پمپ دا
سگریٹ پیئے لیمپ دا

مُنادی کرنے والوں کا اگوا، اُونچے پا بانسوں پر ہوتا تھا جو چلتا ہُوا ناچتا اور اُوپر سے سگریٹ کے نمُونے پھینکتا جو جِس کے ہاتھ لگتے، لگتے۔ سویگ سِنگھ اور مَیں وُہ سگریٹ اُٹھاتے اور دیال سِنگھ کے کارخانے سے کوئلے لے کر کہیں چُھپ کر پیتے۔ ہم دھُوئیں کی بدمزگی میں مزہ لیتے اور فخر محسُوس کرتے کہ ہم وُہ کام کر رہے ہیں جو بڑوں کا حق ہے۔ مَیں فالسے کے پیچھے چُھپ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ مَیں نے گہرا کش لیا جس سے مُجھے اچھُو آ گیا۔ پرماتما سِنگھ، جو بڑی کلاس کا طالبِ علم تھا، قریب سے گُزر رہا تھا، اُس نے دیکھ لیا۔ مَیں نے ڈر کر سگریٹ پھینک دیا لیکن اُس نے مُجھے پکڑ لیا اور کھینچ کر ہیڈ ماسٹر کے پاس لے جانے لگا۔ مَیں نے مسکین صُورت بنا کر عفوِ گُناہ کیا، اُس نے کہا، "ٹھیک ہے، چھوڑ دیتا ہُوں! میری بات مان!"

اُس کی بات سراسر تفویضِ ذات کی تجویز تھی، مَیں نے اُسے منظُور نہ کیا۔ اُس نے میرا ہاتھ تکلیف دِہ حد تک مروڑ دیا اور مُجھے بے بس کر کے میرے گال توڑنے لگا۔ مَیں درد سے چلّایا۔ اُس نے مُجھے چھوڑا لیکن مُجھ پر نیا حربہ آزمایا۔ وُہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے تک جاتا، میری طرف دیکھتا اور مُجھے خوف زدہ پا کر لوٹ آتا اور میرے ساتھ زبردستی کرتا۔ مَیں اُسے روکتا تو وُہ پُوری ڈھٹائی سے اُسی شیطنت کو دُہراتا۔ سکُول بند ہُوا، وُہ گھاتیا میرے پیچھے پیچھے ٹال تک آیا لیکن بھائیا جی کو سامنے دیکھ کر آگے نِکل گیا۔ وُہ یُوں ہی مُجھے کئی دِن تک ڈراتا رہا اور اپنا مطلب

نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر بڑی تگ ودو کے بعد مَیں نے اُس سے چھٹکارا پایا۔

ہر موسم کے اپنے کھیل تھے لیکن ایک کھیل بے موسم تھا، کسی کا لُولُو بنانا۔ شریر لڑکے پُرزوں پر تحقیر آمیز جُملے لکھ کر دُوسروں کے پیچھے چپکاتے تھے اور اُنہیں حرفِ ملامت بناتے تھے۔ گرما، نقّالوں کے لئے مخصُوص تھا اور سرما، کھیلوں کے لئے۔ ریٹھوں، کوڑیوں اور بلّوروں سے نکّی مُوٹھ اور گُچّی پالا کھیلا جاتا تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نشانہ باز تھے لیکن الطاف حسین کا جواب نہ تھا۔ کوئی اُس سے اِس شرط پر نہیں کھیلتا تھا کہ وُہ بال کو نشانہ بنائے گا اور وُہ چوٹوں کو۔ وُہ تگڑا بھی تھا اور لچّا بھی۔ جو کوئی اُسے کھیل میں شریک نہ کرتا، وُہ خود بھی نہ کھیل سکتا۔ وُہ اُس کی گُچّی میں مُوت دیتا۔ اُس کے مَن بھاتی اور حسبِ موقع حکایت تھی۔

نہ کھیلنا نہ کھیلن دینا
گُچّی میں مُوت دینا

کھیلنے والے چھُپ چھُپا کر کھیلتے لیکن وُہ تاک میں رہتا اور اُنہیں ڈھونڈ نکالتا۔ اُس کی شرارت پسندی! وُہ ساری تفریح ہاتھ میں پکڑے گھُومتا، نہ خود کھیلتا اور نہ کسی کو کھیلنے دیتا۔

بسنت پر پتنگ بازی کے مُقابلے شرُوع ہوتے جو کئی کئی روز تک چلتے۔ کئی لڑکے پتنگ لُوٹ کر لاتے اور کئی مانجھا۔ ہر کوئی اپنی لُوٹ کی کہانی جیسے بیان کرتا اُسے داستاں گو سُنتا تو کان پکڑتا۔ کلاس ہو کر باہر، جہاں کہیں دو حریفوں کو وقت ملتا، وُہ اپنی جیبوں سے مانجھا نکالتے اور گھسا میری کھیلتے۔

دُوسری عالم گیر جنگ زوروں پر تھی فوجی افسروں اور رنگرُوٹوں کے وفد ہمارے سکُول میں آتے، اُن کے دِل بہلانے کے لئے جلسے ہوتے۔ جھوری، قادر یار اور مَیں یہ کورس گاتے، انترے کے وقفے میں جھوری مُنہ سے ڈھولک بجاتا، قادر مُنہ سے چکچکی اور مَیں اِکتارا۔

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنگرُوٹ بھرتی ہو جانا
ایتھے مِلدے پھٹے پُرانے
اوتھے مِلدے سُوٹ
بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنگرُوٹ بھرتی ہو جانا
ایتھے مِلدی رُوکھی سُوکھی
اوتھے مِلن فرُوٹ
بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنگرُوٹ بھرتی ہو جانا
ایتھے پھردے ننگے پاؤں

اوتھے ملدے بُوٹ

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنگروٹ بھرتی ہو جانا

عام طور پر جلسے کے خاتمے پر وفد کا انچارج، سکول اور فوج کے بارے میں چند نپے تلے جملے کہتا اور تالیوں کے شور میں رخصت ہو جاتا۔ لیکن ایک بار اس معمول کے بالکل الٹ ہوا، وفد کا انچارج ہمارے پروگرام کی ہنسی اڑا کر سب کو ہنسا گیا۔ "فوج میں کتنی موج ہے، ہم جانتے ہیں۔ خدا کرے، آپ جیسا سوچتے ہیں ویسا ہی ہو لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں،

دو پھلکے تاں کڑچھا دال دا

ہور منگو تاں حولدار ماردا

(دو روٹیوں کے ساتھ صرف ایک کڑچھا دال کا ملتا ہے۔ اس سے زیادہ مانگو تو انچارج حولدار مارتا ہے)

ماسٹر ہنس راج ادبی ڈراموں کے ڈائریکٹر تھے۔ 'ساہوکار' اور 'پھلوں کا مناظرہ' ان دو ڈراموں کی شہرت دوسرے سکولوں اور شہریوں تک تھی۔ میں پہلے میں کسان اور دوسرے میں سنگترے کا پارٹ کرتا تھا اور دونوں لیڈنگ کریکٹر تھے۔ میں کسان کے مکالمے بولتا ہوا ساہوکار کے پیروں پر گرتا اور فرط جذبات سے رو دیتا۔

پڑھائی لکھائی کے دوران کوئی وقت مجھ پر گراں گزرتا تھا تو وہ مہارنی کا گھنٹا تھا۔ میری کوفت کی وجہ وہ تکرار تھی، جس کے بن مہارنی کا لفظ بے معنی ہے۔

تایا جی خود تکرار ناپسند کرتے تھے۔ "تحقیق، علم کی اعلیٰ تفسیر ہے کیوں کہ یہ علم کے جمود کو توڑتی ہے اور اسے تحریک عطا کرتی ہے۔ علم کے ساتھ تحقیق کی خوبی منسلک نہ ہوتی تو اس کی حیثیت کلام خدا کی سی ہوتی۔"

تایا جی کہتے تھے، "ہندسوں کا علم اپنی درستی کی وجہ سے دل نواز ہے لیکن ہنر اپنی باریک بینی سے خیال ساز اور قصد فراز ہے۔" ان کی دانش اور میری فطرت کے لحاظ سے مجھے زراعت اور صنعت پسند تھیں۔ پودوں، پھولوں، پھلوں، کلوں، پرزوں کے نام میرے لئے نئے نہ تھے لیکن ان کی وگیانک تفصیل شوق آمیز تھی۔ میں حیران تھا کہ کسی چیز کا کوئی حصہ نہ تھا، جس کا کوئی نام نہ ہو، کام نہ ہو۔ سنتا سنگھ جس حصے کے بارے میں بات کرتے اس کی لفظی تصویر کھینچ دیتے۔ کوئی چیز بڑی ہوتی تو وہ طالب علموں کو اس کے پاس لے جاتے اور چھوٹی کو کلاس روم میں اٹھا لاتے۔ جو چیز کھولی جا سکتی اسے کھولتے اور دوسری کو چیر پھاڑ کر میز پر رکھ دیتے اور اس کے افعال و فوائد بیان کرتے۔

درختوں کی کروڑوں اقسام ہیں۔ دیو قامت اور ڈراؤنے برگد سے لے کر، نازک اور پیارے پھولوں

کے پودے تک اِن کے زُمرے میں آتے ہیں۔ میں نے ہریانہ کے حکیم پردھان کی زبانی سُنا ہے کہ حقیر گھاس بھی انہیں کے خاندان کا ایک نہایت کارآمد فرد ہے۔ اِن کی بات نیم دریافت شدہ تہذیب و ثقافت کی حقیقت ہے۔ اِس تہذیب میں ہر شہری کی اِنفرادیت لاجواب ہے۔ اِس کے اپنے حسب نسب، طور طریقے اور رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ اپنی کیفیت و ماہیت کی حفاظت جس احتیاط و اہتمام سے کرتا ہے، اُس پر غور کرتا علم و تحقیق کے پوشیدہ نکتے پاتا ہے۔ مُلکِ نباتات کا ہر شہری دُوسرے شہری سے لاگ رکھتا ہے لیکن نوعِ اِنساں کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، جو مُضرِ صحت ہے، لیتا ہے اور آکسیجن، جو صحت کے لئے اکسیر ہے، دیتا ہے اور ہوا کو مُہلک آلودگی سے صاف کرتا ہے۔ اِس کی ساخت آدمی کے برعکس ہے لیکن ہے باکمال! پتّے اِس کے پھیپھڑے ہیں اور گُودا، گوشت، ریشے، رگیں ہیں اور تنا ریڑھ کی ہڈّی، چھال، کھال ہے اور جڑیں، ہاتھ جو کیمیاگر ہیں۔ وُہ زمین کے نمکداں میں سے بھانت بھانت کے نمک چُنتے ہیں، اُن کی ترکیب بدل کر مُفید مرکّب تیار کرتے ہیں اور اُنہیں درخت کے الگ الگ حِصّوں میں جمع کرتے ہیں، اسی لئے تو پھل، پھول، پتّے، چھلکا، گُودا ... ہر حِصّہ اپنے طور پر مُکمّل دوا ہے۔ یہ انوکھے شہری، اطبا و ادویہ دونوں ہیں اور مزید فطرت کے خیراتی شفاخانے اور اُن کے بے اُجرت کارِندے۔ ہر کسی کی کتنی ایسی خوبیاں ہیں جن کے بارے میں حکمانے کتابیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں اور ہر بار کچھ نہ کچھ نیا انکشاف کر رہے ہیں۔ اِس سے درختوں کے پُراسرار کردار کا نشان مِلتا ہے۔

پیپل کی ایک خُوبی ایسی ہے جس پر حُکما کے بجائے ماہرِ نفسیات کی رائے درکار ہے۔ یہ کنواریوں کا ہمدرد ہے۔ یہ اُن کے لئے اُن کی پسند کے دُولہے تلاش کرتا ہے اور بدلے میں اپنی پُوجا کرواتا ہے۔

پھولوں میں نر اور مادہ ہیں اور تتلیاں، شہد کی مکّھیاں، بھونرے، ہوا کے جھونکے اُن کے بچولیے۔ یہ اپنے مہمانوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اُن کی جامد حسِ افزائش کو متحرک بناتے ہیں۔ اُن کے بیج اُن کے رُوحانی دُنیاوی وارث ہیں جو اُن کی سیرت، خصوصیت، کیفیت، ماہیت .... کو قطعی طور پر اپناتے ہیں اور اُن کے نسلی تسلسل کی ضمانت بنتے ہیں۔ قارئین! آپ اپنے بچپن ہی سے پھول دیکھتے آئے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے! وہی پھول، شاخ سے اپنے آپ گرتے ہیں جو اکھرے ہوں اور ساق رکھتے ہوں۔ پھولوں میں کچھ پھول ماس خور ہوتے ہیں۔ اُن کی فطری ماہیت دُوسرے پھولوں سے بالکل الگ ہے۔ اُن کے حامِل زر، پنکھڑیوں سے اُونچے ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے بچولیوں کو کھا جاتے اور اُن کے ساتھ خُود بھی نابُود ہو رہتے۔

تایا جی کے کہنے کے مطابق درختوں کا وُجود، نوعِ انسان کے برعکس ہے۔" آدمی کی ناتمامی ہی اِس کی نارسائی ہے اور سارے دُکھوں کی جڑ مُول۔ فطرت میں ہر شئے اِسی لئے سرشار نظر آتی ہے کہ وہ اپنی جگہ کامل ہے

یا مائل بہ کمال ہے۔"

پھول کے تمام حصے اپنے اپنے طریقے سے اُس کے پالن پوسن میں شریک تھے لیکن وگیانک طریقے سے پنکھڑیاں بیکار شے تھیں۔ میں اِس انکشاف پر حیران ہوتا اور سوچتا کہ ماسٹر جی کہیں بھول نہ کر رہے ہوں۔ پنکھڑیاں پھول کا رُوپ ہیں، سرُوپ ہیں، بناؤ ہیں، سنگار ہیں۔ پنکھڑیوں ہی سے پھول پھول ہے۔ تمام وکامل اور مدلل نظمِ فطرت میں مجھے پنکھڑیوں کی بے آبروئی اچھی نہ لگی۔ میں اُن کے حسن وجود میں معنی تلاش کرتا لیکن ناکام رہتا۔

سکول کا سالانہ جلسہ تھا۔ ہنس راج نے مجھے اقبال کی 'ایک آرزو' یاد کرنے کے لئے دی۔ یہ نظم ہمارے نصاب میں نہ تھی، وہ اُسے کسی دوسری کتاب سے نقل کر کے لائے تھے۔ میں یوں ہی اِس مصرعے پر پہنچا،

سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

گویا میں نے فطرت کا بڑا راز پا لیا۔ میں بھاگا بھاگا سنتا سنگھ کے پاس گیا اور بے اختیار کہا، "ماسٹر جی! ماسٹر جی! پنکھڑیاں فضول شے نہیں، پھول کا لباس ہیں۔" اور اُنہیں اقبال کا شعر سنا دیا۔

مہندی لگائے سُورج جب شام کی دُلہن کو
سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

سنتا سنگھ کچھ زیادہ ہی وگیانی تھے۔ وہ میری 'دریافت' پر خوش نہ ہوئے اور میری بات کاٹ کر بولے "شاعری میں ٹھیک ہے کیوں کہ شاعری خود ایک فضول چیز ہے۔"

وہ شاعری کے مداح تھے اور اکثر خوبصورت اشعار سناتے تھے۔ وہی جانیں! اُنہوں نے میری بات کو کیوں رد کیا؟ میں جس قدر مغرور مغرور اُن کے پاس گیا تھا اُس سے زیادہ شرمندہ شرمندہ واپس آیا۔

چانن سنگھ فارسی پڑھاتے تھے لیکن تعریف پنجابی کی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پنجابی، فارسی سے بڑی زبان ہے۔ وہ فارسی اشعار کے ہم معنی پنجابی اشعار سناتے تھے، جو یاد کرنے میں آسان ہوتے تھے۔

فارسی شعر ہر جا کہ رود قدم شریفا
نہ فصلِ ربیع بود نہ خریفا

(یہ ایسے شریف ہیں کہ جہاں قدم رکھتے ہیں وہاں ربیع کی فصل ہوتی ہے اور نہ خریف کی)

پنجابی شعر جدوں دے جمے چندر بھان
چُلہے اگ نہ منجے بان

(جب سے چندر بھان پیدا ہوا ہے، گھر کی یہ حالت ہے کہ نہ چولہے میں آگ ہے اور

نہ چارپائی میں بان)

فارسی شعر   از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

(اپنے عمل کی سزا سے غافل مت رہ! گندم سے گندم اُگتا ہے اور جو سے جو)

پنجابی شعر   خربوزے خربوزہ پھلدا تُمّے پھلدا تُمّا
شاہاں دے پت شاہ کہاوندے جُتّے دا پت جُمّا

(خربوزے کے بیج سے خربوزہ پیدا ہوتا ہے اور حنظل کے بیج سے حنظل، اسی طرح شاہ کا بیٹا شاہ کہلاتا ہے اور موچی کا بیٹا موچی)

فارسی قطعہ

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار	اے مردِ ہوشیار، اگر حاملہ عورت
اگر وقتِ ولادت مار زاید	سانپ کو جنم دیتی ہے
ازاں بہتر کہ نزدیکِ خرد مند	تو اہلِ خرد کے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے
کہ فرزندانِ ناہنجار زاید	کہ وہ گمراہ بیٹے کو جنم دے۔

پنجابی قطعہ   ہے جننی جے توں جنے
جن داتا جاں سُور
نئیں تاں جننی بانجھ رہ
کاہے گنوائے نُور

(اے ماں! تو جننے پر بضد ہے تو فیاض پیدا کر یا بہادر! ایسا نہیں کر سکتی تو بانجھ بن کر اپنی بدنامی نہ بن)

باب ۱۱

پاتا ہوں اپنے پرتوِ ہستی سے کم اُسے
گرمی تو ہے شعور نہیں آفتاب میں (شاطر)

میں نے انوکھے بالکل انوکھے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ میرے مدرسے روایتی مدرسوں سے نرالے تھے۔ قدرتی مناظر میرے صحیفے تھے اور درخت، پھول، پھل، پتّے، پرندے، جھرنے ..... اُن کے اوراق۔ اُن کی وضع، اُن کی عبارت تھی اور نظارگی معنی بیانی۔ اُن کے درمیان میری زندگی، تحریکِ ہمہ رنگی تھی۔ اِس لئے مرہونِ بیاں نہیں ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں تو یہ میری کاوشِ خود آرائی ہے۔

آسمان پر آفتاب، آتشِ انوار ہے اور گیتی پر وجہِ لیل و نہار۔ دھرمی کرمی اُسے دیوتا سمجھ کر پوجتے ہیں اور اُسے خوش رکھنے کے لئے اُس کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ لیکن اُسے اپنی حمد و ثنا سے سروکار نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنا حسن و کمال بھی آپ ہے اور اپنا جاہ و جلال بھی آپ۔ اُس کی رُوکشی اُس کی خود نمائی کی آن بان ہے۔ اُس کی بے پایاں خوبی! وہ اپنی جانب داری میں غیر جانب دار ہے اور اپنے اعلان میں بے اعلان۔ میں تھا! میں ہوں!! میں رہوں گا!!!

اور آدمی کی وضعداری اِس کی غیر وضعداری ہے۔ یہ ظاہری طور پر گروہ پسند ہے لیکن اندرونی طور پر شیدائے تنہائی۔ باہمی مفاد میں خود غرضی کا حامی ہے اور دوستی میں دشمنی کا۔ اِس کی اپنی گوں ہو تو یہ پہاڑ کھودتا ہے ورنہ پاس پڑا تنکا نہیں اُٹھاتا ہے۔ اِس کی بیکاری اِس کی بیماری ہے اور مصروفیت، بصیرت۔ اپنی بصیرت میں یہ چاند تاروں کی خبر لاتا ہے اور بے بصری میں اپنے ہی وجود سے بے خبر رہتا ہے۔ آسمانی آفتاب کے برعکس یہ دھرتی پر آفتاب ہے اور اِس کی روشنی، ہنر ہے۔ آدمی اور ہنر کا نشو و نما توام ہے اِس کے تاریخی ساتھی حیوانات و نباتات ہیں، جن کا وجود، یارانِ ایثار پسند کا سا ہے۔ اُن کی خاموشی کا مفہوم، وفاداری ہے جس میں حسنِ تسلیم کا پرتو ہے، لیکن جسے دیکھنے کے لئے دردمند دل کی آنکھ ضروری ہے۔ میں اپنی بے کسی کے لمحوں میں مویشیوں اور پیڑوں سے لپٹ کر روتا اور ڈھارس پاتا۔ میرے وہ ساتھی، مجھے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے زیادہ اچھے لگتے۔ باہمی موافقت کے فلسفے کی وہ پہلی کسک تھی جسے میں نے ناموافق حالات میں اپنے طور پر محسوس کیا تھا۔

رُتوں کا سلسلہ ایسا سلسلہ تھا جو سلسلہ در سلسلہ چلتا تھا۔ بسنت میں گریشم تھی اور گریشم میں ورشا، ورشا میں شرد تھی اور شرد میں ہیم؛ ہیم میں ششر تھی اور ششر میں بسنت۔ تایا جی موسم کی گردش کو کاوشِ انسان سے یوں منسوب کرتے تھے۔

گھُم گھُم چرکھڑیا،
توں گھُمّے، ئیں تند پاواں
(اے چرخے گھوم اور گھومتا جا۔ تو گھوم رہا ہے تبھی تو میں کات رہا ہوں)

گرمی عروج پر ہوتی اور پورب کی ہوا چلتی، پچھم میں دھنک دکھائی پڑتی تو تایا جی، اُس درش سے

رِتو بانی کرتے، "برکھا رُت آ رہی ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے بادل اُمنڈ گھمنڈ کر آنے لگتے۔ انہیں دیکھ کر لگتا کہ پُورب میں آکاش سے اُوپے کالے برس رہے ہیں جنہیں ہوا اُڑا کر پچھم میں لا رہی ہے۔ کسان کہتے، "پیاسی دھرتی کی پکار سُن کر سمندر سے ہوا پانی پی کر آئی ہے۔" بادلوں کے اُڑتے ہوئے پہاڑ ایک دُوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے آپس میں دھکم دھکا ہوتے اور گرجتے جیسے مقابلے کی چیتاؤنی دیتے۔ اُن کا نظارہ دِل دہلاتا اور رگوں میں ترنگ بھی دوڑاتا۔ میں ناچتا ہُوا گاتا،

ربا ربا مینھ برسا

میری کوٹھی دانے پا

آگے ہی آگے بڑھتا ہُوا بادل ایسے پیچھے مُڑتا جیسے ہمالہ نے اُسے راستہ نہ دیا ہو۔ وہ منظر دیدنی ہوتا! موروں کی تیکھی جھنکار سے باغ گُونجتے اور پپیہے کی مدھر پی ہُو سے صحن چہکتے۔ بخارات سے بوجھل بادل درختوں کی چوٹیوں سے اُلجھتے اُڑتے۔ میں چھت پر چڑھ جاتا اور اُچھل اُچھل کر بادلوں کو پکڑتا اور اُن میں اُڑتا ہوا محسوس کرتا۔ مینھ کیا برستا، رنگ برستا! بزدل بھاگتے ہوئے پناہ ڈھونڈتے اور مستانے بھیگتے ہوئے تان اُڑاتے۔ فضائیں مہکتی جیسے عطارِ فطرت، خوشبو لُٹا رہا ہو۔ گھروں کی رونق گلیوں میں آجاتی۔ بچے شور مچاتے، پانی اُڑاتے، پتوں کی کشتیاں تیراتے اُن کے پیچھے بھاگتے، جان بُوجھ کر گرتے اور خوش ہوتے۔ اُنہیں دیکھ کر یقین ہوتا کہ دُنیا میں کہیں مستی و ترنگ ہے تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہے۔

میں بھیگتا ہُوا گاتا،

"ساون کے نظارے ہیں، آہا آہا!

عدالت یار ہارمونیم پر ملہار کا الاپ کرتا،

"مدنا تجھ بِن ساون آگ لگائے"

اُس مدھر لے کا اثر! میں اپنی شوخی بھول جاتا اور کھیلنا چھوڑ کر عدالت یار کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ اپنے الاپ میں مگن اُسی جذبے کی آگ میں جلنے لگتا جس کی وہ سادھنا کر رہا ہوتا۔ ماں کا ہلکا سا بُلاوا سُنائی دیتا اور میں ملہار گنگناتا ہُوا گھر کو بھاگتا۔ ہوا کی تاثیر ہی بدل گئی ہوتی۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی لہر کی سی ہوتی اور سوندھی سوندھی خوشبو سے خالی۔ خشی پرنالا، جنگی پرنالے کی طرح بہتا ہوتا۔ ماں اُس کی طرف اِشارہ کرتی اور حکم و اِلتجا سے کہتی، "جا پرنالے کے نیچے نہالے، پت مر جائے گی۔"

سویا ہُوا ماحول ایک دم جاگ پڑتا۔ مینڈکوں کی گُڑیں گُڑیں، جھینگروں کی ریں ریں، بُوندوں کی

رِم جھم ..... اور کتنے ایسے نغمے سنائی دیتے، جنھیں نام نہیں دیئے جا سکتے۔ ہر نغمہ اپنا جادو جگاتا اور اپنے طور لبھاتا، لگتا کہ برکھا رانی اپنی راجدھانی کے ہزاروں گلوکاروں کے ساتھ دھرتی کی سیر کر رہی ہے۔ وہ خوش اطوار اور وفادار گلوکار گاتے، گاتے، گاتے ..... اور اپنا پورا وقت اسی دھن میں گزارتے۔ رات اور دن اپنی اپنی لطافت کا تماشا اپنے اپنے طریقے سے کرتے۔ رات اپنے آفاقی مہمان کی دل نوازی کے لئے اڑتے ہوئے فانوس روشن کرتی تو فضا آسمان در آسمان نظر آتی۔ وہ کوئی کم خیال تھا جس نے اڑتے ہوئے فانوس کو جگنو کہا تھا۔ اس دل نواز ماحول کی شان بڑھانے کے لئے رات کے جاں باز سپاہی، پروانے اپنی بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگ سے لڑتے تو تاریخی جودھاؤں کے ساکھے پھیکے لگتے۔

نباتات و جمادات کے روپ ایسے نکھرتے جیسے بیمار غسلِ صحت کر کے نئے کپڑے پہن لیں۔ پانی، مٹی کی روحانی طاقت کو تخلیقی تحریک میں بدل دیتا۔ سیدھے سادے ذرّے اپنی حقیقت پہچانتے، کایا پلٹتے اور رنگ و بو کی صورت ظاہر ہوتے۔ انکور، لطیف نظاروں سے پھیلتے اور بدولت برگ و بار انتہائے کمال کو پہنچتے۔ چشمِ نظارہ بیں میں احساسِ شعور کی کسک ہوتی تو حسن افزائش کے وہ اسرار ظہور پذیر ہوتے جو بصورتِ دیگر تحقیقِ آدم پر ممنوع ہیں۔ ہوا چلتی تو لہراتی ہوئی کھڑی کھیتی، ٹھاٹھیں مارتا دریا لگتی۔ کیچوؤں، ہزار پایوں، ٹڈیوں، تتلیوں، بھونروں، گھونگوں، مکڑوں، مکوڑوں، چیونٹوں ..... کے دَل گھومتے، جیسے الگ الگ راجدھانیوں کے راجے نئی نئی زمینوں کو فتح کرنے کے لئے نکل پڑیں۔ خود رَو پودے، جیسے چوکا (ترشہ)، کلفہ (خرفہ)، گوکھرو (خار خسک) کلمی، بتھوا، میتھا، کھمب، کھکھنی، اذخر، کاک ماچھی ..... اپنی بہار آپ ہوتے۔ ان کے بارے میں تایا جی کہتے تھے، "یہ جڑی بوٹیاں مہیا شدہ آزمودہ مستعمل دوائیں ہیں" لیکن کھیتی کے محافظ کو ان کی جتنی ضرورت ہوتی اتنی ہی رکھتا اور باقی اکھاڑ کر پھینک دیتا۔ تایا جی اس عمل کا جواز پیش کرتے، "اچھی چیز بھی ضرورت سے زیادہ ہو تو بری ہے۔"

الگ الگ مینھ کی الگ الگ اہمیت ہے۔ پھوئیاں پھوئیاں مینھ کے بارے میں کہاوت ہے کہ رحمت برستی ہے۔ کھیتی کے لئے پھوار واقعی کھاد چھڑکنے کے برابر ہے۔ جھڑی کو ہر کوئی ملعون سمجھتا ہے۔ گرہنیاں اس لئے کہ مکان چونے لگتے ہیں اور ایندھن گیلے ہو جاتے ہیں، کسان اس لئے کہ بہاؤ میں کھیتوں کی زرخیزی بہہ جاتی ہے۔ لیکن بچوں کے لئے جھڑی، حسنِ فطرت کے انمول تحفے لے کر آتی ہے۔ جوں ہی دن نکھرتا ہے گرمی کے ابال سے بیر بہوٹیاں پیدا ہوتی ہیں جو سبزے میں چلتی پھرتی، زندہ لالوں کے ٹکڑے لگتی ہیں۔ ان کو سہج سبھاؤ میں دیکھنا کتنا خوشگوار ہے لیکن بچّے انہیں قید کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بیر بہوٹی کے بارے میں ایک چوپائی یاد آ رہی ہے۔

ایک نار کرتار بنائی
سگرے تن پر لالی چھائی
اور کہوں کیا اِس کے آگے
نام نہ لوں پر بھابی لاگے

آب و ہوا کی تغیّر پذیری میں کائناتی حُسن ہوتا۔ مشرق ہو کہ شمال مشرق، شمال ہو کہ شمال مغرب، مغرب ہو کہ جنوب مغرب، جنوب ہو کہ جنوب مشرق ..... رنگوں کا نظارہ حُسن در حُسن ہوتا۔ لال میں گلابی پیلے میں نارنجی، ہرے میں مُونگیا، نیلے میں آسمانی، سفید میں مٹیالا، کالے میں سُرمئی ..... اور سُرمئی میں ہلکا سُرمئی ہوتا۔ اُس کینوا س کی نِرالی خُوبی یہ تھی کہ وہ نظر نظر بدلتا تھا اور پہلے سے زِیادہ دِل کش نظر آتا تھا۔

ٹانڈے (مکئی کے پودے) گانٹھ گانٹھ بڑھتے منجل (پھول) تک پہنچتے تو کسان منجل کاٹ لیتے۔ اُن کی روایتی سُوجھ بُوجھ میں یہ بصیرت، دِکھاوٹ اور فائدہ مند تھی۔ ٹانڈوں پر کئی کئی بھٹے پھُوٹتے۔ اُن کا سُوت سفید سے پیلا، پیلے سے بھُورا ہوتا اور اِس بات کی خبر دیتا کہ دانے دُودھ سے بھر گئے ہیں۔ مَیں بھُٹا نیا کرنے کے لئے بھُٹا توڑ کر لاتا اور اُسے پردوں (بھُٹّے کے دانوں پر ہرے پتّے) سمیت آگ پر بھُون کر چرونڈتا (دانتوں سے نوچ کر کھانا) اور اِس بولی کا مفہُوم سمجھے بغیر بولی لگاتا۔

بلّے بلّے، بھئی بابا تیری بچھیاں نے
دوہدے پنڈ دے چرُونڈے سارے

(پنجابی میں جوان لڑکی کو طنزیہ بچھی (بچھڑی) کہتے ہیں اور کم سِن لڑکے کو دوہدا (جس بھُٹّے کے دانے، دُودھ سے بھرے ہوں) چوں کہ دوہدے کے دانے اُکھاڑنے ممکن نہیں، اُسے دانتوں سے چُوس اور چچوڑ کر کھاتے ہیں۔ کوئی شاعر کسی بوڑھے سے مخاطب ہے۔ بابا، تجھے معلوم ہے! تیری لڑکیوں نے گاؤں کے سارے لڑکے چچوڑ لیے ہیں)

پنجابی بولیاں فریب ہی کی حد تک ذُو معنی ہیں۔ اِن کے پہلے بول کسی خاص مفہُوم کو ظاہر نہیں کرتے لیکن آخر میں بمب کی طرح پھٹتے ہیں۔ یہ کبھی سارے سماجی رِشتوں کو مسمار کرتے ہیں، کبھی اُداس دِلوں سے قہقہے لگواتے ہیں اور کبھی زن و مرد کی اُن پوشیدہ حرکتوں کو کنایوں میں کہتے ہیں، جن کا کھُلا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔

لدی جاناں اے کرڈ دے ٹانڈے
رس پی گئے پنڈ دے مُنڈے

(کوئی دُلہا، نئی دُلہن کے ساتھ جا رہا ہے اور کوئی من چلا اُس پر طعن کرتا ہے۔ تم بھوک لئے

جا رہے ہو جب کہ رس اِس گاؤں کے لڑکے پی چکے ہیں)

سارا گھر چھان ماریا

لونگ سوہنے دی مُچھاں چوں لبھیا

(میرا لونگ گم ہو گیا۔ مَیں نے سارا گھر چھان چھان مارا اور آخر لونگ مِلا، کہاں سے؟
میرے پیارے کی مونچھوں میں سے)

ڈھور ڈنگر سوکھا چارہ کھاتے کھاتے ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہوتے۔ وہ ہرا (سبزہ) کھا کر پُھرتے (صحت مند ہونا) اور اُن کے پنڈے لِشکتے (چمکتے)۔ کہاں آدھا پیٹ کھانے کے لیے وہ پُوری چراگاہ میں مارے مارے پھرتے تھے کہاں وہ جہاں کھڑے ہوتے وہیں سے پیٹ بھر لیتے۔

جس دِن جھڑی لگتی، ماں کھیر اور پُوڑے پکاتی۔ رِم جِھم کا ساز محرکِ اِشتہا ہوتا۔ مَیں کِتنا کھاتا! نہ پیٹ بھرتا اور نہ ہی نیت۔

ساون جاتا اور بھادوں آتا، بھرن کی بے ثباتی! مینڈ سے اِدھر جل تھل ہو جاتا اور مینڈ سے اُدھر سُوکھا رہتا۔ ایسا نظارہ دیکھتے ہُوئے میرا دِل کرتا کہ مَیں جھالے پر کمند پھینکوں اور اُسے کھینچ کر اپنے کھیت میں لے جاؤں۔ جھالے کی آوارگی طرفہ تماشا ہوتی۔ مَیں اُس کے سائے کی پیروی کرتا لیکن چند قدم سے زیادہ کامیاب نہ ہوتا۔

مکئی کاٹ کر کھیتوں میں کھلیان لگایا جاتا۔ کھلیان کی گرمی، مکّے کو ڈنڈی پر نرم کر دیتی جس سے اُسے توڑنے میں آسانی ہوتی۔ مکّا توڑ کر الگ ڈھویا جاتا اور کڑبی الگ۔ کڑبی کے چارے کو مویشی مُنہ نہ لگاتے جب تک کہ اُس میں برسیم نہ مِلایا جاتا۔

مَیں جو لکھتا ہُوں، سُریندر کو سُناتا ہُوں۔ وہ کئی بار مجھے کھری کھوٹی سُناتی ہے اور کئی بار سراہتی ہے۔ مَیں نے اُسے یہ باب سُنایا تو اُس کا رویّہ الگ پایا۔ اُس نے مجھے بے اعتمادیِ ذات کی وہ نفسیات بتائی، جو کام چور کی زِندگی ہوتی ہے۔ "مَیں گاؤں میں تھی۔ ساونی آئی، اندر اور باہر مکّوں سے بھر گیا۔ مجھے کھیلیں کھانے کا شوق چرایا۔ مَیں نے دو مکّے اُگھیرے (مکّے کے دانے انگوٹھے سے دبا کر نکالنا) انگوٹھوں پر چھالے پڑ گئے۔ مجھے اِس ڈر سے تپ چڑھ گیا کہ وہ سارے مکّے اُگھیرنے پڑے تو کیا ہو گا؟ دُوسرے دِن دو مزدور آئے، اُنھوں نے سونٹے مار مار کر دانے الگ اور ٹُکّے (دانوں کے بغیر مکّا) الگ کر دیئے۔ مجھے بڑا مزہ آیا اور میرا بُخار اُتر گیا۔"

کُوآر کو جاڑے کا دوآر کہا جاتا ہے۔ اُس میں موسم بدلنے لگتا اور ساتھ ہی ہواؤں کا رُخ، پھر اچانک کعبہ کی جانب سے گھٹا آتی اور ایسی جم کر برستی کہ آل سے آل مِلا جاتی۔ کِسان دِن رات ہل چلاتے۔ دہڈوں (پڑت زمینوں)

کو قابلِ کاشت بناتے اَور گندم بوتے۔

ہمالہ کی طرف سے اُڑتی آتی کونجوں کی ڈار کے بعد ڈار یہ خبر دیتی کہ سردی بڑھ رہی ہے۔ جوُں ہی ڈاروں کا سلسلہ بند ہوتا، ہمالہ کی چوٹیاں برف سے لد جاتیں اَور آسمان کو چھونے لگتیں۔ مویشی بر آمدوں سے کمروں میں باندھے جاتے۔ درخت، پتّے ایسے گرا دیتے جیسے وُہ غیر ضروری بوجھ ہو۔ اُن کا بے مُروّت رَویّہ شاخوں کو بانجھ ماؤں کی گود کی طرح سُونا اَور ویران بنا دیتا۔ مَیں جھاڑُو لے کر جاتا اور پتّے اِکٹھے کر کے لاتا۔ اُنہیں حیوانوں کے نیچے بچھاتا اَور محسُوس کرتا کہ مَیں، اُن کی اِنسان دوستی کا حق ادا کر رہا ہوُں۔

پودوں اَور گھاس پر سے شبنمی موتیوں کے گجرے گہنے غائب ہو جاتے جیسے مادرِ فطرت نے انہیں اکٹھا کر کے موزُوں وقت کے لئے محفوُظ کر لیا ہو۔ دُھوپ میں ماں کی گود کی سی نرمی ہوتی جس سے جُدا ہونے کو جی نہ چاہتا۔ چھوٹے دِن، لمبے اَور لمبی راتیں، چھوٹی لگتیں۔ دُھند سے مرئیت سُکڑتی اَور فضا کا اندھیارا پَن نئے طریقے سے منظر کُشا اَور اسرار افشا ہو جاتا۔ جیسے بادل کے پیچھے نیلا آکاش زیادہ نیلا لگتا ہے اُسی طرح دُھند میں نباتات کی صُورت الگ طریقے سے دِل پذیر ہوتی ہے۔ ایسے میں چاندنی رات چھایا واد کی ایسی تصویر دکھاتی ہے جو مُصوّرِ فطرت کی شوکت پسندی کی کہانی کہتی ہے۔

کہاوت ہے کہ ہاڑھی اَور ساوُنی کے توڑے کسان، گنّے کے رَس اَور سرسوں کے ساگ سے جُڑتے ہیں

دھرتی، جس کی کوکھ سے زِندگی کے اُجالے اَور موت کے اندھیرے جنم لیتے ہیں، پدارتھوں میں ایسے نفیس رَس بھرتی جنہیں کھا کر کام و دہن سرشار ہو اُٹھتے۔ چوپالوں پر بکھری ہوُئی رونق بیلنوں پر سمٹ آتی میٹھا ٹھنڈا رَس، رکاڑھی نشیلی چھاچھ، گرم نرم گُڑ، وُہ نعمتیں ہوتیں جن سے بھُوک مٹ کر تازہ ہو جاتی۔

مَیں چنوں کی کونپلیں ہرے مسالے میں مسل کر کھاتا۔ پرکاش کور اَور سورَن کور کھیتوں میں ہوتیں تو میں اُن کے ساتھ ساگ تڑوا کر اُن کی مدد کرتا اور اُنہیں چھیڑتا،

نی مائیں دیکھ کون آ گیا!
کِھڑی ہاڑھ مہینے سرسوں

(سرسوں ماگھ پھاگن میں پھُولتی ہے۔ ہاڑھ مہینے میں سرسوں کا پھُولنا انوکھی بات ہے۔ کسی بیاہی لڑکی، جس کا گونا نہیں ہُوا ہے، کا شوہر اچانک آجاتا ہے اَور گھر میں پہلے اپنی بیاہتا سے ملتا ہے۔

وہ اُسے دیکھ کر شرماتی ہے، اندر بھاگ جاتی ہے اَور اپنی ماں کو اپنے پیارے کے آنے کی خبر سُناتی ہے۔ اَری ماں! باہر نکل کر دیکھ کیا انہونی ہوُئی ہے! ہاڑھ کا مہینہ ہے اَور سرسوں پھُولی ہوُئی ہے)

ماہی میرا لٹھ ورگا
میری گندل جہی جوانی

(گندل (سرسوں کا شگوفہ) کی خصوصیت ہے کہ اُسے ہلکا سا دباؤ تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنے کڑیل شوہر کو پہلی بار دیکھ کر نئی بیاہی لڑکی اپنی ماں سے شکایت کرتی ہے۔ اد ماں! میرے لئے لٹھ جیسا شوہر تلاش کیا اور میں گندل سی کومل ہوں۔ میرا بر پکا کرتے وقت کچھ خیال کرنا تھا!)

میں انہیں گندل دِکھا کر، دبا کر توڑ دیتا۔ وہ اوپرے غصے سے مجھے تھپڑ دِکھاتیں۔ میں ستانا بند نہ کرتا تو وہ میرے کان پکڑ کر کھینچتیں۔ میں اندر ہی اندر خوش ہوتا اور باہر ہی باہر رُوں رُوں کرتا۔

اُڑتے پھولوں کی رنگینی شبابِ بہار کو شرماتی۔ وہ ضرور بے تکا تھا جس نے انہیں تتلیاں کہا تھا۔ میں کئی بار سوچتا کہ ان کا نام بدل دُوں! کھیتوں میں سرسوں پھولتی تو حدِ نظر بسنتی چادر بچھی لگتی۔ دھرتی کے اس درشن میں دُوسرے کھیت نئے لباس میں پیوند لگتے۔ بسنت رُت، فضا کی تحریک بن کر آتی۔ درختوں سے خوشبو پھوٹتی! کونپلوں کی خوشبو، پھولوں کی خوشبو، موروں کی خوشبو ..... جیسے دھرتی کی رُوح بزبانِ خوشبو، عظمتِ انسان کو تسلیم کہہ رہی ہو۔

عدالت یار کھیتوں میں گھومتا ہوا کہیں منڈیر پر کھڑا دکھائی دیتا اور کہیں رہٹ پر بیٹھا ہوا۔ لیکن وہ جہاں ہوتا بسنت کا قصیدہ گاتا سنائی دیتا۔

آئی بسنت سگر بن پھولے

دِن لمبے اور راتیں چھوٹی ہونے لگتیں۔ ہمالہ کی برف لدی چوٹیاں نظر نہ آتیں، کونجیں ڈاروں میں اُڑتیں واپس جاتیں اور سردی کے جانے کا مژدہ سناتیں۔

بھائیا جی، مہرؤوں (بھینسا، بھینس اور ان کے بچے) کو اُسترے سے مونڈتے، ان کی تیل مالش کرتے اور گوکوں (بیل، گائے اور ان کے بچے) کو کھریرا کر کے نہلاتے۔ مہرؤوں کی جلد شیشے کی سی اور گوکوں کی جلد پشمینے جیسی لگتی۔ ان کے سینگ گیروے رنگ دیئے جاتے تو وہ کھُرلی کا سنگار دکھائی دیتے۔

بیساکھ آتا، رزق بھرے کھیت دیکھ کر کسان پھولا نہ سماتا۔ گبرو اپنی اُمنگ اور ترنگ کو اپنے طریقے سے ظاہر کرتے۔ وہ جوں ہی کام کاج سے فرصت پاتے، چوپال میں اکٹھے ہوتے اور بھنگڑا ناچتے اور مٹیاریں (دوشیزائیں) گھروں میں گِدے۔ لاٹھیوں کی تالوں اور پیروں کی دھمالوں سے در و دیوار تھرکتے۔ ہر شے اپنی پختگی اور بے عیبی میں نکھری نکھری اور نئی نئی لگتی۔

ہاروں (فصل بداماں کھیت) میں گھومتے کسان اعتماد سے جھومتے لیکن آسمان میں بادل کا ٹکڑا بھی دیکھ

لیتے تو خوف سے کہتے، "اِس وقت سونے کے چھینٹے بھی پڑیں تو بُرے ہیں!" اُن کی آزمودہ بات، قدرت کے قہر و کرم کی ملی جُلی کیفیت ہوتی۔

عدالت یار کی بانسری پیار کے گیت چھوڑ کر کاروبارِ حیات کی باتیں کرتی،

مان کورے کڈھ گھنگرو

بگّے بلد خراسے جونا

(میری مان کور، گھنگرو نکال کر لا، آج گورے بیل کو خراس میں جوڑنا ہے!)

کھیتاں وِچ سونا اُگیا

اساں بیجیاں مان کورے کنکاں

(اے مان کور، مَیں نے کھیتوں میں کنک بیجی تھی لیکن چمتکار! وہاں سونا اُگ آیا ہے)

لوہار اَور بڑھئی کے کارخانوں پر رَونق بڑھ جاتی۔ ہتھوڑوں، تیشوں، کلہاڑوں، آروں کی آواز پچھلے پہر تک سُنائی دیتی۔ نئی درانتیاں بنائی جاتیں اَور پُرانی تیز کی جاتیں، سانگے (دو شاخے)، ترنگلیاں (کئی شاخے) سَبّر کتے (اناج اِکٹھا کرنے کے پھاوڑے) تنگل (رسّی کی جال نُما چادر) پر چھتی پر سے اُتارے جاتے، مرمّت کئے جاتے اَور ضرورت ہوتی تو نئے بنائے جاتے اَور اُسی طرح سانٹ (خرمن کوب)۔ گدّوں کے دُھرے چکنائے جاتے بیلوں کو نعل لگائے جاتے، اُنہیں گُڑ چنے کھلائے جاتے اَور تیل پلائے جاتے۔ وُہ کھرلی پر کھڑے باچھیں ایسے چاٹتے جیسے کوئی لذیذ کھانا کھا کر مُنہ سنوارے۔ گھر لیپے پوتے جاتے اَور اُسی طرح ذخیرہ خانے۔ کُپ کے لئے پرال کاٹے جاتے اَور جوڑنے باٹے جاتے۔ وُہ قبل از وقت تیاریاں کِسان کی دُور اندیشی کا ثبوت دیتیں۔ کِسی نے اُس جاٹ کے جذبات کی خُوب عکاسی کی ہے جو باہڑی (لالی) سے پہلے کھیتوں میں گشت لگا کر آیا ہے۔

اک کوٹھی ناں گزارہ نہیں ہونا

کھتّے لِپ چار جٹیئے

(جاٹ اپنی گھر والی سے کہتا ہے کہ اِس بار فصل اِتنی اچھی لگی ہے کہ ایک ذخیرہ خانہ سے کام نہ چلے گا! کم از کم چار کھتّے لیپ پوت کر تیار رکھ!)

جُوں ہی گندم کے گدّے دبانے سے ٹُوٹنے لگتے، بچّے سے لے کر بُوڑھے کِسان، کھیتی سنبھالنے میں لگ جاتے۔ مزدُوری کا طریقہ نرالا ہوتا! لاوے (وُہ مزدور جو کھیتی کاٹنے کے لئے رکھے جاتے ہیں) لاوئی جنس میں لیتے اَور آوتی (مدد کے طور پر کام کرنے والے) دعوت کی شکل میں۔ مقابلے کے کام میں ہمّت اَور برداشت کے اَن تھک مظاہرے دیکھنے میں آتے۔ درانتیاں کھیت میں ایسے چلتیں جیسے رَن بھومی میں کٹاریں۔ اِس میدان

میں زخمی ہونے والے جودھے اپنے معالج آپ ہوتے اور ان کے علاج نرالے۔ یہ اپنی پگڑی کے لڑے سے پٹی پھاڑتے، زخم پر باندھتے، اسے پیشاب سے تر کرتے اور جاکر محاذ پر ڈٹ جاتے جیسے وقتی طور پر اپنے ساتھی کے بل بوتے پر چھوڑ آئے تھے۔ کھیت میں مکڑے (گندم کاٹنے والے کے پیچھے کچھ کچھ فاصلے پر لگتے ہوئے لائی کے ڈھیر) کھیت آئے جودھوں سے لگتے۔ کامگاروں کی سرگرمی کو دیکھ کر چلچلاتی دھوپ پھیکی پڑ جاتی۔ مسلسل کڑی محنت کھانے پینے کا مزہ بڑھادیتی اور نیند کی ترنگ کو نشیلی بنادیتی۔

لائی ساتھ ساتھ سنبھالنی ضروری ہوتی۔ اس ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی نے خوب کہا تھا،

جیدے لائی نہ چھبے
اوہ ڈبے کر ڈبے

(جس کسان نے کھیت کاٹ لیا ہے اور اُسے باندھ کر کھلیان میں نہیں لگایا ہے وُہ اس ماجھی کی طرح ہے جو بھنور میں ہے۔ ان دنوں آندھیاں بہت آتی ہیں اور اگر کاٹی ہوئی فصل سنبھالی نہ جائے تو کسی وقت بھی سال بھر کی محنت اکارت جاسکتی ہے)

اور پھر پیسر گھڑے جاتے، گٹھے بکھیرے جاتے، سانٹ جوتے جاتے، کنڈ (کھلیان کو سانگے اور تنگلی سے اوپر نیچے کرنا) دیئے جاتے، خرمن لگائے جاتے، خرمن اڑائے جاتے، راس میں دائیں چلائے جاتے اور پھر راس اُڑا کر کھنڈیوں سے پاک کئے جاتے، کپ اُسارے جاتے اور برکتا (پہلے تول کو برکت سے برکتا بولتے ہیں، دو یا زیادہ (تین کو منحوس مانتے ہیں اور اُس کی جگہ زیادہ بولتے ہیں) کی بھاگ بھری آواز میں بول (صاف اناج کا ڈھیر جسے پہلی بار تولا جائے) تولے جاتے، بوریوں میں بھرے جاتے اور گڈوں پر لادے جاتے۔ ادھر گورے کو سراہا اور ادھر کالے کو للکارا جاتا۔ کوٹھیاں اور کھتے اناج سے چھلک چھلک پڑتے اور کسان تکمیل پذیری کی مسرت سے۔

بداڑھوں اور کلیاتے درختوں کی خوشبو گھل مل کر وُہ رسیلا اور رنگیلا واتاورن (ماحول) پیدا کرتی کہ درختوں کے سائے 'آؤجی، جی آیاں نوں!' کہنے لگتے۔ کام کاج سے فارغ گوریاں اس مدھر سنگیت کو سنتیں اور باغوں کا رخ کرتیں۔ وُہ پسندیدہ شاخوں پر جھولے ڈالتیں اور سہاگ گاتیں۔ کوئلوں کی پیاری ترنگ، گوریوں کی اُمنگ کو جھولا جھلاتی، جس کا اظہار وُہ طرح طرح سے کرتیں۔

ساڈا چڑیاں دا چنبا وے
بابُل اسیں اڑ جانا
ساڈی لمبی اُڈاری وے
بابُل کیہڑے دیس جانا

(اے بابل تیرے گھر میں ہمارا بسیرا چڑیوں کی طرح ہے! پنکھ آتے ہی ہم نے اُڑ جانا ہے۔ ہماری اُڑان بڑی لمبی ہوگی۔ بابلا، تجھے تو خبر ہے، کچھ بتا کہ تیرے دیش سے جا کر ہمیں کس دیش میں پناہ ملے گی!)

آمیاں رانجھیا محل بنائیے
پائیے اُپر چبارا
تیری ہیر لیاوے اِٹاں
تے توں ڈھویں گارا

(میرے پیارے رانجھے، آ! اپنے لئے گھر بناتے ہیں اور اس کے اوپر چبارا۔ ہماری اس جدوجہد میں کسی اور کو دخل نہ ہوگا۔ میں گھر کے لئے اینٹیں ڈھوؤں گی اور تو گارا۔)

کنواریوں کی چہلیں اور پینگوں کی اُڑانیں، بیاہیوں کی پرانی یادوں کو تازہ کر دیتیں اور وہ ٹھوڑیوں پر ہاتھ دھرے اپنے بیتے دنوں کے سندر سپنے دیکھتیں۔

ہاڑھ دا مہینہ، دُھپاں پیندیاں کراریاں
کاہنوں میں بیاہی بُلّے لُٹن کنواریاں

(ہاڑھ کے مہینے کی جلتی دھوپ، تن اور من دونوں کو جلا رہی ہے۔ میں گھر کے جھمیلوں میں اُلجھی ہوئی سانس لینے کو تڑپتی ہوں جب کہ آزاد کنواریاں مزے اُڑا رہی ہیں)

اور نئی بیاہیاں اپنے دل کا غبار یوں نکالتیں،

ہاڑھ دا مہینہ، جی نہ کرے سوہرے جان نوں
گبرو ہے آیا گڈی جوڑ کے تے جان نوں

(ہاڑھ کا مہینہ ہے اور میرا جی، سسرال جانے سے ڈرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؛ میرا گبرو، گاڑی لے کر دروازے پر کھڑا ہے)

زمین پر رنگوں اور محفلوں کی گہما گہمی دیکھ کر آسمان پر اکیلا آفتاب رقابت کی آگ میں جل مرتا اور اس رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے سر پر آ جاتا۔ سائے، آگ اُگلتے، نالے سوکھ کر پیاسی زبانوں کی طرح ہلکتے اور تالاب سوکھ کر زیرِ پا کلیجوں کی طرح پھٹ جاتے۔ ہوا جلتے دامن کی طرح خود جلتی اور دوسروں کو بھی جلاتی۔ درخت نڈھال اور جھاڑیاں بے حال ہو جاتیں۔ چوپائے بورائے سے گھومتے اور اسی طرح پرندے۔ ان کی ڈر کر سبزہ دھرتی کے اندر منہ چھپا لیتا اور اسی طرح ساگ پات۔ آسمان گیر بگولوں کو دیکھ کر تا ۔۔۔

کہتے، "روحِ نباتات، ابرِ رحمت سے فریاد کر رہی ہے۔"

وہ حسرتناک منظر دیکھ کر بادل کا دِل بھر آتا اور بجلی تڑپ اُٹھتی۔ ماں کی چھٹی حِس جاگ پڑتی، وہ باہر پڑا سامان اُٹھا کر اندر رکھتی اور تندور کو کڑاہی سے ڈھانپتی۔ جب تک وہ اُٹھاؤ چولھا اُٹھا کر اندر رسوئی میں لاتی؛ مٹی سوندھے سَت سے مہکنے لگتی۔ میں گہرے سانس لیتا، بازو تولتا، پنجوں پر ناچتا اور رَس میں بھیگتا۔ ماں دہلیز پر کھڑی نظارہ کرتی اور مُسکراتی۔ اُس کی مُسکراہٹ کے سامنے دھنک کے رنگ پھیکے لگتے۔

کہیں دُور سے ساون آیا، ساون آیا، کی اڑتی ہوئی تان آتی گویا ساون کو جھولا جھلاتی۔ میں انترا گاتا ہوا محسوس کرتا کہ عدالت یار کے ساتھ میں بھی ساون کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔

باب ۱۲

ہر گام پہ ٹھوکر سے گرا دیتا ہے
ہر بزم سے بے فیض اُٹھا دیتا ہے
جس میں نہ ہُنر ہو یہ زمانہ اُس کو
مانندِ غلط حرف مِٹا دیتا ہے (شاطرؔ)

سکول جانے کے ساتھ ساتھ میں تحریکِ آزادی سے رُوشناس ہُوا ورنہ ہمارا اُونگھتا ہُوا گاؤں ہر لحاظ سے زمانے سے پیچھے تھا۔ گاؤں کی سادگی، گاؤں پر اِس قدر حاوی تھا کہ نئے لباس کی چمک دمک بڑی بات ہے کوئی دھوبی دُھلے اور اِستری کے کپڑے ہی پہن لیتا تو اُس پر مہمان کا دھوکا ہوتا۔ میں پاکستان کا نام جانتا تھا لیکن پاکستان بننے کی صُورت میں جو گھمسان گھٹنے والی تھی اُس کا تھوڑا سا قیاس مجھے اِس واقعے سے ہُوا تھا۔

طالب علم تختیاں اور سلیٹیں بھڑایا کرتے تھے۔ میری گھر کی بنائی تختی، کالی شیشم کی تھی اور بازاری تختی سے موٹی۔ مجھ سے سب تختی بھِڑانے سے ڈرتے تھے۔ نذیر احمد نئی تختی لایا اور مجھے تختی بھِڑانے کے لئے للکارا۔ تختیاں بھِڑیں اور وہی ہُوا جس کی میرے حریف کو اُمید نہ تھی۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے وہ میرا ٹھٹھا اُڑانے لگا اور مجھے لڑنے پر اُکسانے لگا۔

بھائی جی دی گُتّی وِچ گوہ بڑ گئی
اوہنوں کڈھیا تاں اِک ہور بڑ گئی
(بھائی جی کے جُوڑے میں گوہ گھس گئی، پہلی کو نکالا تو دُوسری گھس گئی)

مَیں نے بُرا مانا، وُہ بولا "سِکھڑے، پاکستان بَن جانے دے! تیرے ٹکڑے کر کے کُتّوں کو کھلائیں گے۔"

ہمارے گاؤں میں آزادی کی تحریک موذّن کی اذان کی طرح آئی۔ کِسی نے سُنی اور اَن سُنی کر دی، کِسی نے سُنی اور چیخ و پُکار سمجھی، کِسی نے از راہِ تجسّس اُس میں معنی تلاش کئے مگر کلمۂ حق سے ناآشنا ہونے کے باعث کِسی نتیجے پر نہ پہنچا اور اپنی بے بصیرتی کا شکار رہا۔

تایا جی کا سیاسی شعور اُن کے دُوسرے خیالوں کی طرح انوکھا تھا۔ "جو اِنسان اپنے خیال اور عمل کو پُر خلوص طریقے سے جا نچتا ہے، وُہ کہیں رہے، آزاد ہے۔"

مَیں رانگھڑوں کا رہٹ پھیر کر پانی پینے کا جتن کر رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہو رہا تھا۔ رہٹ کا کُتّا نہ تھا۔ میرے دوڑ کر پارچہ (رہٹ کے مُنہ میں رکھا ہُوا لوہے کا برتن جِس میں پانی گر کر باہر حوض میں پہنچتا ہے) پر پہنچنے تک وُہ خالی ہو جاتا اور مال (وُہ زنجیر جِس پر ٹنڈیں جڑی ہوتی ہیں) اُلٹی گھوم جاتی اور پانی بھری ٹنڈیں واپس کُنوئیں میں ڈُوب جاتیں۔ مَیں ٹنڈوں میں سے پانی پی سکتا اور نہ ہی پارچے سے۔ پارچے سے گرتے ہُوئے آخری چند قطرے میرے ہاتھ لگتے، جن سے مَیں صرف ہونٹ تر کر سکتا۔ میری تراس اور بھڑک اُٹھتی اور مَیں للچائی ہُوئی نظروں سے کُنوئیں کے اندر جھانکتا جو میرے لئے بھرا ہُوا ہو کر بھی خالی ہونے کے برابر تھا۔ مَیں نے گراری پر اینٹ کا کُتّا لگایا لیکن بُوڑیا (گراری کا دانت) اینٹ کا کونا توڑ کر نِکل گیا۔ میری ہوشیاری میری ناکامی ثابت ہُوئی، اور ناکامی، مُکمّل مایُوسی۔

"عقلاں باہجوں کھُوہ خالی! مُورکھ کے لئے کُنواں خالی ہوتا ہے۔"

اپنے دِل کی بات کِسی اور کی زبانی سُن کر مَیں حیران ہُوا۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، وہاں ٹُنڈی لاٹ کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ وُہ کُنوئیں پر پانی پینے آیا تھا اور میری ناکام کوشش دیکھ چُکا تھا۔ اُس نے کُنوئیں کی منڈیر پر پڑی اینٹ کھبّے ہاتھ سے اُٹھائی اور حوض میں دھو کر پارچے کے مُنہ میں رکھ دی اور پھر مُجھ سے فخر سے کہا، "چندا، اب رہٹ چلا!"

مَیں نے ایک چکّر پُورا نہ کیا تھا کہ پارچہ بھر کر چھلک گیا۔ ٹانگوں کو گاہدی (پاٹ) کی زد سے بچاتے ہُوئے مَیں نے اُسے چھوڑا، پارچے پر پہنچا جِس میں سے پانی کی پتلی سی دھار بہہ رہی تھی۔ ہم نے کُلّیاں کر کے ہاتھ مُنہ دھویا، آنکھوں میں چھینٹے مارے، پانی پیا لیکن پانی ختم نہ ہُوا۔ نیوں کو پانی پِلا کر ٹُنڈی لاٹ روانہ ہُوا اور مَیں اُس کے ساتھ ہو لیا۔

اُس کا نام ہرنام سِنگھ تھا۔ مَیں نے پہلی بار اُس سے کُچھ کہا سُنا تھا لیکن اُسے پہلے سے جانتا تھا۔ مَیں اُس کے بارے میں یہ بھی جانتا تھا کہ وُہ کاما، گاتا، مارو، بحری جہاز کا ایک اِنقلابی رُکن تھا اور اُس تحریک میں حِصّہ لینے کی پاداش میں اُس کا سَجا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا۔ اُس کی شُہرت کی ایک وجہ اور تھی۔ اُس نے نیولے پال رکھے تھے جو اُس کے کاندھوں پر سوار

رہتے تھے یا اپنے گلے کی رسّی کی لمبائی کی حد تک اُس کے آگے پیچھے گھومتے چلا کرتے تھے۔ وہ اتنے تیز رفتار تھے کہ مٹھے بیل کی طرح دردِ سر نہ تھے۔ باتوں باتوں میں بات میری تعلیم تک پہنچی۔ اُس کے کہنے پر مَیں نے اُسے اپنی من پسند نظم "پھول کی فریاد" سنائی۔ اُس نے خوش ہوکر میری پیٹھ تھپکی اور کہا "لائق پُتّر ہو!" میرے باپ کا نام سُن کر اُس کا ردِ عمل جانا پہچانا تھا، "رتن سنگھ! تو اُس کا بیٹا ہے!" میرے باپ دُور دراز تک کئی ناموں سے مشہور تھے۔ وہ کہیں شکاری تھے، کہیں کنکوت، کہیں آڑتی اور کہیں بیوپاری۔ وہ جن گاؤں کے نام لیتے تھے وہ اُس وقت تو خیر اِس وقت بھی جادو نگری معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے نکّی آل لیلاں، گھوڑے باہا، بجّو دِتہ، سینگڑی والا، شام چوراسی تو اپنے نام کے انگریزی ترجمے 'ایوننگ اِن ایٹی فور' سے بھی مشہور تھا۔

گاؤں کے پاس اپنی راہ لینے سے پہلے، مَیں نے نیولے کو چُھو کر دیکھنا چاہا۔ ٹنڈی لاٹ نے اُسے پکڑ کر اُس کا منہ اپنی طرف کیا اور مجھے پیٹھ سے لے کر دُم تک چھونے دیا۔ ریشمی بالوں کے اندر اُس کا ڈھانچہ کتنا نرم تھا! مَیں حیران ہُوا کہ وہ نرم سی جان سانپ سے موذی سے کیسے لوہا منواتی ہے! مَیں نے چراگاہ میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھی تھی۔ نیولا، سانپ کا سامنا پیچھے سے کرتا تھا اور اُس کے پلٹتے ہی دُور جا کھڑا ہوتا تھا۔ اُس کی گھات تاک تب تک جاری رہتی تھی جب تک سانپ زخمی ہوکر پھن پھیلا کر نہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ نیولے کا آخری وار دیدنی ہوتا تھا! وہ ہولے ہولے سانپ کی جانب بڑھتا، اُسے جھکاتا اور وار کرنے پر اُکساتا، وہ جُوں ہی وار کرتا، نیولا اُسے سَر سے دبوچ لیتا۔ وہ بہتیرے بل بھرتا لیکن نیولے کی گرفت کے آگے بے بس رہتا اور آخر کار دم توڑ دیتا۔

کہاوت ہے کہ تندرست سانپ، شیر اور زخمی ہو تو ڈھیر۔ سانپ کے زخم کو چیونٹیاں لگ جاتی ہیں اور اُسے جیتے جی کھا جاتی ہیں

اُن دِنوں ٹنڈی لاٹ میرا مطمحِ نظر تھا۔ مَیں اُسے شہر جاتے آتے دیکھ لیتا تو اگڑ ونڈی (پیچھے سے بھاگ کر آگے ہونا) ہو کر اُسے ست سری اکال بلاتا، نیولوں کو پیار کرتا، اُس کی باتیں سُنتا اور اپنے ساتھیوں میں شان بگھارتا۔ اُن کمینوں کا تصوّر اُن کی کمینگی کی گندگی سے باہر نہ نکلتا۔

آدرش (مطمحِ نظر) کی بات آئی ہے تو مَیں کچھ مزید کہنا چاہتا ہُوں۔ میرا آدرش کبھی ستھر (ٹھہرا ہُوا) نہیں رہا ہے، بدلتا رہا ہے۔ اُس کی نوعیّت کوئی بھی رہی ہو، اُسے نسبت کسی ممتاز شخصیت سے رہی ہے۔

تایا جی نسبت کے بارے میں طرح طرح کے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اُن کے خیالات کا ایک رُخ یہ بھی ہے، اِنسان کے تصوّر کی رازجوئی! یہ اپنے محدود دائرۂ فعل کو لامحدود دیکھنا چاہتا ہے جو اِس کے برعکس فطرت کا لائحہ عمل ہے۔ اِس کی عظمت پسندی کے پاگل پن نے اِس سے مافوق الفطرت کردار تخلیق کروائے اور پھر اُن سے نسبت کے جذبے۔ اِس جذبے کی اِنتہا! کئی اِنسان ہُوبہو بھگوان بن بیٹھے اور کئی اُس کے اوتار۔

میرے ماحول کا یہ پہلو دِل فگار تھا کہ کوئی کِسی سے سبقت لے جاتا تو اُس کی خوبی میں خرابی نکالنے کے نامعقول طریقے گھڑے جاتے تھے۔ مجھ میں بھی یہ خرابی تھی لیکن میری بزدلی میری رُکاوٹ تھی اور میرا ضبطِ نفس بھی

مَیں کلاس میں اوّل آیا۔ عام طور پر محبوب اوّل آتا تھا اور انعام بھی پاتا تھا۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے اُس نے مجھ پر طنز کی، "تو اوّل آیا ہے تو کیا ہے؟ ہے تو سِکھڑا ترکھوٹا (سِکھ ترکھان کی تذلیل)! مَیں سیّد ہُوں!"

وُہی جانے کیسے؟ اُس نے میری ماں کا نام جان لیا۔ وُہ وقت بے وقت میری ماں کا نام لیتا اور مَیں خُون پی کر رہ جاتا لیکن اُسے اُس بدتمیزی سے روک نہ سکتا۔ ہنس راج غیر حاضر تھے اور کلاس میں ہُڑبونگ مچا ہُوا تھا۔ محبوب میری ماں کا نام بلیک بورڈ پر لکھ رہا تھا کہ نبی بخش اندر آگئے اور چُپ چاپ دروازے میں کھڑے ہو گئے، جِس نے دیکھا اُسی نے دَم سادھ لیا۔ محبوب بلیک بورڈ سے پیچھے ہٹا تو اپنے سر پر نبی بخش کو کھڑا پایا۔ اُس نے بلیک بورڈ صاف کرنا چاہا لیکن نبی بخش نے اُسے گردن سے پکڑ لیا اور عبارت کا مفہوم سمجھ میں نہ آنے پر اُنھوں نے اُس سے پُوچھا۔ اُس نے ایک ہی بات پکڑ لی۔ "کُچھ نہیں جناب! کُچھ نہیں جناب!!"

"کُچھ تو ہے، ورنہ تو کیوں لکھتا؟"

یہ کہہ کر اُنھوں نے کلاس کی طرف دیکھا گویا خاموش سُوال کیا۔ مَیں جذبات سے مغلوب ہوکر رو پڑا اور سچ سچ کہہ دیا۔ اُنھوں نے محبوب سے کہا، "گیان کی ماں کے نام کے سامنے اپنی ماں کا نام لکھ!" اُس نے عُذر کیا۔ اُنھوں نے اُسے فرش پر گرا لیا، اپنا پَیر اُس کے ایک ٹخنے پر رکھا اور دُوسرے سے پکڑ کر اُوپر اُٹھایا جیسے وُہ اُسے سیون سے چیر رہے تھے۔ اُس اچانک صدمے سے وُہ کاچھے میں ہگ دیا اور درد سے یُوں بلبلایا کہ کمرہ گُونج گیا۔ وُہ آخری دِن تھا جب اُس نے میری ماں کا نام لیا۔

اُس دِن نبی بخش صاحب نے ہماری کتاب میں سے ایک سبق پڑھایا جس کا عُنوان تھا، "پہلے بات کو تولو پھر مُنہ سے بولو" سبق پڑھا کر اُنھوں نے اِنسانی زِندگی کی ایک فلاسفی بیان کی۔ "ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کا نام زِندگی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ سرگرمِ عمل بنو، آگے بڑھو اور اپنے حریف کو پچھاڑ دو۔ دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حریف کو جان سے مار کر مُقابلہ ہی ختم کر دو۔ پہلا طریقہ عالموں کا ہے اور دُوسرا جاہلوں کا۔ یاد رکھو! تم سب یہاں عالم بننے کے لئے آتے ہو۔"

مَیں جب کبھی ٹُنڈی لاٹ سے مِلتا وُہ خواہش کرتا کہ مَیں اُسے کچھ سُناؤں۔ اِس سے میرا نظمیں اور غزلیں یاد کرنے کا شوق بڑھا۔ مَیں اُسے ہر بار نئی چیز سُناتا اور وُہ خُوش ہو کر داد دیتا۔ "واہ کیا خُوب حافظہ ہے!"

ہندوستان اور پاکستان کا پراپیگنڈہ زوروں پر تھا۔ عِلاقے کی ہوا بدل رہی تھی اور عام چرچا تھا کہ ہوشیارپُور، پاکستان کے حِصّے میں آئے گا۔ اُس چرچے کی وجہ وُہ بستیاں تھیں جِن کی نوّے فیصدی آبادی مُسلمانوں کی تھی۔

اُن تمام بسیوں کے نام شخصی تھے، جیسے عمر خاں دی بسی، وزیر دی بسی، سیدے دی بسی .... نور خاں دی بسی، ۔ عمر خاں دی بسی ہریانہ کے مشرق میں آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔ میں جس رات ٹال پر رہتا، سویرے بھاگ کر اُس کی فصیل کو ہاتھ لگا کر آتا۔ چھوٹی اینٹوں کی اُس فصیل کی چوڑائی نیچے زیادہ اور اوپر کم تھی لیکن اِتنی تھی کہ اُس پر گھوڑا دوڑایا جا سکتا تھا۔ اُس فصیل میں رَندر کھے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ فصیل کے گرد خندق بھی تھی، جسے بھر دیا گیا تھا۔ اُس فصیل کے بارے میں مشہور تھا کہ وُہ ذمیوں نے بیگار میں بنائی تھی۔ اُن بسیوں کی تاریخی اہمیت مَیں نے گرودواروں میں ڈھاڑی جتھوں سے سُنی تھی۔ اورنگ زیب نے انہیں سکھ تحریک کو کچلنے کے لئے بسایا تھا۔ جن ناموں پر وُہ بسیاں بسی تھیں وُہ سب پانچ ہزاری، دس ہزاری، بیس ہزاری .... کے رُتبوں کے مالک تھے۔ سکھ تواریخ میں اُن بسیوں اور ہندو کُش کی کہانی غلاموں، زنا بالجبروں، اِغواؤں، قتلوں، ظلموں، مُصیبتوں، آنسوؤں .... کے عنوان سے لکھی ہُوئی ہے۔ مَیں اُن کے ناموں سے زیادہ اُس قوم سے نفرت کرتا تھا جس کے اسلاف اُن جرائم کے مرتکب تھے۔ جوشیلی تقریروں، خُون کھولاتے نعروں، رزمیہ بیانوں اور 'راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کوئے' کے دُعا زائیدہ نفسیاتی ماحول کے درمیان میں شدّت سے محسُوس کرتا کہ مَیں خالصہ پنتھ کا داعی اور سپاہی ہُوں اور دھرم یُدھ لڑنے کے لئے پیدا ہُوا ہُوں۔ اپنی نامردی کے باوجود، مَیں اپنے آپ کو اُن اِتہاسک یودھوں سے منسُوب کرتا، جن کی تیغ کے ایک وار نے ترکوں کے کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے تھے اور جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے ترکانیوں کے حمل گرا دیئے تھے۔ اُن میں سے ہری سنگھ نلوا کا نام قابلِ ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ افغانستان کے مُسلمان اُس کا نام لے کر روتے بچّوں کو ڈراتے ہیں اور انہیں چُپ کرواتے ہیں۔ مجھے اُن سکھوں پر غصّہ آتا جو سنکٹ اور آزمائش کی گھڑی میں گرو گوبند سنگھ کو یکّا و تنہا چھوڑ گئے تھے۔ مَیں سوچتا کہ اُن کے ساتھ مَیں ہوتا تو اُن کے اِس قول پر پورا اُترتا۔

سُورا اُس کو جانیے جو لڑے دِین کے ہیت
پُرزہ پُرزہ کٹ مرے کبھی نہ چھوڑے کھیت

اپنی ذاتی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے مَیں نے تصوّر میں لڑائی لڑنی سیکھی تھی اور بہت پہلے سیکھی تھی۔ اُس میں جو خُون خرابے ہوتے تھے، دو، چار سے نہ بڑھتے تھے لیکن قوم کا بدلہ قوم سے لینے کے لئے مَیں نے پہلا قتلِ عام ایک ایسی ہی کسی گُرسنگت میں بیٹھے ہُوئے اپنے خیال میں کیا تھا۔

مُسلم لیگ کے مقامی لیڈر کا نام ناصر علی تھا۔ اُس کی چھوٹی سی کار لاؤڈ سپیکر لگائے دھما کے کرتی اور دِن بھر میں کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتی۔ جیسا کہ لیڈروں کی خصلت ہے، وُہ بھی دانش مندانہ تقریر نہ کرتا تھا۔ کسی نے اُس پر یہ شعر موزوں کر رکھا تھا۔

نام کا ناصر ہے لیکن ہے صِفت ناسُور کی
مُونچھ ہے داڑھی نہ اُس کی شکل ہے لنگُور کی

مَیں شاعر کے مشاہدے کی تعریف کرتا۔ ناصر کی طبیعت میں نو دس کا فرق ہو تو ہو، شکل میں فرق نہ تھا۔ اُس کے چہرے کو کسی صحیفے کی آیتوں کی طرح پڑھو تو اُس کے نقوش تنبیہ کے کلمے نظر آتے تھے۔

ناصر کی کار، کچی سڑک کے ربّے (گومڑے) سے ٹکرا کر خراب ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اُس کا نقص دُور نہ کر سکا تو اُس نے اُسے باہتیوں کے ڈیرے سے جوگ لانے کے لئے بھیجا تا کہ وُہ کار کھینچ کر ہریانہ تک لے جا سکیں۔ راہی خُوش تھے کہ اُنہیں کار کو قریب سے دیکھنے اور اِنجن میں جھانکنے کا موقعہ ملا ہے۔ اُن کی تاک جھاک کا ناصر پر عجیب اثر ہُوا! وُہ اُن سے ایسے مخاطب ہُوا جیسے کوئی پیر کسی رمز کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ ”بھائیو! پاکستان، پاک ستان ہو گا! وہاں ہر کوئی محنت اور محبّت سے کام کرے گا اور جو نہ کرے گا اُسے قریب ہی کے درخت سے لٹکا دیا جائے گا۔ وہاں شیشے جیسی سڑکیں بنوائی جائیں گی۔“

ٹُنڈی لاٹ وہاں سے گزر رہا تھا، وُہ ناصر کی فتویٰ نُما بات سُن کر رُک گیا۔ اُسی وقت باہتیوں کے ڈیرے سے ناصر کا ڈرائیور آیا، اور یہ خبر لایا کہ باہتی رُوپے لے کر بھی جوگ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ٹُنڈی لاٹ نے آگے بڑھ کر ناصر سے کہا، ”ناصر میاں! شیشے کی سڑکیں بنوانے اور کام چوروں کو درختوں سے لٹکانے کے لئے تُمہیں پاکستان کی ضرُورت ہے۔ اِس وقت تُم کار کے آگے جُتو اور اِسے کھینچ کر ہریانہ لے جاؤ۔“

تماشائیوں نے ٹُنڈی لاٹ کو ایسے دیکھا جیسے وُہ اُس کے بروقت سُجھاؤ پر آفریں باد کہہ رہے ہوں۔ ناصر اور اُس کے ساتھی پہلے ہی تماشائیوں سے تنگ تھے اور ایک آدھ بار اُنہیں بھگانے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ ٹُنڈی لاٹ کی طنز سے برہم ہو کر ناصر نے کہا، ”تُم غم نہ کرو! ہم جانتے ہیں، ہمیں کیا کرنا ہے!“

”جانتے ہوتے تو ابھی تک ہریانہ پُہنچ گئے ہوتے۔“ ٹُنڈی لاٹ نے بچّوں کے اُوپر سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

ٹُنڈی لاٹ وہاں سے جانے لگا تو سارے کے سارے لڑکے اُس کے ساتھ ہو لئے۔ اُس کے گرد بھیڑ دیکھ کر نیولے اُس کے کاندھوں پر سوار ہو گئے تھے۔ راستے میں ٹُنڈی لاٹ نے رُک کر سبق آموز انداز میں کہا، ”جس تنظیم کی بُنیاد مذہب پر ہو، وُہ تنگ نظر ہوتی ہے اور اِرتکاب خُودکُشی کے مُترادف۔“

اِس کا تجربہ مَیں خُود بھی کر چکا تھا۔ میری زیادہ تر مُصیبتیں میرے اپنوں کی وجہ سے تھیں لیکن مذہبی ماحول میں میری ’اپنوں‘ سے نفرت مِٹ جاتی تھی اور بیگانوں‘ سے جاگ پڑتی تھی۔ اُس نفرت کی ظاہری وجہ صرف اِتنی ہوتی تھی کہ آج سے صدیوں پہلے کسی کے پُرکھے میرے پُرکھوں سے لڑے بھڑے تھے اور میرے پُرکھے ہار گئے تھے۔ مَیں اُن کی شکست کو اپنی شکست سمجھتا تھا۔

تایا جی کہتے تھے ، "ماضی مردہ ہے ، حال زندہ ہے اور مستقبل نازائیدہ ۔ زندگی ، سفر ہے اور انسان مسافر ! اور جو مسافر پیچھے دیکھتا ہوا آگے چلتا ہے ، وہ گڑھے میں گرتا ہے یا صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے ۔ انسان پر لازم ہے کہ یہ اپنے اطراف دیکھتا ہوا آگے چلے اور اپنی سمت پر تنقیح بھی کرے ۔"

میں جن لوگوں کا حصہ تھا وہ ماضی پرست ، حال دشمن اور مستقبل سے بے تعلق تھے ۔

لوگوں کی اپنے اسلاف سے عقیدت نرالی ہے ۔ وہ انہیں جیتے جی دھتکارتے ہیں لیکن اُن کے مرنے پر انہیں سورگ باسی ، مرحوم کہتے ہیں اور اُن کے نام کے قصیدے اور وظیفے پڑھتے ہیں ۔

پنجاب کی تاریخ میں لاکھوں آدمی محض اس لئے قتل ہوئے کہ وہ حکمران بادشاہ کے ہم مذہب نہ تھے ۔ پرچارک ، سنگت میں چیخ چیخ کر دوہراتے تھے ۔ "اورنگ زیب کے راج میں ہندوؤں کو جزیہ بھرنا پڑتا تھا اور وہ سوا من جنیئو سامنے رکھ کر کھانا کھاتا تھا ۔ وہ جنیئو اُن ہندوؤں کے ہوتے تھے جو حاکمانِ وقت کے ظلم و ستم سے ڈر کر مسلمان ہوگئے ہوتے تھے یا کافر کا فتویٰ دے کر مار دیئے ہوتے تھے ۔ مسلمان روپیہ بٹورنے کے لئے جھوٹے جنیئو اکٹھے کرنے لگے تو اورنگ زیب نے نیا حکم صادر کیا کہ ایسے کافروں کے کان بھیجے جائیں ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو مردوں میں کان بال کا رواج پڑا تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ختم ہوا تھا ۔"

اقبال میرا پسندیدہ شاعر تھا ۔ اُس سے میری نفرت کا آغاز ، اُس کا شکوہ اور ترانۂ ملی پڑھ کر ہوا تھا ۔ ان نظموں کے اشعار اِس نظریے کی وکالت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے سوائے ہر کوئی کافر ہے اور گردن مارنے کے لائق ۔

تایا جی کی حویلی کے پاس گوردوارہ تھا جہاں سادھو سنتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا ۔ اُن میں سے کسی کسی سے تایا جی کی بھینٹ ہوتی رہتی تھی ۔ ایک سنت نے تایا جی سے پوچھا ۔ "آپ کے گھر کے ساتھ پوِتر استھان ہے لیکن آپ اِس سے لابھ نہیں اٹھاتے ہیں ۔"

"اِس سے بھی پوِتر استھان ہے اور میرے پاس ہے ۔" تایا جی نے ادھورا جواب دیا جو اُن کی فطرت تھی ۔

"کون سا ؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا ۔

"میرا من !" تایا جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

"اِس کا مطلب ہے کہ آپ تیرتھوں میں بھی یقین نہیں رکھتے ؟" سنت نے بات کو ٹول دیا جیسے وہ تایا جی کے رویے کی اصل دیکھنا چاہتا ہو ۔

"میں تیرتھوں میں یقین رکھتا ہوں !"

"کون سے تیرتھوں میں ؟"

میرے تیرتھ ہیں کرتب ، کرم ، سنتوکھ ، ست ، وچار ! آپ لوگ کبھی کبھی تیرتھ نہاتے ہیں ، میں تو

سانس سانس تیرتھ اَشنان کرتا ہُوں۔"

مانس جیون کے بارے میں تایاجی کے وِچار شاستروں سے الگ تھے۔ وُہ کہتے تھے۔ "دُوسری جُونوں کی طرح مانس جون ایک جُون ہے! یہ نہ بھگوان کے کرم سے مِلتی ہے اور نہ اُس کے قہر سے غارت ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری جُونیں جُوں کی تُوں برقرار رہتی ہیں، مانس جُون اپنے کرم سے اپنے آپ کو سنوار بھی سکتی ہے اور بِگاڑ بھی سکتی ہے۔ تیرتھ اَشنان کرنے سے سُدھار ہوتا اور مُکتی مِلتی تو گنگا میں رہنے والے کیڑے مکوڑے وُہی گندگی نہ کھاتے جو وُہ کھاتے آئے ہیں اور اپنی طرح کیڑوں مکوڑوں کو جنم نہ دیتے۔"

ٹُنڈی لاٹ کوٹلہ نوہند سنگھ کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں میرے گاؤں سے ایک میل دُور شمال مشرق میں مرزاپُور اور ڈڈیانہ خُورد کے درمیان واقع ہے۔ ورشن سنگھ شرط لگاتا تھا کہ ڈڈیانہ کلاں کو مرکز مان کر دائرہ لگاؤ تو کوٹلہ نوہند سنگھ، ڈڈیانہ خورد، آدو وال، شیرپور، کوٹھے جٹاں، بگے وال، لامبڑا، سین پور اور مرزا پُور دائرے کے گھیرے پر پڑیں۔

ٹُنڈی لاٹ کا قد لمبا، رنگ گندمی اور ناف تک بہتی ہوئی پتلی سفید داڑھی تھی۔ وُہ سیدھی سادی چھوٹی سی پگڑی باندھتا اور شلوار قمیص پہنتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی گہرائی تھی اور نپی تُلی بات چیت سے تحقیق و ظرافت جھلکتی تھی۔ اُس کے لہجے کا زیر و بم اُس کے خیال کی اہمیت کو اُبھارتا تھا اور جادو اثر رکھتا تھا۔ اُس کی پہلی ہی بات نے مجھے ہکا بکا کر دیا تھا اور میں کتنی دیر اُس اُلجھن میں گرفتار رہا تھا جو اُس کے آزاد رویّے کی پیدا کردہ تھی۔ میں نے اُسے تایاجی کہہ کر بُلایا، اُس نے مجھے فوراً ٹوک کر کہا، "اپنے سے بڑے سے بات کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ اُسے رشتے دار بنا لیا جائے۔ تُو مجھے سردار جی یا ہرنام سنگھ جی کہہ کر بُلائے گا تو بھی چلے گا۔"

اُس کی اور میری عُمر میں کم سے کم پچاس سال کا فرق ہوگا۔ اُس کی یہ بات سُن کر مُجھے لگا کہ میں اُس کے جتنا بڑا ہوگیا ہُوں۔ میں نے بے دھڑک سُوال کیا، "آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن تایاجی کہنے میں کیا بُرائی ہے؟"

"بچے کے دِل پر کسی کی بزرگی کا بوجھ ہو تو اُس کی جدت پسندی اور خُود روی کُچلی جاتی ہے اور ذہنی نشو و نما مُتاثر ہوتی ہے" اُس نے بلا توقف کہا تھا جیسے میرے سُوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا ہو۔

ٹُنڈی لاٹ کی بات درست تھی، بچوں پر بڑوں کا سایہ کم اور بوجھ زیادہ تھا۔ میں کیا کیا کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن مجبُور تھا کیوں کہ اُن باتوں کا بتانے والا کوئی نہ تھا، خاص کر ایسی باتیں جن کا تعلق اِدراکِ نفس سے تھا۔ قارئین! وُہ باتیں جو ذوقِ مُشاہدۂ نفس کے لئے آگاہی ضمیر ہیں وُہ عام طور پر بزرگوں کے لئے بے ہُودہ اور خلافِ فطرت ہیں۔ رسموں، رواجوں اور روایتوں کی زنجیر اِس وقت بھی اُتنی ہی تنگ ہے جتنی کہ اُس وقت تھی۔ آدمی کی دُور نظری اِس پر اتنی حاوی ہے کہ اِسے پاس کی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔

بزرگوں کے سامنے میری حالت گُونگے اور بہرے مویشی کی سی تھی۔ میرے وسوسے میرے خوف تھے اور

میری لاعلمی میری بے بسی۔ اُس میں تلاش کا عنصر تھا اور بار بار کچلے جانے پر بھی زندہ و فعّال تھا۔ اُس کا سیدھا رشتہ جسمانی ضرورت سے تھا۔ آدمی کی بُنیادی جبلّت سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس ضرورتِ حیات کو غیر اخلاقی بات سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مَیں اپنے ایّامِ طفلی کی ایک واردات بیان کرتا ہُوں۔ میرے بھائیا جی باہر صحن میں نہا رہے تھے۔ مَیں اُن سے کچھ دُوری پر کھیل رہا تھا۔ اُنہوں نے نہا کر گیلا کچھا بدلا، میری نگاہ اُن کے ننگے ستروں پر پڑی۔ اُن کا آکار پرکار دیکھ کر مَیں حیران رہ گیا اور بے اختیار ماں کی جانب بھاگا اور پُوچھا، "ماں ماں! میری پُھلی بھائیا جی سے چھوٹی کیوں ہے؟" میرے تجسّس میں محرُومی کا احساس تھا۔ مجھے لگا کہ اعضا کی تقسیم میں میرے ساتھ ناانصافی ہُوئی ہے اور اُس نقصان کی تلافی ضرُوری ہے۔ اِس سے پہلے کہ میری ماں میری تحقیق پسند فطرت کی کسی طرح تسلّی کرتی، بھائیا جی مجھ پر جھپٹے اور میرے اِس زور سے طمانچہ مارا کہ میرا کان جھنا گیا اور مَیں چکرا کر گر پڑا۔

ہندو لڑکوں کے مُقابلے میں مُسلمان لڑکوں کی پُھلیاں صاف سُتھری ہوتی تھیں۔ وُہ اُن کا مُظاہرہ جس شان سے کرتے تھے، وُہ اپنی شوکت آپ تھا۔ میرا دوست قادر یار پُھلّی کھڑی کر کے دِکھاتا، جس پر مَیں رشک کرتا۔ حالاں کہ مَیں پُھلّی کے لذّت آفریں پہلُو سے بے بہرہ تھا مَیں قادر کی پُھلّی سے پُھلّی ملا کر محسُوس کرتا کہ میری میں کوئی بُنیادی خرابی ہے۔ مَیں اُس خرابی کو جاننے کے لئے پُھلّی کا ہر زاویے سے مُعاینہ کرتا اور اِس نتیجے پہنچتا کہ اُس میں کوئی خرابی نہ تھی چُوں کہ اُس کا گھونگھٹ پیچھے نہ سرکتا تھا اُس کا اصلی رُوپ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میری پُھلّی پردہ پوش خاتون تھی، جس کے قد و قامت اور خدّ و خال لوپ ہو کر بھی الوپ رہتے ہیں۔

مَیں بڑوں کے سامنے پُھلّی سے یُوں بے خبر رہتا تھا جیسے وُہ ہو کر نہ ہو لیکن اکیلے میں اُس سے کھلونے کی طرح کھیلتا تھا۔ جسمانی تحریک اُبھرتی اور گھونگٹ پیچھے سرکنے کی کوشش کرتا لیکن تانتوا اُس کی رُکاوٹ بن جاتا۔ گھونگٹ کے نیچے گیدسی جمی رہتی جس کی بدبو مُردہ چُوہے کی سی گھناؤنی ہوتی۔ اُس بدبُو سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ گھونگٹ پیچھے سرکاؤ اور اُس گندے مواد کو دھوؤ۔ ایک دِن سویگ نے مجھے اُکسایا اور مَیں نے گھونگٹ کو جھٹکا دے کر تانتوا توڑ دیا۔ درد تو زیادہ نہ ہُوا لیکن تازہ خُون دیکھ کر مَیں گھبرا گیا۔ تانتوا پُورا نہ ٹوٹا تھا لیکن مَیں دُوسرا جھٹکا نہ دے سکا۔ سویگ نے پہلے ہی سے پٹّی تیار رکھی تھی۔ اُس نے گھونگٹ پیچھے سرکا کر گھاو پر پٹّی باندھی اور کہا، "اِسے گاہے بگاہے بھگوتے رہنا ورنہ کھولتے وقت گھاؤ ہرا ہو جائے گا۔"

سویگ کا اپنا تانتوا دیسراج سے بنڈ بھڑکا کھیلتے ہُوئے ٹُوٹا تھا۔ ناواقفیت کی وجہ سے اُس نے گھونگٹ پیچھے سرکا کر زخم پر پٹّی نہیں باندھی تھی اِس لئے اُس کا تانتوا دوبارہ جُڑ گیا تھا۔ اُس نے دیسراج کی مدد سے وُہی تجربہ پھر کیا تھا جس سے مَیں مُستفید ہُوا تھا۔

جہاں تک میں جانتا ہوں میرے گاؤں میں میرے ہر ہم عصر کی پھلی کا تانتوا باہم بنڈ بھڑ کا کھیلتے ہوئے
ٹا تھا۔ جاگیر سنگھ کا تانتوا ٹوٹا تھا تو اُس کی پھلی سوج کر کُپا ہو گئی تھی۔
ٹنڈی لاٹ نزاعی حد تک پوجا پاٹھ کے خلاف تھا اور مذہبی روایات کی ہنسی اُڑاتا تھا۔ وہ یہ شعر ایسے
گنگناتا تھا جیسے کوئی مذہبی آدمی، وظیفہ۔

کرو نہ کام کرو ارداس
بھوک لگے تو کھاؤ گھاس

تایا جی اور ٹنڈی لاٹ کا بنیادی کردار ایک تھا۔ دونوں فرسودہ قدروں کے خلاف تھے لیکن ٹنڈی لاٹ
کی باتیں تیر کی طرح لگتی تھی۔ مذہبی لوگ اُسے کافر کہتے تھے۔ اُس کی بڑائی! وہ خود اعتراف کرتا تھا کہ وہ کافر ہے لیکن پروفیسر
موہن سنگھ کے الفاظ میں۔

لائی لگ مومن دے کولوں
کھوجی کافر چنگا
(روایت پرست مومن سے تحقیق پسند کافر بہتر ہے)

وہ ایسی کتابوں کے نام لیتا تھا جو سکولوں اور کالجوں کے کورس میں نہ تھیں۔ وہ ممنوع کتابیں، بدیش سے
چھپ کر اور چھپ چھپا کر دیش میں آتی تھیں۔ نرنجن سنگھ کامریڈ اور ٹنڈی لاٹ لال انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔
روس میں انقلاب آیا ہے جس نے چھوٹے بڑے کا فرق مٹا دیا ہے۔ ہر کوئی اپنی قابلیت کے مطابق کام کرتا
ہے اور اجرت ضرورت کے لحاظ سے پاتا ہے۔ تعلیم بالکل مفت ہے اور اسی طرح صنعت و حرفت کی تربیت۔ ذاتی
ملکیت ختم ہو گئی ہے اور اُس کے ساتھ باہمی جھگڑے بھی۔
تایا جی اُس نظام کے بارے میں کہتے تھے، "اگر وہاں ایسا نظام حکومت قائم ہوا ہے تو بہت اچھا ہے!"
مجھے بھی یہ باتیں زندگی سے قریب لگتی تھیں کیوں کہ راوی کے اس بیان کی تصدیق کرتی تھیں،

زور، زمین، زر
تینوں فساد کی جڑ

میں اُس سماج کا تصور کرتا جو ان تینوں برائیوں سے پاک تھا۔ وہاں کوئی اِس لئے چھوٹا نہ تھا کہ وہ چھوٹی
ذات سے تھا۔ ہمارے گاؤں میں زمین کے لئے آئے دن فوجداریاں ہوتی رہتی تھیں۔ چمار، آرائیں، ترکھان، مسلمان
جٹوں کے موروث تھے۔ کسی زمانے میں موروثوں کی شادیوں میں گھوڑے جوڑے کی رسم جاری تھی، وہ یہ کہ جو موروثی
کرے وہ اپنے مالک کو بندھا ٹکا نذرانہ ادا کرے۔ کہتے تھے کہ اِس رسم کا آغاز بڑا شرمناک تھا! موروثی کو اپنی بیوی

کا نذرانہ دینا پڑتا تھا۔ یہ رسم، دوسری اور کئی رسموں کی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں مٹی تھی۔
بابر کے زمانے کے پُر آشوب حالات آدگرنتھ میں اِس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

آد پُرکھ کو اللہ رکھے، سِکھاں آئی واری
دیوی دیوتیاں، کر لاگا ایسی کیرت چاری
پُوجا، بانگ، نواج مُصلّی، نیر رُوپ بنواری
گھر گھر میاں سبھناں جیاں بولی اور تھماری

(آج کل شیخوں کا دور دورہ ہے، بھگوان کو اللہ کہتے ہیں۔ ایک نیا دستور رائج ہوا ہے!
دیوی دیوتاؤں کے مندروں پر ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ اب لوٹا، نماز اور مُصلّی ہی ممتاز ہے۔ بھگوان کا رنگ نیلا ہوگیا ہے اور باہمی بات چیت میں میاں کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ بولی ہی بدل گئی ہے۔")

دُوسری جنگ کے دوران جاگو لہر اُٹھی۔ سہمی سہمی، ڈری ڈری، دبی دبی جاگو لہر۔ ہمارے گاؤں میں اُس لہر کا بانی نرنجن سنگھ کامریڈ تھا۔ وہ اور اُس کے کچھ ساتھی گلیوں میں گاتے پھرتے۔ اُن کی آواز سُن کر لوگ دروازے بند کر لیتے جیسے وہ چھُوت کی بیماری پھیلا رہے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے دروازے بند کرنے بند کر دیئے اور وہ دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر تاکنے جھانکنے لگے۔ کامریڈوں کے گیت مشہور ہونے لگے، اُن کے ساتھ بچّے گھومنے لگے اور گیتوں کے انترے اُٹھانے لگے، اِکّا دُکّا جوان اور بوڑھے چوپال میں جاکر اُن کے گیت سُننے لگے۔ پھر تو کوئی ہی چمار، مہتر، جولاہا، ترکھان اور باہمی ہوگا جو جلسے میں شرکت نہ کرتا ہوگا اور اپنا بے سُرا سُر اُن کے سُر میں نہ ملاتا ہوگا۔

سُن بھینے سُن جاگو آئی ہے
جاگو آئی ہے مساں بُلائی ہے
اُٹھ اوئے رتن سیاں، اُٹھ اوئے چمن سیاں
اُٹھ اوئے مکھن سیاں، اُٹھ اوئے وطن سیاں
جاگو آئی ہے پریت لیائی ہے
سُن بابو سُن مساں بلائی ہے

(مساں، بڑی مشکل سے، منت سماجت سے)
ایسے نعروں سے چوپال گونجنے لگا،

"مزدور اور کسان ایک ہیں۔"
"ہم بیگار نہیں کریں گے، وقت پڑے تو چھین مریں گے۔"
"گولی لاٹھی کھائیں گے، آگے بڑھتے جائیں گے!"

مالکوں اور مورتوں میں ٹھن گئی۔ ساری بارہ راجپوتوں کی تھی جہاں لوگ رفع حاجت کرتے تھے۔ راجپوت لاٹھیاں لئے وہاں بیٹھے رہتے اور کسی کو اُدھر جانے نہ دیتے۔ کامریڈز حوائجِ ضروری کے مسائل سے بڑی ہوشیاری سے نپٹے، انہوں نے گھروں میں گڑھے کھود لئے۔ مالک بے لحاظ ہوئے تو کمّی (کامگار کی تحقیر) بے نیاز ہو گئے۔ کہاں مالکوں کی آہٹ پا کر وہ راہ چھوڑ دیتے تھے اور جب تک مالک گزر نہ جاتے تھے، ہاتھ جوڑے ادب سے جھکے کھڑے رہتے تھے۔ اب وہ مالکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے جیسے امیر لفنگے، غریب کی بہو بیٹیوں کو تاکتے ہیں۔ پھر ایک عجیب بات سننے میں آئی۔ کئی راجپوت سویرے گھروں سے باہر نکلتے تو اپنے دروازوں پر گوہ پڑے دیکھتے، جس کے بارے میں لوگ کہتے کہ بھوت پریت ہگ گئے ہیں۔ کامریڈز (جن کو راجپوت نفرت سے امکڑے ڈھمکرے کہتے تھے) کے نئے حربے راجپوتوں سے برداشت نہ ہوئے۔ انہوں نے تھانیدار سے ساز باز کر کے بودو رام، بنتا سنگھ، دسوندھی رام اور امیا رام کو تھانے میں بلوایا اور انہیں تڑوا دیا۔ پولیس کی ناانصافی، بے رحمی، زیادتی ... سے کامریڈز اور متحد ہو گئے۔ وہ چاروں نوجوان تھانے سے زندہ مُردوں کی طرح اٹھا کر لائے گئے۔ وہ بسترِ مصیبت پر ہی گل سڑ جاتے لیکن جوانی کی ہڈیوں کی قوتِ شفا! وہ رینگتے رینگتے اٹھ بیٹھے، بیٹھے بیٹھے کھڑے ہوئے اور بیساکھیوں کے سہارے چلنے لگے اور آخر کار وہ سہارے بھی جاتے جاتے چلے گئے لیکن وہ اُن شوخیوں کو چرا لے گئے جو عہدِ شباب کی جولانیاں ہوتی ہیں۔

زراعت کو محنت سے وہی نسبت ہے جو بیمار کو دوا دارو سے۔ ساؤنی برباد ہو گئی، ساڑھی برباد ہوتی نظر آئی تو راجپوتوں کو امکڑوں ڈھمکروں سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ مزدوروں کی مزدوری نقد طے ہوئی تب ساڑھی بچی۔

اُس تحریک کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ گاؤں میں ایک جاگرتی آئی جو بصورتِ دیگر ممکن نہ تھی۔ لوگ باہر کھیتوں میں بھی گڑھا کھود کر ٹٹی پھرتے اور پھر اُسے پاٹ دیتے۔ وہ بدخو جو اس تحریک کے تالو سے تلوں تک خلاف تھے، وہ بھی اس کی یہ خوبی ضرور سراہتے۔

مٹی اور میل کامگاروں کے بدن کا اُتنا ہی لازمی حصہ ہے جتنا مٹی، مٹی کا اور میل، میل کا۔ ہمارے گاؤں کے کامگار زمانے سے الگ نہ تھے۔ اُن کے گھروں میں صابن کی بدوی اشیائے عیش و عشرت کی سی تھی لیکن جوں ہی وہ اس کی تلاش میں نکلے انہوں نے اُسے اپنے پاؤں کے نیچے انجانی دھرتی کی طرح پایا۔ انہیں لونی دھرتی میں سے ریہ، ملی اور بنجر میں سے گونو (ایک طرح کی مٹی جسے قلعی کے طور پر استعمال کرتے ہیں) پانی کی فراوانی تھی ہی، بیرونی ماحول کے

ساتھ گھریلو ماحول بھی سنورنے لگا۔ اپنے مخصوص جذبے کے ساتھ، کامگار جس چیز پر توجہ کرتے، اُس کی صورت بدل دیتے جیسے اُس میں نئی زندگی مضمر تھی لیکن ظاہر ہونے کے لئے اُن کے دستِ محنت کی منتظر تھی۔

"مَیں کامریڈوں کو جتنا سنتا وہ اُتنے ہی حیرت انگیز لگتے۔"

"مذہبوں اور نسلوں کے نام پر جتنا لہو بہا ہے، پنجاب کے دریاؤں سے اُتنا پانی نہیں گزرا ہے۔"

"آدمی کے لئے دھرم ایسے ہے جیسے افیمی کے لئے افیم! اور دھرم استھان، افیم گھر ہیں"

"اپنا گھر اور اُس کا اطراف صاف رکھو، پورا گاؤں اپنے آپ صاف ہو جائے گا۔"

"ذاتی ملکیت سب فسادوں کی جڑ ہے۔"

اِن خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اِن کے موجِد کارل مارکس کا نام لیتے اور اُسے عصرِ نو کا مسیحا کہتے۔ اُن کی سب سے نئی بات یہ تھی کہ وہ کالجوں، کارخانوں، ڈیموں، نہروں، بجلی گھروں کو قوتِ وقت، تقدیرِ حیات سرمایۂ مستقبل کے خیال خیز نام دیتے تھے۔ اُن کی کڑی سچائی یہ تھی کہ وہ پیغامبروں کے برعکس انسان کے ساتھ دھرتی پر اِنصاف کرنا چاہتے تھے اِس لئے رُوحانیت کی جگہ معیشت کی باتیں کرتے تھے۔ تایا جی کی طرح وہ بھی رزمیوں پر ملامت کرتے اُن کی دلیل تھی کہ رزمیے، نسلی نفرت کو تازہ کرتے ہیں اور ہم ذات پات کے دُشمن ہیں۔ وہ جس جہاد کے حق میں تھے وہ لاعلمی، غریبی اور بیکاری کے خلاف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اِنسان ایسا حیوان ہے جس پر تعلیم و تربیّت کے ساتھ رواداری لازم ہے۔ وہ جو کہتے تھے، کرتے تھے، جو کرتے تھے اُس کا پھل آپس میں بانٹ کر کھاتے تھے۔ وہ پجاریوں کے رویّے سے بالکل پاک تھے اور اپنی کٹّر سادگی کو یوں سراہتے تھے"، کم کھانے سے اِنسان صحت مند اور ہلکا پھلکا رہتا ہے۔"

ہر مہینے کے آخری ہفتے سکول میں ادبی جلسہ ہوتا تھا۔ ہر کسی کو سُننے سُنانے کی آزادی تھی، گیت، چٹکلے نظمیں، غزلیں، بولیاں... کچھ بھی سُناؤ، چلتا تھا۔ لیکن جب مَیں جا کر سُنانے لگا تو نبی بخش نے مجھے پہلے ہی بند پر روک دیا اور غصّے سے پوچھا،" یہ شر انگیز گیت تو نے کس سے سیکھا؟"

مَیں ڈر گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ روایت کیسی بھی ہو جائز ہے اور اُس سے انحراف جُرم۔

اُن دنوں پنجاب کی سرزمین پر سر چھوٹو رام کا نام آفتابِ نو کی طرح اُبھرا تھا۔ کسان اُس کا اِس قدر احترام کرتے تھے کہ کوئی اُس کے بارے میں بُرا بولتا تھا تو وہ اُس سے لڑ پڑتے تھے۔ سر چھوٹو رام کسی کسان کا بیٹا تھا جو پڑھ لکھ کر وزیر کے مرتبے تک پہنچا تھا۔ وہ کسانوں کی افسوسناک حالت سے واقف تھا۔ اُس کی اَن تھک کوشش سے پنجاب میں ایکٹ اِنتقالِ اراضیات اور ویسے ہی کچھ اور قانون بھی بنے، جن کی رُو سے کسان، ساہوکاروں کے لقمے بنتے بنتے بچ گئے۔ رہن نامے رد ہو گئے، جائیدادِ مرہونہ بلامعاوضہ کسانوں کو واپس مل گئی۔ غیر کاشت کاروں سے

زمین خریدنے کے حقوق چھن گئے اور کسانوں کے قرضے معاف ہو گئے۔ اُس ایک آدمی کی وجہ سے وُہ انقلاب آیا جو لاکھوں محنت کشوں کی محنت اور اُن کی زندگی کے تحفّظ کی ضمانت تھا۔

جس دِن اُس ایکٹ پر عمل دخل ہُوا، مہندر سنگھ اپنے کھیت کی مٹّی اُٹھا کر ایسے سُونگھنے لگا جیسے اُس میں سرور پرور عناصر چھپے ہوں اور محض اُسی پر عیاں ہُوئے ہوں۔ وہاں کیکر کا درخت تھا۔ وُہ اُس سے لپٹ کر کھُردری چھال کو بے اختیار بار بار چُومنے لگا جیسے وُہ محبُوبہ کے رسیلے ہونٹ ہوں۔ وُہ جوشِ جذبات سے بھڑک اُٹھا، اُس کا پیازی رنگ شہابی عکس سے جھلکنے لگا جیسے ہاتھ کے نیچے لائٹ جلانے سے ہوتا ہے۔

روڑا باہتی کھیت میں جھنڈی پر لیٹ گیا اور اُس سے گال مس کرنے لگا جیسے وُہ بسترِ استراحت کے پھُول ہُوں۔

غُلام جیلانی اپنی فیل پائی کے باوجُود بطخ کی طرح چلتا ہُوا اُس زمین کو دیکھنے چل پڑا جس پر اُس کا لڑکا جمال قبضہ لے کر آیا تھا۔ جمال اُس زمین کا کولمبس تھا! فرق یہ تھا کہ کولمبس نے اپنی دریافت اپنے محسن فردی ناند، اراگان کے بادشاہ کے نام وقف کر دی تھی جب کہ جمال کی دریافت اُس کی اپنی ذات کے پالن پوسن کے لئے تھی۔

اُن کے گھروں میں آن ہونی ہُوئی تھی، وقت واپس لوٹ آیا تھا! اُن کی بیویاں بن سنور کر نیاز دینے کے لئے گھر سے نکلیں تو دُلہنیں لگ رہی تھیں۔ اُس دن دھرتی کے اُفق سے نیا آسمان پھُوٹا تھا جس کا آفتاب کسان تھا۔

باب ۱۳

اِک شخص سے رستے میں ملاقات ہُوئی
دِل چسپ طریقے سے مدارات ہُوئی
شرما کے نگاہوں کو جھکایا پہلے
پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہُوئی (شاطر)

قارئین! میں ایک انوکھا انکشاف کر رہا ہُوں۔ میرا وجدان مجھے یقین دلاتا ہے، "میں اچھوتا ہوں! اِس سے پہلے میں نے خُود کو نہ کسی پر ظاہر کیا اور نہ ہی کسی کو اپنی حقیقت سمجھنے کے قابل پایا۔ میں ازل سے تیرا ہی منتظر تھا! تیرے ہی نُور سے میرے وُجود کو ظہُور ملا ہے اور میں اِس کا احسان مند ہُوں۔"

ترلوچن سنگھ کے بیاہ پر نانکا میل (وُہ لڑکیاں جو بیاہ پر ننہیال سے آئیں) نے جو اُودھم مچایا اُس کا

چرچا کئی سال تک رہا۔ وہ مست اور نڈر دوشیزائیں اِس گھر پر اور کبھی اُس گھر پر دھاوا بولتیں اور مکھن، گھی، دودھ، دہی، چھین جھپٹ کر کھا جاتیں۔ اُنہوں نے دوپٹوں کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور گلیوں میں کلکاریاں مارتی گھوم رہی تھیں۔ مرد، برات کے ساتھ پٹیالہ گئے ہوئے تھے اور کہیں کوئی اِکا دُکا تھا تو وہ کھیتوں میں کام کر رہا تھا جس گھر کی مالکن نے اُنہیں روکا ٹوکا، اُنہوں نے اُس کا زیادہ نقصان کیا۔ اُن کی قابلِ ستائش خوبی اُن کے رنگ رلیاں منانے کا فن تھا، جس کا مظاہرہ وہ کئی طریقوں سے کرتی تھیں۔

وریام سنگھ کے گھر میں وہ ناچتی ناچتی اور گاتی گاتی رُک گئیں۔ اُن میں سے ایک مٹیار (دوشیزہ) آگے بڑھی اور اُنہیں اِدھر اُدھر دھکیلتی ہوئی کہنے لگی۔ "دائرہ بناؤ، دائرہ! ناٹک کریں گے۔" دائرہ بن گیا تو اُس نے اپنا دوپٹہ سر سے اُتار کر کمر سے باندھ لیا اور جوڑا کھول کر بال بکھرا لیے اور میر رقص کی طرح گھومتی ہوئی پکارنے لگی۔

"جوگی آیا، بھینو جوگی آیا۔ باہروں ویکھدا تاں اندر دی دسدا۔"

(بہنو! جوگی آیا ہے۔ باہر سے دیکھتا ہے لیکن بات اندر کی بتاتا ہے)

اُس نے ایک پٹاخہ سی مٹیار کو ہاتھ سے پکڑ کر آگے دائرے کے بیچ کھینچ لیا اور اُس کا ہاتھ دیکھتی ہوئی جوگی کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔

"بی بی میں سِدھ جوگی آں!" (بی بی میں کامل جوگی ہوں)

"میں لکیراں پڑھدا آں!" (میں لکیریں پڑھتا ہوں)

"تیریاں اُپر دیاں لکیراں ایویں آں!" (تیری اوپر کی لکیریں ایسی ویسی ہی ہیں)

"تیرے تھلے دی لکیر ہی سب کچھ اے!" (تیرے نیچے کی لکیر ہی سب کچھ ہے)

"تیرا رب کمال دا رب اے!" (تیرا رب کمال کا رب ہے)

"اونے تیری قسمت دو تھاں لکھ دتی اے!" (اُس نے تیری قسمت دو جگہ لکھ رکھی ہے)

"ادھی اوتھے!" (آدھی وہاں، اُس نے مٹیار کی جانگھ کی طرف اشارہ کیا)

"ادھی ایتھے!" (آدھی یہاں، پھر اُس نے اپنی جانگھ کی طرف اشارہ کیا)

کسی لڑکی نے شرما کر اور کسی نے کھلے بندوں اُس کی جرأت کو سراہا۔

مہندر سنگھ کے گھر میں کوئی دوسری لڑکی جولاہا بن گئی۔ اُس نے مہندر سنگھ کی بیوی پریتم کور کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پریتم کور نے اپنا ہاتھ چھڑوانا چاہا لیکن اُس نے نہ چھوڑا۔

"بی بی، ڈر کاہے دا؟" (بی بی تو ڈرتی کیوں ہے؟

"میں ہاں تیرے پنڈ دا جلاہا" (میں تیرے گاؤں کا جلاہا ہوں

"تانی بُنوالے"	(تو تانی بُنوالے
"آگے پوالے"	(آگے ڈلوالے
"پچھّے پوالے"	(پیچھے بھی ڈلوالے
"بی بی میرے متّھے وَل نہ دیکھ؟"	(بی بی میرے ماتھے کی جانب کیا دیکھتی ہے؟
"ایدھر دیکھ!"	(اِدھر دیکھ
لہریا!	ایک قسم کی بُنتی (ڈیزائن)

اُس نے اپنے ہاتھ کا سانپ بنا کر پریتم کور پر لہرایا۔

ویسے ناٹک مَیں نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ مَیں خود ایسی کتنی بولیاں جانتا تھا، جنہیں عورتوں کے سامنے گانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مجھے "پیٹٹر" یاد تھی جسے پنجابی لوک گیتوں کا سرتاج مانا جاتا ہے۔ لیکن اُن رمزوں اور لفظوں کے معنی مجھ پر تبھی کھُلے تھے جب میری مستور فطرت نے ہویدا ہونا پسند کیا تھا۔

ترلوچن سنگھ کا مُکلاوا (گونا) گرمیوں میں آیا اور وہ میاں بیوی چھت پر سونے لگے۔ اُن کی، آسا سنگھ کی اور ہمارے گھروں چھتوں کو صرف منڈیر جُدا کرتی تھی۔ وہ اپنی چھت پر ایک چارپائی اور ایک مسہری لگاتے اور جتنا ممکن ہوتا، ہماری منڈیروں سے دُور رکھتے۔ چارپائی بس نام کے لئے ہوتی تھی۔ جُوں ہی دُوسری چھتوں پر خاموشی اُترتی۔ امر کور ترلوچن سنگھ کی مسہری پر جا چڑھتی۔ وہ یہ کام لاکھ نرمی سے کرتی لیکن مسہری کی بدتمیز چُولیں اُس کی ہل جُل کا اعلان کر دیتیں ترلوچن نے چُولیں ٹھونکیں، اُنہیں تیل دیا لیکن اُن کی زبان بند نہ ہُوئی۔ چُولوں کی پکار سُن کر میری آنکھیں مچھّردانی کا احاطہ کرتیں اور اُس کے اندر اُن ہیولیوں کو دیکھتیں جو چُولوں کے ساز پر ناچ رہے ہوتے۔ تن و جاں کے اتحاد کا وہ منظر جب تک ختم نہ ہوتا، مَیں رُوحانی طور پر مچھّردانی کے ساتھ چپکا رہتا۔

امر کور دِلدار مٹیار تھی اور ہر وقت چُہلیں کرتی رہتی تھیں۔ مَیں کچھ ہی دنوں میں اُس سے گھُل مِل گیا۔ مَیں نے پُوچھا "بھابی۔ کل رات آپ اور بھائی صاحب چارپائی پر لڑ رہے تھے۔ اگر چارپائی ٹُوٹ جاتی۔؟"

"تجھے کس نے بتایا؟" اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے پُوچھا۔

"مَیں نے خود دیکھا ہے!" مَیں نے فخر سے کہا۔

"اوہ!"

اُس نے مجھے کان سے پکڑ لیا اور مُسکراتے ہُوئے ڈانٹ کر کہا۔ "بڑوں کو لڑتے دیکھنا چاہیئے! پھر ایسی حرکت کی تو تیرا سر دو کانوں کے بیچ کر دوں گی!"

"وہ تو اب بھی ہے!" مَیں نے خوش ہو کر کہا۔

"ابھی تھوڑا باہر ہے!" وہ کان مروڑ کر چہل نما غصّے سے بولی۔

مَیں نے سر کو جھٹکا دے کر کان چھڑوا لیا اور بھاگ گیا۔ آسا سنگھ مجھ سے روز پوچھتا تھا"، ترلوچن سنگھ رات کو سارنگی بجاتا ہے، تُو نے سُنی ہو تو بتا؟"

"ہاں، سُنی ہے!" اُس کے دوہرے مطلب سے بے خبر مَیں کہتا۔

"لیکن ایک بات ہے!" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے کان میں بولتا۔

"کیا بات ہے؟"

میری بے قراری بڑھ جاتی۔

"اُس سارنگی کو سُننا ہے تو تجھے ترلوچن سنگھ کے بستر کے نیچے چھُپنا پڑے گا!"

اُس کی بات میں ترغیب ہوتی۔

"تُو نے ایسا کیا ہے؟"

مَیں پکڑے جانے کے ڈر سے گھبرا جاتا۔

"ہاں، کیا ہے!"

وہ میرا حوصلہ بندھاتا۔

میں ترلوچن سنگھ کی چارپائی کے نیچے چھُپ کر اُس انوکھی سارنگی کو سُننا چاہتا جو صرف اُسی کے نیچے چھُپ کر سُنی جا سکتی تھی لیکن مَیں پکڑے جانے کے ڈر سے ویسا نہ کرتا۔

ترلوچن سنگھ کی شادی ہُوئے تین سال ہونے کو تھے۔ اُس کی بیوی پہلے سے زیادہ موٹی ہو گئی تھی لیکن اُس لحاظ سے نہیں جس لحاظ سے اُس کی ساس چاہتی تھی۔ اُس کی ساس ہیرو اُسے اوسر کہتی، کبھی بنجر اور کبھی پھنڈر (وہ گائے جو بہار پر نہ آئے) لیکن اَمر کور ایک الھڑ اور بے پروا جوانی تھی۔ وہ امر کور سے ٹُونا ٹوٹکا کروانا چاہتی اور اُسے دو مُونہے (ایک سانپ جس کے دو مُونہہ ہوتے ہیں) پر نہلانا چاہتی۔ وہ بھولی سی صُورت بنا کر کہتی، "ماں! پہلے ایک مُونہے پر جی بھر کر نہانے دو، اُس سے اُبوں گی تو دُوسرے کا مُنہ دیکھوں گی۔"

اُس کی شوخی پر ہیرو اُسے پھٹکارتی، وہ اُس کا مُنہ چڑاتی، "دو مُونہا! ناں ماں ناں!! مجھے ایک مُونہے ہی سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے بیٹے سے پُوچھ لے۔"

ہیرو نے اُس سے ترراہے پر ٹُونا کروانا چاہا۔ اُس نے پُوچھا، "ماں! اِس سے کیا ہو گا؟"

"تیرا راستہ کھُل جائے گا!" روایت پرست ہیرو نے اُسے سمجھایا۔

"ماں! تیرا مطلب ہے کہ ایک کے تین راستے ہو جائیں گے؟ میرے لئے تو ٹھیک ہے ماں! اپنے

بیٹے سے پوچھ لے۔ وہ میرے ایک ہی راستے سے ڈرنے لگا ہے اور دو دن سے حویلی میں سوتا ہے۔" اپنے نٹ کھٹ انداز سے اُس نے اُسے اڑایا۔

"بے شرم! زبان کچھ کم نکالا کر!" ہیرو نے ڈانٹا۔

"تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے ماں! لیکن تیری باتیں ہی ایسی ہیں!"

اپنی شگفتہ مزاجی سے اُس نے اُسے لاجواب کر دیا۔

ایک بار وہ قے کرنے لگی اور اپنی ساس کو اُمید افزا پا کر کہنے لگی، "ماں، ماں! میری دُودھیوں میں بھی زور کا درد ہوتا ہے اور پھوڑے کی طرح دُکھتی ہیں۔"

اُس نے اُس کی بلائیں لی اور خوش ہو گئی، "شکر ہے! تجھ پر بھی بھگوان کی کرپا ہوئی ہے!"

دُوسرے ہی دن امر کور نے جن علامتوں کی تصدیق کی تھی، اُن سے دست بردار ہو گئی۔ اُس کی ساس نے پُوچھا تو اُس نے مُنہ بنا کر کہا، "مجھے نہیں چاہیئے ایسا بچّہ! لوگ کیا کہیں گے؟ جو کام تیرے بیٹے کی کرپا سے ہونا تھا وہ بھگوان کی کرپا سے ہوا ہے۔"

وہ مجھ سے دو معنی پہیلیاں بجھواتی، جیسے

"ہلنا ہلونا ہل ٹھنڈ پونا، میرے لئی دیورا اِک ہلنا لیاؤنا۔ اُس کا نام ہلنا ہے۔ وہ ہلتا ہے تو خوشگوار لگتا ہے اور جی کی جلن بجھاتا ہے۔ میرے دیور! میرے لئے ایک ہلنا لے کر آؤ۔"

ایک بار اُس نے یہ پہیلی بجھوائی،

سگری رین چھتن پر راکھا، رنگ رس سب اُس کا چاکھا
بھور بھئی جب دیا اُتار، بوجھ سکھی کر سوچ وچار

میں اِن پہیلیوں کے جو معنی بوجھتا وہ اُنہیں غلط بتاتی۔ میں اُسے بُوجھنے کو کہتا تو وہ بہانہ کرتی، "میں تھکی ہوں میری ٹانگیں دبا تو بوجھوں گی۔"

وہ رنبھورو (وہ اِستری جس کی ٹانگیں کیلے کے تنے سمان ہوں) قسم کی نار تھی۔ وہ چاروں شانے چت لیٹ جاتی اور میں اُس کی ٹانگیں دباتا۔ وہ میری پکڑ میں نہ آتیں اور میں اُنہیں اُوپر اُوپر سے دابتا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے دبانے کو کہتی اور میں جتنا زور لگا سکتا، لگاتا۔ وہ گھگھانہ پہنتی تھی۔ شلوار کا آسن بدن سے چپک جاتا اور جھانگھوں کی تکون کو نمایاں کر دیتا۔ اُس پردہ دری سے گھبرا کر میں اپنے ہاتھ گھٹنوں سے کچھ ہی آگے لے جاتا۔ وہ 'اُوپر' اور 'اُوپر' کی رٹ لگاتی ہُوئی کراہتی۔ اُس کے چہرے کے بھید بھاؤ ایسے بدلتے جیسے وہ کرب و نشاط کے دونوں جذبوں سے ایک ساتھ گزر رہی ہو۔ میں پہیلیاں بھول کر اُس کے کراہنے کے سنگیت سے جھومتا ہُوا ٹانگیں دباتا رہتا جب تک کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر ہماری

محفل کو درہم برہم نہ کر دیتا۔

آسا سنگھ مانجھے بیٹھا۔ اُس کی بھابھیاں اُسے کنگنا باندھ کر اُبٹن ملنے لگیں اور ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں اُسے ستانے لگی اور طنز و مزاح کا نشانہ بنانے لگی لیکن امر کور کی بات ہی اور تھی۔

"دُلہا میاں! دُلہن لا رہے ہو۔ پاس مال بھی ہے؟" امر کور نے آسا سنگھ سے پُوچھا۔

"بالکل ہے!" آسا سنگھ اُسی بے حیائی سے بولا۔

"ذرا دکھاؤ!" امر کور نے اُس کے ناڑے پر جھٹکا دیا۔

"تجھے کیوں دِکھاؤں؛ جسے دِکھانا ہے اُسے ہی دِکھاؤں گا!"

آسا سنگھ نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اُس نے ناڑے کو گول گانٹھ دے رکھی تھی اور اطمینان سے پٹڑے پر بیٹھا تھا۔ یہ داؤ پیچ اُسے پیارا سنگھ نے بتایا تھا جس کے مانجھے پر اُس کی بھابھیوں نے اُس کا ناڑا کھول کر اُسے ننگا کر دیا تھا۔ مانجھا جاری تھا اور اُسی طرح ہنسی مذاق۔ آسا سنگھ، امر کور کی شلوار پر لپکا، وہ ہرنی سی کُود کر پیچھے ہٹ گئی لیکن اُسی وقت بے انت کور نے جلدی سے آسا سنگھ کے ناڑے پر چھُری چلا دی۔ اُس کا کچھا نیچے گرا جس پر کئی ہاتھ ایک ساتھ پڑے اور اُس کے ٹکڑے کر گئے۔ آسا سنگھ ننگا ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھ آگے رکھے اور دُوسرا پیچھے، وہاں سے بھاگا اور کمرے میں جا کر چھُپ گیا۔

ہماری بیری، دیوار کے اُوپر سے امر کور کے صحن تک پھیلی ہُوئی تھی۔ بیری پر کھچڑی آتی، شاخیں جھک کر دیوار سے جا لگتیں اور جب وہ پھلتیں زمین تک نیچی ہو جاتیں۔ امر کور چاہتی تو ہاتھ سے بیر توڑ کر کھا سکتی تھی۔ اونچے پکے بیر توڑنے کے لئے میں نے اُسے شہتوت کی لمبی چھڑی لا دی تھی لیکن وہ مُجھی سے بیر تڑوا کر کھاتی تھی۔ اُسے خُوش کرنے کے لئے میں کانٹوں سے اُلجھتا، اُس کی پسند کے بیر توڑتا، کُچھ کھاتا اور کُچھ اُس کے پلّو میں پھینکتا۔ کوئی واہ واہ لال سُوہا بیر ملتا تو میں اُسے ڈبکا ڈبکا کر کھاتا۔ وہ نیچے کھڑی دامن پھیلائے اِلتجا کرتی، "مجھے ایسا ہی بیر دو! میرے اچھے دیور! ایسا ہی بیر!"

میں ویسا ہی بیر توڑتا اور نشانہ بدل کر اُس کے سینے پر مارتا جو اُس کے مُنہ کی طرح گول مٹول اور لبریز تھا۔ بیر اُچھل کر دُور گرتا جسے ہم ایک دُوسرے کی کوتاہی ٹھہراتے۔ میرا نشانہ ٹھیک لگتا تو بیر چھاتی اور چولی کی درمیانی کھائی میں گم ہو جاتا۔ وہ مجھے ٹھینگا دِکھاتی، آگے جھکتی، بیر نکالتی، بیر کھاتی، خُوش ہوتی اور اُن لال لال بیروں کی طرف اِشارہ کرتی جو میری پہنچ سے باہر تھے۔

مجھے زن و مرد کے رِشتے کا صرف لفظی گیان تھا اور وہ بھی اُن بولیوں کی بدولت جن کو میں لاتعداد میں جانتا تھا۔ وہ بولیاں ہوائے نفس کی ڈھکی چھُپی تفسیر ہیں نہ کہ ننگی دھڑنگی تصویر۔ میں صرف ایک ہی نمُونے پر اِکتفا کرتا ہُوں۔

مُنڈیاں دی عید ہو گئی

بابے بیاہ مٹیار لیاندی

(جوانوں کی عید ہو گئی کیوں کہ بوڑھے نے جس سے شادی کی وہ جوان لڑکی تھی)

امر کور نہایت بے پروا واقع ہوئی تھی۔ وہ سویرے بستر سے اُٹھتی تو اکثر اُلٹی شلوار پہنے ہوتی۔ اُس کی چھت کی سیڑھی میری چھت کے قریب تھی۔ وہ میرے پاس سے گزرتی، میں شلوار کی طرف اِشارہ کرتا۔ وہ اُدھر دھیان نہ دیتی اور مجھ پر لپکتی۔ اگر میں پکڑا جاتا، وہ میرا کان مروڑتی اور مسکراہٹ روکتی ہوئی کہتی، "میں شلوار تو پہنتی ہوں، اُلٹی ہی سہی! تیری بیوی مستی سے ننگی گھوما کرے گی۔" وہ میرا کان نہ چھوڑتی جب تک کہ میں اُس کے پہونٹی کاٹ کر اُسے بے بس نہ کر دیتا۔

امر کور کو بولیاں سُننے کا شوق تھا۔ میں اُسے بولیاں سُناتا، اونچی آواز میں گاتا تو وہ مجھے آہستہ سُنانے کو کہتی۔ وہ کسی کسی بولی پہ بھڑک اُٹھتی۔ اُس کے گال، گلاں جھڑکے سے ہو جاتے اور اُن پر گڑھے گہرے ہو کر خوب ترکتے۔ وہ مجھے باہوں میں جکڑ لیتی اور پوچھتی، "یہ سب تو کس سے سیکھتا ہے؟"

"چرواہوں سے!" میں سیدھا سادا جواب دیتا۔

"تو اِن کا مطلب جانتا ہے؟" وہ میری آنکھوں میں گہرا جھانک کر پوچھتی۔

"جانتا ہوں!" میں وثوق سے کہتا۔

"نہیں، تجھے اِن کا مطلب معلوم نہیں! میرے بانکے، میرے شیلے!" وہ آپے سے باہر ہو کر میرا مُنہ چوم کر کہتی۔ میں پھر ہاں کہتا۔ وہ بے قابو ہو کر مجھ سے لپٹ جاتی اور ہنسی ہنسی میں میرا کاچھا ٹٹولتی اور وہاں کوئی حرکت نہ پا کر زور زور سے ہنستی۔

میں سلیٹ پر حساب کے سوال کر رہا تھا، امر کور میرے پاس آئی اور مجھ سے سلیٹ کا قلم لے کر بولی، "آج میں پڑھاتی ہوں تجھے!"

قلم ٹھوڑی پر رکھ کر وہ سوچنے لگی۔ پھر سلیٹ پر لکھتے ہوئے بولی، "میں نے کسی کو ستّر (۷۰) روپے دیئے اور ایک کام کرنے کو کہا، اُس نے روپے لے لیے لیکن کام نہ کیا۔ میں نے اٹھاسی (۸۸) اور دیئے لیکن اُس نے کہا کہ کم ہیں کچھ اور دو۔"

"وہ کام کیا تھا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"پہلے اِدھر دیکھ پھر بتاؤں گی!" اُس نے سلیٹ کی طرف اِشارہ کیا جہاں وہ ستّر اور اٹھاسی ہندسوں میں لکھ چکی تھی۔ اُس کے کہنے پر میں نے اُسے ایک چادر دی اور گیارہ روپے ساتھ دیئے۔ میرا نرم رویّہ دیکھ کر وہ اکڑ گیا اور زیادہ مانگنے لگا۔ میں نے خیال نہ کرتے ہوئے گیارہ میں پچپن (۵۵) اور مِلا دیئے۔ اُس نے میرے بھیج سُبھاؤ سے فائدہ
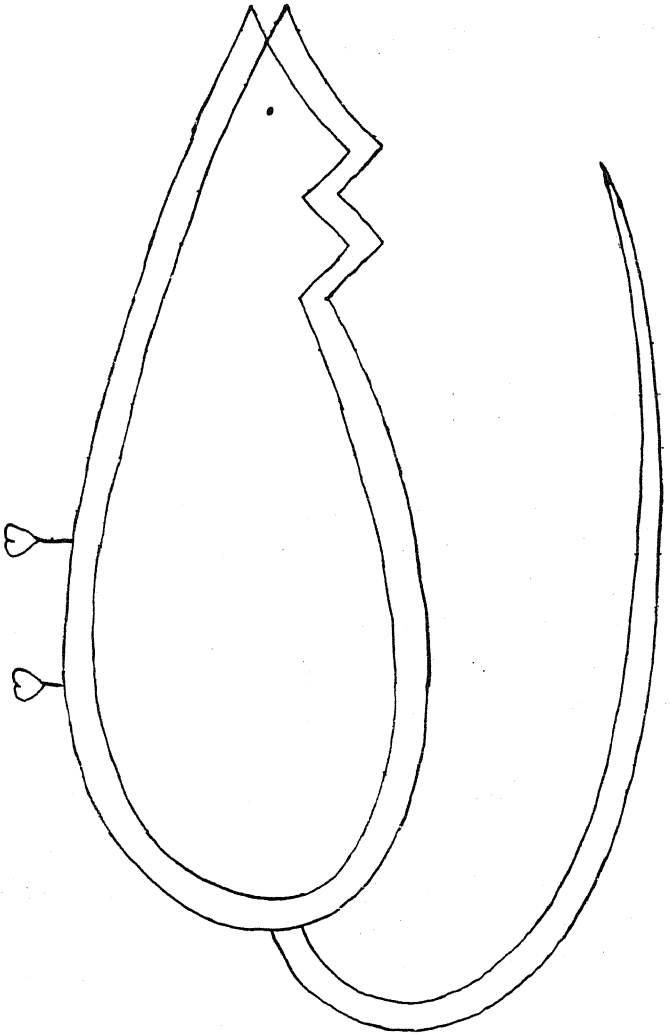
اُٹھایا اور اپنا مُطالبہ بڑھادیا۔ مجھے تاؤ ہی آگیا۔ اُس ٹیڑھے کو سیدھا کرنے کے لئے مَیں نے ایک بڑا سا بانس لیا اور اُس کے چُوتڑوں میں گھُسا دیا۔"

"یہ تو چُوہا ہے!" مَیں خُوشی سے چِلّایا۔

"اِسے تُو نے بُوجھ لیا ہے، اِسے بُوجھے گا تو جانوں گی!" اُس نے مجھے چنوتی دے کر کہا۔

اُس نے سلیٹ پر تھُوکا، اُسے رگڑ کر صاف کیا اور مجھ سے چھپاکر اُس پر کچھ بنانے لگی اور جب مجھے سلیٹ دِکھائی اُس پر آدمی کا خاکہ تھا، مَیں نے جھٹ بُوجھ لیا۔ اُس نے میری بات کو رَد کرتے ہُوئے کہا۔ "نہیں یہ عورت ہے!"

مَیں نے اُس کے ہاتھ سے سلیٹی لی اور خاکے کے سینے پر دو دائرے بناکر کہا "عورت یُوں ہوتی ہے!"

میرے ایسا کرتے ہی اَمرکور بے اِختیار چِلّائی "چاچی، گیان جوان ہوگیا ہے! مَیں اِس کے لئے رِشتہ لاتی ہُوں منظور ہے تو بول!"

اَمرکور کا چُلبلا رَویّہ مزیدار تھا۔ سورن کور کی شادی میں گیان سنگھ حوالدار مَلمل کا کُرتہ پہنے ہُوئے تھا، جس کے نیچے بِن آستین کی سفید بنیان صاف دِکھائی دے رہی تھی۔ گرمی میں ایسا لباس زیب دیتا ہے لیکن سردی میں اپنی سُبکی آپ ہے۔ کِسی نے اُسے اُڑایا، "اوہ! کیا گرمی ہے!"

"ہاں بھئی لُو چلتی ہے!" حوالدار نے اُسی ڈھٹائی سے بات بنائی۔

براتی کھانے کے لئے بیٹھے، اُس پر لڑکیوں کی نظر پڑی اور وُہ اُسے سِٹھنیاں دینے لگیں۔

آگ لگی گیان سنگھ دے

کوئی آوے اینوں بُجھاوے

(گیان سنگھ کے آگ لگی ہُوئی ہے، کوئی ہے جو اِسے بُجھا سکے)

اَمرکور بڑا پنکھا لے آئی اور اُسے جھلنے لگی۔ اُس کی یہ دِل لگی ہر کِسی کو پسند آئی۔ وُہ وہاں سے واپس ہُوئی تو دُولہے کا جُوتا اُٹھاکر لے گئی جسے اُس نے نیگ لے کر ہی لوٹایا۔

اَمرکور کے نہانے کے وقت مَیں گھر میں ہوتا تو وُہ مجھے پیٹھ مَلنے کے لئے بُلالیتی۔ وُہ غُسل خانے میں بیٹھ جاتی اور بیٹھی بیٹھی سارے کپڑے اُتار پھینکتی، چولی کی باری آتی تو پچھایا مجھی سے کھُلواتی۔ مَیں جُوں ہی گانٹھ کھولتا وُہ گھُٹنے اُٹھاکر سینے سے لگالیتی اور کیس آگے پھیلالیتی، مَیں اُن میں پانی ڈالتا اور وُہ اُن پر صابُن لگاتی۔ اُس کے کیس اِتنے بڑے تھے کہ پٹڑے پر بیٹھے ہونے کے باوُجُود زمین کو چھُوتے تھے۔ مَیں شرارت کرتا ہُوا اُس کی پیٹھ پر پانی گراتا اور وُہ اپنی جھُلبلاہٹ پر قابُو پاکر میری سرزنش کرتی، "نہانے دے، تُجھے ٹھیک کرتی ہُوں!"

"مَیں ٹھیک ہی ہُوں! تیرے ہِلنے سے ایسا ہُوا ہے۔" مَیں خُود کو حق بجانب ثابت کرتا اور پھر وہی شرارت

کرتا اور اُس سے جِھڑکی کھاتا۔ وہ مجھ پر پانی پھینکتی، مَیں کام بیچ میں چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتا اور آخر اِس سمجھوتے پر رُکتا کہ نہ وہ مجھ پر پانی ڈالے گی اور نہ میں اُس پر، لیکن یہ سمجھوتہ اُتنا ہی عارضی ہوتا جتنا لوٹے میں پانی بھرنے کا وقفہ۔ وہ کیس دھو کر جھٹکتی اور سینے پر پھیلا لیتی اور آسن سے آسن ملا کر بیٹھ جاتی۔ مَیں اُس کی پیٹھ پر صابن لگا کر جھانویں سے ملتا اور کن انکھیوں سے اُس کے ننگے سُتنوں کو دیکھتا جو ننگے ہو کر بھی ننگے نہ ہوتے۔ ایک بار مَیں نے اُس کی بغلوں میں گُدگُدی کر دی۔ وہ ہنسی سے بے دست و پا سی ہو گئی اور چت لیٹ گئی۔ مَیں دنگ رہ گیا! اُس کا بدن، بچے کی طرح بے مُو تھا۔

بُوٹوں کے موسم میں ہولے بھُونا کرتے تھے۔ اَمر کور کے آنے سے ہولے کھانے کے ساتھ ساتھ دل لگی کا سامان بھی پیدا ہو گیا۔ جب تک ہولے گرم رہتے، ہم ہولے کھاتے پھر ایک دُوسرے کے مُنہ پر کالک ملتے۔

وہ نرم و نازک احساسات اور ادھورے کھلنڈرے تجربات اُوپرے ہو کر رگوں تک گہرے اور خُون کی طرح گرم تھے۔ احساس، انسان کے اندرونی تضاد کو کم کرتا ہے۔ چوں کہ اندرونی تضاد ہر حرکت کا سرچشمہ ہے اِس لئے احساس سے جو نئی صُورتِ حال ظُہور میں آتی ہے وہ گُوناگونی میں یک رنگی ہے۔

تایا جی کے احساس کا تخیّل عملِ فطرت کی ترجمانی کرتا تھا۔ "دھرتی کو جڑ سے، جڑ کو تنے سے، تنے کو شاخوں سے، شاخوں کو پتّوں سے، پتّوں کو پھُولوں سے، پھُولوں کو بیجوں سے اور بیجوں کو دھرتی سے محبّت ہے اور یہی جنم مرن کے سلسلے کا راز ہے۔"

وہ حیوانات و نباتات کی نفسیات بیان کرتے تھے، حیوانوں اور پودوں کی نفسیات بچّوں کی طرح ہیں! جو انہیں پیار کرتے ہیں اور سہارا دیتے ہیں یہ اُسی کی طرف رُجوع ہوتے ہیں اور باہمی رفاقت میں زیادہ پھُولتے پھلتے ہیں۔ اپنی اِسی نفسیات کی بُنیاد پر یہ جنگلی زندگی تیاگ کر گھریلو زندگی کے قائل ہُوئے ہیں۔"

اُن کی اور ماں کی حیوان دوستی مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور پودوں کے بارے میں اُن کی دانائی آزمائی تھی۔ حویلی میں منڈوے پر گھیا کدّو کی بیل چڑھی ہُوئی تھی۔ اُس کی کچھ لانگریں (شاخیں) پھیلنے پھلنے کے جوش میں منڈوے سے بھٹک گئی تھیں۔ مَیں نے ساری لانگروں کا رُخ منڈوے کی طرف پھیر دیا اور ایک کو ویسے ہی رہنے دیا۔ مَیں نے دو ڈنڈے لئے، ایک لانگر کے قریب اور دُوسرا اُس سے کچھ دُور گاڑ دیا۔ حالاں کہ لانگر کا مُنہ دُور کے ڈنڈے کی طرف تھا وہ رات کی رات میں قریب کے ڈنڈے کی طرف مُڑ گئی۔ اُس کے سُوت مضبُوطی سے ڈنڈے سے لپٹ گئے جیسے خطرے میں بچّہ، ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ بیل کی یہ نفسیات جان کر میں اُس سے کھیلتا، جدھر لانگر کا رُخ ہوتا اُس کے دُوسری طرف ڈنڈا گاڑ دیتا، وہ ادھر پلٹتی تو ڈنڈے کی جگہ بدل دیتا۔ مَیں اُس کا مطلوب سہارا دُور ہٹا دیتا تو وہ بے بسی سے زمین پر ڈھے پڑتی۔

رمضان کے باغیچے میں شہتوت کا پیڑ تھا جس کے پھل پک کر سیاہ ہو جاتے تھے اور رس ٹپکاتے جان پڑتے تھے۔ میں شہتوت دیکھ کر بیتاب ہو جاتا لیکن کچھ نہ کر سکتا۔ میں نے شہتوت چرانے کا منصوبہ بنایا اور سکول سے گھر آتے ہوئے آب جو میں اپنے ساتھیوں سے جنگل جانے کے بہانے الگ ہو گیا۔ احمد کے کیار کے گرد بن سوٹی (جنگلی پودا ہے جسے کھیتوں کی باڑ کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اسے چار پتی والے بنگلے کے پروں جیسے سفید پھول لگتے ہیں۔ پتیوں کے نیچے سوت بھر موٹا اور اپنج بھر لمبا ساق ہوتا ہے جسے چوسنے سے مدھو نکلتا ہے) کے پھول دعوتِ شہد دے رہے تھے۔ میں رک گیا اور پھول توڑ کر چوسنے لگا۔ جسے چوستا اس میں سے شہد کی بوچھن ہی ملتی۔ میں نے بن سوٹی کے اندر جھانک کر کچھ پھول توڑ کر چوسے۔ ان میں سے ایک پھول سے گھونٹ بھر شہد ملا اور منہ حلق تک میٹھا ہو گیا۔ میں نے ویسا ہی ایک اور پھول ڈھونڈنے کا قصد کیا لیکن ناکام رہا۔ اس ناکامی کا ردِ عمل! میں رمضان کے باغیچے کی طرف چلا تو میرا شہتوت چرانے کا ارادہ پہلے سے زیادہ پکا تھا۔

باغیچے کی گھنی باڑ میں سے اندر جانا ممکن نہ تھا۔ میں شہتوت چرانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ میں نے باڑ کو دھکا دے کر دیکھا، وہ بیروں میں گلی ہوئی تھی۔ تختی کی دو تین ضربوں نے اوپر کی باڑ اوپر اور نیچے کی باڑ نیچے کر دی۔ میں نے رخنے میں تختی گھسا کر ڈھینگروں (سوکھی شاخوں) کو اوپر اٹھایا اور رینگ کر اندر گھسنے کے لئے راستہ بنایا۔ میں شہتوت پر چڑھ کر شہتوت کھانے لگا اور ساتھ ساتھ جیب بھی بھرنے لگا۔ میں اپنی موج میں بھول گیا کہ میں چوری کر رہا ہوں اور مجھے جلدی بھاگنا ہے۔

"اوپر کون ہے؟" ایک نسوانی آواز آئی۔

چور کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں! میں شہتوت پر سے جلدی جلدی اترنے لگا۔ کھائی میں پیر رکھ کر میں نیچے چھلانگ لگا رہا تھا کہ جینا نے مجھے باہوں میں دبوچ لیا اور پٹاک سے میرا چما لے کر بولی، "ہائے! کیا پھول سا چہرہ ہے!" مجھے سینے سے دبائے ہوئے وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ میں نے اسے دیکھا لیکن اس کی بیباکی کی تاب نہ لا سکا۔ میں ان آنکھوں کو پہچانتا تھا۔ میں نے انہیں باڑ کے اوپر سے جھانکتے اور مسکراتے دیکھا تھا اور خاموشی سے بات کرتے سنا تھا۔ کئی بار چاہا تھا کہ میں ان کے پاس جاؤں اور انہیں قریب سے دیکھوں لیکن ایسا نہ کر سکا تھا۔ اب وہ میرے سامنے تھیں لیکن میں ان سے آنکھیں چرا رہا تھا۔ شہتوت جسموں کی ند میں آ کر مسلے گئے۔ اسے گیلا لگا ہوگا، اس نے باہوں کی زنجیر کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ میرے دل میں کمزور سا خیال آیا کہ میں بھاگ جاؤں لیکن جینا کے نرم رویے نے میرے کمزور خیال کو کمزور تر بنا دیا۔ وہ رس کے کرتے پر گہرا دھبا دیکھ کر وہ اس کے ہونے کا راز جاننے کی کوشش کرنے لگی، جان نہ سکی تو میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری جیب سیاہ رس سے ٹپکتی تھی اور میری شرارت کا اعلان کرتی تھی۔ مصنوعی ناراضی دکھاتے ہوئے اس نے میری جیب سے مسلے ہوئے شہتوت نکال کر پھینکے، رس رنگے ہاتھ سے میرے

نرم نرم طمانچے لگائے اور پھر چٹک کر میرے گال چوم لئے۔

تُو تو جگّا ہے! اُس کی بے ساختگی سے ظاہر تھا کہ اُسے میرا نام اچانک یاد آیا ہے۔ میں حیران ہُوا کہ اُسے میرا نام کیسے معلوم تھا؟ اُس نے اپنے بازوؤں کو میرے کاندھوں پر رکھا اور اپنے بوجھ تلے وہیں گھاس پر بٹھایا۔

"تو چور بھی ہے؟" اُس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

اُس بہتان سے گھبرا کر اور کچھ شرما کر میں نے آنکھیں جھکالیں۔ اُس نے جھک کر میری آنکھوں میں دیکھا، دیکھ نہ سکی تو میری ٹھوڈی میں ہاتھ دے کر میرے مُنہ کو اُوپر اُٹھایا۔

"بولو، چُپ کیوں ہو چور جی؟" اُس نے 'جی' پر زور دیا۔

"میں چور نہیں ہُوں!" میں نے آنکھیں اُٹھائیں لیکن اپنی بات کہہ کر پھر جھکالیں۔

واہ! تُو چور نہیں تو اور کیا ہے؟ سامنے دیکھ کر بات کر! چور نہیں تو بھاگ کیوں رہا تھا؟" وہ میرے گال پر چٹکی بھر کر بولی۔ وہ سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہُوئے بات کرتی لیکن اُس کی شوخی اُسے بے نقاب کر دیتی۔ میں اُس سے آنکھیں نہ مِلا پا رہا تھا۔ یہ میرا ڈر نہ تھا، اُس کی تیز نگاہی کا اثر تھا جو میری شرم کے حصار کو اور مضبوط بنا رہا تھا۔

"تُو چور نہ ہوتا تو باڑ نہ توڑتا، سامنے کے دروازے سے آتا اور پُوچھ کر شہتوت کھاتا؟"

اُس نے مجھ پر الزام لگایا۔

"غلطی ہوگئی!"

میں نے بلا تامّل اپنا قصور مان لیا۔ کسی طرح مجھے تسلّی ہوگئی تھی کہ وہ میری شکایت نہیں کرے گی۔

"تجھے اس کی سزا ملے گی، بول ٹھیک ہے؟"

اُس کے طرزِ کلام سے ظاہر تھا کہ وہ فقط دِل لگی کے لئے مجھ سے پُوچھ رہی ہے ورنہ اُسے جو سزا مجھے دینی ہے، وہ اُس کے بارے میں ٹھان چکی ہے۔ میں نے خاموشی سے سر ہلایا۔ اُس نے مجھے کھینچ کر آغوش میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر گاڑ دیئے اور شدّتِ جذبات سے کانپنے لگی۔

میں نے جس طرح کی تقصیر پر ہمیشہ سزا پائی تھی، جینا اُسے سراہتی تھی۔ وہ میرے باڑ توڑنے اور اُس کے نیچے سے رینگ کر اندر آنے میں جرأت اور نُدرت دیکھتی تھی۔ وہ میرے کیسوں میں اُنگلیاں ڈال کر سہلانے لگی۔ اور ان کی ملائمیت پر اِٹھلانے لگی جیسے وہ اُس کے اپنے ہوں۔ وہ اپنے فندق لگے ہاتھوں سے میرے گالوں اور ہونٹوں کو مسل کر کہتی، "میں چاہُوں تو اِن میں سے خُون نچوڑ لوں لیکن مجھے اِس پیارے چور پر ترس آتا ہے۔"

جینا اور میں نے مل کر باڑ کی مرمّت کی، جب میں گھر روانہ ہُوا تو میرا کھیسا تازہ شہتوتوں سے بھرا ہُوا

تھا۔ کہاں مَیں شہتوتوں کو ترسا کرتا تھا اور کہاں مَیں پورے باغیچے پر قابض تھا۔ جینا میری دِل جوئی کرتی نہ تھکتی اور میری اُس میں بے قرار رہتی۔ مجھے دیر ہو جاتی تو وُہ مجھے چمّوں کی سزا دیتی جو کبھی ختم نہ ہوتی۔ وُہ اپنی بے صبری میں میرے گال پر کاٹ لیتی۔ مَیں مزید چمّے دینے سے اِنکار کرتا، وُہ مجھ پر اِلزام لگاتی، "تو نے ٹھیک سے چمّے نہیں دیئے، پھر سے دے۔"

"مَیں نہیں دیتا، تُو گال کاٹتی ہے۔"

مَیں اِحتجاج کرتا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی، اَب آہستہ اور اِحتیاط سے لُوں گی۔"

وُہ اپنی غلطی کا اِعتراف کر کے مجھے ترغیب دیتی۔

اُس کا چُومنا چاٹنا مجھے اچھا لگتا، خاص کر زبان کا چُوسنا۔ اُس سے مجھے جو تسکینِ دہن ملتی اُس کی لذّت انگوٹھا چُوسنے کی سی تھی۔ اُس کا گال کاٹنا مجھے ناپسند تھا۔ جب وُہ ایسا کرتی، مَیں بھاگ جاتا لیکن ایسے بھاگتا کہ وُہ مجھے آسانی سے پکڑ سکے۔ وُہ میرا چہرہ، اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے آیئنے کی طرح دیکھتی اور دیکھتی دیکھتی کھوسی جاتی، لگتا کہ وُہ اپنے خیالوں کے ساتھ دُور نِکل گئی ہے۔ وُہ میرے ساتھ کھیلنے کے نِت نئے طریقے سوچتی، میرے جھُوٹے شہتوت کھاتی اور اپنے جھُوٹے مجھے کھلاتی۔ ہم اِس کھیل میں ایک دُوسرے کی اُنگلی پر کاٹتے۔ مَیں کتنی ہی نرمی سے کاٹتا لیکن وُہ دَرد سے بلبلا کر ہاتھ جھٹکتی، مجھے لپٹتی، پیٹتی پیٹتی چُومنے لگتی اور مدہوش ہو جاتی۔ مَیں خُود بھی جھُولتا ہُوا محسُوس کرتا۔ اُس کے اَعضا پہلے سے زیادہ دِل آفریں، متین اور حسین لگتے۔ میرے اَندر کچھ انوکھے اور اَن سمجھے جذبات جاگ پڑتے، مَیں چاہتا کہ وُہ مجھے یُوں ہی توڑتی اور مروڑتی اور چُومتی رہے۔ مَیں اُسے دِلی آرزُو نہ بتاتا اور نہ ہی کسی بات میں پہل کرتا لیکن میری سپُردگی مکمّل ہوتی۔ وُہ مجھے جھوڑ جھوڑ کر چُومتی چُوستی، اُن بوسوں کی نرمی اور گرمی اور ہی ہوتی۔ اُن نازک لمحوں میں اُس کی مستانی آنکھوں سے لگتا کہ وُہ جسمانی طور پر میرے ساتھ ہے لیکن رُوحانی طور پر کہیں دُور۔ وُہ میری ٹانگوں کو اپنی جانگھوں میں دبا کر مجھے قریب سے قریب کھینچتی، اپنے اُوپر نیچے روندتی، بے قراری کی اِنتہا کو پہنچ کر کراہتی اور بے دست و پا لیٹ جاتی۔ اُس وقت مجھے لگتا کہ مَیں پگھلتا جم گیا ہُوں۔

مَیں اپنے گھر جانے لگتا۔ وُہ باہر کے دروازے تک میرے ساتھ آتی اور خُدا حافظ! خُدا حافظ! کہتی نہ تھکتی جیسے مجھے شیطان اُٹھا کر لے جانے والا تھا۔ اُس کے حُسنِ بیان کا ایک نادر پہلُو تو مَیں بھُول ہی گیا تھا، خُوب وقت پر یاد آیا ہے! اُس نے ایک مِصرع اِیجاد کیا تھا جو پنجابی ثقافت میں اِضافہ ہے۔ مَیں رُخصت ہوتے ہُوئے کہتا کہ مَیں جا رہا ہُوں تو وُہ میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور غُصّے سے کہتی، "جانا بدشگونی ہے! کہہ کہ مَیں آ رہا ہُوں۔"

مَیں جاتا ہُوں، مَیں جا رہا ہُوں، میری زبان پر اِس قدر چڑھا ہُوا تھا کہ مَیں بار بار غلطی کرتا اور سزا پاتا۔

یہ بالکل دوسری بات ہے کہ وہ سزا میری پسند تھی۔ جینا کے انداز اظہار کی جادو اثری اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ تھی۔ یہ سطور لکھ کر میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنی پیاری جینا کے پاس گیا تو تھا لیکن لوٹ کر نہیں آیا۔

اُس کے جذبات کی تازگی میرے احساس کی نازکی تھی اور باتوں کی نرمی، آسودہ خاطری۔ اُس کی بے اختیاری میری دل داری تھی اور رواداری میری خیال سازی، جس کی طرفگی اُس غریب بچے کے جذبات کی سی تھی، جس نے پہلی بار نئے کپڑے پہنے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کو دکھانا چاہتا ہے، ہر کسی کی نگاہ کا مرکز بننا چاہتا ہے، لیکن اُس کی تقدیر لالۂ صحرا کی سی ہوتی ہے۔

اُس باغیچے سے کچھ دور آب جُو بہتی تھی۔ اُدھر کی ہوا سحر طراز ہوتی تھی۔ ہرے بھرے سبزے اور سائے میں ریشمی بچھونے کا سا آرام تھا، جس پر بیٹھنے سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُس خوبصورت ماحول کی گرفت میں وہ پرواز تھی جو ارضی جذبوں کو آسمانی تصور عطا کرتی ہے۔ اُس حسنِ گناہ میں ایک بے گناہی تھی۔ اُس کی بغاوت میں اطاعت اور شرارت میں موافقت تھی۔ وہ مروّت ایسی تحریک تھی جو روحِ تخلیق کو جنم دے کر اُسے جوہرِ رگ جاں بناتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسا ہی مناسب وقت ہوگا جب کسی نے اپنے ایسے جذبے کے لئے محبت کا لفظ ایجاد کیا تھا۔

میری دوست ہر ملاقات پر نئی راس رچاتی اور مجھے نئے نئے طریقے سے لبھاتی۔ وہ گل بیاں (گلے میں باہیں) ڈال کر مجھے بادام کھلاتی۔ بادام کڑوا ہوتا تو میں منہ بنا کر اُس کی کڑواہٹ تھوکتا۔ میری دل آزاری اُس کی دل آزاری ہوتی اور میری بدمزگی اُس کی بدمزگی۔ وہ ہائے ربا، ہائے ربا' کرتی ہوئی اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی اور میری زبان کی ساری تلخی چوس کر اُس میں شیرینی بھر دیتی۔ اُس کا یہ طرزِ عمل اس قدر لذت آفریں ہوتا کہ دیر تک بادام کڑوا نہ نکلتا تو میں جھوٹ موٹ ہی اُس کے کڑوا ہونے کی شکایت کر اُٹھتا۔ وہ میری جیتی جاگتی اور ہنستی بولتی ملکیت تھی اور میں اُس کا مالک۔ وہ میری خواہش پر نیچے سے اُچھل کر شہتوت، زرد آلو، جامن ...... وغیرہ توڑتی۔ ٹہنی اُس کے ہاتھ نہ لگتی، میں خوش ہوتا اور تالی بجا کر اُسے اُکساتا۔ وہ نئے خروش میں زور سے اور زور سے اچھلتی۔ اُس کی اوڑھنی سرکتی، ڈھلکتی زمین پر گر جاتی۔ وہ اُس سے بے پروا رہتی اور اپنی کوشش جاری رکھتی۔ میں اوڑھنی اُٹھا لیتا اور تھوڑا اور، بس ذرا سا اور، اُسے شہ دیتا۔ وہ اُبھر کر لہراتی اور لہرا کر سمٹتی۔ اُس کے سینے کا اُبھار غٹر غوں کبوتر کے حُسن کا منظر پیش کرتا۔ میں حسبِ حال بولی سناتا۔

نی جنگلی کبوتر نے
تیری ہِک تے آھلنا پایا

(او گوری، تو جانتی ہے کہ تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے گھونسلا بنا لیا ہے)

میری شوخی سے ترنگ پا کر وہ مجھ پر لپکتی۔ میں بھاگ اُٹھتا، وہ میرا پیچھا کرتی۔ میں اِس درخت کے

گرد اور کبھی اُس کیاری کے اطراف دوڑتا ہُوا اُسے تھکا دیتا۔ اُس کی سانس پھول جاتی اور وہ اپنی پھڑپھڑاتی چھاتی کو تھام کر گر سی پڑتی اور مجھ سے رُوٹھ جاتی۔ اُس لپکتے، لہکتے، تھرکتے تال کا رکنا مجھے اچھا نہ لگتا۔ میں اُسے منانے اور از سرِ نو چہل کرنے پر اُکسانے کے لئے اُس کے پاس جاتا۔ اوڑھنی جھٹک کر اُس کے سر پر پھیلاتا اور جھانکتا۔ وہ میری شرارت سے تحریک پاتی اور مجھے اوڑھنی میں سمیٹ لیتی۔ اُس کی سانس اُکھڑی اُکھڑی اور دھڑکن تیز تیز ہوتی اور چہرہ سُلگتا ہُوا۔ وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ میری سپردگی اُس کی گرمی کو سرشاری میں بدل دیتی، جس میں اُس کی بے قراری کا قرار مضمر تھا۔ اُس کی قربت میں وقت کا احساس نہ رہتا۔ میں اُس سے بچھڑ کر گھر جانے لگتا۔ میں محسوس کرتا کہ میں ابھی آیا ہوں اور ابھی جا رہا ہوں۔

ایک دن میں گھر سے دُور ہی تھا کہ مجھے بھائیا جی کی گھن گرج سُنائی دی۔ مجھے جاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ مجھ پر خفا ہو رہے ہیں۔ میں تھوڑا آگے بڑھا اور دیکھا، وہ دہلیز پر کھڑے، آدھا دروازہ روکے، باہر تاک رہے تھے۔ جیسے میرا انت دیکھ رہے ہوں۔ اُن کی نظر، تانی ہُوئی برچھی کی طرح گلی کے آغاز تک کھچی ہُوئی تھی۔ میں وہاں قدم رکھتے ہی چھید اگیا۔ اپنے انجام سے گھبرا کر میں نے اُلٹا پھرنا چاہا لیکن اُن کی نظر کی پَر مکڑی کے جالے کی سی تھی میں لوٹتا اور پھر لُکتا ہُوا آگے بڑھتا رہا اور آخرکار اُس تک پہنچ گیا۔ وہ مقام سب سے دُشوار گُزار تھا، میں نے بھاگ کر پار کرنا چاہا۔

جیسے بھگدڑ کی بُنیاد ہجوم کی بے اختیاری میں ہے ویسے ہی بھائیا جی کے مزاج میں بے ساختگی تھی۔ اُنھوں نے اڑنگا مارا اور مجھے اوندھے مُنہ گرا دیا۔ میری ٹھوڑی پچک گئی اور دانتوں نے زبان کاٹ لی۔ جسمانی ٹیس تھی نہ تھی کہ میری رُوح کو ایذا پہنچی۔ "حرام خور! تُو کہاں مرا ہُوا تھا؟"

"میرے پیٹ میں درد تھا، راہ میں ہگاس لگ گئی تھی۔" میں نے گڑگڑایا جھوٹ بولا۔ اُن کے سوال کا ایک دم جواب نہ دینا کسی دُوسری مصیبت کو مول لینا تھا۔

"تجھے معلوم ہے کہ کھیتوں سے چارہ لانا ہے۔ تُو اب وہاں جائے گا تو 'میرا یہ' کاٹ کر لائے گا۔" اُنھوں نے کاچھے کے پائنچے میں سے نِکال کر کہا۔

میری ماں اور بہن پاس ہی کھڑی تھیں۔ اُن کی بدتمیزی سے گھبرا کر انھوں نے مُنہ پھیر لیا اور اندر چلی گئیں میرے بھائیا جی کا مُنہ گندگی کا اُبلتا ہُوا گڑھا تھا جس کے پاس سانس لینا رگِ جاں کو مجروح کرنا ہے۔

کُتے کو بھی ضبطِ نفس سے تعلّق ہے۔ کمزور کُتا طاقت ور کے سامنے دُم دبا کر لیٹ جاتا ہے تو وہ اُسے مغلوب جان کر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن میری مغلوبی بھائیا جی کی درندگی کو نوالہ دیتی تھی۔ اُن کی آنکھوں کے گوشے سمٹ کر حملہ آور عقاب کی ٹکٹکی بن جاتے اور ہاتھ پھیل کر آہنی پنجے۔ وہ مجھے گلے سے پکڑ کر اُٹھاتے، دیوار سے ٹکراتے اور مرنے

کے لئے چھوڑ دیتے۔ میرے جسم میں کوئی خاص جاں ساز عنصر تھا جو مجھے مرنے نہ دیتا تھا۔

اِس سے پہلے کہ اُن کے خوفناک ہاتھ اپنے آزمائے ہُوئے عمل کو دوہراتے، مَیں اپنے دَرد سے لڑتا ہُوا اُٹھا۔ درانتی اور جیوڑا اُٹھا کر کھیتوں کو بھاگا۔ مَیں بھاگتا جا رہا تھا، بھائیا جی کی گالیوں کی آواز میرا تعاقب ایسے کر رہی تھی جیسے وُہ خُود میرا پیچھا کر رہے ہوں۔ مَیں اُن سے بچنے کے لئے تیزی سے اَور تیزی سے بھاگ رہا تھا، بھاگتا جا رہا تھا۔ میرے اَور اُن کے دَرمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا لیکن اُن کی خوفناک آواز کی شِدّت وُہی تھی جو قریب سے تھی۔ مَیں اِس وقت لاکھوں کروڑوں دھڑکنوں کے طویل سفر میں اُس جان لیوا ماحول سے کئی جُگوں کی دُوری پر ہُوں لیکن اُس کے دَرمیان کھڑا ہُوں۔ میرا دِل وُہ آتش کدہ ہَے جو میری مَظلوم یادوں کے ایندھن سے جلتا ہَے۔ مَیں وُہ سب کُچھ بُھول جانا چاہتا ہُوں لیکن مجبُور ہُوں۔ کاش! میرا حافظہ غارت ہو جاتا!! میرا باپ گندگی کا ایسا گڑھا ہَے، جس میں وقت کا دھارا، بدرو کی طرح بہتا ہَے۔ گزرتے ہُوئے ماہ و سال نے اُس کی بے ہُودگی اَور بڑھا دی ہَے۔ کُچھ عرصہ قبل، مَیں دس سال کی طویل مُدّت کے بعد گاؤں گیا۔ کیوں؟ وہاں میری جڑیں ہیں! یہ جڑیں رِشتوں کی طرح اِنسان کی آزادی، دانش وَری، وسیع النظری پر تہمت ہیں کیوں کہ اِس کی بالیدگی کو روکتی ہیں۔ لیکن مَیں اِنہیں کاٹ نہیں پایا ہُوں۔ مجھے قیام کئے دس دن نہ ہُوئے تھے کہ وُہی ہُوا جو اُس گھر میں ہوتا آیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب اِنسان سوتا ہَے اَور شیطان جاگتا ہَے، میری بیوی سُریندر نے کسی شور کی بِھنک سُنی۔ مَیں گہری نیند سو رہا تھا، مجھے خبر نہ ہُوئی۔ اُس نے تشویش بھرے لہجے سے مجھے جگایا۔ کِسی انجانے خطرے کا خیال کرتے ہُوئے مَیں نے مُنڈا سا باندھا، کونے میں رکھا ہُوا لکھ اُٹھایا اَور دَروازے سے آہٹ لے کر کُنڈا کھولا۔ مَیں برآمدے کے اندھیرے میں جھانکتا اَور کھٹکا محسُوس کرتا ہُوا آگے بڑھا اَور دبے پاؤں بھائیا جی کی خواب گاہ کے باہر پہنچا لیکن وہاں اندر اُجالا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ مَیں نے کواڑ کی دراڑ میں سے دیکھا۔ ماں گُم سُم بستر پر بیٹھی تھی اَور بھائیا جی بپھرے ہُوئے سانڈ کی طرح اِدھر سے اُدھر اَور اُدھر سے اِدھر گھوم رہے تھے۔ اچانک وُہ پاؤں پٹخنے کے سے انداز میں چلنے لگے اَور آ کر دَروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دُہی جانیں کہ اُنہیں کیسے خبر ہُوئی کہ مَیں دَروازے سے لگا کھڑا ہُوں! اُنہوں نے فوراً جست لگا کر دَروازہ کھول دیا۔ مَیں نے سنبھلنے کا جتن کیا لیکن سنبھل نہ سکا اَور مَیں لڑھک کر اُن کے آگے گر پڑا جیسے کوئی مُجرم مُنصِف کے پاؤں پڑ کر رَحم و کرم کی بِھیک مانگے۔ اُنہوں نے مجھے ٹھوکر مار کر کہا، "تُو افسر ہوگا تو اپنے گھر ہوگا! یہ گھر میرا ہَے، میرا!" اُنہوں نے چھاتی پر ہاتھ مار کر مجھے میری ماں کی گالی دی اَور زمین پر پاؤں مارا "اِس گھر میں تُو کون ہوتا ہَے؟"

اُنہوں نے میری ماں کے مقدّس اعضا کا نام اِس ناپاک انداز سے لیا کہ وُہ مجھے عشق بازی کا اڈّہ لگے اَور میری ماں، رنڈی۔ اپنی اَصل کا ارذل ماخذ جان کر مَیں خُود مذمّتی غصّے سے بھڑکا اَور آدمی کی قدیم حیوانی جبلّت کے

زیرِ اثر لپک کر اُٹھا لیکن اپنے دُشمن کا سامنا کرتے ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ آپنے اُس نامرد ردِ عمل پر مَیں غور کرتا ہُوں۔ وُہ کون سا امتناعی جذبہ تھا، جس نے میری پیش قدمی کو روکا تھا؟

میرے قارئین! وُہ کوئی جذبہ نہیں ہے، میرا خوف ہے۔ مَیں قتل کر کے قانُون کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا ہُوں اور نہ مفرُور ہونے کا۔ تشدّد کا حاصل دو طرفہ ہے۔ یہ بیک وقت آزادی اور غُلامی کا پیش کار ہے۔

میری بُزدلی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُنہوں نے حُکم دیا، "دفع ہو جا یہاں سے! وُہ رہا تیرا سامان۔" اُنہوں نے باہر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو چوپٹ کُھلا پڑا تھا اور مجھے بُلا رہا تھا۔ آپنے کمرے کی طرف واپس جاتے دیکھ کر اُنہوں نے مجھے اپنی ازلی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہا، "اُدھر کدھر جا رہا ہے؟ راستہ اِدھر ہے۔"

"سُنو جی! رات کا...." میری ماں نے میری حمایت میں بس اتنا ہی کہا تھا کہ وُہ اُس غریب پر برس پڑے، "کُتیا تو چُپ بیٹھ! میری بات میں ٹانگ اڑائے گی تو توڑ کر رکھ دُوں گا!"

قارئین! مَیں پیدائشی بے ہمّت اور بے غیرت ہُوں، مَیں گھر سے نہ نکلا۔ اُس حادثے کی وحشت انگیزی! مَیں اِس قدر شکستہ اور کمزور تھا کہ میرے کمرے کا چند قدم کا فاصلہ میرے لئے ہزاروں میل کی مسافت بن گیا۔ میری لرزاں ٹانگیں میرا ملعُون بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ مَیں نے کواڑ کا آسرا لے کر سُریندر کو دیکھا۔ وُہ میری طرف پہلو بدل کر اپنے ساتھ لیٹی ہُوئی ننھی سی جان، پُونم کو تھپک رہی تھی جو اپنے نازک ہاتھوں سے اُسے تھامے ہُوئے تھی، جیسے دُنیا کے ہنگامے میں اُس کے گم ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اُف! افسوس!! مَیں سکون و تحفّظ کے احساس ہی سے محرُوم رہا جو بچّوں کا پیدائشی حق ہوتا ہے۔

میرے بال پن میں میری ماں مجھے میرے ظالم باپ کے جبر و تشدّد اور جور و جفا سے نہ بچاتی تو مَیں بے موت ہی مارا جاتا۔ جب وُہ مجھے دیوانہ وار پیٹتے، میری ماں اپنے کسی ناخوشگوار احساس کی طرفداری کرتی ہُوئی ہمارے درمیان کھڑی ہو جاتی۔ چوٹ اُسے لگتی لیکن چیختا مَیں۔ بھائیا جی پینترا بدل کر مجھ پر لپکتے۔ ماں میرے اطراف ڈھال کی طرح پھیل جاتی اور میری مظلُومیت کو دلاسا دیتی۔ مار جتنی زور سے پڑتی، وُہ اُتنے ہی زور سے مجھے آغوش میں سمیٹتی جیسے ویسا کرنے سے وار کی چوٹ بے اثر ہوتی ہو۔

اُس ڈراؤنی رات میرا سامان باہر اوس میں بھیگتا رہا اور مَیں بھیتر آنسوؤں میں۔ مَیں سویرے حیدر آباد روانہ ہُوا تو میری بے گھری کا احساس شدید تھا۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ میرا اپنا گھر ہونا چاہیے تا کہ مَیں وہاں جیسے چاہُوں گزر بسر کر سکُوں۔

ہمارے گاؤں میں باپ سے بیٹے اور بھائیوں سے بھائی الگ رہتے تھے۔ مَیں اُنہیں کم ظرف سمجھتا تھا کیوں کہ مَیں رشتوں کے طلسم میں اسیر تھا۔ بُوٹا سنگھ کے تین لڑکے تھے لیکن وہ اپنی پکاتا تھا، اپنی کھاتا تھا اور طعن کرتا تھا

"اپنا گھر، گھر ہوتا ہے اور پرایا گھر، قبر! جو صرف مُردے کو اماں دے سکتی ہے۔"

تایا جی رِشتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے، "رِشتے تبھی پنپتے ہیں جب اِنسان ست بھاؤ کا ارتھ سمجھے اور اُس پر عمل کرے۔ اِنسان کے مِزاج کی گُوناگونی کا تقاضا ہے کہ جیسے ہُنرور اپنے ہُنر پر نظرِ ثانی کرتا ہے، ہر اِنسان کو چاہیئے کہ وُہ اپنے رویّے پر مُکرّر غور کرے۔ جو کوئی اپنے اِس جذبے کو تازہ رکھتا ہے، وُہی وقت پر اِصلاح کُن قدم اُٹھاتا ہے۔"

مَیں نے رِشتوں کو کئی طریقوں سے سمجھا ہے اور اُن سے سمجھوتا کیا ہے۔ رُوحانی پیشواؤں نے دُنیاوی مسئلوں کا حل جیسے نِکالا ہے وُہ قابلِ ذکر ہے۔ 'خُدا، ماں باپ ہے اور ہم اُس کے بچّے۔ اُسی کی کرپا سے زِندگی میں سُکھ ہیں، ورنہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے۔'

کیا یہ فراست، زِندگی کی کسی مُشکل کو حل کرتی ہے؟ کیا یہ سماجی ذِمّہ داری سے فرار نہیں ہے؟

ممکن ہے، آپ قارئین اِسے ناپسند کریں کہ مَیں اپنی زِندگی کے ایک واقعے میں دُوسرے خیالات گھسیٹ رہا ہُوں۔ یہ ضروری ہے! زِندگی اِتنی بے پناہ، کثیر الوقوع، پُر اِفراط، نِزاعی اِنسان ہے کہ ایک سانس اور دُوسرے سانس میں آغاز و انجام کا مُعاملہ ہے۔ اِس کا سِلسلہ وار بیان مُشکل ہے بلکہ نامُمکن ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کچھ نہ کچھ قصُور میرا بھی ہوگا جو مَیں بے وقت معتُوب ہُوا۔ ہاں جناب! مَیں قصُوروار تھا اور ناقابلِ مُعافی مجرم! میرے کیے کی سزا مُجھے مِلنی ہی چاہیئے تھی۔ اُن کی غیر حاضری میں، مَیں نے مچھلیاں پکڑنے والا جال، ناتھی رام کو اُدھار دے دیا۔ اُس بدذات نے مچھلیاں پکڑ کر گیلا جال، بوری میں بند کر کے واپس کیا اور میری کوتاہی کہ مَیں نے دِھیان نہ دیا۔ بھایا جی گھر میں نہ تھے، وُہ رات گئے گھر آئے اور مچھلی کی بُو پا کر کھوجی کُتّے کی طرح سُونگھتے سُونگھتے جال تک پہنچ گئے۔

میرے بھایا جی کے مِزاج کی خصُوصیّت ہے کہ وُہ کاہلی اور غفلت شعاری پسند نہیں کرتے۔ اُن کا اپنا قانُون ہے کہ ہر کام دھڑاکے سے ہو اور فوراً ہو۔ وُہ حُکم دیتے ہُوئے اکثر اپنی ضرُورت کی وضاحت کرتے تھے۔

"وُہ چیز فوراً سے پہلے لاؤ!"

"وہاں جا کر فوراً سے پانچ مِنٹ پہلے آؤ!"

اُن کے 'فوراً' کا کیا پیمانہ ہے؟ وُہی بتا سکتے ہیں! ایسا کر کے وُہ اپنی اولاد سے اُس قدر و قیمت کا تقاضا کرتے تھے جسے وُہ خود چُکانے میں ناکام رہے تھے۔ بھاگم بھاگ، مار دھاڑ، تُندی و تیزی ..... میرے والد کی خُوبی ہے۔ وُہی بہتر جانتے ہیں کہ وُہ اپنے تخم کو تو ڑھینے کے لیے عرصہ تک میری ماں کی کوکھ میں کیسے پنپنے دیتے رہے۔

عُدُول حُکمی پر وُہ تھپّڑ، مُکّے، لاتیں، گھونسے، ڈنڈے، گالیاں ..... کیا کیا بَن کر برستے۔ کوئی عزم و ہمّت سے کام نہ کرتا تو وُہ اُس پر 'ڈھیلے لام کی پیدائش' کی تہمت لگا دیتے۔ اُن کی سخت گیری اور بدزبانی مُجھے بالکل

نہ بھاتی۔ میں تشدّد و ملامت کا نشانہ بن کر کسی گوشۂ تنہائی میں چھپ جاتا اور اپنی مظلومی پر آنسو بہاتا۔ میرا اُبال نکلنے پر، میں ٹھنڈے دل سے پورے حادثے کی چھان بین کرتا۔ میرا ضمیر مجھ سے کہتا کہ تو قصوروار ہے تو میں کان پکڑتا اور آیندہ ویسا نہ کرنے کا تہیّہ کرتا۔ دوسری صورت میں، میں گرودوارے میں جا کر گرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیکتا اور ارداس کرتا "ہے گرو! کارساز گرو!! میرے باپ کا ہاتھ ٹوٹ جائے! اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے!"

میں اپنے باپ کو ایک نظر برداشت نہ کر سکتا۔ اُسے دیکھ کر میرا دل درد سے ٹپکتا، جیسے پیپ سے بھرا پھوڑا۔ اُس سے میری نفرت کی خوفناک انتہا یہ ہے کہ میں نے کئی بار انتردھیان ہو کر اُس کے مرنے کی منّت مانی اور اپنے طویل سجدوں اور گہری دعاؤں کے دوران صدائے غیب تک سُنی، "تو گھر جا! تیری دعا قبول ہوئی ہے۔" میں سجدے سے اُچھل کر اٹھتا اور نجات پرور حالات کا تجزیہ کرتا ہوا دوڑ کر خوش و خرّم گھر پہنچتا لیکن اپنے باپ کو زندہ دیکھ کر ملول ہو جاتا۔

قارئین! ہر کام کی اپنی خصوصیت ہے۔ کوئی محنت و بصیرت سے پورا ہوتا ہے اور کوئی جبر و تشدّد سے! لیکن خدا کے نائب اُسے مکمّل کرنے کے کیسے کیسے مجہول طریقے بتا گئے ہیں! میں اُن کے بارے میں سوچتا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ عقلمند تھے، بے وقوف وہ ہیں جو انہیں کارگر سمجھ کر اُن پر عمل کرتے ہیں۔

باب ۱۴

آندھی میں گھرا ہوا شجر ہو جیسے، طوفان کی زد میں کوئی گھر ہو جیسے
اُف، شورشِ انفاس بہ ہنگامِ وصال، کہسار سے ندی کا گزر ہو جیسے
(شاطر)

ایک خاص عمر تک آدمی معصوم اور صلحِ کُل ہوتا ہے۔ اِس پر میرے باپ جتنے آنسو رُلاتے تھے، ماں اُتنی ہی اشک شوئی کرتی تھی۔ اُس کی مظلومیت نے اُسے زیادہ ہی رحم دل بنا دیا تھا۔ ویسا نہ ہوتا تو اُس پر عذاب ماحول میں دم لینا مشکل تھا۔

گاؤں اور اُس پر کسان کی زندگی! میں اپنی مصروفیات گنواؤں! میں منہ اندھیرے اُٹھتا کھیتوں سے چارہ لاتا، چارہ کُترتا، چارہ ڈالتا، مویشی چراتا، ہل چلاتا، نلائی کرتا، فصل کاٹتا، کھلیان سنبھالتا.... ضرورت ہوتی تو رات کو ہر پانہ میں کسی نہ کسی کو کھانا پہنچا کر آتا۔ وہاں لاتعداد کام تھے جن کا رشتہ لامحدود محنت سے منسلک تھا۔ ان تمام کاموں سے اہم کام سکول میں وقت پر حاضر ہونا ہوتا تھا ورنہ پانچ بید کھانے پڑتے تھے۔ شاید ہی کوئی دن ہوگا جب میں سکول

کے لئے دلکی نہ لگاتا تھا۔ اِس کے باوجود میں مَن مانی کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔ دکان پر دیر ہو جاتی تو میں شامِ ہریانہ سے لطف اُٹھاتا۔ شامِ ہریانہ ایک اچھوتی تلمیح ہے، اِس لئے وضاحت ضروری ہے۔

سورج اندر باہر ہوتا۔ ہریانہ کی دوشیزائیں اِٹھلاتی، اِتراتی، چہکتی، لہکتی ..... سیر کو نکلتیں۔ اُجلے کپڑوں میں اُجلے چہرے ایسے لگتے جیسے چاند ستارے دھرتی پر اُتر آئے ہوں۔ اُن کے ناز و ادا سے زیادہ اُن کی زندہ دلی کا چرچا تھا۔ وہ بھولے بھالے راہ گیر کسانوں پر پھبتیاں کستیں اور کوئی بُرا مانتا تو اُسے ہنس کر ہنسا دیتیں۔ یوں لگتا کہ غنچے چٹک کر باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں کہیں تیز اور کہیں آہستہ کسی نہ کسی جھرمٹ کا پیچھا کرتا اور خود کو تِٹ کھٹ گھنیا سمجھتا۔ ہیڈ ماسٹر نبی بخش شہری اور دیہاتی زندگی کا موازنہ خوب کرتے،

شہریں بسدے دیوتے، قصبیں بسّن منکھ

پنڈیں بسدے بھوتنے وہڈ وہڈ کھاون رُکھ

(شہروں میں دیوتا بستے ہیں اور قصبوں میں اِنسان۔ گاؤں میں بھوت پریت بستے ہیں جو اپنا گزارہ درختوں پر کرتے ہیں۔)

وہ دوشیزائیں شہر کی حدود سے نکل کر سڑک کے کنارے بے فکروں کی طرح پھرنے بیٹھ جاتیں اور اپنے ادھ ننگے چہروں اور ستروں کی نمائش اِس احتیاط سے کرتیں کہ اُن کے اپنے اُدھر سے گزرتے تو اُنہیں پہچان نہ سکتے۔ لیکن ہریانہ کا بے لکھا دستور تھا کہ جدھر عورتیں باہر جاتی تھیں اُدھر اُن کے مرد جرأت نہ کرتے تھے۔ شفق کے بدلتے رنگ گورے ستروں کو یوں نکھارتے جیسے دہکتا ہوا کوئلہ ہوا کی زد میں آجائے۔ بدن کا ایک آدھ حصہ دیکھ کر میں تمام حسن کا تجزیہ کرتا جو اکثر درست ہوتا۔ کوئی میرے اِدعا کو سراہے یا اِس میں مزاح کا پہلو تلاش کرے، میں اِس بلا کا ستر شناس تھا کہ اُن کی دید سے اُن کی مالکن کے گھر کی نشان دہی کر سکتا تھا۔ میں کئی دوشیزاؤں کو پسند کرتا تھا لیکن اُن سے بات نہ کر سکتا تھا۔ میں اُن سے اپنے طریقے سے ملا کرتا تھا! میں اُن کے پیچھے چلتا ہوا پیروں کے نشان دھیان میں رکھتا اور اُن پر اپنے پاؤں جما کر عجیب سی تسکین محسوس کرتا۔

وہ معصوم خطائیں یاد آتی ہیں تو میں خیالوں کے شہ پروں پر اُڑتا ہوا وہاں جا نکلتا ہوں جہاں چہکتی اور چہکتی یادوں کے ہجوم میری حیاتِ رواں کی رونق ہیں۔ میں اُن راستوں سے بچھڑے ہوئے یاروں کی طرح ملتا ہوں جن پر میں اَن کہے اور انجانے جذبات کا سیلانی بن کر آوارہ گھومتا تھا اور اپنی آوارگی پر ناز کرتا تھا۔ میرا عہدِ گزراں میرے عہدِ حاضر کا آئینہ خانہ ہے۔ قارئین! آہنگِ طبیعت سے زیادہ لذت پذیر کوئی شے ہے تو وہ آہنگِ طبیعت کا سلسلہ ہے۔

میری زندگی ایک لحاظ سے مجھ پر بڑی مہربان رہی ہے۔ وہ یوں کہ اِس نے مجھے فطرت پسندی اور فطرت بینی کے شوق سے نوازا ہے۔ وہ چیز جو اُڑتی، رینگتی، چلتی، پھدکتی، تیرتی، ڈوبتی، لپکتی، مہکتی ... ہوتی تھی میری دلچسپی

کا مُرکز رہتی تھی۔ اور میری دل چسپی کا لاابالی پن! ایک بار مَیں بادل کے ٹکڑے کے سائے سائے چلنے لگا اور پھر بھاگنے لگا اور تب رُکا جب مَیں اُس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکا۔

خوشی ہو کہ غم دونوں حالتوں میں میرا رویہ انتہائی شدید ہوتا تھا۔ میری سب سے بڑی خوشی عروسِ سحر کی دید تھی۔ مَیں منہ اندھیرے اُٹھتا اور اُس کے جلوہ گر ہونے تک کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ ہر شے نور سے معمور ہوتی، اپنی تر و تازگی میں اپنے حسن پر نازاں لگتی اور کئی بار چشمِ تماشا۔ مَیں پودوں کو گالوں سے لگاتا، غنچوں کو دیکھتا، پھولوں کو سونگھتا، اُن کے رس سے مہک اُٹھتا اور اُن کی خود پسندی کی داد اپنی خود رفتگی سے دیتا۔ شبنمی آئینوں میں کرنوں اور پھولوں کے پرتو، نورنگ کے گلستاں تھے۔ اُس نظارے سے جدا ہونا لہر سے اُس کی روانی چھیننا ہے۔ جیسے میری عشرتِ طبیعت میری تلاش میں تھی، حسنِ فطرت کی حصولِ کمال میں ہے۔

مَیں اپنے غم میں اندھیرے میں پناہ لیتا اور اُس کی موت جیسی گھٹن میں زندگی محسوس کرتا۔ مَیں ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو اچھی سمجھتا کیوں کہ وہ جہاں پڑی ہوتیں، آرام سے ہوتیں، کوئی اُن کے سکون میں خلل نہ ڈالتا۔ لیکن آدمی کی سوچ وچار وہ عجیب راستہ ہے جو کبھی بھی کہیں بھی مڑتا ہے اور کبھی بھی کہیں بھی جا نکلتا ہے۔

جینا سے تجدیدِ ملاقات کی رات فسانہ پرور تھی۔ افسردہ چاندنی جاں گداز تھی۔ مَیں چھت پر لیٹا دور آسمان کے دل میں جھانک رہا تھا۔ ستاروں میں گھرا ہوا چاند، مجھے اکیلا دکھائی دیتا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے لگتا کہ وہ میری ہی طرح خلوت پسند ہے۔ مَیں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جوں ہی بادلوں کے حلقے میں گھرتا، پریشان ہو جاتا جیسے اُن کے درمیان اُس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ اُن سے دُور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُس کی پریشانی بادلوں سے دور ہو کر ہی دُور ہوتی۔ وہ اکیلا ہوتے ہی اپنے اُداس آنند کو پا لیتا اور آہستہ خرامی کو اپنا لیتا۔ مجھے چاند پر ترس آیا اور بادلوں کی چاند دشمنی پر غصہ، مَیں اُنہیں گرم نگاہی سے دیکھنے لگا۔ ناگہاں میرا رویہ اُن کی جانب بدل گیا۔ اِس کی وجہ بادلوں کا حسن خود زائیدگی تھا۔ وہ آپس میں گھلتے ملتے ایسے پیارے پیارے خاکے بناتے کہ اُن پر اصلی ہونے کا گمان ہوتا۔ ایک معجزہ ہُوا! مَیں جس چیز کا خیال کرتا، بادل اُسی کی صورت اختیار کر لیتا۔ اپنی مصوری میں مجھے محسوس ہوتا کہ وہ تصویر میری ہی طبع زاد ہے۔

میری کیفیت سرودِ خاموش کی سی لطیف اور نظارۂ رنگیں کی سی خیال خیز تھی۔ میرے خیالِ حسن کار نے جو آخری تصویر بنائی وہ میری پیاری جینا کی تھی۔ اُس کی تمنا میری بے قراری بن گئی۔ مَیں بستر پر سے اُٹھا اور بام بام ٹہلنے لگا۔ مَیں ایک جگہ کھڑا ہو کر سنسان گلی کو دیکھنے لگا جو میری ہر منزل کی راز دار تھی۔ اُس نازک رشتے کا احترام کرتے ہُوئے اُس نے مجھے اشارے سے بلایا۔ مَیں دبے پاؤں دالان کے ڈھائی (ڈگل جوڑا) سے آنگن کی دیوار پر اُترا، گھٹنوں پر جھکا، ذرا دیوار کا سہارا لیا اور اُچھل کر گلی میں جا رہا۔ گلی کے کتے بھونکے لیکن میرے پچکارنے پر مجھے پہچان گئے اور پھر غراتے

ہُوئے چُپ ہو گئے جہاں تک نظر جاتی تھی ہر شے سہ رُخی تصویر نظر آتی تھی۔ چاندنی اور سائے کے نمایاں فرق سے چھوٹی سے چھوٹی چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی روڑا راہ میں پڑا نظر آتا، میں اُسے اُٹھا کر راہ سے دُور پھینک دیتا۔ ایک روڑا پھینک کر مجھے گُمان ہُوا کہ اگر میں پُورا زور لگاتا تو اُسے کئی گُنا دُور پھینک سکتا تھا۔ میں نے اُتنا ہی بڑا دُوسرا روڑا تلاش کیا اور اُسے اُسی جگہ سے پُورے زور سے پھینکا۔ لیکن وُہ پہلے روڑے سے کُچھ ہی پرے گرا۔ مجھے لگا کہ میں پُوری طاقت نہیں لگا پایا ہُوں۔ میں نے ایک اور روڑا اُٹھایا، خُود کو جھنجھوڑا گویا اپنی بکھری ہُوئی توانائی کو یکجا کیا اور اُسے پھینکا۔ میری اِس کوشش کا وُہی نتیجہ نکلا جس کی مجھے اُمید نہ تھی۔ میں مایُوس نہ ہُوا کیوں کہ میں ہنومانی تصوّر میں تھا۔ رام سنگھ کے کارخانے کے باہر شہتیر پڑا ہُوا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اُسے ایک ہاتھ سے اُٹھا سکتا ہُوں لیکن وُہ دونوں ہاتھوں سے بھی نہ ہلا۔ میں بالکل شرمندہ نہ ہُوا۔ اِس کی وجہ! میری رُوح اُس نغمے کو گنگنا رہی تھی جس کی لَے قطعی نئی تھی اور دِماغ سے الگ موجِ خُوں سے مُتعلّق تھی۔

گلی سے صحن کی دیوار ہاتھوں کی پہنچ سے اُونچی تھی۔ میں نے ایک بار اُچھل کر منڈیر کو چھُوا اور دُوسری بار پکڑ لیا۔ میں پیٹ پر رینگ کر اور بازُوؤں اور پاؤں کا پُورا زور لگا کر دیوار پر چڑھا۔ ماس کئی جگہ سے چھِل کر جلنے لگا اور میں نے محسُوس کیا کہ اُن خراشوں میں عجیب سی تحریک ہے۔ میں داڑھے کی سیڑھی سے چھت پر چڑھا، چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا اور خُود کو اکیلا پا کر پھیل گیا، آسمان پر اُڑنے لگا۔ میں اُس وقت دھرتی پر آیا جب میں نے چکور کی پھڑ پھڑا ہٹ سُنی۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے دردمندی سے دیکھنے لگا۔ چاندنی راتوں میں وُہ بہت بے قرار رہتا تھا اور اپنی چونچ اور چھاتی بُری طرح مجرُوح کر لیتا تھا۔ چند مہینے پہلے جب اُسے تایا ملکھی رام کوئٹے سے لائے تھے، اُس کی بے قراری نوگرفتاری کی سی تھی۔ گُنبد کی چھت کا وسط، جہاں سلاخیں پائیں سے اُوپر اُٹھ کر جڑتی تھیں، کھُردرا تھا، جس سے رگڑ کھا کر اُس کا سر بُری طرح زخمی ہو جاتا تھا۔ جب تک وہاں موٹا کپڑا تہ کر کے نہ سیا گیا نہ اُس کے زخم بھرے اور نہ سر پر بال آئے۔

میں نے اُسے اُس کے نام سے بُلایا، "آکاش! آکاش!" پنجرے پر تھپک کر اُسے شانت کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ وُہ سلاخوں سے لڑ رہا تھا اور لڑ رہا تھا جیسے اُنہیں توڑ کر اُڑ جانا اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہو۔ وُہ سلاخوں سے لڑتا لڑتا پائیں سے گُنبد تک جاتا اور راہِ فرار نہ پا کر پھر اُلٹا مُڑ آتا۔ مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی اور میں نے اُسے آزاد کرنے کی ٹھان لی۔

پنجرے کا دروازہ نہ تھا، اُس کا نِچلا حِصّہ دروازہ تھا جسے دو عمُودی قطروں پر رسّی سے چار جگہ گُنبد کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ میں نے دو بند، ناخُن سے کھولے، تیسرا نہ کھُلا، اُسے روڑے سے رگڑ رگڑ کر توڑ دیا۔ گُنبد کو تھوڑا اُوپر اُٹھایا، اندر ہاتھ ڈالا اور آکاش کو ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ وُہ زور سے پھڑپھڑایا۔ میں نے جھٹ گُنبد کو پُورا اُٹھا دیا اور دُوسرا ہاتھ شانوں پر رکھ کر اُسے قابُو میں کر لیا۔ وُہ سہم کر سُکڑ گیا جیسے ایک قید سے نِکل کر دُوسری میں پھنس گیا ہو۔ میں نے اُسے پیار کیا، باہوں کو جھُلایا اور اُسے اُوپر ہوا میں پھینک دیا۔ وُہ ویسے ہی پَر سمیٹے رہا اور نیچے گرنے لگا۔ میں نے افراتفری میں سوچا۔ "ہو سکتا ہے کہ

بدیس رہتے رہتے یہ اڑنا بھول گیا ہے!" لیکن اچانک اُس نے پَر پرواز پھیلائے، پُرزور اُڑان بھری اور پیپل
سے آگے نکل گیا۔ مَیں اُس کے پیچھے بام تک بھاگا جیسے مجھے اُس کی مزید مدد منظور ہو۔

مَیں بستر پر دراز ہُوا۔ مجھے خیال آیا کہ سویرے آکاش کو پنجرے میں نہ پا کر گھر والے کیا کہیں گے؟ مَیں
نے پنجرا اُٹھا کر پچھلے صحن میں پھینک دیا اور منہ اندھیرے اُٹھ کر شور مچا دیا، "آکاش کو بِلّی کھا گئی ہے۔"

کوئی کب تک کسی کو قید کر سکتا ہے؟ کب تک کسی کو کھلونا بنا سکتا ہے؟ جینا کی گائے کا معصوم سا
ھڑا، جس کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ، اُسے پیار کرتی تھی، اُس سے سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ وقت مُہمل اور بے معنی
ادتوں کا ڈھیر ہے لیکن اِنسان کی بدولت بامعنی اور رواں دواں ہے۔ یہ اِسی رواداری اور رواروی کا اِعجاز ہے کہ میرا
نسی وِجدان میری زندگی میں داخل ہُوا اور مجھے پیاری پیاری خیانتیں بھی سکھا گیا۔ درس گاہِ فطرت کی یہ خُوبی قابلِ داد
ہے کہ جنسی مُعاملے میں ہر جاندار خُود آموز ہے۔

مَیں چراگاہ سے مویشی چرا کر لوٹ رہا تھا۔ مَیں اَب جُو میں نہا کر آیا تھا لیکن بدن میں الاؤ سا جل رہا تھا۔ جُون
ہاشیکھر دوپہر ڈھل چکی تھی لیکن دھوپ کی لپک کم نہ ہُوئی تھی۔ میرا سایہ مجھ سے کچھ آگے چلتا نظر آ رہا تھا جیسے میرا باطنی وجود،
الم ہی سہی، اپنی نمائندگی کرنے پر مُصر ہو۔ مَیں نے نہا کر قمیص نہ پہنی تھی، دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر پھیلا لی تھی۔ کچھار
لے باہر ریت کے ذرّے پرفشاں انگاروں سے اُڑ رہے تھے اور جہاں ٹکراتے تھے، داغتے چلے جاتے تھے۔ پاؤں کا جلنا
ں برداشت نہ کر سکا اور اُچک کر بھینس پر سوار ہو گیا۔ وہ کم بخت بدک گئی۔ مَیں تھوڑی دُور تک اُس کی پیٹھ سے چپکا رہا لیکن
ر گر گیا۔ مَیں غصّے سے اُٹھا اور اُسے ڈنڈوں پر دھر لیا۔ وہ بھاگ کھڑی ہُوئی۔ اُسے بھاگتا دیکھ کر سارے مویشی بھاگنے
گے اور باڑے تک سرپٹ پہنچے۔ مَیں نے کسی کے گلے میں زنجیر باندھی، کسی کے پاؤں میں کورائی، باڑے کے مُنہ پر ٹٹیا
ڑی کی اور گھر کی راہ لی جو کچھ کم گرم نہ تھی۔ مَیں اُس کے کنارے کنارے پھوس پر چلنے لگا جو قدرے آرام دہ تھا۔ باراہ
مل سے خالی تھا۔ الیشر سنگھ کی حویلی کا موڑ مُڑتے ہی جینا کے گھر کا دروازہ نظر آیا، فاصلہ کم کرنے کے لئے مَیں راہ چھوڑ
مینڈھ مینڈھ ہو لیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن اُسے مَیں باہر سے کھولنے کی ترکیب جانتا تھا۔ ایک کواڑ آگے کھینچ کر
ں نے دُوسرا پیچھے دبایا۔ کواڑوں کی درمیانی دراڑ چیں چیں کرتی ہُوئی پھیلی جیسے اُسے پھیلنے میں تکلیف ہُوئی ہو۔
ں نے زنگ آلود قبضوں کو کڑی نگاہ سے دیکھا گویا اُنہیں اپنے راز میں شریک کرنا چاہا، پھر اندر ہاتھ گھُسا کر کُنڈی میں سے
لی اَرگل لکڑی جس کے سرے پر ٹوپی ہوتی ہے تاکہ چھید میں سے پھسل نہ سکے۔ اِسے جُوئے میں بیلوں کی گردن پھانسنے
لے لئے بھی کام میں لاتے ہیں، نکالی، زنجیر اُتاری، کواڑ آگے دھکیل کر کھولے، چوکھٹ پار کی، پیچھے مُڑ کر کواڑ بند کئے،
نجیر لگائی، کُنڈی میں ارگل گھُسائی اور اندر کی راہ لی۔ یہ سارے کام میرے لئے جینا کرتی تھی تو اُس کی نزاکت اور لطافت
ں اور ہوتی تھی۔ مَیں نے اُس کے گھر میں پاؤں رکھا تو مجھے لگا کہ وہ کسی دراڑ میں سے مجھے آتے دیکھ رہی ہے۔ میرا رویّہ میرے

ساتھ یکسر بدل گیا۔ اپنی جواں مردی کا ثبوت دینے کے لئے مَیں تپتی دھرتی پر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور خود ساختہ مُصیبت سے لُطف اُٹھانے لگا۔ آگے پہنچ کر مَیں نے دیکھا، جینا جامن کے پیڑ کے نیچے سو رہی ہے چُوں کہ میری جُرأت بے کار گئی تھی، مَیں کچھ مایُوس ہو گیا۔ لیکن اگلی ہی گھڑی میری خود اعتمادی لوٹ آئی۔ مَیں جینا پر دھیان دیئے بغیر نلکے پر پہنچا، سر سے قمیض اُتاری، جھٹک کر غسل خانے کی دیوار پر رکھی اور نلکا چلایا۔ یہ جانتے ہُوئے کہ پانی گرم ہے، اُس کے نیچے ہاتھ کر دیا۔ اِس طرح جان بُوجھ کر ہاتھ جلا کر مَیں نے وُہ توانائی محسُوس کیا جو خرمستی کی نفسیات ہے۔ جینا نلکے کی آواز پر ہڑبڑا کر جاگی اور پھر مُجھے دیکھ کر مُسکرا پڑی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی ترچھی لکیر، مُسکراہٹ سے زیادہ ہی بھلی لگتی تھی۔ اُس نے جماہی لی اور اوڑھنی وہیں چارپائی پر جھٹک کر میری طرف چل پڑی۔ وُہ جُوں ہی سائے سے باہر نکلی، اُس نے جلن محسُوس کی اور وُہ بھاگ کھڑی ہُوئی۔ اُس کی چھاتی، جو اوڑھنی کے نیچے سے بے حجاب رہتی تھی، ننگی لگی۔ میرے جذبے کی دوشیزگی، سردی میں پہلے تاپ کی سی تھی جس میں لذت اور جراحت کا عنصر برابر ہوتا ہے۔ مَیں اُسے اُسی کم حیائی سے دیکھنے لگا جس سے وُہ مُجھے دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے میرے ہونٹ چُومے، اُس کے ہونٹوں کا مزہ تازہ کاٹے لیموں کا سا تھا۔ مَیں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بوسے کا مزہ دوبارہ لیا۔ بوسے کی ملاحت کم ہُوئی لیکن اُس سے رگوں میں ہلچل اُٹھی وُہ بدستُور رہی بلکہ تحریک پکڑ گئی۔ نلکے کے نیچے جست کا بڑا بیضہ نُما ٹب رکھا تھا وُہ لہرا کر اُس میں بیٹھ گئی، آدھا بھرا ٹب، کناروں سے چھلک گیا۔

"تجھے گرمی نہیں لگتی؟ میری تو جان نکلی جا رہی ہے!" اُس نے احساسِ خاطر سے پُوچھا۔

مَیں نے اُس کی بات سُنی لیکن اَن سُنی کر دی کیوں کہ اُس وقت میں ایسے سنگیت کو سُن رہا تھا جو میری رگوں کا پیدا کردہ تھا۔ مَیں نے اُس سنگیت کو پہلے بھی سُنا تھا لیکن اَب اُس کی لطافت کُچھ زیادہ ہی اثر انگیز تھی۔

"نلکا چلا، مَیں نہاؤں گی!" اُس نے پانی سے کھیلتے ہُوئے کہا۔

مَیں نلکا چلانے لگا لیکن میرے خیال کا مرکز جینا تھی۔ وُہ سر ٹیڑھا کر کے نلکے کی دھار سے پانی پیتی اور کبھی چُلّو سے۔ گبرُون کا کرتہ بھیگ کر جسم سے چپکنے لگا۔ اُس نے چوٹی کھول کر بال جھٹکے اور شانوں پر پھیلا لیئے۔ اُنہیں پُوری طرح بکھو کر اُس نے جُوڑا باندھا، جس سے گردن لمبی اور ماتھا کُشادہ دکھائی دینے لگا۔ گردن سے سینے کے مخروطی سرے تک اور وہاں سے پیٹ تک جو زاویہ بنتا تھا وُہ اُس کے پیکر کا سب سے دلکش حصّہ تھا۔ وُہ بدن کو کُرتے کے اُوپر سے ملتی رہی، جو بدن کے اُتار چڑھاؤ میں کہیں ڈُوبتا اور کہیں اُبھرتا، سینہ دو مخروطی چٹانیں نظر آتا اور کبھی ایک غیر ہموار لیکن پُر اَسرار انبار۔ وُہ ٹب میں آلتی پالتی بیٹھی تھی۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے شلوار اُتاری اور دوزانو ہو گئی۔ شلوار ایک طرف پھینک کر اُس نے کُرتے کا سرا پکڑا، کھسوٹ کر اُوپر اُٹھایا جیسے وُہ کُرتے کے ساتھ اپنی جلد نوچنے کی تمنائی ہو۔

ہلکے سے جھکے ہوئے ممّے، اُن کی چوٹیوں پر رجھاتے ہوئے کتھئی دائرے، اُن کے بیچ براجمان چوچیوں کے پیارے مکھڑے، سینے اور پیٹ کے خوبصورت زاویے، صاف شفاف پردے، کولوں کی مرغوب قوسیں پُٹھوں میں تحقیق انگیز تکون، اُجلی رانوں کے درمیان حیرت افزا دھندلی لکیر، جلد کی دوشیزگی کی پاکیزگی ..... وہ تمام مقدس حُسن بیک وقت میری آنکھوں میں سما گیا۔ مَیں اُس نُور سے چُندھیا گیا جس کے پس منظر میں پانی کے قطرے سُسکارتے اور بھبکتے لگتے تھے۔

میرے معصومانہ اِشتیاق میں تجسّس کا جزو اُبھرنے لگا۔ میرے خُون کا دباؤ بڑھنے لگا اور اعضا کا رویہ بدلنے۔ اُس کی عُریانی نے میرے اعصابی نظام میں ہلچل مچا دی۔ مَیں نلکا چلاتا چلاتا رُک گیا لیکن نلکے کے ہینڈل سے ملتی جلتی حرکت میرے کاپچھے میں شروع ہو گئی۔ میری بڑھتی ہوئی لُغت میں وُہ حرکت، 'کاپچھے کی جان' کہلاتی تھی۔ میری وارفتگی جینیا نے دیکھی اور دیکھتی دیکھتی سنجیدہ ہو گئی۔ اُس کی چوچیاں پہلے سے زیادہ نمایاں اور رنگت میں گہری ہو گئیں۔ اچانک وُہ چھپاک سے اُٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر مَیں نہ کُچھ دیکھ سکا، نہ کُچھ سمجھ سکا۔ بس اتنا محسوس کر سکا کہ مَیں اُس کی گہرائی تک اُس کے اندر اُتر گیا ہُوں جہاں وُہ پانی سے الگ نیم گرم تیل کی طرح گیلی ہے۔ اِس سے پہلے کہ مَیں اُس صُورتِ حال کو اپنے طریقے سے دریافت کرتا اور کوئی حرکت کرتا، وُہ کراہتی اور تڑپتی ہُوئی نڈھال ہو گئی اور چاروں شانے چت لیٹ گئی۔

اُس کی بے وقت اور ناروا پسپائی مجھے بُری لگی۔ مَیں نے اُسے اپنی انوکھی کیفیت میں دیکھا۔ وُہ آنکھیں مُوندے ہُوئے آرام سے لیٹی تھی اور مَیں اُسی تناؤ میں کھڑا تھا جو جینیا کی عُریاں تنی سے مجھ میں نفوذ کر گیا تھا۔

میرے آغاز نے میری معصومیت کو میرے انجام تک بے قرار رکھا۔ تصرف کی عشرت، مجھے معلوم نہ تھی۔ میرا فطری وِجدان اَدھورا اور جینیا کا فطری میلان پُورا تھا۔ مَیں اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچتا۔ مَیں اَلفاظ کے محدود اور غیر واضح مفہوم پر حیران ہوتا لیکن کسی طرح بھی اپنے تقاضائے اِیقان کی تسکین نہ کر سکتا۔

جینیا کا فعل بھی وُہی تھا اور میرا بھی وُہی! لیکن اُس کا اُسلوب و مفہوم اُس پر عیاں تھا اور میرا مجھ میں نہاں، اُس جوہرِ آدم کی طرح جسے حُسنِ نمود تک پہنچنے کے لئے آئینہ سازیِ وقت کا اِنتظار تھا۔

باب ۱۵

اپنے عمل کا جس نے کیا تجزیہ صحیح،
دیکھا ہے اُس نے بھر کے نظر آفتاب میں
(شاطر)

میں نے کئی ایسے کام کئے ہیں جن پر معلمِ اخلاق کوئی بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میرے خلوصِ تنقیدِ ذات میں کمی رہ گئی ہے۔ میری کہانی انسانی نشیب و فراز کی کہانی ہے اور اخلاقی قدریں، سماجی پابندیاں جنہیں میں نے اپنے انداز میں توڑا اور اپنے چلن کو حق بجانب سمجھا۔ "تایاجی کہتے تھے، ایک باریک لکیر انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے۔ یہ کس وقت کیا کر گزرے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔" ان سے متاثر ہو کر میں نے پانچ سنہری اصول لکھے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱ چوری نہ کرو

۲ سچ بولو

۳ اچھی بانی بولو

۴ ہر کام محنت سے کرو

۵ غیبت نہ کرو

بے شعوری میں ضبطِ نفس، قتلِ نفس کے برابر ہے۔ میں انسان بننے کی کوشش میں اپنے ہی اصولوں کی گرفت میں آ گیا۔ مجھے گڑ کھانے کی عادت تھی۔ میں ماں سے گڑ مانگتا، وہ گڑ کی چھوٹی سی ڈلی دیتی جس سے زبان بھی پوری طرح میٹھی نہ ہوتی۔ میں کھانے پینے کی چیزیں چرانے میں اختراعی صلاحیت رکھتا تھا؛ اس لئے کھانے سے زیادہ چرانے میں لطف اٹھاتا تھا۔ میں تائی ماں کے گھر سے مکھن چراتا تھا اور وہ بھی اس کے سامنے۔ میں اس کے پاس اس وقت لسی لینے جاتا جب وہ صحن میں کسی کام میں مصروف ہوتی۔ اسے کہتے ہی بنتی، "تو اندر جالی (لکڑی کا چار گوشہ ڈھانچا جس میں کھانے پینے کی چیزیں رکھتے ہیں) میں سے اپنے آپ لے لے۔" میں مکھن دان میں سے مکھن نکالتا، اس کا گولا بنا کر گلاس کی تہ میں چپکاتا، اوپر لسی بھرتا اور تائی ماں کا بھروسا رکھنے کے لئے اسے لسی کا گلاس دکھا کر لاتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جب میں اسے لسی کا گلاس دکھا رہا تھا، مکھن کا گولا گلاس کی تہ سے چھوٹ کر لسی پر تیرنے لگا۔ اس نے مجھے جو سزا دی، دی اور ساتھ ہی مجھ پر مکھن چور کی تہمت لگا دی۔ میں نے چند دن پہلے اصول پر عمل کیا پھر یکسر چھوڑ دیا۔

میرا دوسرا اصول، میری جان پر آیا۔ دسہرے کے میلے میں جڑی بوٹیوں کا مرکب اور سانڈے کا تیل بکتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لطفِ شہوانی بڑھاتا ہے۔ اسے بیچنے والوں کی زبان، حسنِ بلاغت کا ایسا آئینہ تھا جس میں ہر کوئی اپنی حقیقت کا مبالغہ آمیز عکس دیکھتا تھا۔ بھائیا جی نے وہ دونوں چیزیں چوری چھپے خریدیں لیکن میں نے گھر میں رکھی دیکھ کر پہچان لیں۔ سانڈے کا تیل وہ کب استعمال کرتے تھے، وہی جانیں! ہاں مرکب وہ رات کو دودھ کے ساتھ کھاتے تھے۔ کوئی پوچھتا کہ وہ کیا ہے؟ تو وہ کہتے کہ پیٹ کے درد کی دوا ہے۔ ان کا جھوٹ سن کر میرے پیٹ میں کچھ کچھ ہوتا۔ میری ماں کے پیٹ میں پیڑا ہوئی اور اس نے ان سے وہ دوا مانگی۔ انہوں نے اسے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ

یہ دوا صرف مردوں کے لئے ہے۔ میرے جوشِ ایمانی کے اُبال کھایا اور مَیں نے سچ بول دیا، "ماں! یہ بوڑھے کو جوان بناتے کا کُشتہ ہے، نہ کہ پیٹ کے درد کی دوا!"

بھائیا جی نے اُس کُشتے سے کیا فیض اُٹھایا؟ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں لیکن مَیں نے سچ بولنا چھوڑ دیا۔

میرے ماحول کی بول بانی اِتنی بازاری تھی کہ وہاں تمیز سے بات کرنا بدتمیزی تھی۔ مَیں اُصُول پروری کی خاطر کم بولتا۔ میرا چلن بدلتے ہی ہر کوئی مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے مجھے کچھ ہو گیا تھا۔ مَیں خُود بھی ادھورا ادھورا اور الگ الگ محسوس کرتا۔

اُصُولوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا پاپن پورن عین بے اُصُولی پر ٹِکا اور تایا جی کے معیار سے مَیں اُس لکیر کو نہ مٹا سکا جو اچھائی اور بُرائی کے درمیان حدِ فاصل تھی۔ اُس بے اُصُولی زندگی کے بارے میں ایک اعتراف لازم ہے۔ وہ کام جسے مَیں اچھا سمجھ کر کرتا تھا وہی کوئی دوسرا کرتا تو مجھے بُرا لگتا۔

کوئی شہتیروں اور بالوں کا خریدار آتا، بھائیا جی اُسے کیسے کیسے پھانستے۔ "یہ لکڑی تین برسات پُرانی ہے! جتنی ٹیڑھی بنگی ہونی تھی ہو گئی، اب تو نِرا لوہا ہے لوہا! اِسے پت جھڑ میں کاٹا ہے۔ بہار میں کاٹے درخت کی لکڑی بودی ہوتی ہے، اُسے دیمک اور گھُن لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

وہ لکڑی تین برسات پُرانی ہوتی اور نہ ہی پت جھڑ میں کاٹی ہوئی، پُرانی اِس لئے لگتی تھی کہ اُسے چیر کر کیچڑ سے لیپ دیا گیا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ گاہک کچھ سوچتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ بھائیا جی اُسے پھر گھیر لیتے، "لکڑی کے بارے میں یہ نُکتے کِتنوں کو معلوم ہیں؟ آج کل ہر ایرا غیرا نتھو خیرا لکڑی کا بیوپاری بن گیا ہے۔ مَیں خاندانی بڑھئی ہُوں، لکڑی کی صُورت دیکھ کر اُس کی قِسم اور عُمر بتا سکتا ہُوں۔"

اُن کی چرب زبانی! وہ گاہک کو سوچنے اور بولنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ کوئی قیمت پُوچھتا، وہ جھٹ کہتے، "قیمت کیا پُوچھتے ہیں جناب؟ آپ سے زیادہ لُوں گا! آپ میرے اپنے آدمی ہیں اور پھر آپ کی تو بوہنی کر رہا ہُوں۔"

اُس وقت تک وہ گاہک کا گاؤں اور نام جان گئے ہوتے۔ وہ اُن لوگوں کے حوالے دیتے جو اُن کے پُرانے گاہک تھے۔ مَیں ایک بیوپار کی تفصیل بیان کرتا ہُوں۔

"بالے کیسے کوڑی ہیں؟ سردار جی!"

ایک گاہک نے جاتے جاتے قیمت دریافت کی۔

"پندرہ روپے کوڑی"

بھائیا جی کی خُود رَوی سے ظاہر تھا کہ وہ اُس قیمت کے سوائے کسی دُوسری قیمت سے ناواقف ہیں۔

"قیمت ٹھیک ہے؟"

گاہک کے رویّے میں وہی بے دلی تھی، جو تھی۔

"چار انچ مربّع اور چھ فٹ لمبے شیشم کے بالوں کی قیمت پوسٹ کارڈ کی طرح ہے۔ مجھے نیند سے جگا کر پوچھو گے، تب بھی یہی کہوں گا!"

بھایا جی کے کہنے سے ظاہر ہے کہ وہ سودا بازی کے خلاف تھے۔

"بھاگ سنگھ اسی ناپ کے بالے بارہ روپے میں کوڑی دیتا ہے۔"

گاہک کو قیمت کچھ ٹھیک لگی اور وہ رک گیا۔

"آپ کا مکان کتنا لمبا ہے؟"

بھایا جی نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے سودے کو نیا موڑ دیا۔

"بتالیس فٹ۔"

ان کے اچانک سوال پر گاہک سوچ میں پڑ گیا۔

"بتالیس فٹ! چھ فٹ کے لحاظ سے پورے سات خانے بنتے ہیں۔ آپ کو چھت پر چاہا دمٹّی، ڈالنا ہے کہ فرش لگانا ہے؟"

"چاہا ڈالنا ہے۔"

دیکھئے، میرا مال سوت چھوڑ کر چیرا ہوا ہے، سو دھنے کے بعد ماپ پر پکّا اترے گا۔ چاہے کے لئے بھاری مال ہی کھڑا رہتا ہے، ہلکا جھک جاتا ہے۔ دوسرے بیوپاری مال، سوت پر چیرتے ہیں۔ ان کا مال، ماپ سے کم ہوتا ہے۔ یہ لیجئے دو فتّا، بھاگ سنگھ کا مال، ماپ کر آیئے پھر فیصلہ کیجئے۔"

انہوں نے بیوپاری کے ہاتھ میں دو فتّا پکڑا دیا جسے اس نے لوٹا دیا اور ان سے مال خریدنے کا ارادہ کر لیا۔

اور اسی طرح جوں ہی گاہک پھنستا، وہ اپنی پرانی جگت لڑاتے، اس کی آنکھ بچا کر اس کے ساتھ آئے بڑھئی کی مٹھی گرم کر دیتے۔ وہ بڑھئی ملی جلتی لکڑی میں ناقص لکڑی بھی چننے لگتا۔ کسی لکڑی میں کوئی نقص نمایاں ہوتا اور گاہک کی اناڑی آنکھ میں کھٹکتا اور وہ اس پر انگلی رکھتا۔ اس وقت بڑھئی کی چترائی دیدنی ہوتی! وہ یہ آنکھ بند کرتا اور کبھی وہ، مشکوک لکڑی کو ادھر سے دیکھتا اور کبھی ادھر سے اور اسی نتیجے پر پہنچتا جس پر وہ پہلے پہنچ چکا ہوتا، "اتنی سی ٹیڑھ گھڑنے اور رندنے میں نکل جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں اور وہاں آرام سے بیٹھیں۔"

"مستری جی! لکڑی ویسے ہی تیر کی طرح سیدھی ہے۔ میرا ہر ماپ پکّے ماپ سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کو سو دھنے کے بعد چھ کا چھ اور چار کا چار پورا ملے گا۔" بھایا جی مستری کی بات میں اضافہ کرتے۔

ایک بار ایک بڑھئی نے مٹھی بھر گرم کروالی اور لکڑی بھی اچھی چنی اور بھائیا جی کی ایک نہ چلنے دی۔ وہ اس کے انتخاب میں اپنی مرضی سے کوئی لکڑی رکھتے تو بڑھئی اسے اٹھاکر الگ رکھ دیتا اور ان سے کہتا۔ "آپ تکلیف نہ کریں! مَیں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں"۔

وہ سودا جیسے تیسے بھگتا اور بھائیا جی نے خود کو یوں مطمئن کیا۔ "اس بڑھئی کے نطفے میں فرق ہے!"

ہماری ٹال چیل اور سال کی لکڑی سے بھری پڑی تھی، جس کی نکاسی کم ہوتی تھی۔ وہ لکڑی جلاہے کے آلات کے لئے موزوں ہے۔ میرا پھپھیرا بھائی بھگت سنگھ اس کام میں ماہر تھا اور اتفاقاً بیکار تھا۔ اس نے بھائیا جی کو رائے دی کہ وہ جلاہوں کا سامان بناکر بیچیں۔ کانگریس کے پرچار سے کھادی مقبول ہو رہی تھی۔ غریب کسان تو کھادی پہنتے ہی تھے، امیر لالے اور بنیے بھی کھادی پہننے لگے تھے۔ اس سے انہیں واضح فائدہ یہ ہُوا کہ ڈھیلے ڈھالے کرتوں اور پاجاموں میں ان کے موٹے اور بھدّے جسم پہلے کے مقابلے میں کم بدوضع نظر آتے۔ بھائیا جی کو بھگت سنگھ کی تجویز پسند آئی۔ ٹال کے ایک کونے میں موٹی لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ اس جگہ کو اڈّے کے لئے چُنا گیا۔ بھائیا جی نے ان لکڑیوں کو ہاتو (سردی کے موسم میں کشمیر سے مسلمان آتے تھے، جو لکڑیاں پھاڑنے کا کام کرتے تھے) سے پھڑواکر بالن بنالیا اور کونا خالی کر دیا۔

چار بلّیاں سیدھی گاڑی گئیں اور ان پر چار آڑی باندھی گئیں۔ بھگت سنگھ نے اڈّے کے پائے آپ چُنے اور روڑوں اور گارے سے اینٹوں اور سیمنٹ کا کام لیا۔ تیشی، کرنی اور ساہل موجود نہ تھی لیکن اس کے جوش و خروش میں اختراع و ایجاد کی کیفیت تھی۔ اس کے ہاتھوں میں رندے اور ہتوڑے کے نام وہی رہے لیکن ان کے معانی بدل گئے۔ ان کے لچکدار رویّے سے تحریک پاکر آنکھوں نے اپنا کردار بدلا اور خود کو ساہل ثابت کر دکھایا۔ پایوں پر شہتیر رکھا، ہموار کیا، دونوں سروں کو ترچھی اڑواڑ مار کر جکڑا اور بھگت سنگھ نے اڈّہ ہلا کر دیکھتے ہی خوشی سے ہونک کر کہا۔ "مَم ماجی! آ اڈّہ گاڈر کی طرح ٹھوس ٹھوس ہے۔"

بھائیا جی نے پرانی بوریوں کو ٹاٹ میں سیا اور اسے بلّیوں پر پھیلا دیا۔ ٹاٹ کا جھول کھینچنے پر کم نہ ہُوا تو اوپر کی بلّیوں میں دو کا اضافہ کر دیا گیا۔

بھگت سنگھ نے ایک دن اوزار درست کرنے پر لگایا اور دوسرے دن کام پر ڈٹ گیا۔ اس کے ساتھ دو بڑھئی دہاڑی پر لگا دیئے گئے۔ فرصت ہوتی تو اجیت سنگھ اور درشن سنگھ کام میں ہاتھ بٹاتے۔ مَیں سکول سے آتا اور جیسے بن پڑتا، مدد کرتا۔ سامان بننے لگا اور ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ راچھوں، تروں، نالوں اور چرخوں کی پیشگی پر پیشگی آنے لگی۔

بھگت سنگھ کو گانے بجانے کا شوق تھا۔ وہ ایک رات اپنے گاؤں مانان گیا اور صبح کو سارنگی اور ہارمونیم

لے آیا۔ ٹال دن کو کارخانہ ہوتا اور رات کو نغمہ خانہ ہو لے میاں کالڑ کا چراغ علی، بھگت سنگھ کا ہم عمر تھا اور اچھا گلا رکھتا تھا۔ وہ محفل میں پہنچنے میں دیر کرتا تو بھگت سنگھ اُسے مزاحیہ انداز میں پکارتا، "او علی کے چراغ، جلدی آ! تیرے بن محفل اندھیری ہے۔"

میں جس دن ٹال پہ رات بسر کرتا محفلِ ساز و سرود میں حصہ لیتا۔ بھگت سنگھ کے کلی (پنجابی لوک گیت) گانے کا انداز نیارا اور پیارا تھا، گاتا تو سماں باندھ دیتا۔ وہ بات کرتا ہوا ہکلاتا تھا لیکن گانے میں ہکلانا جاتا رہتا جیسے شوقِ نغمہ میں سلاستِ زباں کی صلاحیت ہو۔ میرزا صاحبہ، سسّی پنّوں، جُگنی، ہیر ..... وہ کون سی تان تھی جس میں اس کی زبان لیک نہ رکھتی تھی۔ وہ سارنگی پر لہرا بجاتا تو میں ناچ ہی اٹھتا۔

بھائیا جی لدڑاں میں جھڑی (کئی قسم کے بے ثمر درختوں کا باغ) سمیٹ رہے تھے۔ وہ ٹال پر کھڑے کھڑے آتے تھے اور لوٹ جاتے تھے، سارا کام بھگت سنگھ اور اجیت سنگھ کی مرضی سے چل رہا تھا۔ ایک جلاہے نے بھگت سنگھ سے اپنی دشواری روتے ہوئے کہی، "میں دو رنگا دھاگا بنتا ہوں تو بانے کی نار بدلنے میں بُننے سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ تم اپنے آپ کو ماہرِ فن سمجھتے ہو، میری مشکل کا حل نکالو تو جانوں!"

بھگت سنگھ باریک بیں ثابت ہوا۔ اس نے دو ناروں والا راچھ ایجاد کیا اور اسے ایک نار والے راچھ کی قیمت پر فروخت کر دیا۔ اس کی فراخ دلی کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اس جلاہے نے اسے نیا خیال دیا ہے جس سے اس کا عملی رجحان نکھرا ہے۔

وہ بامراد جلاہا، راچھ لے کر دکان سے باہر جانے ہی والا تھا کہ بھائیا جی اندر آئے۔ ان کی چال میں وہی بے چینی تھی جو ان کی حیوانیت آمیز حرکات کی پیش خبری ہوتی تھی۔ انہوں نے بھگت سنگھ پر الزام لگایا، "تو میری دکان لٹا رہا ہے!"

ہکلے کی نفسیات خوش بیاں سے الگ ہے! آمدِ خیال کی رعنائی اس کی تحریک ہوتی ہے لیکن حسنِ اظہار کی نارسائی، الجھن جو اسے احساسِ کمتری کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ جذبے کی عدم مساوات، جسمانی تفاوت ہی کی طرح ہے جس کا نتیجہ شکست ہے۔

دوسرے دن میری بوا بھگت سنگھ کی وکالت کرنے کے لئے آئی اور گالیاں کھا کر روتی ہوئی چلی گئی۔

باب ۱۶

ابھی تک قلبِ مضطر سے صدائے غم نکلتی ہے
ہوئی مدت کہ چھیڑا تھا کسی نے دل کے تاروں کو

کھانڈ اور کپڑے پر کنٹرول تھا اور اِس طرح کے گانے مشہور ہو رہے تھے۔

میں نوں ٹافٹے دا سوٹ لیادے
سوف دا سِلادے گھگرا
مکھنا! مکھنا وے ڈِپو چوں لیادے کپڑا جے مینوں رکھنا۔

(ایک لڑکی اپنے خاوند مکھن سنگھ سے کہتی ہے، مکھنا! مجھے ٹیفیٹا کا سوٹ اور سوف کا لہنگا سِلادے، ورنہ میں رُوٹھ کر میکے چلی جاؤں گی۔ یہ کپڑا صرف ڈیپو میں ملتا ہے)

ہمارے علاقے کا ڈیپو ذیلدار محمد حسن رانا کے پاس تھا۔ بھائیا جی نے تایا ملکھی رام کا راشن کارڈ ادھار لیا اور مجھے ساتھ لے کر ہریانہ روانہ ہوئے۔ گھر میں کھانڈ زیادہ نہ لگتی تھی کیوں کہ کھانڈ صرف مہمانوں کی آؤ بھگت میں خرچ ہوتی تھی اور گھریلو مصرف کے لئے گھر کا گُڑ شکر بہت تھا۔ زیادہ کھانڈ کی ضرورت اِس لئے پڑی کہ بھاگ وَنتی (جو اجیت سنگھ کی مشاطہ تھی) اجیت سنگھ کے بیاہ کی تاریخ لے کر ہی ٹلی تھی۔ بھائیا جی نے مجھے گھر ہی میں توتے کی طرح رٹا دیا کہ میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ لیکن جیسے اُنہیں میری اصلیت پر شک ہو! ہریانہ جاتے ہوئے یہ ریاض گاہے بگاہے جاری تھا۔

"تو کس کا بیٹا ہے؟" بھائیا جی چلتے چلتے رُک کر اچانک پوچھتے۔

"میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔" میں بڑے بھروسے سے کہتا۔

"وہ آپ کیوں نہیں آئے؟"

"وہ کوٹھے میں ہیں۔"

"میں تیرا کیا لگتا ہوں؟"

"چاچا!"

بڑوں کو جی کہہ کر بلاتے ہیں۔ سکول میں پڑھتے ہو اور نرے گدھے ہو!" وہ بولتے بولتے رُک گئے، میری جانب مڑے جیسے مجھ پر جھپٹنا چاہتے تھے لیکن پھر آگے چل پڑے اور اپنے غصّے کو زبانی کلامی نکالنے لگے،

"نرے گدھے! گدھے کے گدھے!"

میری ناکامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے ہریانہ کی آب جُو میں خبردار کیا۔ "تُو وہاں چُوکا تو تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے جھنجھوڑا جیسے میری سخت جانی کا اندازہ لگا رہے ہوں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے اصیل بچھڑے کی طرح چل رہا تھا اور دبے دبے لہجے میں رٹ لگا رہا تھا، "میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔" ہم ذیلدار کی قلعہ نما حویلی کے سامنے پہنچ کر رُکے۔ بھایا جی نے جوتا اُتارا، اُٹھایا اور تلے پر تلا مار کر غبار جھٹکا، پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹکا، کاندھے پر سے پاجامہ اُتار کر پہنا اور پھر جوتا۔ انہوں نے داڑھی مونچھ سنوار کر صافہ درست کیا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا، یاد ہے؟"

میں حویلی کا ترپولیا غور سے دیکھ رہا تھا۔ درمیان کے دروازے سے دو ہاتھی برابر گزر سکتے تھے۔ وہ دروازہ بند تھا جسے کھولنے کے لئے زمین پر ریل بچھائی گئی تھی۔ دروازے پر منبت کاری کی ہوئی تھی۔ ایک بار میں تایا جی کے ساتھ وہاں سے گزرا تھا، انہوں نے بتایا تھا، "یہ دروازہ دو کاریگروں نے ایک سال میں تیار کیا تھا۔ ان میں سے ایک تیرا تایا مارا سنگھ تھا اور دوسرا گھنکھناں کا ہرنام سنگھ۔" میں ذیلدار کی شان و شوکت سے زیادہ اپنے پُرکھے کے کمالِ ہنر سے مرعوب تھا، جس نے تراش و خراش سے سادہ سی لکڑی کو شاہکار بنا دیا تھا۔ بھایا جی نے مجھ سے سوال کیا تو میں اپنے دھیان میں کھویا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر گالی دے کر ہلایا۔ ان کے سبھاؤ کو جانتے ہوئے کہ وہ جس کسی کے پیچھے پڑتے ہیں، ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں، میں بے سوچے سمجھے بولا، یاد ہے۔"

"کیا یاد ہے؟" انہوں نے تینوں لفظوں کو لمبا کھینچتے ہوئے سوال کیا جیسے کہ وہ اپنے ایک سوال کے جواب میں وہ سب کچھ سُننا چاہتے ہوں جو انہوں نے مجھے پڑھایا تھا۔

"میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ وہ کوئٹے میں ہیں۔ آپ میرے چاچا جی ہیں۔"

اپنے سوال کا ٹھیک جواب سُن کر بھایا جی اپنے آپ میں بند ہی رہے۔ ان کی بے لوچ فطرت کانٹے کی طرح تھی۔ وہ دیکھنے میں خوبصورت ہوتا ہے لیکن لگ جائے تو جان پر آتا ہے۔ ہم بغلی دروازے سے حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ سڑک پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا، مٹی کی خوشبو، ہوا میں جھول رہی تھی۔ اندر بہت سے درخت تھے جو باہر سے کم دکھائی دیتے تھے۔ ذیلدار صاحب اپنے گھر کے سامنے دیوان پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے۔ ان کا بھاری بھر کم سرپر سارے دیوان پر چھایا ہوا تھا۔ خدمت گار پنکھا لئے کھڑا تھا اور آلکسی سے جھل رہا تھا۔ آگے دری بچھی ہوئی تھی جس پر کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ذیلدار نے ململ کا سفید کرتا پہن رکھا تھا جس کے اندر بغیر بازوؤں کی بنیان صاف نظر آرہی تھی۔ کرتے کی آستینوں پر چُنٹ ڈالی گئی تھی، کاجوں میں سونے کے بٹن جھلملا رہے تھے جن کی باریک زنجیر پٹی سے نیچے تک لٹک رہی تھی۔ ذیلدار کا چہرہ ایسا تھا جیسے کسی دائرے کے مرکز سے ہٹ کر اُسے کاٹتی ہوئی کم قطر

کی توس لگاؤ اور پھر اُس توس کو کاٹتی ہوئی ایک توس اور۔ گردن، کاندھوں میں دھنسی ہوئی تھی اور اُس پر غبغب تین تہ گاگر کی طرح نُمایاں تھی۔ ذیلدار کے دیوان کے ساتھ ایک اور دیوان تھا، جس پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ دیوان پر بچھی ہوئی جھالردار چادریں زمین کو چھوکر بھی نہ چھو رہی تھیں۔ اُن کے درمیان اُسی اونچائی کا میز رکھا ہوا تھا جس پر دیوانوں کی چادروں سے ملتا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ اُس پر چاندی کے لگن میں صراحی رکھی تھی جس کے منہ پر ریشمِ قاضی باندھی ہوئی تھی۔ میز پر چاندی کی ایک کٹوری تھی جو چاندی کی پلیٹ میں اوندھی پڑی تھی۔

اُس بیٹھک کے پس منظر میں گھر تھا جس کے سبھی دروازوں پر تیلیوں کے پردے چھوڑے ہوئے تھے۔

میں نے بھائیاجی کے پیچھے ذیلدار کو سلام کیا۔ میں پچھلے پاؤں دری کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ ذیلدار نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے آگے بلایا۔ میں ڈر گیا اور سمجھا کہ وہ مجھے پہچان گئے ہیں۔ میں سکڑ کر سمٹ گیا جیسے خود کو اُن سے چھپا لیا، لیکن میرا چور چھپ نہ سکا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے چلایا "میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں!"

ایک بے ساختہ قہقہہ اُٹھا اور فضا کو جھولا جھلا گیا۔ ذیلدار کی توند ڈانواں ڈول گھڑے کی طرح ہلنے لگی اور دوسرے نقوش اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے پھدکنے لگے۔ انہوں نے گاؤ تکیے کے نیچے سے کچے دودھ کی سی تہہ نکال کر جھٹکی، جو لہرا کر رومال بن گئی۔ انہوں نے اُسے چہرے پر پھیلایا، جب اُسے چہرے پر سے اُتارا، چہرے پر نور کے تڑکے کا سماں تھا۔

میں اپنی بات میں ہنسی کا پہلو تلاش کر رہا تھا کہ ذیلدار نے دم سنبھالنے کی کوشش میں دم روک کر کہا، "تم ملکھی رام کے نہیں، رتن سنگھ کے بیٹے ہو۔ اِدھر میرے پاس آؤ۔"

میں اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر شرمندہ سے زیادہ خوفزدہ تھا۔ میں جھجکتا ہوا آگے بڑھا، میرا دل دھک دھک دھڑک رہا تھا۔

"تم کون سے سکول میں پڑھتے ہو؟" ذیلدار نے میری پیٹھ تھپک کر لکنت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اُن کا نرم رویہ حوصلہ افزا تھا۔ میرا تناؤ جاتا رہا اور اتم وشواش لوٹ آیا۔ میں نے بے جھجک جواب دیا "ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکول میں۔"

"کس کلاس میں پڑھتے ہو۔"

"چوتھی کلاس میں۔"

"تمہارا جھوٹ ہم سن چکے ہیں، اب کوئی نظم سناؤ۔" انہوں نے مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

اُن کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میرے اندر کا فنکار جاگ پڑا، اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنا منہ سامعین کی طرف کیا اور اشاروں، کنایوں میں حقیقتِ حسن سنانے لگا۔ وہ الفاظ کو ایسے

تعبیر کرنے لگا جیسے وہ خود، حسن ہو اور آسمان، خدا۔ نظم ختم ہوئی اور وہ فنکار پس پردہ چلا گیا۔ میں نے دیکھا ہر کسی کے چہرے پر حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ذیلدار نے میرا بازو تھام کر مجھے نگاہِ تحسین آفریں سے دیکھا اور بھائیا جی کو ڈانٹتے ہوئے کہا، "رتن سیاں! تم نے چھوٹی سی بات کے لئے اپنے بچے سے جھوٹ بلوایا ہے۔ جس چیز کی جتنی ضرورت ہے، لے جاؤ!" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور حاضرینِ محفل سے کہا، "اس بچے میں اولیا کی روح ہے، آفریں!"

میرے ننگے دھول بھرے پاؤں پر دھیان نہ دیتے ہوئے، انہوں نے مجھے دیوان پر بٹھا لیا اور دوبارہ بھائیا جی سے مخاطب ہوئے۔ "تمہارے بھائی ماڑا سنگھ نے ہمارا درشنی دروازہ بنایا تھا۔ وہ بڑا کاریگر تھا! تم سیدھے ہمارے پاس آتے اور جو کہتے، ہم خوشی سے دے دیتے۔"

انہوں نے میرا بوسہ لیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے احساسِ مسرت سے کہا، "تم نے ایسا نہیں کیا تو اچھا ہی کیا! ورنہ ہم اس پیارے بچے سے کیوں کر ملتے؟"

انہوں نے اپنے منشی کے نام چٹھی لکھی، تہ کر کے میری جیب میں ڈالی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی، "عمر دراز ہو! بڑھو پھولو۔ آمین!"

بھائیا جی اٹھ کر سلام کرنے کے لئے آگے بڑھے، ان کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ رفیع الشان جذبات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ہم حویلی کے اندر ہی تھے کہ بھائیا جی نے وہ چٹھی مجھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور میری تسلی کے لئے کہا، "تیرے پاس گم ہو جائے گی!"

ڈپو، بازار میں پیارے لال کی دکان کے پاس تھا۔ بھائیا جی نے منشی کو چٹھی دی، وہ اسے پڑھ رہا تھا کہ میں نے دیکھا، جس بوری میں سے کھانڈ دی جا رہی ہے اس پر خالی بھیگی بوری رکھی ہے۔ کھانڈ بھی بھوری اور گیلی تھی اور اس پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ منشی نے ہمیں نئی بوری میں سے آدھی بوری کھانڈ دی جو سوکھی اور سپید تھی۔ اس سے پہلے کہ بھائیا جی کھانڈ کے دام چکاتے، انہوں نے مجھے ٹال پر سے سائیکل لانے کے لئے بھیج دیا۔ میں سائیکل چلانی جانتا تھا لیکن میرے پاؤں پیڈلوں تک پورے نہ پہنچتے تھے۔ میں فریم کی سنٹر ہب پر پاؤں رکھ کر کاٹھی پر بیٹھ جاتا اور پھر گھومتے ہوئے پیڈلوں کو وقفے وقفے سے مار کر کام چلا لیتا۔ میں نے سائیکل لا کر سٹینڈ پر کھڑی کی اور بوری لادنے کے لئے کیریئر کا سپرنگ اٹھایا۔ بھائیا جی نے دیکھ کر کہا۔ "اسے سٹینڈ پر سے نکال، بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔" میں نے سائیکل کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے اپنی ٹانگوں میں جکڑا، سپرنگ اٹھایا اور بھائیا جی نے ڈپو کے مزدور کی مدد سے بوری اٹھا کر کیریئر پر رکھی۔ میں نے سپرنگ چھوڑ کر بوری سنبھالی اور بھائیا جی نے سائیکل۔ ہم سائیکل

دھکیلتے ہوئے گھر پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے ماں کی مدد سے سائیکل پر سے کھانڈ اُتاری اور اندر رکھی۔ اُس نے اُسی رات تھوڑی کھانڈ کا بُورا بنا لیا اور باقی کو ویسے ہی رہنے دیا۔ ماں، دِن رات بیاہ کے کام میں مصروف تھی اور جب دیکھو سُہاگ گاتی رہتی تھی۔ ایک دِن میں سکول سے واپس آیا اور دیکھا کہ گھر میں کپڑوں کا انبار لگا ہوا ہے اور امر چند ٹیلر اُنہیں کھول کھول کر دیکھ رہا ہے۔ سب بھائیوں کے لئے ایک جیسے کپڑے لائے گئے تھے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے امر چند کو ناپ دینے سے اِنکار کر دیا اور حقارت سے فیصلہ کُن لہجے میں کہا، "میں سب جیسے کپڑے نہیں پہنوں گا، میری انفرادیت پر حرف آتا ہے۔" پہلے تو ہر کسی نے میرے اِحتجاج کی ہنسی اُڑائی لیکن جب بھایا جی نے میری ہٹ دھرمی میں سچائی دیکھی تو اُنہوں نے مجھے ڈرایا، "ٹھیک ہے! تو برات میں نہیں جائے گا، گھر میں رہے گا۔"

اُن کا فیصلہ میرے حق میں عذاب تھا لیکن میں اپنے اِرادے پر اڑ گیا۔ میں حالات سے سمجھوتا کرنے کے بارے میں سوچتا، میرا ضمیر مجھ سے کہتا، "تو اِس بھیڑ کا حصہ نہیں ہے! اگر یہ تجھے، خود الگ کرتی ہے تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

میں ماما کشن سنگھ کا لاڈلا تھا۔ وہ آئے، میری ہٹ پر حیران ہوئے اور خوش بھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہریانہ لے گئے اور میرے لئے میری پسند کے میرون کپڑے اور باٹا کے بوٹ خرید کر لائے۔

جس دِن بیاہ کا ساہا آیا گھر میں ہریالے اور گھوڑیاں گائی جانے لگیں۔ ایسے پکوان پکائے جانے لگے جو روزمرہ کے کھانے سے الگ تھے جیسے گلگلے، پکوڑیاں، گھنگھنیاں اور کانجی۔ بازی گر بھاندی کا آنا جانا شروع ہو گیا، وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ڈھول بجاتے ہوئے آتا اور چند کرتب دکھا کر چلا جاتا۔ وہ پہلا آدمی تھا جسے میں نے اپنی ہی بات کو سراہتے اور پھر کاٹتے دیکھا تھا۔ اُس کی ظرافت کے پردے میں حُسنِ مطلب دیدنی تھا! وہ اپنے پٹھوں کو ادنیٰ سے اعلیٰ اور پھر اعلیٰ سے اعلیٰ تر کرتب دکھانے پر اُکساتا تھا اور جب تک وہ اُس کے قائم کردہ معیار کو نہ پہنچتے، وہ یہی کہتا، "خوب ہے! لیکن قابلِ داد نہیں ہے۔"

بھابی کی بری کے لئے مخمل کا گھاگرا بنایا گیا۔ اُس کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ لگا، جس کا میں نے صوف بنا لیا۔ اُس خوبصورت صوف کا نفسیاتی اثر! میں پہلے سے زیادہ اِحتیاط سے لکھتا: حروف کی ساخت پر غور کرتا جس سے میرا خط، خوش خط ہو گیا۔

اجیت سنگھ کے سسرال، نلوا میں ہوئے، جو شوالک پہاڑ کے دامن میں ہے۔ کوئی براتی ہو گا جس کے ہاتھ میں تلوار، لاٹھی یا ڈنڈا نہ تھا۔ کچھ براتی گدّے پر سوار تھے اور زیادہ تر پیدل۔ اجیت سنگھ گڈی (منجھولی) پر سوار تھا اور اُس کے ساتھ درشن سنگھ، جو اُس کا شاہ بالا تھا۔ عدالت یار اور نصیر احمد اونٹ پر تھے اور ساجن سنگھ گھوڑی پر

براتی آپس میں مخول بازی کر رہے تھے۔

"رتن سیاں! مَیں چنتو سے کہہ آیا ہُوں کہ برات سات دِن رہے گی۔ ٹھیک ہے ناں!"

ایشر سنگھ جانتا تھا کہ برات دُوسرے دِن لوٹ آئے گی لیکن اُس نے بھائیا جی کو چھیڑا۔

"بالکل ٹھیک ہے! لیکن اُس کے چھلا (عصمت کی حفاظت کے لئے ایک آلہ) ڈال آنا تھا۔"

بھائیا جی نے اُس کی بات کی تائید کرتے ہُوئے، اُسے رائے دی۔

"چھلا اُس کے ڈالتے ہیں جو خالی رہتی ہو۔ میری بیوی اُدھر خالی ہوتی ہے اور اِدھر مَیں بھر دیتا ہُوں!"

ایشر سنگھ نے مُونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"پھر تو ضرور سات دِن رہیں گے! سمدھی یاد کریں گے کہ کن بھُوکوں سے پالا پڑا!!"

بھائیا جی نے پھر اُس کی بات کاٹی۔

اِس بار ایشر سنگھ داڑھی کھُجلاتا ہُوا خاموش رہا اور لال سنگھ کو دیکھنے لگا جو تایا جی سے کہہ رہا تھا،

"کیوں بھائیا جی! ایک دِن کی برات کوئی برات ہوتی ہے؟"

"ایک دِن کی برات بھی زیادہ ہوتی ہے! لگن کے فوراً بعد گھر لوٹ آنا چاہیئے۔" تایا جی نے اُس کی بات پر سنجیدگی سے غور کر کے کہا۔ اور پھر گُن گُن کرتے ہُوئے بولے۔

بُلیا، جَم نالوں بُری جنیت

تھلّے سونا پھکنی ریت

(اے بُلّے شاہ! برات میں جانا ایک سزا ہے۔ نہ اپنی پسند کا کھانا اور نہ اپنی پسند کا رہنا، زمین پر سونا اور ریت پھانکنا)

ہریانہ میں ہمارے گاؤں کی لڑکی پرستی بیاہی ہُوئی تھی۔ وریام سنگھ، ایشر سنگھ، تایا جی اور بھائیا جی اُس کے گھر اُسے شگُن دینے گئے جب تک براتی ہریانہ کے ہسپتال کے برابر رُکے رہے۔ وہیں سے نلوا کو سڑک بھُوٹی اور مہنتوں کے ڈیرے سے گذرے لیک میں بدل گئی اور وہ بھی سانپ کی لکیر کی طرح آڑھی ٹیڑھی۔ وہاں سے آگے نرسل کا جنگل شرُوع ہُوا، جس میں سَو، پچاس قدم بچھڑا ہُوا ہم سفر دکھائی نہ دیتا۔ میرُو نے اپنے بیلوں کو جھانجھ اور سنگوٹی پہنائی تھیں اور نصیر احمد نے اپنے اُونٹ کو جھاگل۔ اُس گھنے جنگل میں مُسافروں کا شور ایسے سُنائی دے رہا تھا جیسے آوازوں کی کھچڑی پک رہی ہو۔ کئی بار جنگلی چرندے چرتے اور پرندے چُگتے دکھائی دیتے۔ اُن کے فطری ماحول میں خلل پڑتے ہی وہ چوکس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور پھر اپنا کھانا دانا ڈھونڈنے لگتے۔ اُن کی اَن گنت گنتی پر حیران ہو کر ہر کوئی اپنے انداز میں تبصرہ کرتا۔

خرگوش! کتنے خرگوش ہیں!!

نیل گائے کے پیچھے بچھڑا ہے!

مور!

تیتروں کے جھنڈ ہیں!

کتنے بٹیر ہیں!

اگر کوئی اُن کا پیچھا کرتا، اُن کی رفتار و پرواز سے پُرخطر لمحوں کا منظر جھلکتا۔ ایک برساتی آب جُو کا سوکھا پاٹ آیا۔ جس کے کنارے پر سے تیتروں کا جھنڈ دوسرے کنارے کی طرف اُڑا۔ اُس کے اُڑان بھرتے ہی 'سال ں ں ں' کی مسلسل آواز سنائی دی جیسے خانۂ زنبور برہم ہو گیا ہو۔ میں نے ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ تایاجی نے آسمان کی جانب اِشارہ کیا۔ ایک شاہین سیدھا جھنڈ پر آ رہا تھا۔ اُس نے جس تیتر کو نشانہ بنایا وہ جھنڈ سے کچھ پیچھے اکیلا تھا۔ شاہین پر پرواز سمیٹتا اور پنجے کھولتا تیتر پر جھپٹا، اُس کی 'قیں قیں' کی قابلِ رحم آواز کے ساتھ چند پنکھ گرے اور شاہین کی پُروقار 'کوایں کوایں' کے ساتھ بکھر گئے۔ ترلوچن سنگھ گڈے کی پینجنی پر کھڑا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر ہُش ہُش کرتا ہوا تیتر کو شاہین سے چھڑانے کے لئے دوڑا۔ اُس نے اپنے گرد چوکسی سے دیکھا اور اپنے شکار کو گھسیٹتا ہوا لے اُڑا۔

ایک جگہ ایک تنگ پاٹ آیا۔ اُس کے دونوں طرف اونچے ٹیلے تھے اور وہ جوہڑ پر بند ہوتا تھا۔ اُسے دیکھ کر بھائیا جی نے منجھے ہوئے شکاری کی طرح کہا، "یہ جگہ اوگی لگانے کے لئے کتنی موزوں ہے!" ہرے بھرے کھیت دکھائی دیئے، بڑے بوڑھے کہنے لگے۔ "نلوآ قریب ہے۔" اُن کھیتوں کے گرد دوہری چوڑی باڑ تھی۔ ڈھینگر (کاٹی ہوئی ٹہنی) گاڑے ہوئے نہ تھے، اُن کے گٹھے پاس پاس پھینکے ہوئے تھے۔ ہر راہی کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ وہ زندگی اندیشہ بھری سہی لیکن اُس جذبے کی طرح خوبصورت تھی جو کسی خطرے کو تسخیر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہنگامِ سفر میں تیزی اور تحریک تھی۔ میری پھریری میں ایسی توانائی تھی جو راہِ نو کی رعنائی ہوتی ہے۔ گڈے لیک کہیں کہیں دوسری لیک نے کاٹی تھی لیکن گاڑی والوں کے لئے صحیح لیک کا تعین کرنا آسان تھا۔ وہ جس پہاڑی کی سیدھ میں چل رہے تھے، اُس کی اہمیت قطبی ستارے کی سی تھی۔ میں گڈے پر کھڑا ہو گیا، اُس منظر کا نظارہ کرنے لگا جو تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا اور اپنے حسنِ یکتا پر نازاں لگتا تھا۔

اچانک بینڈ کی آواز سنائی دی۔ بینڈ والے برات کو ہریانہ پار کروا کر گم ہو گئے تھے اور دکھائی نہ دیئے تھے۔ ایک آموں کے باغ کے پار نلوآ دکھائی دیا اور وہیں بینڈ والے اور کئی براتی۔ میرو کی حصاری اگومی جوڑی (بیلوں کی جوٹ جس کے سینگ نوکیلے ہوں) کی پُٹھ (دُم اور کوہان کے اندر کا حصّہ) نبی تھی۔ عام گڈے میں بیلوں کے گھٹنے،

پہیوں سے بھڑتے تھے اِس لئے اُس نے اُن کے لئے نیا گڈّا بنوایا تھا، جس کے جُوئے اور جوتوں کو پیتل کی کیلوں سے منڈھایا تھا۔ بیل ایسے تیز طبع تھے کہ بدن پر مکھی بیٹھنے سے جُھرجُھری لیتے تھے۔ میرو نے راستے میں کہیں انہیں ہانکا نہ تھا بلکہ روکتے ہُوئے چلایا تھا۔ وہ انہیں کبھی پُچکیرتا تو وہ دُلکی بھرنے لگتے۔ اُس نے بیلوں کو پُچکارتے ہُوئے اُن کے پگے کھینچے، تایا جی کو پکڑائے اور سانگی سے جُوئے اور جُوئے سے اُونٹنے (Z شکل کی لکڑی جو گڈّے کے تیروں کے درمیان ہوتی ہے۔ اُن تینوں لکڑیوں کے جوڑ پر جُوا آ بیٹھتا ہے۔ اُونٹنے کے دو فائدے ہیں۔ اوّل گڈّے پر چڑھنے اور اُترنے کے کام آتا ہے، دُوسرا، بیلوں کو جوتتے وقت گڈّے کو اُٹھانے کے لئے زیادہ جُھکنا نہیں پڑتا ہے) پر پاؤں رکھ کر نیچے اُترا۔ ترلوچن سنگھ پہلے ہی گڈّے پر سے اُتر چُکا تھا۔ گڈّے کا توازن بگڑا اور اُلار گیا۔ میرو نے اُونٹنا پکڑ کر گڈّا دبایا اور ترلوچن سنگھ سے اُلاڑوا (اُلار روکنے کی لکڑی جو گڈّے کے پیچھے لگی ہوتی ہے) لگانے کو کہا۔ میرو پھر گڈّے پر چڑھا، پیچھے سے کچھ سامان اُٹھا کر آگے رکھا، گڈّے کو دباؤ کیا اور نیچے اُترا۔ اِتنے میں نصیر احمد اور عدالت یار اونٹ پر آ پہنچے۔ نصیر نے مُہار کھینچتے ہُوئے اور 'ہش ہش' کرتے ہُوئے اونٹ کو بٹھایا، اپنی ٹانگوں کو ایک طرف کیا اور سرک کر اُترا، اُسی طرح عدالت یار۔ براتی اِکٹھے ہو رہے تھے اور ایک دُوسرے کی دیکھا دیکھی ضروری حوائج سے نپٹ رہے تھے۔ بینڈ والے اپنے سازوں میں بے سُری پھونکیں مارنے لگے اور سُست رفتار براتیوں کو جلدی پہنچنے کی چیتاونی دینے لگے۔ جیسے ٹروم بون، ٹرم پٹ اور کورنٹ پر سُورج مکھی چھایا ہُوا تھا اُسی طرح چھوٹے ڈھولوں پر بڑا ڈھول۔ بینڈ ماسٹر فرہاد کی رُومی ٹوپی اُس کے ساز 'کلے ری نٹ' جیسی نئی تھی۔ جب تک براتی اِکٹھے ہُوئے میرو نے بیلوں پر لال جُھول ڈالے۔ کوہان کے لئے جو غلاف تھا وہ جُھول ہی کا حصّہ تھا اور اُس پر سفید ریشم کا پھندنا جڑا ہُوا تھا۔

رلنی چوپال میں ہُوئی۔ ایسے شبد گائے گئے جن کا مطلب ایک دُوسرے کو نئے رِشتے کی نازکی سے آگاہ کرنا ہے۔ میرے بھایا جی اپنے سمدھی سے گلے ملے تو سب کی زبان پر یہ پوِتر شلوک تھا۔

ہم گھر ساجن آئے

رب بچھڑے میل ملائے

عین اُس وقت ابرِ باراں کا ایک ٹکڑا کہیں سے آیا اور پھوار برساتا ہُوا گُزر گیا جیسے وہ اُس مُبارک گھڑی کو دُعائے خیر دینے کے لئے ہی اُدھر آن پہنچا ہو۔

رات کے کھانے کا اِنتظام شامیانے کے نیچے چاندیوں پر کیا گیا۔ کھانا پروس کر بھوگ لگانے کی ارداس کی ہی تھی کہ کوئی آوارہ بگولا، شامیانے اور قنات کو اُڑا لے گیا۔ چاندیوں کے کناروں پر میز فرش رکھے ہُوئے تھے، اِس کے باوجود چاندیاں اُڑ گئیں اور کھانا، ریت ریت ہو گیا۔ کچھ براتی بندوبست پر لعن طعن کرنے لگے اور کچھ قدرت

کی بے دردی پر۔ سمدھی نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی اور بہتر بہتر نظام کو درست کرنے لگے۔ برات ڈیرے لوٹ رہی تھی کہ لال سنگھ نے تایا جی سے کہا، "بھائیا جی! آپ کا کہا ٹھیک نکلا۔"

تایا جی کھلی اور پرسکون فضا کو دیکھتے اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے چل رہے تھے جیسے اُن کے بھونڈے سلوک پر نکتہ چیں ہوں۔ راہ میں نالی پڑتی تھی۔ انہیں اُس سے بے خبر دیکھ کر، میں نے خبردار کیا۔ انہوں نے اپنا قدم معمول سے لمبا اُٹھایا، نالی کو پار کیا اور لال سنگھ سے کہا۔ "میں نے مُلّے شاہ کا تجربہ بیان کیا تھا، بخشش بانی نہیں کی تھی!"

برات کے کھانے کا انتظام دوبارہ کیا گیا۔ دوسرے دن پانچ سہاگنیں سہاگ گاتی آئیں اور دلہن کے لئے سہاگ پٹاری لے گئیں۔ اجیت سنگھ کا بیاہ گرو گرنتھ کے پاٹھ کی گونج میں ہوا، جس کا نچوڑ یہ ہے،

ہر پربھ ٹھاکر کاج رچایا

دھن ہردے نام وگاسی

(یہ کام بھگوان کی منظوری اور مہربانی سے پورا ہوا ہے۔ وہ دل قابلِ تحسین ہے۔ جو اپنا کام اُس کا مبارک نام لے کر شروع کرتا ہے)

یہ گاؤں ہمارے گاؤں کی طرح گنجان آباد نہ تھا۔ مکان ہمارے مکانوں سے اونچائی میں چھوٹے تھے لیکن صحن، صحنوں سے بڑے۔ نیائیاں بالکل نہ تھیں اور نہ ہی چاہی کھیتی۔ جہاں کہیں کنواں تھا، چاہ در چاہ تھا۔ ایک چھوٹے قطر کے کنوئیں کا پانی ستارے کی طرح ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد لوگ گھروں سے کم نکلتے تھے کہتے تھے کہ باگھ پڑتا ہے۔

دوسرے دن برات نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پتّا چکانے کا وقت آیا۔ بھائیا جی نے جتنا دیا، انہوں نے اُس سے زیادہ مانگا اور دونوں فریق اپنی اپنی بات منوانے لگے۔ ماما کشن سنگھ کی شامت آئی، وہ بھائیا جی سے کہہ بیٹھے، "دے بھی دو جیجا جی، خوشی کا موقع ہے!" اُن کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بھائیا جی، انہیں ننگی گالیاں دینے لگے۔ وہ اُسی وقت وہیں سے اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ بھائیا جی کی کنجوسی اور بدطینتی پر سمدھنوں نے نہایت ملامت آمیز سٹھنیاں دیں، جس سے وہ اور بھڑک اُٹھے۔ سمدھیوں نے نیگ کی مانگ واپس لی تو دُلہن بدا ہوئی۔ ہر کوئی انہیں اس اُمید سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اب بکھیر پھینکیں گے اور شگن کریں گے لیکن وہ ہر نازک جذبے سے عاری گم سم چلتے رہے۔ ڈولا، سمدھیوں کی نظر سے اوجھل ہونے لگا تو لال سنگھ نے بڑھ کر اُن سے کہا۔ "رتن سیاں! ایک دو ہاتھ شگن کے لئے پھینک دے۔ میرا پھینکتا ہے یہ!" وہ اپنے چڈے پر چھپٹے۔ اُن کا بس چلتا تو وہ ننھے رتن سنگھ کو اکھاڑ کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ وہ جتنی تیزی سے آگے بڑھا تھا اُتنی ہی سست رفتاری سے پیچھے رہ گیا۔ بھائیا جی کی برہمی گاؤں تک بدستور رہی کیوں کہ تایا ملکھی رام انہیں مسلسل ورغلاتے رہے کہ گھر میں پہلی شادی کے سارے اخراجات ننھیال کی

ذمہ داری ہوتے ہیں۔ دُلہا دُلہن باہر دروازے پر کھڑے تھے اور ماں پانی اُتارنے کی تیاری کر رہی تھی کہ بھایا جی ننھیال پر برس پڑے۔ وہ اُسی وقت جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ تایا جی نے بیچ بچاؤ کیا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

اور پھر اجیت سنگھ کا مکلاوا (گونا) آیا۔ مَیں نے بھابی گربچن کور کو رُوپ درشن (رُونمائی) دینے کے لئے ماں سے ایک رُوپیہ مانگا، اُس نے نہ دیا تو مَیں بسورنے لگا۔ بھابی کو خبر ہُوئی، وُہ میرے پاس آئی، گھونگٹ اُٹھایا، مجھے بَچّی دی اور بولی، "یہ ہے میری مُنہ دکھائی دیور جی! مَیں نے رُوپیہ کیا کرنا ہے!"

گربچن کور سُنبک دَست، خُوش مزاج اور حاضر باش قسم کی لڑکی تھی۔ اُس کی بَری کی تہ نہ ٹُوٹی تھی کہ وُہ ماں کا ہاتھ بٹانے کے بہانے کام میں حصّہ لینے لگی۔ ماں اُسے روکتی تو وُہ اپنی لوچ دار آواز میں اُسے فریب دیتی۔ "ماں جی، مَیں کام کر نہیں رہی ہُوں، پرکھ رہی ہُوں!" اُس کے پَرنائے کال (ایّامِ عرُوسی) کا خیال کرتے ہُوئے ماں اُسے غصّہ کرتی۔ وُہ 'رُوں اُوں' کرتی ہُوئی اُس سے لپٹ جاتی اور اُسے اپنے اِرادے میں مُداخلت کرنے سے باز رکھتی۔ جانتے جانتے ماں نے اُس کا سُبھاؤ جان لیا اور اسے 'ست بچن' کا نیا نام دے دیا۔ ست بچن کی اداؤں میں حُسنِ تسلیم تھا اور انکار میں اقرارِ دلبری۔ اُس کی مُسکراہٹ اُڑتی ہُوئی خوشبو تھی، وُہ موجود وہاں ہوتی اور محسُوس یہاں۔ وُہ اَن تھک تو تھی ہی، خُوش اُسلُوب بھی تھی اور گھر میں سُلکھیا سی پھرتی رہتی تھی۔ اُس کی آواز کی فطری لَے، دِلربا سنگیت سے معمُور تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے حکم دیتے رہو اور وُہ حکم بجالاتی رہے۔ ماں کی طرح بھابی بھی کام ایجاد تھی لیکن جو چیز اُسے ماں سے مُمتاز کرتی تھی وُہ اُس کی نگاہِ جِدّت طراز تھی۔ وُہ جھُوٹے برتنوں کو پانی کے ٹب میں اکٹھا کرتی جس سے برتنوں پر جھُوٹن نہ سُوکھتی اور اُنہیں صاف کرنے میں آسانی رہتی۔ وُہ برتن صاف کرتے وقت ہاتھوں پر کھیسے چڑھا لیتی جس سے ہاتھوں کا سِنگار خراب نہ ہوتا۔ پہلے دو تین مہینے میں برتن قلعی کروانے پڑتے تھے اب اُنہیں قلعی کروانے کا وَقفہ بڑھ گیا۔ وُہ کڑھی بناتی تو ہانڈی کو تَلا دے کر چُولہے پر چڑھاتی اور ہانڈی کے کنارے چکنائی سے چُپڑ دیتی۔ کڑھی کا اُبال مشہُور ہے! اِس طرح وُہ کڑھی کے اُبال کو قابُو میں رکھتی جو بصُورت دیگر کڑھی رتھے (کڑھی کا اُبلنا بند ہوکر اِکسار کھولنے کی حالت) پڑنے تک رسوئن کا دردِ سر ہوتا ہے۔ اُس نے کُوزے میں کھریا بھگو کر رکھ دی تھی۔ وُہ کھانا پکا کر چُولہے پر کھریا کا پوتا پھیر دیتی، چُولہا ایسے لگتا جیسے دِکھاوے کی شے ہو تقریباً ہر الگنی گانٹھی ہُوئی تھی، اُس نے نئی الگنیاں باندھ دیں۔ وُہ تازہ دُھلے گیلے کپڑے جھٹک اور کھینچ کر پھیلاتی اور اُن میں ذرا نمی ہوتی تو اُتار کر تہ لگا لیتی۔ کپڑے وقت پر اُتار نہ سکتی، اور کپڑے کرارے سُوکھ جاتے تو وُہ اُن پر پانی ترونک (چھڑک) کر اُنہیں نرم کرتی، تہ لگا کر فرش پر جماتی اور اُوپر تختہ رکھ دیتی۔ وُہ جب کپڑے وہاں سے اُٹھاتی، الماری میں سلیقے سے جما دیتی۔ مَیں وہاں سے کپڑے لے کر پہنتا، مجھے لگتا کہ وُہ دھوبی دُھلے ہیں۔ ایک دِن گیان کور آئی اور الماری میں قرینے سے رکھے کپڑے دیکھ کر احساسِ قصُور سے بولی۔ "گربچن! ہمارے گھر کی الماریاں کھولنے سے چیزیں مُنہ پر گرتی ہیں۔ اُنہیں ترتیب دینے کے لئے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ تُو یہ سب، کب سجاتی ہے؟"

جب ضرورت ہوتی ہے ۔ ویسے پہلی بار سجانے میں وقت لگتا ہے پھر یہ کام بہت آسان ہے" اُس نے اپنی ایک زُلفِ پریشان کو سنوارتے ہُوئے کہا۔

میرے پاس ایک ہی پگڑی تھی ۔ اُس نے اپنی سفید اوڑھنی ، باندھنوں سے لال اور پیلی رنگ کر مجھے دے دی ۔ اُس پگڑی سے میری انفرادیت پسند طبیعت کو تقویت ملی ۔ پُورے سکول میں کسی کے پاس ویسی پگڑی نہ تھی ۔

پگڑی دھو کر سُکھانے کے لئے مجھے ہمیشہ کسی دُوسرے کی مدد لگتی تھی ورنہ پگڑی میں چُنٹ پڑ جاتی تھی ۔ بھابی نے دیوار میں آنکڑا گاڑا ، اُس کے ساتھ پگڑی کی چوڑائی کا ڈنڈا درمیان میں باندھ کر لٹکایا اور اُس کے دونوں سروں پر دھاگے باندھ کر لٹکتے چھوڑ دیئے ، عین ترازو کی ڈنڈی کی طرح ۔ مَیں نے رنگ ریز کو ویسے پگڑیاں اور دُوپٹے سُکھاتے دیکھا تھا لیکن مَیں اُس کی تقلید نہ کر سکا تھا ۔ مَیں بہت خُوش ہُوا اور بھابی سے پُوچھا ، "بھابی ، اِس کا نام کیا ہے ؟"

"رنیل گر اِسے ڈنڈا کہتے ہیں لیکن مَیں اِسے ساکھی کہتی ہُوں۔"

بھابی کے حُسنِ انتخاب کی دِل کشی مرہُونِ بیاں نہیں ہے ۔

ایک اکیلا اور دو گیارہ ، گھر کے پُورے کام آدھے رہ گئے ۔ اَب ماں ، بھابی کو کسی کام سے روکتی تھی تو وُہ تھا گوبر سمیٹنے کا کام ؛ لیکن بھابی اُس کام میں بھی قابلِ قبول طریقے سے ہاتھ بٹانے لگی ۔ وُہ گوبر کے ٹوکرے بھرتی اور ماں اُنہیں اُٹھا کر ڈھیر پر پھینکتی ۔ جب تک ماں دُوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے نجات پاتی ، بھابی چُولہا چوکا سنبھالے ہوتی ۔ وُہ سب سے پہلے آٹا گُوندھتی اور پھر دال سبزی بناتی ۔ روٹی پکانے سے پہلے وُہ گُوندھا ہُوا آٹا دوبارہ گُوندھتی ۔ اُس سے آٹے کی کنی مر جاتی اور اُس میں چکنائی اُبھر آتی جو آٹے کی لون (گُوندھا ہُوا آٹا جس سے تھوڑا تھوڑا لے کر لوئی بناتے ہیں) پر صاف دکھائی دیتی ۔ بھابی کی لوئی ، ماں سے چھوٹی ہوتی اور اُسی طرح روٹی ۔ ماں پاک صاف ہو کر روٹی پروستی اور روٹی دیکھ کر بھابی سے کہتی ، "بیٹی اَتو کھتر انی جیسی روٹی بناتی ہے ، پیڑا تھوڑا بڑا رکھا کر ، تیرے بھائیا جی ہلکی روٹی پسند نہیں کرتے" وُہ ہماری اور بھائیا جی کی پسند کا خیال رکھتی ، ہمارے لئے ہلکی اور بھائیا جی کے لئے بھاری روٹی پکاتی ۔

گھر میں ایک مٹکا ماش پڑے تھے ، جنہیں ماں اِس لئے نہ پکاتی تھی کہ اُن میں چور ماش زیادہ تھے ۔ بھابی نے اُنہیں خرچ کرنے کا منصُوبہ بنایا اور اِس طرح سِرے چڑھایا ۔ وُہ اُن ماشوں کو پکا کر ایسے نتھارتی کہ چور ماش الگ ہو جاتے اور دوسرے ماش الگ ۔ وُہ چاولوں کی سنگ شوئی کرتی کہ پیسی بناتی ، مہکتی اور لہکتی ہوتی ۔ کام سے اُس کا وُہ رشتہ تھا جو بادِ نسیم کا باغ سے ہے ۔

تبدیلی کوئی بھی ہو ، بلاشک و شُبہ اِنتشار پیدا کرتی ہے اور اکثر ناچاقی کا باعث بنتی ہے ۔ لیکن ماں کی کام سے علیحدگی اور بھابی کی کام سے وابستگی ایسے ہُوئی جیسے پھُول میں پھل آتا ہے اور پھر وُہ ہولے ہولے بڑھتا ہُوا پھُول کو یکسر غائب کر دیتا ہے ۔ ماں کی تقدیر ہی بدل گئی ۔ وُہ گھر کی نوکرانی سے گھر کی رانی بن گئی لیکن وُہ اِس سے خُوش نہ تھی ۔ وُہ بھابی

کو سمجھاتی، "بیٹی، کام میرے لئے ضروری ہے! میں بیکار رہوں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔" لیکن بھابی تھی کہ اس بارے میں اُس کی ایک نہ سُنتی تھی اور یہی بات ماں کو کھٹکتی تھی۔ ماں میلے کپڑے دھو رہی تھی، بھابی نے اُسے دیکھ لیا اور اسے اُٹھا کر خود دھونے لگی۔ ماں ناراض ہو گئی اور غصے سے کپڑے پٹک کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، "کئی بار تو تو گلے ہی پڑ جاتی ہے!"

بھابی کام چھوڑ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی اور اُس کے مُنہ کے آگے گال کر کے لاڈ لڈاتے ہوئے بولی، "ماں! گلے نہیں پڑتی ہوں! گلے لگتی ہوں!!"

اُس کے عنایت آمیز اِصرار اور خوش کُن اظہار پر ماں کو مُسکراتے ہی بنی۔ اُس نے اُس کا رخسار چُوما اور دُعا دی، "دُودھوں نہاؤ، پُوتوں پھلو، جُگ جُگ جیو۔"

بھابی کی نفاست سے گھر میں ایک بے لکھا قانون نافذ ہو گیا۔ کسی چیز کو اِدھر سے اُدھر ہونا ہوتا یا ڈھول کو کہیں ڈیرہ جمانا ہوتا تو اُسے بھابی سے اجازت لینی پڑتی۔ اُس کی مُستعدی کا اعجاز! وُہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی وُہ ظہور آمیز حرکت سے تھرکتی نظر آتی اور اُسی طرح وُہ خود بھی۔ اُس کے اعضا کی کام سے وُہ دوستی تھی جو سنگیت کی سُروں سے ہوتی ہے۔

کپاس کی ساکھ آئی تو ماں کی 'بیماری' اور 'ناراضی' دونوں ہی کا حل نکل آیا۔ ماں نے گالے، دھوپ میں سکھائے، گز سے پھٹکے اور اونی پر اوٹ لئے۔ ایک دُھنیا راچھا ٹُنکارتا اور ہانک لگاتا گھوم رہا تھا، میں اُسے بُلا لایا۔ اُس نے اپنے کام کے لئے برآمدہ پسند کیا جو ایک طرف سے کُھلا تھا، اُدھر پردہ لگا دیا گیا۔ اُس نے راچھا چھت سے باندھا، سَر مُنہ کپڑے میں لپیٹا اور رُوئی دُھنکنے لگا۔ دُھنیا، آدمی نما جنتر لگتا۔ وُہ جس ترکیب سے راچھے کی تانت پر ہتھی مارتا۔ تانت سے رُوئی لپیٹتا، لپیٹ لپیٹ کر تانت ٹُنکارتا، وُہ ایک دِل رُبا تال تھی۔ سنگیت کے مُوجد نے کہا ہے کہ سات سُروں یعنی سا، رے، گا، ما، پا، دا، نی، میں ہر تال کی تفسیر ہے۔ مَیں سوچتا ہوں کہ کیا وُہ تال اِن سُروں میں سما سکتی ہے؛ مَیں کوشش کرتا ہوں۔ سا رے، سا رے، دا نی پا، دا نی پا، دا نی پا۔ نی سا، نی سا، سا رے، سا رے۔

تُومی ہُوئی رُوئی سے برآمدہ بھر گیا۔ ماں نے کانٹی اُٹھی کی اور بھابی نے رُوئی سنبھالی۔ ماں نے کانٹی کو گتے اور کھریا مٹی میں گوندھا اور اُسے گھڑے کے پیندے پر تھاپ کر اُس سے گولا بنایا۔ وُہ سُوکھ گیا تو بھابی نے اُس کے اندر اور باہر لال اور پیلے رنگ سے لکیریں کھینچ دیں۔ اُسے اُلٹا کر کے دیکھنے سے وہ خربُوزہ نظر آتا اور سیدھا دیکھنے سے کِھلا ہُوا گُلاب۔ اپنے دھیسج میں، بھابی رنگیلا جڑاؤ چرخہ لائی تھی جو ویسے ہی رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے اُسے جتنی باندھی، ماں ڈالی۔ چمرخیں لگائیں۔ تکلا بٹھایا اور تیل دے کر رمایا۔ تکلے کا ڈمرک کہیں نہ ملا۔ میں بھاگا گیا اور تایا جی سے لکڑی کا ڈمرک بنوا لایا۔ بھابی نے پہلا مُڈھا کات کر چرخے کا شگن کیا اور پھر چرخہ، پیڑھا ماں کو سونپ دیا۔ ماں نے اپنی زندگی نئے طریقے

سے پائی۔ وہ چرخہ کاتتی، سہاگ گاتی اور اپنے آپ میں مست رہتی۔

تیرے محلاں دے وچ بابلا، کون کتے گا چرخہ؟
میری سگھڑ پوتریاں، دھیئے توں گھر جا اپنے!

(کوئی لڑکی اپنے سسرال جانے سے پہلے اپنے باپ سے کہتی ہے۔ اے بابل! میں تیرا گھر چھوڑ کر اپنے سسرال جا رہی ہوں۔ اب تیرے گھر میں چرخہ کون کاتے گا؟ اس کا باپ اس سے کہتا ہے۔ وہ تیرا سسرال نہیں گھر ہے! تو میرے گھر کی فکر نہ کر، میری سگھڑ پوتریاں میرے گھر میں چرخہ کاتیں گی اور اس کی رونق بڑھائیں گی)

گھریلو معمولات اکثر ناگوار ہوتے ہیں، ان میں سہانی دل کشی پیدا ہو گئی۔ گھر کی فضا دوہرے حسن سے نکھر آئی۔ مجھے کسی کام میں حمایت کی ضرورت ہوتی، میں بھابی کو آواز دیتا، وہ 'آئی دیور جی' کی ترنگ میں ناچتی ہوئی آتی اور مسکراہٹ کی روشنی بکھیرتی ہوئی پورا کام نپٹا جاتی۔ میں چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھاتا، اتفاق سے توا ہنستا، وہ ٹھٹھا کرتی، "دیور جی! تمہاری شادی کا فال نکل رہا ہے۔ کوئی پسند کر رکھی ہے تو بتاؤ ورنہ میں، تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈتی ہوں"

بھابی بہت کم جہیز لائی تھی۔ تائی ہیرو، اس کا مقابلہ ہرنام کور کی بہو سے کرتی، جو اپنے ساتھ سلائی مشین سے لے کر چولہا، پیڑھا، توا، چکلا، بیلنا، چمٹا، پھونکنا، نمکدان، چنگیری...... سوئی، دھاگا تک لائی تھی۔ اس کی اپنی ساس سے بھی نہ تھی، جو اس کے بارے میں گھر گھر کہتی پھرتی تھی۔ "کھائی وات، رہ گئی کم جات۔" اس کے باوجود تائی ہیرو، میری ماں کے سامنے ہرنام کور کی بہو کے جہیز کی بات کرتی جسے سن کر بھابی دل گیر ہو جاتی۔ تائی ہیرو جب آتی، بھابی اس سے منہ چھپاتی۔ ایک دن ماں، چرخہ کاتتی تھی اور بھابی کشیدہ کاڑھتی تھی کہ تائی آئی۔ اسے دیکھ کر بھابی کشیدہ لے کر اندر جانے لگی۔ ماں نے اسے روکا اور وہیں بیٹھ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ تائی باتوں باتوں میں اسی بات پر آگئی جو بھابی کو ناپسند تھی اس بار اس نے حد ہی کر دی۔ بولی: "خالی ہات، آئی کم جات"۔

بھابی یہ طعنہ سن کر رونے لگی۔ ماں نے گربچن کا منہ اپنے ہاتھوں میں لیا، اسے چوما اور سر پر ہاتھ پھیر کر اس کا دھیرج بندھایا پھر تائی سے کہا، "بھابی! بھلائی اسی میں ہے کہ ایسی بات مت کیا کرو! کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہارا منہ پکڑنا پڑے۔ میری بہو میری بیٹی ہے! دنیاوی چیزیں، میں اس پر وارتی ہوں!" ماں نے اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتاری، بھابی کے گلے میں ڈالی اور سہاگ گانے لگی۔ وہ سہاگ، میں بھول گیا ہوں لیکن اس کا مفہوم یاد ہے "میرے گھر کی تقدیر، میری بیٹی لے گئی تھی جسے میری بہو لائی ہے۔"

بھابی کو کوئی کام نہ ہوتا، وہ ماں کے پاس جا بیٹھتی۔ پونی سلائی پر پونیاں بناتی، بوئیا میں رکھتی اور کوئی سہاگ گاتی۔ اس کا مدھ ماتا روپ اور مدھر آواز! لگتا کہ گندھرب کنیا ساکشات (ہو بہو) براجمان ہے۔ کچھ گھڑیاں

پوری گئیں تو بھابی نے اٹیرن نکال لیا۔ وہ حسبِ ضرورت پونیاں بناتی اور کبھی گُگڑیاں اٹیر کر انٹیاں۔ وہ کام کی رسیا تھی اور کسی کے بلانے پر بھی کسی کے گھر نہ جاتی تھی، اگر جاتی تھی تو ماں کے ساتھ۔ وہ ایک دن نانی ماں کے گھر میں گئی اس کی بہو سمرن کور سویٹر بُن رہی تھی۔ بھابی نے سویٹر کی بُنتی دیکھ کر اُس سے کہا، "سمرن، تیری بُنتی ایک جیسی نہیں کہیں ڈھیلی ہے اور کہیں کسی ہوئی ہے اور کہیں کہیں بُنتی میں فرق بھی ہے۔"

"مَیں نے بڑی کوشش کی ہے، ہاتھ ایک سا نہیں رہتا اور بُنتی میں غلطی ہو جاتی ہے۔"

سمرن کور نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے سویٹر پھیلایا۔

"تیرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے، بس دھاگے کو یوں پکڑا کر اور سلائی چڑھا کر بُنتی دیکھ لیا کر۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر گرے گا ایک دم پتا چلے گا اور اُسے اٹھانا آسان رہے گا۔"

گُربچن نے داہنے ہاتھ کی چھنگلی کے اُوپر سے دھاگے کو بل دے کر دکھایا۔ اُس کے بیٹھے بیٹھے سمرن کور نے چند سلائیاں چڑھائیں اور اُس بُنائی کی صفائی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس کی گرم جوشی! اُس نے بُنا ہُوا سارا سویٹر اُدھیڑ اور نئے سرے سے بُننا شروع کر دیا۔

"تو تو کبھی بُنتی نہیں، تجھے یہ سب کیسے معلوم ہے؟" سمرن کور نے گُربچن کو ٹٹولا۔

"کام کی باریکیاں کام کرنے ہی سے کھلتی ہیں یا کسی کے بتانے سے۔ مَیں سلائی اور سوئی کے کام میں ماہر ہوں۔ ماں اون کات رہی ہے۔ مَیں پہلا سویٹر بھائیا جی کے لئے بناؤں گی۔" بھابی نے بھائیا جی کے لئے اپنا پیار جتاتے ہوئے کہا۔"

"تو سارا وقت گھر میں پڑی کیا کرتی رہتی ہے؟ کبھی مل بیٹھنے کے لئے آیا کر۔" سمرن نے اپنی ٹوہ میں رائے دی۔

وقت کہاں ہے سمرن! جب کہیں تھوڑا ملتا ہے مَیں ہزارہ (وہ پھلکاری جس میں ہزار پھول ہوں) بناتی ہوں۔"

"تجھے ہزارہ کیا کرنا ہے؟" سمرن نے تجسّس بھرے انداز میں پوچھا۔

"کل ترسیم کور کے لئے ضرورت پڑے گی" بھابی نے دور اندیشی سے کہا۔

"اُس کے لئے! ابھی سے!!" سمرن نے متحیّر ہو کر سوال کیا۔

بھابی! لڑکی تُرئی کی طرح بڑھتی ہے۔ اِس کے بارے میں آج سے سوچنا چاہیئے۔" اپنی دور اندیشی کی ضمانت میں بھابی نے مثال دی۔

پھلکاری، پنجابی تہذیب کا ایسا باغ ہے جس کے گل بوٹے کپڑے پر دھاگوں سے اُگائے جاتے ہیں۔

چوں کہ پھلکاری کو لڑکی کا سہاگ سمجھتے ہیں، اور ماں باپ سے بچھڑنے کی نشانی، اِسے کاڑھتے ہوئے لڑکیاں کیسے دردانگیز اور حسرت آمیز سہاگ گاتی ہیں! اُن کے کلمے کتنے مخصوص، کتنے نادر، کتنے لبریز ہوتے ہیں۔ اِس کے باوجود اُن کی شدّت بقدرِ احساس ہے۔

گھڑ لیا سُنار یا، سونے دے تار وے (او سُنار! میرے لئے سونے کے تار بنا کر لا،
اِسیں وِچھڑ جاناں، کونجاں دی ڈار وے (قازوں کی ڈار کی طرح ہم نے بچھڑ جانا ہے،
کئی اُچے گئیاں، کئی لمّے گئیاں (کئی بہت اِدھر گئی ہیں اور کئی بہت اُدھر گئی ہیں،
کئی گئیاں سمندروں پار وے (اور کئی سمندر کے پار گئی ہیں،
گھڑ لیا سُنار یا سونے دے تار وے، (او سُنار! میرے لئے سونے کے تار بنا کر لا،
گھڑ لیا سُنار یا سونے دا ڈھولنا (او سُنار! میرے لئے سونے کا ڈھولنا، پیار سے پریتم کو کہتے ہیں، بنا کر لا،
اسیں وِچھڑ جاناں مکھوں نہیں بولنا، (ہم نے اپنے ماں باپ سے بچھڑ جانا ہے لیکن مُنہ سے کچھ نہیں کہنا ہے۔
کئی اُچے گئیاں، کئی لمّے گئیاں، (کئی بہت اِدھر گئی ہیں، کئی بہت اُدھر گئی ہیں،
کئی گئیاں سمندروں پار وے (اور کئی سمندر کے پار گئی ہیں،

اسیں تیرے باگاں دِیاں کلیاں وے بابُلا (اے بابُل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں
امبڑی دا ویڑا چھڈ چلّی آں وے بابُلا، (اے بابُل! ہم اپنی ماں کا گھر چھوڑ چلی ہیں
تیرے گھر دیکھی کسی چیز دی نہ بھکھ وے (تیرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔
تیرے گھر پائے ساری دُنیا دے سُکھ وے (تیرے گھر میں ہم نے سارے جہاں کے سُکھ پائے ہیں
اسیں تیرے باگاں دِیاں کلیاں وے بابُلا (اے بابُل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں۔
پیڑیاں دے پچھے وِچوں دُور ٹُر چلّی آں (میں تیرے خاندان سے بہت دُور جا رہی ہوں
رسماں توں ہوئی مجبور ٹُر چلّی آں (ریتوں، رواجوں سے مجبور ہو کر جا رہی ہوں
راجیاں توں ریتاں نہیں ٹلیاں وے بابُلا (اِن ریتوں، رواجوں کو راجے بھی ٹال نہ سکے
اسیں تیرے باگاں دِیاں کلیاں وے بابُلا (اے بابُل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں

بھابی کے سہاگوں کی جاں گدازی اور گُل سازی ایک دوسرے کے مُتقابِل تھی۔ سوزن کاری کے کام میں، سُوئی میں دھاگا ڈالنا، بے حقیقت سا عمل ہے لیکن بھابی کے ہاتھ اُسے ہُنر بنا دیتے تھے۔ ہاں، سُوئی میں دھاگا ڈالتی تھی جب کہ بھابی، دھاگے میں سُوئی، پھر دھاگے کو ناکے میں سے ایسے کھینچتی کہ لمبی تُرپن بھرتی لگتی۔ پھلکاری کے حاشیے

بر چھوٹی چھوٹی کمانوں کی باڑ تھی، جن میں اُن کی جسامت کے لحاظ سے گل لالہ تھے۔ پھلکاری کو کئی کیاریوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر بیل، کیاری کے ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک جاتی تھی۔ بیل کے دونوں طرف شاخیں، کُنڈیوں کی طرح پُھوٹتی تھیں اور اُن میں سے پتیاں اور پھر پھل۔ جہاں شاخ ختم ہوتی تھی، وہاں پُھول کِھلتا تھا۔ چُوں کہ وہ پھلکاری رنگ دَر رنگ کچّے ریشم سے کاڑھی ہُوئی تھی، اِس لئے ہرے میں لال، لال میں پیلا اور پیلے میں ہرا رنگ دوڑتا دکھائی دیتا تھا۔

لیکن بھابی کی دُور اندیشی اور ہنروری کسی کام نہ آئی۔ ایک شام ماں برآمدے کے چُولہے پر روٹی پکا رہی تھی۔ بھابی چُولہے کے سامنے بیٹھی روٹی سیک کر اجیت سِنگھ کو پروس رہی تھی، جو پاس ہی چارپائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کوئی بات ہُوئی اور بھابی کِھلکھلا کر دوہری ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ماں بھی ہنسنے لگی۔ کہتے ہیں کہ ہنسی متعدی ہوتی ہے اور اکثر روکنے سے رُکتی نہیں ہے۔ وُہی بات ہُوئی۔ ماں اپنے رَس میں روٹی پکانی بُھول گئی اور بھابی روٹی پروسنی۔ اُس کی اوڑھنی نیچے ڈھلک گئی اور جوانی کی ساری بے حجابی، سینے پر ناچنے لگی۔ عین اُس وقت، جب گھر کی فضا مستی و سرشاری سے جُھول رہی تھی، بھائیا جی باہر کے دَروازے میں دِکھائی دیئے۔ اپنے جذبات کی رَواداری میں کسی نے اُدھر دھیان نہ دیا۔ پردے کا رواج تھا اور بڑوں بُوڑھوں پر فرض تھا کہ وہ اپنی آمد کی اِطلاع کسی نہ کسی طریقے سے کریں، کھانس کھنکار کر، کسی بچّے کا نام پُکار کر، دَروازہ کھٹکھٹا کر...... تاکہ بہو بیٹیاں پردہ کر سکیں۔ اِس رواج کی طرفداری میں کسی نے خُوب کہا ہے۔

گھر بڑّا کھڑک نہیں کردا
بابے گل ٹل پا دیو

(بُوڑھا، گھر میں دبے پاؤں چلا آتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی اِس کے گلے میں گھنٹا باندھ دے)

اِسی طرح کوئی بہو اپنے سُسر کی تاک جھانک کا شکار ہُوئی ہوگی۔ اُس نے اپنے مجروح جذبات کو جن سخت لفظوں میں بیان کیا ہے، اُن سے بے رحمی ٹپکتی ہے۔

کورے کورے کُجّے وِچ مرچاں میں رگڑاں
سوہرے دیاں اکھاں وِچ پا دُوں گی
گھُنڈ کڈھنے دا ریڑ کا مِٹا دُوں گی

(مَیں کورے کُوجے میں اِس لئے مرچیں رگڑتی ہُوں کہ میں اِنہیں اپنے سُسر کی آنکھوں میں ڈالنا چاہتی ہُوں۔ وُہ اندھا ہو جائے گا تو گھونگٹ نکالنے کا کشٹ جاتا رہے گا)

مَیں کھُرلی (ناند) پر کھڑا سانی کر رہا تھا۔ مَیں نے بھائیا جی کو آتے دیکھا اور بھابی کو آواز دے کر خبردار کیا

تب تک وہ اندھے سور کی طرح دھنس دیتے ہوئے، چوکے میں پہنچ گئے۔ انہیں یکایک سامنے پاکر بھابی بوکھلا گئی۔ اوڑھنی اُس کے زانو پر پڑی تھی، جو اسے ہڑبڑی میں نظر نہ آئی۔ وہ افراتفری میں اٹھی، اوڑھنی میں اُلجھ کر گرتی گرتی بچی اور اپنا بھرپور سینہ ہاتھوں سے ڈھانپتی ہوئی، دالان کے اندر بھاگ گئی۔

خوں خوار جذبے کی انوکھی خصوصیت ہے! یہ تب خوں خواری پر آمادہ ہوتا ہے، جب اِس میں درندگی کا عنصر ملتا ہے۔ غضب ناکی کے اُس مقام پر پہنچنے کے لئے عام آدمی کو صورتِ حال کے مطابق کئی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن درندگی میں میرے بھائیا جی کا اِن مدارج سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ وہ طبعاً خوں خوار تھے۔

وہ اجیت کے گلے پر لپکے، اُس نے روکا، انہوں نے چارپائی اُلٹ دی۔ وہ بلندی پر سے لڑھکتے ہوئے پتھر کی مانند دیوار کے خلاف ٹکرا کر رُکا۔ اُس کی تھالی جھنجھناتی ہوئی بیری کے پاس گری، سالن کی توڑی (مٹی کی ہانڈی) کھڑونچی پر ٹوٹی اور پانی کی صراحی دیوار پر۔ روٹیوں کا چھابہ اُڑتی ہوئی طشتری کی طرح گھومتا ہوا گھر سے باہر گلی میں پڑا اور وہی حشر آٹے کی پرات کا ہوا۔

ٹائیگر دُم ہلاتا ہوا بھائیا جی کے ساتھ چوکے تک پہنچا تھا۔ وہ پہلے دھماکے پر چونکتا ہوا اور پیچھے ہٹا لیکن خاموش رہا جیسے تصادم کا راز سمجھ رہا ہو۔ بھائیا جی کا توڑنا پھوڑنا جاری رہا تو وہ انہیں بھونکنے لگا۔ اُس کے سوائے ہر کسی کی زبان پر فالج گر گیا۔ اُس کی جرأتِ فریاد اُن پر ناگوار گزری۔ انہوں نے اُسے نوں گھونسا مارا۔ وہ وار بچا گیا اور پہلے سے زیادہ شدت سے بھونکنے لگا۔ اُس کے اِحتجاج کو پورا کچلنے کے لئے، انہوں نے پھاوڑا اُٹھایا اور اُس کا پیچھا کیا۔ ایک بالٹی لانگھن میں پڑی تھی، وہ اُس سے ٹکرا گئے اور گر پڑے، بالٹی کو کوستے ہوئے اُٹھے اور دوبارہ ٹائیگر پر لپکے۔ وہ بھاگتا، رُکتا، بھاگتا، رُکتا بھونکتا رہا اور اپنی آواز بُلند کرتا رہا۔ وہ اُسے خاموش نہ کر سکے، پلٹ آئے اور اپنی ناکامی کا بدلہ اوٹے سے لینے لگے۔ ایک اینٹ چولہے میں جلتی لکڑی کے پچھلے سِرے پر گری، جو اُڑ کر اُن پر پڑی۔ انہوں نے اُسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا، اُٹھایا اور اُسے چولہے پر توڑ دیا۔

اُن کے پیچھے پیچھے ٹائیگر بھونکتا ہوا لوٹ آیا اور اُن کی شدتِ ناروا پر اِحتجاج کرتا رہا، جو کسی اور کا مقدور نہ ہوا تھا۔

میرے والد کا نطفہ تخلیق ہوا تو اُس کے خالق نے جہاں اُسے ہر مادی خوبی سے مالا مال کیا وہاں اُس میں ہر روحانی نزاکت کا فقدان رکھ دیا۔ اُن کا ہر انگ، اِنسانی جذبے کی مخالفت میں شیطان کی طرح صف آرا رہتا تھا اور یہی اُن کی خوں ریز سفاکی کا راز تھا۔ اُس نطفے کی تقدیر! وہ پیدا نہ ہوتا تو جم راج ہوتا۔

گھر میں ایسے جاں فگار لمحے آتے تھے تو ہر کوئی خوف زدہ ہو کر یا اُس بربادی کی تاب نہ لا کر آنکھیں نیچی

کر لیتا تھا۔ کوئی اعتراض کرتا تھا تو ٹائیگر! وہ اپنے رویّے سے اِس کہاوت کی تائید کرتا کہ کتا موت کے فرشتے کو دیکھ لیتا ہے، اُسے بھونکتا ہے اور انسان پر وار کرنے سے روکتا ہے، روک نہیں سکتا ہے تو اپنی بے بسی پر روتا ہے اور یُوں اُس نوالے کا حق ادا کرتا ہے جو اُسے گھر گھر سے ملتا ہے۔

اجیت سنگھ غم کے لوندھے کی طرح وہیں پڑا تھا جہاں وہ گرا تھا۔ یہ فرطِ ہیبت کا اثر تھا کہ وقتی طور پر ٹائیگر کے سوا ہر چیز مر گئی تھی۔ کسی طرح اجیت سنگھ میں جان پڑی۔ وہ آنکھیں جھکائے اُٹھا اور سامنے پڑی پگڑی کی جانب دیکھنے لگا جیسے اپاہج ہو۔ اُس نے کانپتے ہوئے پگڑی اُٹھائی، گھسیٹن پر مجبوری سی نگاہ کی اور باہر کی راہ لی۔ اُس کی حرکت سے ہر کوئی بے نیاز رہا لیکن ٹائیگر دُم ہلاتا آگے بڑھا اور اُسے چاٹتا ہوا ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں سہمے سہمے اور کمزور کمزور صحن سے برآمدے اور برآمدے سے گلی میں اُترے، داہنے مڑے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں نے بھینس کے پیچھے دبکے ہوئے وہ خونی تماشا دیکھا اور چاہتے ہوئے کسی کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ بھابی کی گھٹی گھٹی چیخوں سے کمرے کے اندھیرے دہل رہے تھے اور ماں کے ہیجانی بینوں سے باہر کے اُجالے۔ وہ اپنی بُری تقدیر کے ساتھ اُس ابھاگی گھڑی کو بھی پیٹ رہی تھی جب اجیت سنگھ، دُکان جلدی بند کر کے گھر چلا آیا تھا۔

اُس ویران شام کی کہانی لمبی ہو کر بھی چھوٹی ہے!

گھر کی فضا مجروح اعضا کی طرح نیلی نیلی تھی۔ درو دیوار طوفان میں گھرے درختوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ میری رُوح کی پستی اُس تاریک غار کی طرح تھی جس کی اِبتدا ہو لیکن اِنتہا نہ ہو۔ مکینوں کی حالت افسوس ناک سے زیادہ عبرت خیز تھی۔ بھائیا جی کے باولے پن سے بوکھلا کر مویشی جُگالی کرنا بھول گئے تھے اور بیری پر چہچہاتے پرندے ڈر کر چُپ سادھ لئے تھے جیسے کسی مآل اندیشی سے خوف زدہ ہوں۔ ماں کے بین، درو دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر ایسے لوٹ رہے تھے جیسے وہ اُن کی شدّت کو جذب نہ کر پا رہے ہوں۔ وہ خاموش ہوئی تو گھر میں بے چین سنّاٹا تھا جس کی دہشت انگیزی، شورِ فغاں سے زیادہ ہولناک تھی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی تھی، سہمی سہمی، سکڑی سکڑی، ڈری ڈری۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے بوجھ کے ساتھ ہزاروں نادیدہ بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے لیکن کسی اندرونی شکتی سے خُود کو ٹوٹنے سے بچائے ہوئے ہے۔

اور بھائیا جی، صحن کے درمیان کھڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی اِنسان نما ٹھنٹھ زمین میں سے اُگ آیا ہو اور اپنے بے حس وجود پہ نازاں ہر نازک شے کو حقارت سے دیکھ رہا ہو۔

اور صبح بے نُور سی بے نُور تھی! خانہ داری کے سارے حیات پرور معمول لہو لہان پڑے تھے۔

بھینس دُودھ دینے کے لئے بیتاب زمین دل رہی تھی۔ بھوکے بیل دروازے کی طرف مُنہ اُٹھائے دیکھ رہے تھے۔ صحن کوڑے کرکٹ اور روندے ہوئے گوبر سے اَٹا پڑا تھا، چولہا ٹھنڈا تھا اور وہ بیرا (وہ برتن جس میں دہی جمایا

جاتا ہے) پیڑھی سے بندھا تھا۔ میں بھوکے پیٹ سکول روانہ ہوا تو میری انتڑیاں موت کو پکار رہی تھیں۔ ٹائیگر گھر میں تھا لیکن اجیت سنگھ کا مطلق اتا پتا نہیں تھا۔

افسوس، ہزار افسوس! وہ بربادی ہمارے غم کی حد نہ تھی۔ بے رحم وقت کے ترکش میں مہلک تیر اور بھی تھے، صرف ہمارے ہی زخموں کو ان کی فلاکت کا اندازہ نہ تھا۔

بسنت نے اندھیرے کے کیڑے کی طرح اجالے کا منہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس کا باغ و بہار چہرہ، آنسوؤں سے مرجھا گیا جیسے آب زدہ سبزہ۔ بڑا سانحہ یہ ہوا کہ وہ خود کو اس بدبختی کی بنیاد سمجھنے لگی۔ اس کی آنکھوں نے پانی کی مہین سی چادر اوڑھ لی، وہ دیکھتی تو اسی چادر کے پیچھے سے جھانکنے لگتی۔ اس نے نہانا، کپڑے بدلنا اور کنگھی پٹی کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے کالے گھنے ریشم سے بال، کھردری جٹاؤں سے ہو گئے۔ وہ بات کرتی آہ بھرتی لگتی، سست سست چلتی جیسے بوڑھی ہو گئی ہو۔ ماں کی کوئی دل ربائی اور خاطرداری کام نہ آئی۔ بھابی اپنی زندگی، بیوہ کی طرح گزارنے لگی۔

ماں کی اپنی حالت غیر طبعی تھی۔ وہ کئی بار کام کرتی کرتی رک جاتی اور اسے غیر مانوس نظروں سے گھورتی۔ وہ چکی پر بیٹھی تھی، مجھے بے اعتبار سی لگی۔ میں نے اس کی آنسو بھری اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دیکھا، اسے ہلایا اور تشویش سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا، "ماں! ماں! تم ٹھیک ہو!"

میرے سنبھالتے سنبھالتے، وہ اس طرف گر گئی جدھر تھوڑی جھکی ہوئی تھی۔ اس کے دنیاوی رنج روحانی عذاب بن گئے۔ ہماری خوشیوں کے پھول کھلتے ہی مرجھا گئے۔ میری ماں بھائیا جی سے اجیت سنگھ کے بارے میں پوچھتی۔ وہ اس کی پوری بات سنے بغیر کہتے، "وہ کوئی لڑکی ہے جس کا تجھے رانسا چڑھا ہوا ہے! جہاں ہوگا ٹھیک ہوگا"

کوئی اور بھائیا جی سے اجیت سنگھ کے بارے میں پوچھنے کی ہمت کرتا تو وہ پوری بے حسی سے کہتے، "جب تک اس کے مرنے کی خبر نہ آئے، وہ زندہ ہے!" بھائیا جی زور زور سے زمین پر پاؤں مارتے اور بے حس تیقن سے کہتے، "ارے وہ جائے گا کہاں! اس کی جڑیں یہاں ہیں! یہاں! یہاں! یہاں!! یہاں ں ں!!!"

بوٹا سنگھ کو دیکھنے سے لگتا تھا کہ تاریخی کہانیوں کا کوئی سفید ریش درویش، تاریخ کے اوراق سے نئی دنیا کا نظارہ کرنے کے لئے نکل آیا ہے۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے بدن پر چولا، پاؤں میں کھڑاؤں، بغل میں بیراگا اور ہاتھ میں تسبیح نہ تھی۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ جاتا اور اونچی آواز میں بھائیا جی سے پوچھتا، "رتن سیاں! بیٹے کی خبر سار ملی ہے کیا؟"

ہر نقطہ نشانِ امتیاز ہے اور اپنی جگہ نیک علامت لیکن یہ جس نیت سے برتا جائے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

"بوٹا سیاں! خبر سار کیا کرنی ہے؟ پانچ ہیں! ایک مر بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا؟"

بھائیا جی کا بے حس انداز اِس بات کی گواہی دیتا کہ وہ گھر کے پشوؤں یا پکشیوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

"ارے بہُو کا کیا ہو گا؟!"

بُوٹا سنگھ بظاہر محرم کی طرح دِل کو مسوستا لیکن اُس کا اِرادہ اور ہوتا۔

"اُس کا کیا ہو گا؟ اُس پر چھوٹا چادر ڈال لے گا!"

بھائیا جی اِس اطمینان سے کہتے جیسے اُن کی بہُو، منقولہ جائداد تھی جسے وہ کسی کو بھی سونپ سکتے تھے۔

"یہ ہے مَردوں والی بات! یہ ہے مَردوں والی بات!!"

بُوٹا سنگھ، اُن کی بے دردی کو سراہتا ہُوا چھت سے نیچے اُتر جاتا۔ بھائیا جی اپنے آپ کو ایسے دیکھتے جیسے کوئی کتا اپنے بہتے ہُوئے زخم کو دیکھتا ہے اور اُسے چاٹ کر محسُوس کرتا ہے کہ وہ، اُس کی لذّت جِہن کا وسیلہ ہے۔ مظلُوم اور بے کس بھابی ایسے رُوح فرسا جُملے سُن کر کلیجہ پکڑتی، گرتی اور پچھاڑیں کھاتی۔ اُس کے مُنہ سے جھاگ سی بہنے لگتی اور وہ یُوں تڑپتی جیسے کوئی شکار، شکاری کا تیر کھا کر تڑپتا ہے۔

اور پھِر بھابی کو متلی ہونے لگی۔ ماں نے اُس کے حاملہ ہونے کی تصدِیق کر دی اور اُس کے میکے سندیسا بھیج دیا۔ اُس کا بھائی اُسے لینے آیا اور وہ دونوں ٹال کے رستے گھر گئے۔ بھائیا جی سُنسان ٹال میں ایک لکڑی پر بیٹھے تھے جیسے ویرانے میں اُلّو۔ بھابی شلوار کے اُوپر لہنگا پہنے اور گھونگٹ کاڑھے جلدی سے آئی اور اُن کو ماتھا ٹیک کر چلی گئی۔ عداوت پسند اِنسان کے لئے محبت ایسے ہے جیسے کُتّے کے لئے خوشبُو۔ بھائیا جی اُسے دیکھ کر گھبرائے تلملائے اور بڑبڑا کر اُٹھے جیسے اُس پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ مَیں پاس ہی کھڑا تھا۔ اُن کی آدم شکار فطرت پر کسمسا کر رہ گیا۔ اُن کی اذیت خواہی، اذیت ایجادی تھی۔ میرے پیٹ میں سے غم کا غُبار اُٹھا اور دِل سے ٹکرا کر طُوفان بن گیا۔ اُس کی تُندی جانے مجھے کہاں اُڑا کر لے جاتی اگر بھابی میرا بازُو تھام کر مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔ اُس کا نفیس لہجہ حیرانی سے زِیادہ میری پریشانی کا باعث تھا۔ مَیں نے زخم کی طرح چیخ کر کہا، "بھابی! آپ یہاں کیوں آئی تھیں؟ اِس پاپی کے پاؤں چھوئے بغیر آپ میکے چلی جاتیں تو کیا آسمان ٹوٹ پڑتا؟"

میری بات اُس کی دُکھتی ہُوئی رگ کو چھو گئی اور وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ مَیں بھی رونے لگا۔ ہم دیر تک روتے رہے۔ اُس کی راہ کھوٹی ہونے لگی تو اُس کے بھائی نے ہمیں دِلاسا دیا اور ایک دُوسرے سے جُدا کیا۔ وہ خُود غم گرفتہ تھا۔ بھابی نے دُوپٹے سے پہلے میرے آنسُو پُونچھے، پھر اپنے اور سسکتے ہُوئے رُک رُک کر بولی، "کون جانے! مَیں لوٹ کر آؤں، نہ آؤں! مَیں بد اخلاقی کیوں کروں؟ مَیں نے ......"

مَیں اُس کے غم انگیز جذبات و آداب کی تاب نہ لا سکا۔ وہ کچھ اور بھی کہتی اگر مَیں، اُس کے مُنہ پر ہاتھ

نہ رکھ دیتا۔ میرے روکنے سے وہ بے قابو ہوگئی جیسے دِل کا اُبال نہ نکلنے سے ہوتا ہے۔ اُس سے متاثر ہوکر میں پھر بے قابو ہوگیا۔ ہم سیلاب زدہ کناروں کی طرح تھے جو طُغیانی ہی میں ایک دُوسرے سے ملتے ہیں اور ویرانی میں جدا ہوجاتے ہیں، جُدائی کے صدمے میں ایک دُوسرے کو حسرت سے تکتے ہیں اور اُس طُوفان کا اِنتظار کرتے ہیں جو اُن کے وِصال کا وسیلہ ہُوا تھا۔ بھابی چاروناچار چلی گئی۔ وہ آگے چلتی چلتی پیچھے مُڑکر دیکھتی جیسے واپس آنا چاہتی تھی۔ میں وہیں کھڑا رہا، کمزور کمزور اور اُداس اُداس۔ اُس کا سراپا چھوٹے سے چھوٹا اور مدھم سے مدھم ہونے لگا اور ہوتے ہوتے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا گویا ایک سِلسِلہ ٹُوٹ گیا۔

میں ڈانوں ڈول حالت میں اپنی راہ نہ پا رہا تھا کہ بھایا جی ٹال سے باہر نکلے۔ وہ مجھے دیکھتے دیکھتے گھورنے لگے جیسے میرے وہاں کھڑے رہنے کا سبب پُوچھنے لگے۔ اُن کی نظروں کی گرفت! میں اُدھر کھِنچنے لگا۔ اجیت سنگھ ہی جانے! وہ اُس گرفت سے کیسے آزاد ہُوا تھا؟

کہاوت ہے، "روتے گئے موئے کی خبر لائے۔"

میری بھابی اِس کہاوت اور اپنی بات پر کھری اُتری۔ وہ واقعی لوٹ کر نہ آئی اور اپنے بچّے کے ساتھ زچگی میں مرگئی۔

باب ۱۷

خُدا کیسا، کہاں کا دیر و کعبہ!
یہ آدم ہی نے سب فتنے جگائے (شاطر)

اور پھر ماتموں کا سِلسلہ شُروع ہوتے ہی بند ہوگیا۔ بھایا جی بھابی کے کریاکرم پر نلو آگئے اور سمدھی سے صاف لفظوں میں کہہ آئے، "اور آنے جانے کی ضرُورت نہیں ہے!"

اجیت سنگھ کی جڑیں، عین الیقین رتن سنگھ کے گھر میں تھیں۔ وہ مرا بھی نہ تھا اور اپنی بیوی کے مرنے پر زندہ لوٹ بھی آیا تھا۔ اُسے مغمُوم دیکھ کر بھایا جی اُسے پرساد دیتے، "کام و دہن کا سواد بدلتا رہے تو خوشی کی بات ہے! تو کم بخت کس لئے رنجیدہ ہے؟"

دھارمک اصُولوں کی بنیاد پر اپنی بیوی کی اگنی کریا کرکے، کپال کریا، اجیت سنگھ ہی نے کی تھی۔ وہ اُس کے سپنے میں آتی اور اُس سے کہتی، "میں مری نہیں تھی تُو نے مجھے زندہ جلایا ہے!"

اجیت سنگھ بیمار بیمار رہتا، خواب میں ڈرتا، اور چیختا ہُوا اُٹھ کر بھاگتا۔ بڑی بُوڑھیاں کہتیں، "منحوس چلّے میں مری ہے اور چڑیل کی جُون پڑی ہے۔ میلو! ننتے چمار سے گھر کیلوالو۔"

تایا جی ایسی خُرافات بکنے والوں کو سمجھاتے، "ہر حادِثے کا نفسیاتی ردِ عمل ہوتا ہے جو مٹتے مٹتے ہی مٹتا ہے۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا، اِسے اِس کے حال پر رہنے دو اور کام میں دِل لگانے دو۔"

زِندوں کی نِسبت مُردوں سے مصالحت آسان ہے۔ کہیں بھابی کا ذِکر آتا تو اُسے سُرگ باسی کے نام سے یاد کیا جاتا اور اِحترام سے اُس کی ہڈیوں کو پھول کہا جاتا، جنہیں گنگا میں بہایا گیا تھا۔

باب ۱۸

ہجُومِ شوق کے پردے سے شاطر
کوئی کیسے حقیقت دیکھ پائے
(شاطر)

میری زِندگی میں کسی ایسے آدمی کو دخل نہیں ہے جسے اہلِ علم وفن جانتے ہوں، میں اُن لوگوں کے ساتھ بڑا ہوا جن میں سے کئی گاؤں کی حُدُود کے باہر اجنبی تھے۔ وہ لوگ جیسے بھی تھے، میرے شب و روز کا اِس قدر اہم حِصّہ تھے کہ اُن سے دُور رہنا، سانس روکنے کے برابر ہے۔

جھیوروں کے گھر میں بھیانک غریبی تھی۔ وہ اُبالا سبالا کھاتے تھے اِس کے باوُجود ہٹّے کٹّے تھے۔ میں تگڑے بچّوں پر رشک کرتا تھا اور اُن کی طاقت کا راز جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ اُن کے بارے میں سب کچھ جانتے ہُوئے میں نے رام کِشن سے پُوچھا، "تو کیا کھاتا ہے؟ جو اِتنا موٹا تازہ ہے!"

"مرد مکھن!" اُس نے بے ساختہ کہا اور اپنی پھٹی ہُوئی آستین میں سے ڈولا پھُلا کر دکھایا "اِدھر دیکھ! مرد مکھن کا اثر۔"

مینڈک کے غدُودوں جیسے پھُولے ڈولے دیکھ کر میں اِس قدر مُتاثر ہوا کہ بھاگا بھاگا ماں کے پاس گیا اور اُس سے شِکوہ کیا "ماں ماں! میں اِس لئے تگڑا نہیں ہوتا کہ تُم مجھے کھانے میں مرد مکھن نہیں دیتیں!"

"کس نے کہا تجھ سے؟" ماں نے پچکار کر پُوچھا۔

"رام کرشن نے" میری معصومیت! میں نے جھٹ بتا دیا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"باہر گلی میں"

میری جان بچ گئی اور رام کِشن کی شکنجے میں آگئی۔ ماں نے پُوچھ تاچھ کئے بغیر اُس کے تڑا تڑ تھپڑ جڑ دیئے اور چیخ کر کہا، "پھر بچّوں کو خُرافات سکھانا، تیری ہڈّی پسلی ایک کر دُوں گی!"

دیسراج، رام کرشن کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ جو کچھ تھا آزاد مرد تھا اور مجھ سے تین چار سال بڑا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا،

ناک میں نتھ نہ پیر میں پگّا
سب سے بھلا کمہار کا گدّھا

وہ کسی رمتے جوگی کے ساتھ نکل جاتا اور مہینوں لوٹ کر نہ آتا۔ میں اُس کے بے ضابطہ چلن کا مدّاح تھا۔ اُس کے کردار کی دلکشی اُس کی انوکھی باتیں تھیں جنہیں وہ پوری سنجیدگی سے سناتا تھا۔ اُس نے مجھے بہادر بننے کا نسخہ بتایا، "تو کسی بچے کو مار کر اُس کا خون پی لے اور کلیجہ کھالے، تجھ میں دس آدمیوں کا بل آجائے گا!"

"تو نے ایسا کیا ہے؟" میں نے کچھ ڈر کر اور کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہے!" اُس نے دھڑلے سے کہا۔

"کہاں! کس کو مارا تھا؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"جالندھر کے پاس ایک گاؤں میں پانچ سال کے بچے کو مار کر اُس کا خون پیا تھا اور کلیجہ کھایا تھا۔"

اُس نے کچکچی باندھ کر اپنے ہاتھ ہلائے جیسے اپنے خیال میں اُس دیرینہ عمل کو تازہ کر رہا ہو۔

"کسی کو جان سے مارنا اتنا آسان ہے؟" میں نے ڈر کر پوچھا۔

"بالکل آسان ہے!" اُس نے لاپرواہی سے کہا جیسے کسی کو جان سے مارنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔

"کیسے؟" اُس کے نڈر رویّے سے میری دہشت، حیرت میں بدل گئی۔

"تو کسی چھوٹے بچے کو بہلا پھسلا کر جنگل میں لے جا اور وہاں اُسے چھرا گھونپ دے۔" اُس نے اپنا ہاتھ آگے پیچھے ہلا کر کہا۔ زبان اندر باہر نکالی جیسے زبان سے پانی والا جانور، پانی پیتے وقت کرتا ہے۔ میں اُس کے مظاہرے سے بہت مرعوب ہوا اور اُسے دیکھتا رہ گیا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اُس نے بڑے فخر سے کہا۔ "جبھی تو میرا کلیجہ اتنا بڑا ہے!"

وہ بیٹھے بیٹھے اُٹھا اور پورے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا جیسے اُس کا کلیجہ اُس کے سینے سے کئی گنا بڑا تھا۔

"میں جہاں چاہوں، جس وقت چاہوں جا سکتا ہوں۔ تو ایسا کر سکتا ہے؟"

اُس نے سانس روک کر سینے پر زور سے مکّا مارا، جس سے دھماکا ہوا جو دور تک سنائی پڑا۔

اُس کا کلیجہ واقعی بڑا تھا! وہ جب چاہتا، جدھر چاہتا چلا جاتا اور کوئی اُسے روکنے کی جرأت نہ کرتا۔ اُس کی آزادہ روی ہی اُس کی بڑائی تھی۔ وہ جتنے دن گاؤں میں رہتا اپنی روٹی آپ کماتا، منڈی میں بوجھ ڈھوتا، قُفلی لگاتا، سبزی بیچتا، برتن مانجتا...... کھیتوں میں کام کرتا۔ وہ جو کام کرتا اُسی کی زبان بولتا اور اُس پیشے میں پرانا گھاگ لگتا۔

"تجھے خبر ہے؟ بھان سنگھ کا کلیجہ میرے کلیجے سے سو درجہ بڑا تھا۔"

اُس کے لب و لہجے کا انداز، چشم دید گواہ کی طرح تھا۔ دراصل وہ جو بات کرتا تھا اُس کی سچائی کی ضامنی بھرتا تھا اور اُس کے چلن سے لگتا تھا کہ وہ سچ بولتا ہے۔

بھان سنگھ مشہور ڈاکو تھا جس کے معرکوں کے منظوم قصے میلوں اور چوپالوں میں گائے جاتے تھے۔ وہ تین منزلہ مکان کی بالائی منزل میں تھا کہ اُسے پولیس نے گھیر لیا۔ پولیس سیڑھی کے راستے اُوپر چڑھی اور وہ پیپڑھی پر بیٹھ کر نیچے کود گیا۔ پیپڑھی ٹوٹ گئی لیکن اُسے آنچ نہ آئی اور وہ للکاریاں مارتا ہوا پولیس کے سامنے فرار ہو گیا۔

"واہ! کیا آدمی تھا وہ! اتنا دلیر اور نڈر!" مَیں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا لیکن اُس کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ "تایا جی کہتے ہیں کہ آدمی جو بنتا ہے، اپنے دماغ سے بنتا ہے، نہ کہ اعضا سے!"

"آدمی اپنے دماغ سے کچھ بھی بنے لیکن دلیر اور نڈر کلیجے ہی سے بنتا ہے! اور کلیجہ اُسی کا بڑھتا ہے جو بچپن ہی سے مار دھاڑ اور خوں خرابا کرنا سیکھتا ہے۔" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

وہ کہتا تھا کہ دُنیا میں سب سے بڑا کلیجہ پٹھان کا ہوتا ہے اور سینے میں اِس پاسے سے اُس پاسے تک پھیلا ہوتا ہے۔ وہ مومیائی کھاتے ہیں جس سے کلیجہ بڑھتا ہے۔ وہ مومیائی بنانے کا طریقہ بتاتا تھا۔ جو کس قدر بھیانک ہے! پٹھان غیر پٹھان کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں، اُس کا سر مونڈ کر اُسے گرم تیل کی کڑاہی پر اُلٹا لٹکاتے ہیں اور کھوپڑی پر اُسترے سے پچھنے لگاتے ہیں۔ اُن میں سے جو خون گرتا ہے وہ تیل میں پک کر مومیائی بنتا ہے۔

سویگ سنگھ پڑھنے لکھنے میں ایسا ویسا ہی تھا۔ مَیں اُس کے بعد سکول میں داخل ہُوا اور اُس کے آگے نکل گیا۔ وہ اکثر فیل ہوتا، اُس کا باپ لال سنگھ مجھ سے کہتا، "میرے بیٹے کی نقل مارنے والے پاس ہو جاتے ہیں اور میرا لڑکا فیل!"

وہ اپنے طور پر سویگ کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ نالائق ہے لیکن دُوسروں کے سامنے اُس کی بڑائی ہی کرتا تھا۔ وہ اُسے مُبالغہ آمیز طریقے سے سراہا کرتا تھا۔ "سویگ کے اُستاد اُس کی قابلیت کو نہیں پہنچ پاتے ہیں اِس لئے اُسے فیل کر دیتے ہیں۔"

لال سنگھ میری کامیابی پر تبصرہ کرتا، "تُو نے پڑھ کر جو اکھاڑنا ہے، مجھے معلوم ہے! بڑھئی کیا اور پڑھائی کیا! پڑھنا لکھنا برہمنوں اور کھتریوں کا کام ہے۔"

مَیں کئی بار چاہتا کہ اُس سے پُوچھوں کہ تُو اپنے لڑکے کو کیوں پڑھاتا ہے؟ لیکن پُوچھ نہ سکا۔ سویگ سنگھ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا، جس کی وجہ عجیب ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میرا باپ چوری کا دھن لاتا ہے جسے کھا کر میری بُدھی بھرشٹ ہو گئی ہے۔

دیسراج اور سویگ سنگھ اور مَیں دوست تھے اور آپس میں کیسے کیسے رازوں میں شریک تھے!

بیلا رام مر گیا، ملوکا اور دیسراج اُسے نہلانے گئے۔ دیسراج اُسے نہلا کر واپس آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا، "بیلا رام کی رُوح نرک میں گئی ہے!"

"تجھے کیسے معلوم ہُوا؟" سوہگ نے متجسّس انداز میں پوچھا۔

"اُس کی رُوح، چوتڑوں میں سے نکلی ہے!" اُس نے ایسے یقین سے کہا جیسے اُس نے رُوح کو وہاں سے نکلتے دیکھا ہو۔

"رُوح نے وہاں کوئی نشانی چھوڑی تھی؟" اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سوہگ نے جلدی سے پُوچھا۔

"اُس کی ٹٹی نکلی ہُوئی تھی!" دیسراج اُسی وُثوق سے بولا۔

مَیں یہ بات کئی بار سُن چکا تھا کہ مانس کے شریر میں نَو اِندریاں ہیں اور دسواں دُوار۔ جو آتما دسواں دُوار کھول کر شریر سے نکلتی ہے وہی پرماتما سے ملتی ہے اور مُکتی پاتی ہے۔ لوک کتھاؤں میں ایسے کئی مہان پُرشوں کی کہانیاں تھیں جن کی آتما کو پرماتما لینے آیا تھا، سُورگ میں ڈنکے بجے تھے اور دھرتی پر سُنائی دیتے تھے۔

"مگر تایا جی تو کہتے ہیں کہ رُوح نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے!" مَیں نے اُس کی بات کو کاٹا۔

"تیرے تایا نے کون سا شاستر لکھا ہے؟ یہ شاستروں کی بات ہے۔ اگر آتما نہیں تو پرماتما بھی نہیں اور پرماتما نہیں تو کچھ بھی نہیں! یہ سرشٹی کس کے سہارے کھڑی ہے؟"

"تایا جی کہتے ہیں، اپنے سہارے کھڑی ہے۔ جیسے ہم کھڑے ہیں۔"

"تیرے تایا کو کیا معلوم ہے، وہ معلوم بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، شاستر، سادھوؤں، سنتوں یا برہمنوں ہی کی سمجھ میں آتے ہیں۔ شُودر پڑھ سکتے ہیں، سمجھ نہیں سکتے۔ اِنہیں برہما کا سراپ ہے، چلو سنت سے پُوچھ لو!"

تایا جی کے بارے میں ایسی باتیں مُجھے بُری لگتی تھیں لیکن مَیں اُنہیں برداشت کر لیتا تھا۔ اِس لئے نہیں کہ وہ تایا جی کی وِچار دھارا سے جُداگانہ تھیں، اِس لئے کہ تحقیر آمیز تھیں۔ ہم تینوں سنت گُرچرن سنگھ کے پاس گئے۔ عام و شواش تھا کہ اُسے شاستروں پر عبور حاصل ہے۔ اُس نے دیسراج ہی کی بات کو سچ ٹھہرایا اور یہ بھی کہا کہ جو مانس بھگوان کو نہ مانے وہ ناستک ہے اور نرک کا اَدھیکاری ہے۔ اُس نے ہرناکشک، جرا سندھ، راون کی مثال دی جو بھگوان کے بھگت تھے لیکن نرک میں پڑے تھے کیوں کہ وہ اپنے گیان پر گھمنڈ کرنے لگے تھے اور برہما کے لکھے ویدوں میں مین میخ نکالنے لگے تھے۔

مَیں نے سنت سے پُوچھا، "جب آدمی کے مرتے ہی اُس کی رُوح کو کرموں کے تُلنے پر جنّت یا دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے تو لوگ اُس کی مُکتی کے لئے پُوجا پاٹھ کیوں کرواتے ہیں؟"

پر ماننا چاہے تو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔ بگیرتھ کی سات کُل نرک میں پڑی تھیں اور پھر بگیرتھ کی بھگتی سے اُن کی مکتی ہُوئی تھی۔

سنت نے وُہی بات کہی جسے میں کئی بار سُن چُکا تھا۔ بگیرتھ، پرلاد، دھرُو..... اور کیئوں کے بارے میں ایسی کہانیاں تھیں، جن کی سچائی اتنی تھی کہ کہنے والے کی بات پر یقین کرو، شک کرو تو نرک میں پڑو۔

مَیں ایسی باتوں پر یقین نہ کرتا تھا لیکن خُدا کے تعلق سے میرے دل میں خوف بیٹھا ہُوا تھا، اِس لئے مَیں اُس کے وُجُود سے مُنحرف نہ تھا۔

گُرچرن سنگھ پرچار کیا کرتا تھا کہ مانس اپنی نَو اِندریوں جیسے دو آنکھوں، دو کانوں، دو نتھنوں، ایک مُنہ ایک مُوتنی اور ایک ہگنی کی وجہ سے ذلیل ہے۔ جِسے اِندریوں پر اِختیار ہے وُہ اوتار ہے۔ اوتاروں کے بارے میں ایسی کتنی کہانیاں گردِش میں تھیں کہ اُن کی گندگی اُس بھوجن سے اچھّی تھی اور پُر اعجاز بھی، جو عام اِنسان کھاتا ہے۔

پُورے گاؤں میں سنت گُرچرن سنگھ ہی کنوارا تھا۔ وُہ ہاتھ میں سُمرنی رکھتا تھا، گھٹ گھٹ رام نام جپتا تھا اور یہی دھرم کے عین مُطابق تھا۔ شاستر کہتے ہیں کہ جیسے تَن کے لئے صابُن ہے، مَن کے لئے رام نام ہے۔ اپنے مَن کی طرح وُہ تَن کو اُجلا رکھنے کے لئے ہزار جتن کرتا تھا لیکن اُس کی بدصُورتی بدستُور تھی۔ اُس کے نتھنوں کے زاویے، جو عام طور پر کانوں کی طرف ہوتے ہیں، آنکھوں کی طرف تھے، اِس لئے بانسے پر اُگے بال، ٹنڈی کی مُونچھوں کی طرح نظر آتے تھے۔ کانوں کے سیپوں پر کالی پھپھوندی جمی ہُوئی تھی۔ ابرُوؤں کے بال، اُن کانٹوں سے مُتشابہ تھے جن کے مُنہ ہر طرف ہوں۔ وُہ بالوں کو مُقدّس مانتا، غیر ضرُوری بالوں کی تراش خراش سے پرہیز کرتا، اور اُنہیں رُومال سے چھُوتا تھا۔ وُہ کنگھا کرتا اور جتنے بال جھڑتے اُنہیں اکٹّھا کر کے آگ میں جلاتا۔ وُہ سمجھتا کہ بالوں کو زمین پر پھینکنا اُن کی بے عزّتی کرنا ہے۔ کوئی کام نہ دھام، وُہ رام نام نہ جپ رہا ہوتا تو کوئی انگ سنوار رہا ہوتا۔ وُہ کھڑاؤں پہنتا تھا اور کہتا تھا کہ جُوتا پہننے سے پاؤں کی پوِترتا بھنگ ہوتی ہے کیونکہ پاؤں کا رِشتہ سیدھا دسویں دُوار سے ہے۔ اُس کا غُسل کرنا اور کپڑے بدلنا ایک بالترتیب طریقِ عمل تھا جس سے چُوکنا وُہ گُناہ سمجھتا تھا۔ وُہ ناک میں پانی چڑھا چڑھا کر بار بار زور زور سے سِنکتا اور کراہت آمیز آوازیں نِکالتا۔ وُہ دانتوں پر اُنگلی پھیر کر کُلّی کرتا اور پھر گلے میں پانی لے کر غرارہ۔ وُہ پیٹ پر دباؤ دے کر گلا صاف کرتا تو لگتا کہ حلق میں پھنسے ڈاٹ کو نِکال رہا ہے۔ وُہ کپڑے کو صابُن لگا کر اُس سے گھائیوں، کوروں اور ناخُنوں کو ایک ایک کر کے رگڑتا۔ کنوئیں پر غُسل خانہ نہیں تھا اِس لئے اُس کی ہر حرکت دیکھی جا سکتی تھی۔ وُہ بدن پر پانی نڈیلتا، ڈول نیچے رکھتا، پھرتی سے کاچھے میں ہاتھ گھُساتا، ستروں کو اُوپر نیچے مَلتا اور کئی بار لگتا جیسے اُس کا ہاتھ کسی چیز میں اٹک گیا ہو۔ اُس کے کاچھا بدلنے کا طریقہ نیارا تھا۔ وُہ گیلے کاچھے کو جانگھوں اور کولھوں پر دبا دبا کر نچوڑتا اور اُس کے اُوپر سے سُوکھا کاچھا چڑھا لیتا۔ وُہ جھُکتا، اُٹھتا، بَل کھاتا، سیدھا ہوتا خاص قسم کی ورزِش

کرتا لگتا، جیسے تیسے گیلے کا چھے کا ایک پائنچہ ٹانگ میں سے نکالتا اور پھر دوسرا۔ اُس کھینچا تانی میں اُس کا سوکھا کاچھا تقریباً بھیگ جاتا لیکن وہ کرتا وُہی جو اُسے کرنا ہوتا۔ وہ چاہتا تو کمر کے گرد تولیا باندھ کر گیلا کاچھا اُتار سکتا تھا اور ستروں کو سکھا کر دوسرا کاچھا پہن سکتا تھا لیکن اس کے نزدیک وہ ادھرم تھا۔ وہ لسّی پیتا، جس کا پھوک مونچھوں میں پھنس جاتا جسے نکالنے کے لئے وہ منہ سے سانس پھونکتا اور مونچھوں کو ہلاتا، اُس وقت وہ منہ کے آگے کپڑا نہ رکھتا تو پھوک اُڑ کر دوسرے پر گرتا۔ وہ پاخانہ پھر کر عام دیہاتیوں کی طرح کنکر ڈھیلا گھسنی نہ کرتا بلکہ وہیں ہاتھ دھو کر پاک ہوتا اور خود کو ایسے لوگوں سے برتر سمجھتا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کا پاد نکل جائے تو وہ اشنان کر کے کپڑے بدلتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک وُہی تھا جس نے امرت چکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی مادی ضرورتوں کے لئے جن کا محتاج تھا، انہیں رُوحانی اعتبار سے ذلیل سمجھتا تھا۔ وہ تایا جی کے سامنے دہقانوں اور اُن کے رہن سہن پر طعن کرتا، وہ اُس سے کہتے۔ "گرچرن سیاں! تم اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہو اور دوسروں کو ناپاک، لیکن اُن کا پیدا کیا ہوا کھاتے ہو، پہنتے ہو! کیا جسم رُوح سے الگ ہے؟ انسانی زندگی کی سچائی فقط عمل سے ہے کیوں کہ عمل، ناپاک شے کو پاک بنانے کا اسلوب ہے۔ بے عمل زندگی کیسی بھی ہو، ناپاک ہوتی ہے اور ادھوری بھی، جیسے تمہاری!"

تایا جی کی باتوں کا اُس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "تم سنساری لوگ گیان دھیان کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے اِس موضوع پر بات نہ کیا کرو۔"

رُوح میرے لئے ایک معمہ تھا جس کا میں حل چاہتا تھا۔ میں تایا جی سے پوچھتا، وہ رُوح کی تشریح جس طرح کرتے وہ سمجھنے میں آسان ہے لیکن شاستروں کے برعکس ہے۔ وہ کہتے تھے، "آنکھوں کی رُوح، قوّتِ باصرہ ہے، کانوں کی قوّتِ سماع، دماغ کی قوّتِ حافظہ، پیٹ کی قوّتِ ہاضمہ، ہاتھوں کی قوّتِ تخلیق...... ٹانگوں کی قوّتِ رفتار" وہ رُوح کے بارے میں یہ کہتے تھے اور کبھی وہ۔ وہ کہتے تھے کہ بے جان چیزوں میں بھی رُوح ہے۔ درانتی کی رُوح اُس کے دانتوں میں ہے اور تیشے کی اُس کی دھار میں۔ رُوح کے بارے میں اُن کا مجموعی تاثر، فہمِ فطرت سے شروع ہو کر تسخیرِ فطرت پر ختم ہوتا تھا۔ "آدمی میں کئی رُوحیں ہیں جو ہم آہنگ ہوں تو قوّتِ تخلیق بنتی ہیں۔ جس ہنرور کی قوّتِ تخلیق اچھوتی ہے، اُس کی رُوح اعلیٰ تر ہے۔"

تایا جی کی باتیں تحیّر خیز اور خیال آرا تھیں لیکن اُن کی ابتدا و انتہا خود آگاہی پر موقوف تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اصلی علم و ہنر، کتابوں سے باہر انسان کے دماغ میں پوشیدہ ہے۔

مجھے مافوق الفطرت باتیں زیادہ مرغوب کرتی تھیں کیوں کہ وہ حاصلِ مقصود تک پہنچنے کا آسان طریقہ بتاتی تھیں۔ میں دھارمک کتھاؤں کے کرداروں کی طرح اُڑنا چاہتا تھا، معجزے کرنا چاہتا تھا، ایسے کام کرنے چاہتا تھا جو

صرف دیوتاؤں ہی کی صفت تھے۔

میں رُوح کو دھرم کے طریقے سے سمجھنا چاہتا تھا، ممکن ہوتا تو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم نے یکدم لڑائی کر اگر یم راج کو جسم تک نہ پہنچنے دیا جائے تو جسم مر نہیں سکتا۔ اِس خیال کی سچائی آزمانے کے لئے میں نے لکڑی کا ڈبّہ بنایا اور اُس کا ایک پاسا کھلا رکھا، ہم نے پہلے کانٹے سے مچھلی پکڑی مگر ڈبّے میں منتقل کرتے کرتے وہ زخمی ہوگئی، لیکن پھر کپڑے سے کئی مچھلیاں پکڑیں، اُن میں سے ایک ڈبّے میں ڈالی اور کھلے پاسے کو کیلوں سے بند کر دیا۔ یہ دیکھنے کے لئے ڈبّا مُہر بند ہے کہ نہیں، ہم نے ڈبّے کو اینٹ باندھ کر پانی کی تہ میں رکھ دیا، دُوسرے دِن اُسی وقت کھولا اور مچھلی کو مرا ہُوا پایا۔ میں نے تایا جی سے اپنا تجربہ بیان کیا، اُنہوں نے مُسکرا کر کہا "مچھلی کی رُوح، پانی ہے جیسے آدمی کی رُوح ہوا۔ نہ مچھلی، پانی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے اور نہ آدمی، ہوا کے۔"

"اور وہ جو کہتے ہیں کہ رشی منی یوگ وِدیا سے سانس روک کر عُمر کو ہزاروں سال بڑھالیا کرتے تھے، کئی سنجیونی کھا کر امر ہوجاتے تھے، کیا وہ جھوٹ ہے؟" میں نے دریافت کرتے ہُوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"بالکل جھوٹ ہے!" اُنہوں نے بالکل پر زور دے کر کہا اور اپنی بات جاری رکھی "سنجیونی ایک فرضی جڑی بوٹی کا نام ہے جیسے امرت! یہ سچ ہوتا تو دھرتی پر رشیوں، منیوں کے سوا کوئی دُوسرا نظر نہ آتا اور عام آدمی کا جینا مُشکل ہوجاتا۔ یوگ وِدیا کوئی وِدیا نہیں، جسم کو نروگ رکھنے کے لئے پریوگ ہے۔ یوگ لاحاصل عمل ہے اور اِنسان کے زندہ رہنے کے لئے ناموزوں ہے اِسی لئے یوگی بھیک مانگتے پھرتے ہیں یا دان پُن پر جیتے ہیں۔ اصلی یوگ کام ہے۔ کام، سیر حاصل ہے اور نیک عمل کا ضامن بھی!"

تایا جی ایک بات کو کئی کئی طریقوں سے بیان کرتے تھے اور دھرم کے بارے میں بالکل ارضی نظریہ رکھتے تھے،

کرَ سے کِرت، کِرت سے کرما
مانس جاتی ایکو دھرما

(آدمی کے ہاتھ تقدیر تخلیق ہیں اِس لئے آدمی اپنی تقدیر کا خالق آپ ہے۔
مانس جات کا ایک ہی دھرم ہے اور وہ ہے کرم)

اُنہیں اِتنے شلوک یاد تھے کہ وہ اپنے خیال کی تائید کے لئے کئی کئی شلوک سُنا سکتے تھے۔

دیسراج بھوتوں کو بس میں کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی غریبی آڑے آرہی تھی۔ اُس کام کے لئے اُسے پانچ بکرے اور پانچ شراب کے پیپے درکار تھے۔ اِس سے آگے کی تفصیل دِل دہلا دینے والی ہے۔ شمشان گھاٹ میں اماوس کی رات دیسراج کا اکیلے جانا، اپنے گلے میں مانس کھوپڑیوں کی مالا پہننا اور کلمہ پڑھنا۔ کلمے کے زور سے طوفان

بادو باراں کا آنا، بھوتوں کا پرگھٹ ہونا، اُس کا اپنے استھان پر ڈٹے رہنا، بھوتوں کا خوش ہوکر رسد مانگنا، اُس کا کلمے کے زور سے سامنے پڑی رسد کی کیل توڑنا، بھوتوں کا رسد کھاپی کر ناچنا اور اُسے وردان دینا۔

وہ جاڑے میں بندر کی طرح ٹھٹھرتا ہوا کس اُمید سے کہتا تھا، "میں بھوتوں کو بس میں کروں تو ساری دُنیا کا بادشاہ بن جاؤں۔"

اُس کی باتوں سے متاثر ہوکر سویگ سنگھ اُس کا ہاتھ تھام کر التجا آمیز احترام سے کہتا، دیسراج، "تم بادشاہ بنو تو مجھے اپنا وزیر ضرور بنائیو! اپنے بچپن کے ساتھی کو بھول نہ جائیو۔"

اُس کی بات سُن کر دیسراج اُسے کسی کریم کی طرح دیکھتا اور پھر اُس سے ایسے بات کرتا جیسے کوئی لٹیرا اپنی لوٹ کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں مخصوص کرے۔

"دیسراج، تو رسد خریدنے کے نااہل ہے لیکن جو خرید سکتے ہیں وہ بھوتوں کو بس میں کرکے بادشاہ کیوں نہیں بن جاتے؟" میں زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے طریقے سے سمجھنے کے لئے اُس سے سوال کرتا۔

"ایسا خطرناک کام کرنے کے لئے میرے جیسا حوصلہ چاہیئے! ورنہ جان کا خطرہ ہے۔"

وہ تیز تیز قدموں سے اِدھر اُدھر چلتا، بدن جھٹکتا اور وقتی طور پر بھول جاتا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔

نام دیو کے گھر کے مغرب میں پورن سنگھ کا ویران کھیت تھا جس میں سر سے اونچا اور گھنا جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ کہتے تھے کہ وہاں بھوتوں کا ڈیرا رہتا ہے۔ وہاں سے نام دیو کے گھر میں سیندھ لگی تھی جس سے وہ جگہ اور بھی ڈراؤنی ہوگئی تھی۔ میں رات کو اُدھر سے گزرتا تو اُتنے راستے کو بھاگ کر پار کرتا۔ جاڑے میں دھونی جلانے کے لئے وہاں ایندھن ہی ایندھن تھا جسے ہم تینوں ایک ساتھ یا اکیلا دیسراج اُٹھا کر لاتا تھا۔ وہ وہاں جاکر آتا ہوا پیچھے مُڑ کر نہ دیکھتا اور ہم پر رُعب جماتے ہوئے کہتا، "پیچھے مُڑ کر وہ دیکھتا ہے جو ڈرتا ہے۔ اور بھوت سے ڈرنا، مرنا ہے۔"

ہمارے گاؤں کے اطراف کتنے گُدڑیا پیر تھے جو پوجے جاتے تھے جیسے پیر پھلاہی، مقام، تکیہ، ست رکھا..... وغیرہ۔ دیسراج کا باپ جوگا رام موٹھ چلانے میں نام رکھتا تھا۔ اُس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ اپنے دشمن کی موٹھ سے مرا تھا۔ اُس کی اولاد میں سے جاگر رام نظر اُتارتا تھا اور چھلوری (اُنگل بڑا) باندھتا تھا۔

بھوتوں کی باتیں سُن کر گھر لوٹتے ہوئے مجھے لگتا جیسے کوئی میرا پیچھا کرتا ہو۔ میں رُکتا، میرے ساتھ وہ چاپ بھی رُک جاتی، بھاگتا تو میرے پیچھے بھاگتی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا لیکن بھوت کا خوف مجھے ایسا نہ کرنے دیتا۔ میں سر سے پاؤں تک رضائی اوڑھ کر سوتا، اِس کے باوجود مجھے گھر کے اندر بھوت نظر آتے۔ میں پاٹھ کرتا لیکن میرا خوف کم نہ ہوتا۔ میں اُسی نفسیاتی کیفیت میں سوتا۔ نیند میں میرا دم گھٹتا اور میں چلاتا۔ جو کوئی میرا شور سُنتا وہ مجھے جھنجھوڑ کر جگاتا اور مشورہ دیتا، "بھگوان کا نام لے، تجھ پر بھوت پریت کا سایہ ہے!" میں بھگوان کا نام جپتا لیکن میرا خوف کم نہ ہوتا۔

میری حالت اُس مظلوم کی سی ہوتی جو کسی کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے، اُسے خود روک نہ سکے لیکن کسی دُور اُفتادہ رفیق کو مدد کے لئے پکارے اور اپنی مصیبت میں مجبور و معذور رہے۔

جب ویسراج کسی مہم پر جاتا، بہ آوازِ بلند نعرہ لگاتا۔ "جل تُو جلال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو!" اگر وہ ناکام لوٹتا خود کو یوں تسلّی دیتا "گھر سے نکلتے ہوئے پیرو مہتر منہ لگا تھا، اُس پر لعنت پڑے۔ جب کالی بلی راستہ کاٹی مجھے واپس گھر لوٹ آنا چاہیئے تھا۔"

وہ خواجہ خضر کا پجاری تھا۔ برسات میں آب جو شباب پر ہوتی، وہ چھڑیوں اور گھاس پھوس سے بیڑا تیار کرتا، اُسے آب جو کے کنارے کم گہرے پانی میں رکھتا، پانچ مرتبہ چلّو میں پانی بھر کر اپنے اُوپر سے پھینکتا، بیڑے میں آٹے کا چراغ روشن کرتا، اُسے دھکیلتا ہوا گہرے پانی میں لے جاتا اور بہاؤ پر چھوڑ دیتا۔ جب تک بیڑا دکھائی دیتا، وہ اُس پر نظریں گاڑے عمل پڑھتا اور جھومتا جیسے اُسے خواجہ خضر کا وردان ہو اُس کے الفاظ، میرے پلّے نہ پڑتے۔ میں پوچھتا، وہ اِترا کر کہتا، "یہ عربی کلمہ ہے، تیری سمجھ میں نہیں آسکتا!"

وہ کہتا تھا کہ خضر نے پانی پر کلمہ لکھا ہوا ہے جو اُسے پڑھ لے گا وہ پانی اور پانی کے اندر رہنے والی ہر شے پر حکمرانی کرے گا۔ وہ آنکھیں سمیٹ کر غور سے پانی پر دیکھتا جیسے اُس نے اچانک کچھ نوشتہ دیکھ لیا ہو اور اُسے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تُو پانی پر کلمہ دیکھ لے گا تو پڑھے گا کیسے؟ عربی تجھے آتی نہیں ہے!" میرے سوال میں شک کا شائبہ ہوتا۔
"یہی تو بات ہے! خواجہ جسے کلمہ دکھاتے ہیں، اُسے پڑھنے کی صلاحیت دیتے ہیں۔" وہ ایمان و اعتقاد سے کہتا۔

ایسی ہی کئی باتیں میں سنگت میں سن چکا تھا۔ کتنے اوتاروں نے گونگوں اور ان پڑھوں کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور ان سے گیتا پڑھوا کر اُس کا ارتھ کروایا تھا۔ مانس تو پھر بھی مانس ہے! اوتاروں اور سنتوں نے پشوؤں اور پکشیوں سے ویدوں کے ارتھ کروائے تھے، جو صرف برہمنوں ہی کا حق تھا۔

میں اُس کی بات پر یقین نہ کرتا، وہ مجھے خواجہ خضر کے عتاب سے ڈراتا۔ میں کئی بار خواب میں دیکھتا کہ کوئی سبز پوش سفید ریش مجھے پکڑ کر پانی میں ڈبو رہا ہے۔ خواجہ خضر کی ہیئت، وہ ویسی ہی بتاتا تھا۔

اِس کے باوجود میری نشوونما میں ہلکا سا تغیّر رونما ہونے لگا تھا۔ جن رسموں، رواجوں، روایتوں، اندھی قدروں کو لوگ اٹل سمجھتے تھے اور ان سے ذرا سے انحراف کو گناہ، میں انہیں تحقیق کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور یہ تھا تایا جی کی باتوں کا اثر۔ وہ بار بار سمجھاتے تھے، "آدمی کی سچّائی وہ نہیں جس کا یہ ادعا کرتا ہے۔ آدمی کی سچائی وہ ہے جس کا یہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کسی کی کسی بات کو بن پرکھے تسلیم کرنا اپنی بے ہودگی ہے۔ زندگی کی حقیقت، اپنے

عرفان سے بے نقاب ہوتی ہے نہ کہ اعتقاد سے۔ اعتقاد، آدمی کے جہل کا حاصل ہے اور عرفان، عرفان کا۔"

وہ بچوں کو ڈراتے نہ تھے، اُن کے ساتھ دوستوں اور اُستادوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن میرا دِل خوف پروردہ تھا اور یہ میرے بھائیا جی اور ہم عصروں کے تشدد کا ردِّ عمل تھا۔ اس سے بڑھ کر مذہبی روایتیں اور حکایتیں تھیں، اُن سے کتنا گریز کرو، وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود تھیں۔

دھرت راشٹر اس لیے اندھا تھا کہ اُس کی ماں نے ویاس رشی سے نیوگ (کسی عورت کا کسی غیر مرد سے اولاد کے لئے جسمانی رشتہ قائم کرنا) کرتے وقت آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور اُس نے اُسے سراپ دے دیا تھا کہ اُس کا بیٹا نیتر ہین ہوگا۔ دھارمک کتھاؤں میں سراپ اور وردان کو بڑا دخل ہے۔ مایا سے موہ کرنے والے کو سرپ جون بھوگنی پڑتی ہے اور بڑبولے کو کوّے کی۔ یہاں تک کہ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد بھگوان کا احسان نہ ماننا اور شکریہ ادا نہ کرنا اپرادھ ہے جس کی سزا، نرک ہے۔ کسی اور گناہ گار کو خدا معاف کر دے تو کر دے، ناشکرا ناقابلِ معافی ہے۔ کہتے ہیں کہ بھگوان بندے کو عبرت دلانے کے لئے گربھ میں نو ماہ تک اُلٹا لٹکاتا ہے، اِس کے کان میں نام پھونکتا ہے پھر اسے پیدا کرتا ہے، لیکن اِس کا غرور! یہ پیدا ہوتے ہی نام بھول جاتا ہے اور میں! میں! چلانے لگتا ہے جیسے پروں بن پکشی ہیٹا ہے، پھل بن ترور ہیٹا ہے ...... نام بن بندہ ہیٹا ہے۔ اور یہ کہاوت اِن سب سے ہیبت ناک تھی۔ بھگوان ماں باپ کے گناہوں کی سزا اُن کے بچوں کو دیتا ہے۔

قارئین! اگر بھگوان ہے اور اُس نے ایسے قانون نافذ کر رکھے ہیں تو اُس سے بڑھ کر انسان دشمن کون ہے، انسانی قانون کتنے ہی سفاک سہی، بھگوان کے بنائے ہوئے قوانین سے زیادہ انسان دوست ہیں۔

مَیں جوں ہی کسی روایت سے انحراف کرتا، میرا بھے مجھے ڈس لیتا۔ میری حالت اُس پرندے کی سی ہوتی جس نے پر پرواز اسیری میں نکالے ہوں اور وہ اُن کے مصرف سے بے خبر ہو۔ لیکن تایاجی کی ایک بات میرے رویئے پر صادق آتی تھی "مشاہدہ وہ انوکھا بیج ہے جو ہر شاہد میں نئے طریقے سے اُگتا ہے اور نئے پھول کھلاتا ہے۔"

مَیں یہ تذکرہ ہزار بار سُن چکا تھا کہ گوتم بدھ راج پاٹ اور رشتے ناطے تیاگ کر جنگل میں چلا گیا اور بڑ کے نیچے کئی برس تک بھگتی کرتا رہا اور یوں اُسے گیان اور نروان پراپت ہوا۔ اسی طرح اور کئی بڑے نام تھے جو گھر سے بھاگ کر ہی کچھ بنے تھے کیونکہ ان کے ماں باپ اُن کی سمجھ بوجھ کو پنپنے نہیں دیتے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ مَیں عقل و دانش میں یکتا ہوں اِس لیے کوئی مجھے سمجھ نہیں رہا ہے۔ اپنی بڑائی منوانے کے لئے مجھے گھر سے بدیس بھاگ جانا چاہیئے۔ آنکھوں سے پرے ماحول کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر مجھے لگتا کہ کوئی مجھے بُلا رہا ہے۔ اُس عالمِ اسرار کی تعبیر جاننے کے لئے مَیں گھر سے بھاگ جاتا۔ لیکن جوں ہی جانی پہچانی حدوں سے آگے نکلتا، کیا ہوا کے

جھونکے اور کیا پرندوں کے چہچہے! مجھے ڈراتے اور گھر لوٹ جانے کی تلقین کرتے جیسے وہ میرے انجام سے واقف ہوں۔ میں دو قدم آگے بڑھتا اور ایک قدم پیچھے ہٹتا، میری بے حوصلگی میری ناکامی ہوتی۔ میرے پاؤں منوں بھاری ہو جاتے۔ پہرے داروں کے سے درخت، میرا راستہ روکتے اور جھنڈ، مجھے خوف دلاتے۔ میں بھائیا جی کی اڑتی ہوئی تنبیہ سنتا، "تو بھاگ کر کہاں جائے گا؟ ذلیل! ایک دن یہیں لوٹ کر آئے گا، اس وقت میں تیری کھال کھینچ لوں گا!"

قارئین! میرے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا، میرے سب بھائیوں نے بھائیا جی کو اپنے ظرف کے مطابق جھیلا ہے۔ میں اُن سب کے بارے میں لکھوں گا تو اپنی کہانی ختم نہ کر سکوں گا۔ اس کے باوجود میں ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں، تاکہ اُن کی خوں آشامی کا ایک نرالا پہلو سامنے آ سکے۔

دیدار سنگھ گندم کی نلائی کر رہا تھا۔ شام کو بھائیا جی آئے اور اُس کے کام کا تجزیہ کر کے گالیاں دینے لگے اور اُسے کاٹتے ہوئے کہنے لگے، "جتنا کام تو نے سارے دن میں کیا ہے، اُتنا میں سویرے ہگتا ہگتا کر سکتا ہوں۔"

"پھر کر لینا تھا! مجھے کرنے کے لئے کیوں بھیجا تھا؟" اُس نے چڑ کر کہا۔

"تو سوال جواب کرتا ہے، حرامی!" بھائیا جی ملامت کرتے ہوئے غصے سے بولے۔

"کرتا ہوں۔" وہ تھوڑا بد دماغ تھا، اکڑ پڑا۔

"تو گھر سے نکل جا، ابھی!" انہوں نے حکم دیا۔

دیدار سنگھ جم کر کھڑا رہا۔ انہوں نے جوتا اُتار کر اُس پر پھینکا اور تحکم سے بولے۔ "جاتا ہے کہ دھکے ماروں، حرام خور!"

اُس نے حوصلہ کیا اور جدھر منہ تھا، اُدھر چل دیا۔ بھائیا جی اُس کی جرأت پر ہکے بکے رہ گئے اور کھڑے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد لاٹھی اُٹھائے اُس کے پیچھے دوڑے اور اپنے کھیت سے دو کھیت پرے اُسے جا لئے اور پیٹنے لگے، "تیری یہ ہمت! تجھے اِس دن کے لئے پالا پوسا تھا کہ تو کمانے کے قابل ہوتے ہی پیٹھ دکھا جائے! آج تک تجھ پر جتنا لگایا ہے، اُس کا حساب چکا اور جہاں جانا ہے، جا! احسان فراموش! میں تیری ہڈی پسلی توڑ کر تجھے اپاہج بنا دوں گا تاکہ تو کوئی کام نہ کر سکے اور مرتے دم تک دوسروں کا ادھین رہے، بھیک مانگتا پھرے!"

میں خوف سے کانپ جاتا۔ نئی فضاؤں اور نئی کھوجوں کا ولولہ، میرا ساتھ چھوڑ دیتا۔ پرانے راستے میرے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے۔ بن کو میں جانی پہچانی حدوں سے کچھ ہی آگے تک اُٹھا کر نے جاتا، لیکن توڑ کر

آزاد نہ ہو سکتا۔

سویک سنگھ نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کیا اور بھاگ گیا۔ اُس کے چرچے گھر گھر ہونے لگے۔ کوئی اُسے جواں مرد کہتا اور کوئی بزدل اور کوئی بھگوڑا! دیسراج کے گھر والوں کے برعکس اُس کے گھر والوں کی حالت غیر تھی۔ وہ رشتہ داروں کے پاس دوڑے، تھانے میں رپٹ لکھوانے پہنچے لیکن اُس کا سُراغ نہ ملا۔ وہ اُسے رو بیٹ چکے تھے کہ وہ واپس آگیا۔ اُس کے گھر میں چراغاں ہوا لیکن وہ بجھا بجھا رہا۔ وہ اپنی زندہ دلی اُن انجانی راہوں میں گنوا آیا تھا جہاں سے دیسراج نئی زندگی ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ ہم کہیں ملتے تو وہ چپ گڑپ رہتا۔ اُس کی خاموشی میں بے چینی تھی جیسے اُس نے ناگوار شے نگل رکھی ہو اور وہ اُسے اُگلنے کے لئے مضطرب ہو۔ آخر اُس نے قے کر ہی دی۔ گھر سے بھاگ کر اُس نے 'ہریاں بیلاں' میں پناہ لی اور نہنگ بن گیا۔ وہ طرزِ حیات، جسے وہ تقدیس پروردہ اور بے پروا سمجھتا تھا، اپنے طریقے سے مُلوّن تھا۔ اُس ظاہرہ تقدیس کے پیچھے وہ جنسی بھوک پوشیدہ تھی جس کا اُسے گمان نہ تھا۔ اُس کے ساتھ وہاں وہی ہوا جو سانڈوں کے جھنڈ میں ایک گائے کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

پنجابی زبان کی لطافت مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں برمحل خوبصورت مثال پیش کروں۔

اَن داڑھیاں مُنڈا رَن ورگا

داڑھی آوے مُنکھ بن جاوے

(بے خط لڑکا، لڑکی جیسا ہوتا ہے، خط آنے ہی سے وہ مرد بنتا ہے)

عملی زندگی کو خیالی زندگی کے برعکس پا کر میں تایا جی سے پوچھا، تایا جی! آدمی کی حقیقت کیا ہے؟"

"آدمی کی کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے! اس کی حقیقت وہی ہے جس کا یہ عملی طور پر ثبوت پیش کرتا ہے"

وہ اپنا فلسفہ بگھارتے۔ میں اُن کے بیان کی روشنی میں اپنی زندگی کو دیکھتا اور معلوم کرتا کہ میں زندگی کے ہر شعبے میں نا تمام ہوں اور کہیں بھرپور ہوں تو اپنے تصوّر میں۔

ایک دن سویک سنگھ اور دیسراج نے انکشاف کیا کہ وہ ہتھ رسی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے شوق کو پُر اسرار نام دے رکھا تھا 'اپنا ہاتھ جگن ناتھ'۔ اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنا ہاتھ آزمایا لیکن میں کسی نتیجے پر نہ پہنچا۔ اُنہوں نے بیک زبان فیصلہ سنایا، "تیرا لہو پتلا پانی ہے!" وہاں شیشے کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے انگوٹھا زخمی کیا اور انہیں دکھایا۔ زخم سے لال گاڑھا خون نکلا اور بہتے بہتے جم گیا۔ وہ میری جرأت پر ششدر رہ گئے اور خود میں بھی۔ اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے فیصلہ نہ بدلا اور مجھ پر مزید تہمت لگائی، "تو ابھی بچہ ہے اور تیری مٹی ٹھنڈی ہے!"

پہلے میں احساسِ کمتری کا شکار تھا، اُن کے الزام سے میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ میں بچہ سہی، ایسا بچہ

بھی نہیں تھا۔ میرے جذبات اور اعضا وہی تھے۔ میری مٹّی بھی ٹھنڈی نہ تھی جس کی نفی میری پھونکڑی ہو کر تی تھی۔ لیکن ہاں، اس کا نائزہ، جسم کے اس حصّے تک نہ پہنچتا تھا جو لذّتِ بسیار کا سرچشمہ ہے۔ اس کا وجود، اندھی گلی کی طرح تھا جیسے چھوٹی سی دیوار، شاہ راہ سے جدا کرتی ہو۔

ان کے سیدھے اور سپاٹ جملے، میری شکستہ خاطری کا سبب ہوتے۔ ایک طرف وہ اور دوسری طرف فطرت میرا تمسخر اڑا رہی تھی جس نے میرے خون میں لذّتِ نفس کی بجائے افسونِ اضطراب پھونک رکھا تھا۔ جس خیال سے لطفِ نفس کی تجدید ہوتی، میں اسے طرح طرح سے تازہ رکھتا۔ میری آرزو، دھڑکن کی تیزی بن کر رگوں میں پھیلتی اور پھر روح کی پھریری میں بدل کر کاچھے میں سمٹ آتی۔ میں جس عضو کو چھوتا وہ اپنے بے لطف جہل سے جاگ کر سرورِ آگہی سے سرشار ہو جاتا اور میرے دل کے قریب ترین لگتا۔ میں اس جوہر کا تصوّر کرتا جو میری رگوں میں دفن تھا لیکن اس تک میری رسائی نہ تھی۔ میں اپنے سنتروں کو حیران حیران دیکھتا۔ میری حالت اس بچّے کی سی ہوتی جو اپنا کھلونا رکھتے ہوئے اس سے نہ کھیل سکتا ہو، نہ دل بہلا سکتا ہو۔ میری رنجوری و صبوری قابلِ رحم تھی۔ ایسی رات کو اس ارمان کے ساتھ سوتا کہ سویرا ہونے تک میری طفلی و جوانی میں فاصلہ مٹ جائے اور میں وہاں جا رہوں جہاں نئی زندگی ہو، اجنبی خوشی ہو اور انجانی لذّت ہو۔

میں اپنے اور جینا کے رشتے پر غور کرتا جس میں دونوں کا حاصل الگ الگ تھا۔ وہ مجھ سے کھیلتی تھی جب بھی اچھی لگتی تھی اور نہ کھیلتی تھی تب بھی۔ میں اس سے پوشیدہ اعضا کی بات کرتا اور ان کی اہمیت سمجھنا چاہتا۔ وہ مجھے 'گندی بات' کہہ کر چپ کروا دیتی۔ میں حیران ہوتا کہ جو اعضا جسم کا ضروری حصّہ ہیں، ان کے بارے میں بات کرنا، بری بات کیوں ہے؟ میں محسوس کرتا کہ وہ اعضا اپنے عمل میں اپنی ساخت سے جدا ہیں اور حقیقت میں وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ان کی اپنی باطنی سچائی ہے جو اپنے مخصوص عمل میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر روپوش ہو جاتی ہے۔

میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا موافق و مخالف قدروں میں گھرا ہوا بدحواس تھا۔ میں روایتوں کو حقیقتوں سے اور کتابوں کو عملی باتوں سے الگ پاتا تھا۔

اجیت سنگھ ٹال پر رہنے لگا تھا اور اس کے کمرے میں میں۔ ایک دن پلنگ جھاڑتے ہوئے میں نے نواڑ کے بیچ ایک کتاب دیکھی۔ میں حیران ہوا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ میں نے اسے نکالا اور دیکھا۔ وہ کوک شاستر تھا جو دسہرے کے میلے میں بٹر پیپر کے لفافے میں مہر بند بکا کرتا تھا۔ مبادا کوئی دیکھ لے، میں نے کمرہ بند کیا اور اسے کھولا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں تھیں، جن میں بے قید طرزِ حیات کی تلقین کی گئی تھی، اس لیے کہ اس سے جنسی جذبہ تر و تازہ رہتا ہے۔ ان کہانیوں کی زبان ننگے اعضا سے زیادہ ننگی تھی۔ اس میں عورتوں اور مردوں کی عریاں تصویریں تھیں اور کئی جگہ انہیں بھوگ بلاس کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ حالاں کہ وہ کاغذ پر بے جان مورتیں تھیں، مجھے محسوس ہوا کہ

وُہ شدّتِ جذبات سے تھرک رہی ہیں اور رُوبہ عمل ہیں۔ جبینا کو ننگے نہاتے دیکھ کر مَیں اِس قدر بدحواس نہ ہُوا تھا جتنا اُن تصویروں کو دیکھ کر۔ اِتنے میں ماں نے مجھے پٹھے کترنے کے لئے مشین پر بُلایا۔ مَیں نے جلدی سے کوک شاستر وہیں چُھپایا اور اِدھر اُدھر ٹہل کر اپنے نفس پر قابو پایا پھر ماں کے پاس گیا۔ اُس دن پٹھے کترتے ہُوئے میری رفتار ہی الگ تھی۔ ماں مشین کو گالا دیتی ہُوئی بار بار ہدایت کر رہی تھی "ہولے چلا! ذرا ہولے چلا!!" لیکن مَیں تھا کہ مشین دوڑائے جا رہا تھا جیسے مجھ میں نئی طاقت آ گئی ہو۔

اُس رات مَیں کوک شاستر نیفے میں اڑس کر دیسراج اور سویگ سنگھ کو دِکھانے کے لئے لے گیا۔ وُہ دونوں پیپل کے نیچے دُھونی جلائے میرے مُنتظر تھے۔ وہاں سے ہم سویگ سنگھ کی حویلی میں آ گئے، جہاں وُہ سوتا تھا۔ وہاں لالٹین کی روشنی میں اُنھوں نے کوک شاستر دیکھا۔ اُن دونوں کی جو حالت ہُوئی وُہ بیان سے باہر ہے۔ وُہ ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اِس سے پہلے کہ وُہ دُوسری بار مقابلہ کرتے، مَیں ماں کا بُلاوا سُن کر گھر لوٹ آیا۔ اُس کے بعد مَیں نے کوک شاستر کو کبھی نہ دیکھا۔ اُنھوں نے مجھے باور کروا دیا کہ وُہ کہیں گُم ہو گیا ہے۔

یہ وُہ وقت تھا جب مَیں کتابوں کی طرف رُجُوع ہُوا۔ مَیں نے سکُول کی لائبریری چاٹ لی لیکن مجھے ایک کِتاب نہ ملی جِس کے کردار میرے جانے پہچانے ہوں۔ اُن کے رہن سہن ہی الگ نہ تھے، جذبات بھی جداگانہ تھے۔ سچّے کردار ڈھونڈنے کے لئے مَیں کتابیں پڑھتا لیکن ہر کتاب، ہر ورق، ہر لفظ، سربستہ راستے کی طرح پاتا۔

تایا جی اِنسانی زِندگی کے ہر مسئلے کا حل بتاتے تھے لیکن جنسی زِندگی کے بارے میں کُچھ نہ کہتے تھے۔ اِس تعلّق سے وُہ مجھے ریاکار لگتے تھے۔ مَیں چاہتا کہ وُہ اُن رموزِ حیات کو بھی موضُوعِ سُخن بنائیں جو اُنھوں نے اپنے وقت اپنے انداز سے سمجھے ہوں گے۔

مَیں جِن لوگوں سے قریب تھا وُہ کتابوں سے کھرے تھے حالاں کہ وُہ ہمہ جذبات زِندگی چند جملوں میں گزار رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے کام پروردہ اور کام زائیدہ کردار کو بیش لفظوں سے سروکار ہی نہ تھا۔ وُہ اپنی ضرُورت کی تسکین، کام میں پاتے تھے۔ اُن کے پاس وقت کا ایک ہی مفہوم تھا، کام! چوں کہ وُہ وقت کو کام سے ناپتے تھے کام کے بغیر ادھورے رہتے تھے جیسے بے برگ و بار شجر۔ وُہ بیرونی طور پر اُونچی قدروں کے طرفدار سہی، اندرونی طور پر مُخالف تھے۔ وُہ کِسی قدر کے بارے میں وسیع مشرب تھے تو وُہ اُن کی مصرُوفیت تھی، ورنہ اُن کی تنگ دِلی روایت تھی۔

کم بناں گھڑم

(جہاں کام نہ ہو وہاں گڑبڑ ہے، ہر شے اوندھی ہے)

اُن کی تنگ دِلی میں کہیں فراخ دِلی نظر آتی تھی تو صرف توالد و تناسُل کے میدان میں۔ کثرتِ اولاد سے

ہر ماں کی حالت، نہال میں ملکہ کی سی رہتی تھی۔ لیکن ملکہ کے برعکس وہ اپنے بچوں کو دھتکارتی، پھٹکارتی اور دور بھگاتی تھی لیکن وہ اُسے بُری طرح چمٹے رہتے تھے۔ اپنی روحانی تکلیف میں، وہ انہیں چھڑیاں کہتی اور مرجاؤ تک کا سراپ دے دیتی۔ اُن میں سے کوئی مرجاتا تو اُس کے بین سُن کر کلیجے پھٹ پھٹ جاتے۔ صاف ستھرے بول اور میٹھے پیارے الفاظ سُننے کے لئے کان ترستے رہتے تھے۔ من موہنی زبان گیتوں میں تھی یا اخلاقی کہانیوں میں، اچھے جذبے اُفق کے رنگوں کی طرح ناپائدار تھے۔ اُن کے کاروبارِ حیات اور کاروبارِ جہاں صرف نفسی سمجھوتے کے تحت چلتے تھے۔ یہ اُسی سمجھوتے کا کمال تھا کہ باہمی نفرتوں، کینوں، کدورتوں .... کے باوجود زن و مرد اُجالے میں ایک دوسرے سے لڑتے اور اندھیرے میں باہیں پسارے اِنتظار کرتے۔ اُن کا نفس وہ موافق عنصر تھا جو اُن کے باہمی انحراف کو ختم کرنے میں ممد و معاون تھا۔ اِس حیات آفریں جذبے کو لوک گیتوں میں کس شدت اور نفاست سے بیان کیا گیا ہے۔

ادنے جدوں ہتھ پھیریا
مینوں دُکھ جِندڑی دے بُھل گئے
(اُس نے جوں ہی میرے بدن کو سہلایا، میں رُوح کے سارے دُکھ بھول گئی)
سوہنا پچھوں گل کردا
پہلاں ہتھ ممیاں تے رکھدا
(میرا پیارا بات پیچھے کرتا ہے لیکن پہلے ممّوں پر ہاتھ رکھتا ہے)

جس جذبے کا برملا ذکر منافیِ اخلاق ہے وہی در پردہ اُن کے وجود کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچائے ہوئے ہے۔ یہ اِعجاز اُسی پُرکشش جذبے کا ہے کہ وہ اپنی ہڈیوں اور رگوں کو کھرچ اور نچوڑ کر اُن میں سے بچے جنتے اور اُن کی حقیقت میں اپنے جھوٹے تسلسل کے خواب دیکھتے اور اپنی دل بستگی کے حسین لمحوں میں اُن فانی وجودوں کو اپنے نشان کہتے۔ اِس معقول جذبے میں اِنتہائی نامعقول بات یہ ہے کہ وہ اپنے بے رعونت اور مستقبل ناآشنا بچوں کے نام مذہبی صحیفوں میں سے چن کر اعلیٰ اور خوش آیند رکھتے جو اُن کی صورتوں اور صفتوں کے اِتنے برعکس ہوتے کہ انہیں دیکھ کر خیالوں کے آئینے چور چور ہو جاتے۔

باب ۱۹

وصل میں بے خودی کا وہ عالم
گویا خود سے جدا ہو گئے تم (شاطر)

کتابیں پڑھنے کا خاص فائدہ یہ ہُوا کہ میرے الفاظ کا ذخیرہ کئی گنا بڑھ گیا۔ میں نے کئی ایسی نظمیں یاد کرلیں جو سینکڑوں اشعار پر مشتمل تھیں۔ اُس روا روی میں مجھے ایک احساس ہُوا جو بدستور ہے۔ میری کیفیت کے ساتھ الفاظ کے معنی بھی بدل جاتے۔ وہی مضمون جو میری رگوں میں کھلبلی مچا دیتا کبھی ناکارہ اور پھیکا لگتا۔

ہمارے گاؤں کا کچھار جگنوؤں کی دھرتی تھا جو سرِ شام آسمان در آسمان نمودار ہوتا تھا۔ میں اُس کی دل کشی کا قائل تھا لیکن مجھے اُس لطیف اُفتاد کا احساس نہ تھا جو اُس کی رُوکشی میں تھا۔ اُس کی وہ خوبی، مجھ پر اُس دن آشکار ہوئی جس دن میں نے اقبال کی نظم 'جگنو' پڑھی۔ میں کچھار میں گھومتا ہُوا ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور یہ نظم گاتا ہُوا بے تشریح جذبات میں کھو گیا۔

او آفاقی لمحو! او مہا آنندو!! تم سے بچھڑے ہُوئے جُگ بیت گیا ہے۔ میں تم سے ملنے کے لئے ترستا ہُوں! کیا تم اُس پُر لطف انجمن کی آرزو کرتے ہو؟ جس میں تم برابر کے شریک تھے۔ جیسے میں تمہارے بارے میں سوچتا ہُوں تم بھی میرے بارے میں سوچتے ہو؟!

میں پچھلی بار گاؤں گیا تو مجھے 'گیان سنگھ شاطر' کا خیال نہیں تھا۔ ایک رات، چاند پگھل کر رنگ و نُور کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں خراماں خراماں، آوارہ آوارہ اُدھر جا نکلا جدھر کچھار ہوتا تھا۔ اُس علاقے کو اجنبی پا کر میں وہاں اُس ٹیلے کو ڈھونڈنے لگا جس سے میری شناسائی تھی لیکن وقت کی اُتھل پتھل نے اُسے مٹا دیا ہے۔ میری ترنگ نے میرے جذبۂ تلاش کو چین نہ لینے دیا جب تک اُس نے چر (ندی کے بہاؤ میں بہہ کر آئی ہوئی ریت) میں وہ مقام نہ ڈھونڈ لیا۔ میں نے وہاں کی مٹی اٹھا کر سونگھی، وہ میرے ماضی کی مہک سے رسی بسی تھی۔ میں اُس جہان میں پہنچ گیا جہاں لہراتے چشمے، گاتے جھرنے اور لہلہاتے سبزے تھے۔ اُن مناظر کی مجموعی خوبصورتی بڑھانے کے لئے ستارے پنکھ لگائے اُڑتے آتے تھے لیکن بھولے بھالے دیہاتی اپنے بھولپن میں اُنہیں جگنو سمجھ لیتے تھے۔

وہ عالم واقعی حسین تھا یا میرا حُسنِ تصوّر اُسے رنگین بنا رہا ہے۔ اُس یاد کی رعنائی کا جادو ٹوٹتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی عظمت کی بلندی سے ندامت کی پستی کی طرف لڑھکتا ہُوں۔ میری خود طمانیت مجھے لاچار کرتی ہے کہ میں ان پیاری پیاری یادوں میں کھویا رہوں جو میری چاہتوں کی سرخوشی اور سانسوں کی سرمستی ہیں۔ جن کی بدولت

وقت کی رفتار تھمی ہوئی ہے۔

لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے!

اضطرابِ عناصر، شرطِ حیات ہے! جیسے دل کی دھڑکن گردشِ خوں میں منتقل ہو کر اُس کالافانی حصّہ بن جاتی ہے ایسے ہی مجھے اپنی کہانی کو آگے بڑھانا ہے۔ ایسا نہ ہوا تو میری کہانی اپنے انجام کو کیسے پہنچے گی؟
ایک رات میں جگنو پکڑنے لگا اور پگڑی کے لڑ میں باندھنے لگا۔ جگنو کو پکڑنا نغمہ بار ساز کو چھو کر اُس کی نغمگی لوٹنا ہے۔
میری بے ہودہ حرکت کی وجہ میرا خوبصورت خیال تھا جو اپنی دنیا میں نرالے منظر کی تشکیل کر رہا تھا۔
میں مٹھی بھر جگنو لئے جیبنا کے پاس گیا۔ وہ اِتنے سارے جگنو دیکھ حیران رہ گئی اور مجھے ڈرانے لگی،
یہ جہاں پیشاب کر دیں، وہاں خارش ہو جاتی ہے، تو انہیں چھوڑ دے!"
میں اُس انجانے خطرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ میں اُسے ایسے اچنبھے میں ڈالنا چاہتا تھا جس کا اُسے گمان تک نہ تھا۔ میں اپنی ضد پر اڑ گیا اور اُسے اپنی بات منوا کر ہی رہا۔ میں نے جگنو اُس کے سر میں ڈالے اور ان پر دوپٹا باندھ دیا۔ وہ نظّارہ کیا نظّارہ تھا! وہ اِس قدر خوبصورت اور دل پذیر ہوگا، مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔
میرے قارئین! آپ ایسا منظر دیکھتے تو اُسے کیا کہتے؟

میری جدت طرازی کی داد مجھے ویسی ہی ملی جیسی عام حالات میں ملتی تھی۔ میں انجام آشنا نہ سہی وہ زود آغاز ضرور تھی۔ وہ جلد ہی اُس کیفیت سے گزر گئی جو اُس کے شوقِ ہوس کی تلاش تھی۔
میں اپنے سازِ عناصر کو سنتا تھا لیکن اُس کی لے نہ سمجھتا تھا۔ میری تعمیرِ نفس کی خودکاری میرے اعضا کے جوان ہونے کی رفتار سے کم تھی۔ میرے دل کی دھڑکن میرے سانس کی دم ساز تھی لیکن اُس کی ہم راز نہ تھی۔
میری خلوت نشینی کو میرے آب و گِل کی جلوت آفرینی منظور تھی، وہ تشکیل جاری تھی لیکن اُس کی آہستہ خرامی میری ناگواری تھی۔ میرا لہو، شعلۂ مضطر کی طرح تھا۔ وہ اپنی بیتابیِ نمود میں میری رگوں اور پٹھوں اور ہڈیوں میں دوڑ رہا تھا لیکن کوئی راہ نہ پا کر اپنی ہی گردش میں اسیر تھا۔
دراصل میرا وجود میرا غنچۂ آرزو تھا۔ وہ اُس خوشبو سے بے بہرہ تھا جو اُس کی مٹھی میں بند ہوتی ہے۔

باب ۲۰

طاری ہے اِک جمود سا بزمِ حیات پر
مرنے کا حوصلہ ہے، نہ جینے کا بانکپن (شاطر)

آدمی عناصر سے زیادہ خواہشات کا پتلا ہے۔ مَیں نے جو بھی خواہش کی ہے اُس کا ذکر کا ہے لگا ہے جاری ہے لیکن اُس کے بارے میں جو بات مَیں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وُہ یہ ہے کہ میری خواہش کی نوعیت جیسی بھی رہی ہو اُس کی کارفرمائی ایک تھی کہ وُہ اپنے کمال کو پہنچے لیکن ویسا ہوتا نہ تھا۔ مَیں کسی اَور اُونچ نیچ کا شکار ہُوا تو ہُوا لیکن میری خواہش کا یہ خبط قائم و دائم ہے۔

کہتے ہیں کہ کوئی ایک سنگین واقعہ انسان کی پُوری اٹھان کو کچل سکتا ہے۔ مَیں سوچتا ہُوں کہ وُہ میری کون سی رگِ آفرینش تھی جو میرے وُجُود کے ٹُوٹتے تانے بانے کو جوڑتی اور سنوارتی رہی۔

مَیں گاؤں میں تھا تو میرے ہم عصروں کی دست درازیاں اَور بھائیا جی کی زُود رنجیاں میری تقدیر تھی۔ مَیں شہر میں اُٹھ آیا تو کامگاروں کی کڑی بول بانی اَور کارخانوں کی زندگی، میرا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ مَیں اپنے ماحول کے دو متضاد پاٹوں میں پِس کر جیا ہُوں۔ لیکن ماضی کا حال سے موازنہ کرتے ہوئے، مَیں دیانت داری سے تسلیم کرتا ہوں کہ میرا ماضی اپنی تمام تر بے ہُودگی، ابتری، بدحواسی، بے راہ روی ... کے باوُجود میرے حال سے بہتر تھا۔ دراصل وُہ بہتر نہیں تھا لیکن مَیں بہتر ظاہر کرتا ہُوں۔ کیوں؟ اُن حالات کو رقم کرتے ہُوئے، مجھے عجیب سی تسکین ہوتی ہے۔ ذلت خواہی، ماضی پرستی کی پیداوار ہے۔

وُہ جھومتے ہُوئے سبزہ زار، بیلوں کے گھنگھرُوؤں کی جھنکار، رہٹ کے پاٹ کی لوریاں، باغوں میں جھُولے جھُولتی گوریاں، کریال میں مست چرند، ندی میں چُہلیں کرتے پرند، ناچتی فاختاؤں کی آلاپ رچو کس ٹٹیریوں کا دِلاپ، اپنی لَے میں سرشار مور، برکھا کی رِم جھِم میں جھرنوں کا شور، بڑ کی داڑھی کے جھُولے، کھیت کھیت سرسوں پھُولے، قدم قدم نئی نزہت گاہ، نظر نظر نرالی جلوہ گاہ، سحر کی مہک، چڑیوں کی چہک، شفق کے بڑھکیلے رنگ اور اُن کی دید سے پیدا ہوتی ہُوئی ترنگ .... ہر منظر کی طرح یہ منظر بھی اپنا جواب آپ تھا۔

بر سین کو پانی دینا مقصود ہوتا، مَیں رہٹ جوت کر بیلوں کو اندھیری لگا دیتا اَور بوڑیوں (گراری کے دانت) پر کتا گرا دیتا۔ مَیں بیل ہانکتا اَور جہاں وُہ دھیمے ہوتے اُن پر چھپکے سے برس پڑتا۔ اُن پر بے اعتباری چھاتے ہی وُہ چال پکڑ لیتے اَور مَیں کسی اُٹھا کر نکّوں (ایک کیاری میں سے دُوسری کیاری میں پانی پہنچانے کی راہ) پر توجہ کرتا۔

پانی کیاری میں پھیلتا ہُوا آگے بڑھتا اور میں مینڈ پر کھڑا ہو کر پڈیوں کی چوکسی کا نظّارہ کرتا۔ کیاری کا پھیلاؤ، اُن کی چونچوں میں سمٹا ہُوا نظر آتا۔ ادھر پڈیاں ڈوبنے سے بچنے کے لئے پھُدکتیں اُدھر پڈیاں اُن پر لپکتیں۔ ایک کی کامیابی اور دُوسرے کی ناکامی میں ٹھونگ بھر ہی کا فرق ہوتا۔ وُہ سر گھماتی اور دُم ہلاتی اور اِٹھلاتی ایسی بھلی لگتیں کہ بس!

بھائیا جی کے گھناؤنے سائے اور میری بزدلی سے دُور ہر قدم انوکھی دید اور پیاری نوید تھی۔ میرے خیالوں میں یادوں کا میلہ لگا ہُوا ہے، سُہانی یادیں، ڈراؤنی یادیں! مَیں اُن کے دیرینہ لمس سے کبھی خوشی سے مسرور ہوتا ہُوں اور کبھی غم سے آزُردہ۔

ایک جانا پہچانا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہتا ہے۔ "جگیا! تُو مجھے بھول گیا ہے کیا؟"

مَیں چاچا کریم کو کئی بار یقین دِلا چکا ہُوں کہ وُہ مجھے یاد ہے لیکن شاید اُسے میری بات پر اِعتبار نہیں ہے۔ اِس میں اُس کا کیا قصُور؟ اُسے، مجھ سے اُسی جلدی کی توقع ہے جو کبھی مجھے، اُس سے ہوتی تھی۔ میرے اچھے چاچا کریم! کون جانے تو کہاں ہے اور کس حالت میں ہے؟ مَیں تیری یاد کو حیاتِ جاوید دے رہا ہُوں۔ وُہ تیری فیاضی کی شانِ سرفرازی تھی جسے ناداریِ دوراں رَد نہ کر سکی تھی۔

چاچا کریم ہماری ٹال کے پاس کُبڑی شیشم کے نیچے امرُود اور موسمی پھل بیچا کرتا تھا۔ امرُود اندر سے لال اور باہر سے سُنہری ہوتے تھے۔ امرُودوں کی چھانٹ چھٹائی میں اُسے کوئی داغی دانا مِلتا، وُہ اُس کے اچھے حِصّے کی پھانکیں بنا کر بچّوں میں بانٹ دیتا۔ وُہ شریر اُن سے دوہرا کام نکالتے، پہلے اُن سے ہونٹ رنگتے پھر اُنہیں کھاتے۔ کریم کی آواز اُس کے تبسّم نما چہرے کی سی تھی جو کانوں کو خاطر میں نہ رکھتی تھی اور سیدھی دِل سے ساز باز کرتی تھی۔

آمب رسیئے،

لے کے کھاؤ آمب رسیے

(آموں کی طرح رسیلے، آموں کی طرح رسیلے لے کر کھاؤ)

وہ امرُودوں کو ٹوکری میں ٹیلے کی طرح سجاتا اور ایک امرُود سِتارے سا کاٹ کر چوٹی پر رکھ دیتا اور اپنے میلے کچیلے صافے سے مکھیاں جھلتا ہُوا رسیلے انداز میں گاتا اور راہ گیروں کو رِجھاتا۔ وُہ اُن کی چال سے اُن کا اِرادہ بھانپ لیتا اور امرُودوں کا قصیدہ گاتا ہُوا، اُن کی ریجھ کو ہوا دیتا۔ کوئی اُس سے دامن بچاتا تو اُس کے گانے اور مکھیاں جھلنے میں یکساں بیتابی ہوتی۔ ماؤں کے ساتھ بچّے دیکھ کر چاچا کریم کے بُلاوے میں نئی اُمنگ اور نئی ترنگ ہوتی۔

نِت نِت نئیں بزاریں آؤنا
مُنڈے نوں لے دے اَمب رسیا
روز روز بازار میں کہاں آیا جاتا ہے! اپنے بیٹے کو آم کی طرح رسیلے خرید دے
بی بی نی لے دے اَمب رَسیا
سوہنے نوں لے دے اَمب رَسیا
پیارے نوں لے دے اَمب رَسیا
(اے بِی بی، اپنے بیٹے کو اَمب رَسیالے دے، اَپنے سُندر کو اَمب رَسیالے دے،
اپنے پیارے کو اَمب رَسیالے دے!)

وہ گانے کے مِصرعے حسبِ ضرورت تبدیل کرتا اور گاہک کو لوٹتے دیکھ کر جگمگا اُٹھتا۔ کسی کا بچّہ روتا لیکن وُہ اَمرودوں کی طرف مائل نہ ہوتا تو چاچا کریم کا مسلک صُلح کُل ہوتا۔

لَے دے مُنڈے نوں اَمب رَسیا
کر دے مُنڈے دا دِل راضی
اَپنے بیٹے کو اَمب رَسیالے دے وُہ ایک دَم خُوش ہو جائے گا۔

جو کوئی اُس کے بُلاوں اور چھلاوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے، اُن کی حالت غیر ہوتی۔ اُن کے بچّے اُن کا راستہ روکتے، آنچل کھینچتے، رُوں اُوں کا جاپ کرتے، رُکتے بڑھتے اور بڑھتے رُکتے واپس آنے لگتے اور کئی لوٹ ہی آتے۔

مَیں نے ٹال کی باڑ کے ساتھ بلُوبلز لگا رکھے تھے۔ سادھُو رام کے باغیچے میں دھرم اَرتھ رَہٹ لگا تھا جسے ضرورت مَندوں کے آرام کی خاطر سانجھ سویرے جوتا جاتا تھا۔ مَیں وہاں سے پانی ڈھوتا اور بلُوبلز کو سیراب کرتا۔ اُن کی جھالرسی لانگریں (وُہ شاخ جسے بڑھنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو) باڑ کے سہارے سہارے دُور تک نِکل گئی تھیں۔ مَیں اُن کی نِلائی کرتا، کیاری پر مِٹّی چڑھاتا، مُرجھائے ہُوئے پُھول پتّے چُنتا گویا تازہ پُھولوں پتّوں کا حُسن نکھارتا۔ مَیں کِسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا اور اُدھر سے گُزرتا تو وُہ مجھے بُلانے لگتے۔ مَیں اپنے اِحساس سے لبریز موہن سِنگھ کی یہ نظم گاتا،

اَسیں نِمانے ساوے پتّر
سانوں کون خیالے
دو دِن چھاں پُھلاں دے رُتّے

جاگے ساڈے تالے
سوہنے دے گلدستے خاطر
جان جدوں اوہ لگّے
کھا کے ترس اساں دے اُتّے
لے گئے سانوں نالے

(ہم بے مقدور ہرے پتّے تھے۔ ہماری کوئی پہچان نہیں تھی لیکن پھولوں کی قربت سے ہماری قسمت ہی بدل گئی۔ وہ اپنے محبوب کے گلدستے کے لئے جا رہے تھے کہ اُنہیں ہماری بے مقدوری پر ترس آیا اور وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گئے)

میرا جذباتی لگاؤ دیکھ کر چاچا کریم، اَمب رسیوں کا کاروبار بھول جاتا اور گہری بھرّائی آواز میں یہ دَردناک اشعار گاتا،

سدا نہ باگیں بُلبُل بولے
سدا نہ موج بہاراں
سدا نہ مِل بیٹھن مٹیاراں
سدا نہ صحبت یاراں

(بلبل کے ترانے ہمیشہ باغ کی رونق نہیں رہتے اسی طرح کسی کے اچھے دِن! جیسے سہیلی، سہیلیوں سے نہ ملنے کے لئے بچھڑتی ہے ویسے ہی یار، یاروں سے)

مَیں جب کبھی پھولوں کو پانی نہ دے پاتا، وہ کُملا کر لڑھک جاتے۔ مَیں اُنہیں تشویش سے دیکھتا، وہ مجھ سے شکایت کرتے لگتے، ہماری دیکھ بھال سے مُنہ موڑنا تھا تو ہمیں بویا ہی کیوں تھا؟ میری تشویش، احساس میں بدل جاتی اور مَیں خود پر ملامت کرتا، شرمندہ ہوتا، بالٹی اُٹھاتا، رہٹ کو بھاگتا، کیاری لبالب بھرتا اور اُن پر چھڑکاؤ کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے مکھڑے یوں کھِل اُٹھتے جیسے کوئی روتوں کو گُدگُدا دے۔

بھائیا جی تعلیم کے خلاف تھے اور نئی جماعت کی پُرانی کتابیں تب خرید کر دیتے جب اُستاد جماعت سے باہر نکالنے لگتے۔ میری نفاست پسندی گوارا نہ کرتی کہ مَیں اُن کتابوں کو اُسی بُری حالت میں پڑھوں۔ مَیں اُن کی مرمّت کرتا اور اُن پر بھی والی جلدیں باندھتا جو اُن کا حُسن نکھار دیتیں جیسے گوریوں کے بڑھے ہوئے رنگین ناخن۔ کتابوں کو سلور فش اور دیمک سے بچانے کے لئے مَیں اُن میں سانپ کی کینچلی رکھتا اور خوبصورت پرندوں کے پروں کو ترک کے طور پر استعمال کرتا۔ مَیں کتابوں کی جلدیں مانڈی کی بجائے گوند سے باندھتا جسے مَیں کیکروں سے اُتار کر لاتا۔ کتابوں

کے ورقے غائب ہوتے تو مَیں دوسروں کی کتابوں سے نقل کر کے اپنی کتابیں مکمّل کرتا۔ کسی کتاب کے کونے مُڑے ہوتے، اُس کا حجم بڑھ گیا ہوتا، جو بھدّی لگتی، اور بدنُما بھی۔ مَیں ایسی کتاب کے کونے کاٹ کر گول کر لیتا۔ کئی پھوہڑ طالب علم، میری نقل کرتے اور اپنی نئی کتابوں کے کونے کاٹ دیتے۔

مَیں گوند اکٹھا کرنے کے لئے گھر سے نکلا، کھیڑے کی کیکروں سے کچھ حاصل نہ ہُوا، مَیں نے کلّروں کا رُخ کیا۔ شاہ بیلے ہی لُو چل رہی تھی۔ مَیں آب جُو کے لمبے مگر ٹھنڈے راستے پر ہو لیا کہیں ٹخنوں اور کہیں گھٹنوں پانی میں سے ہوتا ہُوا، مَیں فیروز شاہ کے راس پر پہنچا۔ وہاں گہرا دُھم (آب جُو کا تالاب) تھا۔ مَیں نے پگڑی، ٹکوے سے لپیٹی، اُسے گُھما کر دُوسرے کنارے پر پھینکا اور کپڑوں سمیت پانی میں گُھس گیا جیسے دوں اور تونس کا مارا کوئی بھینسا۔ مَیں کتنی دیر تیرتا اور ڈبکیاں لگاتا رہا۔ باہر نکل کر مَیں نے جُوڑا کھولا، بالوں کو شانوں پر بکھرایا اور ٹکوا اُٹھا کر چل پڑا۔ کپڑوں سے نچڑتا ہُوا پانی مجھے تلوؤں تک بھگونے لگا۔ میری جدّت طرازی سے دُھوپ کا عذاب، آرام میں بدل گیا۔ کلّروں سے بھی گوند نہ ملا لیکن مَیں خوش ہُوا کیوں کہ میری ناکامی نے مجھے میری دُور اندیشی تک پہنچا دیا۔ مَیں نے ٹکوے سے کیکروں پر کاٹ لگا دیے جو میری آئندہ ضرورت کی ضمانت تھے۔ کیش سُوکھ کر تپنے لگے تھے اور پاؤں جلنے۔ مَیں نے جُوڑا کر کے پگڑی باندھ لی اور وہاں سے مینڈ مینڈ کالے آم کا رُخ کیا۔ وُہ راستہ ناک کی سیدھ میں آدھے سے آدھا تھا لیکن مَیں ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے جھنڈیوں سے ڈر رہا تھا۔ مینڈ پر کھبّل گھاس (دھاگے جیسی موٹی گھاس جو تپّڑ کی طرح پھیلتی ہُوئی بڑھتی ہے۔) ہونے کی وجہ سے وُہ دوسری دھرتی سے قدرے ٹھنڈی تھی۔ کالے آم کے پاس لامبڑے کی سرحد پر کیکروں کی لمبی قطار تھی جو 'بیر پھلاہی' سے آگے ختم ہوتی تھی۔ آفتاب اِس قدر درخشاں تھا کہ اُس کے پرتو سے ٹھس دھرتی، شیشے کی طرح چمکتی تھی۔ کرنیں دھرتی سے ٹکرا کر اوپر اُٹھتیں اور ہوا کے رُخ پر خاموش لہروں جیسے بہتیں۔ احمد علی کے بنجر میں وہی منظر الگ خصوصیّت کا حامل تھا۔ وہاں زمین کی سطح، پیالہ نُما تھی۔ ذرّاتِ ریگ، انگاروں کی طرح چمکتے اور بل کھاتے ہُوئے اُوپر اُٹھتے۔ وُہ چھوٹا سا خطہ، آگ کے دریا میں گردابِ آتش لگتا۔ سانس میں شُعلے کی سی لپک تھی۔ دوپہر ہو رہی تھی، کسی طرف چلو آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ مَیں نے پگڑی اُتاری، لڑ لمبا رکھ کر باندھی اور لڑ کو چہرے پر پھیلا لیا۔ ایسا کرنے سے میری نظر کا دائرہ سُکڑ گیا لیکن مَیں اپنی سمت اور اُونچا نیچا بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے شوخی سُوجھی! مَیں نے آنکھوں کو بند کیا اور سو قدم چلنے کا عہد لیا۔ مینڈ کافی چوڑی تھی لیکن آنکھیں بند کر کے اُس پر سے گزرنا، شعبدہ گر کا رسّے پر چلنا تھا۔ مَیں آدھے سے کم فاصلہ چلا ہُوں گا کہ میرا پاؤں، چُوہے کے بِل میں دھنس گیا اور مَیں گرتے گرتے بچا۔ مَیں دہل گیا اور جُوں ہی سنبھلا، مَیں نے دیکھا، ٹخنے پر ہلکا سا زخم آیا ہے۔ مَیں مُسکرایا پھر آنکھیں بند کر کے چل پڑا جیسے گرنا پڑنا، چوٹ کھانا میری شوخی کا لازمی امر تھا۔ فضا، حبس سے عاری تھی اس لئے لُو، لپٹ جیسی تھی۔ مَیں دوبارہ گرا

تو مَیں نے راستے سے آنکھ مچولی کھیلنا بند کیا۔ وریام سنگھ کا رہٹ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ میں وہاں پہنچا اور اسے آڑ (کھیت میں پانی دینے والی نالی) میں چادر بچھائے آموں کے سائے میں لیٹا ہوا دیکھا۔ وہ سارے بوٹے نسلی تھے جن کے پھل ایک سیر میں دو تلتے تھے۔ پچھلے سال اُن درختوں کے آم، گوجر ہلون (ٹہنی ہلاکر پھل گرانا) کر لے گئے تھے اس لئے وریام سنگھ آٹھوں پہر پہرا دیتا تھا۔ وہ میرے بھائیا جی کا ہم عصر تھا لیکن میں اُسے ’ویر جی‘ کہہ کر بلاتا تھا اور وہ مجھے ’پڑھاکو بابو‘۔

”پڑھاکو بابو! ایسے میں شیر اپنے بھٹ سے باہر نہیں نکلتا، تو کدھر مارا مارا پھر رہا ہے؟“ میرے پیروں سے پتے کھڑکے، اُس نے میری طرف پہلو بدل کر دیکھا اور کہا۔

”اِس لئے کہ شیر، شیر ہے اور میں، گیان سنگھ ہُوں“

مَیں نے اُس کی بات سے تضحیک کا پہلو نکالا۔

”واہ رے گیان سنگھ جی! لیکن ایسی کیا ضرورت آپڑی کہ گیان سنگھ شیکھر دوپہر کو نکلا ہے؟“

وہ اپنی مُسکراہٹ روکتا ہُوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”گوند چاہیئے، کتابوں کی جِلدیں باندھنی ہیں۔ نہ کھیڑے سے کچھ ملا ہے اور نہ ہی کلروں سے۔“

اُس کے سامنے ہل پڑا ہُوا تھا، مَیں اُس پر بیٹھ گیا۔

”اُدھر بیٹھ!“ اُس نے مینڈ پر پڑی اینٹ کی طرف اِشارہ کیا اور اپنی بزرگی کا مُظاہرہ کرتے ہُوئے کہا، ”اَوزار پر بیٹھنے سے اُس کی بے حُرمتی ہوتی ہے۔“

اینٹ پر بیٹھنا تکلیف دِہ تھا، مَیں اُٹھ کر زمین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ حالاں کہ وہاں زیادہ درخت نہ تھے لیکن ہوا کا رویّہ بدلا ہُوا تھا۔ چھاؤں کا دھوپ سے وُہی رِشتہ ہے جو پانی کا آگ سے۔ مَیں اپنے بچپن میں کھیتوں کو دھوپ میں جاتے آتے ماں کے سائے سائے چلتا تھا تو اُس میں بھی آرام پاتا تھا۔ مجھ سے قریب ہی پرانا گڈا شکستہ حالت میں کھڑا تھا جس کے ساتھ بیل باندھے ہُوئے تھے۔ مَیں نے اُسے دیکھ کر کہا۔ ”ویر جی، آپ اِس کا بائن کیوں نہیں بنا لیتے؟“

”اپنے جنتروں کے بارے میں ایسا سوچنا پُرکھوں کے تبرکات کی بے حُرمتی کرنا ہے!“ اُس نے مجھے یُوں دیکھا جیسے اُسے مجھ سے اس سوال کی اُمید نہ تھی۔ ”کیا تجھے سکول میں یہی پڑھاتے ہیں؟“ اُس نے طنزیہ انداز میں پُوچھا۔

”ہاں یہی پڑھاتے ہیں!“ مَیں نے پُورے اعتماد سے کہا اور اپنی بات کو جاری رکھا، ”سنتا سنگھ زراعت ماسٹر کہتے ہیں کہ نظمِ فطرت کی خُود آرائی کا راز، بازگردی میں ہے۔ دیکھئے ناں! آپ گڈے کا ایندھن نہیں بنائیں گے تو

اِسے دیمک کھا جائے گی!" میں کپڑے جھاڑتا ہُوا اُٹھا، گڈّے کے پاس گیا اور پہیے پر اُبھری ہُوئی مٹّی کو چھُوا جس کے اندر دیمک چُپ چاپ اپنا کام کر رہی تھی۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی بھُربھُری مٹّی جھڑ گئی اور اندر سے دیمک نمُودار ہُوئی۔ اساڑھ میں چِتّے نکلے، بھُورے ہو جاتے ہیں لیکن دیمک اُسی طرح شفّاف رہتی ہے جیسے وہ ہوتی ہے۔ اُس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ دیمک دو متضاد سمتوں میں جا آ رہی تھی؛ یہاں وہاں آپس میں ٹکراتی، رُکتی، منہ اور مُوچھ ہلاتی جیسے باہم کارگزاری اور جلد بازی کی داد دے رہی ہو۔

"ایسا تو مَیں نے سوچا ہی نہیں تھا!" اُس نے لیٹے لیٹے کہا۔ اُس کے چہرے کے بھاؤ سے لگا کر اُس نے میری بات کو پسند کیا ہے اُس نے اُٹھنا چاہا اور پھر جیسے اِرادہ بدل لیا اور میری تائید میں کہا۔ "چیونٹی، دانہ دانہ کر کے کھا لے جاتی ہے اور یہ ذرّہ ذرّہ کر کے لکڑی کو مٹّی کر دیتی ہے۔ مَیں کل ہی اِسے پھاڑ کر ایندھن بناتا ہُوں۔"

"ویر جی، مَیں چلتا ہُوں۔ دھُوپ بڑھ رہی ہے۔" مَیں نے ٹکوا اُٹھاتے ہُوئے کہا۔

"آموں میں جالی پڑ گئی ہے۔ لے، ملاجی کے لئے کُچھ آم لے جا۔"

وہ اُٹھا اور تھانولے میں سے چند آم نکال کر مجھے دیئے جو شاید کل رات ہوا سے گرے تھے۔

رہنے دیجئے! میرے پاس ڈالنے کے لئے کپڑا نہیں ہے۔ مَیں نے اپنی رضامندی میں بے بسی کا اِظہار کیا۔

"مَیں جالی میں ڈال دیتا ہُوں۔"

اُس نے کھُرّی کے اُوپر پڑی جالی اُٹھائی اور تقریباً آدھی آموں سے بھر دی۔

"اِتنے کیا کرنے ہیں، تھوڑے کم کر دیجئے۔"

"تھوڑے راج کَل کے گھر میں دے دینا اور کہنا کر میں نے بھیجے ہیں۔"

مَیں نے شکریہ ادا کیا، جالی لے کر روانہ ہُوا تو اُس نے کہا، "لامبڑے کی سرحد پر جاؤ۔ وہاں کیکروں پر گوند کے ڈھیر ہیں۔"

"یہ بات ہے تو گڈّا لے جاؤں آپ کا؟"

گڈّے کے ساتھ باندھے ہُوئے بیلوں کی طرف دیکھ کر مَیں نے کہا، جو کُریال کر رہے تھے۔

"بدمعاش ہے تو! پُورا بدمعاش۔" اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"جو کُچھ ہُوں، آپ کا چھوٹا بھائی ہُوں!"

مَیں زیرِ لب مُسکرایا اور اُس کی بات سے بات پیدا کر کے خُوش ہُوا۔

"اِسی لئے تو مَیں کہتا ہُوں کہ تُو پُورا بدمعاش ہے ! میں اپنے آپ کو جانتا ہُوں۔"
اُس نے میری بات سے لُطف اُٹھایا اور اپنی بات میں نیا معنی پیدا کیا۔
اِتنے میں عطر سنگھ دکھائی دیا جو وَریام سنگھ کا بھتّا لے کر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر وَریام سنگھ نے مُجھے دعوت دی، تھوڑا مِٹھا پی کر جاؤ"!
"وُہ آپ کے لئے ہی کافی ہو گا!"
اُس کی پیش کش پر مَیں نے نہ اِقرار کیا اور نہ اِنکار۔
"مِٹھّا اور جھگڑا بڑھانے میں کیا دیر لگتی ہے؟"
اُس نے ٹھیٹ دیہقانی کہاوت دُہرائی۔
عِطر سنگھ قریب آ پہنچا تھا، مَیں نے اُسے ست سری اکال بُلائی۔ اُس نے گھُٹی سی آواز میں میری ست سری اکال کا جواب ست سری اکال میں دیا اور وریام سنگھ سے بولا۔ "کیا گرمی پڑ رہی ہے!"
"اَساڑ میں بسیت پڑے گی کیا؟ گرمی ہی پڑے گی!" اُس سے بھتّا لے کر وَریام سنگھ نے اُس پر چوٹ کرتے ہُوئے کہا اور کنُوئیں کی جانب چل پڑا۔ اُس نے کُوزے پر سے ڈبّا اُتار کر ایک طرف رکھا اور مَتّھے پر سے پانی نتارا، جب تک مَیں نے تازہ پانی کا ڈول نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے کُوزے کے اَطراف پانی ڈال کر اُسے ٹھنڈا کیا اور اُس تقریب میں سارا پانی بہا دیا۔ مَیں نے دوبارہ پانی نِکالنے کے لئے کنُوئیں میں ڈول ڈالا، اُس نے کہا، کنُوئیں کی تہ سے ٹھنڈا پانی نِکال!"
مَیں نے ساری نیج کنُوئیں میں چھوڑ دی لیکن ڈول تہ کو نہ لگا۔ مَیں نے اَز راہِ تجسّس پُوچھا۔ وِیرجی! کنُوئیں میں کِتنا پانی ہے؟"
"کیوں؟ پُورا بیس ہاتھ ہے۔"
اُس نے وہیں سے کنُوئیں میں جھانکا جہاں وُہ بیٹھا ہُوا تھا۔
"مَیں نے ساری نیج چھوڑ دی ہے، ڈول تہ میں نہیں لگا۔"
مَیں نے کنُوئیں میں گہرا جھانکا اور ڈول کی گہرائی کا اَندازہ لگایا لیکن لگا نہ سکا۔
یہ ڈول تہ میں لگانا ہے تو اِتنی نیج اور چاہیے۔ اُس نے پُورے اِعتماد سے کہا جیسے اُس نے نیج اور کنُوئیں کی گہرائی ناپی ہُوئی ہو۔
مَیں نے ڈول کو کئی بار اُوپر اُٹھایا اور نیچے گرایا۔ پانی میں ڈول کا وَزن نہ ہونے کے برابر تھا اور میرے اِس علم کی تصدیق کہ اگر کوئی مادّی وُجُود، پانی میں رکھا جائے تو اُس کا وَزن اُتنا کم ہو جاتا ہے جِتنا پانی وُہ ہٹاتا ہے۔

مَیں دل ہی دل میں خوش ہوا، ڈول باہر نکالا اور وریام سنگھ کو دیا۔ اُس نے مٹھّے کو تازہ پانی سے کوزے کی گردن تک بڑھایا، اُس میں کوہستانی نمک گھولا۔ انگشتِ شہادت سے مٹّھا اُٹھایا، منہ میں ٹپکایا اور بے تکلف دعوت دی۔ ”لے پی جتنا پینا ہے! لون کم لگے تو بتا دینا۔“

مَیں نے ہاتھوں سے اوک بنائی اور منہ سے لگائی۔ وہ کوزے سے اوک میں مٹّھا ڈالنے لگا اور مَیں پینے لگا۔ مَیں نے سر ہلایا تو اُس نے کوزہ ہٹایا۔ مٹّھے میں کورے کوزے کی ہلکی سی مٹیالی مہک تھی۔ اُس نے اصلی مزے کو لطیف حد تک بڑھا دیا۔ اُس کے مزیدار اصرار پر مَیں نے کہا۔ ”ویر جی! پیٹ، حلق تک بھر گیا ہے! اور کہاں ڈالوں؟“

”ارے مٹّھے کا کیا ہے؟ ایک بار موت کیا اور مٹّھا ہضم!“ اُس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

وریام سنگھ نہانے کے لئے کپڑے اُتارنے لگا اور مَیں نے کیکروں کا راستہ لیا۔ مَیں چند قدم ہی گیا تھا کہ عطر سنگھ کا اُداس اور خاموش چہرہ، میری آنکھوں میں پھر گیا اور اُس کے ساتھ جُڑا ہُوا قصّہ بھی۔ اُس کا بیاہ پہاڑ کے کسی گاؤں میں پورے دھارمک رسم و رواج کے ساتھ ہُوا تھا۔ اُس کے سسرال والوں نے اپنی بیٹی کی بری کے ساتھ پچاس تولے سونے کی مانگ کی تھی جو پوری کی گئی تھی۔ برات تو ترٹے کے جنگل میں واپس آ رہی تھی کہ کچھ گھوڑ سوار تلواریں سونتے گھوڑے دوڑاتے آئے اور مارو پکڑو کا شور مچاتے براتیوں پر ٹوٹ پڑے۔ جدھر کسی براتی کا منہ تھا وہ اُدھر بھاگ کھڑا ہُوا۔ گھوڑ سوار پسپا ہوئے، براتی تاکتے جھانکتے جھاڑیوں میں سے نکلے، کوئی جانی نقصان نہیں ہُوا تھا لیکن بری غائب تھی اور اُسی طرح دُلہن اور گونہار۔ جب اِس حادثے کی خبر عطر سنگھ کے سسرال میں دی گئی تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ پھر باتوں باتوں میں یہ بات مشہور ہُوئی کہ عطر سنگھ کے سسرال والوں نے کنیا کی جگہ کنور کے ساتھ پھیرے دیئے تھے اور گونہار کے بھیس میں بھی لڑکے کو بھیجے تھے اور پھر دونوں کو جنگل سے بھگا لے گئے تھے۔

اُن دنوں پنجاب میں لڑکیاں کم تھیں۔ جس گھر کے سارے لڑکے بیاہے جاتے تھے، اُس کا بڑا نام ہوتا تھا۔ زیادہ تر بٹّے کے رشتے ہوتے تھے۔ جاٹوں کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کے گھر میں صرف بڑے بھائی کا چولہا جلتا ہے اور باقی سب اُسی میں پکاتے کھاتے ہیں۔ یہ نقلیں اتنی عوام پسند تھیں کہ بس!

کوئی لڑکی پہلی بار سسرال جاتی ہے، وہ کچھ دن لاج شرم میں کئی شوہروں کو برداشت کرتی ہے اور پھر بوکھلا کر اپنی ساس سے پوچھتی ہے، ”ماں ماں! میرا شوہر کون ہے؟“

ہُو! تُو، مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرا شوہر کون ہے!“

بچولیا اپنے ججمان کو خوش خبری سناتا ہے۔ ”شیر سیاں! مَیں تیرا بیاہ پکّا کر آیا ہوں۔“

"دھن باد پروہت جی، بہتا دھن باد! ہاڑی آنے دو، پہلے آپ کا کھاتا بھروں گا اور جو بچے گا اُسے اپنے گھر لاؤں گا۔"

"لیکن!"

"یہ لیکن کیا؟"

"لڑکی کے ساتھ گیلڑ، ربیب ہے۔"

"تو کیا ہُوا! جہاں دس حیوان پلتے ہیں وہاں ایک آدم زاد بھوکا مرے گا کیا؟"

"لیکن!"

"یہ پھر لیکن کیا؟"

"لڑکی ذرا کالی ہے!"

"کالی ہے تو کیا ہُوا! رنگ کوئی کھانے کی چیز ہے جو وہ بے سواد لگے گی؟"

"ایک بات اور ہے!"

"اب کیا بات ہے؟"

"لڑکی کانی ہے!"

"کانی ہے تو کیا! چارپائی کانی ہو تو نیچے تھوڑے گراتی ہے! سونے ہی کے کام آتی ہے۔"

"شیر سیاں!"

"پروہت جی ایک بات بتاؤ، لڑکی نیچے سے ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے! مجھے اُوپر سے کیا لینا ہے؟"

مَیں نے کالے آم کے سائے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے بائیں پاؤں میں سُول ٹوٹ گئی اور مَیں لنگڑا کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مَیں نے نشال (کانٹے کا وہ حصّہ جو ماس کے اندر ٹوٹ کر رہ جائے) ٹٹولا اور اُسے ناخنوں سے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ اُس کی پیٹھ، ماس سے زیادہ باہر نہ تھی اِس لئے پکڑ میں نہ آسکا۔ گوندا رام، کالے آم سے ڈھی دے کر بیٹھا ہُوا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اُونچی آواز میں یقین سے کہا۔ "کانٹا لگ گیا ہے کیا؟"

میرے سر کے اِشارے سے 'ہاں' سُن کر اُس نے اپنی کمر سے گُتھلی کھولی اور اُس میں سے سُوئی، موچنا اور چاقو نکالا اور مٹّی میں رگڑ رگڑ کر اُنہیں صاف کرنے لگا۔ مَیں لنگڑاتا اور ایڑی کے بوجھ پر چلتا ہُوا اُس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ مَیں نے نشال کو تھوک لگا کر صاف کیا اور اُسے موچنے سے پکڑ کر کھینچ کر نکالا۔ مَیں دھوپ میں سے روڑا اُٹھا کر لایا، پسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور زخم کو اچھی طرح داغ دیا۔ گوندا رام مجھ سے دو نسلیں بڑا تھا۔ مَیں نے اُس کی دُور اندیشی کو سراہا اور اُن آلات کی دستی بناوٹ پہچان کر اُس سے پُوچھا۔ "تایا جی! یہ آلات آپ کے اپنے بنائے ہُوئے ہیں؟"

مجھے قدردان اور متجسس پاکر وہ کسی پرانی یاد کو تازہ کرنے لگا۔ اس نے ان آلات کو ایسے دیکھا جیسے وہ ان سے نیا نیا متعارف ہوا ہو۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ اس کا ان سے جذباتی رشتہ ہے۔ وہ گویا ہوا تو اس کا لہجہ رُندھا ہوا تھا، "یہ تینوں اوزار میرے بھائیا جی (واہگرو ان کی روح کو چرنوں میں جگہ دے) کے بنائے ہوئے ہیں۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن جذبات سے لبریز دل، گلے تک بھر آیا۔ اسے چھلکنے سے بچانے کے لئے وہ پیچھے جھک کر اوپر دیکھنے لگا لیکن میں نے تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لئے جو آنکھوں کے گوشوں سے کانوں کی طرف لڑھک رہے تھے۔ اس نے پگڑی کے لڑ سے آنسو پونچھے اور اپنے آپ پر قدرے قابو پاکر کہا۔ "میرے بھائیا اتنے طاقت ور اور کاریگر تھے کہ وہ ایک تاؤ میں کمانی پیٹ کر پھال بنا دیتے تھے۔ وہ لوہے کو ایسی آب دیتے تھے کہ اس سے شیشہ کاٹا جاسکتا تھا۔ وہ نالی پر ڈنٹر پیلا کرتے تھے اور نالی، پسینے سے کیچڑ ہونے تک ڈنٹر پیلتے رہتے تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور آنکھیں موند لیا جیسے کوئی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اچانک شانت ہو جائے۔ آواز، اضطراب ہے اور خاموشی، متانت۔ اپنے تکلیف دہ لمحوں میں تایا جی خاموش ہو جاتے تھے اور ایسے گوشے میں جا بیٹھتے تھے جہاں کوئی ان کی تنہائی میں مخل نہ ہو۔ وہ کئی بار مون رکھتے اور کم سے کم بات کرتے۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ خاموشی ان ساری باتوں پر بھاری ہے جو وہ کرتے ہیں۔ ان دنوں ان کے چہرے پر روشنی سی ہوتی جیسے ان کی روح منور ہو گئی ہو۔ کچھ ویسا ہی منظر میں نے گوندارام کے چہرے پر دیکھا۔

میں اس کے اس جذبے سے واقف تھا اور اس کے کئی چہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ خود کوئی ایسا کاریگر نہ تھا لیکن اس کی ساخت کہتی تھی کہ وہ جوانی میں کڑیل جوان رہا ہوگا۔ اس کی چوڑی چکلی کلائی، میری پنڈلی سے موٹی تھی۔ میں اس اکھڑ دہقان کے جذبات کی نفاست اور سعادت پر حیران ہوا۔ اس کے ہر لفظ میں انسانی ورثے کی شان اور احسان مندی کی آن تھی۔ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کے گوشے پونچھے اور مجھے نرم نگاہی سے دیکھا جیسے میں نے اس کے جذبات میں شریک ہوکر اس پر عنایت کی ہو۔ اس کے چہرے پر جو تسکین تھی وہ کسی پرخلوص بیٹے کو اپنے باپ کا قرض چکا کر ملتی ہوگی۔

اس وقت گوندارام کے چہرے کے ساتھ کئی اور چہرے میرے سامنے ہیں۔ میں ان کے بارے میں الگ الگ لکھنا چاہتا ہوں، چوں کہ ان کے جذبات ایک ہی نوعیت کے ہیں اس لئے میں انہیں اجتماعی طور پر بیان کرتا ہوں تاکہ تکرار سے بچ سکوں۔

وہ جفاکش لوگ سادہ لوح اور جاہل تھے اور اپنی جہالت کی وجہ سے خدا کے دلالوں کے فریب کا شکار تھے۔ وہ اپنی زندگی کو رحمتِ حق کا مظہر مانتے تھے اور چوراسی (شاستروں کے لحاظ سے آتما کو صرف مانس جیون

ہی نا سے مُکتی مل سکتی ہے۔ پر ماتما کی کرپا سے آتما مُکت نہ ہو تو پھر جینے اور مرنے کے چکّر میں پڑ جاتی ہے اور چوراسی لاکھ جُون بھوگ کر ہی مانس جیون پاتی ہے) کو اپنے کُکرموں (بُرے کرموں) کا پھل گردانتے تھے۔ مذہبی تعلیم اور روایات سے وہ وہموں کا پُلندہ تھے اور زندگی کی حقیقت سے بے بہرہ۔ وہ اپنے طور پر کچھ سمجھنا بھی چاہتے تھے تو سمجھ نہ سکتے تھے کیوں کہ انھیں بار بار یہی سمجھایا جاتا تھا۔

رام نام جپ بندیا
کاٹی جائے گی چوراسی تیری

کھانا جھُوٹا کرنے سے پہلے وہ ایک گراس باہر رکھتے ہُوئے سوچتے کہ اگر پر ماتما کی کرپا سے اُن کے پُرکھوں کی چوراسی نہ کٹی ہو گی تو ان کی رُوحیں جیو جنتو میں بھٹک رہی ہوں گی۔ وہ اُن کی رُوحوں کی بھلائی کے لئے تیرتھ نہاتے، پاٹھ کرواتے، دان کرتے، مُرنڈا (کھڑی فصل کا کچھ حصّہ بطور خیرات چھوڑنا) چھوڑتے، سِلّا نہ چُگتے اور اُس رزق کو غریب غُربا کے لئے رہنے دیتے۔ اُس وقت اُن کے جذبات و اظہار ایسے ہوتے جیسے کوئی اپنا گھر لُٹا کر اپنی تہی دستی پر ناز کرے۔ ان رُسومِ مغفرت میں آنسوؤں کا نذرانہ اُن کی رُوح کی سخاوت کا آخری چارۂ کار تھا جس کا صِلہ، تسکین وہ سرِ عمل پاتے تھے۔ اُن کی بے اختیاری میں جو دیانت داری تھی، وہ مکمّل سپردگی کی سی تھی۔

مَیں نے گوندا رام کا شکریہ ادا کیا اور اپنی منزل کا راستہ لیا۔ مَیں کچھ ہی دُور گیا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دے کر کہا، "کاکا! میرے پشُو اِدھر ہانک دو۔"

اُس کے مویشی لامبڑے کی طرف مُنہ کر کے چر رہے تھے۔ مَیں نے آب جُو کی اُگان سے ایک ٹہنی توڑی اور اُس سے پشوؤں کو ڈرا اور چھچکار کر گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ مَیں اُن سے سو قدم آگے گیا اور دیکھا، ہری سنگھ ایک جھاڑی کے سائے میں سویا پڑا ہے اور اُس کے سانٹ لگے بَیل، دلدل کے کنارے چر رہے ہیں۔ مَیں اُن کے پاس سے گزرا تو انھوں نے چرنا چھوڑ دیا اور کان پھٹپھٹاتے ہُوئے چوکنے ہو گئے جیسے انھیں مجھ سے خطرہ ہو۔ وہ دونوں بَیل، مرکھنے تھے۔ مَیں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا، اُن کے پاس سے گزر گیا اور کیکروں کے پاس پہنچ کر دم لیا۔ ان پر گوند ڈھیلوں کی طرح جما ہُوا تھا، جن پر تازہ رِسا گوند، نگینوں سا چمک رہا تھا۔ جتنا گوند آسانی سے اُتر سکتا تھا، مَیں نے اُتارا اور گھر کا راستہ لیا۔ اُس کے بعد مَیں نے گوند اکٹھا کرنا اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ایک کاٹ میں سے گوند رِسنا کم ہوتا تو مَیں اُس سے کچھ دُور دُوسری کاٹ لگا دیتا۔ برسات میں گوند دُوسرے موسموں سے زیادہ رِستا تھا۔ ماں کے ذخیرے خانے میں ایک بٹلوئی خالی پڑی تھی۔ مَیں نے اُسے گوند سے بھر لیا پھر گوند اکٹھا کرنا بند کیا۔ بھایا جی سیاہی اور سلیٹی کے لئے پیسوں کے عوض گالیاں دیتے تھے۔ مَیں اپنی سیاہی کیکر کے کوئلے اور گوند سے تیار کرتا جو بازاری سیاہی سے چمکیلی ہوتی۔ میری ندرت پسندی! مَیں تختی کے لئے زیادہ گوند والی اور کاغذ کے لئے کم گوند والی سیاہی بناتا اور دو دواتیں

رکھتا۔ جزدان میں دو دواتیں رکھنا مشکل تھا۔ میں نے اُن کے لئے لکڑی کا چھوٹا ڈبا بنایا اور اُس کا قُفل بھی۔ وُہ قُفل طوطے کی چونچ جیسا آنکڑا تھا جو مدار کے گِرد گھومتا اور کیل کے ساتھ مُقفّل ہوتا۔ اُس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ آنکڑا لگاؤ تو ' ٹک ' کی آواز آتی تھی جو اُس کے صحیح بیٹھنے کی اِطلاع کرتی تھی۔ دواتوں کے ڈھکن کے لئے میں نے ڈبے کے سَر پوش کے اندر، ربڑ لگائی تھی۔ ڈبا اُلٹا ہونے کی صُورت میں ربڑ، دواتوں کو بہنے نہ دیتی تھی۔ میری تحریر ایسے چمکتی تھی جیسے سیاہی میں گردِ الماس ملی ہُوئی ہو۔ میں سیاہی کا سلیٹوں سے مَبادلہ کرتا اور اپنا کام چلاتا۔ سکُول کی فیس کا مسئلہ ناقابلِ برداشت حد تک ناخوشگوار تھا۔ اُس کے لئے بھائیا جی کے بندھے ٹکے جُملے سُننے پڑتے تھے۔ وُہ اُنہیں بدلتے نہ تھے جیسے اُن کی تقدیس کے قائل ہوں۔

"فیس، فیس، فیس! تُو ایک مہینے میں کتنی بار فیس لے جاتا ہے؟"

"ارے تُو فیس مانگتے ہُوئے اَدیر سویر کیوں نہیں دیکھتا؟"

"تُو نے پڑھ کر تحصیل دار نہیں بننا ہے! جمع تفریق کرنے اور خط لکھنے کے قابل ہو گیا ہے، کافی ہے۔ آج سے سکُول جانا بند کر دے۔"

مجھے کوئی وقت یاد نہیں آتا، جب میں نے فیس مانگی ہو اور بھائیا جی سے گالی یا مار نہ کھائی ہو۔ میں اُسی ایک اذیّت کا شمار کرُوں تو ہندسے کم پڑ جائیں۔ جو کوئی بھکاری کو کچھ دیتا ہے وُہ اُس کے کشکول یا ہاتھ کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ میری حالت اُس سے بری تھی۔ وُہ دُور ہی سے میری طرف پیسے پھینکتے جیسے کوئی آوارہ کُتّے کے آگے رُوٹی کا ٹکڑا ڈالے۔ اُن کی یہ کمینی حرکت مجھے تڑپا کر رکھ دیتی۔ میں دِل ہی دِل میں اُنہیں دُشمن کی طرح کوستا۔ اُن کا یہ رویّہ اِس قدر تکلیف دِہ تھا کہ اُسے تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے مجھے جان سے گُزرنا پڑتا۔ بھائیا جی برآمدے میں آہو تھن (چارہ کُترنے کے لئے زمین میں گاڑی ہُوئی لکڑی) پر کُٹی کاٹ رہے تھے۔ فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی ورنہ پانچ ڈنڈے سزا تھی۔ میں فیس لینے کے لئے اَڑ گیا۔ انہوں نے اول جلول بکتے ہُوئے بنڈی میں سے پیسے نکالے اور مجھ پر پھینکے۔ میری بدقسمتی! ایک آنہ مجھ سے ٹکرا کر بُھس میں جا گرا۔ میں نے بُھوسا چھان مارا لیکن وُہ منحوس سکّہ نہ ملا۔ اُس ناخواستہ نقصان کا ذِمّہ میرے ہی سَر آیا۔ اِدھر میں اکیلا اور اُدھر گالیوں، گھونسوں، تھپیڑوں اور ٹھوکروں کی فوج! غیر مساوی محاذ! میں ہڈیوں تک پِس گیا۔

وُہ پڑھنے میں میری مدد کرتے تھے۔ چوں کہ اُن کا انداز اُنہیں کی طرح نرالا تھا اِس نے اُس کا ذِکر ضروری ہے۔ گرمی کے دِن تھے اور چاندنی سے رات، دُودھ کی طرح سفید تھی۔ میں چھت پر گھومتا ہُوا جُغرافیے کا وُہ سبق بول بول کر یاد کر رہا تھا جو زمین کی گردش سے پیدا شدہ نتائج بیان کرتا ہے۔ بھائیا جی نیچے صحن میں آرام کر رہے تھے، اُنہوں نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں نے چھت کے اوپر سے نیچے دیکھا۔ وُہ ہاتھ میں پکڑو کر دھڑلّے سے بولے، "یہ بے

دھرتی کا دھرا! اس کے گرد دھرتی اور سرشٹی دونوں گھومتی ہیں۔ رات اور دن اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ انہیں پیدا ہونا ہے! موسم اس لئے بدلتے ہیں کہ انہیں بدلنا ہے! نطفہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اسے بچہ بننا ہے ورنہ وہ ٹٹوں کے اندر جوں کا توں پڑا رہتا۔"

"کیا ہوا؟" انہیں اچانک چلاتے سن کر ماں نے ڈرپوک سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں! تیرے لاڈلے کو دھرتی کے کاروبار سمجھا رہا ہوں۔ دھرتی گھومے یا کھڑی رہے، جب تک اگائے گندم کا ہے کا غم! لیکن ایسا نہیں ہوتا! اس لئے آدمی کام کرتا ہے اور جو کام کرتا ہے، وہ تھکتا ہے! جو تھکتا ہے، وہ سوتا ہے، جو سوتا ہے، وہ تازہ دم ہوتا ہے اور پھر کام کرنے کے قابل۔ میں تازہ دم نہیں ہوں گا تو کام کیسے کروں گا اور کام نہ کروں گا تو تم سب کو کیسے پالوں گا؟ بیکار پلّے!"

ہمارے کھیت میں ایک پتھر تھا۔ بھایا جی کھیت پہلے بیجتے تو اسے اٹھا کر دولت رام کے کھیت میں پھینک دیتے اگر دولت رام پہلے کھیت بیجتا تو وہ پتھر ہمارے کھیت میں پڑا ملتا۔ کوئی یہ نہ سوچتا کہ اسے مینڈ پر گاڑ دے یا دور کسی ویرانے میں ڈال آئے۔ باجرہ کاٹتے ہوئے وہی پتھر دکھائی دیا جسے بھایا جی نے دولت رام کے کھیت میں پھینکا تھا۔ بھایا جی نے اسے لڑھکا کر ایک طرف کیا تاکہ اس کے گرد اگا ہوا باجرہ آسانی سے کاٹ سکیں۔ پتھر کے نیچے سے وہ انکوے نکلے جو اس کے دباؤ کی وجہ سے ابھر نہ سکے تھے۔ وہ ادھورے پودے دیکھ کر تایا جی نے بھایا جی سے کہا، "رتن سیاں! ماں باپ جاہل اور جابر ہوں تو بچوں کی حالت ان انکوروں کی سی ہوتی ہے۔"

"ماں باپ اپنے بچوں کا اس قدر خیال کریں گے تو خود کیوں کر پنپیں گے؟"

انہوں نے پتھر کو ایسے دیکھا جیسے اس کی بے حسی کی داد دے رہے ہوں۔

"انسان کی یہی خوبی، آفاقی ہے! یہ کسی کو جتنا دیتا ہے اپنی ذات میں اس سے زیادہ اضافہ کرتا ہے۔"

تایا جی نے انسانی زندگی کے تخلیقی رجحان کا مثبت پہلو اجاگر کیا۔

"بچھڑے کے دودھ کے دانت ٹوٹ جائیں تو گائے اسے لات مار کر تھن چھڑوا لیتی ہے اور کہتی ہے کہ اب جا اور گھاس کھا۔ وہ یوں نہ کرے تو بچھڑا اس کا خون بھی سڑپ جائے!"

بھایا جی نے اپنا فلسفہ بگھارا۔

"یہی وجہ ہے کہ حیوان کا بچہ ہمیشہ اصل کی نقل ہوتا ہے جب کہ انسان کا بچہ، اصل سے کم یا زیادہ! ایک انسان دوسرے انسان کا جواب دِہ ہے۔"

تایا جی نے انسانی اور حیوانی زندگی کے نشوونما کا نازک فرق سمجھایا۔

بھایا جی کام کرتے کرتے آگے نکل گئے اور تایا جی ان نامکمل انکوروں کو دیکھتے رہے جیسے ان کے بارے

میں مزید سوچتے رہے۔

سرسبز کھیتی میں گھرے ہوئے، وہ ادھورے انکور اِس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں، اُن کی ناتمامی اِس قدر مکمل ہے کہ دھوپ لگنے سے وہ بالکل ڈھیر ہو گئے ہیں۔

مجھے یہاں وہاں بے شمار واقعات یاد آرہے ہیں جو میری اُپج پر بوجھ تھے اور اُس کی روک بھی۔ میں کبھی وجہ سے کسی کو نظر انداز کرتا ہوں تو وہ مجھے کوستا ہے، "تو میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گا تو اپنی سچائی سے انصاف نہیں کرسکے گا۔ خیر یہ تیرا معاملہ ہے! لیکن یہ یاد رکھ میں اپنی بے قدری کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گا۔"

اور واقعی میں جس واقعے کو نظر انداز کرتا ہوں وہ مجھ سے اِنتقام لیتا ہے۔ میرے قارئین حیران ہوں گے کہ کیسے؟ وہ ہٹیلی مکھی کی طرح میرے ذہن پر بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے دِق کرتا ہے اور میری سُرت بھنگ کرتا ہے۔ میری مشکل! میں کسی واقعے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ میں اکثر ایسی رُوحانی اذیت میں گرفتار ہو جاتا ہوں جس سے بچنا ناممکن ہے۔ اپنی سچائی لکھتے ہوئے، میں جیسے نازک جذبات سے گزرتا ہوں، میں ہی جانتا ہوں! میری آنکھیں جوشِ گریہ سے طوفانی دریا کی طرح چڑھ آتی ہیں اور کبھی ضبطِ گریہ سے صحرا کی طرح جلتی ہیں۔ میرا عذاب یکتا ہے اور درد نرالا۔ میرے اندھیرے میں اُجالا ہوتا لیکن وہ جھلک اِتنی چھوٹی ہوتی کہ میں اپنی بدحواسی کا شکار ہو جاتا۔ میری ماں کی اِستقامت پسندی اور بُردباری مجھے سہارا نہ دیتی تو جانے مجھ پر کیا گزرتی؟ اُس نے جس طرح میری حِفاظت کی بیج اپنے انکور کی کرتا ہے۔ میری کمزوری مجھے لرزاں و ترساں رکھتی لیکن اُس کی ایک نظر مجھے سنبھال لیتی اور میں پھر اُس منزل کی جانب چل پڑتا جسے بُزدل، قسمت کہتے ہیں۔

میرے سکول کا راستہ میرے حالات ہی کی طرح طُرفہ تماشا تھا۔ برسات میں وہ جوئے رواں کی طرح بہتا۔ اُس کے چکنے کناروں پر پیر نہ جمتے، جو اُن پر چھوٹے چھوٹے قدموں سے نہ چلتے، وہ پھسلتے اور گرتے۔ وہ فاصلہ طے کرتے کرتے پاؤں دھنکی ہوئی رُوئی کے گالے سے بن جاتے۔ ٹاٹ کی گھگی میری برساتی تھی۔ وہ پانی جذب کرتے کرتے نچڑنے اور کپڑے بھگونے لگتی۔ گھگی کوئی دوسرا لے جاتا تو میں درختوں کی چھتریوں کے سائے سائے چلتا۔ بھیگے کپڑے سوکھتے، سوکھتے لیکن اُس بدبُو سے تازہ رہتے جو رطوبت کی لعنت ہے۔ جاڑا اپنے عذاب لے کر آتا۔ آب جو میں سے گزرتے ہی گیلے پاؤں کو ہوا لگتی اور وہ سنّا جاتے۔ دورانِ سفر وہ جیسے کیسے ساتھ نباہتے لیکن دُعا کے لئے کھڑے ہوتے ہی وہ سونے لگتے اور جھٹکے جھاڑنے پر بھی ہوش نہ سنبھالتے۔ سانسوں کی حالت پیروں جیسی ہی نازک ہوتی۔ پھیپھڑے اُن کی پوری گرمی نچوڑ لیتے اور اُن کی ہیئت ہی بدل دیتے۔ وہ کہرے کے بادل لگتے۔ آویزاں بُخارات نتھنوں پر بیٹھ کر کھُجلاتے اور چھینکنے پر آمادہ کرتے۔ دُعا کے رُکے رُکے لمحے ختم ہونے پر پاؤں اُٹھائے نہ اُٹھتے۔ میں اُن برفیلے تودوں کو گھسیٹتا ہوا کنوئیں تک پہنچاتا اور اُن پر تریڑا دیتا۔ رگیں، برف کی کرچوں کی طرح ٹوٹتیں اور پاؤں پر چیونٹیاں رینگتیں۔ میں بے قرار ہو کر پاؤں جھٹکتا، کلاس روم تک دُبکی لگاتا، ڈیسک پر اکڑوں بیٹھ کر فیصے کی جگہ

ناک تک چڑھاتا اور سی سی کرتا ہُوا اپنے گرد سہمی سہمی ٹھٹھری نظر دوڑاتا۔ مجھ آدم زاد پر اُس پرندے کا گمان ہوتا جو پروں میں چونچ گھسائے بیٹھا ہو۔

میرے قارئین! مَیں آپ سے ایک سُوال کرتا ہُوں۔ ایسے افسردہ جذبات اور پست حالات کا تعلیم جیسی بُلند و برتر شے سے کیا رشتہ ہے؟

گرمی میں آب جُو کا پانی چند قدموں میں سکڑ آتا اور باقی پاٹ، ریگ زار بن کر پھیل جاتا۔ اُس پر چلنا صحرا نوردی کرنا تھا۔ مَیں کہیں ایڑیوں پر چلتا اور کہیں پنجوں پر، عین صحرائی گرگٹ کی طرح۔ جب اِس سے کام نہ نکلتا، مَیں سرپٹ بھاگتا، جہاں برداشت نہ کر سکتا وہاں تختی پر کھڑا ہو کر آرام کرتا اور پھر آگے بڑھتا۔ تختی چھُٹی تو کھجار کی جھاڑیاں کام آئیں۔ ایسا بھی ہُوا کہ مَیں نے پاؤں پر پتّوں کے پاتابے باندھ کر اُس تپتے صحرا کو پار کیا۔

اوّل تو جُوتا ملتا نہ تھا کبھی ملتا تو ادھوڑی کا پان والا جُوتا، جسے گنوار پہنتے ہیں۔ وہ میرے نازک پاؤں کو کاٹتا اور میرے عذاب میں نئے طریقے سے اضافہ کرتا۔ مَیں اُسے سرسوں کا تیل مَل مَل کر نرم بناتا اور پھر پہنتا لیکن چند ہی قدموں میں محسوس کرتا کہ میرے پاؤں، بھِڑوں کے چھتّے میں رکھے ہیں۔ مَیں جُوتا اُتار کر ڈسے ہُوئے پیروں کو دیکھتا، اُن پر چمرس، چرکوں کی طرح جلتے ہوتے۔ مَیں جُوتا ہاتھ میں پکڑتا، ننگے پاؤں چلتا اور ہم عصروں کی طنزوں کا نشانہ بنتا۔ مَیں اُسے اُس موچی کے پاس لے کر جاتا جس نے اُسے بنایا ہوتا۔ وہ اُسے کالبوت دیتا، اُس میں سُکھ تلا ڈالتا لیکن اُس کی تعمیل میں فرق نہ پڑتا۔ اُس ذلیل جُوتے سے ننگے پاؤں رہنا آرام دہ تھا۔ ہریانہ کے بڑے بازار میں پیپل کے نیچے بِتیا رام موچی کی دُکان تھی۔ وہ نری کا پتلی کمر کا جُوتا بناتا تھا جو اُس وقت کا پہناوا تھا۔ بھائیا جی اپنا جُوتا، اُسی سے بنواتے تھے۔ مَیں کبھی بازار سے بھائیا جی کے ساتھ گزرتا، وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھ کر اُن سے کہتا، "سردار جی! بچّہ ننگے پاؤں ہے، اِسے یہ جُوتا لے دیجئے۔" وہ دیوار پر لٹکے ہُوئے جُوتوں میں سے میرے ناپ کا جُوتا اُتار کر دکھاتا اور مجھے آگے پاؤں بڑھانے کو کہتا اور ساتھ ہی اُس کی تعریف کرتا، "اِس کا چمڑا اور نری مَیں نے خود کمائی ہے اور سلو کی سلائی کی ہے۔ کئی سال چلے گا!"

مَیں جُوتا پانے کے امکان پر بہک جاتا، بھائیا جی کی تنگ دلی کو یکسر نظر انداز کرتا، جلدی سے ہاتھ سے پاؤں پونچھتا اور انہیں آگے بڑھاتا۔ بھائیا جی غصّے سے دیکھتے اور مجھے پیچھے دھکیلتے ہُوئے کہتے، "بچّے کے پاؤں ترّی کی طرح بڑھتے ہیں۔ یہ جُوتا دو مہینے میں چھوٹا ہو جائے گا اور پھینکنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے چل دیتے اور اُن کے پیچھے مَیں، اندر ہی اندر بسمل کی طرح تڑپتا ہُوا اور انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا ہُوا۔

وہاں کئی ایسے تھے، جو مجھے وہ ہر چیز خرید کر دینے کے لئے تیار تھے، جس کی مَیں خواہش کرتا تھا لیکن مَیں اُس کا بدل جانتا تھا۔

باب ۲۱

ہر نئے زخم کی قسم شاطرؔ
زندگانی سے اور پیار جتا (شاطرؔ)

پاکستان کا دھندلا سا تصوّر حقیقت بن گیا۔ ہمارے گاؤں کے کتنے لوگ کوئٹے، راولپنڈی، کراچی لاہور اور کتنی جگہوں سے گھر لوٹ چکے تھے۔ جہاں دو آدمی کھڑے ہوتے، امرتسر سے اُس پار خوں خرابے کی باتیں کرتے جنھوں نے ریڈیو نہ دیکھا تھا، وہ بھی ریڈیو کی خبر سناتے۔ ہمارے علاقے کی فضا قدرے پُرسکون تھی لیکن بے اعتمادی کا تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔

ترسیم سنگھ، فقیر سنگھ اور میں سکول سے لوٹ رہے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ چلتی سڑک پر نہ کوئی ہمارے آگے تھا اور نہ کوئی پیچھے۔ آرائیوں کے ڈیرے سے پگ ڈنڈی پھوٹتی تھی جو ہمارے گاؤں کی طرف دو فرلانگ دور جا کر سڑک میں ملتی تھی۔ وہاں سے 'علی علی، یا علی' کی دہائی آئی۔ ہم نے اُدھر دیکھا، کئی لوگ برچھے اور گنڈاسے تانتے ڈیرے سے نکل رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ نادِ علی سے مراد، طبلِ جنگ ہے۔ انہوں نے ہم پر ہتھیار لہرائے تو ان کے ناپاک ارادے صاف ہو گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے چلّا کر کہا "بھاگو! ورنہ مارے جاؤ گے!" اور ہم بھاگ پڑے۔ حملہ آور کھیت میں سے سیدھے ہم پر آئے۔ ان کے تہمد باجرے میں اُلجھنے لگے۔ اپنی ابتدائی سازش کے مطابق وہ تیزی سے آگے نہ بڑھ سکے اور واپس پلٹ کر پگڈنڈی پر ہو لئے لیکن اتنی دیر میں ہم کافی آگے نکل گئے۔ بھاگتے بھاگتے میرا بستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا، میں نے رُکنے اور اُسے اُٹھانے میں تامّل نہ کیا۔ وہ اپنے کھیتوں کے کنارے آکر رُک گئے اور گالیاں دینے لگے۔ ان کا رویّہ پالتو کتّوں کا سا تھا، جو اپنی حدود سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں اور وہیں کھڑے ہو کر راہ گیروں کو بھونکتے ہیں۔

اُس حملے کی خبر، دہشت بن کر پھیل گئی۔ طالب علموں نے سکولوں کو جانا بند کر دیا اور ہر سکول پر تالا پڑ گیا۔ اکّا دکّا آدمی ہریانہ جانے سے گریز کرنے لگا۔ ہریانہ کے راجہ احمد سعید خاں کی ہندو مسلم دوستی ایک مثال تھی اور یہ اُسی کے اثر و رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمارا علاقہ ابتری اور بدنظمی سے بچا ہوا تھا۔ دوسرے دن بھایا جی، لال سنگھ، وریام سنگھ اور میں راجہ صاحب کے پاس شکایت کرنے گئے۔ انہوں نے آرائیوں کو بلایا اور ہمارے سامنے کھڑا کیا۔ ان میں سے میں نے دو کو پہچان لیا لیکن وہ قرآن مجید اور رسولِ پاک کی قسم کھا کر مُکر گئے۔

مراد پور کے کچھ سکھ خاندان سب کچھ لُٹا کر اور اپنے چند عزیز مروا کر پاکستان سے آئے۔ گرو ارجن دیو کا شہیدی پُرب تھا، مراد پوریوں نے اپنے گاؤں کے مسلمان گوجروں کے گھروں کو آگ لگا کر پُرب منایا۔ وہ جان بچا کر بھاگے

تو انہیں مار کر آگ میں پھینک دیا۔

ایک قتل آپسی دشمنی کا نتیجہ ہے اور قانون کی رو سے جرم ہے لیکن قتلِ عام، گروہ کی سازش ہے اور بغاوت بھی۔ بغاوت کی نفسیات متعدی ہے! اسے فوری نہ کچلا جائے تو یہ حیرت انگیز سرکشی سے پھیلتی ہے اور بہت سے دوسرے جرائم کو ابھارتی ہے جو بے لکھے قانون بن جاتے ہیں۔ چوں کہ بے لکھے قانون، خلافِ قانون ہوتے ہیں اس لئے وقتی ہوتے ہیں۔ یہ اپنا کام کر کے پسِ پشت چلے جاتے ہیں اور پھر رزمیوں کی صورت نمودار ہوتے ہیں اور انسانوں کے اندرونی مجرموں سے میل ملاپ رکھتے ہیں تاکہ کسی مناسب وقت پر انسانوں کے خلاف اپنی ناروا داری، عداوت، بے رحمی نفرت جتا سکیں اور امن پسند جذبوں میں انتشار پھیلا سکیں۔

گوردواروں، مندروں اور مسجدوں میں رزمیے گائے جانے لگے۔ جہاں انسان اور انسانیت کی ترقی کے لئے دعا ہوتی تھی اور دعا گو اپنی حیات وحفاظت کے ساتھ سربت (سب) کا بھلا چاہتے تھے وہاں دوسروں کی فناد قضا کے منصوبے بننے لگے۔ لوگ اپنے خدا سے قتل و غارت کرنے کی ہمت مانگتے اور اسے اپنے بے رحم عمل میں شریک کرتے۔ مجرموں کے حوصلے بڑھ گئے، ان کے راہبر پیدا ہو گئے۔ مسلمانوں کی مسلمان جانیں! سکھوں میں سے مائی کنگاں کا جنوانی اور ہندوؤں میں سے بھنڈاری ہوشیار پوری مشہور ہوا۔ روایت کے مطابق سنکھ اور گھڑیال سن کر لوگ رام نام، ست نام کا اچارن کرتے تھے۔ ان کی آواز کو نئے ارتھ دیئے گئے۔ اسے خطرے کی نشانی بتایا گیا اور سنکھ، گھڑیال کا حسبِ معمول بجانا ممنوع قرار دیا گیا۔

نہ کوئی بیری نہیں بیگانہ
سگل سنگ موہے بن آئی

(نہ کوئی میرا بیری ہے اور نہ کوئی میرے لئے بیگانہ، میں سب کا بہی خواہ ہوں!)

جن گروؤں کا یہ پیغام تھا اور اخلاقی معیار یہ کہ وہ بدگوئی کو قتل کے مترادف سمجھتے تھے، ان کے نام قاتلوں سے جوڑے جانے لگے۔ حیوانی جذبہ، انسانی جذبے کو ہڑپ کر گیا اور آدمی آدمی کو درندے کی طرح دیکھنے لگا۔ بندوں نے خدا کے گھروں میں مقتل بنا دیئے۔ گنگا جل پاک اور انسانی خون ناپاک بتایا جانے لگا۔ زندگی؛ موت کی بد دعا بن گئی۔ کھڑ گنت، سنت اور بے آتما، مہاتما بن گئے۔ وہ جاہل، رذیل، بدمعاش..... جو ہر انسانی قدر کے دشمن تھے، مذہب کے محافظ ٹھیرائے گئے۔ ان میں سے کتنے امرت چھک کر پاک ہو گئے اور جو پاک نہ ہوئے ان پر دباؤ ڈالے جانے لگے۔ اس اوسر سے فائدہ اٹھا کر کئی چماروں نے بھی امرت چھک لئے اور مذہبی سکھ کہلانے لگے۔

پرانی کہاوت تازہ ہو گئی،

کھانا پینا لاہے دا ⁂ باقی احمد شاہے دا

بقائے نفس اور اتلافِ ذات کی جبلّتیں، اِنسانی زِندگی کی دو متضاد طاقتیں ہیں جو اپنے عروجِ کمال میں یکساں ہیں۔

لوگ دِن کو سوتے اور رات کو جاگتے۔ چوبیس گھنٹے ٹھڑے پہرے دیئے جانے لگے۔ زِندگی کے حاصِل کام، موت کی آغوش میں سو گئے اور مرگ آسا کام، زِندگی کے حاصِل ہو گئے۔ ہاتھ کاروبارِ رزق بھول کر ہتھیار بنانے میں جُٹ گئے۔ لشکر سِنگھ کمانیں اور بندوقیں بنا کر بیچنے لگا۔ اُس کی پیشہ ورانہ لیاقت! اُس نے انہیں خُوش نُما نام دے دیئے۔ ایک ٹانک کی کمان، دو ٹانک کی کمان، ایک توڑے کی بندوق، دو توڑے کی بندوق۔ تیروں کی وافر پیداوار کے لئے اُس نے سانچے بنا لئے۔ انی کے لئے الگ، گز کے لئے الگ اور سوفے کے لئے الگ۔ گھر بار، حِصار اور مورچے نظر آتے۔ لوگ شستر لئے گھومتے۔ شستر گیان دینے کے لئے گُرو پیدا ہو گئے۔ اُن میں سے پیپڑو، نام دیو سنگھ اور جسونت سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔ بوڑھے تھے کہ بچے، عورتیں تھیں کہ مرد، دفاعِ ذات کے گُر سیکھتے۔ کوئی تلوار دھاری، تلوار دھاری سے جھوٹی لڑائی لڑتا اور کوئی تیر کمان لئے تودے پر نشانہ بٹھایا کرتا۔ چوپالوں میں رن بولتے۔ ذرّے، زخموں اور جھونکے، لہو کی بُو سے مہکتے۔ سیاسی اور مذہبی نفرت اپنی اِنتہا کو پہنچ گئی۔

"سکھ ٹِڈی پھرنے جاتے ہُوئے کہتے، پاکستان جا رہے ہیں!"

"مُسلمان پھر کر آتے اور کہتے، "ہندوستان سے آ رہے ہیں۔"

آدمی کا اِنسان مر گیا اور بقولِ تایا جی، اِنسان کا خُون سفید ہو گیا،

مُسلمان پُشت در پُشت سے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھائی چارے کی زِندگی بسر کر رہے تھے، وہ گھر بار چھوڑ کر ہریانہ کیمپ میں جا کر رہنے لگے۔ سادہ لوح اِنسان، جو سیاست دانوں کے سیاسی کینوں سے ناواقف تھے، یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ راج بدلتے ہیں، رعایا نہیں بدلتی ہے! بے اِعتمادی کا غُبار جلد ہی چھٹ جائے گا اور مُسلمان اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے، لیکن جو کوئی گیا، وہ لوٹ کر نہ آیا۔

دولت خاں، فرید علی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میں محلّے والوں کا گُونگا تھا تب وہ گاؤں والوں کا دولت تھا۔ اِدھر میں بچپن کی گلیوں میں رینگتا، لڑھکتا، سنبھلتا ہُوا گُونگے سے ہکلا اور ہکلے سے جگّا بنا اُدھر وہ لڑکپن چھوڑ کر جوانی کے شہرِ تمنّا میں جا بسا اور عدالت یار کہلایا۔ وہ غیبی خیالوں کو لفظوں میں ڈھالتا اور سُر تال میں سجا کر گاتا۔ میں اُس کا سُرتال کیا ہُوا یہ گیت گایا کرتا تھا۔

میں وطن دا شہید ہاں

میری یاد بُھلا دینی

عدالت یار کو ماں کی پکائی مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بہت پسند تھا۔ پسند کیوں نہ ہوتا؟

ماں کے ساگ اور مکئی کی روٹی تیار کرنے کا عمل وجدانی تھا۔ وہ پہلی بار ساگ میں مٹھی بھر آلن ملاتی اور اسے گھوٹ کر چکھتی، اس کے بعد وہ رچنا کار اور پرکھیا دونوں کا فرض ادا کرتی اور ساگ میں تھوڑا تھوڑا آلن ملا کر گھوٹتی اور چکھتی۔ اس کا عمل جہاں تعمیری ہوتا وہاں دیدنی بھی! اس کی ساری حسیں اس کے حکم کی منتظر ہوتیں۔ وہ اپنا اپنا کردار نباہتیں اور لذت کو لطافت سے تعبیر کرتیں جس کی بنا پر وہ آلن کی مقدار کی حد مقرر کرتی۔ جوں ہی ساگ اس کے احساسِ نفاستِ ذائقہ کی تائید کرتا، اس کی آنکھوں میں وہ چمک ہوتی جو کسی خوبصورت چیز کی دید کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ میں مکئی کی روٹی کے تیار کرنے کی تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن گریز کر رہا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ الفاظ اس فعل کے لطیف عمل سے انصاف نہیں کر سکیں گے۔ اسے دیکھنا اور چکھنا ہی اس کی پرخلوص قدردانی تھی۔ یہ سوغات میسر ہوتی تو ماں، عدالت یار کو کھائے بغیر جانے نہ دیتی۔ ماں روٹی پروسنے لگتی، وہ کس لاڈ اور بے تکلفی سے کہتا، "ماں جی! ساگ وچ مکھن میرے جُسّے دے حساب دا پاویں۔ ماں جی! ساگ میں مکھن ڈالتے ہوئے میرے ڈیل کا خیال رکھنا!"

اور ماں مسکرا کر کہتی، "ہاں پتر! لاڈیاں تے مناں مکھن نثار۔ ہاں پتر! لاڈلوں پر منوں مکھن نثار ہے۔"
ماں تھالی میں جتنا ساگ ڈالتی، اس پر اس سے آدھا مکھن ضرور رکھتی۔

آواز کا لہجہ، الفاظ کے معنی کو وسعت عطا کرتا ہے اور اپنی رفعت میں ایسی لذت پیدا کرتا ہے، جس کا حاصل عشرت ہے۔ عدالت یار نغمہ سرا ہوتا۔ اس کی آواز تا حدِ رسائی ایسا جادو جگاتی کہ کام کرنے والوں کے ہاتھ اس لے پر تھرکنے لگتے۔ کنوئیں پر پنہاریوں کی حرکت، سرگم ہی کا کوئی سُر ہوتی۔ ایک بار امر کور نے پانی کا ڈول کھینچتے کھینچتے چھوڑ دیا اور درد بھری آواز میں گانے لگی۔

ڈول کھیچ دے ماہی دی یاد آئی
ہتھ وچوں لج چھٹ گئی

(میں کنوئیں سے پانی کا ڈول نکال رہی تھی کہ مجھے اپنے دلبر جانی کی یاد آئی۔
یاد کی اچانک کسک! میں نے بیچ چھوڑ کر کلیجہ پکڑ لیا)

کسان کے پیشے کو حرف وصوت سے کیا نسبت! لیکن عدالت یار سنگیت کی دنیا میں ہوتا تو اسی کا باشندہ لگتا۔ ایک دن عدالت یار کو باڑ مرمت کرتے دیکھ کر سیوا سنگھ نے پوچھا، "یار عدالت! کسان کے کھردرے پیشے میں تیرے پاس حساس دل کہاں سے آیا؟"

وہ دو کانٹے دار شاخوں کے بیچ کا رخنہ بند کر رہا تھا، رک گیا اور کہنے لگا۔ "حساس دل ہوتا ہی کسان کے پاس ہے! یہی وجہ ہے کہ کسان کے عمل کی پاکیزگی مسلمہ ہے۔ کسان پودوں، شگوفوں، انگوروں، پھولوں، پھلوں کی خالص بزم میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں مرتا ہے۔ کسان، فطرت کی دائی ہے اور ماں بھی۔ اور صرف ماں ہی عالم

انسانی کے شیرازے کو سنبھالتی اور سنوارتی ہے۔ ماں سے بڑھ کر کوئی حسّاس ہے تو وہ خود ماں ہے!"

اُس نے سیوا سنگھ کو مسکرا کر دیکھا، گھاس کا پُولا کھولا اور بینگنوں کی پود کو پالے سے بچانے کے لیے سایہ کرنے لگا۔

تایا جی کہتے تھے کہ دھرتی اور کرسان (کسان) دو مائیں ہیں، جو پاس پاس بیٹھی ہیں۔ پہلی، دوسری کو احساسِ خاطر سے دیکھتی ہے اور دوسری اپنے بچّوں کو کھانا پروستی ہے۔

کئی کٹّر مسلمان، عدالت یار کے ذوقِ سرود و نغمہ پر طعنہ زن رہتے تھے لیکن وہ جس مٹّی سے بنا تھا اُس سے صانعِ ازل صرف فنکار ہی بناتا ہے۔ اُس کے طویلے کے گرد ناگ پھنی کی باڑ تھی۔ ناگ پھنی کے پھل پکتے، وہ انہیں توڑ کر خود کھاتا اور بچّوں کو کھلاتا۔ اُس کے کبھی کانٹا لگتا، وہ اُس کی چبھن کو سہلاتا ہوا ناگ پھنی کو ایسے دیکھتا جیسے رموزِ حسنِ فطرت کی پردہ کشائی میں مصروف ہو۔ وہ کہتا تھا کہ ناگ پھنی کے پھول اور پھل اِس کی روح کے سُر اور تال ہیں۔

جو آدمی، زندگی سے سفّاک حد تک نفرت کرتا ہو اُس کا نازک جذبے اور خیال آرائی سے کیا رشتہ؟

میرے بھائیا جی، عدالت یار کی دیکھا دیکھی، تُونبے، اِکتارے پر گاتے۔ تایا جی انہیں گاتے دیکھ کر مسکراتے۔ ایک بار بھائیا جی نے غصّے میں اُن سے پوچھا، "میں گاتا ہوں تو تم مسکراتے کیوں ہو؟"

"قدرت کی شعبدہ بازی دیکھتا ہوں۔"

"گاتا میں ہوں اور تمہیں اِس میں قدرت کی شعبدہ بازی نظر آتی ہے؟" بھائیا جی نے تلخی سے کہا۔

تُونبا کڑوا ہے اور اسے کوئی منہ نہیں لگاتا ہے لیکن یہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اُس سے میٹھے بول ہی بلواتا ہے۔" تایا جی جھکے ہوئے انداز میں بولے۔

تایا جی سنگیت، سنگیت میں فرق کرتے تھے اور شاستریہ سنگیت کو شوریہ گاتھا (رزمیہ) پر ترجیح دیتے تھے وہ کہتے تھے کہ سنگیت ایسا ہنر ہے جو جذبے کو صرف دوڑاتا ہے۔ مشتعل جذبے میں تعمیری سمت نہ ہو تو یہ تخریبی راستوں پر چل نکلتا ہے۔

عدالت یار کا اندرونی آدمی واقعی ناگ پھنی پر پھول تھا۔ کھیتی باڑی کے کام سے اُس کی انگلیاں کھردری تھیں لیکن وہ سُروں پر چلتی تھیں تو اُن کی خوش حرکتی سے یقین ہوتا کہ وہ صرف سنگیت ہی کی عادی ہیں۔ اُس کے وجود کی ساری سختی؛ انگلیوں کی لچک اور زبان کی نزاکت بن جاتی۔ وہ گاتا ہوا پہلو بدلتا، ہونٹ سنوارتا اور آنکھیں جھپکاتا تو اُس کا ہر لہجہ نغمے ہی کا کوئی پردہ محسوس ہوتا۔ اُس کے سراپے اور نغمے میں ایسا رشتہ تھا جیسے دو چاہنے والے ایک دوسرے کی ستائش کرتے ہوں۔

ایک اداس شام عدالت یار ہمارے گھر میں ہارمونیم پر تان الاپ رہا تھا،

نگری میری کب تک یُوں ہی برباد رہے گی۔

عین اُس وقت اُس کی نگری کو برباد کرنے کے لئے سِکھ لُٹیروں کا جتھا چڑھ آیا۔ جو بولے سو نہال، ست سری اکال، کے جیکاروں سے فضا گُونجنے لگی۔ عدالت یار کی اُنگلیاں جہاں کی تہاں رُک گئیں۔ بھائیا جی گھبرا گئے، اُچک کر اُٹھے اور ایک ایک جست میں کاٹھ کی سیڑھی کے دو دو ڈنڈے پھلانگتے چھت پر چڑھے، ویسے ہی نیچے اُترے اور عدالت یار سے بولے، "جب تک میں گھر نہ لوٹوں، تم گھر سے باہر نہ نکلنا۔" یہ کہہ کر وہ تلوار اور ڈھال لے کر گھر سے چلے گئے اور دروازہ بند کرنے کو کہہ گئے۔ اجیت سنگھ اور درشن سنگھ تیر کمان اور بھر مار لئے چھت پر چڑھ گئے، ماں اور میں عدالت یار کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ کچھ دیر گم سُم بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اُس کے اضطراب سے لگتا تھا کہ وہ وہاں خطرہ محسُوس کر رہا ہے۔ ماں نے ہاتھ سے اُس کا مُنہ چُوم کر کہا، "بیٹا، تُو فکر نہ کر! جب تک ہم ہیں، تم پر آنچ نہ آئے گی!"

رضاکاروں نے لُٹیروں کو روکا، اُنھوں نے اُن کو لُوٹ میں حِصّہ دینے کا وعدہ کیا لیکن اُنھوں نے پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ تکرار ہُوئی جو بڑھ کر تُو تُو، مَیں مَیں پر ٹلی۔ لُٹیرے پسپا ہو رہے تھے کہ ایک ذلیل نے کچھ دُور جا کر گولی چلا دی جو گنڈا سنگھ کے لگی۔ رضاکاروں نے اُس کا پیچھا کیا لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

بھائیا جی، عدالت یار کو اُس کے گھر پہنچانے چلے، وہ فرطِ جذبات سے رو پڑا اور اُن کے پاؤں چھُونے لگا۔ اُنھوں نے اُسے دلاسا دیا اور صحن کا دروازہ کھولا۔ وہ اُسے اُس کے گھر پہنچا کر لوٹے اور کتنی دیر دروازے میں کھڑے ہو کر اِدھر دیکھتے رہے جیسے کسی خطرے کا خوف ہو۔

ہمارے گاؤں کے مسلمان، گاؤں والوں کی ضمانت پر ہریانہ کے کیمپ میں نہ اُٹھے تھے، وہ دُوسرے ہی دن کیمپ میں چلے گئے اور جو کچھ ساتھ لے جا سکتے تھے، لے گئے۔ اُن میں سے غلام نبی کی بیوی جو لے کر گئی، وہ حیران کُن شے تھی --- اوپلوں کی راکھ! اُسے اوپلوں کی راکھ کھانے کی لت تھی۔

برسات شُرُوع تھی، کچھ دِن بعد سناٹے کی جھڑی لگی۔ پانی کا تانا ٹوٹتا۔ چھینٹے، اولوں کی طرح پڑتے جیسے دھرتی کی چھاتی پیٹتے۔ برکھا کے دَل میں سے صحن کی دیوار دکھائی نہ دیتی۔ بجلی کے کڑکنے پر آکاش پھٹنے کا گمان ہوتا۔ کالی گھٹائیں، زمین سے لپٹی لگتیں جیسے آدمی کی سیاہ کاریاں، گھٹاؤں کا رُوپ دھار کر اِس کا وجُود ختم کرنے پر تُل گئی ہوں۔ مکانوں کے چاہے (چھت پر مٹی کی تہ) گل گئے، بنیرے (بام) گھُل گئے اور پرنالے گر گئے۔ بدروؤں سے سوتے بہتے اور گلیوں میں کیچُو تِلمِلاتے۔ مکھیوں جیسے موٹے مچھر اور کچھوؤں جیسے بڑے مینڈک گھروں اور تالابوں کا کہرام بن گئے۔ جل کا تَل، سطحِ زمین تک چڑھ آیا اور کنوئیں، چشموں کی طرح بہنے لگے۔ اُن میں جل جیو پیدا ہو گئے۔ لوگ پانی چھان کر پیتے۔ برساتی نالے، دائمی دریاؤں کی طرح بہتے۔ سارے کھیت پانی میں ڈوب گئے، جو نہ ڈوبے اُن کی

مٹی کائی کے نیچے دب گئی۔ اُفق سے اُفق تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا اور طوفانِ نوح کی کہاوت تازہ کرتا۔ کچھار میں کاٹ لگ گئی۔ پھس پھسی دھرتی، دف سی بجتی۔ ہوا، سانپ سی پھنکارتی چلتی۔ اِکّے دُکّے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے۔ روہی (بانڈو) کی فصل ماری گئی اور میرے (بھوڑ) کی فصل پیلی ہلدی ہوگئی۔ روہی کے راستے، گھاس کے نیچے دب گئے اور کلّروں کے راستے، کوروں سے ڈھل گئے۔ کچے مکان ڈھے گئے اور پکے چھلنی ہو گئے۔ چھتوں میں سے رنگ دار پانی گرتا اور جہاں پڑتا نشان زدہ گنوا تا۔ صحن چھینٹوں سے اور فرش چوئے (ٹپکے) سے چیچک زدہ چہرے لگتے۔ کہیں نالی رُک جاتی تو صحن پر تالاب کا گمان ہوتا۔ سوکھے کپڑے پھپھوندی لگے اور گیلے کپڑے، کیچڑ رہتے۔ سیل کی گھناؤنی باس، سانس کا حصہ بن گئی۔ دروازے پھول کر ایک دوسرے کے اوپر جا چڑھے اور کنڈے بے معنی ہو گئے۔ دروازے بند کرنے کے لئے کُنڈے، رسّی سے باندھنے پڑتے۔ بند کھڑکیاں، کیل ماری جیسی ہو گئیں۔ ونڈے (چارے کے انبار) گل گئے، کپ سیاہ ہو گئے اور بُھورے سڑ گئے۔ دیواروں پر سبزے اور کُکرمتے اُگ آئے۔ ہوا، پانی جیسی ہو گئی اور پانی، کیچڑ جیسا۔ بیرون ہر چیز پر پانی پھر گیا اور اندر ہر چیز کو پانی لگ گیا۔ مٹکوں میں رکھے گُڑ شکر، شیرے بن گئے، بوریوں میں رکھے اناج پھوٹ پڑے، کھتّوں کے اناج سڑ گئے اور گھر بھر گند سے بھبھک اُٹھے۔

دن رات پُورا ہوا چلتی اور راوی کی صداقت کی ضمانت دیتی۔

ساون وگّے پُرا، اوہ بھی بُرا
جٹ بجاوے تُرا، اوہ بھی بُرا

(گرمیوں میں بادِ مشرق چلتی ہے تو اُسے اچھا سمجھتے ہیں کیوں کہ واتاورن (فضا) ٹھنڈا رہتا ہے ساون میں اُسے بُرا مانتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ بارش ہی بارش لاتی ہے اور لوگ بارش سے پہلے ہی بیزار ہوتے ہیں۔ تُرا ایک ساز ہے۔ یہ دو ہاتھ لمبا بانس ہوتا ہے اور دونوں سروں پر کھُلا۔ اُس کا بجانا سنگیت پیدا کرتا نہیں، پھیپھڑوں کا زور آزماتا ہے۔ چوں کہ اُس کا پیمانہ خیالی ہے، اِس لئے مَیں جیتا، تُو ہارا۔ تُو ہارا، مَیں جیتا کرتے کرتے فریقین لڑ پڑتے ہیں۔)

تایا جی اُداس اُداس رہتے۔ کوئی قدرت کے قہر و ستم کی بات کرتا، وہ ہمدردی سے کہتے "عالمِ فطرت میں ہر شے باہمی درد مندی اور ساجھی ذمہ داری کے ولولے میں اسیر ہے۔ یہی مظہرِ فطرت ہے جس سے نظمِ فطرت میں توازن برقرار ہے کوئی بڑا سانحہ گزرتا ہے تو اِس کا نظم و نسق بگڑ جاتا ہے۔"

اِس تعلق سے وہ ایک مثال دیا کرتے تھے جو سمجھنے میں کس قدر آسان ہے۔ حساس انسان کسی مظلوم کی حالت سے متاثر ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں، بشدّتِ غم سے مر بھی سکتے ہیں۔ اُن کی یہ بات، میری آزمائی ہوئی تھی۔ مَیں اپنی

ماں پر بھائیا جی کا تشدّد برداشت نہ کر سکتا تھا اور مجھے دَشت لگ جاتے تھے۔

تایا جی منڈلاتے ہوئے بادلوں کو دیکھتے ہُوئے آنکھیں نہ جھپکاتے جیسے اُن میں سسکتے ہُوئے مظلوموں کی آہوں کو سُن رہے ہوں۔ وُہ آہ بھرنے کے سے انداز میں آنکھیں نیچی کرتے اور کسی کام میں مصروف ہو جاتے۔ اُن کی عقل کے مُطابق لگتا کہ انسان پر دو ہی چیزیں لازم ہیں، کام اور نیک عمل!

ہر وقت ہرا چارہ کھانے اور کیچڑ میں اُٹھنے بیٹھنے سے مویشیوں کو موک (پیٹ کی بیماری جس میں مویشی پتلا گوبر کرتا ہے) کھُرے (ایک بیماری جس میں مویشی کے پیر گلنے لگتے ہیں) اور اُٹھان (ایک بیماری جس میں مویشی بیٹھ کر اُٹھ نہیں سکتا ہے) کی وبا پھیل گئی۔ موت نے طویلوں پر تنبو تان لئے۔ کسان ایک کا مُردہ باہر پھینک کر آتے اور دُوسرے کو مرا ہُوا پاتے۔ گِدھ، مُردار کھاتے کھاتے اِتنا کھا جاتے کہ اپنا بوجھ لے کر اُڑ نہ سکتے اور مُردوں میں مُردوں کی طرح پڑے رہتے۔ اُنہیں پھر بھوک لگتی تو وُہ پُرانے مُردے کو منہ نہ لگاتے اور اُڑنے کے بجائے پھُدکتے پھُدکتے نئے مُردے کے پاس پہنچتے۔ کُتّوں اور کرگسوں کی روایتی لڑائی دکھائی نہ دیتی۔ دونوں جُدا جُدا مُردار کھاتے۔ کُتّے، گوشت قے کرتے پھرتے۔ کوئی اُنہیں روٹی ڈالتا، وُہ اُسے سُونگھ کر منہ پھیر لیتے۔ کسان کیکر کے چھلکے اور پھٹکڑی سے جوشاندہ بناتے اور اُس سے مویشیوں کے پاؤں دھوتے۔ غریب کسان جانتے تھے کہ اُن کے مویشیوں کو دوا دارو سے زیادہ سُوکھی دھرتی کی ضرورت ہے۔ لیکن دھرتی پر سُوکھا مقام تھا کہاں؟ کوئی تھا تو وُہ مظلوموں کی آنکھیں تھیں جن کا سارا پانی، آنسو بن کر بہہ گیا تھا۔

گھروں والوں کا یہ حال ہو تو بے گھروں کی بے کسی کا کیا مقدور! جو آسمان اور دھرتی کے درمیان عناصر کے رَحم و کرم پر پڑے تھے۔

بارش میں ہر طرف پانی تھا لیکن ماحول صاف تھا۔ رگھی (لمبی برکھا کے بعد نکلنے والی دھوپ) نکلی تو زمین پٹیشر کی طرح دکھائی دینے لگی۔ مکان پھُوٹ کی طرح پھٹ کر گرنے لگے۔ ہماری بیٹھک ڈھے گئی اور میری ماں مرتی مرتی بچی۔ دھرتی میں سے گندگی اور مری پھُوٹ پڑی، جس نے دو ٹٹیاں کیں اور دو ہُلوکیں ڈالیں، وُہ چل بسا۔ کیمپ میں مرنے والوں کی رفتار تعداد آبادی سے بڑھ کر تھی۔ کیمپ کے گرد قبریں کھودنے کے لئے جگہ نہ رہی۔ قبروں کے اُوپر قبریں کھودی جانے لگیں اور لاوارث لاشیں بکھری پڑی سڑنے لگیں۔ وُہ دھرتی، جسے کسان اپنی سعادت میں دھرتی ماں کہتے تھے، اُن کی مُصیبت میں کھُلی قبر بن گئی اور قبریں اِس کہاوت کی مثال،

قبراں اُڈیک دیاں، جیوں پُتراں نوں ماواں

(قبریں، مُردوں کا اِنتظار ایسے کرتی ہیں جیسے مائیں اپنے بچّوں کا)

اگر بھوت پریت، زندگی کی حقیقت ہوتے تو وُہ چیختے چِلّاتے، منہ پھاڑے اور دانت نکالے، اُن

بچے کھچے انسانوں کو نگل لیتے جو کسی طرح موت کی ناپاک رسائی سے بچ گئے تھے۔ بھائیا جی ہریانہ سے آئے اور یہ منحوس خبر لائے کہ عدالت یار ہیضے میں مبتلا ہے۔ یہ سن کر مجھے ایسا صدمہ پہنچا کہ میرا تخیل ایک ہی خیال پر جم گیا کہ وہ مرجائے گا۔ میں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن کیسے کرتا؟ مجھے ایک ہی چارہ سوجھتا، دعا! زیادہ نکم، دعا! میں گردوارے میں جاکر گروگرنتھ کے آگے طویل سجدہ کرتا اور رو کر دعا مانگتا۔ میں اپنی دھندلائی آنکھوں میں سے عدالت یار کو دیکھتا، وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا نظر آتا جیسے وہ مسکرایا کرتا تھا۔ میرا ایمان و اعتقاد جو کئی بار ٹوٹا تھا، جسے میں نے اپنی بے ایمانی اور بے اعتقادی سے تعبیر کیا تھا، از سر نو تازہ ہو گیا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے کیمپ میں گیا۔ وہ نحیف و نزار بستر پر دراز تھا۔ جس زبان کی جادوگری دلوں کو اسیر آہنگ رکھتی تھی، سازِ شکستہ کی طرح خاموش تھی۔ جس چہرے کی تازگی سے ہرے بھرے کھیت شرماتے تھے، اجڑے دیار کی سی عبرت برسا رہا تھا۔ وہ عدالت یار وہ عدالت یار نہ تھا جس کے نغمے سوئی ہوئی اداس رگوں میں خوشگوار زندگی کی تحریک جگاتے تھے۔ اسے دیکھ کر پھر سے میرے اعتقاد کو جھٹکا لگا اور میں اندر ہڈیوں تک کانپ گیا اور ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ میری بے بسی پر ترس کھا کر اس نے اپنا کمزور کمزور ہاتھ سرکا کر میری جانب بڑھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھنا چاہتا ہے۔ میں اس کی مدد نہ کرتا تو وہ اپنی تمنا پوری نہ کر سکتا۔

کیا وہ وہی ہاتھ تھا؟ جس نے پنجہ لڑاتے ہوئے حریف کی کلائی توڑ دی تھی۔
کیا وہ وہی کاندھے تھے؟ جو دھرے چکنانے کے لئے چھکڑا تول دیا کرتے تھے۔
کیا وہ وہی بازو تھے؟ جن میں منوں بوجھ اچھلتا کودتا دکھائی دیتا تھا۔
کیا وہ وہی قدِ آدم تھا؟ جس کے سامنے عام قد و قامت کا آدمی، بونا لگتا تھا۔

وہ وہی عدالت یار تھا! وہ وہی سب کچھ تھا! بس اس جوہر سے محروم تھا جو آدمی کے عناصر کا دم خم ہوتا ہے۔ وہ رو پڑا، اسے دیکھ کر میں رو پڑا۔ رونا چھوت کی بیماری ہے، ہر کوئی رو پڑا۔ ناامیدی کا غبار چھٹا، ہر کسی کے ہاتھ اس کی زندگی کی دعا کے لئے اٹھے۔ ہر کسی نے اسے دلاسا دیا، حوصلہ بندھایا لیکن وہ ہمت ہار چکا تھا۔ دوسروں کی خوشیوں کا اجالا اپنے غموں کے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ میں اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سوچ سوچ کر، رک رک کر کہا، "یہ فضا سکوں پرور ہے! ہر شے میری جانی پہچانی ہے! میں اس مٹی سے پیار کرتا ہوں! جب مرنا ہی ہے، میں یہیں کیوں نہ مروں؟ کہیں اور مرا تو انجانے ماحول میں قیامت کا انتظار بے نور اور بے آہنگ ہوگا!"

اس کے اظہارِ تمنا میں دعا تھی، دردمندانہ التجا تھی۔

کریں نہ خوار توں ربا عدالت یار دی مٹی

.بہہ جس تھاں دی ہے مٹی اِس نوں اُس مٹی چے ملنے دے

(میرے ربا! تو عدالت یار کی مٹی خراب نہ کرنا! یہ جس جگہ کی مٹی ہے تو اِسے اسی مٹی میں ملا دے تو اچھا ہے)

وہ بہرا رب! وہ بے حس رب!! جسے میرے اِحساس کی پروا نہیں تھی، وہ عدالت یار پر ریجھ گیا اور اُس نے اُس کی مٹی کو خوار ہونے سے بچا لیا۔

اُسے کھو کر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اُس سے پیار کرتا ہوں۔ میری عمر کے ماہ و سال کھلے منظر کی طرح میرے سامنے پھیل گئے۔ میری ہر بات میں اُس کا مفہوم تھا جس کا رشتہ آسودگی نفس اور سرشاری جاں سے برابر تھا۔ میرا بچپن میری ماں کی غم خواری، تایا جی کی ناز برداری، عدالت یار کی فسوں کاری کی تثلیث تھی۔ وہ میرا انوکھا جزو تھا، جو میرے نغموں کے ذریعے مجھ سے متوصّل تھا۔

باب ۲۲

شاطر نہ درندے سے نہ حیواں سے ڈرو
دوزخ کے عذابوں سے نہ شیطاں سے ڈرو
ہر فتنہ دُنیا کا ہے ماخذ انساں
ڈرنا ہے اگر تم کو تو انساں سے ڈرو (شاطر)

میری طبع آج بھر رواں نہیں ہے۔ میں لکھنے کی کوشش میں کاغذ پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتا ہوں۔ سارے واقعات میرے سامنے ہیں لیکن انہیں لکھنے کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے ہیں۔ یہ موزوں الفاظ بھی کیا بلا ہیں! ان کی عدم موجودگی، تحریک و عمل اور اوّل و آخر کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ میری بے بسی! میں کئی کئی دن تک ایک جملہ نہیں لکھ پاتا جسے میں اپنے معیار سے مکمل کہہ سکوں۔ میز پر کتنے کاغذ پڑے ہیں، جن پر مکڑی کے جالے سے ملتے جلتے حلقے بنے ہیں اور میں، ان حلقوں میں اُلجھا ہوا۔ لاحرکت ہوں۔ کل رات ہی سے میں ناموزونیت کا شکار ہوں۔ آج رات کا پچھلا پہر آنے کو ہے لیکن میری طبع کی روانی، رُکی کی رُکی ہے۔ میں پریشان اور غم زدہ ہوں اور اپنی ناکامی کے کرب سے فرار چاہتا ہوں۔ میری خاطرداری کا سامان میرے قلم کے پاس ہے لیکن وہ میرا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ مجھے ایک مفر سوجھا ہے۔ میں افسانہ امروز لکھتا ہوں، ممکن ہے کہ میری طبیعت بہل جائے اور میری مطلوب کیفیت مجھے مل جائے۔

آج تیرہ اگست اُنیس سو اُناسی ہے۔ گھڑی کے الارم نے حسب معمول پانچ بجنے کا شور مچایا، میں بستر

سے ٹوٹ کر بیدار ہُوا تو ادھوری نیند سوئیوں کی طرح چُبھتی تھی۔ اور سونے کی خواہش کے باوجود میں اٹھا اور بجلی کا بٹن ڈھونڈتا ہُوا کُرسی سے ٹکرا گیا۔ درد پوری تندی سے اٹھا۔ میں 'ہائے ماں' پکارا، درد ایسے گھٹا جیسے 'ہائے ماں' کا لہجہ، درد کی اکسیر تھا۔ میں غُسل خانے سے فارغ ہُوا اور پانی کا پُورا گلاس چڑھایا، یہ میری عادتِ صبُوحی ہے۔ میں روز کی طرح عادتاً لکھنے کے لئے بیٹھا لیکن کچھ نہ لکھ سکا آخر دِل بہلاوے کے لئے کُرسی پر سے اُٹھا، جاکر کھڑکی کے پاس کھڑا ہُوا اور گرد و پیش کا نظارہ کرنے لگا۔ بارش میں نہاتی ہُوئی ہوا، چُہل کر رہی تھی۔ چھینٹوں کی ضربوں سے پتّے ڈفلیوں کی طرح بج رہے تھے۔ اندھیرے اُجالے میں پانی، چادرِ سیمیں لگ رہا تھا۔ ایک ٹھنڈا جھونکا آیا اور مجھے کپکپا گیا۔ حُسنِ فطرت کی دِل کشی کہوں کہ اپنی محویت! میری مجال نہ ہُوئی کہ میں منظر سے نظر ہٹاؤں۔ میں نے پیچھے ہاتھ بڑھا کر بستر پر سے چادر اُٹھائی اور بُکّل ماری۔ اُس کی گرمی نے لذّتِ نظارہ لطیف تر کر دی اور میری چشمِ شوق، حقیقتِ حال کی محرم بن گئی۔ اِس سال بارش کم ہونے کی وجہ سے مینڈک اپنے خوابِ گراں سے ابھی ابھی جاگے ہیں۔ پپیہا اور کوئل رات بھر جاگتے ہیں۔ میں نے سونے سے پہلے اُن کی مدھر آواز سُنی تھی اور اب بھی سُنتا ہُوں۔ پپیہے کی 'پی ہو' میں وُہی دائمی لطافت ہے لیکن کوئل گاہے گاہے پٹر پٹر اور لپ جھپ بولتی ہے۔ چند دنوں میں یہ اپنی لے بالکل بھول جائے گی، اور کوّں میں کوّا نظر آئے گی۔ یہ دوہا مجھے بے اِختیار یاد آتا ہے جسے تایا جی موسمِ بہار میں کوئل کی پہلی لے سُن کر سُناتے تھے۔

کوّا کالا کوئل کالی کی دوناں وِچ پھیر؟
کوّا کوّا، کوئل کوئل، بسنت رُت آون دی دیر!

(کوّا کالا ہے اور کوئل بھی کالی ہے، ایک کی دوسرے سے کیا پہچان ہے؟ بسنت رُت آنے دو، کوّا کوّا رہ جائے گا اور کوئل کوئل ہو جائے گی!)

چڑیاں اور کوّے آمدِ سحر کے پیامبر تھے۔ چند گھنٹوں کی بارش میں نہا کر ہریالی، دُلہن کی طرح نکھر آئی تھی۔ مغرب کی ہوا چلنے لگی، بادلوں میں رخنے پڑنے لگے اور اُن میں سے نیلا امبر جھانکنے لگا۔ سفید بادلوں کے پس منظر میں نیلا آکاش کچھ زیادہ ہی نیلا تھا۔ ستارے، چراغانِ سحری کی طرح بے رعُونت تھے۔ دھن چڑیاں، بجلی کے تار پر بیٹھی تھیں، ایک ذرا کھسکتی، دوسری اُس کے پاس سرک جاتی۔ وُہی جانیں کہ وُہ آپس میں پیار جتاتی تھیں کہ صُبح کی ٹھنڈک میں باہمی حرارت سے لُطف اُٹھاتی تھیں۔ بالکٹارے (ابابیل) اپنے انداز میں سحر کو خُوش آمدید کہتے تھے۔ کئی تُنک رفتار تیروں کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزرتے اور پھر وسعتِ فضا میں نُقطے سے دکھائی دیتے۔ کئی آڑے ترچھے، اُوپر، نیچے دہیں اُڑتے۔ میرے دِل میں ترنگ اُٹھی کہ میرے پر ہوں تو میں بھی آسمان کی گہرائی ناپتا پھِروں۔ میرے ٹیلیفون کے تار پر ہرے رنگ کی پیاری سی چڑیا آکر بیٹھی۔ میں نے کھنک سی سُنی اور ٹیلیفون

کو دیکھا، وہ خاموش پڑا تھا۔ اُس مدھر سُر کا ماخذ جاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ چڑیا گاتی تھی گویا مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ بجلی کے تار کے بدلے ٹیلیفون کے تار کا اِنتخاب! مَیں اُس کے مذاقِ سلیم کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اور جھوم اُٹھا۔ اپنے جھولا جھلاتے جذبات سے رَس لیتے ہُوئے، مَیں اُس سرودِ نغمہ کو زبان میں ڈھالنے لگا لیکن بے بس رہا۔ مَیں نے خود کو سمجھایا کہ صوت پابندِ حروف نہیں ہوتی! لیکن میری وجد آفرینی نے مجھ سے کہا، تو اُس پیارے نغمے کو مضمون میں باندھ کیوں کہ وہ نغمہ، نغمہ نہیں! دو رُوحوں کی ہم آہنگی کے لئے راز و نیاز ہے۔"

"تُو کہاں ں ں ہے!؟"

"مَیں یہاں ں ں ہُوں!"

اُس مدھر بلاوے کے جواب میں بے اِختیار ہو کر، مَیں پکار اُٹھا۔ میری شوخ مِلنساری کے کھلے اظہار سے سُریندر جاگ پڑی۔ وہ انگڑائی لیتے ہُوئے کس پیاری ادا سے مُسکرائی۔ وہ میری کمزوری جانتی ہے کہ لپکتے لمحے، مجھے بے قابو بنا دیتے ہیں۔

فیکٹری کے سائرن نے جُوں ہی چھ بجنے کا اعلان کیا ایک لاری (جس کا ڈِفرنشل خراب تھا) شاہ راہ پر سے گُزری۔ شور کی جھنکار لمبی اور تیز ہو گئی۔ مَیں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ یہ اِس دُوری پر اِتنا جان لیوا ہے تو سڑک کے آس پاس رہنے والوں پر کیا گزرتی ہے؟ مَیں ابھی اِسی خیال میں اُلجھا ہُوا تھا کہ میرے سامنے پرکاش ملک کے باغیچے سے کالی بِلّی نے سَر نکالا۔ پرکاش کی بیوی شیلا ایک چیز ہے! اُس کے رسیلے ہونٹوں سے الفاظ، نغمے کی طرح نِکلتے ہیں اور اُس کی ہنسی! بالکل صراحی کی قُلقُل جیسی ہے۔ خیر یہ دُوسری بات ہے! بلّی رُک کر باہر نکلی اور چوکنّی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر ایسے پھیلائیں کہ اُس کے پیلے دیدوں میں کالی لکیریں عمودوں کی طرح اُبھر آئیں۔ بلّی ایک حُسنِ سراپا ہے! وہ کوئی بد ذوق تھا جس نے اِس کے بارے میں باطِل عقیدہ پھیلایا تھا۔ ایک جھاڑی کے پاس بلّی، زمین کھکھوڑنے لگی۔ میرے دِل میں یہ خیال آیا کہ ہر کوئی بھُوک کے عذاب میں گرفتار ہے۔ میرے خیال کے برعکس بلّی نے گڑھے میں پاخانہ کیا اور اُسے مٹّی سے ڈھانپ دیا۔ میرا یہ مُشاہدہ، مجھے گاؤں کے جنگل میں اُڑا لے گیا جہاں درختوں کے کھوڑوں میں بڑے طوطے (ہورن بِل) رہتے تھے۔ اندر بیٹھے بیٹھے انہیں بیٹ آتی، وہ اپنے چونچ کھوڑ کے مُنہ کے سامنے لاتے اور اِس زور سے بیٹتے کہ بیٹ پچکاری کی طرح کھوڑ سے باہر دُور جا گرتی۔

تایا جی کہتے تھے، "خیال سے مشاہدہ اور مشاہدے سے عمل خُوبصورت ہے۔" اُن کی بات اپنی جگہ دُرست ہے اور میرا مشاہدہ اپنی جگہ، کئی حیوان فِطرتاً اِنسانوں سے حُسن پرست ہیں۔

ٹاؤن شِپ کی سڑکوں کی روشنی بجھی، انڈسٹریل سِکیورٹی فورس کے جوان ڈرِل کے لئے جانے لگے۔

لیٹ لطیف سزا کے ڈر سے دگڑ دگڑ بھاگتے تھے۔ آوا جاہی بڑھ گئی اور پرندوں کی ڈاریں، جنگل کی طرف اُڑتی دکھائی دینے لگیں۔ کُتّے، کان پھڑپھڑاتے، انگڑائیاں لیتے اور سستیاں توڑتے، گلیوں میں نکل پڑے۔ مویشی، کیچڑ کُنڈیوں کا رُخ کرنے لگے۔ اپنا حق لُٹتا دیکھ کر کُتّے اُن پر بھونکتے اور وہ دفاعِ ذات میں سینگ ہلاتے اور داؤ لگتے ہی دولتی بھی جھاڑ دیتے۔ رات کی خاموشی کو صبح کے شور نے نِگل لیا۔ مسز شرما کی نوکرانی بلما کام پر دیر سے آئی، وہ اُسے پھٹکارنے لگی۔ اُس نے چیخ مار کر بے دھڑک کہا، "اماں! میرا احساب کر دو اور جسے چاہو نوکر رکھ لو۔" وہ ڈٹ کر وہیں کھڑی رہی اور مسز شرما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ آخر وہ اُس کے راستے سے ہٹ گئی اور وہ 'ہونہہ' کہہ کر اندر چلی گئی۔ بلما کی ہٹ دھرمی اور مسز شرما کی نرمی سے متاثر ہو کر مَیں نے سوچا کہ زندگی ایک جنگ ہے جو آدمی کو لڑ کر گزارنی ہے۔ اِس جنگ میں ہزاروں معرکے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا معرکہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اِس وقت مَیں اپنے اُس خیال کو الگ طریقے سے پیش کرتا ہوں۔ زندگی کی جنگ میں ہر معرکہ بڑا ہے، مجھے چھوٹا لگتا ہے کیوں کہ مَیں اُس میں شریک نہیں ہوں۔

مَیں اپنے خیال میں اِس قدر محو تھا کہ سریندر چائے کا پیالہ لے کر آئی تو مجھے خبر نہ ہوئی، اُس نے پکارا تبھی مجھے اُس کی موجودگی کا علم ہوا۔ پیالے میں سے لہرا کر اُٹھتی ہوئی بھاپ، نند لال نورپوری کی یاد تازہ کر گئی۔

رَن نہاوندی چھپڑ وچ دیکھی

سُلفے دی لاٹ ورگی

(مَیں نے ایک عورت کو جوہڑ میں نہاتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا سراپا سُلفے کی

لاٹ سے ملتا تھا)

اُس انجانی عورت کے تصوّر سے مزا لیتے ہوئے، مَیں نے چادر اُتار پھینکی جو اچانک بوجھ لگنے لگی تھی۔ مَیں چائے پیتا ہوا سوچنے لگا، "زندگی کتنی کثیر الجہت ہے۔ ہر سانس، نرالی خوشی اور انوکھا غم ہے۔ یوں کہیے کہ زندگی، دو دھاری تلوار ہے۔"

مَیں چائے پی کر ویسے ہی ٹہلتا رہا۔ رسوئی میں سے برتنوں کی چھن چھناک میں سے سریندر کی آواز آئی جس میں ہلکی سی سرزنش تھی، "یار ملنگ! اب نہا لو اور تیار ہو جاؤ، ورنہ فیکٹری جانے میں دیر ہو جائے گی!" میرا اندازہ سراسر ٹھیک نکلا ہے، ہر اُلجھن کا انجام، اچھا آغاز ہوتا ہے۔ میری رُکی ہوئی طبع کو روانی مل گئی ہے۔ کیسا تضاد ہے! پھول ہزار زبان رکھتے ہوئے خاموش ہے لیکن میری ایک زبان لاکھوں دلوں کی ترجمان ہے۔

تقسیمِ وطن سے تین چار ماہ پہلے مولا رانگڑھ مر گیا۔ وہ غلام جیلانی کا بڑا بھائی اور لاولد تھا۔ پہلا جتنا کفایت شعار تھا دوسرا اُتنا ہی کھاؤ اُڑاؤ۔ کہتے تھے کہ اس کے بیٹے کی شادی پر روپڑ کی شبّو رنڈی کا ناچ ہوا تھا اور دولہا ہاتھی پر چاندی کے میگڈمبر میں بیٹھ کر بیاہنے گیا تھا۔ غلام جیلانی کی بارگاہ میں بھانڈ، نقال اور گویّے حاضر ہوتے اپنا کمال دکھاتے اور انعام پاتے۔ لیکن اب وہ سب کچھ لٹا چکا تھا اور جیسے تیسے گزارتا تھا۔ حالاں کہ اس کی محرومیاں اپنی پیدا کردہ تھیں، وہ ان کا ذمّہ دار اپنے بھائی کو ٹھہراتا تھا۔ جس دن مولا مرا، غلام جیلانی نے اپنا اصلی رنگ دکھایا۔ اُس نے خاندانی قبرستان میں کھدا ہوا گڑھا پاٹ دیا اور باغ سے کاٹے ہوئے برگے اٹھا کر گھر لے گیا۔ بھیکو نمبردار نے اُسے سمجھایا لیکن وہ رام نہ ہوا۔ مولے کی قبر جہاں کھودی گئی وہاں کی مٹّی ریتیلی تھی۔ قبر کھود کر گورکن ضریح کرید رہا تھا کہ قبر ڈھے گئی۔ اُس لاولد کے لئے نئی قبر کون کھودتا! اُسے اسی قبر میں دفنایا گیا۔ برگوں اور پوٹ کی چادر وغیرہ کے لئے روپیہ، نمبردار نے ملبا خرچ سے دیا۔

پھر وقت بدلا اور مسلمان اپنے ہی گھروں میں بے گھر ہو گئے۔ وہ زمین، جو ہر کس و ناکس کی زندگی تھی، موت کا اکھاڑہ بن گئی۔ بستیوں پر ہُو کا عالم چھا گیا۔ آدمی اتنا بے آسرا ہو گیا کہ موت کے سوائے اُسے دوسرا آسرا نہ رہا۔

کہتے ہیں کہ بے کسی میں در و دیوار ہی سے دکھڑا رو لو تو دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ غریب مسلمان راجہ احمد سعید خاں کے پاس اپنا دکھڑا رونے جاتے اور وہیں کے ہو رہتے۔ وہ خدا ترس آدمی تھا، اُس نے اِن دکھیوں کے لئے لنگر کھول دیا۔ مفت خوروں کی فطرت، جراثیموں کی طرح ہے۔ موافق ماحول ملتے ہی یہ اتنی تیزی سے بڑھتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے سہارے کو چٹ کر جاتے ہیں۔ لنگر بند ہو گیا۔ ہریانہ کی آبادی ایسے بڑھی کہ گلیاں، سڑکیں، مضافات آدمیوں سے بھر گئے۔ ہریانہ کے در و دیوار، انسانی سمندر میں تیرتے بلبے کی طرح نظر آتے۔ اُس مور و ملخ ہجوم کی حفاظت کے لئے سکھ ملٹری آ گئی جس نے ہندو مسلم ہائی سکول میں ڈیرا ڈالا۔ ہریانہ کو کیمپ کا نام پہلے ہی مل چکا تھا، اب اُس پر سرکاری ٹھپّہ لگ گیا۔ سکول کے صحن میں ایک کھمبا گاڑا گیا جو درختوں سے کئی گنا اونچا تھا اور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ کیمپ میں رہنے والے اُسے حیرت نما دلچسپی سے دیکھتے جیسے پاکستان جانے کا آسان اور سیدھا راستہ وہی ہو۔ ہتھیار بردار سپاہی سکول کے گرد چکّر لگاتے اور دروازے پر کھڑے پہرا بھی دیتے۔

سُود مندی اور بے چارگی، دونوں حالتوں میں آدمی رذالت اور نفاست کی انتہا کو پہنچتا ہے اس لئے زحمتِ حالات، حُسنِ اخلاق کی کسوٹی ہے۔ ہندو اور سکھ مٹھی بھر روپے لے کر کیمپ میں جاتے اور مال و اسباب کے چھکڑے بھر کر لاتے۔ خریدار، بیچنے والوں سے صبر آزما حد تک سودا بازی کرتے، دام چکاتے تو اُن بے چاروں کے دل بھر آتے۔ وہ اپنے سامان کو چھو چھو کر روتے اور کلیجے پکڑتے جیسے وہ بے جان سامان، اُن کے جیتے جاگتے بدن

کا حصّہ ہو جیسے کاٹا جا رہا ہو۔ ایک ایسے ہی سودے کا دردناک واقعہ، میری آنکھوں میں ہے۔ ایک بیوہ اپنی پچکلیانی بھینس، بیس روپے میں بیچ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈالے رو رہی تھی۔ اُس کے دو بچّے بھی بلکتے ہوئے اُس سے لپٹے ہوئے تھے۔ اُس جذباتی ڈرامے کا سفّاک انجام یُوں ہُوا۔ بس بھئی بس! اپنے آنسو اپنے پاس رکھ، مَیں نے صرف پچکلیانی کے دام دیئے ہیں۔

وُہ دور بے اعتباری، بے کسی، بے رحمی . . . . . کا کیسا دور تھا! جسم کا جان سے رشتہ صرف روٹی سے جُڑا ہُوا تھا۔ روٹی، آس تھی! روٹی، انفاس تھی! روٹی، کانوں کی سماعت تھی! روٹی، آنکھوں کی بصارت تھی! روٹی، رگوں کی گرمی تھی! روٹی، زندگی کی روشنی تھی . . . . . روٹی، وقت تھی اور وقت، روٹی۔

پیٹ نہ پئیاں روٹیاں
تاں سبّھے گلّاں کھوٹیاں

(پیٹ، روٹی سے خالی ہے تو زندگی کی ہر قدر کھوٹی ہے)

اور پھر وُہ بھیانک برسات شرُوع ہُوئی جس کا ذکر اس سے پہلے باب میں آ چکا ہے۔ بھایا جی نے گھن کھایا ہُوا بالن تک منہ مانگے داموں بیچا۔ مُسلمان سُوکھا بالن خرید کر گیلے کپڑوں میں ایسے چُھپاتے جیسے کوئی اپنے ننّھے کو نظرِ بد سے بچائے۔ ٹال پر دروازوں اور کھڑکیوں کی لکڑی کے سوا کوئی دُوسری لکڑی دکھائی دیتی تھی تو وُہ تکڑ (بڑی تکڑی) کی ٹیڑھی میڑھی بلّی تھی۔

کیمپ میں کتنے تھے جو دِن بھر محنت مزدُوری اور چھوٹا موٹا کام کر کے کچھ کماتے تھے اور رات کو کھانے پکانے کا سامان خریدتے تھے۔ اُن کے کام ٹھپ ہو گئے اور چوُلہے ٹھنڈے۔ جن کے پاس کچھ رسد تھی وُہ برسات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پن کال پڑ گیا۔ امیر، غریب ہو گئے اور غریب تہی دست۔ بھوک کی ڈائن منہ پھاڑے گھُومتی اور انسان نگلتی۔ جب جان بچانے کا کوئی راستہ نہ رہا، انسان اُن حیوانوں کے درپے ہو گئے جنہیں وُہ غیر ضروری جان کر آوارہ چھوڑ آئے تھے۔ لیکن بھُوک کا مُنہ بھرنے کا یہ طریقہ کارگر نہ ہُوا! ماس ریندھنے کے لئے بالن نایاب تھا اور انسان کی پچھلیوں کے ساتھ اُس کے معدے سے وُہ سارے عرق غائب ہو چکے تھے جو کچّا ماس پچانے کے لئے لگتے ہیں۔

کیمپ میں رہنے والے کیمپ کمانڈر کے پاس جاتے، صرف دو عرض گزارتے اور ایک ماننے کو کہتے،

ہمیں پاکستان لے چلو،

ورنہ گولی مار دو!

کمانڈر دونوں صُورتوں میں بے بس تھا۔ کیمپ کی روانگی کا حُکم اُوپر سرکار سے آنا تھا اور پُرامن شہریوں کو مارنے کا اُسے اختیار نہ تھا۔ لیکن وُہ تھا احمد سعید کی طرح دردمند! اُس نے فاقہ زدہ بچّوں کے لئے کھانا مُہیّا کرنا چاہا۔ اُن کے

ساتھ بڑے بھی اندر گھس پڑے۔ سنتری کا ہالٹ، ہالٹ' کا حکم کام نہ آیا، ہلڑ مچ گیا، جسے دبانے کے لئے فائر ہوا اور کتنے بھوکے پیٹ کے آزار سے آزاد ہو گئے۔ اس زیادتی پر شرمندہ ہو کر کمانڈر نے مسلمانوں کو سپاہیوں کی حفاظت دی تاکہ وہ اپنے گاؤں جا سکیں اور کھانے کی چیزیں لا سکیں۔ مسلمان ساؤنی بیچ کر کیمپ میں گئے تھے لیکن اُن کے جاتے ہی لوگوں نے ان کے کھیت اور گھر لوٹ لئے تھے۔ وہ اپنی ضرورت، دوسروں کے کھیتوں سے پوری کرتے اور سپاہیوں کو باور کرواتے کہ وہ صرف اپنی فصل کاٹتے ہیں۔ دراصل وہ بلا لحاظ و تمیز ہر کسی کی فصل کاٹ لیتے تھے۔

وہ ایسا کرتے تھے تو بے قصور تھے!

روٹی، انسان کی کم سے کم ضرورت ہے اور جینے کے لئے شرط اوّل! اس کی عدم دستیابی خودی کی خودکشی کی تحریک ہے جو اپنی حرکت کی قوت آپ ہے۔ نہ اس کی نفی کی مثبت ہے اور نہ ہی پستی کی بلندی اس کے حلقۂ اثر میں سلیقے قرینے، طور طریقے مہمل ہیں اور قانون، قاعدے باطل۔ چوں کہ یہ تہذیب و تمدن سے مقدم ہے اس لئے حیوان کی طرح انسان کی اوّل حقیقت ہے۔

اُن بھوکوں کا ٹڈی دل ہمارے گاؤں کے کھیتوں میں اترا، اُن کی لوٹ سے وہی کھیت بچا جو گاؤں کے قریب تھا۔ ہر زبان ہاہاکار اور للکار تھی۔ تایا جی کو خبر ملی، انہوں نے احساسِ احسان مندی سے اپنے بچوں سے کہا، "اچھا ہوا! تم لوگ، اُن کا جتنا لوٹ کر لائے ہو اُس کا کچھ تو ادا ہوا! افسوس اس بات پر ہے کہ جو ہمیں، اُن سے معافی مانگ کر عزت کے ساتھ لوٹانا چاہیئے تھا وہ انہیں چرانا پڑا ہے۔"

لیکن اُن کے لڑکے بھڑک اٹھے اور اُن پر الزام لگانے لگے، "تو پاگل ہو گیا ہے! تیرا بس چلے تو تو گھر بار اٹھا کر مسلمانوں کو دے آئے اور ہمارے ہاتھوں میں بھیک کے کاسے پکڑا دے۔" وہ ہتھیار اٹھا کر کھیتوں کو بھاگے اور ایک مسلمان کو اپنے کھیت میں جا لئے۔ وہ انہیں فریب دے کر بھاگ نکلا۔ ترلوچن سنگھ نے اُس پر گنڈاسا پھینکا، جس سے اُس کا بازو کٹ گیا لیکن وہ سپاہیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ کسان پہلے ہی سپاہیوں کو گھیرے کھڑے تھے اور فصل لٹ جانے کی فریاد کر رہے تھے۔ سپاہی انہیں دلاسا دے رہے تھے اور مسلمانوں کو اُن کی غیر اخلاقی حرکت پر کوس رہے تھے۔ اپنے آدمی کو زخمی دیکھ کر سپاہی بگڑ گئے۔ وہ غصے میں اپنی رائفلیں اور مشین گنیں اٹھانے گرانے لگے۔ جب تک کسی نے زخمی کا ٹنڈ رسی سے کس کر باندھا، سپاہیوں نے آپس میں انگریزی میں مشورہ کیا اور الیشر سنگھ، عطر سنگھ اور گوپال سنگھ کو معاوضہ دینے کے لئے اپنے ساتھ لے لیا۔ انہوں نے کئی اور کسانوں کو بلایا لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ وہ تینوں ٹرک میں بیٹھ کر چند کھیت پرے گئے تھے کہ شام سنگھ کا لڑکا گربچن سنگھ کھیتوں میں پہنچا۔ اُس کا نقصان سب سے زیادہ ہوا تھا لیکن وہ موقعۂ واردات پر دیر سے آیا تھا۔ معاوضے کا ذکر

سُنتے ہی وُہ ٹرکوں کے پیچھے بھاگا۔ وُہ لپک لپک بھاگتا ہُوا اُن تک پہنچ نہ پاتا لیکن اُس نے کھیتوں کا سیدھا راستہ اپنایا اور اُنہیں نالے میں جا لیا۔ سپاہی ٹرک روک کر اُسے ساتھ لینے لگے۔ ایشر سِنگھ نیچے کُود پڑا اور پاخانہ کا بہانہ کر کے جھاڑیوں میں چُھپ گیا۔ سپاہی، اُس کے لئے کُچھ دیر رُکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ایشر سِنگھ چُھپتے چُھپاتے اُن کا پیچھا کرنے لگا تاکہ موقع ملے تو وُہ اپنے ساتھیوں کو بھاگ نِکلنے کا اِشارہ کرے۔ اُس نے سپاہیوں کی باتوں سے محسُوس کیا تھا کہ اُنہوں نے اُن کو قتل کرنے کے اِرادے سے ساتھ لیا ہے۔ کُچھ دُور جا کر سپاہیوں نے اُن تینوں کو ٹرک پر سے اُتار دیا اور واپس جانے کے لئے کہا۔ وُہ وہیں کھڑے رہے اور اُنہیں گالیاں دینے لگے۔ ایشر سِنگھ نے اُنہیں بھاگنے کے لئے پُکارا، اِس سے پہلے کہ وُہ اُس کی بات سمجھتے، سپاہیوں نے اُن پر مشین گن سے فائر دیا۔ اُس بے آئینی کے دور میں داد رسی کیسی! اُس ہولناک قتل کے بعد مُسلمانوں نے کیمپ سے نِکلنا بند کر دیا۔

وُہ دور، بھیانک دُور تھا! رخشِ قانُون بے لگام تھا۔ ضمیر کوڑیوں سے سستا تھا اور تمدّن ننگا ناچ رہا تھا۔ عابد، عدو اور مہاتما، بے آتما تھے۔ کٹھور دِلوں کے سامنے پتھر، موم تھے۔ مانس کو کیسا شراپ تھا! جو جِتنا گرا ہُوا تھا اُتنا ہی اُونچا کہلاتا تھا۔ گرمیِ حرص میں نازک جذبے کا یہ حال تھا جیسے تپتے توے پر پانی کا قطرہ۔

ہِندُوؤں اور سِکھوں پر جُوں ہی آشکار ہُوا کہ مُسلمان لوٹ کر نہیں آئیں گے، اُن پر نادِر شاہ کی رُوح حکمران ہو گئی۔ جو ڈرتے کسی سے آنکھ سے نہ مِلاتے تھے، وُہ جرحا جرحی لُٹیرے بن گئے۔ زمین پر سونے والے پلنگوں پر سونے لگے۔ مِٹّی کے برتنوں میں پکانے کھانے والے کانسے اور تانبے کے برتنوں میں پکانے کھانے لگے۔ دُودھ دہی کو ترسنے والے دُودھ دہی میں نہانے لگے اور ننگے رہنے والے کپڑے پہننے لگے۔ کھیتوں، حویلیوں اور گھروں کے ساتھ دِلوں کی حدیں بھی بدلیں۔ فرق بس اِتنا تھا کہ وُہ آدمی کے سینے میں چُھپی ہُوئی تھیں اور نظر نہ آتی تھیں۔

پیٹ کی آگ کا ایندھن، روٹی ہے، جس سے یہ آگ بُجھتی ہے۔ لیکن ہوس کی آگ کا ایندھن، ہوس ہے جس سے یہ آگ بھڑکتی ہے اور اِنسان کو آتش فشاں بنا دیتی ہے۔

جسونت سنگھ اور اُس جیسے کئی اور، جو دُوسروں کے لئے کام کرتے ہُوئے ایک آدھ مَن بوجھ اُٹھاتے ہُوئے شکایت کرتے تھے، لُوٹ مار کے منوں بوجھ کے نیچے آرام دِہ لگتے۔ کوئی حیرت کا اِظہار کرتا تو وُہ خُود پر اِعتراض کرتے، "چیونٹی اپنے وزن سے ہزار گُنا زیادہ بوجھ اُٹھا لیتی ہے، اُس کے سامنے یہ نہ ہونے کے برابر ہے!" اَمر سِنگھ پیارا سِنگھ، کرتار سِنگھ، آسا سِنگھ، سیوا سِنگھ، باوا سِنگھ، سنتا سنگھ..... مَیں کِس کِس کا نام لوں! میرے باپ رتن سِنگھ اپنے ہی گاؤں میں اپنے کو رفیوجی ظاہر کر کے مُسلمانوں کی جائیداد پر قابض ہو گئے اور زمین کی سرکاری الاٹمنٹ ہونے تک اُس پر اپنا عمل دخل جمائے رہے۔ جب اصل رفیوجی، مُسلمانوں کے گھروں میں آئے تو اُنہیں رہنے کے لئے کھنڈر مِلے۔ جس کِسی نے جہاں قبضہ جمایا، وُہ وہاں کا ساز و سامان اُتار کر لے گیا۔ ہمارے گھر کے پچھلے صحن میں جو ٹیڑھا ہے وُہ اِتنی

کم نہ تھی جتنی اَب ہے۔ وُہ بھی بالکل سیدھی ہوتی اگر سنتا سنگھ پُور کو موڑ پڑنے کے محاورے پر عمل نہ کرتا۔ ہمارے گاؤں میں جتنے رفیوجی آئے، اُن میں زیادہ ساتی تھے۔ اُنہوں نے مقامی لوگوں سے ملنے کی یہ شرط رکھی کہ یہ اپنے گرُودوارے کا نام بدل کر گرُودوارہ سنگھ سبھا رکھ دیں۔ اِنہوں نے شرط نامنظور کر دی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُنہوں نے تکیے کی مسجد کو گرُودوارہ میں تبدیل کر لیا گویا ایک محاذ کھول دیا۔

اَخلاقی قدروں کے اُس فقدان میں کوئی اپنے آپ میں تھا تو وُہ تایا جی تھے۔ وُہ کہتے تھے۔" کاروبارِ فطرت میں ہر ذرّے کی زندگی حُسنِ اُسلُوب پر مبنی ہے۔ جسے جو بننا ہے وُہ اُسی کے لئے سرگرمِ عمل رہتا ہے اَور آخرکار اپنی بقا کے کمال کو پہنچتا ہے اِس لئے ہر چیز کا نام، اُس کی پہچان ہے۔ اَصلِ طینتِ آدم، حیوان ہے! اِسے اِنسان کہلانے کا حق اپنے اَچھے عمل سے ملتا ہے۔"

وُہ اپنے بچّوں اَور بھائیوں کو لُوٹ مار کرنے سے روکتے۔ وُہ اُن پر طنز کرتے،" تیری ہڈیوں میں زور ہوتا تو سُورا (جودھا) ہوتا تو یہی کرتا جو ہم کرتے ہیں۔"

"قتل وغارت اَور جنگ وجدل اِنسانی گراوٹ کا آخری مرحلہ ہے اَور دُنیائے اِنسانیت کا اَندھا پہرا۔ میری ہڈیوں میں زور ہوتا تو مَیں پہلے تُمہارے خلاف کھڑا ہوتا اَور یہ اِنسانیت سوز کام کرنے سے روکتا۔ تُم جیسے دلیرانہ عمل کہتے ہو، وُہ ظالمانہ اَور بیدردانہ فعل ہے! سُورا وُہ ہوتا ہے جو دُکھیوں اَور بے سہاروں کی مدد کرتا ہے۔ وُہ بزدِلی کا میلانِ خاطر ہے جو کمزور کو بے آبرو دیکھنا چاہتا ہے اَور اُس کی بے کسی پر برتری محسُوس کرتا ہے۔" اُن کے مذہبی جنُون میں وُہ اُنہیں کرپان کا اَرتھ بتاتے،" کرپان، کرپا دھان ہے! اِسے جِس نے بنایا تھا، اپنی حفاظت کے لئے بنایا تھا۔ اُس کی فن کارانہ بصیرت کو اُس سختی، زیادتی اَور بے رحمی کا اَندازہ نہ تھا جس کے لئے اِسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ تُمہارا گھناؤنا عمل تُمہارے ضمیر پر داغِ بریاں کی طرح رہے گا، جِس پر کسی پُوجا پاٹھ اَور پچھتاوے کا امرت کارگر نہ ہوگا۔"

تایا جی کی رُوحانی اذیت سے بھی اِنسانی محبت کی جھلک اَور اَخلاقی جذبے کی شدّت دکھائی دیتی۔ وُہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تو تایا جی ہارے ہُوئے لہجے میں کہتے،" درندے کا بچّہ، درندہ نہیں بنتا جب تک کہ وُہ اُسے درندگی کے طور طریقے نہیں سکھاتا۔ تُم جو کر رہے ہو، وُہ میری دی ہُوئی تعلیم وتربیّت کے عین برعکس ہے۔ مَیں اپنی کوشش میں پُوری طرح ناکام رہا ہُوں!"

وُہ بے حیا اُن کی بات نہ سُنتے، تایا جی خود کلامی کے اَنداز سے کہتے،" سادھو سیاں! تُو بھُول رہا ہے کہ درندے کا بچّہ کبھی نہ کبھی درندہ ہی بنتا ہے لیکن اِنسان کا بچّہ کبھی بھی کچھ بھی بن سکتا ہے! اَور اِس کے مُنہ خُون لگ جائے تو یہ درندے کو شرما سکتا ہے۔" اپنی بات کی تائید میں وہ گربانی کا حوالہ دیتے،

جے رت لگے کپڑے ، جامہ ہوئے پلیت
جو رت پیوے مانسا ، تن کیوں کر نرمل چیت
(اگر لباس، خون سے لت پت ہو جائے تو اُسے غلیظ جانتے ہیں)
(جو انسان، انسانوں کا خون پیتے ہیں، اُن کے دل اور کام کیسے پاک ہو سکتے ہیں)

اُن کے لڑکے ہتھیایا اور چرایا ہوا مال لا کر گھروں میں رکھتے اور فخر کرتے۔ وہ اعتراض کرتے، "تم سمجھتے ہو کہ تم گھر بھر رہے ہو! حقیقت میں تم ایسے گڑھے بنتے جا رہے ہو جس کی گہرائی تمہارے شرمناک فعل سے سیدھی جڑی ہوئی ہے۔ بادشاہوں کو ملک بس نہ ہوئے کیوں کہ وہ اُن کی لوٹ مار کا حاصل تھے۔ کوئی چیز اپنی جڑوں کے بغیر نہ پنپتی ہے، نہ پھولتی پھلتی ہے! سماجی قدریں، انسان کی جڑیں ہیں! کاش تم جانتے کہ تم اپنی ہی جڑیں کاٹ رہے ہو! تم انسان نہیں لٹیرے ہو اور تاریخی لٹیروں کے چھوٹے نمونے۔ تم جنہیں لوٹ رہے ہو، وہ مسلمان نہیں انسان ہیں!"

وہ کئی بار اپنے آپ سے باتیں کرتے۔ "ضرورت غیر محسوس طریقے سے بڑھتی ہے، اِس پر دھیان نہ دیا جائے تو یہ حرص بن جاتی ہے۔ حرص، قارون اور نادر کی تسلّی نہ کر سکی کیوں کہ حرص کا ایک ہی چلن ہے، زیادہ حرص! یہ تنگ دلی سے شروع ہوتی ہے اور اپنی مصیبت پر ختم۔"

رزمیہ گاتے اور جیکارے بُلاتے لوگوں پر وہ تبصرہ کرتے، "الفاظ صداقت نامہ سکونت ہیں اور پروانۂ ہلاکت بھی۔ یہ ایسے الفاظ کیوں چنتے ہیں جو بربادی کی ضمانت ہیں۔" لٹیروں کے سرغنوں کی اشتعال انگیز اور حقارت آمیز تقاریر سُن کر وہ کہتے، "جذبۂ نفرت، اِتلاف و ابطال کی زندہ حقیقت ہے، اِس جذبے کو تعمیری سمت دینے والے ہی کا نام انسان ہے! نام نہاد انسان، درندے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیوں کہ یہ اپنے جرم میں اپنے جیسوں سے ساز باز کر لیتا ہے۔"

تایا جی کے درد و غم، آنسو بن کر بہتے اور وہ میری ماں سے کہتے، "فرض کرو، ہم ایسے حالات میں ہوتے، لٹیرے ہمیں لوٹتے، قاتل ہمیں مارتے تو ہم کیسا محسوس کرتے؟ کتنی بہو بیٹیاں گربھ وتی ہوں گی، جن کو طبی امداد کی ضرورت ہے، اُن پر کیا گزرتی ہوگی؟"

اُن ابھاگنوں کا خیال کر کے ماں رو پڑتی، انہیں روتا دیکھ کر میں رو پڑتا۔ تایا جی مجھے آغوش میں لیتے اور سسکتے ہوئے کہتے، "تم مجھ سے وعدہ کرو! تم بڑے ہو کر کوئی ایسا کام نہ کرو گے جو ننگِ انسانیت ہو!" میں اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دیتا اور بے اختیار اُن سے لپٹ جاتا۔ وہ خود کو سنبھالتے اور مجھے ساتھ لئے کھیتوں کو چل پڑتے۔ ہم وہاں پہنچتے اور کسی کام میں مشغول ہو کر اپنا اور مسلمانوں کا دکھ بھول جاتے۔

حالات کی اُس الٹا پلٹی میں کیا کیا نہ ہُوا؟ انسانوں کی حیوانی جبلّت نے درندوں کو پچھاڑ دیا۔ مجھے لگتا کہ آدمی کی رحم دلی غیر طبعی ہے اور اذیت خواہی عین طبعی! کیمپ میں رہنے والوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گردش میں تھیں۔ ایک افواہ نہایت بے دردتھی کہ نوجوان، بوڑھوں کو بھوکا مار رہے ہیں۔ کیمپ نے کوچ کیا تو انسانی بے حسی کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ مسلمان اپنے ان لوگوں کو وہیں پڑے رہنے دیئے جو چل نہ سکتے تھے۔ ان میں سے کئی لنگڑاتے اور کئی بچّوں کی طرح رینگتے قافلے کے ساتھ ہو لیئے اور جیسے جیسے ہمّت ہارتے گئے، ڈھیر ہوتے گئے۔

انسانی زندگی کتنے تضادوں کا اتّصال ہے! ہمارے گاؤں کا بھیکو نمبردار اپنی سینکڑوں ایکڑ اراضی پیچھے چھوڑ گیا لیکن اپنے پُرکھوں کی قبروں کی مٹّی سے بوری بھر کر لے گیا جیسے وہ اُس کی آئندہ زندگی کی ضامن ہو۔

ہریانہ، ہوشیار پور کی سڑک پر درخت ویسے ہی ہرے بھرے تھے اور ویسے ہی آنے جانے والے لیکن نظر نہ آتے تھے۔ مُردوں کی سڑاند نے ہر شَے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جہاں آنکھ اُٹھتی، مُردوں پر پڑتی۔ ماحول کی وحشت سے گھبرا کر لگتا کہ موت منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہے اور ہر زندہ شَے کو نگل رہی ہے۔

باب ۲۳

اپنے لہو میں جب نہ رہی گرمیِ وفا
کیوں عذرِ سرد مہریِ دُنیا کرے کوئی
(شاطر)

حادثات کی نفسیات متضاد ہے! کہیں یہ مصیبت در مصیبت، موافقت کو جنم دیتے ہیں اور کہیں موافقت در موافقت، مصیبت کو۔ میرے بڑے ماموں کشن سنگھ، میانی کے مورچے میں مارے گئے۔ ان کی بیوہ نے رنڈسالا پہنا ہی تھا کہ اُسے ضرورتوں نے گھیر لیا۔ اُس نے ضرورتاً اس کے آگے ہاتھ پھیلائے، کبھی اُس کے آگے اور جب اُسے ہر ضرورت مدام نظر آئی، وہ کسی مستقل وسیلے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میرا چھوٹا ماما رام سنگھ، لنگڑا، مجرّد اور منگلی تھا۔ منگلی کے بارے میں شاستر لکھتے ہیں کہ اُس کی لگن کنڈلی منگلی سے ملتی ہے یا بیوہ سے۔ رام سنگھ کے لیئے اِس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ اُس نے اپنی بھابی کے آگے چادر ڈالنے کی تجویز رکھی جو اُس نے مان لی۔ نانی کو بُرا لگا اور اُس نے اُن دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ اُس کا یہ فیصلہ اور کئی دُکھوں کا پیش خیمہ ثابت ہُوا۔ میرے نانا کا چھوٹا بھائی نارائن سنگھ بیساکھی کے میلے کی بھگدڑ میں کچلا گیا۔ اُس کے بیٹے بوٹا سنگھ کو مالی خولیا ہو گیا۔ موسی پیار کور کا خاوند کسی متعدی مرض سے مر گیا اور موسی گیان کور کا گھر سے بھاگ گیا۔ موسی شور کور، تپِ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ میرے موسیرے بھائی سر لوچن سنگھ کے سیدھے بازو پر زخم آیا جو زہر باد بن گیا۔ اُسے بچانے کے لئے

اُس کا بازو کاٹنا پڑا۔ غم کی مُسلسل چوٹوں سے نانی ٹوٹ گئی، اُس نے چارپائی ایسی پکڑی کہ مَر کر چھوڑی۔

میرے بھائی اجیت سنگھ کی دُوسری شادی کی بات چل رہی تھی۔ درشن سنگھ ایف۔ ایس سی میں فیل ہوگیا اور بھائیا جی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ بھائیا جی کی بھابی نکّی اپنی بے عزّتی کے باوجود اپنے حِصّے کی جائیداد سے دست بردار ہوگئی تھی۔ اَمر کور کو نربدال (پائل) لڑکی پیدا ہوئی جس کی تکلیف سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اُس کے مرتے ہی تِرلوچن سنگھ کے لئے دُوسرا رِشتہ آیا تھا جسے تایا جی نے قبول کرلیا۔

گاؤں کے شمال مشرق میں ہمارا بیہڑ بنجر تھا۔ وہاں برو، کانس، لونڈرا اور گوکھرو اُگتا تھا۔ بھائیا جی نے اُسے توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ چھ مہینے تک لگاتار ہم اُس میں ہل چلاتے، پنجے سے جڑیں رولتے اور مسواۃ سے ہموار کرتے رہے۔ برو اور کانس کی جڑیں لمبی ہوتی ہیں اور گہری بھی۔ اِن دونوں کو جڑ سے مارنا، پہاڑ کھودنے کے برابر ہے۔ ہم نے دِن کو دِن اور رات کو رات نہ جانا، سمجھو کہ پہاڑ کھودا۔ کُنواری دھرتی اور اُس پر کھاد کا زور! گندم اور چنا اِس زور کا ہُوا کہ سِٹّے اور ڈوڈے نرخ گئے۔ چُوں کہ اُس ویرانے میں کھیتی باڑی کم ہوتی تھی اس لئے بھائیا جی کی نیّت وہاں باغ لگانے کی تھی۔ وہ کام، دھرتی توڑنے کے منصوبے ہی کی طرح مُشکل تھا۔ کھیت کو یکساں حِصّوں میں تقسیم کیا، ہر نشان پر گز بھر گول اور گہرا گڑھا کھودا، گڑھے کی مٹّی میں کھاد ملا کر گڑھا بھرا اور کئی کئی بار سینچا۔ پہلی برسات پر پیوندی آموں کے بُوٹے ہوشیار پُور نرسری سے لائے۔ گھر میں اچھی نسل کے آموں کی پنیری تھی، کچھ پودے اُس میں سے چُنے۔ اُن کی چاکلیاں (چاکلی، جڑوں کی مٹّی کے ساتھ اکھاڑا ہُوا پودا) جس احتیاط سے نکالیں، پرال میں باندھیں گڈّے پر لادیں، کھیت میں پہنچائیں، پرال کھول کر اُٹھائیں اور گڑھوں میں لگائیں، وہ تفصیل نُطفے سے آنول نال تک کی ہے۔ چاکلی کے اطراف مٹّی بھر کر اِس طرح کُوٹی اور ترکی کہ چاکلی کی گل، گل در گل مل گئی۔ ہر پودے کی دیکھ بھال ایسے کی جیسے زچّہ، بچّے کی کرتی ہے۔ کھیت کی باڑبندی ضروری تھی۔ جس کے لئے آک کے دبّے لگائے تھے۔ وہ جڑ پکڑتے ہی اِس سرکشی سے پھیلے کہ اُنہیں قابو میں رکھنے کے لئے ایک طریقہ ایجاد کیا گیا جسے ہر کسی نے سراہا۔ اُنہیں آپس میں بُن دیا جاتا۔ وہ بیچ در بیچ اُلجھتے ہُوئے بڑھتے اور اپنے آپ کو ترتیب دینے کے ساتھ باڑ کے رخنوں کے ڈاٹ بھی بنتے جاتے۔ ورزیں، پتّوں نے ڈھانپ لیں اور باڑ ایسے ہوگئی جیسے ہری دِیوار۔ کھیت میں ہل چلانا ہوتا تو پودوں کو بیلوں سے بچانے کے لئے اُن کے مُنہ پر مُسکا چڑھانا پڑتا۔ نودھے سیراب کرنے کے لئے، ہم فرلانگ بھر کے فاصلے سے پانی لاتے۔ بہنگی کے بوجھ سے کاندھے سُلگتے اور تکان سے اعضا یُوں شل جاتے کہ نمک چھڑکے زخم لگتے۔ اُس سخت محنت سے گھبرا کر مَیں کوئی بہانہ گھڑتا، دامن بچاتا لیکن باقی سبھوں کا خلوص، میرے منفی ردّیے پر بُرا بھلا کہتا اور مَیں اپنی ذہنی کیفیت بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔

سردی کی رُت آئی، پودوں کو پالے سے بچانے کے لئے آڑکی، جس کی اُونچائی ناپ کر پودوں سے

فٹ بھر اونچی رکھی۔ پت جھڑ گئی، بسنت رت آئی اور آڑ کھولی۔ پودوں کی کیفیتِ رونمائی، ممتا کی کہانی تھی۔ لال نرم کونپلیں، کالے ہرے پتوں کی آغوش میں نئے جنے بچوں کی سی تھیں۔ میں انہیں چھوتے ہوئے ڈرتا جیسے ہاتھ کی گرمی سے ان کے جل جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے وسوسے میرے لگاؤ کی اپج تھے! کونپلیں ہزار نازک سہی، اس قابل تھیں کہ موسم کی گرمی اور سختی سہار سکیں۔ ہم نے پودوں کے گرد تھانولے بنائے اور آب جو سے پانی ڈھو کر بھرے۔ ہماری سرگرمی ہی اور تھی۔ ہمارے آخری پھیرے میں پہلے پھیرے کی سی پھرتی تھی۔ ہر کوئی ایسے ترو تازہ تھا جیسے توانائی کو ماندگی سے تحریک ملی ہو۔ بھائیا جی کی حالت نرالی تھی۔ میں نے پہلی بار انہیں چہکتے، دمکتے اور چہکتے دیکھا تھا۔ وہ پودوں کو پکڑتے اور جذبات سے چھلک کر کہتے "کل سے موٹے لگتے ہیں!" وہ کھیت کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر سارے پودوں کو نظروں کی لپیٹ میں لے کر کہتے، "یہ اسی طرح بڑھتے رہے تو چند سال میں پھل لے آئیں گے!" یہ احساس ان کے چہرے پر تسکین اور اطمینان کی لہر دوڑا جاتا۔ وہ ایسے منہ سنوارتے کہ آموں کا مزہ لیتے لگتے۔ آم کے پیڑ کی لمبی زندگی کہاوت ہے، دادا لگائے اور پوتا کھائے۔ بھائیا جی اس کہاوت کی ترمیم کرتے، "ان کا پھل، میری ساتویں پشت بھی کھائے گی!"

"بیٹا پالنے سے آم کا بوٹا لگانا زیادہ دشوار ہے۔" وہ جس سے ملتے باغ کی باتیں کرتے اور اس طرح کی فراست جھاڑتے پھرتے۔

آڑ کے لئے ہم گھر کے درختوں کی شاخیں کاٹتے تھے۔ تقسیم وطن کے سال ایسا نہ ہوا، بھائیا جی کا ارادہ کچھ اور تھا۔ ایک اندھیری رات بھائیا جی نے اجیت سنگھ کو تبر دیا، درشن سنگھ کو آرا، مجھے رسوں کا گٹھا اور خود کلہاڑا لیا۔ ہر کوئی وقفے وقفے سے گھر سے نکلا اور الگ الگ راستے سے باغ میں پہنچا۔ وہاں سے ہم اکٹھے فیروز خاں کی جھڑی (شیشم کے کم عمر کے درختوں کا جنگل) میں پہنچے۔ بھائیا جی درخت پر کمند پھینکتے، پھانس کا جائزہ لیتے، درشن کو رسی پکڑاتے اور اجیت کے ساتھ مل کر درخت کے پیروں پر آرا چلاتے۔ درشن سنگھ اور میں کمند کو کھینچتے۔ آرے کے چند رگڑے اور کمند کے چند جھٹکے درخت کو زمین پر لے آتے۔ کوئی اسے کاٹتا اور کوئی اکٹھا کرتا۔ اندھیرا گہرا تھا لیکن ہماری حرکات پر اثر انداز نہ تھا۔ ہم اپنے کام میں ایسے مصروف تھے جیسے ہماری آنکھوں میں الوؤں کی پتلیاں جڑ دی گئی ہوں۔

مجھے کھنکار کر تھوکنے کی لت تھی اور لت، چھل کی طرح تکرار چاہتی ہے۔ میں کچھ سانسوں میں کھانس کھنکار کر تھوک نہ لیتا تو مجھے لگتا کہ میرا دم، گلے میں اٹک گیا ہے۔ جب تک کاٹنا چھانٹنا جاری رہا، میرے کھنکوروں کا بےہودہ پن اس کے شور میں ڈوبتا رہا۔ جوں ہی وہ کام بند ہوا، بھائیا جی نے میرا کھنکارنا سنا اور بھڑک کر کہا، "تیرے گلے میں میرا . . . . اٹک گیا ہے؟"

مَیں پہلے ہی بھائیا جی کے رویّے سے دِل برداشتہ تھا۔ مَیں اُن کے بُرے عمل میں اِس لئے شریک تھا کہ مجھ میں بغاوت کا مادّہ نہ تھا۔ جہاں تک اُن کے طرزِ تخاطب کا سوال ہے، وُہ اُس کُتّے کی طرح تھے جس کا بھونکنا، کاٹنے سے زیادہ تکلیف دِہ ہو۔

مَیں کھتی (شاخوں کا گٹھا) اُٹھائے باغ کی جانب چل رہا تھا۔ بھائیا جی میرے آگے جارہے تھے اور گولا اُٹھائے ہُوئے تھے۔ میرا دم، میرے گلے میں رُکا اور مَیں اُسے صاف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بھائیا جی گولا پھینک کر پیچھے مُڑے اور مجھ پر لپکے۔ اُنہوں نے مجھے اڑنگا دیا، مَیں اوندھے مُنہ گر کر کھتی کے نیچے دب گیا۔ اُنہوں نے کھتی گھسیٹ کر میرے اُوپر سے ہٹائی اور مجھ پر چڑھ کر میرا گلا دبانے لگے۔ میری رگوں میں تناؤ بڑھتے ہی دیدے پھیل گئے اور وُہ، چھاتی پر پہاڑ سا دکھائی دینے لگے۔ میرا دم ٹُوٹنے ہی والا تھا کہ اُنہوں نے میرا گلا چھوڑا اور میری بکھی میں گھونسا مارا۔ میرا رُکا ہوا دم، بگولے کی طرح نکلا اور اپنی تندی میں میرا کلیجہ لے اُڑا۔ میرا بدن جھُوٹا پڑ گیا اور مَیں ہونکتے ہونکتے بے سُدھ ہو گیا۔ مَیں کتنی دیر کانپتا رہا، پھر سنبھلا۔ کھتی کھینچ کر اُتارنے سے میرے ماس پر خراشیں پڑگیں۔ ہر خراش شُعلے کی طرح سُلگتی تھی اور اندھیرے میں دکھائی دیتی تھی۔ وُہ گھڑی انوکھے ضبط کی گھڑی تھی۔ مَیں مُصیبت زدہ اور بے آبرو تھا لیکن رو نہیں رہا تھا۔ میرے آنسو میری رگوں میں تیر رہے تھے لیکن آنکھوں تک نہیں آرہے تھے۔ میری حالت اُس لبریز ساغر کی سی تھی جسے چھلکنے کے لیے بس ایک مزید قطرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں کھتی اُٹھا کر بوجھل دِل، بوجھل سانس، بوجھل نظر اور بوجھل قدم چل پڑا۔ اپنے ملعون بوجھ کے ساتھ اِتنے سارے اور بوجھ اُٹھائے مَیں ساری رات کمندیں کھینچتا رہا درخت کاٹتا رہا اور چِرا اتارا رہا۔ اُس دوران کھانسنا اور کھنکارنا بڑی بات ہے، مَیں نے ٹھیک سے سانس نہ لیا۔ میرا سینہ سُلگتے ہُوئے جذبات سے یُوں بھرا ہُوا تھا کہ وہاں سانس کی اہمیت دھُوئیں کی سی تھی۔ میرے مظلوم دِل نے مجھے بار بار اُکسایا، "تُو اپنے ظالم اور چور باپ کا قتل کر دے" لیکن مجھے حوصلہ نہ ہُوا۔

مُرغانِ سحر کے شور کے ساتھ ہم نے چُرائے ہُوئے درختوں کی ٹھُنڈیوں پر مٹی ڈالی، جھڑی سے باغ تک کے راستے میں گری پڑی ٹہنی اُٹھائی اور تاحدِ امکان وُہ ہر نشانی مٹائی جو ہماری کالی کرتُوت کا سُراغ دے سکتی تھی۔ ہم نے اوزار باغ کی باڑ میں چھپائے اور اُسی طرح گھر واپس آئے جیسے باہر گئے تھے۔

ہر کوئی مسرور و مغرور تھا لیکن مَیں شرمسار اور آزردہ تھا۔ مَیں چوری کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ میرے ستم گروں سے بڑھ کر میری بزدلی، میری بےبسی تھی جو مجھے میری نظر میں ذلیل رکھتی تھی۔ میرے آنسو، میرے ضبطِ غم سے رگوں میں بھاپ بن کر تیرتے تھے۔ میری چال میں بے کسی اور بے چارگی، داخلی و خارجی تحریک سے بے نیاز دھڑکنوں کی سی تھی۔ کیسا ٹھہراؤ تھا! مجھے اپنی سانس کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ میری خاموشی میرے ہونٹوں کو مجروح کرتی تھی۔ سحر اُداس تھی جیسے میرے اِنسانیت سوز فعل پر غم زدہ ہو۔ سناٹا کیسا بھیانک تھا! درختوں پر پتّے یُوں

لٹکتے تھے، جیسے میرے انجام سے ڈر کر زبان سی لئے ہوں۔ ہوا نالُود تھی جیسے میرے شرمناک راز کو سمیٹتی ہوئی اَندھیرے کے ساتھ دُور نکل گئی ہو۔ میں آبِ جُو کے کنارے پہنچا۔ شبنم ہی شبنم دیکھ کر مجھے محسُوس ہُوا کہ مادرِ فطرت میرے ننگِ وُجُود پر اشک بار ہے۔ اِس نازک احساس نے میرے صَبر کو چھُولیا۔ رگوں میں تیرتی ہُوئی بھاپ، ڈھیلوں سے ٹکرائی اَور پانی بن کر برس پڑی۔ سینے میں دباؤ گھٹنے سے کلیجہ پچکا اَور میں درد سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ مَیں سنبھلتے سنبھلتے سنبھلا اَور قفس زاد کی طرح گھر کی جانب چل پڑا۔ میری زندگی میرے گھر کی طرح تضاد کا مجموعہ تھی۔ اُس کی نفرت انگیز خصوصیت یہ تھی کہ وہاں اِخلاص و اَخلاق کا دَرس دیا جاتا لیکن جب اُن کے عملی مُظاہرے کا وقت آتا تو لگتا کہ اُن اکشروں کا ارتھ، گیان کوش سے الگ ہے۔

قارئین! مَیں نہایت غضب ناک بیان دے رہا ہُوں! بھلے تم اِسے میری بدطینتی سے مَوسُوم کرو یا میری بدخُوئی سے! میری زندگی میں جتنے لوگ آئے، وُہ میرے گھر کے لوگوں ہی کی طرح کم اَصل تھے اَور اَندر سے کھوکھلے۔ ظاہری رکھ رکھاو اُن کا چلن تھا۔ وُہ اُوپر سے کھرا کُندن نظر آتے تھے لیکن ذرا کُرید نے پر اُن کا کھوٹا پن، مُنہ چڑانے لگتا تھا۔ شریفانہ طرح داری اَور سلیقہ مندانہ سنجیدگی، اُن کی مصنُوعی زندگی کے زیور تھے جو اُنہیں وِرثے میں ملے تھے۔ حالاں کہ وُہ دُوسروں کی اُس اِملاک پر طنز کرتے تھے لیکن اپنی پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔

اُس ویرانے میں ہمارا ہی کھیت ہرا بھرا تھا۔ جو پڑوسی ہمارے منصُوبے کو کم نظری سے دیکھتے تھے، وُہ اِیرکھا سے جل مرے۔ ہر کسی کی اپنی وجہ تھی! نام دیو کی یہ تھی کہ ہمارے درختوں کی چھاؤں اُس کے کھیت کی زرخیزی کو مار لے گی۔

پَودوں کی آڑ کے لئے شاخوں کی بہتات تھی۔ اُس کام میں گھاس پھُوس بھی لگتا تھا جو کبھار میں جتنا چاہو مِلتا تھا۔ پَودوں کو آڑ بڑی اَور گھنی کی گئی۔ خزاں گئی، بہار آئی اَور ہوا تازہ پھُولوں، نئے پتّوں کی خُوشبُو سے مہکنے لگی۔ ہم آڑ ہٹانے کے لئے باغ میں پہنچے۔ جس آڑ کو ہٹایا اُس میں سُوکھا ہُوا پَودا پایا۔ پُوری تباہی کا راز جاننے کے لئے ہم نے پَودے کھینچ کر دیکھے، وُہ ہاتھوں میں آ گئے جیسے گاڑے ہُوئے ڈنڈے تھے۔ کسی حاسد نے پَودوں کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔

ہر کسی کا اپنا غم تھا لیکن بھائیاجی کی ڈانٹ پھٹکار سے اُس میں طرح طرح سے اِضافہ ہونے لگا۔ وُہ اُس حادثے کو ہماری بے توجہی سے منسُوب کرتے حالاں کہ وُہ کہا کرتے تھے کہ چوروں اَور بدمعاشوں کے کئی ہاتھ ہوتے ہیں کوئی کس کس کا خیال رکھے۔

پہلے وُہ کھیت کسی امیر کے دیوان خانے کی طرح تھا جہاں کوئی نہ کوئی آتا جاتا رہتا تھا۔ اَب کوئی اُدھر نہ جاتا جیسے اُس کے اَنجام کا سامنا کرتا ہُوا ڈرتا ہو۔ اُس کی حالت اُس وبا گرفتہ آبادی کی سی تھی جس کے سارے باشندے ڈر کر دُوسری جگہ جا بسے ہوں اَور اُسے ملعُون سمجھ کر پھر اُدھر کا رُخ نہ کرتے ہوں۔

باب ۲۴

اُسی نے گھول دیا زہر سا خیالوں میں
اُسی کا ذکر مجھے زندگی سے پیارا ہے (شاطر)

میرا دماغ میرے دل سے سوال پوچھ رہا ہے، "تو اپنے باپ کی برائی ہی برائی کرتا جا رہا ہے جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آدمی نما درندے تھے۔ وہ واقعی مکمل درندگی، مکمل بے حسی، مکمل بے رحمی اور مکمل سرکشی کا مرکب تھے تو اُن کے بے اعتبار سائے میں تیری زندگی کو دھوپ کیسے ملی!؟" اور دل یاد کرنے پر مجبور ہے۔ اُن تمام گھناؤنے، تمام سلگتے، تمام کمینے رشتوں میں اپنے پن کا احساس ہے لیکن میرے مجروح جذبات کی شدت درد میں محسوس نہیں ہوتا۔

مجھے ٹال پر اکیلا چھوڑ کر وہ سردار سنگھ کی شادی میں چلے گئے، واپس آئے اور برفی کی دو رنگین ٹکڑیاں لائے۔ ہریانہ میں رنگین برفی دسہرے پر ملتی تھی، میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا، "آپ یہ برفی کہاں سے لائے ہیں۔؟"

"میں برات میں برفی کھا رہا تھا کہ تو، میری آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں تیرا اترا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکا اور آنکھ بچا کر اِن دو ٹکڑیوں کو تیرے لئے چرا لیا۔ میں تجھ سے دور تھا لیکن میرا دھیان تجھ میں تھا۔" انہوں نے اپنے جذبے کی حقیقت جوں کی توں بیان کی اور پھر اپنی قمیض کی اندر کی جیب سے ایک پڑیا نکال کر مجھے دی، جس میں بازار سے خریدی ہوئی سفید برفی تھی۔ اتنی ساری برفی دیکھ کر میں خوش ہوا اور شادی کی تقریب میں شریک نہ ہونے کا غم بھول گیا۔ میں مزے سے برفی کھا رہا تھا کہ انہوں نے مایوس کن لہجے میں کہا، "ماں باپ درجن بھر بچے پال سکتے ہیں لیکن درجن بھر بچے اکیلے ماں باپ کو نہیں پال سکتے!"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا اور برفی کھاتا کھاتا رُک گیا۔

"جب تو بڑا ہو گا تو اپنے آپ سے پوچھنا!" انہوں نے میرا سوال مجھی پر لاد دیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگے۔

میں پھر برفی کھانے لگا اور اُن کی بات پر غور کرنے لگا۔ اچانک میرے دل نے اُچک کر مجھ سے کہا، "اِس سے پوچھ! تو نے اپنے ماں باپ کو کیسے پالا پوسا تھا؟" لیکن میرا ہیانہ کھلا۔

قارئین! زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر میں اس وقت وہی سوال کچھ تصرف کے ساتھ خود سے پوچھتا ہوں، "بچے، بڑے ہو کر اپنے ماں باپ کو بوجھ کیوں سمجھتے ہیں؟"

اور میرا ردِ عمل یہ ہے کہ سمبندھ کوئی بھی ہو، وہی پنپتا ہے جو احساس و ادراک پر قائم ہو۔ جس

میل جول سے یہ عنصر غائب ہو وہاں اعتدال و استدلال کی فضا نابود ہوتی ہے اور جہاں ایسی صورت حال ہو وہاں جبر و تشدد کا دور دورہ ہوتا ہے اور فضائے جبر و تشدد باغیوں کی موروثِ اعلیٰ ہے۔

مہاوٹ برسی اور اُس کے ساتھ اولے بھی پڑے۔ زمین، برف کی سِل بن گئی اور ہوا ٹھنڈی تلوار۔ ہم ناک کے آگے سے کھیس ہٹا کر سانس لیتا تو لگتا کہ نتھنوں پر برف کی ڈلی رکھی ہے۔ ہنسراج نے کلاس روم کے دریچے اور دروازے بند کروا دیے اور پاؤں کرسی پر رکھ کر سکڑ کر بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں پڑھنا اور پڑھانا کیسا وہ عمر عیار کا قصہ سنانے لگے۔ عین اُس وقت جب عمر عیار اپنے دوست امیر حمزہ کو شہرِ طلسم سے آزاد کروانے کے لئے اپنی زنبیل میں سے جادو کا توڑ نکال رہا تھا، دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنسراج نے امیر حمزہ کو اُس کے حال پر چھوڑا، حیرانی سے دروازے کی جانب دیکھا اور کوستے ہوئے بولے، "کون ہے؟ اِس پالے میں بھی آرام نہیں!" دروازہ اُن کے پاس ہی تھا، وہ چاہتے تو ہاتھ بڑھا کر کھول سکتے تھے لیکن وہ صرف گردن گھمانے کی حد تک ہلے اور حمید کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور اِس انداز سے دروازہ کھولا جیسے اُسے سزا ملی ہو۔ سر سے پیروں تک ڈھکے ہوئے ہیولا نما آدمی کو دیکھ کر ہنسراج نے غصے سے پوچھا "کون ہے؟ کیا چاہیے؟"

درشن سنگھ نے منہ کے آگے سے دوسوتی ہٹا کر ڈھیلی سی آواز میں کہا۔ "میں درشن سنگھ ہوں جی! گیان کا بڑا بھائی۔"

میں اپنی قطار میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بولتے ہوئے سنا اور اِس سے پہلے کہ ہنسراج کچھ کہتے، میں اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ دروازے سے ذرا پرے ہٹ کر اُس نے دوسوتی کی بکل سے کپڑے میں لپٹا ہوا لوٹا نکالا اور مجھے تھما کر کہا، "دودھ ہے، بھائیا جی نے بھیجا ہے۔"

اُس کنکنے دودھ کی کنکنی گرمی آنتوں سے دوڑتی ہوئی، رگوں میں پہنچی اور ناخنوں میں جا کر رُکی۔ اُس نازک گھڑی، میں نے اپنے بھائیا جی پر فخر کیا اور اندر ہی اندر محسوس کیا، "میں اُن کا نہایت چہیتا بیٹا ہوں۔"

رام لیلا کے چوک میں کوئلے کی بھٹیاں لگائی ہوئی تھیں۔ وہ جل گئی تھیں، اُن کے موکھے دبا دیے گئے تھے اور انہیں سمیٹنے کے لئے بھائیا جی ہماری دسہرے کی چھٹیوں کے انتظار میں تھے۔ جس دن چھٹیاں ہوئیں کچھ بھٹیاں اُسی دن بجھائیں اور کچھ دوسرے دن سویرے، اُس کے بعد پہلے دن کی بجھائی ہوئی بھٹیوں کا کوئلہ نکالنا شروع کیا۔ جلی مٹی کی بو باس، گرم گیلے کوئلوں کی بھڑاس، اُڑتی چنگاریوں کا سنتاپ، ہڈیوں پر ماس کی حالت سیخ پر چڑھے کباب کی سی تھی۔ پسینہ ایسے گرتا جیسے کباب کے آنسو۔ شام تک بدن، کالا کوئلہ ہو جاتا۔ دیدے اور دانت ایسے چمکتے جیسے اندھیرے میں سرمکھیا دیپک جل رہا ہو۔ ہم کام بند کر کے ٹال کی طرف جاتے، راہ گیر، ہمارے ٹولے کو

مڑ مڑ کر دیکھتے اور سوہنے ملن جیسے یار بارش پھبتیاں کستے،

"بھوتوں کا ڈیرا کدھر چڑھائی کر رہا ہے؟"

"مکوڑوں کو پنکھوں کے بجائے پیر لگ گئے ہیں!"

"کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا! سنا تھا، دیکھا نہیں تھا۔"

اُن کی برجستہ تمثیلوں سے لطف اٹھاتے ہوئے اور کسی کا منہ چڑاتے ہوئے ہم رہٹ پر پہنچتے، لائف بوائے سے مل مل کر نہاتے، ایک دوسرے سے بدن کی جانچ کرواتے اور کہیں نہ کہیں کالک موجود پاتے۔ کانوں کے پیچھے کالک، کانوں کے آگے کالک، ناک کے باہر کالک، ناک کے اندر کالک، کوروں پر کالک، ناخنوں میں کالک اور کھائیوں میں کالک۔ چھیدوں کی کالک بالکل ہٹیلی تھی، وہ اندر دور تک گھس جاتی تھی اور کسی طرح نہیں نکلتی تھی۔ میں کالک کھاتا، کالک تھوکتا، کالک سنکتا اور کالک ہگتا۔ کام کی یہ سختی خلافِ معمول نہ تھی۔ بھیاجی اور کٹائی کے موقع پر ایسی سخت مشقت، زندگی کی کڑوی حقیقت تھی۔ مجھے جس بات کا ذکر مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اس کام کو سمیٹ کر بھائیا جی نے بکرا جھٹکایا اور ٹھرا منگوایا۔ ماس پک کر تیار ہوا۔ انہوں نے اپنے لئے نرے ٹھرے کا گلاس بھرا اور گلاس کا ایک چوتھائی میرے لئے۔ تایا جی شراب نہیں پیتے تھے، کہتے تھے کہ انسانی جسم لذتِ سرور کا تخلیقی سرچشمہ ہے، اِس میں بیرونی لذات ملاتے رہو تو اس کی اپنی لطافت مر جاتی ہے۔ بھائیا جی نے ٹھرے کا گھونٹ پی کر چٹخارا بھرا گویا اس کی لذت کی نفاست کو پرکھا۔ میں نے ٹھرا چکھا، مجھے کڑوا لگا اور میں نے منہ بنا کر گلاس رکھ دیا۔

"تو مرد ہے؟ امرت چکھ کر منہ بنا رہا ہے۔" بھائیا جی نے جھڑکا۔

"اِس میں تھوڑا پانی ملا دیجئے، کڑوا ہے!" میں نے بدمزگی کا اظہار کیا۔

"اِس کی تلخی میں چاشنی ہوتی ہے، آنولے کی طرح۔ اب کیسا لگ رہا ہے؟" انہوں نے میری بے دلی کو ترغیبِ شوق دے کر سوال کیا۔

جب تک ٹھرے کی تلخی مزے کی سنسناہٹ میں بدل چکی تھی۔ میں نے ان کے مشاہدے کی تائید کرتے ہوئے کہا، "اچھا لگ رہا ہے!"

"تو پھر چل نکل، خوشیاں!" انہوں نے گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔

میں نے اپنا گلاس اُن کے گلاس سے ٹکرایا، منہ سے لگایا اور غٹا غٹ چڑھا لیا۔ میری رگوں میں شعلہ لپک گیا اور میرا روم روم چمک گیا۔ انہوں نے شاباش کہا اور نلی کا گودا نکال کر مجھے کھلایا۔

انسانی رشتے کتنے سہل ہیں! کتنے مشکل ہیں! کتنے دردمندانہ ہیں! کتنے ظالمانہ ہیں! کتنے محبت آمیز

ہیں! کتنے نفرت انگیز ہیں! کتنے اونچے ہیں! کتنے نیچے ہیں! کتنے پورے ہیں! کتنے ادھورے ہیں!! مکمل بھول بھلیاں ہیں۔

ہم کھات کے لئے گڑھا کھود رہے تھے کہ وہاں بھائیا جی آ گئے۔ انہوں نے سب کو ملامتوں پر دھر لیا کیوں کہ کام کا حاصل ان کی امید سے کم تھا۔ ہم صبح سے جان مار رہے تھے، ہمیں بے جا ملامت پر بہت رنج ہوا اور ہم نے کام کرنا بند کر دیا۔ اپنے اس رویّے کے بارے میں، میں ایک بات تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں۔ ہم سب بھائی کسی منصوبے کے لئے شاذ ہی متحد ہوتے تھے لیکن آنٹ سانٹ کے لئے ایک دوسرے کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔

بھائیا جی بھڑک اٹھے۔ وہ گالیاں بکنے لگے اور جاتے جاتے تاکید کر گئے "شام تک گڑھا پورا نہ ہوا تو گھر میں نہ آنا، جدھر جی چاہے، چلے جانا۔"

تایا جی پاس ہی کام کر رہے تھے، وہ آ کر ہمارے بیچ بیٹھ گئے۔ ہمارے پاس ہی ایک جڑ پڑی تھی جو گڑھے میں سے کاٹی تھی اور اس برگد کی تھی جس کا وجود کھوئی ہوئی صدیوں کا ایک سراغ ہے۔ تایا جی نے جڑ کو دیکھا اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس جڑ کو دیکھو، غذا کی تلاش میں کہاں سے کہاں پہنچی ہے! سوچو! یہ برگد سے کیا لیتی ہے؟ لیکن اس کے لئے رات دن کام کرتی ہے اور نام و نمو سے دور گمنامی میں زندگی گزارتی ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو اسے دن رات مصروفِ کار رکھتا ہے؟" وہ جڑ کو غور سے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی خاموش بیانی کو سن رہے ہوں۔ ہم نے انہیں سوالیہ انداز سے دیکھا، وہ بولے، "یہ جانتی ہے کہ میں برگد کا اٹوٹ حصّہ ہوں اور مجھے اس کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ کنبے میں ہر فرد کی حسبِ توفیق ذمّہ داری ہے! وہ اپنے فرض سے کوتاہی برتے گا تو کنبے کی ہم آہنگی میں خلل پڑے گا اور یوں وہ افراتفری کا مرتکب ہوگا۔ اٹھو اور اپنا فرض پورا کرو!" انہوں نے ہر کسی کی پیٹھ تھپکی اور جا کر اپنا کام کرنے لگے اور اسی طرح ہم بھی۔

ایک بار بھائیا جی ہلکے پھلکے مزاج میں بیٹھے تھے، میں نے کہا، "آپ گالیاں نہ دیا کریں تو آپ کی صحت پر اثر پڑے گا کیا؟"

"میری صحت پر نہیں، تیری صحت پر ضرور اثر پڑے گا! کیوں کہ ماں باپ کی گالیاں، سہالیاں ہوتی ہیں۔" انہوں نے ترنت گالی دے کہا۔

میں کبھی تایا جی سے بھائیا جی کی زبان درازی کی شکایت کرتا۔ وہ انہیں کچھ نہ کہتے، مجھے ہی سمجھاتے، "بچّے نازک دل اور نازک دماغ ہوتے ہیں۔ یہ بات کو جلد اور بلا عذر مان لیتے ہیں جیسے نرم شاخ کو جدھر جھکاؤ، جھک جاتی ہے۔ اس کے برعکس بڑے بے لچک ہوتے ہیں، انہیں کچھ کہنا، نہ کہنے کے برابر ہوتا ہے۔" وہ میری پیٹھ

تھپک کر کہتے، "چنگا ناؤں رکھایا، کر کرت بھی چنگی! اے اِنسان تُو نے اپنا نام حُسن کا اعلیٰ رکھا ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ تیرا عمل تیرے نام کے ہم سر ہو۔"

باب ۲۵

کوئی یقین کرے اِس پہ یا ہنسے شاطرؔ
وُہ زندگی ہے مری جس نے مُجھ کو مارا ہے (شاطرؔ)

مَیں کیسی کیسی ذِلّتیں اَور مُصیبتیں جھیل کر سنِ بُلوغ کو پہنچا ہُوں یہ افسانہ ایک دردِ مُسلسل ہے۔ جب تک میرا دِل رو رو کر ابرِ مُردہ نہ ہو جائے یہ داستانِ گریہ جاری رہے گی۔ خُوشی کے چند جھونکوں کے سوا میری زندگی تپتے ریگستان کی طرح ہے۔ مَیں سوچتا ہُوں کہ کتنی جانوں پر مجھ سے بھی کٹھن گزری ہو گی! یہ محض اعجازِ وقت ہے کہ مجھے زورِ قلم اَور میری طبعِ حقیقت پسند کو اپنے آپ کو رُسوا کرنے کا حوصلہ مِل گیا۔ ورنہ ہائے وُہ لوگ جو اپنے اَن کہے غموں اَور اَن کھولے دِلوں کو سینوں میں چھپائے ماٹی میں سو رہے ہیں۔ او دھرتی ماں! تجھ میں کیسے کیسے غم گرفتہ اَور مُصیبت زدہ لوگ بستے ہیں لیکن تُو خاموش ہے۔ اگر اِنسان کا ظرف، تجھ جیسا ہوتا تو دُنیا کا نقشہ ہی دُوسرا ہوتا۔ انبوہِ دَرد و غم اَور بدنامی کے ڈر سے میری حالت عجیب ہے۔ ایک طرف مَیں حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوتا ہُوں اَور دُوسری طرف دروغ گوئی۔ مَیں کہوں یا نہ کہوں کی زحمت سے نِڈھال رہتا ہُوں۔ میری جُرأت بیانی بحال ہوتی ہے تو مَیں اپنی عیب جُوئی کرنے لگتا ہُوں۔ یہ کتنا مُشکل کام ہے! اِس نایاب عذاب کی انوکھی زیادتی وُہی جانتا ہے جو اپنی بُرائی آپ کرتا ہے۔

میرے غم گُسار قارئین! آپ میرے ایک اَور غم، بھیانک غم میں شریک ہو رہے ہیں۔ میرا یہ خاص غم یُوں ہے جیسے پھُول پر تیلیا (ایک مکھی کا ہنگامیٹھا جس سے پھُول کی قوّتِ تولید غارت ہو جاتی ہے) مَیں نے اِس غم کو ردپیٹ کر اپنے گوشت و پوست کے ڈھیر میں دفن کر لیا تھا۔ اِس پر ریاکاری کا ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ اُس تک میری رُوح ہی کی رسائی تھی۔ آپ اِس سے اِس غم کی اَہمیت کا اَندازہ لگا سکتے ہیں! مَیں اِس کے تعلّق سے محتاط سا محتاط تھا! میری رُوح، زخمی شیرنی سی چنگھاڑتی ہُوئی، مجھے اِس غم کی تشہیر کرنے سے روک رہی ہے اَور مَیں ہُوں کہ اپنے اِرادے پر اٹل ہُوں۔ آپ سوچیے! آپ، مجھے کِس قدر عزیز ہیں! مَیں کس حد تک آپ کو اپنا سمجھتا ہُوں!

مَیں نوعمری ہی سے 'شاطر' کے نام سے موسوم ہوں، حالاں کہ نہ مجھے شطرنج کھیلنی آتی ہے اور نہ ہی مَیں فطرتاً عیّار ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہو، مَیں مزید وضاحت کرتا ہوں۔ مَیں پیدائشی شاعر بھی نہیں ہوں۔ اِس نام سے مجھے بدنام کیا تھا ایک لونڈے باز نے! وُہ پنجابی کا شاعر تھا اور بسمل تخلّص کرتا تھا۔ اُس کا اصلی نام کس قدر مذہبی ہے، ہری رام! اُس کا حلیہ نرالا تھا۔ وُہ سال میں بارہ مہینے اور مہینے میں تیس دن بھدرا کرواتا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کا دِل کسی پر آجائے تو وُہ اُسے داماد بنا کر بھی زیر کر سکتا ہے۔ اُس نے بھائیا جی سے تیس رُوپے اُدھار لیے لیکن واپس نہ کیے۔ رُوپے اُگاہنے کے لیے بھائیا جی، مجھے اُس کے پاس بھیجے۔ وُہ مجھے طرح طرح سے بھرماتا، مجھ سے اشعار سُنتا، میرے حافظے کو سراہتا، مجھے شعر کہنے پر اُکساتا اور میرے نام سے مجھے شعر لکھ کر دیتا۔ وُہ مجھ پر اشعار کہتا جن میں مجھے طرح طرح کے ناموں سے مخاطب کرتا۔ مَیں اُس کے بھترے پر نہ چڑھتا وُہ کہتا، "آپ اپنے لیے کچھ بھی لے جائیں سرکار، اُس کھوسٹ کے لیے دمڑی نہ دُوں گا۔"

اُس کا دوست گُرداس سنگھ اُسے لونڈے باز کہہ کر بُلاتا تھا۔ اپنے بھلے نام کے ساتھ اُسے یہ تحقیر آمیز اضافت بُری لگتی۔ وُہ اُس سے نہایت شائستہ انداز میں کہتا، "تم ہمارے ذوق کی توہین کرتے ہو! ہمیں شاہد پرست اور میرے پیارے کو شاہدِ مقصود کہا کرو۔ یہ شاہانہ ذوق ہے! سکندر اور محمود جیسے بادشاہ اِسے اپنی ذکاوت کی علامت سمجھتے تھے۔"

عام طور پر شاعر ہونا، تہمت خریدنا تھا۔ حالاں کہ لوگ، اُن کا کلام گاتے تھے۔ لیکن اُنھیں ناپسند کرتے تھے۔ چانن سنگھ صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ شاعر، اَمرد پرست ہوتے ہیں۔ وُہ اپنے بیان کی تصدیق میں اشعار سُناتے تھے، خاص کر، میر تقی میر کا یہ شعر،

میر کیا سادہ ہیں! بیمار ہُوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ہریانہ میں اتنے شاعر تھے کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا، کُتّے کے پتھر مارو تو شاعر کو لگتا ہے۔ شاعروں کے بارے میں گندی گندی افواہیں پھیلی رہتی تھیں۔ سوہنے ملّن کی باؤلی پر ہر شام شاعر اِکٹھے ہوتے تھے اور اپنے معاشقوں کے منظوم قِصّے سُناتے تھے۔ 'چنت پرنی' بیت بازوں کا تیرتھ تھا۔ وہاں ہر سال میلہ لگتا تھا اور فی البدیہہ بیتوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ وُہ باتیں اِتنی خیال خیز تھیں کہ بڑے بڑوں کو لے اُڑتی تھیں۔

ہمارے علاقے میں لونڈے بازی اپنی اِنتہا پر تھی۔ جیسے ریوڑ میں مست بوک، بکریوں کو دم نہیں مارنے دیتے اُسی طرح لونڈوں کے پیچھے لونڈے باز لگے رہتے تھے۔

بسمل کی حویلی کے در و دیوار پر بدنام فِقرے لکھے رہتے تھے۔ چُوں کہ مَیں اُس کے پاس جاتا تھا، اُس

گاؤں کے لڑکے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ایک دن اُس کے پاس گیا اور دیکھا کہ اُس کے دروازے پر دو خاکے بنے ہوئے ہیں، ایک پر گیان لکھا ہوا ہے اور دوسرے پر بیتل۔ اس طرز کے خاکے بیت الخلاؤں اور پیشاب گاہوں میں عام ہوتے ہیں۔ اُس تہمت سے گھبرا کر میں نے اُسے مٹانا چاہا لیکن وہ بدنامی میری تقدیر کی سیاہی تھی۔ سیاہی کی انوکھی صفت ہے کہ یہ سفیدی کی سی تیزی سے پھیلتی ہے لیکن اُس کے برعکس بھیانک ہوتی ہے۔ وہ سیاہی دیوار دیوار، راستہ راستہ، درخت درخت ہوتی ہوئی میرے سکول میں پہنچ گئی۔ میں بیتل کے گاؤں جانے سے پرہیز کرتا۔ مجھے زبردستی بھیجا جاتا، میں اِدھر اُدھر وقت گنوا کر گھر میں لوٹ آتا اور بھائیا جی کو گھڑا گھڑایا جواب سُنا دیتا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا! مجھ پر بیتل کے لونڈے کا نام داغ دیا گیا۔ اب تو شاطر کی قسمت ہی بدل گئی ہے! میں اسے غارِ گمنامی سے کھود کر بذاتِ خود اُجالا دکھا رہا ہوں۔

بیتل کی لڑکی پُشپا مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی، جس کی ساری خوبصورتی اُس کی آنکھوں میں تھی۔ اُن میں ایسا نمک تھا جو اُڑ کر رگوں میں پہنچتا تھا اور خون کا دباؤ بڑھاتا تھا۔ وہ پُشپا کے ساتھ شہر آتا اور جان بوجھ کر اُس وقت واپس جاتا جب میرے گھر جانے کا وقت ہوتا۔ وہ ہمارے ساتھ چلتا چلتا کسی نہ کسی بہانے پیچھے رہ جاتا اور ہم آگے نکل جاتے۔ زیادہ تر خاموش ہی رہتے اور گاؤں کے پاس پہنچ کر اُس کا انتظار کرتے۔ میں دل ہی دل میں پُشپا سے بہت سی باتیں کرتا لیکن زبان سے کچھ نہ کہتا۔ اُس سے اپنی پوشیدہ محبت کو میں نے یوں ہویدا کیا کہ اپنے دائیں ہاتھ کی پشت پر اوم کھدوا لیا۔

مجھ میں اور کئی تبدیلیاں آ رہی تھیں لیکن میرا شرمیلا پن زیادہ نہ بدلا تھا۔ پُشپا اچھی لڑکی تھی اور میری ہی طرح معصوم لگتی تھی۔ اُس کی اندرونی حالت وہی جانے! میری حالت اُس ابرِ بہار کی سی تھی جو اُڑتا اور منڈلاتا جاتا ہو لیکن برسنے کے فن سے بے بہرہ ہو۔

میرے بارے میں پھر افواہ اُڑی لیکن اِس بار اُس کی نوعیت دوسری تھی۔ میں بیتل سے جتنی نفرت کرتا تھا وہ قدرے کم ہو گئی۔ ہر کوئی ہر صورتِ حال سے اپنا مطلب نکالتا ہے، وہی اُس نے کیا۔ میں اِس وقت بھی سوچ نہیں سکتا ہوں کہ نفس پرستی جیسا لطیف جذبہ مکمل حیوانیت کے زیرِ اثر عمل پزیر ہو سکتا ہے؟

مجھے دکان پر دیر ہو گئی۔ سوءِ اتفاق! اندھیری رات تھی۔ شامِ ہریانہ ویران ہو چکی تھی اور تنہائی، کالا ماتمی لباس پہن کر بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ سناٹا سا سناٹا تھا! ستارے سہمے سہمے دکھائی دے رہے تھے۔ درخت گھات میں بیٹھے ہوئے شکاریوں کی طرح دم سادھے ہوئے تھے۔ گرد و پیش میں وحشت کی حکمرانی تھی، وہ شے جس کا رشتہ نظر سے ہے، اجنبی لگ رہی تھی۔ جانے پہچانے گوہر ڈراؤنے مفہوم رکھتے تھے اور دل میں نشتر سے چبھاتے تھے۔ اُلو کی ترّرو اُس نقیب کی سی تھی جو کسی آفت کی تشہیر کرتا ہو۔ میں وسوسوں ہی وسوسوں میں گھرا تھا۔

رجھینگر مجھے روکتے تھے۔ وہ میری آہٹ پاکر خاموش ہوجاتے جیسے میرے احساس کی تائید کرتے۔ مینہ ٹل کے ڈیرے کے اِدھر باغوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور کبڑے آم کے پاس ختم۔ میں ہول زدہ وہاں پہنچا۔ میرے سفر کے واحد ساتھی، ستارے باغوں کی پہنائی میں چھپ گئے جیسے میرے حال سے آنکھیں چرا گئے۔ مملوس راستہ اور مملوس ہوگیا۔ میں اندھیرے میں ایسے چلتا تھا جیسے گہرے پانی میں۔ میرے پاؤں ایک ساتھ مخالف اور حریف تھے میں نے کسی ساتھی کے انتظار میں رکنا چاہا لیکن میرے پاؤں آگے ہی بڑھتے گئے جیسے میری سلامتی سے زیادہ انہیں اپنی منزل کی فکر ہو۔ انجانے خطرے بھیانک شکلوں میں ڈھل کر میری آنکھوں کے سامنے اودھم مچانے لگے۔ مجھے سہما اور تنہا پاکر راستے کے ذرّے ہیولوں کی طرح پھیل گئے۔ میں سمٹ کر چلنے لگا جیسے اُس باغی اور وحشی ہجوم میں میرے کچلے جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہ کیسا اتفاق تھا! ہوا میں اکسیر کی تاثیر تھی۔ سانس، رگوں کو توانائی پہنچا رہی تھی جیسے وہ، انہیں ناگہانی حادثے کا سامنا کرنے کے لئے تیّار کر رہی ہو۔ یہ اُسی توانائی کی ہم نوائی کا اثر تھا کہ دیندار کے ڈیرے کے برابر میں نے گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ وہاں سے کچھ آگے قدِ آدم سے اونچی بن ٹوٹی تھی، اُس میں سے آدمی نما ہیولا نمودار ہوا۔ میں، اُسے پریت سمجھا اور خوف سے چپ ہوگیا۔ میں واہگرو کا جاپ کرنے لگا۔ ماں کہتی تھی کہ واہگرو کا پوتر نام سن کر گندی روحیں بھاگ جاتی ہیں۔ وہ ہیولا آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ میں واہگرو کے نام میں اُلجھنے لگا اور آخر چپ ہوگیا۔ میں نے چلانا چاہا لیکن چلاّ نہ سکا۔ میری بے حوصلگی نے میری زبان مفلوج کر دی لیکن میری ٹانگیں اُس کے ناکارہ اثر سے بچ گئیں۔ میں جدھر ہٹتا وہ ہیولا ادھر پلٹتا اور میرے آگے اڑ کر کھڑا ہو جاتا۔

"ڈر گئے دلبر جانی؟"

اُس کے مترنّم لہجے سے میں نے اُسے پہچان لیا، وہ بنتّل تھا۔ میں جن حالات سے دوچار ہوا تھا میں نے اُن سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور غصّے سے کہا، "ہٹ میرے راستے سے!"

"میں کب تک ہٹتا اور تڑپتا رہوں گا؟"

اُس کی بے تکی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، میں راستہ کاٹ کر نکل گیا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑ کر کہا، "آج نہیں جانے دوں گا! میرا حق مجھے دو اور جاؤ۔" اُس نے میری کلائی پر اِس زور کا دباؤ ڈالا کہ میں بے بس ہو کر اُس کی چھاتی سے جا لگا۔ میری جسمانی بے مقدوری اور جذباتی پستی نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں زیادہ مزاحمت نہ کرسکا۔ اُس کی شہوت مست حرکتیں اور ہیجان پرور سانسیں میرے سارے وجود سے لپٹ گئیں اور اسے اپنے اپنے طریقے سے مغلوب کرنے لگیں۔ میں اُس کی ہوس کا شکار ہونے ہی والا تھا کہ میں نے کسی کو گاتے ہوئے سنا۔ شدّتِ اہانت اور شدّتِ دہشت سے میرا وہ خود افزا جذبہ مر چکا تھا جو شکست خوردہ حالات میں انسان کی خوداعتمادی کو ابھارتا ہے اور اُس کی ہمّت بندھاتا ہے۔ کسی طرح اُس جذبے کا احیا ہوا۔ اُس نے میری

بے چارگی کو سہارا دیا اور میرے معذور دل کو حوصلہ اور میں نے "بچاؤ بچاؤ" کا شور مچادیا۔ اُس نے میرا مُنہ بند کیا اور مجھے اٹھاکر جھاڑیوں میں لے جانے لگا لیکن اُس وقت تک میرے بلاوے کا جواب آچکا تھا۔

"ٹھہرو ہم آتے ہیں!"

چند آوازیں ایک ساتھ آئیں اور پھر برابر آنے لگیں۔ وہ بوالہوس گھبرا گیا۔ اس نے مجھے چھوڑا لیکن میرے گال پر کاٹ کھایا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں درد سے سنبھلا نہ تھا کہ دو آدمی بھاگتے ہوئے میرے پاس پہنچے۔

"کون تھا؟ کیا ہوا؟" وہ پے در پے سوال کرنے لگے۔ اپنی بدنامی کے ڈر سے میں صرف اتنا کہہ سکا، "شاید کوئی چور تھا۔" وہ جدھر گیا تھا میں نے اُدھر ہاتھ اٹھاکر کہا، "اِدھر گیا ہے"۔ ایک آدمی نے سڑک کے کنارے کی جھاڑی کو ہلاکر کہا، "حرام زادے، تیری تقدیر اچھی ہے کہ اندھیرا ہے! ورنہ تجھے مزہ چکھاتے۔" وہ دونوں، چور اور اندھیرے کو گالیاں دیتے ہوئے میرے ساتھ ہولئے۔ میں چکتے کو سہلاتا، جو مجھے ٹھونکی ہوئی کیل کی طرح لگتا۔ کیل اور زخم کی کارسازی ایک ہے، دونوں اپنا نشان نہیں گنواتے ہیں۔ اُس چکتے کا نشان بصورتِ دیگر میرے دل میں ہے۔ میرے ساتھیوں کو میرے گاؤں سے آگے گیگنووال جانا تھا۔ میں اپنے گاؤں کے پاس اپنے راستے جانے لگا، انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا، "اِتنی رات گئے اکیلے مت آیا جایا کر! راستے میں سو طرح کا خطرہ ہوتا ہے۔"

قارئین! میں بارہا ذلیل ہوا ہوں، جذباتی طور پر روندا گیا ہوں، رویا ہوں۔ میرا دل شاہد ہے کہ اِس ذلت کی سنگینی اور جذبات کی بے کلی بالکل الگ ہے اور ناقابلِ بیان۔ اپنی تذلیل پر بہائے جانے والے آنسوؤں کی آگ نرالی ہوتی ہے۔ میں بظاہر اچھا بھلا تھا لیکن ہڈیوں کے مغز سے لے کر ہر بُن مُو کے اندر تک جھلسا ہوا۔ جب کبھی میں ایسی صورتِ حال سے گزرتا، مجھے لگتا کہ میری خوب صورتی بار بار لگاتار میرا پیچھا کرتی ہے اور مجھے اِس امر کی سزا دیتی ہے کہ میں اُس کا نااہل دوست ہوں۔ اپنی خوب صورتی پر مجھے جیسا ناز تھا، غریب کو امیر کی دوستی پر ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر میں مردود تھا! میری روحانی سربلندی، میری خوب صورتی سے تھی۔ اُس سے میرا وہ رشتہ تھا جو پرندے کا شاہ پروں سے ہے۔ اُس کے بل بوتے پر میں اڑتا تھا اور آسمان کی بلندیوں میں جھانکتا تھا۔ میری رفیق، میری مصیبت کا باعث بنی تو میری رگوں میں میٹھی شراب کی جگہ کڑوا تیزاب بھر جاتا جو دھڑکنوں سے لے کر سانسوں تک میں سرایت کر جاتا۔ میری روح کی وہ طاقت غارت ہو جاتی جو مجھے میری لاچاری میں سنبھالتی تھی۔ میں اپنی ذلت کی پستی میں سوچتا کہ بدصورتی کتنی ہی بھیانک سہی، خوب صورتی سے دل پذیر اور آرام رساں ہے۔ میری، یہ نفسیات شاید شدید نہ تھی، اگر رہتی! میں نے اپنی صورت بگاڑ لی ہوتی۔

اُس پیج نے ہربھجن سنگھ اور گُرداس سنگھ سے اٹ سٹ کر کے مجھے زیر کرنے کی گہری چال چلی۔ وہ دونوں چھٹے ہوئے طالبِ علم تھے اور مرنے مارنے پر تیار رہتے تھے۔ میری خوش قسمتی! میں اُس کے بیچ میں آتے آتے کرم چند

کی وقتی مدد سے بال بال بچ گیا۔

میرا بزدل، جسے میں لاشے کی طرح اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا تھا، میری زندگی پر گھناؤنا بوجھا تھا۔ اپنے سارے عذابوں سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھ پر لازم تھا کہ میں اس بدذات سے چھٹکارا پاتا۔ میں کبھی اپنے بزدل کا حوصلہ بندھاتا اور ناموافق حالات کا سامنا کرتا لیکن منہ کی کھاتا۔ مجھ ملعون پر یہ کہاوت پوری اترتی تھی۔ 'ہیجڑے کا یار، سدا خوار'

باب ۲۶

زندگی کی بساط پر شاطر
چال اپنی نہ کوئی کام آئی (شاطر)

وہ زمانہ میری زندگی کا نازک ترین زمانہ تھا۔ میں اپنے آپ کو بدلنا چاہتا تھا، اپنی بزدلی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، اپنے تعلق سے کیا کیا نہ چاہتا تھا! میں جسمانی طور پر اتنا کمزور نہ تھا اس کے باوجود میں کسی کی زیادتی کا مقابلہ کرنے کے ناقابل تھا۔ بھایا جی کی دست درازیوں نے میری اس جبلت کو کچل دیا تھا جو للکار کا جواب للکار سے دیتی ہے۔ جہاں کہیں مقابلہ درپیش ہوتا، وہاں میری حالت اس کتے کی سی ہوتی جو حریف کو دیکھ کر دم دبا لیتا ہے اور اس کے حملے سے پہلے ہی زمین پر لوٹنے لگتا ہے۔

تایا جی کے عالمانہ رویے سے میری ذہنی تربیت جیسی ہوتی تھی اس کی نوعیت دوسری تھی۔ میں ان سے دلیل سے زیادہ عمل سے جیتنے کا فن سیکھ رہا تھا۔ معرکہ آرائی میں، میں حریف کے سنمکھ ہوتے ہی یوں بجھ جاتا جیسے ہوا میں کمزور چراغ۔ ماں کی مکمل تابعداری نے مجھے دعاوں، التجاوں اور مناجاتوں کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا، جہاں مجھے نہ کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کچھ سجھائی۔ میں گھور اعتقاد کی گھور خندق میں پڑا روشنی کا تمنائی تھا۔ میں ماں کی طرح اپنی ذلت کو اس کی رضا سمجھتا تھا لیکن راضی بہ رضا جینے کے لئے، میں جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتا اور جڑ جڑ کر ٹوٹتا تھا وہ عذابی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ کاش مجھ میں ایسی قابلیت ہو کہ میں نئے الفاظ ایجاد کر سکوں جو میری تڑپتی رگوں جلتی سانسوں اور کانپتی آہوں کی سچی نمائندگی کر سکیں۔ میری مجبوری میری روح کی زیاں کاری ہے اور میری ناتمامی کی ہمیشگی۔ میری پستی میں سے ایک ہی آرزو ابھرتی تھی کہ میں اپنے اذیت دینے والے سے بدلہ لوں لیکن میں بے مقدور تھا۔

میں اپنی لاچاری میں اپنے دل و دماغ میں جنگ لڑا کرتا تھا، جنگ! بھیانک جنگ!! وہ جنگ

واقعی لڑی جائے تو جنگِ عظیم سے عظیم تر ہو۔ میرا یقین ہے کہ آدمی ظاہری طور پر جتنے ظلموں، ستموں، فسادوں قہروں، غضبوں .... کا مرتکب ہے وہ اس کی خیالی دَرِندگی کا دھندلا سا عکس ہے۔

میری بدلہ لینے کی آرزو دو ہی طریقے سے پوری ہو سکتی تھی۔ اوّل! میرا خدا میرے دشمنوں سے لڑتا اور اُنہیں ملیامیٹ کرتا۔ دوم! وہ میری نامردی کو مردانگی میں بدل دیتا اور میں وہ سب کچھ کر دکھاتا جس کی مجھے اُس سے توقع تھی۔ مجھے دعاؤں کی کارگزاری پر شک گزرتا اور میں اُن دھارمک کتھاؤں کو من گھڑت خیال کرتا جن میں بھگوان، اوتار دھارن کر کے اپنے بھگت کو سنکٹ سے بچاتا ہے۔ میں خدا کے معنی پھر سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ تو بس رحیم تھا اور کریم تھا۔ میں سوچتا کہ ایسا خدا میرے کس کام کا! میرے خدا پر لازم ہے کہ وہ خوں خوار، بے درد بے رحم اور سفاک ہو۔

قارئین، فہم و فراست کی نفسیات ہے! اور یہ نفسیات، پانی کی طرح ہے جسے جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

باب ۲۷

چراغِ منزلِ نَو ہیں وہ شاطرؔ
وہی جو نقشِ پا ہیں خوں چکاں سے
(شاطرؔ)

پنجاب کے ساتھ زبان بھی تقسیم ہوئی۔ وہ لوگ جو اردو پڑھنا، اردو لکھنا اور اردو بولنا تہذیبی علامت سمجھتے تھے، اردو دشمن ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، اسے بھی ملک بدر کر دو۔ نئی تہذیب کے علم بردار اردو کی مخالفت اردو میں کرتے۔ کوئی بھلا مانس انہیں یاد دلاتا تو وہ ڈھٹائی سے کہتے، "اردو مسلمانوں کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے، ہم ہندی بول رہے ہیں۔"

ہریانہ کے آتش صاحب اکیلے آدمی تھے جو اردو کے بارے میں مستند نظریہ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اردو عین ہندوستانی زبان ہے جو اسلامی اور ہندوستانی کلچر کے وصال سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بالکل اتفاقی بات ہے کہ وقت کے حکمرانوں نے اس کے لئے فارسی طرزِ تحریر اپنایا۔ ایسا نہ ہوتا تو آج کوئی ایسی بات نہ کرتا۔ رسم الخط بدلنے سے زبان نہیں بدل جاتی۔ جب تک گرومکھی لپیّ ایجاد نہ ہوئی تھی، پنجابی، فارسی لپیّ میں لکھی جاتی تھی۔ سندھی، پوٹھوہاری پنجابی، اردو .... سب پراکرت بھاشا کی شاخیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ زبان ہی حلال ہے اور زبان ہی حرام ہے، وُہی بات تھی۔ اپنی تائید اور دوسرے کی تردید میں لوگ جیسی باتیں بناتے، انہیں سُن کر حیرت ہوتی۔ کوئی اُن کی بات پر دھیان نہ دیتا تو وُہ خُود کو ایسے دیکھتے جیسے اپنی بات کو آپ سراہ رہے ہوں۔ کندن باوا یہی باور کروانے کی فکر میں رہتا کہ دُنیا کی ہر زبان کی ماں، سنسکرت ہے۔ اِسے ہر مُلک کی زبان بنا دینا چاہیئے، اِس طرح زبانوں کے جھگڑے ختم ہو جائیں گے، دُنیا ایک ہو جائے گی اور سنسکرت کو اُس کا کھویا ہُوا مقام بھی مِل جائے گا۔ وُہ بیساکھی کے میلے میں سبیل لگایا کرتا تھا، اِس بار اُس نے سبیل کا نام پیاؤ رکھا۔ وُہ ریٹائرڈ فوجی تھا، اپنے بال انگریزی وضع کے بنواتا تھا اور اُسی طرز کا لباس۔ وُہ دیسی کپڑے پہننے والوں کو گنوار سمجھتا تھا اور اُن پر طعن کرتا تھا۔ اُس نے گائے کے کھُر جتنی بڑی چوٹی رکھ لی اور دیسی، وُہ بھی غیر رسمی پہراوا رکھنے لگا۔ وُہ سُودہ صندل سے تلک لگاتا، دھوتی باندھتا اور ایک ہاتھ میں لانگ پکڑتا۔ حالاں کہ جِنسی زندگی جینے کے لئے ختنہ ضروری ہے، وُہ اِس میں عیب نکالتا، "بھگوان سب کو ہندو پیدا کرتا ہے جو آدمی ختنہ کرواتا ہے وُہ بھگوان کے کاروبار میں خلل ڈالتا ہے اِس لئے ناقابلِ مُعافی گُناہ گار ہے۔"

آداب و سلام کی جگہ ست سری اکال نے لے لی اور پھر ست سری اکال اور نمستے میں ٹھن گئی۔ کوئی سکھ ہِندو کو ست سری اکال بُلاتا، وُہ نمستے میں جواب دیتا، ہِندو، سکھ کو نمستے کرتا تو وُہ ست سری اکال کہتا۔ پنجابی، گُرمُکھی لپی سے رُوشناس ہُوئی۔ یہ اِس طرح کہ گُرمُکھی، گُرو انگند دیو جی کی اِیجاد تھی، اِس رشتے سے مُقدس مانی جاتی تھی اور صرف دھرم کے کاروبار میں اِستعمال ہوتی تھی۔ اب گُرمُکھی میں وُہ ادب نقل ہونے لگا جو فارسی رسم الخط میں رقم تھا۔

تایا جی گُرمُکھی کے بارے میں جو کہتے تھے وُہ بالکل غیر رسمی ہے، "برہمن، سنسکرت کے مُحافظ بنے بیٹھے تھے نہ کسی دُوسرے کو پڑھنے دیتے تھے اور نہ پڑھاتے تھے۔ وُہ گیان کو صرف اپنی جات تک محدُود رکھے ہُوئے تھے اور گیان بانٹنے کے خلاف اِتنی سختی سے کاربند تھے کہ کوئی غیر برہمن، نام سُن لیتا تھا تو اُس کے کانوں میں سیسا ڈلوا دیتے تھے اور سنسکرت پڑھنے والے کی جیب کٹوا دیتے تھے، علم و فن کی ترقی، جو انسانی زندگی کی طاقت ہے، مفلوج تھی اور باہمی نفرت عرُوج پر۔ اُس فرسُودہ نظام کی تجدیدِ نو کے لئے گُرو جی نے بھاشا کے آدھار پر گُرمُکھی اِیجاد کی اور اِسے ذریعہ مراسلت بنایا۔ اِسے ہمہ صِفت اور ہر دل عزیز بنانے کے لئے اُنھوں نے ہر ذات کے بزرگوں کی بانی اِکٹھی کی اور اپنی بانی کے ساتھ گرنتھ میں لکھی تاکہ گُرمُکھی، سنسکرت کی طرح ایک ذات کی اِجارہ داری سے باہر رہے۔ لیکن ہُوا وُہی جو وُہ نہ چاہتے تھے! گُرمُکھی، پُوجا سمگری بن گئی اور پجاریوں کا طرزِ معاش۔" وُہ کہتے تھے کہ میں نے وُہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب نہنگوں کے ٹولے آوارہ گھُومتے تھے، ہِندوؤں اور سِکھوں سے دسوندھ (کمائی کا دسواں حِصّہ) وصُول کرتے تھے، جو نہیں دیتا تھا، اُسے لُوٹ لیتے تھے۔ اُس دھاندلی سے اُن کا جہل زیادہ تکلیف دِہ تھا! وُہ ہلوں سے پھال نکال کر لے جاتے تھے اور

ہالیوں کو مارتے تھے۔ اُن کا عذر تھا کہ سری صاحب (پھال، برچھی کی طرح ہوتا ہے اور برچھی، گرو گوبند سنگھ جی کا ہتھیار تھا جسے احترام سے سری صاحب کہتے ہیں) سے دھرتی کھودنا، اُس کی بے حرمتی کرنا ہے۔

پجاریوں نے سوچا کہ گرومکھی کا علم عام ہوا تو اُن کے نان و نفقہ کا کیا ہوگا؟ انہوں نے گرومکھی میں لکھی کتابوں کو ممنوع قرار دیا اور انہیں جلانا شروع کردیا۔ جب ماسٹر تارا سنگھ نے پنجابی صوبے کی مہم چلائی تو پجاریوں کا رویہ بدلا جس کا، ردِ عمل پنجاب اور ہریانہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

میری سوجھ بوجھ جس لحاظ سے بدلنا چاہتی تھی اُس سے میل کھاتا ادب ملتا نہ تھا۔ اقبال میری پسند کا شاعر تھا لیکن میرے جذبہ تلاش نے اُسے مسترد کردیا تھا۔ اُس کا 'شکوہ'، 'جوابِ شکوہ' اور 'ترانۂ ملی'، پڑھ کر تو میں اُس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

تایا جی روایتوں اور اداروں سے اپنی وجہ سے منحرف تھے۔ "انسان اور حیوان آزاد پیدا ہوتے ہیں لیکن انسان اپنی اختراعی صلاحیت کی وجہ سے اپنے پیدا کردہ حالات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ میرے اسلاف پتھر سے اوزار بناتے تھے، جب کہ میں فولاد سے، وہ پتے اوڑھتے تھے، میں کپڑے پہنتا ہوں۔ میں نے ہر اُس چیز کو ترک کیا کہ جس پر اُن کا انحصار تھا۔ میں اُن کی ہر چیز ساتھ لیے پھرتا تو غیر ضروری بوجھ کے نیچے دبا رہتا۔ انسان کے لئے ردّ و قبول اور تغیر و تبدل لازم و ملزوم ہیں۔ روایتیں اور ادارے انسانی ضرورت کی پیداوار ہیں، انسانی ضرورت کے ساتھ ان کا بدلنا ضروری ہے جو نہ بدلیں وہ جمود پرستی کا شکار ہیں اور اُسی طرح وہ ذہن، جو ان سے منضبط ہیں۔ دونوں اپنے اپنے انداز میں بیمار ہیں لیکن پُر لطف بات یہ ہے کہ اپنی فرسودگی سے بے خبر ہیں۔"

وہ کہتے تھے، "پہلا پانی جیو ہے جت ہریا سب کوئے۔ سب سے پہلے پانی میں پرانی پیدا ہوئے اور اُسی سے ساری زندگی کی اُپج ہوئی۔ پھر جیوو کا سا تمک پرا کریا (ارتقائی طریقِ عمل) سے بڑھتے، بدلتے دوسری انواعِ حیات میں بدلے اور بنتے بنتے آدمی بنے۔ گو ننگے رہنے سے بولنے اور ننگے رہنے سے کپڑے پہننے اور جنگلی سے شہری بننے تک آدمی جس طرح کے اُلٹ پلٹ حالات سے گزرا ہے اُن کی تفصیل ماہر انسانیات ہی بتا سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آدمی کی ابدیت کا راز تغیر پزیری میں ہے نہ کہ سخت گیری میں۔ جن جانداروں میں یہ حیات پرور صلاحیت نہیں تھی وہ نابود ہوگئے۔ چوں کہ آدمی کو فہم و فراست سے نسبت ہے اِس لئے جمود پرستی، فہم و فراست کی نفی ہے۔ خود رو زندگی کے برعکس آدمی اپنی زندگی کا پاسدار آپ ہے۔ آدمی کی اختراع و ایجاد کی لیاقت ہی اِس کے دوام کی دلیل ہے۔ اِس کے ارتقا میں کسی بیرونی طاقت کو دخل تھا، نہ ہے اور نہ ہو گا۔"

پنجاب کی سرحد کیا بدلی ہر چیز بدل گئی۔ ہمارے گاؤں کی آدھی سے زیادہ مسلمانوں کی زمین جودھا مل کو الاٹ

ہوئی اور باقی دوسرے شرنارتھیوں کو، جو کسی کو الاٹ نہ ہوئی وہ خالصے لگ گئی۔ شرنارتھیوں میں سے جگدیو سنگھ اور بارا سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔ جگدیو سنگھ اِس لئے کہ وہ کچہری کا پنچھی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اپنے بارے میں یہ بات کس شان سے بتاتا تھا، "میں جج کے سامنے سچ بولنے کا حلف اُٹھاتا ہوں لیکن سراسر جھوٹ بولتا ہوں!"

بارا سنگھ اور بہادر سنگھ جھنگ سیال سے آئے تھے۔ وہ کسی سے کوئی بات کرتے تو اُسے گالی دے کر بلاتے۔ شروع شروع میں اُن کا رویہ جھگڑوں کا باعث ہوا، آخر بدلتے بدلتے کچھ وہ بدلے اور کچھ گاؤں کے لوگ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو انہیں گالی دے کر نہ بلاتا، وہ اُسے جانگلو کہتے۔ وہ جو کچھ تھے، اپنی تہذیب رکھتے تھے، جس کا جنسی پہلو بے شرمی کی حد تک مضحکہ خیز ہے۔ کسی رات بارا سنگھ گھر سے باہر لکڑیوں پر یاروں کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور دیر تک گھر نہ جاتا تو اُس کی بیوی دروازے میں کھڑی ہو کر چلاتی، "باریا! مارنی ہے تو آجا، ورنہ میں سو جاؤں گی۔" اُس کی بات پر بارا سنگھ کا ردِ عمل نہایت فحش ہوتا۔ کئی بار وہ اُٹھ کر چلا جاتا لیکن جس دن وہ اُسے نیند سے جگا دیتا، وہ ایسا ہنگامہ کرتی کہ اپنی نیند کے ساتھ پڑوسیوں کی نیند حرام کر دیتی۔ اُن کی ہر ریت اُلٹی تھی۔ وہ تہمد باندھتے اور کرتے پہنتے۔ توا اُلٹا استعمال کرتے اور روٹی، مانڈے (روٹی کا پتلا پاسا) کی طرف چپڑتے۔ اُن کے پاس چکیوں کے بدلے چکلے تھے جو لیٹے رہے ہوئے تھے اِس لئے انہیں جھوتے ہوئے دائیں سے بائیں پھراتے تھے۔

ہماری ٹال کے پیچھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی تھی، اُس میں محکمہ زراعت کا دفتر کھل گیا۔ جہاں سُندریوں کے جھرمٹ اٹھکیلیاں کرتے گھومتے تھے وہاں اکھڑ دہقانوں کے جھنڈ ہنہناتے پھرتے۔ زراعت انسپکٹر سُرائن سنگھ خوش خلق اور سادہ طبیعت آدمی تھا، وہ شام کو کاچھے، بنین اور کھڑاؤں پہنے دکان پر آنکلتا۔ اُس کا بیٹا بخشش سنگھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے وہاں بیٹھا ہوتا جب کہ میں کام کرتا ہوتا۔ سُرائن سنگھ اپنے بیٹے کو رائے دیتا، "تجھے یہاں بیٹھنا ہے تو گیان سنگھ سے سائیکل مرمت کرنے کا ہنر سیکھ لے۔ کتنا اچھا لڑکا ہے! پڑھتا ہے۔ کماتا ہے اور گاؤں سے پیدل آتا جاتا ہے۔"

"بابوجی! میں ٹریکٹر ریپیئر کرنا سیکھوں گا۔" وہ اِٹھلا کر کہتا جیسے سائیکل مرمت کرنا اُس کے شایانِ شان نہ تھا۔

"یو سی، مائی سَن اِز اے فول! آرٹ اِز آرٹ! تم دیکھو، میرا لڑکا بے وقوف ہے! ہنر کوئی بھی ہو ہنر ہے۔" اپنے بیٹے کے جواب سے ناخوش ہو کر سُرائن سنگھ مجھ سے کہتا۔ اُس کی عادت تھی کہ جو انگریزی کا فقرہ بولتا تھا اُس کا اُردو میں ترجمہ ضرور کرتا تھا۔

گرداس سنگھ اور ٹھینو رام محکمہ زراعت میں عارضی بیلدار تھے۔ گرداس سنگھ کنوارا تھا اور ٹھینو رام شادی شدہ لیکن وہ گونا نہ لایا تھا۔ مزاج ٹھنڈا رکھنے کے لئے وہ دونوں دھنیا گھوٹ کر پیتے۔ اجیت سنگھ اُن کا ٹھٹھا اُڑاتا،

"تم دھنیا نہ پیا کرو! ایسا نہ ہو کہ وقت پڑے اور تم ٹھنڈے کے ٹھنڈے رہو۔"

مستقل ملازمت کے لئے گرداس سنگھ اور ٹھینورام کی انٹرویو ہوئی، گرداس سنگھ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے رہ گیا۔ وہ جان جائے کہ رہے، قسم کا خدمت گار تھا اور سُرائن سنگھ کا چہیتا۔ انٹرویو کے وقت سُرائن سنگھ چھٹی پر تھا۔ اُسے پتا چلا تو اس نے انٹرویو ردّ کروا دیا۔ انٹرویو دوبارہ ہوا، گرداس سنگھ نہ کہ صرف یہ کہ مستقل ہوا بلکہ اس کا تقدم برقرار رکھا گیا۔

دفترِ زراعت کے نوکر خانے کا ایک کمرہ راجو اور ماڑو کے پاس تھا، جو باپ اور بیٹا تھے۔ ایک دن راجو کسی بردہ فروش سے اپنے بیٹے کی عمر کی مسلمانی خرید لایا۔ راجو اپنے بیٹے ماڑو کو مجبور کرتا کہ وہ اس لڑکی کو ماں کہہ کر بلائے لیکن ماڑو کو یہ بات ناپسند تھی۔ پہلے دونوں باپ بیٹے جیسے رہتے تھے، خوش رہتے تھے، اب آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ راجو اپنے بیٹے سے زیادہ محنت کرنے لگا اور برف تلائی کے دو گھان لگانے لگا۔ ایک رات وہ دوسرا گھان بیچ کر آیا تو 'ماں' اور 'بیٹے' کو غائب پایا۔

چاچا کریم کی جگہ گرارام امرود بیچنے لگا تھا۔ اس کی آواز اس کی صورت ہی کی طرح بھدی تھی۔ اسے دیکھ کر گھن ہوتی تھی لیکن اس کے امرود چاچا کریم سے زیادہ بکتے تھے، لگتا تھا کہ آزادی کے بعد لوگوں کے پاس دھن زیادہ آگیا ہے اور ساتھ ہی خرچنے کی صلاحیت۔

مولے کی ٹال پر سورج بھان آ بسا تھا۔ مولا شام کو چہرہ بناتا، نہاتا اور پھلیل لگاتا تھا۔ میں کئی بار گھر جاتے ہوئے جان بوجھ کر اس کے پاس سے گزرتا اور اسے سلام کرتا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلاتا، پھلیل کی شیشی کا ڈاٹ نکال کر میرے ہاتھ کی پیٹھ پر رگڑتا اور مجھے مہکا دیتا۔ سورج بھان گورا چٹا تھا لیکن تھا سور کی طرح غلیظ۔ اس کا بدن میل سے چنکبرا رہتا تھا جسے دیکھ کر متلی ہوتی تھی۔ جس دن وہ نہاتا، لگتا کہ اس نے کینچلی اتاری ہے۔ وہ اپنی گندی عادت کو حق بجانب قرار دیتا اور اس کی تائید میں یہ شلوک سناتا،

پنج اشنانم نہاں گیانم، نِت ناون دلدری
چھئیں مہینیں آلسی، سال پچھوں آدمی

دضو کرنا عالموں فاضلوں کا چلن ہے۔ ہر روز نہانے والے خبیث ہیں۔ چھ ماہ میں ایک بار نہانے والے آلسی ہیں اور سال کے بعد نہانے والے چست چالاک،

شام کا وقت تھا۔ میں ٹال پر کیبری (چھوٹے باریک کوئلے) میں سے کوئلے رول کر الگ ڈھیر نکال رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی تیز تیز اور اونچی اونچی ٹاپوں میں 'پوش پوش، بچاؤ بچاؤ' کی دہائی سنی۔ میں کام چھوڑ کر سڑک کی جانب بھاگا۔ میں ادھر ہی تھا کہ ایک تانگہ میرے سامنے سے جھپاک سے گزر گیا۔ رکھا اور دریا ما تانگے کی پچھلی سیٹ

کو چپکے ہُوئے تھے اور مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ مَیں تانگے کے پیچھے بھاگا۔ تانگہ لیلا کے چوک میں پہنچا اور ناہموار سڑک پر اُچھلنے لگا، اِس پہیئے پر اور کبھی اُس پہیئے پر۔ سڑک کی نشاندہی کے لئے کولتار کے خالی ڈرم گاڑے ہُوئے تھے، تانگہ ایک ڈرم سے ٹکرایا اور اُلٹ گیا۔ رکّھا اور وریاما اچھل کر دُور گرے، وریاما کو خراش تک نہ آئی لیکن رکّھے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

راجہ احمد سعید کے اصطبل میں بڑے سجیلے اور بانکے گھوڑے تھے۔ زنجی بار میں اُس کا گھوڑوں کا فارم تھا جہاں سے وُہ فلوّوں کو لاتا اور اُنہیں کھڑی کھیتی اور کھڑی نہاری پر پالتا۔ وُہ اُنہیں بدیسی نام دیتا جو دُور آید شَے کی طرح حسین لگتے۔ راجہ سگھڑ راکھا اور غضب کا شہسوار تھا۔ اُس کے گھوڑوں کی کاٹھیوں میں قبوُر بنے ہُوئے تھے جن میں وُہ بھرے پستول رکھتا تھا۔ اُس کی نازک مزاجی اور معرکہ آرائی کے قِصّے مشہُور تھے۔ وُہ گھوڑے پر سوار ہو کر باگھ کا پیچھا کرتا اور اُسے اکیلا مارتا۔ اُس کے انگ رکشک (باڈی گارڈ) ہم رکاب رہتے تھے لیکن کسی کو شکار پروار کرنے کا حُکم نہ تھا۔ وُہ سویرے سویرے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا کہ اُس کی باگ ٹُوٹ گئی اور گھوڑا بے قابُو ہو گیا۔ وُہ لپک کر گھوڑے کی گردن کو لپٹا، پلٹی مار کر نیچے لٹکا اور اپنی ٹانگوں کو فانے کی طرح اُس کی اگلی ٹانگوں میں جڑ دیا۔ گھوڑا یوُں رُکا جیسے سامنے دیوار آ گئی ہو۔ اُس کے سائیس، گھوڑوں کو کئی طرح سے سدھاتے تھے۔ وُہ اُنہیں کبھی کھڑکھڑیا میں جوتتے اور کبھی کاوے دیتے۔ دونوں حالتوں میں سدھانے والوں کی ترنگ دیدنی ہوتی۔ کھڑکھڑیا پر توازن برقرار رکھنے کے لئے وُہ ایسے ہلتے جیسے لہروں پر کفِ دریا۔ وُہ اُنہیں چوگان پھراتے ہُوئے اُن کی ایال پکڑ کر بھاگتے بھاگتے اُچھلتے، سوار ہوتے، اُترتے اور اُترتے ہی اُن کے ساتھ بھاگنے لگتے۔ راجہ کی یہ بات کہاوت تھی، "راگ کا اصلی مزہ وُہ لیتا ہے جو راگ گاتا ہے اور باگ کا وُہ، جو باگ اُٹھاتا ہے۔"

اُن گھوڑوں کے بارے میں مشہُور تھا کہ وُہ ناپ کے پُورے ہیں۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟ مَیں نہیں جانتا ہُوں، ہاں اُن گھوڑوں کے جبڑے چھوٹے، نتھنے پیارے، چہرے پتلے، گلے لمبے، سینے چوڑے، نالیاں کم گہری، پیٹ گول اور ٹانگیں مضبُوط مگر لچکدار تھیں جیسے پنکھ ہوں۔ اُن کی نازک طبعی اور گرم رفتاری قابلِ ستائش تھی وُہ اڑتے تو پچھلی ٹانگوں پر الف ہو جاتے اور بھاگتے تو زمین سے کچھ اوپر اڑتے دکھائی دیتے۔ اُن کی ٹاپوں کی تیزی حد سے زیادہ کسے ہُوئے ڈھولوں کی تھاپوں جیسی تھی۔ وُہ سواری کی حالت میں ایسے ٹھہرتے جیسے انگاروں پر کھڑے ہوں۔ جب اُنہیں لگام سے پکڑ کر چلایا جاتا، اُن کی چال میں بانکے جوانوں کی شوخی اور سرکشی ہوتی جسے خُوش سیرتی اور خُوش خرامی میں بدلنے کے لئے احمد سعید گھوڑوں کو دوہرے دہانے کی لگام اور زیر بند پہناتا، تنگ اور زیر بند کو ایسے کستا جیسے کوئی حسینہ اپنی کمر کو چینگ (کس کر ناڑا باندھنے سے پڑا ہُوا نشان) سے بچانے کے لئے اِزار بند باندھنے میں احتیاط کرتی ہے۔ گھوڑے میٹھا پوُیا چلتے ہوتے تو سواروں کے اُٹھنے بیٹھنے کا منظر دیدنی ہوتا۔

علاقے میں کئی اور لوگوں کے پاس گھوڑے تھے جو اُن گھوڑوں کے مقابلے میں ٹائر لگتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب راجہ کے گھوڑے اپنی ٹھسک گنوانے لگتے ہیں، وہ اُنہیں مروا دیتا ہے۔ بھایا جی اُنہیں دیکھ کر کہتے، "باز ہیں، شریر باز!" اُن سے اچھے گھوڑے میں نے ایک بار نہنگوں کے پاس دیکھے تھے، جو ہمارے گاؤں کے مشرق کے باغوں میں اُترے تھے۔ اُن گھوڑوں کا سلسلۂ نسب "نیلا" (گرو گوبند سنگھ کا گھوڑا، جس کی وفاداری، بہادری اور خوب صورتی کے منظوم قصّے پنجابی لوک گیتوں کی آبرو ہیں) سے ملاتے تھے۔ وہ اُنہیں پُرشکوہ ناموں سے بُلاتے تھے جیسے رنجیت سنگھ صاحب، سوا لاکھ سنگھ صاحب ..... وہ اُنہیں شاہ زادوں کی طرح پالتے تھے اور ازراہِ احترام اُن پر سوار نہ ہوتے تھے۔

پرندوں کے شکار کے لئے راجہ، باز پالتا تھا۔ جب وہ شکار کے لئے نکلتا، باز آموز چمڑے کا دستانہ چڑھائے باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہوتا۔ باز خوں خوار آنکھوں سے اپنے اطراف دیکھتا، جس سے اُس کی اندرونی بے قراری کا پتا چلتا۔ باز آموز کسی کو زیادہ پاس آنے سے روکتا اور شکاریوں کی بھیڑ سے تھوڑا الگ رہتا۔ وہ جس ادا سے ہاتھ کو حرکت دے کر باز، شکار پر چھوڑتا، وہ دل گرمانے اور اُکسانے والا منظر تھا لیکن باز اُس کی حرکت سے بے نیاز لگتا۔ اُس کا اپنا انداز اُس کا کمال تھا جیسے کسی کی حمایت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہاتھ پر پنجوں کی گرفت ڈھیلی کرتا، شانے اچکاتا، اُچھلتا، پر پھیلاتا اور بے تکلف تُنک روی سے کرۂ ہوا میں جا رہتا جو اُس کے ورثے سے اُس کی کشورِ مُسلّمہ ہے۔ اگر شکار بچ کر کسی کمیں گاہ میں چھپ جاتا، وہ اُس پر منڈلاتا، اپنی بے چینی میں چیخ نما آواز نکالتا، کبھی اونچا کبھی نیچا اُڑتا جیسے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی میں سرگرم ہو۔ باز آموز اُسے چمڑے کی چڑیا سے للچاتا اور لُبھاتا، اُس کی ناکامی میں اُس کی آس بندھاتا۔ آخر کھوجی کُتّے چھوڑے جاتے، وہ شکار کو کمیں گاہ سے ڈھونڈ نکالتے۔ اُس کے اُڑان بھرتے ہی باز اُس پر انتقام جویانہ تیزی سے جھپٹتا، پنجوں میں دبوچتا، زمین پکڑتا، فاتحانہ انداز میں اپنے اطراف دیکھتا اور مُتمکّن لگتا۔ راجہ کے ہر باز کی ٹانگ پر سونے کی شناختی تختی باندھی ہوتی تھی۔ بازوں کی پرورش گھوڑوں ہی کی طرح خیال آفریں ہے۔ وہ کریز میں آتے تھے تو باز آموز اُنہیں گھاس کے ٹھنڈے جھونپڑوں میں رکھتے تھے اور زندہ بھیگی چڑیاں کھانے کو دیتے تھے۔

جب راجہ احمد سعید پاکستان گیا، اُس نے اپنا سارا اصطبل ہندو دوستوں میں بانٹ دیا۔ چند گھوڑیاں اور گھوڑے سیٹھ پیارے لال اور منشی رام کے پلّے پڑے۔ اُن کی بھاری بھرکم توندوں اور لولوں لٹکے چہروں سے اُن برق رفتاروں کو کیا نسبت ہو سکتی تھی! وہ بدذوق اُنہیں تانگوں میں جوتنے لگے۔ ورِیام، منشی رام کا کوچوان تھا جس کے تانگے میں عربی جتا ہُوا تھا۔ وہ حادثہ یُوں ہُوا کہ عربی کا دہانہ ٹوٹ گیا اور جدھر اُس کا منہ تھا، وہ اُدھر بھاگ کھڑا ہُوا۔

سیٹھوں کے خاندان میں صرف رومیش ہی چست اور چھریرے بدن کا تھا، باقی سب، جیسا کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا، گندے بروزے کے ڈرم تھے۔ رومیش نے اپنی سواری کے لیے عرشی مخصوص کر رکھی تھی۔ وہ اُس کی دیکھ بھال خود کرتا تھا اور اُس سے روحانی لگاؤ رکھتا تھا۔ اُس کی مالش کرتے کرتے اور جسم سہلاتے سہلاتے، وہ اُسے ایسے چوم لیتا جیسے وہ اُس کی محبوبہ ہو۔ اُس کی حرکتوں اور باتوں پر وہ اپنے طریقے سے متاثر ہوتی۔ اُس وقت رومیش بالکل جذباتی ہو جاتا، "ٹھیک ہے پیاری! میں جانتا ہوں! تم اچھی لڑکی ہو!" جب عرشی سواری کے لیے نکلتی، وہ گھڑی دیدنی ہوتی۔ اِدھر وہ رکاب پر بوجھ محسوس کرتی اور اُدھر چوکڑی بھرتی اور اگلے لمحے تان کی طرح سنائی تو پڑتی لیکن دکھائی نہ دیتی۔ رومیش اُس کی تعریف یوں کرتا، "عرشی بھاگتی ہے تو ہوا پر سے قدم اُٹھاتی ہے۔"

رومیش کو عرشی پر سوار ہونا ہوتا تو اُس کا نوکر لال، عرشی کی لگام پکڑتا۔ عرشی کی بے قراری رومیش کو لقمہ دیتی اور وہ جس پھرتی سے رکاب پر پاؤں رکھتا، کاٹھی کا سہارا لیتا، اُچھلتا، کاٹھی پر بیٹھتا وہ وجد و کرب کا ملا جلا منظر تھا۔ وہ اکیلا ہوتا تو اُس کے سوار ہونے کا طریقہ ایک جھلک میں سمٹ آتا۔ وہ ہرنے کو پکڑ کر کوندے کی طرح لپکتا اور تقریباً بھاگتی ہوئی عرشی پر سوار ہوتا۔ وہ اُسے میلوں پویا دوڑاتا اور عرشی تھی کہ تازہ دم لگتی۔ اُسے عرشی پر چڑھے چڑھے بات کرنی ہوتی، وہ کبھی اُس کی لگام کھینچتا کبھی ڈھیلی چھوڑتا اور اُسے رام کرنے کے لیے اُس کی گردن تھپکتا اور اُسے پُچکارتا۔ لال، عرشی پر کاٹھی ڈال کر لایا۔ رومیش کو گھر میں کوئی کام نکل آیا اور اُس نے اُسے واپس کر دیا۔ اُس کے دل میں کیا آئی کہ وہ پہاڑیے کی مدد سے عرشی پر سوار ہو گیا۔ پہاڑیے کے لگام چھوڑتے ہی عرشی، اُسے لے اُڑی۔ وہ لگام کھینچے تو عرشی پچھڑ رہی چلے، لگام ڈھیلی چھوڑے تو وہ ترارے بھرے۔ پیچھے سے بس آ رہی تھی، وہ اچانک مُڑی اور بس سے ٹکرا گئی۔ اُس بیچ تبھی لال بس کے پیچھے آکر مر گیا اور عرشی کی اگلی ٹانگوں کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔

اور جیسا کہ کہاوت ہے، لنگڑا گھوڑا اور ڈھیلا ..... کس کام کا! عرشی کو گولی مار دی گئی۔

رکھا، وریام کا بڑا بھائی تھا۔ وریام نے اُسے اُٹھا کر گھر لے جانا چاہا لیکن اُس نے روک دیا۔ وریام نے اِصرار کیا تو اُس نے اُسے گالیوں پر دھر لیا۔ جس کسی نے وریام کی طرفداری میں کچھ کہا، وہ اُس کے بھی گلے پڑ گیا اور اپنی اکڑفوں سے سب کو حیران کر دیا۔ جب میں گھر روانہ ہوا، وہ وہیں پڑا کراہ رہا تھا۔

رکھا مجرد تھا اور اڈے میں ایک جامن کے نیچے رہتا تھا۔ وہ ڈھیروں میں سے ردی کاغذ اور چیتھڑے اکٹھے کرتا اور انہیں بیچ کر جو کچھ کماتا اُسی سے اپنا پیٹ پالتا۔ میں اُسے پہلے سے جانتا تھا اِس لیے کہ اُس کی دیانتداری روایت تھی۔ اگر عمل کے معنی خبط لیے جائیں تو اُس پر تایا جی کی بات صادق آتی ہے، "آدمی کا عمل اُس کا نجی حوصلہ ہوتا ہے۔"

اُسے ڈھیروں میں سے گھریلو سامان جیسے برتن، چمچہ، کھرپا..... وغیرہ مل جاتا تو وہ اُس کے مالک کو ڈھونڈنے کا پورا جتن کرتا۔ اُسے سگریٹ کی ڈبیا میں سے سو کا نوٹ ملا جسے اُس نے پنگل واڑے (جہاں کوڑھ کے مریض رکھے جاتے ہیں) کے فنڈ میں دے دیا۔ کوئی اُسے بھکاری جان کر خیرات دے بیٹھتا تو وہ اُس کی ایسی خبر لیتا کہ بس!

دوسرے دن میں سکول گیا تو اُسے دفترِ زراعت کے باہر برآمدے میں پڑا ہوا دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں رینگ کر پہنچا تھا۔ بھورام کا اڈے میں ڈھابا تھا جو رکھے کے خاندان ہی سے تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کشمیری لال کے ہاتھ رکھے کو کھانا بھیجا، جسے اُس نے اِس شرط پر کھایا کہ وہ اُدھار کھا رہا ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگ آپ ہی سیدھی کر کے اُس کے گرد بانس کی پچریں باندھ لیں جو میں نے اُسے بنا کر دیں۔ اُس نے میرا ہاتھ چوم کر احسان مندی سے کہا، "میں یاد رکھوں گا! کبھی نہیں بھلاؤں گا!"

اُس کے ساتھ میں نے ایسا کچھ نہ کیا تھا، جسے اُس کے یاد رکھنے یا بھلانے سے مجھے فرق پڑتا تھا! لیکن میں اُس کے جذبے کی نفاست پر حیران ہوا کیوں کہ وہاں ایسی بات کرنے کی ریت نہ تھی۔ اُسے وہاں اُٹھانے بٹھانے والا کون تھا! اُس نے وہیں کچے فرش پر گڑھا کھودا اور اُسے ضروری حواجات کے لئے برتنے لگا۔ اُس کا لباس چار اُنگل چوڑا تنبا تھا جسے وہ کمر کے گرد بندھی رسّی سے ستروں کے اُوپر باندھے رکھتا تھا۔ تنبے میں سے خصیے جھانکتے رہتے جیسے وہ اُس کے نگہبان ہوں اور نکتہ چیں بھی۔ گوشوں (اُپلوں) کی آگ کے سامنے وہ ٹاٹوں اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ناہموار گٹھڑی کی طرح پڑا اپنی کھال میں مست رہتا۔ وہ کبھی نہیں نہاتا تھا۔ گندی دھرتی پر پڑی گندگی، گندگی نہیں لگتی، دونوں ایک دُوسرے کا حصّہ لگتی ہیں ایسے ہی رکھے کے اطراف گندگی تھی، جس میں وہ مکھی کی طرح جی رہا تھا، صاف ستھرا، صحت مند، مسرور اور مطمئن۔ کیا کوئی یقین کرے گا! اُس کی اندھیری اور گھناؤنی زندگی میں ایک ناقابلِ فہم کشش تھی۔ ماہ بھر میں وہ لنگڑاتا ہوا چلنے لگا اور کبھی کبھار دکان پر آ کر بیٹھنے لگا۔ اُسے بیٹھنے کے لئے کچھ دیا جاتا پھر بھی وہ زمین پر ہی بیٹھتا اور کہتا، "میں دھرتی کی دُوری برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ شاید ہی ایسی بات کرتا جس میں کسی کی گراوٹ ہو۔ کوئی اُس کے سامنے غیبت کرتا، وہ اُسے پھٹکارتا، "تم کیسے آدمی ہو! اپنے دُشمن کا گوہ کھاتے ہو!" اُس کے خلافِ روایت رویے پر میں اتنا حیران نہ تھا جتنا اس بات پر کہ اُس سے سُوسج بھان کی طرح بدبُو نہیں آتی تھی۔ ٹال پر کوئی دُوسرا نہ ہوتا اور اجیت سنگھ کو کہیں جانا ہوتا، وہ ٹال اُس کے سپرد کر کے چلا جاتا۔ کبھی سُوئی بھر کا نقصان نہ ہوا۔ ٹال کے برابر ہوشیار پور اور جالندھر جانے والی بیل گاڑیوں کا پڑاؤ تھا۔ گاڑی بان دُور دراز سے گڈے لادے آتے، وہاں رُکتے بنڈا بھانڈا تلاش کرنے کے لئے شہر میں جاتے۔ مہترانیاں گوبر اکٹھا کرتی ہوئیں مال کاٹ لیتیں اس پہ بیلوں کو آرام سے نہ بیٹھنے دیتیں۔ اُن بلاؤں کو دُور رکھنے کے لئے گاڑی بان باری باری بازار جاتے اور اِس احتیاط میں سفر کا آغاز دیر سے کرتے۔ رکھے نے گاڑی بانوں کا اعتماد جیت لیا۔ وہ اُس کی نگرانی میں گاڑیاں رکھ کر بازار چلے جاتے اور یوں وقت

بچا لیتے۔ اُسے بیساکھی لگ گئی تھی۔ اُس نے پُرانا کام ترک کر دیا اور گوبر اکٹھا کرنے لگا۔ چوُں کہ وُہ وہیں رہتا تھا اُس کا کوئی حَرِیف نہ تھا۔ سادھُو رام کے باغیچے کی شمالی حد کو چھُوتا ہُوا قدِ آدم گہرا اور کئی قدِ آدم لمبا گڑھا تھا، رکھّا اُسے گوبر سے بھرنے لگا۔ چند مہینوں میں گڑھے کا تَلا، حاملہ کے پیٹ کی طرح اُبھرا اور باہر دکھائی دینے لگا۔

اُس سال ہماری کھیتی اچھی نہ ہُوئی جس کا سبب کھاد کی کمی سمجھی گئی۔ رکھّے کا ڈھیر خالص گوبر تھا جسے بھائیا جی نے پندرہ رُوپیہ فی گاڑی کے لحاظ سے خرید لیا۔ درشن رام، بھائیا جی کا پُرانا بھاڑے دار تھا، اُس نے چار رُوپے فی گاڑی بھاڑا مانگا جسے اُنھوں نے تُرنت مان لیا۔ درشن رام حیران ہُوا اور اپنی خُوشی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا، "چاچا جی، آج تو بڑے مہربان ہیں آپ!"

"ہم نامہربان کب تھے؟" بھائیا جی نے اُسی لہجے میں کہا۔

اُس مہربانی کا مَطلب درشن رام کی سمجھ میں تب صاف طور پر آیا جب پہلا گڈّا بھر گیا۔ گڈّا ہینڈیا جوڑنے پر ملا۔ اُس نے واویلا کیا لیکن رکھّا چُپ چاپ دیکھتا رہا بلکہ مشورہ دیا، "سردار جی، سانگی خالی ہے کچھ ٹوکرے بھر کر وہاں رکھ دیجئے!"

اُس طرح حد سے زیادہ لادنے کے باوجُود تیس گڈّے بھرے گئے۔ بھائیا جی رکھّے کا حساب کرنے لگے تو اُس نے لبھّو رام کو بُلا لیا۔ بھائیا جی نے اُنگلیوں کو تھوک لگا لگا کر جیسے رُوپیہ گِنا، لبھّو رام کو دیا اور پھر ہم بھائیوں کو دیکھا وُہ اُن کی خطرناک تنگ دِلی، گھناؤنی تنگ خیالی اور سخت تنگ نظری کا مُظاہرہ تھا۔ وُہی ہُوا جس کا مجھے کھٹکا تھا! حُکم جاری ہو گیا، گوبر اکٹھا کیا کرو! وُہ حقیر حُکم سب کے لئے ایک سا تھا، سب کو بُرا لگا لیکن حُکم عدولی کا بدلہ ہر کسی کو معلُوم تھا۔ کسی کو چوُں وچرا کا حَوصلہ نہ ہُوا اور ہر کوئی گردن ڈالے کھڑا رہا۔ بھائیا جی کے وہاں سے جاتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی ہانکنے لگا۔ اُس سے کیا ہوتا؟ اُن کا کہا پتھر پر لکیر تھا۔ گوبر جمع ہونا شرُوع ہُوا لیکن اُس کی مقدار بھائیا جی کی اُمید سے کم تھی۔ اُن کے حُکم کی آبرُو رکھنے کے لئے میرے بھائی مجھے ہی کام میں لاتے اور خُود اُس ذلیل کام سے دُور رہتے۔ وُہ میری ہی طرح غم گرفتہ ہوگا، جس نے یہ کہا تھا "سگ باش، برادرِ خُورد مباش۔ کسی کا چھوٹا بھائی بننے سے کُتّا بننا بہتر ہے!"

میرے گوبر اکٹھا کرنے کی بات میرے سکُول تک پہنچ گئی اور پھر بات میں سے بات نکلنے لگی۔ کوئی مجھے گوبر گنیش کہتا اور کوئی مہتر کی اولاد۔ مَیں کہاں تک جھیلتا؟ کب تک روندا جاتا؟ چیونٹی بھی پلٹ کر کاٹ لیتی ہے۔ مَیں نے سوہن لال کو اُس کی زبان درازی کا مزہ چکھانا چاہا لیکن اُس نے اُلٹا مجھے چکھا دیا۔ مَیں تازہ زخم کی طرح بہتا ہُوا ٹال کے اندر داخل ہو رہا تھا کہ بھائیا جی نے مجھے دُور سے دیکھا اور بُلایا۔ وُہ سادھُو رام کے باغیچے کے پچھواڑے میں تیروں کی پھڑی لگاتے لگاتے رُک گئے تھے اور ایک بیل کی طرف اِشارہ کر رہے تھے، جو دُم اُٹھائے اچھوتر بھینچ بھینچ کر

گوبر کے آخری ذرّے خارج کر رہا تھا۔ اُن کا مطلب جان کر بھی میں انجان ہو گیا۔ وہ میری دیدہ دلیری پر بپھر گئے اور گالیاں بکتے ہُوئے میری جانب دوڑے، دوڑتے دوڑتے پیچھے مُڑے، بانس میں سے ڈنڈا کھینچ لائے اور ہاتھ اُٹھائے مجھ پر آئے۔ میرا انجام قریب آرہا تھا لیکن میرے مجرُوح جذبات کا ہٹیلا پن میرے قریب تر تھا۔ کیڑے پر پاؤں پڑنے سے وہ دوبارہ روندے جانے کے ڈر سے سُکڑ جاتا ہے یا کُنڈلی مار لیتا ہے، میں پہلے ہی ویسا ہو گیا۔ میری ہوشیاری کسی کام نہ آئی کیوں کہ میں کیڑا نہ تھا اور میرے اذیت دِہ کا رویّہ ناگاہ نہ تھا، سوچا سمجھا تھا۔ جہاں ڈنڈا پڑتا وہاں بھوکے جبڑے کی طرح نوچ لیتا۔ مار کی تیزی اور غضب ناکی نے مجھے سر نہ اُٹھانے دیا۔

بھائیا جی اپنے غُصّے میں اُس راکشش کی طرح لگتے ہوں گے جس کے بارے میں راوی کہتا ہے کہ وہ دانت نکالے اور زبان لٹکائے بچوں کا خون سُڑپتا ہے۔ میں اُن کی جُنون گرفتہ حرکات کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہُوں، کیوں کہ اذیت کی شِدّت نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں کی باڑھ میں ڈُوب کر اندھی ہو رہی تھیں اور کانوں میں چیخ نُما گالیوں کا سیسہ پگھل گیا تھا۔ میں نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ سُن سکتا تھا۔ انُہوں نے اپنی جانب سے مجھے مار کر چھوڑ دیا۔ میری سخت جانی! میں مرتے مرتے زِندہ ہو گیا۔ میں نے اپنے کُچلے ہُوئے وُجود کو دیکھا۔ نیلوں پہ آڑے ترچھے نیل پڑے ہُوئے تھے جیسے خُوں خوار سانپ آپس میں پلٹے ہُوئے ہوں۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ ظاہری چوٹ سے گُجھی چوٹ زِیادہ تکلیف دِہ تھی۔ مُجھے لگ رہا تھا کہ ہر شَے چکّر کی طرح گھوم رہی ہے۔ میں، ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول کے پاس ڈر کر چیخا اور بھاگنے کی کوشش میں گر پڑا۔ میری دھُندلائی ہُوئی نظر نے دیکھا تھا کہ ایک درخت سیدھا مُجھ پر گر رہا ہے۔

میرے بھائیا جی اُس بُوجھ کی طرح تھے جسے میں نہ اُتار کر پھینک سکتا تھا، اور نہ وہ مجھے کُچل کر میرے عذاب سے مُجھے نجات دِلاتا تھا۔

بزُدِلی کو آزار پرستی اور بہادری کو خُود رائی سے نِسبت ہے اِس لئے بزُدِل اپنی کُلفت اور بہادر اپنی جُرأت میں خوش ہوتا ہے۔ میں بہادر ہوتا تو میری آزردگی میرے دُشمنوں کی زِندگی ہوتی اور میری ہلاکت اُن کی قسمت۔

پھر بھی بہادر جِتنا سوچتا ہے حقیقتاً اُتنا کر نہیں پاتا ہے، میں تو پیدائشی بزُدِل تھا! میرے ہمدرد مُجھ سے کیا اُمید کر سکتے ہیں؟ میں گوبر اُٹھاتا رہا، اپنے ہم عصروں کی مَلامت کا نِشانہ بنتا رہا، اپنی حالت پر روتا رہا اور خُود سے نفرت کرتا رہا اور خُود نفرتی، زِندگی کی وہ بُری فِطرت ہے جو اِعتبارِ نشوو نما کو جڑ سے مار سکتی ہے۔

میرے بھائیا جی بے مِثال گھاگ اور چالاک تھے، جس دن وہ ٹال پر نہ ہوتے اُس کے دُوسرے دِن ڈھیر کی پڑتال کرتے، میری دِیانت داری پر شک گزُرتا تو کُچھ کہے سُنے بغیر ڈنڈا اُٹھا لاتے۔ وہ مار دھاڑ اور گالی گلوچ

میں ایسے بے لگام اور سنگ دِل تھے کہ انسان و حیوان میں تمیز نہ کرتے تھے۔

پیشے کے لحاظ سے رکھّا نیچ سہی، بظاہر پلیچ سہی، اُس کا چلن اونچا اور اُجلا تھا۔ میں اُس کا پیشہ ور رقیب تھا لیکن وُہ مجھ سے بیر نہ رکھتا تھا۔ اُس کی دیانت داری میں جیسی سادگی تھی اُس کا بناؤ سنگار کیا جائے تو وُہ بدصورت لگے۔ مجھے رنجیدہ پاکر وُہ مجھ سے کہتا، "گوبر اُٹھا کرنا بُرا کام نہیں ہے! دھوکا بُرا ہے! فریب بُرا ہے! چوری بُری ہے! بدخواہی بُری ہے! محنت کسی بھی قسم کی ہو! اونچی اور سانچی ہوتی ہے اور بالاتر دھن ہوتی ہے۔ آدمی کی اونچ نیچ اِس کے پیشے کے برعکس کرم، اُلکرم سے ہے۔"

تایا جی بھی یہی کہتے تھے لیکن الگ طریقے سے، "تہذیب و تمدّن کے بانی بڑھئی، موچی، جولاہے، معمار اور لوہار ہیں اور حقیقت میں یہی پانچ کارکن انسانی ترقی کے ذِمّہ دار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تاریخ نگار اِن کا ذکر نہیں کرتے اور ڈھاڑی اِن کے ساکھے نہیں گاتے۔"

مَیں اُن کی بات سُن کر مسرور ہو جاتا لیکن جُوں ہی ایسے لوگوں کی سماجی اور معاشی حالت دیکھتا، دِل پکڑ لیتا۔ رکھّے اور تایا جی کی فراست میں وُہ اعلیٰ سہی، روایت کے لحاظ سے وُہ گروں پِڑوں کے نُطفے تھے۔ مَیں اُصولوں کی حقیقت پر غور کرتا، مجھے لگتا کہ اُصول اُن لوگوں نے بنائے تھے، جو اپنی ذِلّت کو ریاکارانہ انداز سے عِزّت ثابت کرنا چاہتے تھے اور اپنی ہَٹ دھرمی سے ایسا کر بھی گئے۔ اُن سب کے سردار برہم چاریوں اور برہم کُماریوں کی رِیت چلانے والے ہیں۔ اُن کی تائید کردہ رِیت ساری دُنیا اپنا لیتی تو اِنسان کا بیج ہی گنوا دیتی۔

اِس بار مَیں نے پھر اُصول بنائے لیکن میرا جذبہ اُصول دانوں سے الگ تھا۔ مَیں اپنے عمل کا کمال دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اِنسان بُنیادی طور پر تن آسان ہے، دُشوار پسند ہوتا تو ہر کوئی صاحبِ کمال ہوتا۔ یہ اِنسان کی سہل پسندی ہی کی لعنت ہے کہ اِنسان اپنی بدبُو سے بدحواس ہے اِس نے دُوسرے کی خوشبُو سے بے بہرہ ہے۔ میرے اُصول میری تقویت نہ بن سکے۔ مَیں اُصولوں اور اُصول دانوں سے نفرت کرنے لگا، کرتا ہُوں اور کرتا رہوں گا۔ مَیں ایسا نہیں کرتا ہُوں تو مجھے اپنی سچّائی پر شک گُزرتا ہے۔ یہی وُہ حقیقت ہے جو میری زِندگی کی تاریکی میں میری روشنی رہی ہے۔ میرے اِس چلن نے میرے گِرد وُہ کھُرنڈ نہ بننے دیا جو پیپ میں گلے سڑے بھُٹوں کا انجام ہوتا ہے۔

اِس باب کی آخری سطور لکھتے ہُوئے مَیں، رکھّا رام کو نرم و نازک جذبات سے یاد کر رہا ہُوں۔ یہ جذبات اُس کے خیالوں کی تردید کی معذرت کے طور پر نہیں اُس کے اُس قرض کی وجہ سے ہیں جِسے مَیں اُس کی زِندگی میں چکا نہ سکا۔ آپ حضرات میرے انوکھے اعتراف پر حیران ہوں گے۔ بے شک! آپ کو حیران ہونا چاہئے! میری کہانی وُہ انوکھی کہانی ہے جِس کی پیش قیاسی ناممکن ہے۔ مَیں اپنے جانے پہچانے لوگوں کی نظر بچا کر گوبر اُٹھاتا، جِس دن ایسا نہ کر سکتا۔ رکھّا گوبر کے ایک دو ٹوکرے میرے ڈھیر پر ضرور پھینکتا۔ اُس کے عمل کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا اُس کی سچّائی وُہی جانتا ہو گا!

مَیں اپنے آپ سے پُوچھتا ہُوں، کیا وُہ میرے انجام سے ڈر کر میرے ساتھ ہمدردی جتاتا تھا؟ یا اپنے وعدے کا احترام کرتا تھا جو اُس نے مجھ سے پچیس لے کر کیا تھا۔

باب ۲۸

کانٹوں کے ساتھ ساتھ ہیں چھالے بھی ہم سفر
دشتِ جنونِ شوق میں تنہا نہیں ہُوں مَیں (شاطر)

میری زندگی کہیں فکر و کردار ہے اور کہیں سماجی چھلاووں کی یلغار ہے، کبھی آزادیِ کون و مکان ہے اور کبھی قیدِ ناموسِ جہاں ہے، گاہے صبر و خامشی کا پیام ہے اور گاہے لپکتا ہُوا شعلۂ تمام ہے۔ مَیں حیران و پریشاں دو متضاد طاقتوں میں گھرا ہُوا گو، مگو کے جذبے میں اسیر ہُوں۔

میری ماں کہتی تھی، "ایک چُپ سو باتوں سے بھلی ہے۔"

تو کیا میں خاموش ہو جاؤں؟ وُہ قلم جسے نیرنگیِ حالات نے سچ لکھنے کی جُرأت دی ہے اُسے سماجی دقار کی بھٹی میں جلا دُوں؟ اُن کاغذوں کو تلف کر دُوں جنہیں مَیں نے خُونِ جگر سے لکھا ہے؟ ہائے! مَیں کیا کروں؟

مَیں کسمپرسی کے عالم میں قلم پھینکتا ہُوں، روتا ہُوں، چیختا ہُوں، سینہ کوٹتا ہُوں اور سسکیاں لیتا ہُوا ناکارہ سا بستر پر ڈھے پڑتا ہُوں۔ جمود کی مرگ آسائی میں میرا دم گھُٹتا ہے اور مَیں ہیجان میں مُبتلا ہو جاتا ہُوں۔ یہ جاں کاہ عذاب جھیل کر میں جیسے تیسے سنبھلتا ہُوں، جذبۂ تخلیق سے تلملاتا اور تڑپتا ہُوں، لیکن اپنی طبع رواں کو روکتا ہُوں، میرے درونِ ضمیر سے آواز آتی ہے کہ زندگی کی اصل، حقیقت ہے! تو اپنی حقیقت لکھ اور بے دریغ لکھ! چھوٹی سے چھوٹی حقیقت، بڑے سے بڑے جھوٹ سے بڑی ہوتی ہے کیوں کہ اس کی اہمیت تاریکی میں روشنی کی سی ہوتی ہے۔

میں اس انکشاف پر غور کرتا ہُوں۔ میری رگیں خود افروزی کی حقیقت سے تھرکتی ہیں اور مجھ تک یہ پیغام پُہنچاتی ہیں جسے مَیں دروغ کی وحشت انگیزی میں سُن نہ سکا تھا، "تُو اُجالے کا ایسا آفتاب ہے جو صدیوں میں طلُوع ہوتا ہے۔" ہاں قارئین! میں اُجالے کا نرالا آفتاب ہُوں۔ میرا دُوسرا نام، قلم ہے اور روشنائی، میرا نُور۔ مَیں اپنے نُور میں انسان کی ریاکاری کا اندھیرا غرق کر کے ہی رہُوں گا تاکہ آپ اِس کی حقیقت دیکھ سکیں۔

مجھ میں جدت طرازی کا تخم تھا، وُہ اِس لئے نہ پنپ سکا کہ کیا اپنے اور کیا پرائے، میری آزادہ روی میں اپنی شکست دیکھتے۔ میں کہیں اپنی تخلیقی قابلیت کا مظاہرہ کرتا، میرے وجدان و رُجحان اِس بے رحمی سے کچل دیے جاتے کہ میرے دُکھ دینے والے مجھ میں تڑپنے اور سسکنے کی سکت تک نہ چھوڑتے۔ مجھ میں تصویر کشی کی صلاحیت تھی جسے اُبھارنے

کے لئے مَیں نے ایک نوٹ بُک الگ رکھ لی۔ مَیں مویشی چَراتے جاتا، فِطرت کا مُطالعہ کرتا، کوئی نظر آفریں مَنظر چُنتا اَور اُس کی تَصوِیر آ۔ اتا۔ میری بَدقسمتی! ذلیل میری پُشت پر ہی سَوار رہتی تھی۔ میرا کام درشن سِنگھ کی نظر پڑ گیا۔ پھر کیا تھا! جو حال میرے کام کا ہُوا، وُہی میرا لیکن مَیں اپنے لچکدار اَعضا کی وجہ سے بچ رہا۔ وہاں پڑھنے کا ماحول تھا اَور نہ ہی فرصت، سکوُل میں جو پڑھ لیا سو پڑھ لیا۔ بھائیا جی میرے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی بھونکتے اَور میرے کتاب نہ چھوڑنے پر مُجھے کاٹ کھاتے۔ مَیں ڈیک کے نیچے چارپائی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا بھینس گوبر کر کے روندنے لگی۔

بھائیا جی وہیں کھڑے تھے، بولے، "اُٹھو، گوبر اُٹھاؤ!"

اُن کی غیر ضروری مُداخلت مُجھے بُری لگی کیوں کہ وُہ کام وُہ خُود کر سکتے تھے۔ مَیں نے جو محسُوس کیا، کہہ دیا۔ اُنھوں نے گوبر ہٹانے کے لئے پھاوڑا اُٹھایا، مَیں اپنے اِنکار کی کارگری پر خُوش ہُوا لیکن میری خُوشی کا وَقفہ عارضی نِکلا۔ اُن کا دِل تاریک گڑھا تھا جِس کی تہ میں جھانکنا ناممکن ہوتا ہے۔ وُہ پھاوڑا اُٹھائے مُجھ پر آئے، اپنا سر نِشانہ ہوتے دیکھ کر مَیں نے پَلٹی ماری لیکن پِنڈلی زد میں آ گئی۔ میری چیخ کے ساتھ میری زبان بھی باہر نِکلی جیسے وُہ اُسے اُڑا لے جا رہی ہو۔ مَیں تڑپ کر نیچے گرا اَور سر زمین پر پٹکنے لگا۔ دُوسرا وار منڈلاتے دیکھ کر مَیں ہانپتے اَور کانپتے ہُوئے اُن کے پیروں پر گرا اَور پُوری مَغلوبیت سے پُکارا، "اُٹھتا ہُوں! ابھی اُٹھتا ہُوں! ہائے ماں مر گیا، ابھی اُٹھتا ہُوں!"

"تو کیوں اُٹھے گا؟ آرام سے بیٹھ! یہ کنجر، نوکر ہے ناں! یہ کما کر لائے گا اَور تُجھے آنڈو بیل کی طرح ناند پر باندھ کر کھلائے گا۔"

وُہ پھاوڑا پھینک کر مُونچھیں سَنوارنے لگے جیسے اپنے کئے کی داد آپنے آپ سے لے رہے ہوں۔

مَیں پھاوڑا اُٹھانے کے لئے اُٹھا۔ میری ملعُون ٹانگ نے میرا بوجھ نہ لیا اَور مَیں ڈھے پڑا۔ ~~بَر رینگ کر پھاوڑے تک پہنچا۔~~ مُجھے بالکل پامال دیکھ کر اُن کی خُون آشام آنکھوں سے اِطمینان جھلکنے لگا۔ اپنی لازوال حقارت میں لپٹے ہُوئے وُہ مُجھے یُوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی خطرناک کیڑے کو کُچل کر اُس کے وُجُود کا مَقصد تلاش کرے۔ میری ماں بھاگتی بھاگتی دالان تک آئی اَور چوکھٹ کے اُدھر رُک گئی جیسے وہاں پہنچ کر اُس کی ساری طاقت سَلب ہو گئی ہو۔ وُہ حد، اُس کے لئے سَدِ سکندری تھی۔ اُس کے پار سے وُہ خُوں خرابوں کو ایسے دیکھتی تھی جیسے اپنی بےچارگی پر تُہمت طراز ہو۔ مَظلُوم مَعصُومیت کی بےبسی دیدنی ہوتی ہے کیوں کہ یہ اپنی سلامتی کے جتن سے عاری ہوتی ہے اَور بالکل ظالم کے رحم وکرم پر جیتی ہے۔ مَیں نے پھاوڑا اُٹھایا، اُس کی ٹیک لے کر اُٹھا، چلا، آہستہ آہستہ گوبر ہٹایا اَور اپنے ہی بوجھ سے ڈھیر ہو گیا۔ پِنڈلی سے نِکلتا ہُوا خُون ٹخنے تک پہنچ گیا تھا اَور درد لہرا لہرا کر اُٹھتا تھا، جیسے پھاوڑے کا پھال، ہڈی کے اَندر ٹُوٹ گیا ہو اَور اُچھل اُچھل کر باہر نِکلنے کی کوشش کرتا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے پِنڈلی سُوج کر ران کے برابر ہو گئی اَور زخم، خُون کی گاڑھی پرت کے نیچے چُھپ گیا۔

"مکتی، نروان!"
"کس چیز سے مکتی؟"
"جنم مرن سے!"

"نہیں، سنت جی مہاراج! گوتم نے اِس شنکا (گمان) سے مکتی پائی کہ 'کرتا' ہی 'کرتار' ہے۔ اپنے گیان کا وگیانک ثبوت ملتے ہی وہ خوشی سے چلایا، بُدّھم سرنم گچھّامی! ارتھ ہے کہ میں بدھ کی، یعنی اپنی پناہ لیتا ہوں۔ انسانی زندگی کا مقصود اپنے کرم سے ہے نہ کہ طاعت و عبادت سے! اُس نے دنیا کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے کیسی کھری بات کہی ہے، اپنے گرو کی بات پر بھی بھروسا نہ کرو جب تک اُس کی سچائی نہ پرکھ لو۔"

"آپ ناستک ہیں۔ آپ سے بات کرنا پاپ ہے۔" سنت نے حقارت سے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

تایا جی نے اُسے تحقیق آمیز نظر سے دیکھا اور پھر خود کو جیسے اسُر اور سُر میں فرق کر رہے ہوں۔

وہ کہتے تھے کہ سب سنت مہاتما اپنے اپنے انداز میں مجرم ہیں لیکن جس جرم میں یہ سب شریک ہیں، وہ ہے بیکاری، جسے جائز بتانے کے لیے یہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور جو انھیں جھٹلاتا ہے اُس پر ناستک کی تہمت لگا کر اُسے اپنے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ اِن کا شیوہ چچڑیوں کا سا ہے جن کا نشانہ گرم خون ہوتا ہے۔

تایا جی کے خیال سے کسی نے کس خوبی سے مضمون لڑایا ہے،

چیلا لائے مانگ کر بیٹھ کے کھائے مہنت
رام بھجن کا نام ہے، پیٹ بھرن کا پنتھ

حالاں کہ وہ دھارمک کتابوں میں سے اُدھارن (مثال) دیتے تھے لیکن اُن کا جاپ کرنے کو حماقت سمجھتے تھے۔ "جو آدمی الفاظ پڑھتا ہے اور اُن پر عمل کرتا ہے وہی اُن کے معنی سمجھتا ہے۔ جو کوئی الفاظ جپتا ہے اُسے اُن کے معنی کا احساس نہیں ہوتا۔ الفاظ، اوزار ہیں۔ جیسے کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق کے نقوش سنوارنے کے لیے اوزار بار بار تیز کرتا ہے، نئے اوزار ایجاد کرتا ہے اُسی طرح عامل اپنے لفظوں کے معنی بار بار پرکھتا ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا ہے، وہ خرافات کا پجاری ہے۔ ذہن ایک گھر کی طرح ہے۔ جیسے گھر کو شستہ و رفتہ رکھنے کے لیے اُسے گندی سڑی چیزوں سے پاک رکھنا پڑتا ہے اُسی طرح مخلص زندگی گزارنے کے لیے ذہن کا اجیالا لازم ہے جو مطمحِ نظر کی تازگی سے ملتا ہے

شکاری کی خوبی ہے کہ وہ شکار کو فتراک میں رکھ کر اُس کے بارے میں بھول جاتا ہے اور نئے شکار کی فکر کرتا ہے۔ وُہی نہاد میرے بھایا جی کی تھی اور وہ اُسی نہج سے سوچتے تھے۔ وہ مقامِ حادثہ پر اُتنی ہی دیر رُکتے تھے جتنی دیر حادثے کو اُن کی ضرورت ہوتی تھی۔

میری ماں، کاندھے کا سہارا دے کر مجھے رسوئی میں لائی، پانی گرم کر کے اُس میں نمک ملائی، جما ہُوا خُون، رُوئی کے پُنبوں میں گھُلائی۔ زخم نے ننگا ہو کر پھر مُنہ کھول لیا اور تازہ کٹے بکرے کی گردن کی طرح بہنے لگا۔ ایسے کتنے زخم ہیں جو میرے جسم پر بھُولی بسری قتل گاہوں کی طرح موجُود ہیں۔ مَیں انہیں دیکھتا ہُوں تو اُن سے منسوب خُوں ریزیوں کو یاد کرتا ہُوں اور پھر اُسی جان لیوا تکلیف سے گزرتا ہُوں جو اُن کی سرشت ہے۔ میرا دل، اُس نے کی طرح ہے، جس کی تقدیر، نوحے ہوں۔ ماں زخم کو لوگڑے (گُودڑ) سے سینکتی، اُس پر نیم اور ہلدی کی پٹی باندھتی اور مجھے نیم کا بھرتا کھلاتی۔ مَیں کتنے دن تک لاٹھی ٹیک کر چلتا رہا۔

قارئین، زخم کی تقدیر، زخم ہے! اس کی فضیلت درد ہے اور زندگی، تازگی، یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے لاکھ بچائے، یہ چوٹ کھاتا ہے اور تازہ رہنے کی پُوری کوشش کرتا ہے۔

کھیتی باڑی کے کام میں زخم بھرتے بھرتے کریدا جاتا۔ اوّل تو انگور نہ بندھتا، بندھتا تو اُس کے نیچے زخم کھولتا جیسے اپنی شفا کے غم میں کُڑھتا ہو۔ اُس کا رویّہ بے چینی کی کیفیت پیدا کرتا جسے مارنے کے لئے مَیں اسے کھجلاتا کھجلاہٹ کی لذّت! کھجلاتے کھجلاتے انگور پھٹ جاتا۔ میری نفسیاتی کمزوری، زخم کی نفسیاتی توانائی بن گئی اور اُس کی زندگی بڑھا گئی۔ حالات کی ہم آہنگی اور ہڈّی کا زخم ٹھیک ہوتے ہوتے کئی مہینے لگ گئے۔ میری وُہ مظلوم یاد، میرے دل اور پنڈلی پر بیک وقت موجُود ہے۔ مَیں نے اُسے ابھی ابھی چھُوا ہے اور اُس میں وہی درد محسُوس کیا ہے جو اُس کے تعینِ آغاز میں تھا۔

ایسے صبر شکن اور عناصر فگن حادثوں کا شکار ہو کر مَیں جذبات کی عمیق ترین پستی میں ڈُوب جاتا۔ میری یاس پسندی! مَیں اندھیروں سے محبّت کرتا اور اُجالوں سے نفرت اور اپنی فرسودگی میں ہر شے کو اپنی ہی طرح ذلیل دیکھنا چاہتا۔ میری نامردی! مَیں کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ مَیں اپنی بے بسی پر برہم ہوتا اور انتقام جُوئی کی کیفیت میں سینہ کوبی کرتا اور کئی بار خُود کو مجرُوح کر لیتا۔

مَیں سکُول کی فیس مانگنے پر معتوب ہُوا۔ مَیں گھر سے سکُول کے لئے نکلا لیکن راستہ بدل کر جھاڑ میں چھُپ گیا۔ مَیں اس جھاڑی کے نیچے بیٹھتا، اُس کے پاس کھڑا ہوتا اور شاخوں سے پتّے نوچ کر دُور پھینکتا۔ وہ دُور گرنے کے بجائے میرے ہی اطراف بکھر جاتے جیسے مجھے میری کم مائیگی کی یاد دلاتے۔ اُن کا بکھراپن مجھے اچھا نہ لگتا اور مَیں گھبرا کر کسی لطیف جذبے میں پناہ لینے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا۔ میرا دل آسیب زدہ گھر تھا جہاں مَیں پلید ذہنوں

میں گھرا اور سکڑا بیٹھا تھا۔ کب سورج سر پر آیا، کب سایہ ڈھلا، کب جھٹ پٹا ہوا، میں نے دیکھ کر نہ دیکھا۔ نہ مجھے بھوک لگی اور نہ ہی پیاس۔ میرے زندہ ہونے کی کوئی دلیل تھی تو وہ میری سانس تھی جو حلق میں سے کھردرے ڈھیلے کی طرح گزرتی ہوئی اُسے کھرونچ رہی تھی۔ میرا دماغ بجھا ہوا کوئلہ تھا جس کے اندر اور باہر یکساں اندھیرا ہوتا ہے۔ میری آنکھوں میں دھندلی سی روشنی تھی، اُس نے میری رہنمائی کی اور مجھے کراڑے پر لے گئی۔ کراڑے کی پاتال سی گہرائی نے مجھے پکارا جیسے اُسے میرا غم معلوم ہو، "دیکھتے کیا ہو؟ آؤ آؤ اپنی مظلومیت ختم کرو!"

وہ بلاوا میری آنکھوں نے سُنا اور سُن کر مجھے سُنایا جیسے مجھ بزدل کا حوصلہ بندھایا، "چلو، ہم تمہارے ساتھ ہیں! ہم نے تم سے کم عذاب نہیں جھیلے ہیں!"

میں نے آنکھوں کے ساتھ مل کر پاتال میں دیکھا۔ اُس میں پُراسرار کشش تھی جیسے اُسے میری مدد کرنا منظور ہو۔ اُس کی ناموس خاموشی اُس کی سنجیدگی کی ضمانت تھی۔ مجھے ضعیف الارادہ پا کر وہ اوپر اُٹھ آیا، میری طرف آگے بڑھا جیسے آفتِ ناگہانی میں ایک دوست دوسرے کو سنبھالتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ جائے اماں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے جھٹکا لگا، میرا سارا اُبال جاتا رہا اور میں کانپتا ہوا پاؤں پر دھنس گیا۔ دل یوں دھڑکا گویا رُک کر چلا ہو۔ میں پسینے میں نہا گیا۔ میرا احساسِ حیات لوٹ آیا۔ مجھے پاتال سے ڈر لگا۔ میں رینگ کر پیچھے ہٹا، مڑا اور اپنے سامنے تایا سُندر سنگھ کو کھڑے دیکھا۔ میں انہیں خیرہ سا تکنے لگا اور وہ مجھے حیران سے جیسے کر میں اُن کا جانا پہچانا گیان سنگھ نہیں کوئی دوسرا تھا۔

ہاں قارئین، ماس اور ہڈیوں کا ڈھانچہ، انسان نہیں ہوتا۔ وہ تعمیرِ نفس کا عزم ہے، جو اِس کے لئے کوئی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔

حالاں کہ میں صبح سے بیکار تھا، میرا سارا جسم تکان سے شل تھا۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا 'بھاگ دی ابی' کے پاس سے پہڈوں پر پاؤں جماتا ہوا آب جو میں اُترا۔ اُجل جل میں پاؤں بھیگتے ہی رگوں میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں ذرا آگے بڑھا، وہی مغنی کے الاپ سا بہتا ہوا پانی، چھوٹے چھوٹے بجروں سی تیرتی مُرغابیاں، سنگِ مرمر کی مورتیں، بگلے، پر تولتی، پر سکیڑتی، گرتی، ڈوبتی، ابھرتی، اُڑتی رام چڑیا، چوکس ٹیٹریاں، رس پیتی تتلیاں، تیرتی کھیلتی مچھلیاں، چھپڑ چھپاک بھاگتے مینڈک، ایک دوسرے کے تعاقب میں نست ڈریگن فلائیز، سبزۂ نوخیز کے سامنے اپنی بزرگی پر اِتراتے ڈاب کے سِٹے اور اُن سب کو حساب کی رُو سے جھٹلاتا اور زندگی کی تکونی ماہیت جتلاتا ڈیلا (ڈاب اور ڈیلا گھاس ہیں جو پانی میں یا پانی کے کنارے اُگتے ہیں۔)..... تاحدِ نظر حُسن و جمالِ حیات اپنی تقدیسِ آزادی پر نازاں تھا۔ میری طرح ہر شے اپنے طور پر کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی لیکن طائفہ فطرت میں اُس کا وجود نہایت مزین اور معین تھا۔

میں سوتی پر بیٹھا ترل ریت سے دانت مانج رہا تھا کہ میں نے کیکر کے پھول، پانی میں بہتے آتے دیکھے۔

وہاں سے کچھ دُور اُدھر کیکر کا پیڑ پانی پر جھکا ہُوا تھا۔ جسے مَیں جاتے آتے کئی بار دیکھ چُکا تھا لیکن اُس وقت وہ مجھے نئی دریافت کی طرح لگا۔ مَیں نے گہری کلّیاں کیں، ہاتھ منہ دھویا اور اُدھر چل پڑا۔ کیکر، بیّوں کے گھونسلوں سے بھرا پڑا تھا۔ مَیں نے ایک گھونسلہ حاصل کرنا چاہا۔ مَیں نے بن سُوٹی کا لمبا سونٹا توڑا اور اُس سے ایک گھونسلے پر وار کیا۔ گھونسلہ تھوڑا اُونچا تھا، میرا وار خالی گیا۔ مَیں نے دُوسرا وار اُچھل کر کیا۔ میرا نشانہ ٹھیک لگا لیکن گھونسلہ جُھول کر ثابت رہ گیا۔ پیڑ پر چوں چراک شروع ہوئی اور شور میں بدل گئی۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ کس زاویے سے وار کرنا کارگر ہوگا؟ اتنے میں بئے شور مچاتے گھونسلے کے گرد اور میرے سر پر منڈلانے لگے۔ مجھے لگا کہ بئے مجھ سے لڑنا چاہتے ہیں لیکن کمزور ہونے کی وجہ سے بے بس ہیں۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی مَیں نے چھڑی پھینک دی اور وہاں سے کچھ پرے ایک جزیرہ نُما اُونچے استھان پر جاکر بیٹھ گیا اور بیّوں کو دیکھنے لگا۔ جُوں ہی خطرہ ٹلا، وہ بکھرتے بکھرتے بکھر گئے اور اپنے اپنے کام میں جُٹ گئے۔ اُن کی محویت میری رغبت بن گئی۔ اُن کی چونچوں میں پیشہ ور ہاتھوں کی سی مہارت تھی اور نفاست بھی۔ بیا کھیتوں میں سے گھاس کا لمبا اور پتلا چیرلاتا اور اُسے گھونسلے میں بُنتا۔ بئی اُس کے آس پاس چہکتی، پھدکتی اور شاخ پر جھولا جھولتی جیسے وہ بئے کے کام کا مُعائنہ ہنستی کھیلتی کرتی ہو۔ بیا جتنا خاموش، مُخلص اور محنتی تھا، بئی اُتنی ہی باتونی اور نکمی تھی۔ بیا نیا چیرلانے کے لئے پر تولتا، بئی کے چہچہانے کا انداز نئی ترنگ اختیار کرلیتا۔ وہ بئے کو یہ تاکید کرتی لگتی۔

چیر سوہنا چہا لیائیں
گھر پریت ناں بنائیں

(کوئی خوبصورت سا چیر توڑ کر لانا اور اُسے پریت سے گھونسلے میں بُننا)

ٹھنڈی نرم ہریالی اپنی آسودگی میں رس برسا رہی تھی اور میری تنگ دلی کو کشادگی عطا فرما رہی تھی اور میرے تصوّر کو بہکا رہی تھی۔ وہ اُفق پر بدلتے ہُوئے رنگ ہیں یا عرُوسِ فطرت محوِ خود آرائی ہے! مَیں نے سوچا، "یہ اچھی بات ہے کہ مَیں حیات ہُوں۔" مَیں لطافت کی رو میں بہہ کر اپنا غم بھول گیا اور ان دو بے زبانوں کے انوکھے رشتے کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اُسے خاموشی سے سراہنے لگا۔ مَیں نے بئی کی قسمت پر رشک کیا، جس کی خاطر بیا اپنی ذاتی ضرورتیں تیاگ کر تن دہی سے کام کرتا تھا۔ مجھے اپنی ماں کا خیال آیا۔ وہ غریب، بھایا جی کی اطاعتوں اور خدمت گزاریوں کا صلہ، ملامتوں میں پاتی تھی۔ قابلِ رحم تھی میری ماں! مَیں اُسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہوگیا اور گھر جانے کے لئے اُٹھا۔ چند قدم جاکر مَیں نے پیچھے مُڑکر بئے کو ست بھاؤ سے دیکھا اور جو دیکھا وہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ بیا اپنی چونچ میں کوئی ٹمٹماتی ہُوئی چیز پکڑے ہُوئے تھا۔ میرے سارے احساس مرکزِ توجہ بن گئے۔ مَیں نے اُسے پہچانا، وہ جگنو تھا جسے وہ گھونسلے میں محفوظ کر رہا تھا۔ مَیں اُس بے زبان کی جدتِ طرازِ فطرت پر حیران ہُوا۔ اپنی شریکِ حیات کا دل لُبھانے کے لئے بیا جیسی فضا تراش رہا تھا، وہ انسانی رشتوں میں ناپید ہے۔ اس نرالے انکشاف کی جدت اور سادہ منظر کی نفاست، مستی بن کر رگ و پے میں دوڑ گئی

میری تازہ کیفیت اُس جھونکے کی سی تھی جو تپتے ریگستان سے یکایک نخلستان میں پہنچ جائے۔ میں نے ماں سے بئے کی بات کہی لیکن میری دریافت میری خوشی کا باعث نہ ہوئی۔ اُسے وہ راز پہلے ہی معلوم تھا۔ مزید براں اُس نے مجھے بیئوں کے بارے میں ایسی حیرت انگیز حقیقت بتائی جس کی تصدیق پرندوں کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ "بئی کو گھونسلہ پسند نہ آئے تو وہ اُسے توڑ پھوڑ کر گرا دیتی ہے اور بئے کو نیا گھونسلہ بنانے پر مجبور کرتی ہے۔"

اُس رات میں فطرت کے پُر اسرار اعجازوں پر غور کرتا ہوا بستر پر لیٹا اور آسمان کے جلوۂ بے حجاب کا نظارہ کرنے لگا۔ ستارے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے قوّتِ نامیہ سے تڑپ رہے ہوں۔ چاند کے حُسنِ سفر میں دعوتِ سفر تھی۔ اُس کے راستے میں بادل کا کوئی ٹکڑا حائل ہوتا تو اُس کا شوقِ سفر، جوشِ سفر میں بدل جاتا۔ وہ اُس کا سینہ چیر کر آگے نکل جاتا اور پھر وہی سُبک خرامی اختیار کر لیتا جس کا وہ متوالا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتا۔ "زندگی کے بارے میں مجھے ایسا زاویۂ نظر بنانا چاہیئے جو چاند کے عملی رجحان کی نمائندگی کرتا ہو۔"

باب ۲۹

درد، گریہ، فغاں، خلش، افسوس
شاخِ احساس کیسے پھلتی ہے! (شاطر)

میں ایسے لوگوں کا اٹوٹ حصّہ تھا، جہاں مصروفیت کی دلآویزی تھی یا بیکاری کی فتنہ پردازی۔ آدمی کی ڈھنکی چھپی درندگی کئی طرح سے نمایاں تھی۔

"مالک سیاں! اس سال فصل دھوکا دے گئی ورنہ سنتوکھے کا کام تمام کر دیا ہوتا!"

اور کسان کو جس کمائی پر بھروسا ہے اُس کی عدم یقینی کہاوت ہے،

لگی کھیتی دیکھ کے گربھ کرے کرسان
جھکڑ جھولا سامنے گھر آئے تاں جان

(کسان بھرے پُرے کھیتوں کو دیکھ کر ناز کرتا ہے اور گھمنڈی ہوا جاتا ہے۔ لیکن جب تک کھیتی گھر نہ آئے کون جانے کیا گزر جائے؟)

میں جگدیو سنگھ کو بُلانے کے لئے اُس کے گھر گیا، وہاں سے پتا چلا کہ وہ حویلی میں رسّا بٹ رہا ہے۔ رسّا اندر رکھ کر وہ تالا ڈھونڈنے لگا، تالا نہ ملا، دروازے کا کُنڈا ویسے ہی چڑھا کر میرے ساتھ ہو لیا اور خود بر طعن کیا، "ہم کسان کیسے مورکھ ہیں! گھروں کو تالے لگاتے ہیں جب کہ ہماری ساری پونجی کھیتوں میں کھلی پڑی رہتی ہے۔"

کسان فطرت پروردہ ہیں اور فطرت سچ کی علم بردار ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی برمحل بات، نقطہ بہ نقطہ دست آویز ہوتی ہے۔ یہ دست آویز انوکھی دست آویز ہے! اُن کے بزرگوں سے اُن تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہے۔ اِس کہاوت کی صداقت پر کون اُنگلی اُٹھا سکتا ہے!

کنک، کماد ی سنگھنی، ڈانگو ڈانگ کپا
گھُمدا پھردا مکئی دے وِچوں دی لنگ جا

(گندم اور ایکھ گھنا بونا چاہیئے اور کپاس لاٹھی کی دُوری پر۔ مکئی بوتے وقت یہ
خیال رہے کہ اُس کے کھیت میں آسانی سے گھوما پھرا جا سکے)

قارئین! کام تنقیحِ فسادِ رُوح ہے۔ آدمی کی زندگی کا رِشتہ اور کار زائیدہ نہ ہوتی تو یہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکتا۔ اِس کی ہر تلخی اور ہر محرُومی کا اِزالہ کام ہے اور ہر فرار کی پناہ بھی کام۔ جو آدمی زندگی کے اِس فلسفے کو نہیں سمجھتا، وُہ شہرِ حیات کا ناکارہ، مکروہ اور آفت زدہ باشندہ ہے۔ بھائیا جی کی روندی ہُوئی، میری ماں اُٹھتی اور روتی ہُوئی کسی کام میں لگ جاتی۔ اُس کے توڑے مروڑے اعضا رفتہ رفتہ زندگی سے تھرکنے لگتے جیسے کملائے ہُوئے پودے پانی ملنے سے لہلہانے لگتے ہیں۔ وُہ اپنے دُکھ میں چکّی پیستی ہُوئی گاتی تو اُس کے لفظوں کا درد بہت نازک اور معصوم ہوتا۔ جن دنوں اُسے میرے ماما اور میری بھابی کا سوگ تھا، اُس کے گیتوں کا سوز و گداز الگ ہی تھا۔ لگتا تھا کہ وُہ دانوں کی جگہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پیس رہی ہے۔

دُنیا تیرا باگ بکیجہ تُوں باگاں دا مالی
کچّے پکّے دی سار نہ جانیں توڑ گنوائیں ڈالی

(اے خدا! دُنیا تیرا باغ ہے اور تُو ہی اِس باغ کا مالی ہے۔ لیکن تُو کیسا مالی ہے! تجھے
کچّے اور پکّے پھل میں تمیز ہی نہیں ہے اور جسے جب چاہے شاخ سے توڑ کر ضائع کر دیتا ہے)

بھائیاں باج نہ سوہندیاں بھیناں بندھ اڈیکاں کھڑیاں
پُتراں باج نہ سوہندیاں ماواں، بھاویں لکھاں دولت بھریاں

(بھائیوں کے بغیر بہنیں سوہنی نہیں لگتی ہیں، وُہ اُن کے اِنتظار میں اُن کی راہ دیکھتی ہیں۔
پُتروں کے بغیر مائیں سوہنی نہیں لگتی ہیں، بے شک اُن کے لاکھوں خزانے کیوں نہ ہوں)

تایا جی کے پیٹ میں رسولی تھی جس کے درد کا اُتار چڑھاؤ اُن کی زندگی کا سانجھ سویرا تھا۔ درد کے سخت مراحل میں وُہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے، کوئی قریب ہوتا، اُس سے پیٹ دبواتے ورنہ پیٹ باندھ کر کسی کام میں لگ جاتے۔ اوّل اوّل وُہ غم کا شگوفہ لگتے پھر کھلتے کھلتے پھول کی طرح کھِل اُٹھتے۔ قارئین! جیسے نشیب سے فراز شرُوع

ہوتا ہے اسی طرح دُکھ سے سکھ۔ فرق یہ ہے کہ نشیب کو فراز سے راستہ ملتا ہے اور دُکھ سے سکھ کو کام۔

ورناکیولر فائنل کا امتحان سر پر تھا اور کورس ختم نہ ہوا تھا اس لئے جمعیت سنگھ اور چانن سنگھ راتوں کو پڑھانے لگے۔ مجھے سکول میں رہنے کی اجازت تب ملی جب جمعیت سنگھ شخصی طور پر بھایا جی سے ملے اور ان پر اس مخصوص پڑھائی کی اہمیت جتائی۔ موقع کا لحاظ کرتے ہوئے ماں نے مجھے نیا بستر دیا۔ میں اتنا خوش ہوا کہ میری خوشی ہزار داستان کی سی تھی۔ یہ اس لئے کہ ماں جو نیا بستر بناتی تھی اُسے مہمانوں کے لئے اٹھا رکھتی تھی، تھوڑے پرانے بستر بڑوں کو ملتے تھے اور بڑوں کے مسلے ہوئے بستر چھوٹوں کو۔ یہ ذلت آمیز تقسیم میرے حق میں عذاب تھی۔ کسی کو نیا بستر ملتا میرے پرانے بستر میں کانٹے اُگ آتے جو کروٹ کروٹ جسم میں اُترتے اور رگوں سے ہوتے ہوئے حلق میں پہنچ کر پھانس بن جاتے۔ میں اپنے غم میں سانس لیتا گویا آہ بھرتا۔ میرا احساس مجھے پستی روح کے اس اندھیرے غار میں لے جا گراتا جس کا باب داخلہ تھا، باب رخصت نہ تھا۔ میں ان مہمانوں پر رشک کرتا جن کے نئے ماں دھوپ جیسے اُجلے بستر بچھاتی تھی۔ کتنے مہمان غلیظ اور گنوار ہوتے تھے، لیکن مہمان تو مہمان ہیں۔ وہ اپنے بوائیوں بھرے اور گوکھرو لدے پاؤں بستر پہ رکھتے اور ایک ہی کروٹ میں اس کی حالت ایسی کر دیتے جیسے بھینس دلدل سے نکل کر ہرے بھرے کھیت میں لوٹ جائے۔ میرا نیا بستر، میرے دل میں عمدہ جذبات جگا رہا تھا جو میری محرومی کی حالت میں نہ جانے کہاں سوئے رہتے تھے۔ میرا جذباتی اور نفیس ضمیر میری زندگی کی مصیبت اور طبیعت کی وحشت رہا ہے۔ اس نے مجھے جس طرح لرزاں و خیزاں رکھا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کبڑے آم کے ادھر ہی تھا کہ ایک دھماکہ ہوا اور میرے خیال کی رنگینی حقیقت کی سنگینی سے ٹکرا گئی۔ میں اپنے بھایا جی کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنے سوال کا جواب سنتے ہی ان کا منہ جُلاب لگے چوتڑوں کی طرح پھٹ پڑا اور میں اس گھناؤنی گند میں گھر گیا جس کی گھٹن پھندے سے عبارت ہو۔ میں اُلٹے پاؤں گھر لوٹا۔ میرے پاؤں بوجھل پہاڑ تھے اور اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ حسین خیالوں کی طرح ہلکا پھلکا بستر سر پر بھاری پتھر لگتا تھا۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچا۔ چونکہ بھایا جی سائیکل پر تھے، وہ مجھ سے پہلے پہنچ گئے تھے اور ماں پر لعنت ملامت بن کر برس رہے تھے۔ ان کے نفس غلیظ کی تسلی کے لئے ماں نے مجھے وہی بستر دیا جو میری کم نصیبی کا ساتھی تھا۔ سکول میں ہوسٹل اور چارپائیوں کا انتظام نہ تھا۔ رات کو کلاس روم ہی میں ٹاٹوں پر بستر بچھائے جاتے تھے اور سویرے تہ کر کے برآمدے میں جما دیئے جاتے تھے۔ میرے سوائے سب کے پاس نئے بستر تھے۔ میرے بستر پر کوئی بستر نہ رکھتا، وہ ایک طرف پڑا رہتا جیسے رسوئی میں جھوٹا برتن۔

جمعیت سنگھ کا گاؤں بھیکھو وال پاس ہی پکی سڑک پر تھا، وہ پڑھا کر گھر چلے جاتے۔ چانن سنگھ کا گاؤں ڈتے وال کچی سڑک پر تھا اور دور بھی، وہ پڑھا کر وہیں سو رہتے۔ سکول میں رہتے ہوئے چند دن نہ گزرے تھے کہ میرے بُرے نصیب آدھمکے۔ ایک رات جمعیت سنگھ کی باری تھی۔ ان کے جاتے ہی فانوس بجھا اور میں سو گیا۔ میں ابھی کچی نیند

میں تھا کہ کوئی میری رزائی میں گھس آیا۔ میں نے اُسے روکا، وہ رواداری سے کام لینے کی ترغیب دینے لگا۔ میں نے اُسے پہچان لیا، وہ نیچ سوہن سنگھ تھا۔ اُس سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے میں نے شور مچایا لیکن کمرے میں ایسا سکوت رہا جیسے ہر سونے والے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے منگت رام کو آواز دی۔ اُس نے آ کر دروازہ پیٹا لیکن کسی نے نہ کھولا۔ دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑا۔ اسی اثنا سوہن سنگھ مجھے دھکا دے کر بھاگ گیا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کے بارے میں جھجک اور سندیہ کی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے منگت رام سے ساری بات کہہ دی۔ اُس نے دِیا جلایا اور ہر کسی کو ٹھوکر مار کر جگایا۔ ہر کوئی ایسے اُٹھا جیسے محوِ خوابِ خرگوش ہو۔ اُس نے اُن سب کو گالیوں پہ دھر لیا، اُس لمپٹ کو گھسیٹ کر باہر لے گیا اور اُسے مار پیٹ کر رسوئی میں بند کر دیا۔ اُس شرمناک اور افواہ طراز حادثے کے بعد نیند کسے آتی، میری بدحواسیوں اور دوسروں کی کاناپھوسیوں میں صبح ہو گئی۔ میں جمعیت سنگھ کا منظورِ نظر طالب علم تھا۔ انہوں نے میرے دشمن کی جو درگت بنائی، سو بنائی! مجھ غریب پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ باتوں باتوں میں بات پھیل گئی، وہ مشہور اور میں بدنام ہو گیا۔ جو مجھے نہیں جانتا تھا، وہ پہچاننے لگا۔ میں جدھر جاتا اپنی طرف انگلیاں اُٹھتی ہوئی پاتا۔ میری نیک نامی حرفِ مہمل کی طرح مٹ گئی۔ میری صفائی اور عذر داری کچھ کام نہ آئی۔ میں ہر کسی کی دل لگی کا سامان بن گیا۔ میرے عذرِ معذرت پر میرے ستم گر کہتے، ”یہ بات جھوٹی ہے تو اس میں تیری ہیٹی کیسے ہوتی ہے؟“

کرنیل سنگھ نے مجھ سے یہی کہا۔ میں نے حوصلہ کر کے اُس سے کہہ دیا، شنگارا سنگھ کہتا ہے کہ وہ تیری بہن کی مارتا ہے۔

وہ مجھ سے اُلجھ پڑا لیکن میں نے مقابلہ کیا۔ وہ اپنے دوست گرمکھ سنگھ کے ساتھ مل کر مجھ پر آیا، میں نے ڈر کر کہا، ”میں نے جھوٹ بولا ہے۔“ اس کے باوجود انہوں نے مجھے پیٹا اور رُلا کر چھوڑا۔

بات سچی ہو کہ جھوٹی جس سے دل آزاری ہوتی ہو، لائقِ تعزیر ہے۔

مجھ پر بے دردی سے جملے کسے جاتے، ”میں کیا بُرا ہوں؟ میرا بھی ذرا خیال رکھو!“

”بِلّا، اپنی سنبھال میرا ہلیا۔“

کئی دھاکڑ اوٹ پٹانگ بکتے ہوئے میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے راستہ بدلنے پر مجبور کر دیتے۔ زنجیر اُتنی ہی مضبوط ہوتی ہے جتنی اُس کی کمزور کڑی، میری جواں مردی میری بزدلی کے مساوی تھی۔ میں کسی کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ میں نے جمعیت سنگھ سے ریشم سنگھ اور ترلوک سنگھ کی شکایت کی۔ انہوں نے اُن کی خبر لی اور پھر مجھی کو سمجھایا، ”مجھے تمہارا بہت خیال ہے! لیکن میں تمہاری کہاں تک مدد کر سکتا ہوں؟ اپنی حفاظت آپ کرنا سیکھو۔“

میں نے اُن کی بات کی نزاکت کو سمجھا اور اُس پر عمل کیا۔ لیکن میرا عمل اُس ہیجڑے کا سا تھا جو کسی

مزے کو دیکھ کر اُس کی نقل کرے اور عین وقت پر جانے کہ وہ ہیجڑا ہی ہے۔ بے حوصلگی اور حوصلہ مندی دو طاقت ور متضاد نفسیاتی کیفیتیں ہیں۔ میری بے حوصلگی میری حوصلہ مندی سے زیادہ قوی تھی اور اپنی حریف پر بُری طرح حاوی تھی۔

مَیں کرتار سنگھ کو اپنا ہواخواہ سمجھتا تھا۔ وہ بلوان تھا اور لڑاکو بھی، مَیں نے اُس سے مدد چاہی۔ میری مجبوری سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُس نے مدد کا 'صلہ' پیشگی مانگا۔ میری سنجیدہ درخواست پر اُس کا لااُبالیانہ ردِعمل مجھے پریشان کر گیا۔ اُسے مجھ سے وہ ساری اعانت ملتی تھی جو نالائق طالب علم کی زندگی ہوتی ہے لیکن اُس نے اُسے یکسر بھُلا دیا۔ اُس کی بے ہودگی سے زیادہ، مَیں اُس کی فطری بے شرمی پر حیران ہُوا جس میں پیشہ ور شاہد بازکی سی جرأت تھی۔

میرے غمگسار قارئین! اپنے جسم پر ہلکا سا زخم قتلِ عام کی خبر سے کئی گنا اذیت ناک اور تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ جن زخموں کی تقدیر میں رسوائیوں اور بدنامیوں کے نمکدان ہوں، آپ اُن کی کسک اور ٹیس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں رُوحانی اُتار چڑھاؤ سے گزرتا ہُوا سوچتا۔ "حیات و ممات احساسِ نور و ظلمت ہی کے دوسرے نام ہیں۔" مَیں ایسے بیدار ہوتا جیسے کوئی مُردہ قبر سے اُٹھ کر زندوں میں شامل ہو جائے۔ غم ہر پل، ہر جگہ، ہر سانس میرا پیچھا کرتا، رگوں میں لاوے کی طرح دوڑتا، رونگٹوں سے چنگاریاں بن کر پھُوٹتا۔ آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکتا ناک سے رطوبت بن کر بہتا اور پیٹ میں مروڑ سا کلبلاتا۔ اُس غم کے ہزاروں پہلو ناقابلِ بیان ہیں۔ میرا غم کوئی ٹھوس چیز ہوتی اور مَیں بورا، تو سیونوں پر پھٹ جاتا اور تار تار مسک جاتا۔ مَیں غم سے گھبرا کر کوئی تنہا گوشہ تلاش کرتا لیکن میری افسردگی اُسے کال کوٹھڑی میں بدل دیتی۔ میری مُردہ دلی سے سناٹے کی فضا گھری ہو جاتی۔ اُس بے اعتبار تاریکی میں میرا دم گھُٹتا اور مَیں سانس کے لئے تڑپتا ہُوا دیوار پر سر پٹکتا، فرش سے لپٹ کر روتا جیسے ایک وُہی میرا مُونس و غم خوار ہو۔ دِل کچھ ہلکا ہوتا، مَیں جا کر پھُول بن میں بیٹھ جاتا۔ مزاج کچھ اور بہلتا مَیں کتاب کی طرف دھیان دیتا۔ کوئی کمینہ پھبتی باز اُدھر سے گزرتا اور مجھ پر گانڈو کی تہمت لگا کر اپنی راہ لیتا۔ اُس افترا پردازی سے میری رگِ جاں میں ورم اُبھر آتا، حروف آنکھوں کے سامنے ناچتے اور صفحے، سیاہی پوتے کاغذ نظر آتے۔ میرے کانوں میں ذِلّت کے گولے پھٹتے، فضا شورِ فنا کی طرح گونجتی اور میرے غم کو نفرت کے ہیجان میں بدل دیتی۔ جذبۂ نفرت کی خصوصیّت ہے کہ یہ مُدّعی کو اپنی نظر میں گرا دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ایسا سانحہ گزرتا ہے وہ اپنی برتری جتانے کے لئے کوئی بھی بے جا طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے دوسرے کی نیک نامی متاثر ہوتی ہو۔

مجھے لگتا کہ پھُول میری ہنسی اُڑاتے ہیں اور پتّے مجھ پر طنز کرتے ہیں۔ مَیں دیوانوں کی طرح بپھر جاتا اور اُن بے بسوں پر اپنا غصّہ نکالتا۔ اُس سے میری تسلّی نہ ہوتی اور میری نفرت، ملامتِ نفس کی صورت نمایاں ہوتی۔

مَیں اپنے بال نوچتا، منہ پیٹتا اور روتا۔ آنسو، پانی ہیں لیکن مجھے آگ کی طرح جلاتے تھے۔
کہتے ہیں کہ ہر غم عارضی ہوتا ہے اور وقت ہر درد کی دوا! یہ درست ہے تو غمِ رفتہ کی آگ میرے دامنِ دل کو کیوں جلا رہی ہے؟ یہ عبارت لکھتے ہوئے مَیں پستیِ رُوح میں کیوں ڈوبا ہُوا ہوں؟ مَیں اُسی طرح کیوں تڑپ رہا ہوں جیسے اُن جاں کاہ لمحوں میں تڑپا کرتا تھا؟
میرے پیارے قارئین! آپ میں سے کتنوں کو میرے جیسے جاں گسل غم سے واسطہ پڑا ہوگا۔ کوئی مجھے بتائے کہ غم واقعی دیرپا ہوتا ہے یا مَیں ہی کم نصیب ضرورت سے زیادہ حساس ہوں۔

مَیں اِس باب کو بند کر چکا تھا کہ یہی سوال مَیں نے خود سے کیا اور یہ جواب پایا۔ "خوشی کے لمحے جھومتے، لہراتے خوشبو کے جھونکے کی طرح گزر جاتے ہیں لیکن غم کے لمحے، خوں خوار سانپ کی طرح رگِ جاں سے لپٹے ڈستے رہتے ہیں۔"

باب ۳۰

سفر ہے شرطِ فراغِ حیات اے شاطرؔ
جہاں رُکا ہوں لگا ہے وہیں حصار مجھے (شاطرؔ)

اُس رُوحانی حادثے سے مَیں ورنیکولر فائنل میں فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اُس کے بعد ڈی۔ اے وی، ہائی سکول میں داخل ہُوا۔ اِس سکول کے بارے میں اُس سے پہلے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مَیں اِس سکول کی ڈرل دیکھ رہا تھا، اتفاقاً میرے ساتھ کچھ ڈرل چور بھی کھڑے تھے۔ برکت رام ہیڈ ماسٹر گٹ پٹ، گٹ پٹ کرتا آیا، بغل میں سے ڈنڈا نکالا اور ڈرل چوروں پر برس پڑا۔ کسی نے کچھ حیلہ کیا اور کسی نے کچھ لیکن اُس نے کسی کا عذر نہ سُنا اور اپنی دھڑا دھڑ میں مجھے بھی پیٹ دیا۔ دوسرے پٹ کر پریڈ گراؤنڈ کی جانب چل پڑے اور مَیں گھر کی طرف۔ وہ ڈنڈا گھماتا ہُوا مجھ پر لپکا۔ مَیں نے روہنہار ہو کر کہا، "مَیں ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کا طالبِ علم ہوں۔" وہ اپنی غلطی پر جھینپ گیا اور مجھے پچکارتا ہُوا اپنے دفتر میں لے گیا۔ ماسٹر مہنگا رام سامنے کھڑا تھا، اُس نے اُسے حکم دیا، "فوراً ایک گلاس دودھ منگواؤ۔"
"یس سر!" مہنگا رام نے پیلے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ مَیں نے اُسے دیکھا اور گھن سے منہ پھیر لیا لیکن جیسا کہ استعجاب کا تقاضا ہے، مَیں اُسے دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اُس وقت تک وہ دفتر سے باہر جا چکا تھا

اور چپراسی کو آواز دے رہا تھا۔

برکت رام نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور ایک تھیلی میں سے بادام اور کشمش نکال کر میرا کھیسا بھر دیا۔ اُس نے میرے بارے میں جتنے سوال کئے، میں نے اُن کے جواب بے جھجک دیئے۔ میں اپنی بزدلی کا رونا بے شمار بار رو چکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں اُستادوں کے سامنے نڈر رہتا تھا جب کہ بہادر طالبِ علم اُن کے سامنے کانپتے تھے۔ برکت رام میرے بھائیا جی کو جانتا تھا۔ جن ترکھانوں نے اُس سکول کا فرنیچر بنایا تھا، وُہ اُن میں سے ایک تھے۔ بھائیا جی کے پیشے کا ذکر آیا ہے اِس لیئے میں اُن کی 'کاریگری' کا ایک واقعہ بیان کرتا ہُوں۔

اُنہوں نے ایشر سنگھ سے مِل کر فیروز شاہ سے تختے چیرنے کا ٹھیکا لیا۔ اُنہوں نے تنہ پتھ کر (کلہاڑے سے چھیل کر گول لکڑی کا مُربع یا مستطیل بنانا) سُوت لگایا اور چیرنے لگے۔ کم سے کم پچاس تختوں کا مال تھا، ایک طرف کی لکیریں لگاتے میں ماہ بھر لگ گیا۔ دُوسری طرف کی لکیریں لگا کر وُہ ڈنگے (بڑی لکڑی کو دونوں طرف سے چیرتے ہیں اور جہاں دونوں طرف کی کاٹ ملتی ہے اُسے ڈنگا کہتے ہیں) چھُڑوانے لگے تو پتا چلا کہ سُوت ٹیڑھا لگا ہے۔ اُنہوں نے تنہ لٹا کر اُس پر ٹاٹ باندھ دیا اور فیروز سے کہا، "اِسے چار پانچ دِن تک تر کرو تا کہ ڈنگے کھُل جائیں۔" اُس نے اُن کی بات پر یقین کر لیا اور اُن کا حساب کر دیا۔ اپنی جان بچانے کے لیئے وُہ دونوں کوئٹہ چلے گئے اور دو سال کی مُسافری کے بعد لوٹے۔

برکت رام کے کہنے پر میں نے اُسے اپنی مرضی سے ایک طویل نثر سُنائی۔ میں اُس نثر کے تخلیق کار کا نام بھُول گیا ہُوں لیکن وُہ خوبصورت نثر مجھے اِس وقت بھی یاد ہے۔ اُس کا آغاز یُوں ہوتا ہے، اے میری زباں اے میری طُوطیِ شیوہ بیاں، اے میری قاصِد، اے میری ترجمان تُو سچ بتا کہ تُو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؛ تیرے ہر پھُول کا رنگ نیا اور ہر پھل کا مزہ نِرالا ہے۔ کبھی تو سِحر فسُوں ساز ہے جس...

"تُو میرے سکُول میں داخل ہو جا، میں تیری فیس معاف کر دُوں گا!" اُس نے خوش ہو کر مجھے لالچ دیا۔

میں نظمیں اور غزلیں سُنانے کی بات کئی بار کر چکا ہُوں۔ اُن دِنوں بڑے بُوڑھے، بچّوں کو یُوں ہی پرکھتے تھے اور ایسی پہیلیاں بھی بجھواتے تھے۔

اک رتّی سرمہ نو جنیاں، نو من سُرمہ کے جنیاں؟ (ایک رتّی سرمہ نو عورتوں کے لیئے کافی ہے، نو مَن سُرمہ کتنی عورتوں کے لیئے کافی ہوگا)

سو مَن دا لکّڑ، اُپر بیٹھا اک بھبھکڑ، رتّی روز کھاوے ذرا نہ گنواوے، دَسّو اوہ لکّڑ نُوں کِنیاں دِناں وِچ کھاوے گا؟ (ایک لکڑی سو من بھاری ہے، جس پر گھن کا کیڑا بیٹھا رہتا ہے۔ وُہ ہر روز ایک رتّی کھاتا ہے،

بتاؤ وہ لکڑی کو کتنے دنوں میں کھائے گا ؟)

بچّوں کی حاضر دماغی جانچنے کے لئے یہ سوال عام پوچھا جاتا تھا۔ ایک سیر لوہا بھاری ہے کہ ایک سیر رُوئی !

میں برکت رام سے داد پاکر گھر جانے لگا، اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنی پیشکش کو پھر دوہرایا۔ اُس کی سخت گیری کی علاقے میں دھوم تھی اور میرا پہلا تجربہ بھی یہی تھا لیکن اُس کے نرم رویّے سے میں بہت متاثر ہُوا۔ وہ واقعہ میں نے کس کس کو سُنایا! جب میں اُس سکول میں داخل ہوا، برکت رام ریٹائرڈ ہوچکا تھا اور اُس کا داماد بھیم سین ہیڈ ماسٹر تھا۔ میری فیس مُعاف نہ ہوئی لیکن میں فیس دینے والوں کے اُس گروہ میں شامل ہوگیا جو اپنی فیس دفتر میں جمع کرواتا تھا۔ فیس ہڑپ کرنے کا یہ طریقہ بھیم سین نے ایجاد کیا تھا۔ جو کوئی دفتر میں فیس جمع کرواتا تھا اُس کی فیس ریکارڈ میں مُعاف ہوتی تھی۔ میرے پہلے اُستاد کا نام گیان سنگھ تھا۔ وہ اُسی سکول کی پیداوار تھا اور میٹرک میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ اُس سے نام کی نسبت میرے خیال کو اُڑاتی اور مجھے بہکاتی کہ میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آؤں گا۔ اُس نے مجھے ایک بار بتایا کہ میں فلاں جگہ بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ میرے خیال کی اُڑان! میں اُسی جگہ بیٹھ کر پڑھتا اور سمجھتا کہ اُس جگہ میں کوئی پُر اسرار خوبی ہے جو میری فطری قابلیت کی کایا ہی پلٹ دے گی۔

رشتہ داری ہو کہ طرفداری، تنگ نظری کو فروغ دیتی ہے اور آخر کار سوچنے کی صلاحیت اور سمجھنے کی نفاست پر اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے کئی ایسے نزاع دیکھے ہیں جہاں لوگوں کو اپنے رفیق کی ملامت درکار تھی لیکن وہ اُس کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ اِس کی وجہ یہی عصبیت ہے جس کی شدّت وابستگی میں عصبہ اندھے ہیں اِس غضب ناک جذبے نے ایک قوم کو دوسری قوم اور ایک مُلک کو دوسرے مُلک کے خلاف نبرد آزما رکھا ہے اور اِنسان کو تاریخ کے بدترین جرائم کا مُرتکب بنایا ہے۔ اِسی ملعون جذبے کے ایک بھیانک منظر نے میری مذہبی تعمیر کو جڑ سے اکھاڑا تھا۔

تقسیمِ وطن کے وقت ہریانہ کے ایک مُسلمان محلّے میں قتلِ عام ہُوا۔ تمام بڑے مارے گئے اور بچّے، بچے۔ بچے جنھیں تایا جی اِنسانی برادری کی سانجھی پونجھی کہتے تھے، قاتلوں کا مسئلہ بن گئے۔ ہر کوئی یہ سوال اُٹھانے لگا کہ اِن سپولیوں کا کیا کریں ؟!

معصومیت کا اپنا جلال ہے اور ایسا انوکھا جلال ہے کہ اِس کے سامنے اِنسان، رُعبِ شاہی کے برعکس محبّت سے جھکتا ہے۔ اِس کی کارفرمائی حیوان تک میں اِنسانی جذبہ جگا دیتی ہے۔ میں نے حیوانوں کو حیوانوں بلکہ اِنسانوں کے بچّوں کی مدد کرتے اور اُنہیں مُصیبت سے بچاتے دیکھا ہے۔ لیکن آدمی! یہ اپنے جوشِ جنوں میں ہر جانی پہچانی

اور دیکھی سنی اِنتہائے ظلم کی اِبتدا ثابت ہو سکتا ہے۔

قاتلوں کے انبوہ میں سے بھاگ سینی آگے بڑھا۔ اُس آدمی نما درندے کے قدموں میں وہ گھات تھی جو شکار پر جھپٹنے سے پہلے شکاری کی چال میں ہوتی ہے۔ پھر وہ جیسے پاگل ہو گیا۔ اُس نے 'ماتاؤں' 'بھوانیوں'، 'گروؤں' کی جے جے کار بلاتے ہوئے اُن معصوموں کو اُٹھا اُٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیا۔ اور آدمیت کی گراوٹ! وہ ذلیل قاتل ہریانہ کا سب سے بہادر آدمی گردانا جانے لگا۔

گیان سنگھ مرزا پور کا رہنے والا تھا۔ وہاں آٹا پیسنے کی مشین تھی جو دن ڈھلے چلتی تھی۔ اُس کے گھگھو کی آواز ہمارے گاؤں تک سنائی دیتی تھی۔ میں اپنے بچپن میں گھگھو کی آواز سن کر کس مسرت میں گاتا تھا!

ایک دو تین

بابے بڈھے دی مشین

اُوپر گھگھو بولدا

بابا بے ایمان آٹا گھٹ تولدا

میرے جی میں آتی تھی کہ میں وہاں سے آٹا پسوا کر لاؤں اور مشین کو بھی دیکھوں لیکن ماں یہ کہہ کر ٹال دیتی، "چکی اور خراس کے مقابلے میں مشین کا آٹا بھکسا ہوتا ہے اور کھانے میں بدمزہ! مشین کا آٹا وہی لوگ کھاتے ہیں جن کے پاس نہ چکی ہے اور نہ خراس جوتنے کا سادھن۔" لیکن کوئی تقریب آپڑتی تو بھایا جی، آٹا مشین پر پسوا کر لاتے اور اکثر مشین والے سے لڑتے کیوں کہ وہ پسائی زیادہ لینے کے لئے مول سے زیادہ تولتے تھے۔

میں اُس سکول میں انگریزی کے ساتھ پنجابی پڑھنے لگا۔ انگریزی پڑھنے اور بولنے میں مجھے وہی دشواری ہوتی جو اردو بولتے وقت ہوتی تھی۔ میں زبان میں روانی اور سلاست پیدا کرنے کے لئے انگریزی بول بول کر پڑھتا اور جہاں موقع ملتا، ریاض کرتا۔ ہریانہ سے گھر لوٹتے ہوئے، میں اپنی دھن میں انگریزی کی کتاب بول بول کر پڑھ رہا تھا۔ میرے پیچھے سے دولتی رام آیا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "کاکا! میرا کتا تیری ہی طرح انگریزی بولتا تھا! اسے انگریزی کی گرمی ہو گئی اور وہ پاگل ہو کر مر گیا۔ تو اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے اُسے حیرت سے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ اُس کا اپنا لڑکا ترسیم سنگھ انگریزی میں ٹیوشن لیتا تھا جب کہیں پاس ہوتا تھا اور آخر آٹھویں کلاس سے آگے نہ پڑھ سکا تھا۔

ہمارے اڑوس پڑوس میں پڑھے لکھے تھے لیکن میں بوڑھوں اور بوڑھیوں کا چہیتا تھا اور اُن کے خط لکھا کرتا تھا۔ شیر سنگھ کی عادت تھی کہ وہ ایک بات لکھواتا اور پہلی ساری باتیں پڑھوا کر سنتا اور خط لکھنے کے بعد سارا خط پھر پڑھواتا۔ ایک بار میں اڑ گیا کہ میں خط لکھوں گا لیکن پڑھ کر نہیں سناؤں گا۔

"تو جانتا ہے کہ خط لکھوا کر اُسے پڑھوا کر سننے کی روایت کیوں پڑی؟" اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر پاس بٹھا لیا اور سوال کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، مَیں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بس، بڑا ہوشیار بنتا ہے! میں بتاتا ہوں تجھے۔ یہ صرف مجھی کو معلوم ہے۔" اُس نے فخر سے مسکرا کر کہا۔ "ایک آدمی اپنی خوشدامن، جانتے ہو خوشدامن کیا ہوتی ہے؟ ساس، کو خط لکھوا رہا تھا۔ اور سوڑے کے نیچے بیٹھا تھا۔ اُوپر سے چڑیا نے بیٹ کر دی جو اتفاق سے خط لکھوانے والے پر گری۔ وہ جھلا کر بولا، تو مجھ سے دُور بیٹھی ہے ورنہ مَیں، تیرے چوتڑوں میں انگلی گھسا دیتا۔ لکھنے والے نے اِسے مضمون سمجھ لیا اور ہوبہو لکھ دیا۔"

"مَیں ویسا نہیں ہوں!" مَیں نے ہنس کر کہا۔

مَیں کب کہتا ہوں کہ تو ویسا ہے! مَیں ویسا ہوں اور اُوپر شاخ پر چڑیا بیٹھی ہے۔"

تیلو رام واحد اُستاد تھے جو ڈنڈا نہ رکھتے تھے لیکن اُن کے لیکچر مشہور تھے۔ بکھیر تھ لال کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی تھی اِس لئے وہ 'نلی چوچو' کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کی نلی بہتے بہتے ہونٹوں تک بہہ آتی، وہ غلیظ اُسے سِنکنے کی بجائے اُوپر چڑھا لیتا۔ کئی اُستاد اُسے 'یو ڈرٹی فیلو، غلیظ آدمی' کہتے لیکن اُس پر اثر نہ ہوتا۔ تیلو رام ریاضی پڑھاتے تھے۔ اُنہوں نے بکھیر تھ کو بلیک بورڈ پر حل کرنے کے لئے سوال دیا جسے وہ حل نہ کر سکا۔ تیلو رام اُسے ڈانٹتے اور اپنے غصّے میں بڑبڑاتے ہوئے اُس کی جانب بڑھے۔ اُس کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ کانپتا ہُوا موتنے لگا۔ اُسے اپنی نلی پر قابو نہ رہا، جو ٹوٹ کر نیچے گر گئی۔ تیلو رام نے اُسے معاف کر دیا لیکن بلدیو رام نے اُسے نہ بخشا، اُسے 'چوچو جھرل چو' کا نیا نام دے دیا۔

اُس دہقانی ماحول میں بھی پہناوا بدلتا تھا۔ ٹانگیں مونڈنے کا رواج چلا، جن کی ٹانگوں پر رونگٹے تھے، وہ بھی اُسترا پھیرنے لگے۔ مَیں اپنے گاؤں میں اکیلا تھا جو اُن کی ریس نہ کرتا تھا۔ میرے ہم عصر مجھ پر طعن کرتے، ارے، یہ مردوں کا کام ہے! اِسے لونڈے نہیں کر سکتے!"

اُن دِنوں تنگ پوشی کا رواج تھا۔ بے میانی بالشت بھر کچھے، کچھوں کے پائینچوں سے ذرا اُونچے کُرتے، کاندھوں تک موڑے ہوئے آستین، کُرتے کے سارے بٹن کھلے، کالر کے نیچے سمو سا کیا ہُوا رنگین رومال، مونڈی تیل چپڑی ٹانگیں، ننگے پیروں میں آدھے جراب اور کلائی میں پٹّی۔ پاؤں کے اُوپر ہر بوٹی ایسے پھڑکتی جیسے شیشہ باز کے سر پر شیشہ۔ نوکدار پگڑی اور اُس پر پنّوں سے لکھا ہُوا نام، گویا چلتا پھرتا تعارف نامہ۔

جس غریب کی پگڑی میں گنجی نہ ہوتی وہ آخری لڑ کو تہ کر کے اُس میں کاغذ رکھ لیتا اور اُسی میں تسکین پاتا۔ جوگندر سنگھ امرتسر گیا اور وہاں سے رنگین سِروں والے آلپین لایا۔ اُن کا قطر، اُن صِفروں سے کچھ ہی چھوٹا تھا جو اُسے امتحان میں ملتے تھے۔

دھرم چند امتحانوں کے پرچے دیکھ کر لاتے، طالب علموں میں تقسیم کرتے اور اُن کی زبانی اُن سے نمبر پوچھتے جو کہ ہندسوں میں ہوتے۔ جوگندر سنگھ کی باری آئی، وہ پوری ڈھٹائی اور بے حیائی سے بولا، جناب سر! آپ نے انڈا دیا ہے۔" ایک بے لگام اور بے ساختہ قہقہہ اُٹھا اور ہیڈ ختم ہونے تک سارے سکول میں پھیل گیا۔ اُس حادثے سے جوگندر سنگھ بے اثر رہا لیکن دھرم چند نے اثر لیا۔ انھوں نے انڈے دینے بند کر دیئے اور کم سے کم ایک نمبر دینے لگے۔ جوگندر سنگھ بلا کا ظریف تھا، کچھ بُجھارتیں اُسی سے منسوب تھیں۔

آدمی کے پاس وہ کیا چیز ہے جو سردی میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور گرمی میں بڑی؟

وہ کیا شے ہے جسے غریب پھینک دیتا ہے اور امیر رومال میں لپیٹ کر رکھ لیتا ہے؟

جوگندر سنگھ کی جگمگاتی ظرافت، ہر کسی کو اُس کی ہزیمت دکھاتی تھی۔ جب اُسے ڈنڈوں کی سزا ملتی وہ اپنے اُستاد کو نشانہ بناتا، "مر گیا ماسٹر جی! ماسٹر جی مر گیا!" اور ماسٹر جی اُسے تب تک پیٹتے جب تک اُس کے منہ سے یہ نہ کہلوا لیتے، "ماسٹر جی! میں مر گیا۔"

وہ سائیکل سواروں کو طرح طرح سے تنگ کرتا تھا کسی کو پکار کر کہتا، "ذرا نیچے دیکھ! تیرے سائیکل کے پہیئے گھوم رہے ہیں۔"

"سائیکل چلاتے ہوئے تیرے چوتڑ ایسے ہل رہے ہیں جیسے اونٹ جگالی کر رہا ہو!"

اُس نے جگدیو سنگھ سے کہا، "نمبردار جی! آپ کے پچھلے پہیئے کی ہوا نکل رہی ہے۔" وہ جھٹ سے سائیکل پر سے اُترا اور جھک کر پہیئے کو دیکھنے لگا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ جوگندر نے اُسے اُلّو بنایا ہے، اُس نے اُس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا، "کاکا! میری ہوا نہیں نکلی لیکن تیرے باپ کی ضرور نکلے گی جب تیری ماں اُسے بتائے گی کہ تو میرا نطفہ ہے۔"

جوگندر سنگھ وقتی طور پر جھینپ گیا لیکن جگدیو سنگھ کے وہاں سے جاتے ہی اُس نے اُسے منہ بھر کر بیٹی کی گالی دی۔ میں نے اُسے آفریں آمیز انداز سے دیکھا جگدیو سنگھ اِس قدر غنڈہ تھا کہ کوئی اُس کے پیچھے بھی اُسے گالی دینے سے ڈرتے تھے۔ گالی دیکھنے میں الفاظ کا پشتارہ نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں! یہ ایک طرح کا ہتھیار ہے، جو ہارا ہوا انسان اپنے حریف کے خلاف برتتا ہے، اُسے نقصان پہنچاتا ہے اور کسی حد تک اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شکست خوردہ اپنی ذلت کی دلدل سے نکل نہ پاتا اور اُسی میں غرق ہو جاتا۔

کرم چند آب جو میں ٹانگیں مونڈ رہا تھا، میں مویشی چراتا ہوا اُدھر جا نکلا۔ اُس سانپ نے مجھے بہکایا اور میں بہک گیا۔ ٹانگیں مونڈ کر میں نے اپنی نئی حالت کا جائزہ لیا۔ مجھے عجیب سا لگا۔ اُسی اثنا میں نے

کرم چند کو قاہ قاہ ہنستے سنا۔ میں نے حیرت سے اُدھر دیکھا؛ اُس نے ہنستے ہوئے رُک رُک کر کہا، "تُو ایسے، ہا ہا، لگ رہا ہے، ہا ہا ہا ہا، جیسے چھیلا ہُوا کیلا!"

اُس ذلیل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اُس کی طنز اور میری خود آگاہی نے میرے احساس کو گہرا کر دیا اور مجھے لگا کہ میری ٹانگیں کنواری کی رانیں لگتی ہیں۔ میرا خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اِس سے پہلے کہ میں اپنی ہوا باندھتا میری ہوا نکل گئی۔ میں اپنی حماقت پر پچھتاتا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی، ہمیشہ کی طرح دیر ہو چکی تھی۔ اپنی ندامت چھپانے کے لئے میں نے اندھیرے کا اِنتظار کیا اور پھر رات ہوتے ہی مجھے صبح کا کھٹکا لگ گیا۔ میں بستر میں دیر تک دبکا پڑا رہا اور بھید ظاہر کرنے والے اُجالے پر کُڑھتا رہا۔ وہ ڈھیٹ میری حالت سے بے نیاز بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔ سکول جانے کا وقت قریب آ گیا۔ میں ناشتے کے لئے چوکے میں نہ پہنچا، ماں نے بلایا۔ پاجامہ میرے پاس نہ تھا ورنہ میں اپنی شرم چھپا لیتا۔ مجھے ایک طریقہ سُوجھا، میں جس سے ملتا اُس سے آنکھیں چُراتا ہُوا گزر جاتا۔ میری کرتوت دیکھ کر ماں نے کچھ راز جوئی اور کچھ حیرانی سے پوچھا، "بارے تو بھی جوان ہو گیا ہے!؟"

میرے پاگل پن کی کہانی کرم چند نے رات ہی میرے ہم عصروں کو جا سنائی۔ دوسرے دِن سڑک کے پہلے موڑ پر اُن بدذاتوں کی ٹولی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ اُن میں کئی ایسے تھے جو روز سکول دیر سے پہنچتے تھے اور سزا پاتے تھے، وہ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ قہقہے، وہ زہر میں بجھے فقرے، وہ بے باک کچوکے، میں ذلت کے بگولے میں مدار کی بڑھیا کی طرح تھا جو اپنے بیج کے ساتھ اُڑتی اُڑتی کہاں گرتی ہے؟ کسے معلوم۔ کاش! میں اِتنا حساس نہ ہوتا، اِتنا بزدل نہ ہوتا!! اپنی ذلتوں کا خیال کرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ اُن کی عمر ہزاروں سال ہے۔

سردیوں کے دِن تھے۔ میں کئی دوسرے طالب علموں کے ساتھ کلاس روم سے باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کھرنی پر سے مادہ چیل کی 'چوں اوں، چوں اوں' کی درد بھری آواز آئی۔ وہ یہ خاص آواز اپنے نر ساتھی کو مائل کرنے کے لئے پیدا کرتی ہے۔ اُس آواز کی حسرتناکی! فضا اُس نر اس کے جذبات سے چھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ عملِ وصل کی کم مائیگی! چیل چند چھنوں کے لئے چپ ہوتی ہے اور پھر اُسی حسرت بھرے انداز میں کرلاتی ہے جو ہجر میں اُس کی طبیعت کا سوز و گداز ہوتا ہے۔ جس طرح فطرت حُسنِ تخلیق سے معمور ہے اُسی طرح اِنسان جوشِ مسرت میں مجبور ہے۔ میں اپنی لہر دبا نہ سکا، "چیل مرواتی کم اور شور زیادہ مچاتی ہے۔" میری بات زبان سے ہونٹوں تک ہی پہنچی ہو گی کہ بھیم سین نے سُن لی جیسے وہ میرے ہونٹوں سے کان لگائے بیٹھا ہو۔ اُسے دیکھ کر میں جلدی سے اُٹھا لیکن اِس سے پہلے اُس نے مجھے کلائی سے پکڑ لیا اور جھٹکا دیا۔ میں گرتا گرتا مشکل سے سنبھلا۔ اُس کے ساتھ اُس کی لڑکی ششی کلا بھی کھڑی تھی۔ میں نے جو کہا، بلا ارادہ کہا تھا۔ میری سچائی کی سند، میری بزدلی ہے۔ "سوری سر، ویری سوری سر!" میں نے سچے دل سے معافی مانگی لیکن اُس نے قبول نہ کی۔ مجھ پر بید

برسنے لگا اور ساتھ ہی میری آنکھیں۔ اُن میں ادنیٰ سا فرق یہ تھا کہ میری آنکھیں خاموش برس رہی تھیں۔ ششی کلا کے چہرے کی بناوٹ ایسی تھی کہ وُہ زیرِ لب مُسکراتی لگتی تھی۔ اُس کی مُسکراہٹ غائب ہوگئی جیسے اُسے اپنے باپ کی سختی بُری لگی ہو۔ اُس نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر لپک کر اپنے ظالم باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "بس! ڈیڈی بس!!"

بھیم سین نے اُسے غُصّے سے دیکھا لیکن چُپ رہا، آخر میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ وُہ شرمندہ تھا کہ پراگندہ، وُہی جانے! ششی نے جاتے ہُوئے جس نیم نگاہی سے مجھے دیکھا، اُس میں ہمدردی سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وُہ کیسا حادِثہ تھا! بھیم سین کی زیادتی مجھے بُری نہ لگی۔ اُس دن سے ششی کے رویّے میں میرے بارے میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ وُہ جہاں کہیں مجھ سے مِلتی، مُسکراتی اور آنکھیں مِلا کر جِھجکتی ہُوئی گزر جاتی۔ اُس کا یہ انداز اِس قدر نازک، دِل گداز اور خیال آرا تھا کہ پل بھر کے لئے مَیں اپنے ماحول سے بے خبر ہوجاتا اور اُس قیافے، اِستعارے سے لُطف اُٹھاتا جسے وُہ راہ دکھا گئی ہوتی تھی۔ مَیں وہیں کھڑا اِس یقین سے اُسے دیکھتا کہ وُہ پیچھے مُڑکر دیکھے گی اور مُسکرائے گی۔ میری آنکھوں نے وُہی دیکھا جو میرے دِل نے اُن سے کہا تھا۔ ہم کئی بار اکیلے بھی مِلتے لیکن مَیں کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جو جذبات کے لااُبالی پَن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود مَیں ایک اِعتراف کرنا چاہتا ہُوں۔ وُہ شلوار قمیض پہن کر سکول آتی تھی، اچانک وُہ سکرٹ پہننے لگی۔ اُس کے بارے میں پہلے بھی باتیں ہوتی تھیں لیکن الگ نوعیت کی۔ ایک دِن وُہ میرے پاس سے گزری، مَیں نے سوچی سمجھی لاپروائی سے اپنی کِتاب گرا دی اور کِتاب اُٹھانے کے لئے جُھکا، لحظہ بھر کے لئے اُسے دیکھا، افواہ کے برعکس وُہ انڈر ویئر پہنے ہُوئے تھی۔

بھیم سین ہر سال آٹھویں اور نویں اور دسویں کلاس کے لئے پیپر گائیڈ مُنتخب کرتا تھا۔ ہر طالبِ علم گائیڈ کی پُوری قیمت چُکاتا تھا لیکن حِصّے داری سات طالب علموں کے ساتھ نباہتا تھا۔ اُس کے پیچھے ہر کوئی شور مچاتا لیکن آمنے سامنے چُپ سادھ لیتا۔ اُس کا سب سے پیارا مُحاورہ تھا، ویلتھ لوسٹ نوتھنگ لوسٹ، ہلتھ لوسٹ سم تھنگ لوسٹ اینڈ کیریکٹر لوسٹ ایوری تھنگ لوسٹ۔ دولت گئی کُچھ نہیں گیا، صحت گئی کچھ گیا، چال چلن گیا، سبھی کُچھ گیا۔" ساری کلاس کے لڑکوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ہم بھیم سین کے ساتھ بات کریں گے اور الگ الگ گائیڈ دینے کی مانگ رکھیں گے۔ ترسیم سنگھ اور نمردن سنگھ کو لیڈر بنایا گیا اور باقیوں نے اُن کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب وقت آیا، کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وُہ بیچارے دھر لئے گئے۔

ایک نئے اُستاد پیارا سنگھ کا تقرر ہُوا، جو صرف بی۔ اے۔ پاس تھا۔ مزے کی بات یہ تھی

کہ اُس نے اپنی ڈگری، سائیکل کی مڈگارڈ پر لکھی ہوئی تھی۔ وُہ آتے ہی بی۔ اے کے نام سے اور پھر لونڈے باز کے نام سے مشہور ہوا۔ اُسے صرف ایک ہی شعر آتا تھا اور وُہ بھی پنجابی کا،

گورے رنگ نے سدا نہیں رہنا

بھر بھر بُک وَنڈ دے

(یہ گورا رنگ ہمیشہ رہنے کی شے نہیں ہے، اِسے بُک بھر بھر کر بانٹ دے)

وُہ جیسے اوچھی باتوں میں بدنام تھا ویسے ہی فُٹ بال اور کبڈی میں اُس کا نام تھا۔ وُہ اپنے دائیں پاؤں میں کالے رنگ کا بانا باندھتا، ٹانگیں مونڈتا اور بدکار عورت کی طرح پائینچے اٹھا کر گٹھیلی پنڈلیاں دکھاتا۔ وُہ آوارہ لڑکوں کو پُرچک دیتا اور اُن میں پُرجہادر کھلاتا۔ اُس نے من پسند لڑکوں کو پھانسنے کا مؤثر طریقہ نکالا، وُہ اُن پر سوال نامے فاش کرتا۔ اُس کے پاس لونڈوں کی بھرمار تھی لیکن اُس کی عادت کُتّے کی سی تھی جو تنگ ہانڈی میں مُنہ نہ ڈال سکے تو اُسے اُوپر ہی سے سُونگھ اور چاٹ کر مطمئن ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا فریب مجھ پر نہ چلا تو اُس نے میرے پیچھے بھڑوے لگا دیئے۔ وُہ پھر بھی کامیاب نہ ہُوا تو انجان ہو گیا۔ ہمارے درمیان وُہی رِشتہ قائم ہو گیا جو اُستاد کا طالبِ علم سے ہونا چاہیئے۔

ایک شام دیر گئے مَیں کھیتوں سے لوٹ رہا تھا کہ پیارا سنگھ مجھے سڑک پر ملا۔ وُہ سائیکل دھکیلتا ہُوا چل رہا تھا۔ ست سری اکال کے بعد اُس نے بتایا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی ہے۔ اُس کا گاؤں شاید کھڈیال تھا اور میرے گاؤں سے کافی دُور، مَیں اُوپرے دِل سے اُسے رات رہنے کے لئے کہہ بیٹھا اور وُہ تُرنت مان گیا۔ کاش مجھے آنے والے سانحے کا ذرا سا بھی خیال ہوتا! میرے قارئین! یہ میری کمزوری ہے کہ مَیں زُود اِعتماد ہُوں۔ مَیں نیند سے عالمِ بدحواسی میں بیدار ہُوا، پیارا سنگھ الف ننگا مجھے خُوں خوار سانپ کی طرح لپٹا ہُوا جہاں تہاں ڈس رہا تھا۔ وُہ آہنی گرفت، وُہ ہوس بھرے حملے، وُہ دانتوں جیسے کڑے اعضا، مَیں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے آپ کو بچایا۔ اُس تگ و دو میں منجا ٹوٹ گیا اور وُہ بھبھوکا سا ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُس نے مجھے میرے حال پر چھوڑا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ مَیں گیا گُزرا سا گیا گُزرا تھا! اُسے پکڑنے اور مارنے کے لئے، مَیں نے نہ کسی کو مدد کے لئے بُلایا اور نہ ہی شور مچایا۔ میری اِس معذوری اور نامردی کی وجہ ہیبت سے زیادہ ذِلّت تھی جسے مَیں نے چُھپانا چاہا تھا۔ جب کبھی مَیں ایسے جاں کاہ مراحل سے گُزرتا، اپنے غم کا بوجھ رو کر ہلکا کرتا۔ اُس منحوس رات، مَیں نہ رویا، نہ ملول ہُوا، ایک مُردہ بے حِسی سے اپنے مسلوب وجُود کو دیکھتا رہا جیسے کوئی بے بس مجروح اپنے بہتے ہُوئے خُون کو دیکھے اور سمجھے کہ وُہ اُس کی ذات کا حِصّہ نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ کُتّا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے لیکن اپنی ذات میں، مَیں کُتّے سے بدتر تھا۔ اپنی نابکاری کی وجہ سے مَیں نے جتنے بارِ ذلّت اُٹھائے ہیں وہ ہمالہ پہاڑ پر پڑتے تو وہ زیرِ زمین دھنس جاتا۔ مَیں نے جتنے آنسو روئے ہیں انہیں کسی طرح اکٹھا کر سکتا تو ان کی گہرائی میں سمندر ڈوب جاتا۔ مَیں صبر شکن جوروں اور عناصرِ فگن بیدادوں کا وہ قبرستان ہوں، جس کے ذرّے ذرّے سے ذلّتوں، تہمتوں اور بدنامیوں کا لہو ٹپکتا ہے۔ ان وارداتوں کو دہرانا پُرانے زخموں کو تازہ کرنا ہے۔ میری تقدیر کیسی تقدیر ہے! پہلے میری زندگی ایک سانحہ تھی، اب میری کہانی ایک المیہ ہے۔ مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے تو مَیں عجزِ اظہار میں تڑپتا ہوں۔ میری ہر بات ماورائے سخن ہے! آپ میرے سامنے ہوتے اور میری کوشش کی بے کسی دیکھتے! مَیں جتنا لکھتا ہوں اُس سے زیادہ حذف کرتا ہوں۔ اِس کی وجہ ایک ہی ہے۔ مَیں اپنی دِلی کیفیت مِن وعَن بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ مَیں اپنی اُس حالت میں زندہ کیوں کر رہا؟ میرے ہم جماعت ہر کرشن نے میرے جیسے دُکھ سے گھبرا کر خودکشی کر لی تھی۔ کوئی جو سمجھے، سمجھے! مَیں نے اُس کی بہادری پر رشک کیا تھا۔ مَیں پیارا سنگھ سے انتقام لینا چاہتا تھا لیکن بُزدل کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ بھیڑ کی لات، ٹخنوں تک زیادہ بڑھی تو گھٹنوں تک۔ ایک بار مجھ ارذل ہستی کو جُرأت ہوئی اور اپنے دشمن کی سائیکل پنکچر کر دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میری شکستِ دل نے مجھے کچھ سنبھلنے دیا تھا۔

اُس حادثے کا پس اثر! مَیں اپنی مظلومیت میں کچلے ہوئے کیڑے کی طرح رینگتا اور اپنے غم سے نجات پانے کا چارۂ کار ڈھونڈتا۔ میری زندگی کیسی زندگی تھی؟ مَیں اپنی گلی سڑی لاش اُٹھائے گھومتا، اُس کی سڑاند میں جاں بلب رہتا، لیکن زمانے کی بے تعلّقی! کسی کو میری میت نظر آتی تھی اور نہ ہی عفونت۔

وہ حادثہ وہیں ختم نہ ہوا۔ اُس نے سکول کے غنڈہ عناصر کو اپنے ساتھ ملا لیا جو مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ اُن کی زیادتی مجھے بالکل ناپسند تھی لیکن دِل کے کسی کونے میں پسند تھی، الگ طریقے سے مَیں اُن کے سامنے جانے سے گریز کرتا کہ نہ کُتّے دیکھیں گے، نہ بھونکیں گے۔ وہ میرے بارے میں من چاہی افواہیں پھیلاتے اور مجھے بدنام کرتے۔ افواہوں کی بدچلن سرشاری شراب سے افزوں تر ہے۔ اول تو اُترتی ہی نہیں، اُترتی ہے تو پس چڑھنے کے لئے۔ بدمعاش لڑکے، میرا نام لے کر چٹخارے بھرتے جیسے وہ کوئی کھانے کی مزیدار چیز ہو۔ نرنجن سنگھ جہاں کہیں ملتا کسی نہ کسی طرح مجھے دِق کرتا۔ مَیں ملامتی اور مردود منہ ہی منہ میں اُسے گالیاں دیتا۔ تصوّر میں اُسے زدوکوب کرتا، اُس پر دانت پیستا لیکن اُس کے منہ پر ایک حرف نہ بول سکتا۔ وہ بدنامی؛ انوکھی جوالا مکھی تھی! مَیں اُس میں سانس سانس جلتا تھا لیکن جل کر راکھ نہ ہوتا تھا۔

اپنے دشمنوں کا رویّہ بدلنے کے لئے میرے لئے لازم تھا کہ مَیں کوئی معرکہ آرا کام کرتا۔ مَیں کیا کر سکتا تھا؟

مَیں نے سوچا، سوچا، سوچا اور اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے ایک جھوٹ اُڑایا کہ مَیں نے دین دار کے ڈیرے کی تھانگ میں رہنے والے بُوہے کو دیکھا ہے اور اُسے مار بھگایا ہے۔

جیسے ننگا گُڑ مکھیوں کا کھاجا ہے۔ وہی حشر میرے جھوٹ کا ہُوا۔ میرے بارے میں مشہور ہو گیا، ہیجڑے کے گھر بیٹا ہُوا! کس نے دیکھا؟ ہیجڑے نے۔

نویں جماعت کا سالانہ جلسہ تھا اور مجھے اوّل انعام ملنا تھا۔ مَیں انعام کے لئے اُٹھا، پیارا سنگھ نے اپنی منڈلی میں سے آوازہ کسا، "مَیں کیا دیکھ رہا ہُوں؟"

"کیا دیکھ رہے ہو؟" نرنجن سنگھ آنکھ مچکا کر بولا۔

"کانڈو کو تمغہ مل رہا ہے" پیارا سنگھ نے تیے تُلے انداز میں کہا جیسے وہ مجھے میرے لقب اور عزت سے بُلا رہا تھا۔

"یہ تو شرم کی بات ہے! کانڈو کو تو تڈے باز ملنا چاہیئے۔" نرنجن سنگھ غرور آمیز افسوس کے ساتھ سُجھاؤ دیتے ہوئے بولا۔

"سہج پکے سو میٹھا ہو! ملے گا، ضرور ملے گا! ہم اسی آس پر جی رہے ہیں!" پیارا سنگھ نے ایسے کہا جیسے کوئی کسی کا شجرۂ نسب دیکھ کر اُس کی اصل کا فیصلہ کرتا ہے۔

مَیں نے اُسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور نامردگی کی سی مردانگی سے جواب دینے کے لئے رُکا پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ حقیر، کتّے کی طرح ہونٹ چاٹ کر بولا، چلو، ایک نظر ہی سہی! سچے عاشق کے لئے یہی کافی ہے۔" مَیں انعام لے کر واپس ہُوا، اُس ذلیل انسان نے ایسے سانس کھینچا جیسے ہوا میں سے میرا رس چُرا رہا ہو اور بولا، "بھور بھکھے واسنا دے، ہور لوڑنا ں، بھونرے صرف خوشبو کے بھوکے ہوتے ہیں! وہ زیادہ کی تمنّا نہیں کرتے۔"

قارئین: الفاظ کے معنی نہیں ہوتے، انہیں معنی دینے پڑتے ہیں۔ مَیں الفاظ اپنے احساس میں تولتا ہُوں پھر لکھتا ہُوں۔ خدا نے میرے باپ کو جس ناپاک مٹّی سے بنایا وہ اپنے حقیر کردار میں اُس کے حقیر معیار پر پوری نہ اُتری۔ اپنے حقیر مقاصد کی بے تکلف پیروی کرتے ہوئے اور اُن کے قطعی حصول کے لئے اُس نے اُس مٹّی میں بے ضمیری، بے اصلی، بے ہمتی، بے تمیزی، بے دادگری، بے وفائی، بے حسی، بے ادبی، بے ایمانی، بے حیائی، بے دردی، بے رحمی، بے لحاظی . . . کے عناصر زیادہ مقدار میں ملائے اور اُس سے ذلیل انسان پیدا کیا۔

مَیں انسانوں سے گھبرا کر کتابوں میں پناہ ڈھونڈتا اور ایسی کتابیں پسند کرتا جن کے کردار مظلوم ہوتے۔

ویسی کتابیں اُردو میں ناپید تھیں۔ میں نے پنجابی میں 'چٹا لہو' اور 'پوتر پاپی' پڑھے اور بار بار پڑھے۔ میں امرتا پریتم کی نظم 'آکھاں وارث شاہ نوں' پڑھتا اور بار بار پڑھتا اور روتا، بھڑاس نکلنے تک روتا اور اطمینانِ قلب حاصل کرتا۔

اپنی داستانِ رنج و غم کے اس نازک مرحلے میں، میں زندگی کا ایک نازک راز بیان کرتا ہوں جسے رازِ ارتقا کہنا چاہیئے۔ میں ٹوٹ ٹوٹ کر جڑا اور جڑ جڑ کر ٹوٹا اور پھر جڑا لیکن بالکل نئے انداز سے! جیسے کوئی مصوّر اپنی تصویر کو شاہکار بنانے کے لئے اُس کے نقوش بار بار مٹاتا ہے اور بناتا ہے۔

پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد پنجاب دیاں دھیاں، پنجاب کی بیٹیاں بھیک مانگنے کے لئے آنے لگیں۔ وہ، وہ لڑکیاں تھیں، جو ملک کے بٹوارے کے دوران کسی طرح پاکستان میں رہ گئی تھیں اور پھر ہندوستان لائی گئی تھیں لیکن اُن کے ماں باپ نے انہیں قبول نہ کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے جور و ستم کی کہانیاں سناتیں، اپنی مصیبت کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے لباس اٹھاتیں اور اپنے کاٹے ہوئے، داغے ہوئے اعضا دکھاتیں۔

عورتیں انہیں دھتکارتیں، "تم کچھ کھا کر کیوں نہ مر گئیں؟ تم ڈوب کیوں نہ مریں؟ راہ میں پانچ دریا آتے تھے!"

"بہنو! تم ہماری جگہ ہوتیں تو شاید ہم بھی تم سے یہی سوال کرتیں! ہم مر سکتیں تو کب کی مر گئی ہوتیں!" وہ شرمندہ ہوتے بغیر کہتیں۔

لیکن مرد، اُن سے ہمدردی سے پیش آتے، اُن پر ترس کھاتے اور مسلمانوں کی ہوس کے نشانوں کو ایسے چھوتے جیسے اُن میں چھپے زخموں کے اندرونی درد کو سہلا رہے ہوں۔ کئی خدا ترس اُن اعضا کو 'پاک بناتے' جو مسلمانوں نے 'ناپاک کر دیئے تھے'۔

میں عہدِ گزشتہ کے جس لمحے کو یاد کرتا ہوں وہی سوز دروں کی بھولی بسری کہانی ہے۔ لیکن میری تقدیر! میں اپنی کہانی لکھنے سے باز بھی نہیں رہ سکتا! میرے قارئین کے ذہن میں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ کیوں؟

میں تاریخ ساز ہوں اور مورخِ وقت کو میری سچائی محفوظ کرنی ہے۔

باب ۳۱

جو ہوا منحرف روایت سے
اُس نے راہِ حیاتِ نو پائی (شاطر)

میرے احساس کی تفصیل کسی کے لئے بے فائدہ تطویل ہو سکتی ہے۔ اپنی حقیقت لکھتے ہوئے، مَیں خود آفت زدہ ہوں، اِس کے باوجود، مَیں بھرپور یقین سے کہتا ہوں کہ وہ زمانہ آپنے اندر میرے حال سے زیادہ تاب و تعب رکھتا تھا۔ میرا متضاد بیان پڑھ کر مبادا کوئی تذبذب میں پڑ جائے، مَیں شکست و ریخت کی نفسیات بیان کرتا ہوں۔ خود شکنی عبرت انگیز ہو تو وہ خودگری سے ہم آہنگ ہوتی ہے ورنہ اپنی تردید سے۔ مَیں بے چارگی و بے کسی کا ایسا مظہر تھا جو بننے کے لیے بگڑتا تھا۔ اِس لئے میرے حرفِ حیات میں سَیلِ معنی کے وہ سمندر ہیں جن کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میرا ماضی لامتناہی منظر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہُوا ہے۔ مَیں ہر ادنیٰ و اعلیٰ نوعیّت کے منظر کو یُوں دیکھتا ہُوں جیسے مَیں خود ہی عینِ منظر ہوں۔ میری بڑائی! مَیں اُس منظر کا مصوّر ہُوں۔ میری کمزوری! مَیں اپنے خاکوں میں وہ رنگ نہیں بھر سکتا جن سے وہ حقیقی حُسن کے حریف ہو سکیں۔ جیسے ماں، بچّے کو جنم تو دے سکتی ہے، دَردِ زہ کی لذّت بیان نہیں کر سکتی، وُہی صُورت میرے احساسِ عمل کی ہے۔

کسبِ اَخلاق پیکرِ آدم کی طرح ہے جو کہیں یکساں نہیں، مَیں اپنے اَخلاق کو اپنے گز سے ماپ رہا ہُوں۔ مَیں انسانی جبلّتوں کا روادار ہُوں۔ مُروّجہ قدریں کیا بلا ہیں؟ مَیں نہیں جانتا، تہذیب و تمدّن کیا شَے ہیں؟ مَیں نہیں پہچانتا۔ میری ذہنی بلُوغت، میری اپنی آزادہ روی ہے اور میرا شعُور میری طبیعت کی سیماب وَشی۔ مَیں آغاز و انجام سے بے پروا ہُوں اور شوق و تجسُّس کے رخشِ تیز گام پر سوار سَفر در سَفر اُڑا جا رہا ہُوں۔ مَیں پیچھے مُڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا لیکن میرا خبطِ ماضی شناسی، مَیں دیکھتا ہُوں۔

مَیں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہُوا اُس کی رسیلی مُسکراہٹ سے رس لے رہا ہُوں۔ وہ مجھے گُدگُدا رہی ہے اور مَیں ہاتھ پاؤں مارتا ہُوا کھِڑکھِڑا رہا ہُوں۔ وہ میری بھنّو سے کھیلتی ہُوئی مجھ سے پُوچھ رہی ہے، "یہ کیا ہے؟" مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے! یہ جاننے کے لئے مجھے بڑا ہونا ہے۔ مَیں بڑا ہو رہا ہُوں اور ماں کے دائرہ اثر سے باہر زیادہ بڑا ہو رہا ہُوں۔ مَیں نئے اَلفاظ اور نئے لہجے سیکھ رہا ہُوں، میری ماں اُنہیں سُنتی ہے تو حیران ہوتی ہے۔ کوئی میری بھنّو کو ہاتھ لگا کر پُوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ تو مَیں پُورے اِعتماد سے اُسے بتاتا ہُوں، "یہ میری بھنّو ہے۔" میرا ٹھیک جواب سُن کر کوئی حیرت زدہ ہے، کوئی خُوش ہے اور کوئی طعنہ زن، "بڑا ہوشیار ہے!" مجھے اِس کی پروا ہے اور نہ اُس کی، مَیں بے شرم و بے لحاظ ننگا دھڑنگا گھُوم رہا ہُوں۔ فتّو مجھے دیکھتی ہے تو پکڑ کر میرے پیٹروؤں میں تھُوک دیتی ہے۔ مجھے اُس کی حرکت بُری لگتی ہے، مَیں رو پڑتا ہُوں۔ وہ جھلاتی ہے اور مُنہ بنا کر کہتی ہے، "جا، گھر جا اور کچھّی پہن کر آ!" مجھ میں ننگے پن کا احساس جاگتا جا رہا ہے اور مَیں اپنی ماں سے کہنے لگا ہُوں، "ماں! مجھے کچھّی پہنایا کرو۔" وہ مجھے پُچکار کر بہلاتی ہے اور کچھّی پہننے کا خیال میرے دِل سے نکالتی ہے۔ مَیں وقتی طور پر

بہل جاتا ہوں لیکن کسی ہم عمر کو کچّھی پہنے دیکھتا ہوں تو مچل پڑتا ہوں۔ بھائیا جی مجھے دیکھتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں اور بازو سے پکڑ کر باہر بڑھا دیتے ہیں، "میں سکول گیا تھا تو کچّھا پہنا تھا! گھر سے نکل اور باہر کھیل۔"

میں ان کے کٹھور رویّے سے دل برداشتہ ہوں لیکن باہر جاکر کھیلنے لگا ہوں اور کچّھی کا غم بھول گیا ہوں۔ ہر کسی کی اپنی پسند اور ناپسند ہے، جس کے حصار توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں پسند اور ناپسند کے جذبے سے روشناس ہو گیا ہوں اور فتّو کو ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ملتی ہے، مجھے پکڑتی ہے اور میرے جوتڑوں میں تھوک دیتی ہے یا ان پر گوبر مل دیتی ہے۔ اس کے بارے میں میری شکایتیں بڑھ گئی ہیں، جن سے تنگ آکر ماں نے مجھے کچّھی سی دی ہے۔ میں کچّھی میں عجیب سا محسوس کرتا ہوں لیکن خوش ہوں۔

"تو نے کچّھی کیوں پہنی ہے؟" تایا جی مسکرا کر پوچھتے ہیں۔

"میں بڑا ہو گیا ہوں!" میں خود اعتمادی سے کہتا ہوں۔

ان کی مسکراہٹ نمایاں ہو گئی ہے، انہوں نے میری پیٹھ تھپکی ہے اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے میرے سراپے کا جائزہ لیتے ہیں گویا میرے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

میں اپنے باپ سے ہر طریقے سے دور ہوں لیکن ایک طریقے سے قریب۔ جہاں کہیں وہ مجھے ہم عمر لڑکیوں میں کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں، جھک کر میرے کان میں کہتے ہیں، "انہیں اپنی پھلّی نکال کر دکھا!" میں جوں ہی ان کے کہے پر عمل کرتا ہوں، ان کے چہرے پر روشنی سی دیکھتا ہوں۔ میرے اندر ایک لہر اٹھتی ہے جو مجھے تھرکتا ہوا چھوڑ جاتی ہے۔

میری سوجھ بوجھ بڑھ رہی ہے۔ میں نے ماں کے اس جھوٹ کی سچائی جان لی ہے کہ اس کی دعاؤں کے صلے میں بھگوان نے مجھے، آسمان سے اس کی جھولی میں نہیں پھینکا تھا بلکہ میں اس کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جیسے گائے کا بچھڑا۔ میں اپنے آپ کو لڑکیوں سے برتر سمجھتا ہوں، یہ اس لئے کہ ان کے چڈّے میرے چڈّوں کے مقابلے میں ادھورے نظر آتے ہیں۔ کچھ کام میں محض اس لئے نہیں کرتا ہوں کہ وہ لڑکیوں سے مخصوص ہیں جیسے بیٹھ کر موتنا۔ میرا ہر فعل میری خودی کی تحسین ہے۔ میں اپنی شرم دھیا، جو تہذیب و تمدّن کا سرمایہ ہے، اسے دست بردار ہوں۔ میں موتتا ہوا دائرہ بناتا ہوں اور کسی سے موت کی دھار دور سے دور مارنے کی بازی لگاتا ہوں۔ میں کسی سے جیتتا ہوں اور کسی سے ہارتا ہوں، جس سے ہارتا ہوں اس کے ساتھ پھر بازی لگاتا ہوں۔ زندگی بڑھتی ہوئی توانائی ہے اور پیچیدگی بھی۔ ریاکاری میری فطرتِ ثانوی بن گئی ہے۔ میں لفظوں سے لفظوں میں تمیز کرنے لگا ہوں۔ وہی الفاظ جو میں دوستوں یاروں کے سامنے بے تکلّف برتتا ہوں، بلکہ برتنے میں فخر محسوس کرتا ہوں، ماں باپ اور بھائی بہنوں کے سامنے ان سے گریز کرتا ہوں۔ میری پھنو کھڑی ہونے لگی ہے۔ اپنی جذباتی کیفیت کی پردہ داری

کے لئے، مَیں چھپ کر پھنّو سے پھنو لڑاتا ہوں۔ یہ لڑائی انوکھی لڑائی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مَیں یہی لڑائی لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ نیکی و بدی مَیں جانتا نہیں، پند و وعظ سے مجھے کوئی واسطہ نہیں، میرے عمل میں میری خود نمائی کا جزو ہے۔ مَیں ہر کام کرنا چاہتا ہوں اور اپنے ہر عمل کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں لیکن بند بِھڑ کا ایسا عمل ہے جس کا ردِ عمل نہیں ہے۔ ویسے یہ فعل مقبول ترین عمل ہے۔ جہاں دو بچے چھپے ہیں، سمجھو وہ اِسی طرح لوٹنے پوٹنے کی حرکت کر رہے ہیں۔

مَیں ہوا کے جھونکے کی طرح ہوں، جو گرمِ سفر ہے لیکن اپنی منزل سے بے خبر ہے اور ہر گھڑی نئے ماحول سے سینہ سپر ہے۔ مَیں وہ سب کچھ کیسے بیان کروں! جو مَیں دیکھتا ہوں، کرتا ہوں اور کرنا چاہتا ہوں مَیں پہلے لکھ چکا ہوں اور اب مکرّر مگر ذرا تصرّف سے لکھتا ہوں۔ زندگی، رفتار ہے اور قلم، رفتار کا حریف نہیں ہوتا۔ مَیں اپنی نشوو نما کو کسی حد تک قلم بند کر کے پھر وہیں لوٹتا ہوں جہاں سے مَیں نے یہ نفسِ مضموں شروع کیا ہے۔

مَیں اپنی ماں کی گود سے نکل کر رینگتا ہوں، کسی چیز کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا ہوں اور سہارے سہارے چلتا ہوں۔ میری ماں مجھے دیکھتی ہے اور خوشی سے مسکراتی ہے۔ مَیں سہارے سے پرہیز کرتا ہوں، لڑکھڑاتا ہوں، گرتا ہوں اور نئے دلولے سے اٹھتا ہوں۔ میری ماں، میری بے کسی پر ترس کھاتی ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چلنا سکھاتی ہے۔ میری دست نگری! مَیں سہارے ہی میں محفوظ محسوس کرتا ہوں لیکن میری خود اعتمادی مجھے سہارے کے بغیر چلنے پر اکساتی ہے۔ میری ماں، میری کوشش کو سراہتی ہے اور میری ہمت بڑھاتی ہے۔ مَیں اُس کے ہمراہ ہوں مگر اپنے ننھے قدموں سے اُس کا ساتھ نہیں دے پاتا ہوں۔ وہ مجھے قدم بڑھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ میری تیز طبعی! مَیں اُس کے برابر برابر چلتا ہوں۔ حُسنِ تغیّر کا کمال! مَیں اِستکانت کی حدوں کو پار کر کے اِستقامت کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہوں۔ مَیں اپنی ماں کے آگے آگے چلتا ہوں اور غرور سے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مَیں اُس کی جگمگاہٹ سے شہ پاتا ہوں اور دوڑ پڑتا ہوں۔ میرے اور اُس کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہے وہ مجھے پکارتی ہے اور آہستہ چلنے کی نصیحت کرتی ہے۔ اُس کے منع کرنے سے میرے قدموں میں تیزی آئی ہے جو میری سرشاری بڑھا گئی ہے۔ مَیں پھر ماں کو دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے پریشان لگتی ہے جیسے اُسے کسی خطرے کی پیش آگاہی ہو۔ وہ مجھے رُکنے کی تاکید کرتی ہے لیکن میری آزادی میری تندی بن گئی ہے۔ وہ ڈرتی ہے۔ مجھے واپس بلاتی ہے اور مجھے بے خوف دیکھ کر نادیدہ آفتوں کا خوف دِلاتی ہے لیکن مَیں اُس کے بلاوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اُس کا تعلّقِ خاطر! وہ مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے بھاگتی ہے لیکن مَیں اُس سے اِس قدر دُور نکل جاتا ہوں کہ نہ اُسے دیکھ پاتا ہوں اور نہ سُن سکتا ہوں۔

میری خودروی میری تحریک بن گئی ہے۔ اخلاقی قدروں سے ڈر کر میں کوئی کام نہیں کرتا ہوں تو مجھے 'ماں کا بیٹا'، یا 'یہ ابھی بچہ ہے' کہہ کر چڑایا جاتا ہے۔ خود کو خود بردار ثابت کرنے کے لئے میں کسی بھی 'کھیل' میں کود پڑتا ہوں اور اپنی صلاحیت کا ڈٹ کر مظاہرہ کرتا ہوں۔ میں حقیقت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اِس کے کہے پر یقین کرتا ہوں، کبھی اُس کے کہے پر۔ حقیقت کی ہمہ رنگی! جو یہاں درست ہے وہاں غلط ہے۔ میں نے خدا کی حقیقت کو پالیا ہے۔ وہ میرے قریب ہوکر بھی مجھ سے دور ہے اور ناکارہ قسم کا ساتھی ہے۔ کسی کام کو اُس پر چھوڑنا، اپنا بیڑا آپ غرق کرنا ہے۔ میں متوحش ہوکر بھی خوش ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسرارِ حقیقت کو پانا ہی زندگی کا واحد انعام ہے۔ میرے خبط کی پیچ، بچے کی ہٹ کی سی ہے جو کچھ نہ جانتے ہوئے سب کچھ جاننے کا ادعا کرتا ہے۔ چوں کہ میری ناکامیاں میری اُستاد ثابت ہوئی ہیں اِس لئے میرے بننے اور بگڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور یہی تغیر کا تسلسل ہے۔

سالانہ کھیل ہو رہے تھے۔ نرنجن سنگھ کبڈی کے میدان میں اُترا۔ اُس کے لیموں جتنے بڑے ممے سب کی نظروں کا مرکز بن گئے۔ کہیں سے بات چلی اور چل نکلی۔ بات مزیدار تھی، میں نے بھی لطف اُٹھایا۔ چوں کہ مجھے ذلیل کرنے کا اُسے منہ پڑا ہوا تھا، وہ سب کو چھوڑ کر میرے سر ہوگیا۔

"مارنے، مروانے کی شرط، تو کسی کھیل میں اُتر آج فیصلہ ہوگا اور ضرور ہوگا!" اُس نے مجھے للکارا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے سب کے سامنے اعتراف کیا۔ وہ اور بپھر گیا اور خم ٹھونکنے لگا، "ہر دو طرح تیری ماروں گا! میدان میں اُترا تو ہرا کر، ورنہ زبردستی ڈھا کر!" وہ جھپٹنے کے سے انداز میں میری طرف بڑھا اور مجھے منکسر پاکر آپے سے باہر ہوگیا اور بدزبانی کرنے لگا۔

میری بزدلی نے میری نفسیات کو عجیب طریقے سے متاثر کر رکھا تھا۔ لڑائی میں پہل کرنا بڑی بات ہے، میں لڑائی کے نام ہی سے ڈرتا تھا اِس لئے فتح کے جذبے کی سرشاری سے ناواقف تھا۔ جنگ جویانہ حالات میں، میں جیتنے کی اُتنی خواہش نہ کرتا تھا جتنی اُس صورتِ حال سے بچ نکلنے کی۔ اُس کے بار بار کھلم کھلا ذلیل کرنے پر میری نامردی ایسے اُڑن چھو ہوگئی جیسے جادو پھونکنے سے ہوتا ہے۔ میرے دِل میں کپکپاہٹ سی اُٹھی، خون میں کوندے کی طرح لپکی اور رگوں کی سنسناہٹ بن گئی۔ سانسوں کی گرمی ایسے بڑھی جیسے میرے اندر آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ میری ساری سلب شدہ اور بکھری ہوئی قوتیں یکجا ہوگئیں۔ وہ اپنی قلبِ ماہیت کرکے اپنی پوری توانائی سے اُبھریں اور فتح کا جذبہ بن گئیں۔ میں نے سنا، میدانِ کارزار، مجھے معرکہ آرائی کے لئے پکار رہا ہے، ایسے بلاوے پر لبیک نہ کہنا، فراری ہے۔ میں مقابلے میں اُتر پڑا اور اپنی مرضی سے اُسے دو میل کی دوڑ کا چیلنج دیا جو اُس نے ایک دم مان لیا۔ اِس انوکھے مقابلے کو دیکھنے کے لئے دوسرے سبھی کھیل بند ہوگئے۔ اُس کی جیت اور میری ہار کی

پیس قیاسیاں ہونے لگیں۔ ہر کوئی دوڑ کے نتیجے سے زیادہ نتیجے کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے بے قرار تھا۔ میرے اندر جرائت کا سیلاب اُمڈ آیا اور میں جو ہو، سو ہو کی ترنگ سے سرشار ہو گیا۔ میرے بھی طرفدار پیدا ہو گئے۔ بلدیو رام اور ترلوچن سنگھ کی نرنجن سنگھ سے لاگ تھی۔ انہوں نے میرے کان میں کہا، "شروع میں تیز نہ دوڑنا باقی سب ٹھیک ہو گا!" سوہن سنگھ کے فیصلے کے مطابق فٹ بال گراؤنڈ کے دس چکر لگانا قرار پایا اور ایک جگہ خط کھینچ دیا گیا۔ میں اپنے حریف کے برابر کھڑا ہوا، اس نے حقارت سے تھوک کر کہا، "تیری آخرت نہ بگاڑ دی تو نرنجن نام نہیں!"

"تیری بھی آخرت نہ بگاڑ دی تو گیان نام نہیں۔"

میں نے خود کو منیو (برائی کا ناش کرنے والا دیوتا) کی طرح دیکھا اور اسے دسیو (نیکی کا ناش کرنے والا راکشس) کی طرح۔

"ابھی پتا چلے گا، ٹھہر ذرا!"

اُس کی ہٹ دھرمی سے لگا کہ وہ، مجھے دسیو اور خود کو منیو سمجھ رہا ہے۔

"ابھی پتا چلے گا، تو ٹھہر ذرا!"

میرے عزم نے میرے منیو ہونے کی تصدیق کی۔

"تیرے ایک چکر میں دو چکر لگاؤں گا اور تجھے پانچویں میں داب لوں گا۔ ارمان نکل گیا آج!" اس نے تمسخر آمیز تبسّم سے کہا اور خوشی سے اوپر اچھلا جیسے اُڑنا چاہتا ہو۔

سوہن سنگھ نے چار لڑکے دوڑائے جو جا کر گراؤنڈ کے چاروں کونوں پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ہجوم کو پرے دھکیلتے ہوئے ہدایت دی، "دوڑ ریڈی، سٹیڈی، گو سے شروع ہو گی۔" اس نے ریڈی، کہا، نرنجن نے شیر جھٹکا، سٹیڈی پر سر دھڑ سے آگے بڑھایا اور گو پر یہ جا، وہ جا ہو گیا جیسے وہ سو گز کی دوڑ، دوڑ رہا ہو۔ میرے ایک چکر میں اس نے ڈیڑھ چکر لگا لیا۔ اس کی واہ واہ ہونے لگی اور میری حیثیت گئے گزرے کی سی ہو گئی۔ میں گھبرایا نہ تھا۔ مجھے تجربہ تھا کہ دس چکر بہت ہوتے ہیں۔ میرا دم پک گیا اور میں نے قدم کچھ تیز کر دیا۔ حالاں کہ میں اس سے پونا چکر پیچھے تھا، اس نے مجھ سے آگے نکلنے کے لئے زور لگایا اور وہ میرے برابر آ گیا۔ اس کوشش میں اس کا اَنس نکل گیا جب کہ میں ترو تازہ تھا۔ میں اس کے قدم سے قدم ملانے لگا، اس نے پورا زور لگا دیا جیسے وہ آخری چکر ہو۔ وہ ہانپنے لگا اور اس کا قدم اُکھڑنے لگا۔ اس کا پچھڑنا میرے حق میں اکسیر ثابت ہوا۔ اس کی ہے ہے، ہو ہو اور میری اَش اَش واہ واہ ہونے لگی۔ اس کا دھونسا بجنے لگا اور قدم لڑھکنے لگا آخر وہ گر پڑا۔ تماش بین اس پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے گھیرے میں آئے شکار پر شکاری کتے۔ میں دوڑ جاری رکھے ہوئے وہاں سے گزرا، میں نے دیکھا کہ میرا حریف ننگا اور بے بس پڑا ہے۔

بلدیو رام اور تر لوچن سنگھ اُس کی ٹانگیں اٹھائے ہوئے ہیں۔ دوسرے لڑکے مجھے پکڑ کر وہاں لائے اور دعوتِ عیش دینے لگے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ جیت جاتا تو مجھے ہرگز معاف نہ کرتا لیکن میں اُسے ذلیل کرنے پر راضی نہ ہوا۔ میرے طرفدار مجھے کوسنے لگے کیوں کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ ان کے بار بار اِصرار پر میں نے بھڑک کر کہا، "حرامی کی پیں نکلی پڑی ہے! اِسے ابھی چھوڑ دو، پھر کبھی ماروں گا اِس کی۔" میں نے اپنی فتح کا نعرہ مارا اور ہر کوئی میرے خروش میں شریک ہو گیا۔

اَب میرے اندر بالکل نیا آدمی تھا جس سے میری پہچان اچانک ہوئی تھی۔ وہ اُس رینگتے ہوئے مظلوم سے الگ تھا، جو مجھے ذلیل رکھتا تھا۔ میرا نیا آدمی خود رَو، خود آرا، خود سر، خود شناس ...... تھا، اُس کی شان و شوکت اُن نظاروں پر کمند ڈال رہی تھی جن کی تمنا میری حسرت بنی رہتی تھی جیسے جذبۂ عشق و نشاط نُقطۂ کمال کو پہنچ کر روبہ زوال ہو جاتا ہے، اُسی طرح وہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میرے حمایتی مجھے بزدل کہہ رہے تھے لیکن اُن کی ملامت، لذّت سے معمور تھی۔ میرا دشمن میرے سامنے بے بس پڑا تھا۔ میری فتح کا جذبہ دو آتشہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا! اُسے میرے دشمن کی اہانت کی ضمانت حاصل تھی۔

نرنجن سنگھ تکان سے نڈھال پڑا تھا۔ میری زبان سے اپنی توہین سُن کر وہ چونچال ہو گیا۔ گالیاں بکتا ہوا اُٹھا اور مجھ پر لپکا۔ میں اپنی جیت کی مستی سے بدمست اپنے دشمن کی بے کسی پر نازاں تھا۔ میری خود پسندی میری رگِ جاں کے لئے سامانِ راحت تھی۔ اپنی خود آرائی کی ہمیشگی کے لئے میں اپنے دشمن کو مجبور و معذور دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی سرکشی بارِ خاطر گزری، میں نے پچکی باندھ کر پینترا بدلا اور لات کھینچ کر اُس کے چڈّے میں ماری۔ وہ نلوں کو پکڑ کر چیخا، سکڑ کر گرا، سری ٹیک مار کر تڑپا تڑپا تو تھ پوتھ ہو گیا۔ میری نئی دلیری نیا ماحول پیدا کر گئی۔ میری خوشی، جو چند ثانیوں کے لئے میرے غصّے میں گم ہو گئی تھی، پھر لوٹ آئی لیکن وہ قلیل سا وقفہ، وہ عہدِ تغیّر کس قدر گراں گزرا تھا! وہ اُسی گرانی کا اعجاز تھا کہ میری نئی مسرت کا مرتبہ پہلے سے زیادہ برتر تھا۔ میں پہلی بار اپنا کمال آپ تھا۔ مرنے اور مارنے کی جبلّت میں حیات افروز فرق تھا۔ پہلی دل آزار پستی تھی اور دوسری دل فریب بلندی۔ میں نے بکرا بلایا، کلکاری ماری اور اُس کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ کہاں میں ایسے حالات میں آنکھیں نیچی کئے اپنی ذلت چھپاتا تھا اور بچ نکلنے کا جتن کرتا تھا کہاں میں آنکھیں پھاڑے اپنے حریف کو تک رہا تھا اور اُس کے سامنے اٹل کھڑا تھا۔

اِنسان نما حیوان کے خلاف میری یہ فتح، مجھ سے زیادہ دوسروں کے لئے باعثِ فخر تھی۔ وہ سب عش عش کر رہے تھے جیسے وہ فتح اُن کی فتح ہو۔ میری ظفریابی میری بڑائی تھی جس کی پاکیزگی مسلّم تھی۔ میری زندگی، رنج و محن سے یوں صاف ہو گئی تھی جیسے بپھری ہوئی موج۔ کنارے پر سے کوڑا کرکٹ بہالے جائے

اور اس پر چاندنی بکھیر جائے۔ میرے نام کے پرانے معنی مٹ گئے اور وہ مجھ پر اپنے نئے عنوان کے ساتھ منکشف ہوا۔ اس کے آہنگ میں ارتعاش تو تھا اب اس کی بساط میں وسعت بھی ہو گئی۔

میں ان اخلاقی قدروں سے روشناس ہوا جو اہنسا کے اصولوں کے برعکس ہیں لیکن میری دانست میں سچی اور قابلِ اعتبار۔ محبت، نفرت کو فتح نہ کر سکے تو اسے فتح کرنے کے لیے اس سے بڑی نفرت درکار ہے۔ خدا نام کی کوئی چیز نہیں ہے! یہ نام بزدلوں، ناداروں، مصیبت زدوں، جاہلوں ....کی ایجاد ہے، جس کی مدد سے وہ اپنے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ عاجزی/مسکینی .... جسے خدا پرست حمد و ثنا کہتے ہیں، شکست زدوں کی اپنی تذلیل و تکذیب کی آہ و بکا ہے۔ نوعِ آدم کا سب سے بڑا فریب آدمی نے خود پیدا کیا ہے، پروردگار مددگار!

میں نے اپنا خدا کھو دیا لیکن خود کو پالیا۔ اپنا مردہ، جسے میں زندہ سمجھ کر اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا، اسے میں نے وہاں پھینک دیا، جہاں اس کی جگہ تھی۔

باب ۳۲

اُڑے سے جاتے ہیں شاطرؔ وصال کے لمحے
کچھ ان پہ روک لگاؤ بہار کے دن ہیں (شاطرؔ)

میری زندگی میں وہ وقت آچکا تھا جب ہر کوئی شاعر بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ وہ وقت، نازک وقت ہے! آدمی دماغ کے بدلے دل سے سوچتا ہے، اپنے آپ کو ہر لڑکی کا معبود سمجھتا ہے اور گنگناتا پھرتا ہے،

جھناں نوں لوڑ متراں دی
لک دھمن پتناں تے کھڑیاں

(جسے مجھ سے محبت ہے، وہ کمر باندھے گھاٹ پر کھڑی ہے اور میری راہ تک رہی ہے)

بوالہوس، شاخوں میں انگڑائیاں لیتی کنواریاں دیکھتا ہے اور اپنے تصور میں ان کا پیچھا کرتا ہوا دور تک نکل جاتا ہے۔ اس نازک وقت کی خوشبو، میں نے اپنے مضمون 'ماں دی دلچ دِل' میرے گاؤں کا کنواں میں سونگھی تھی۔ اس کا اثر کتنا متضاد تھا! جہاں میری طبیعت سرشار ہوتی تھی بھیم سین کی بگڑ گئی تھی۔ میری

گستاخی کی پاداش میں مجھے اُتنے نفی نمبر ملے تھے جتنے مضمون کے نمبر تھے۔ اِس کے باوجود میں نے سربلند محسوس کیا تھا جیسے میرا رویّہ صحیح ہو۔

"تیرتھ کور کنوئیں سے ڈول کھینچتی ہوئی جھولتی ہے جسے دیکھ کر میرے لہو میں دھنک سی ٹوٹتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ویسے ہی جھولتی رہے اور میں کتاب کے پیچھے سے چھپ کر اُسے دیکھتا رہوں۔"

اُنتالیس لفظوں کی یہ نثر، نثر نہ تھی، میری بساطِ ہوس کی ڈھکی چھپی حقیقت تھی۔ ایسے کنوارے جذبات کی ہلکی سی عکاسی اِن بولیوں میں ملتی ہے۔

کِدّاں دسّاں اَمبڑی نوں
میرا باجرے چے لونگ گواچا
(میں اپنی ماں سے کیسے کہوں کہ میرا لونگ باجرے کے کھیت میں گم ہوا ہے)

پہلاں کہندا اے دوئیں آرسی
پچھوں گل نئیں سِدھے منہ کردا
(پہلے آرسی کا وعدہ کرتا ہے لیکن بعد میں سیدھے منہ بات نہیں کرتا ہے)

کئی لڑکیوں کے دل میں میرے لئے لطیف جذبہ تھا جس کا اظہار وہ اپنے انداز میں کرتی تھیں۔ وہ کہیں راستے میں ملتیں، مسکرا کر پاس سے گزرتیں اور پھر تا حدِ نظر پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتیں۔ وہ کھیتوں میں کام کر رہی ہوتیں اور مجھے دور سے آتا دیکھ لیتیں تو اپنوں کی نظر بچا کر دیہقانی تحفے ڈانڈے پر رکھ جاتیں۔ وہ معصوم لگاؤ اُن ڈھکے چھپے جذبوں کے نمائندے تھے جو اپنی وجہ سے ظاہر ہونے سے جھجکتے تھے۔ وہی جانے وہ کون تھا؟ جس نے اپنے اَن کہے جذبوں کو یوں بیان کیا ہے۔

ساڈے دل دیاں دل وچ وسیاں
نہ اونے پچھیاں نہ اسیں دسیاں
(میرے دل کی باتیں دل ہی میں رہیں، نہ اس نے پوچھیں اور نہ میں نے بتائیں)

میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دوں۔ میں دوبارہ سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ باتیں میری زندگی کی بنیاد ہیں جن پر میری حقیقت کی تعمیر کھڑی ہے۔ تایا جی اِسی بات کو الگ طریقے سے کہتے تھے، "بڑی بڑی باتیں پیغمبر کرتے ہیں کیوں کہ وہ ذمہ داری سے بری ہوتے ہیں۔ ذمہ داری سے آدمی انسان بنتا ہے اور چھوٹی بات ذمہ داری کا تقاضا ہے۔"

یہ دقت درشن سنگھ پر بھی آیا تھا۔ اُس نے اُسے لاکھ چھپایا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا۔ کسی نے

گھاٹ پر اُس کی راہ دیکھی کہ نہیں ! یہ راز، اُسی کا ہے۔ ہاں مَیں اِتنا جانتا ہُوں کہ وُہ اپنی دھات کا علاج اُس گائے کے دُودھ سے کرتا تھا جو ہریانہ کی بھٹیاری نے پال رکھی تھی۔ بھٹیاری کی گائے سے زیادہ اُس کی کنواریوں کی دھُوم تھی، جن کے بارے میں رومینٹک مزیدار بات بتایا کرتا تھا، "ان کے تھن، گائے کے تھنوں سے اچھے ہیں کیوں کہ دو ہینے کے لئے پنہانے اور سہلانے نہیں پڑتے ہیں!"

مَیں اُن منزلوں کو سر کرنا چاہتا جن کا خیال غیر واضح ہو کر بھی واضح تھا۔ مَیں اپنے دائرۂ اختیار کو ہر طریقے سے بڑھانا پسند کرتا۔ اپنے فعل کے جواز کے تحفّظ کے لئے مجھ میں متضاد ضمیر جاگ پڑا تھا۔ قارئین، میری یہ یاد مجھے دھوکا دے رہی ہے! یہ نزاعی ضمیر میرے بچپن ہی سے مجھ میں موجود ہے مَیں جوڑوں سے کھیلتا تھا اور دِل ہی دِل میں اُن کی خوبصورتی سے محظوظ ہوتا تھا کہ میری ماں وہاں آ گئی۔ مَیں اُس سے اُن خوبصورت کھلونوں کی تعریف کرنے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا، "دیکھا بیٹا، جوڑے کتنے اچھے ہیں!"

مجھے لگا کہ ماں نے میرا خیال چُرا لیا ہے۔ مَیں نے حقارت سے منہ بنا کر کہا، "کہاں اچھے ہیں؟ اُونہہ، بالکل گندے ہیں!" میں نے اُن سے کھیلنا چھوڑ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میری ماں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کاندھے اُچکا کر رہ گئی۔ میرے ماہ و سال نے جہاں میرے ایسے روّیے کو چمکایا وہاں مجھے اپنے اچھے اور بُرے خیال کی حفاظت کرنے کا فن بھی سکھایا۔ میں بلونت سنگھ زخمی سے متعارف ہوا تو میری یہ انوکھی کیفیت اپنی انتہا پر تھی۔ وُہ میرے ننھیال، بودلاں کا رہنے والا تھا اِس لئے مَیں اُسے ماما جی کے لقب سے بُلاتا تھا۔ ہوتے ہوتے اُس کی رسائی دُکان سے گھر تک ہو گئی۔ ویسے وُہ تھا عجیب آزاد مرد! وُہ کوئی کام دھام نہ کرتا اور گھومتا پھرتا رہتا اور جہاں رات پڑتی وہیں کہیں ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لیتا، خواہ انجانے لوگوں کے بیچ کیوں نہ ہو۔ اُس کی کھبّی بانہہ شانے کے قریب سے غائب تھی اور سجّے ہاتھ کی دو اُنگلیاں نابود۔ وُہ اپنے ادھورے ہاتھ کو نفیس، رنگین اور مہکتے ہُوئے رومال سے اِس ہوشیاری سے ڈھانکتا کہ پُورا لگتا۔ اُس کے پگڑی باندھنے، کپڑے پہننے اور ڈاڑھی مونچھ سنوارنے کے سلیقے سے اُس پر ٹُنڈا ہونے کا گمان نہ ہوتا۔ وُہ کس قدر پابند و محتاط تھا! سانجھ سویرے ٹھنڈے پانی سے اشنان کرنا، گھنٹا آدھ گھنٹا پُوجا پاٹھ میں گزارنا، بیٹھ کر مُوتنا، مُوت کر ہاتھ پاؤں دھونا، کھانستے کھنکارتے وقت منہ پر رومال رکھنا، بالوں کو ننگے ہاتھوں نہ چھُونا اور چھوٹے بڑے سے نرمی سے مِلنا اُس کی عادت کی نفاست تھی۔ اُس کے طور طریقے طہارت پرورده تھے۔ میرا خیال تھا کہ وُہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے، جو مادّہ پرستی تیاگ کر روحانی زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کا اندازِ تخاطب کس قدر دِل رُبا تھا۔ ماتا جی، جی ماتا جی، پِتا جی، جی پِتا جی، ویر جی، جی ویر جی، بہن جی، جی بہن جی، ہاں جی، جی ہاں اور جی جی کی موسیقی، نمک پر میٹھے اور میٹھے پر نمک کا سا مزہ دیتی تھی۔ اپنے حُسنِ بیان سے ملتا وُہ یہ شعر سنایا کرتا تھا۔

نین سلونے ادھر مدھ کہہ رحیم بڑ کون؟
میٹھا بھاوے لون پر اور میٹھے پر لون

بد مزہ سے بد مزہ مضمون اُس کی زبان سے کیف کے ساغر کی طرح چھلکتا۔ اُس کی زبان اُس کا پیشہ تھا۔ وہ حسبِ موقع اشعار سناتا اور اپنے انداز کو پُر اثر بناتا۔ دھارمک گرنتھوں میں ایسے اشعار کی بھرمار ہے جو دو محبت کرنے والوں کی دوری و حضوری کی کہانی بڑے غم انگیز اور حسرت آمیز الفاظ میں کہتے ہیں۔ بھگتوں اور سنتوں نے خود کو معشوق اور خدا کو اپنا روحانی عاشق تصوّر کیا ہے اپنے آفاقی رشتے کو یوں نبھایا ہے کہ بالکل ارضی لگتا ہے۔

آج نہ سُتّی کنت سیوں میرا انگ مڑے مڑ جائے
جاؤ پُچھو ڈہاگنی اوہ کیوں کر رین بتائے

(میں آج اپنے کنت کے ساتھ نہ سو سکی، میرا ہر انگ درد سے تڑپ رہا ہے۔ اُس ابھاگن کی کیا حالت ہوگی؟ جسے اپنے پتی کی سیج ہی میسّر نہیں ہوتی۔)

وہ ان اشعار کے معنی بیان کرتا تو ان کے خالق کی جگہ اپنے مقصود پر زور دیتا، جو بنتے بنتے سننے والوں کی نفسیات بن جاتا اور لگتا وہ، انہیں کے دل کی بات کرتا ہے۔ جس کسی پر اُس کا جادو نہ چلتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتا، وہ اُس کی بے قراری بھانپ لیتا، بار بار اُسی سے مخاطب ہوتا اور اُسے روکے رکھتا۔ باتوں باتوں میں بات کسی نازک مرحلے پر پہنچتی، وہ ادھ کھلی آنکھوں سے جھومتا اور اپنی بات سے رس لیتا جان پڑتا۔ اُس کا ماضی اُس کی خود ستائی کی کہانی تھی۔ وہ غدر پارٹی کا ماہرِ اسلحہ رُکن تھا۔ وہ ٹرین اُڑانے کے لئے بم بنا رہا تھا کہ بم پھٹ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ وہ ایک پٹھان کی فوری اور وقتی مدد سے جانبر ہوا اور اُسی کے گھر میں مہینوں روپوش رہا۔ اُس کے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے پر سرکاری انعام تھا اِس لئے وہ آزادیٔ وطن کے بعد ہی گوشۂ گمنامی سے باہر آیا تھا۔ چوں کہ آزادی حاصل کرنا اُس کی زندگی کا اوّل و آخر مقصد تھا اس لئے اُس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

وہ نوجوانوں کو جو کہانیاں سناتا تھا اُن میں ایک 'پری زاد' ہوتی تھی جو اُس سے والہانہ عشق کرتی تھی لیکن وہ اُس کی محبت سے بے پروا ملک و قوم کی خدمت کرتا رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک معصوم دوشیزہ کی تصویر تھی جو سرسوں کے کھیت میں کھڑی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، تھی، لیکن اُس کی سادگی میں ایسی پرکاری تھی کہ اُسے بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اُس تصویر کو ریشمی رومال میں یوں چھپاتا کہ وہ پردے میں ہو کر بے پردہ ہوتی، اِس لئے خواہش مند کی کمزوری۔ جہاں تک اُس کے اپنے نقش و نگار تھے، عُمر کے

لحاظ سے دیکھو تو تیز تلوار تھے۔ ماتھا، قدرتی طور پر کشادہ تھا۔ ہونٹ، چھدری مونچھوں میں سے صاف دکھائی دیتے اور کالی مونچھوں کے پس منظر میں لال لگتے۔ رخسار کی ہڈی اونچی نہ تھی۔ چوں کہ وہ رخسار پر سے بال اکھاڑتا رہتا تھا اس لئے گال ابھرے ہوئے اور چکنے تھے۔ ناک کو چہرے سے الگ کر کے دیکھو تو خوبصورت نہ تھی لیکن اپنے ناتے داروں میں بیٹھی جچتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اپنی کہانی جھلسیاں ہڈیاں کے عنوان سے لکھ رہا تھا؛ وہ کیا لکھ رہا تھا اس نے کبھی سنایا نہ تھا لیکن اس کی کہانی کا عنوان نہایت دردناک اور خیال افروز تھا۔ وہ ہمارے گھر آتا، میں جی جان سے اس کی خدمت سے کرتا اور وہ میرے معمولی سے معمولی کام کو کھل کر سراہتا۔ ویسا حسنِ سلوک ہمارے گھر کا رواج نہ تھا اس لئے وہ مجھے اور بھی اچھا لگتا۔

پوس جوان تھا۔ سورج کی گرمی پُر اسرار طریقے سے غائب ہوگئی تھی۔ وہ جلتے ہوئے الاؤ کے برعکس ٹھنڈا گولا سا نمودار ہوتا تھا۔ ہمالیہ آسمان کو چھو رہا تھا اور آسمان سردی کھائے اعضا کی طرح نیلا نیلا تھا۔ ہمالیہ کے پاؤں میں شوالک کے پہاڑ، ٹیلے لگتے تھے۔ دور دور تک بادلوں کا نشان نہ تھا۔ کہیں کوئی ٹکڑا تھا تو وہ روئی کا اڑتا ہوا گالا لگتا تھا۔ شبنم کے موتی دھندلے آئینوں کے سے غیر دلچسپ اور بے رعونت تھے۔ اپنی حرارت بحال رکھنے کے لئے رگیں، سانس کی پوری گرمی نچوڑ لیتیں اور وہ بیچاری منہ میں جمتی جمتی جانے کیسے نہ جمتی؛ اور بالکل کہرے کی طرح خارج ہوتی۔ کھلی ہوا، سرد فضا سے ڈرتی بند کمروں کی تلاش میں رہتی اور جہاں کہیں راہ پاتی، اندر گھستی اور گرم گوشوں میں چھپ جاتی۔ اجالے پر جھٹ پٹے اور اندھیرے پر گہرے اندھیرے کا گمان ہوتا۔ ہر چیز مائل بہ زوال تھی لیکن ہاں! چاند ستاروں کا وجود آئینہ دارِ آفرینش تھا۔ ذی روح تو ذی روح تھے، غیر جاندار ڈرے ڈرے سے رہتے۔ تالاب کا پانی ہرے بور کے نیچے سر چھپائے سویا رہتا۔ مویشی ادھر منہ نہ کرتے جیسے دونوں کسی خاموش معاہدے کا لحاظ کرتے ہوں۔ شام و سحر اپنے انداز میں ویران تھے۔ پرندے دن چڑھے چہچہاتے اور دن ڈھلے چپ سادھ لیتے۔ دھرتی، سبزے کو سردی سے بچا نہ سکی تھی لیکن شاخوں کی ممتا دیدنی تھی! وہ نازک کونپلوں کو اپنے ریشوں میں ایسے چھپائے تھیں جیسے بیج، انکور کو۔

گرمیوں میں میرا تھا، ٹٹوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اب وہ جاڑے کا مارا ان کی آغوش ہی سے نہ نکلتا۔ بھٹی کے اطراف ہجوم کی گرم باتیں ہڈیوں کی حرارت قائم رکھنے کے لئے ناکافی تھیں۔ ہم گلیوں میں سے گھاس پھوس اکٹھا کرتے، الاؤ جلاتے اور داؤ لگتا تو اپنی ضرورت کے لئے بیلنوں سے پچھی (کھوئی) چرا لاتے۔ ہم آگ تاپتے ہوئے کانپتے اور روئی دوئی کی کہاوت دہراتے، چڑھیا پوہ، بچن کے اوہ، جیہڑے سون کے دو (پوس شروع ہوگیا ہے، اس کی سردی کی سختی سے وہی بچ سکیں گے جو جوڑا، جوڑا سوئیں گے)

میں الاؤ تاپ رہا تھا، آسمان کی دائمی متانت گیتی پر اثر انداز تھی اور چاند ستاروں کی دل آرام روشنی

انسانی رفاقت کی غماز تھی۔ سکوتِ شب میں حسن نشو و نما کی تحریک تھی اور اس کی تاریکی، زندگی میں مضمر حقیقت کا مظہر۔ در و دیوار لبِ راز آشنا بنے ہوئے تھے۔ دِل میں آغازِ سفر کی سی بے قراری تھی اور نظر، شوقِ منزل بنی ہوئی تھی۔ پیپل کا درخت ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی محبوب، محبوبہ کے انتظار میں ہو۔ راستہ چند قدم تک دکھائی دیتا تھا گویا کسی کے قدم لینے کے لئے حدِ نظر سے آگے دور نکل گیا تھا۔ میں وُہی حیات آفریں ضرب المثل دُہراتا اور اپنی دُنیائے مراد کا نظارہ کرتا ہُوا، آگ پر ہاتھ تاپ تاپ کر ستروں کو سہلاتا۔ وُہ ایسے تنے ہُوئے تھے جیسے پھٹائی پھوٹنے سے ذرا پہلے بیج۔ اچانک پیپل کا پیڑ ہلا جیسے کسی کو جگہ دینے کے لئے پیچھے ہٹا ہو۔ راستہ پلٹ آیا اور اپنے ساتھ زخمی کو لایا۔ مَیں بے ساختہ اُٹھا اور ماما جی کہہ کر اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے مجھے گلے لگایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر کہا، "آپ بڑے ہو گئے ہیں، مجھے میرے نام سے بلایا کرو!"

اُس کا بے تکلف انداز مجھے پسند آیا، خاص کر میرے لئے کُل اور اپنے لئے واحد کی تعبیر۔ بھایا جی تلوال میں ٹال پر رہتے تھے اور درشن سنگھ ہریانہ میں۔ درشن سنگھ کی بیکاری کا حل نکالنے کے لئے اجیت سنگھ یوت مال، مہاراشٹرہ میں چلا گیا تھا اور درشن سنگھ نے سائیکلوں کی دُکان کے ساتھ "ٹائپنگ انسٹی ٹیوٹ" کھول لیا تھا۔ گھر میں میری حیثیت بڑے کی سی تھی۔ مَیں نے زخمی کا بستر اپنے کمرے میں لگایا۔ اُس نے اشنان کیا، کھانا کھایا اور جیسا کہ اُس کا معمول تھا، آنکھیں نیم وا کر کے مُنہ ہی مُنہ میں پاٹھ کرنے لگا۔ اتنے میں ماں دروازے پر آئی اور کہنے لگی، مجھے لالٹین چاہیئے، پشو اندر باندھنے ہیں۔ میں نے کچھ کہے بغیر کھونٹی پر سے لالٹین اتاری اور لے جا کر اُس کے حوالے کر دی اور اُس سے چراغ لے کر میز پر رکھ دیا۔ مَیں رزائی میں گھسنے لگا۔ مَیں نے کمرے کے ماحول میں واضح فرق محسوس کیا، زخمی بول بول کر پاٹھ کر رہا تھا۔ وُہ آنکھیں بند کئے باہری ماحول سے بے خبر تھا جیسے رُوحانی اہتزاز میں ہو۔ مَیں نے بستر پر لیٹ کر رزائی کو اپنے گرد لپیٹ لیا، اور ٹھنڈی ہوا کو بھینچ کر باہر نکال دیا جو میرے اُٹھنے سے اندر گھس آئی تھی۔ مَیں نے سر ڈھانک کر بڑی احتیاط سے چہرہ ٹھوڑی تک ننگا کیا اور زخمی کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر وُہی سنجیدگی تھی جو ہمیشہ رہتی تھی لیکن تھوڑی دیر پہلے کسی وجہ سے الوپ ہو گئی تھی۔ مَیں بے سر و پا سوچتا ہُوا وقت کاٹنے لگا اور بے ارادہ اُس کے معمول سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اُس حالت میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اندھیرا بڑھنے لگا۔ مَیں نے چراغ کو دیکھا، بتی کا گُل بڑھا ہُوا تھا اور شعلہ پھیلا ہو رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر چراغ اُٹھا کر دیکھا، فتیلہ چھوٹا تھا۔ اُس کا آخری سرا بڑی مشکل سے تیل کو چھوتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مَیں جاؤں، ماں کے کمرے سے تیل کی بوتل لاؤں اور چراغ کو مُنہ تک بھر دوں۔

مَیں دو دِلی سے لڑتا ہُوا اُٹھا، باہر گیا اور ماں کے کمرے میں جھانکا، وُہ لالٹین بڑی کر کے سو رہی تھی۔ مَیں نے اُسے جگانا مُناسِب نہ سمجھا، لوٹ آیا اور دروازہ بھیڑ کر اُسے اندر سے بند کر دیا۔ اِتنے میں مجھے میری مُشکل کا دُوسرا حل مِل گیا۔ مَیں نے چراغ کو کاپی کی مدد سے تِلوانس دیا اور گُل جھاڑ دیا جس سے وُہ پہلے کی سی آب و تاب سے جلنے لگا۔ مَیں نے رزائی میں گھس کر زخمی کو دیکھا، وُہ پاٹھ ختم کر کے مُسکرا رہا تھا۔ مُسکرانے کا کوئی موقعہ محل نہ تھا لیکن مَیں اخلاقاً جواباً مُسکرایا۔ اُس نے وارفتہ سا ہو کر دروازے کی جانب دیکھا اور اپنے بِستر پر سے اُٹھ کر میرے بِستر پر بیٹھ گیا۔ میری خُود رفتگی! مَیں کُچھ اِدھر سرک گیا اور اُسے رزائی میں لے لیا۔ میرا حال چال پُوچھتے ہُوئے، اُس نے مجھے کاپھے کے اُوپر سے چھوا جیسے اُس کا ہاتھ بھٹک گیا ہو۔ مقامی گرمی کی لہر اُٹھی اور سنسناتی ہُوئی رگوں میں دوڑ گئی۔ اُس نے اُسی انداز سے مجھے دوبارہ چھُوا اور یُوں پکڑا کہ جانے نہ دیا۔ پھر تو مَیں خُود اُس کے ساتھ ہولیا۔ کُچھ نئے راستے کی تلاش، کُچھ تلاش کی بے قراری، کُچھ بے قراری کی تندی اور کُچھ تندی کی سرمستی، ہوا کا جھونکا آیا، چراغ کی کانپتی ہُوئی روشنی بجھنے لگی اور بجھتے بجھتے بجھ ہی گئی۔ لیکن اُس سے فرق نہ پڑا! میری رگوں میں ایک کوندا لپکا، اُس نے مجھے وُہ چمکارا دکھایا جس کا نُور عارضی ہو کر بھی دائمی تھا۔

وُہ سحر میری زِندگی کی نرالی سحر تھی اور نُورِ آفتاب کے بجائے جمالِ رُوح میں نہائی ہُوئی تھی۔ اُس سحر کا آفتاب پردۂ اُفق کے برعکس میرے لہُو سے طلوع ہُوا تھا جو میری رگوں میں صدیوں اور صدیوں سے موجزن تھا۔ مجبُوری کی بے سروپائی سے مختاری کی منزل تک پہنچنے کے لئے اُسے کتنی طویل اور کیسی کڑی مسافت طے کرنی پڑی تھی۔ اپنی گردشِ افزائش کی تکمیل کے لئے وُہ کیسے کیسے حادِثوں سے جانبر ہُوا تھا! تغیرّوں سے گُزرا تھا! بیک وقت پوشیدہ و ہویدا رہا تھا۔ اُس کا مُنکشف ہونا اُس آغازِ حیات کی تجدید تھی جو آدم کی تخم ریزی سے شرُوع ہُوئی تھی، میرے بھایا جی کی وساطت سے مجھ تک پہنچی تھی اور نئی تحریک کی مُرتکب بنی تھی۔

قارئین! مَیں ایک نئے طریقے سے اپنے بھایا جی کا مقروض ہُوں۔

میرا ننھا، میرے ساتھ میرے ہاتھوں میں جوان ہُوا تھا۔ مَیں نے اُسے ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی اپنے خواب کو پُورا ہوتے ہُوئے دیکھے۔ میری محویت میں لگتا کہ وُہ دُنیا کی سب سے دِل فریب شے ہے۔ وُہ مجرُوح ہُوا، مجھے لگا کہ اُس کا زخم، زخم درخُون ہے، خُون کی لذّت ہے جِسے مَیں نے رگوں کی زبان سے چکھا ہے۔ میرے جِسم میں لہُو کی لذّت منڈلانے لگی، جِس کی پذیرائی سردی کے الاؤ کے تاپ کی سی تھی۔

اُس تاپ کا تپاک مُسلسل تھا، جِس سے میرے اعضا روشن ہو گئے۔ مَیں، اُن کے اندر دیکھتا اور وجد کرتا۔ مَیں اِس بات پر حیران تھا کہ وُہ وجد میرے لہُو کا ازلی راز تھا لیکن مَیں نے اُسے اِتفاقاً پایا تھا۔ لہُو دیکھنے میں کچھ اور تھا لیکن اَصل میں کچھ اور۔ چوں کہ اُس کی تقدیر ناقابلِ تفسیر ہے، مَیں اُسے ماورائے اِدراک سے تعبیر کرتا ہُوں۔ وُہ گھڑی وقتی تھی لیکن اُس کی رفاقت دائمی۔ اُس کی پہچان سے مَیں اُس جذبے سے رُوشناس ہُوا تھا جو تحریکِ خُود نمائی و خُود سازی ہے۔ مُجھ پر انوکھی جِبلّت آشکار ہُوئی تھی! اِتلافِ ذات میں اقرارِ ذات کی شانِ اِدّعا۔

جگدیو سِنگھ لڑائی کے مَیدان میں یکّہ تاز تھا اور ویسا ہی اُس کا تجزیہ۔ وُہ اپنے زخموں کو فخر سے دیکھتا ہُوا کہتا، لڑائی جیتنے کے لئے میرا لڑائی میں زخمی ہونا لازمی ہے!"

لیکن میرے زخم کی داستانِ رنگ و بُو میرے زخم ہی کی طرح نِرالی تھی۔ مَیں مویشی چرانے جاتا، کیکر کی چھال اُتار کر ٹھیکرے میں اُبالتا اور زخم کو نیم گرم رَس سے دھوتا۔ اُس کی جلن، مستی تھی جِس کی عِشرت افروزی کا نشہ ٹُوٹتا ہی نہ تھا۔ مَیں زخم کو کھُجلاتا اور اُس کے درد میں لذّت محسُوس کرتا۔ کھُجلانا اور سہلانا ترغیب انگیز اعمال ہیں اِس لئے دونوں اپنا تَسلسل چاہتے ہیں۔ زخم بھرا تو مجھے سہلانے کا چسکا پڑ گیا۔ یہ بُری عادت، ہوس پرستوں کی دِل آویزی ہے جسے وُہ خاموش بندگی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اپنے ننّھے کو شکل پزیر ہوتے دیکھ کر مَیں مسرور ہو جاتا۔ اِس مَصدرِ ہستی کا خیال، جمالیاتی مَسرّت کی حقیقت اور لمس، جملہ ظواہر کی لذّت تھی۔ مَیں اِسے خُود سے جُدا کر کے دُور سے دیکھنا چاہتا۔ اُس فن کار کی طرح جو اپنے فن پارے کو تراشتا ہے تو کبھی اُسے قریب سے، کبھی دُور سے، کبھی اِس پہلُو سے، کبھی اُس پہلو سے دیکھتا ہے، اُس کے نقش و نگار سنوارتا ہے جو اُسے ہر بار پہلے سے زیادہ رواں اور نمایاں لگتے ہیں۔ اُس کا ہر جتن اور ہر تعیّن ایک پُر تخیّل شاہکار کو عملی صُورت میں دیکھتا ہے اور اُسے زندۂ جاوید بناتا ہے۔ میرا ننّھا کتنا مُجمّل تھا! کتنا مُکمّل تھا! چاہت کی زبان تھا، لذّت کی جان تھا، رعنائیِ خیال تھا، حُسن کی مِثال تھا، فطری طور پر تہذیبِ نَفس کا مُبصّر تھا لیکن خُود ستائی کے لمحوں میں عیش دوست تھا۔ اُس سے میرے رِشتے کی نوعیّت ہی بدل گئی۔ وُہ میرے لئے اندھے کے سہارے کی طرح تھا، جِس کے بغیر وُہ اپاہج محسُوس کرتا ہے۔

مَیں اپنی زندگی پر سرسری نظر دوڑاتا اور کبھی سنجیدگی سے غور کرتا۔ مُجھے کوئی لمحہ ایسا یاد نہ آتا جب کسی نے مُجھے میری اِس جاں ستاں ضرورت اور جاں افزا جِبلّت کے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ مَیں تیاگ اور تپسیا کے مُتعلق جتنی باتیں سُن چُکا تھا اُن کا ازدواجی اور عملی زندگی سے کوئی سمبندھ نہ تھا۔ وُہی

فضول باتیں کھلے عام بحث کا موضوع رہتی تھیں اور عین حیات بتائی جاتی تھیں۔ نفسانی جبلت، جسمانی و روحانی وصال کا وسیلہ ہے لیکن اُسے ننگِ حیات سمجھا جاتا تھا۔ میں اخلاقی قدروں پر وچار کرتا ہوا یہ نہ سمجھ سکتا کہ قواعد و ضوابط کے موجدوں نے انسانی طبیعت کی جس خوبی کو خرابی قرار دیا وہ اُن کی بھی صفت رہی تھی پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ آدمی کی سچائی الٹی سیدھی سچائی ہے! یہ جس فعل میں خوش رہتا ہے، دوسرے کو اُسی سے روکتا ہے تاکہ اس کی انفرادیت برقرار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے سروں پر بڑوں کی بڑائی کے خنجر لہراتے ہیں نہ کہ تربیت کے سائے۔ چونکہ بچوں کی فطرت، بڑوں سے تحقیق طلب ہوتی ہے اور اپنی سرگرمی میں انہیں کسی کی اعانت نہیں ملتی ہے، وہ اپنے اضطراب میں بھٹک جاتے ہیں اور مطلوب مقام پر پہنچتے ہیں لیکن ٹیڑھے میڑھے راستوں سے، اندھیرے اجالے تجربوں سے۔

نفس پرستی اُتنی ہی پرانی جبلت ہے جتنی کہ حیاتِ آدم۔ میں اپنے قارئین سے ایک غیر متوقع سوال پوچھتا ہوں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کو اس جبلت کے بارے میں کبھی کچھ بتایا ہے؟ میرا یقین ہے کہ آپ میری ہی طرح اپنے والدین کی بے توجہی کا شکار رہے ہیں! یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم، اُن کے اس قدر قریب ہو کر کس قدر دُور تھے! جنسی ضرورت کے لحاظ سے وہ ہمیں ہیچ سمجھتے تھے جب کہ ہم ہمہ تن سرگرم تھے۔ ہم اُن کی ریاکاری کا یرغمال تھے جس کی تلافی ریاکاری تھی۔

قارئین! نفس پرستی احسن قوت و ادراک ہے۔ یہ شائستہ ماحول میں پروان چڑھے تو انسان کی نرم و نازک اور غیر معمولی خوبیوں کو اُجاگر کرتی ہے اور انہیں وصف و ثنا کے مرتبے تک پہنچاتی ہے ورنہ اپنی ہی لعنت بن کر رہ جاتی ہے۔

میں کلاس میں بیٹھا اپنے ننھے سے کھیل رہا تھا کہ رگھبیر چند نے مجھ سے سوال پوچھا۔ میں اپنی دُھن میں سن نہ سکا اور اس نے مجھے کھڑا ہونے کا حکم دے دیا۔ ترلوچن سنگھ میرا ہم نشین تھا، اُس نے میرے کہنی ماری لیکن مجھے سنبھلنے اور اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ رگھبیر چند نے غصے سے پوچھا، "تو کیا کر رہا ہے؟"

ترلوچن نڈر مسخرا تھا، اس نے سر کھجلاتے ہوئے کہا، "جناب، منکا پھیر رہا ہے۔"

وہاں کون تھا جو منکا پھیرنے کے معنی نہیں سمجھتا تھا! کلاس روم، قہقہہ زار میں بدل گیا۔ رگھبیر چند نوجوان اُستاد تھا اور خوش مزاج بھی، وہ خود ہنسنے لگا اور پھر لڑکوں کو مصنوعی غصے سے ڈانٹ کر چپ کروانے لگا۔

بچہ دانتوں پر آئے تو اُسے دستوں کا روگ لگ جاتا ہے اور سنِ بلوغ کو پہنچے تو تاک جھانک کا روگ لگوا لیتا ہے۔ پہلا روگ طبعی ہے اور دوسرا اکتسابی، پہلی صورت میں اس کی حالت ترحم آمیز ہے اور

دوسری صورت میں قابلِ مذمت، جس کا میں کئی بار مرتکب ہوا ہوں۔

کیسر سنگھ اور میں، رومیش کے رہٹ پر بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ کوئی ادھیڑ عمر کی گھسیارن پانی پینے آئی۔ کیسر نے مجھے اُکسایا اور میں نے اُسے آنکھ مار کر کہا، کیا حال ہے؟

وہ خلافِ اُمید تن کر کھڑی ہو گئی اور مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی، "تیرے منہ سے دودھ ٹپکتا ہے اور میرا حال پوچھ رہا ہے تو!"

"اور کس کا پوچھوں؟" میں اپنی ندامت اور دہشت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"اپنی ماں کا! اپنی بہن کا!! ویسے کوئی نہ کوئی اُن کا حال پوچھ ہی رہا ہوگا، اسی طرح!"

اُس نے میری ماں اور بہن کا ذکر کیا تو میں غصے سے بپھر گیا لیکن اُس کی پوری بات سُن کر کانپ گیا اور شرمندہ ہو کر بے زبان سا اُس کا منہ تکنے لگا۔ بات وہیں ختم نہ ہوئی، اُس نے مجھ پر تھوک کر کہا، "کل تو جسے بیاہ کر لائے گا، وہ کسی کی چوسی اور چچوڑی ہوئی ہوگی۔ لیکن تجھے کیا فرق پڑے گا؛ تو خود گندگی کا کیڑا ہے"

اُس نے مجھ سے جو کہا وہ توہین آمیز سے زیادہ شرم خیز تھا۔ میرا وہی جذبہ جسے میں مسرت کا دھارا سمجھا تھا، ندامت کی بدرو بن گیا۔ اِس وقت میں اُس اجنبی گھسیارن کے پاکیزہ جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ میری نفسیات واقعی گندگی کے کیڑے کی سی تھی لیکن مجھے احساس نہ تھا۔

میرے اطراف ایسے لوگوں کا انبوہ تھا جو اپنے نفسانی رویّوں کے مظاہرے جن شرمناک طریقوں سے کرتے تھے وہ سب منافیِ اخلاق ہیں۔ میں اُن سب کی تفصیل میں نہ جاؤں گا اور اپنے بیان کو اپنے دو ایک دوستوں تک محدود رکھوں گا۔ کیسر سنگھ اِس معاملے میں بے شرمی کی حد تک بدکار تھا۔ عورتوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اُس نے اپنے جوتے میں جیبھ ڈلوا رکھی تھی۔ کسی کا حال پوچھنا اُس کے لئے کھیل تماشا تھا۔ اُس نے ایک راہ گیر عورت کو ٹٹولا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور اُسے گالی دے کر بولی، "دودھے، تیری ماں نے تجھے بتایا نہیں کہ باجرے کے ٹکّڑ کے ساتھ سالن پتلا ہو تو کھانے میں بدمزہ ہوتا ہے!" وہ کسی اکیلی لڑکی کو دیکھ کر مچھی اُٹھتا اور اُس کے پیچھے ہی پڑ جاتا۔ وہ کئی بار پٹتا پٹتا بچا تھا۔ کچھ مہترانیاں جنگل میں بالن اور ارنے اوپلے چُگ رہی تھیں۔ اُس نے اُنہیں رائے دی۔ "زمانہ خراب ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنے مردوں کو ساتھ لایا کرو۔"

وہ سب کی سب اُس پر برس پڑیں۔ اُن میں سے ایک پٹاخہ سی نے ببریاں چھوڑ رکھی تھیں۔ وہ چونڈا ہلاتے ہوئے، ٹھسک سے آگے بڑھی اور مٹک کر بولی، "بھیّا! تو کیوں گھبراتا ہے؟ ہمارے مرد جانتے ہیں کہ ناگ پھنیوں کو باڑ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود دوسروں کی باڑ ہوتی ہیں۔"

رومیش کا گیان کور سے یارانہ تھا جو ایک شادی شُدہ عورت تھی۔ رومیش کی نفسیات نرالی تھی! وُہ بیاہی عورتوں ہی کا پیچھا کرتا تھا اَور کہتا تھا، "کنواری کی دوستی کوئی دوستی ہے! کبھی اِس کا ڈر، کبھی اُس کا ڈر! بیاہی کا مزہ ہی اَور ہے۔ یہ رقیب کی طرح کھلاڑی ہوتی ہے اَور جذباتی بھی۔ کنواری، اناڑی ہوتی ہے، اِس لئے ٹھنڈی ہوتی ہے۔"

پنجابی کا یہ شعر وُہ کس مزے سے گایا کرتا تھا۔

یو بارہ، چھڑے دے پُت اٹھارہ!
بابُو اِک نہ کہے
(کنوارے کی پانچوں گھی میں ہیں۔ اِس کے اٹھارہ بیٹے ہیں لیکن
کوئی بھی اِسے باپ نہیں کہتا۔)

گیان کور اپنے خاوند کی موجُودگی میں رومیش سے جیسے ملتی تھی وُہ اُسی کا دِل گُردہ تھا۔ وُہ رومیش پر جان چھڑکتی تھی لیکن اُس کا دِل اُس سے بھر چکا تھا۔ وُہ اُس سے پیچھا چھُڑوانا چاہتا تھا۔ رومیش نے اُسے مجھ سے ملوانا چاہا، اُس نے اُس کا مُنہ نوچ لیا اَور جتایا "تُو نے پھِر ایسی بات کی تو تجھے زہر دے دُوں گی اَور اَور خُود زہر کھا لُوں گی۔" مَیں نے اُس کی وفاداری کو سراہا، رومیش نے اُکتائے ہُوئے لہجے میں کہا، "مَرد کا مِزاج بھونرے جیسا ہے! یہ ایک دو پھُول پر کیسے گُزر بسر کر سکتا ہے؟ بھونرے کو بھری بہار چاہیئے! بھونرے کو بھری بہار کیوں چاہیئے؟ یہ تو بھونرا ہی بتا سکتا ہے۔ ہاں وہاں لڑکے، لڑکیوں کا پیچھا ایسے کرتے تھے جیسے مدھو مکھیاں، مدھو بھرے پھُولوں کا۔

اُس کی بات سُن کر مَیں حسد سے سڑ کھُجلاتا لیکن وہاں کون تھا جو ایسا نہ کرتا تھا۔ جو لوگ شادی شُدہ اَور بال بچّوں والے تھے، وُہ بھی دُوسری عورتوں کے بارے میں مزے مزے کی باتیں کرتے تھے اَور آزاد نفسانی عمل چاہتے تھے جیسے ازدواجی رِشتے ناگوار بندھن ہوں۔ کئی تو شادی کو خُوشی کا مدفن کہتے تھے۔ لیکن اِنسانی فطرت کی سِتم ظریفی! لوگ جیسی باتیں دُوسری عورتوں کے بارے میں جائز سمجھتے تھے اپنی عورتوں کے بارے میں ناجائز۔

جہاں تک میرا سوال ہے، مَیں کیسر سِنگھ جتنا بے باک تھا اَور نہ رومیش کا سا خُوش نصیب، دِل پھینک ضرُور تھا اَور خُود کو ہاتھ میں لئے گھُومتا تھا۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ مَیں خُود کو ٹھکانے نہ لگا سکتا تھا۔ میرا جنسی تجربہ لذّتِ بے تسکین کی طرح میرے حواس پر چھا گیا۔ جِسم کا وُہ حِصّہ، جِس کا نام ننگا اَور گندا مانا جاتا ہے مجھے وَیسا نہ لگتا۔ کیوں لگتا؟ روایتیں اَور کتھائیں اُسے مُقدّس بتاتی ہیں اَور اُسے، نوعِ اِنساں کو بھگوان کا ہدیہ جتاتی ہیں۔ اِس کا ثبوت شِوالے ہیں جہاں شِو لِنگ کی پُوجا ہوتی ہے۔ مَیں اُن گیتوں کے معنی راست جِہت میں

تعبیر کرتا، جنہیں بدکاری، بدچلنی اور بدفعلی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دو نمونے پیش کروں لیکن میری ریاکاری اجازت نہیں دیتی ہے۔ میرا محتاط رویہ اس حقیقت کی ضمانت ہے کہ عصری آدمی کتنا ہی پُرخلوص ہو، ابتدائی دور کے بشر کا ہمسر نہ ہوگا۔ ہو بھی نہیں سکتا قارئین! ہر تہذیب و تمدن اپنے شہریوں سے الگ قسم کا تقاضا رکھتے ہیں! میں نے ناگاؤں کو لباسیوں پر ہنستے دیکھا ہے۔

میرے نقش و نگار پہلے سے زیادہ فروزاں اور عریاں لگتے۔ میں نے دیکھا کہ میری مسیں بھیگ رہی ہیں اور گالوں پر رُوئیں پھُوٹ آئے ہیں۔ ان میں وہ دل کشی تھی جو کچے پھل پر اُگے مُلائم بالوں میں ہوتی ہے۔ میں چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہُوا محسُوس کرتا کہ میرے اندر ایک اور آدمی ہے جو میری فریب کاری کی پردہ دری چاہتا ہے۔ میری خوشبوئے تمنّا، ہوائے تمنّا میں بدل گئی۔ میرا جذبہ، شوقِ نظر سے بڑھ کر حُسنِ لذّت سے جا ملا۔ میں نے بے ضبطی کے گداز اور نفس پرستی کے انداز سیکھ لیے۔ میں ایک ہو کر دو حصّوں میں بٹ گیا۔ میرا دُوسرا حصہ مختصر سہی، اُس کی رُوحانی پرواز آسماں گیر تھی۔ وُہ مجھ پر میرے شہ پروں کی طرح منکشف ہُوا تھا جس کی بدولت میں نئے آسمانوں میں اُڑ رہا تھا۔ میں نے جس کائنات کو پایا تھا اُس کی مزید تلاش کے لیے میں پریشانی کی حد تک بے قرار تھا۔ میرا الخیّل! مجھے ہر طرف اِٹھلاتی اور مُسکراتی ننگی کنواریاں نظر آتیں۔ میرے سوتے ہی اُن میں سے کوئی ہنستی کھیلتی مجھ سے لپٹ جاتی اور میں، اُس کے بدن کی گرمی میں پگھل کر بہہ نکلتا۔ میں بیدار ہو جاتا اور خُود کو اکیلا پا کر حیران ہوتا لیکن لذّت آشنا دل اُس حقیقت کو جھٹلاتا کیوں کہ وُہ اُس خُوشبُو میں رسا بسا ہوتا جو اُڑتی ہُوئی مستی تھی۔ میں بڑے گھونٹ کی طرح گہری سانس لیتا اور اُس خُوشبُو کو رگوں میں اُتارتا، جن سے وُہ فرار ہُوئی تھی۔ میں چاہتا کہ رُوحانی خلوت کی وُہ فضا قائم رہے اور وُہ طلسم نہ ٹوٹے جو میرے اندر اور باہر مُؤثر ہوتا۔ میرا ہر خیال، وصل کا خیال ہوتا اور ہر احساس عورت کا احساس۔ اور یہ عین تقاضائے ضرورتِ فطرت تھا۔ میں پھر سونے کی کوشش کرتا لیکن گیلے کاچھے نیند نہ آتی۔ کوئی میرے کمرے میں ہوتا تو کاچھا بدلنا مُشکل ہو جاتا۔ میں آہستہ، نرم روی سے سائے کی طرح آہٹ کیے بغیر کمرے سے باہر نکلتا اور غسل خانے میں جا کر کاچھا بدلتا۔ میرا احساسِ گناہ! مجھے لگتا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ کھولتے اور بند کرتے وقت دروازہ آواز کرتا تھا، میں نے اُسے تیل دے کر خاموش کر دیا لیکن وُہ احساس جُوں کا توں رہا۔ میں خواب گاہ میں اکیلا سونا پسند کرتا جو کبھی مُمکن ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ کئی بار بدلا ہُوا کاچھا بھی گیلا ہو جاتا۔ میرے پاس صرف دو ہی کاچھے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مجھے سکُول جاتے ہُوئے غلیظ کاچھا ہی پہننا پڑتا۔ میں خواہش کرتا کہ میرے پاس کئی کاچھے ہوں۔ ایک بار میں ایسے ہی کاچھا بدلنے کے لیے غُسل خانے میں گیا اور وہاں درشن سنگھ کو کاچھا بدلتے پایا۔ ہم دونوں ایسے جھینپ گئے جیسے ایک چور دُوسرے چور کو چوری کرتے دیکھ لے۔ میری ہر سانس، ہزار داستان تھی اور ہزار حقیقت بھی۔

مَیں اپنی حقیقت کے آئینے میں جس کسی کی حقیقت دیکھتا، وُہی مجھے شہوت کا شعلہ نظر آتا جیسے وُہ، زندگی کا مرکزہ ہو اور اپنے طور پر خود پرور و خود مختار۔ میری طبعی حرارت بڑھ گئی اور رگوں کی نفسیات بدل گئی مَیں اپنے جذبے کو اُس کی گہرائی تک سمجھنے کی سعی کرتا جو میری ہی دُھن کا حاصل ہوتا۔ درختوں کے جھومنے کی آوازیں مجھے کنواریوں کی چہلیں لگتیں اور گندم کے خوشے، حسینوں کی لہراتی، بل کھاتی چوٹیاں۔ مَیں پھولوں کو دیکھتا، مجھے لگتا کہ کوئی اُن میں چھپا ہُوا میرا منتظر ہے۔ مَیں سوچتا اور یہی سوچتا کہ مباشرت میرا پیدائشی حق ہے۔ میرے لوک گیت نئی گہرائی و گیرائی سے متعارف ہُوئے۔ میری نظریں دروں بیں ہو گئیں اور لڑکیاں مجھے ننگی دکھائی دینے لگیں۔ مَیں کسی لڑکی کے پاس سے گزرتا، دِل دھک دھک دھڑکتا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ میری نبض سرپٹ بھاگتی اور خون کی بڑھتی ہُوئی گرمی کی خبر دیتی۔ مَیں کسی لڑکی سے بات کرتا تو اپنی ہیجانی مسرّت میں مسکراہٹ کو روک نہ سکتا اور مدّعا بھولنے لگتا۔ میرے ادھے ادھورے جملے بظاہر کچھ اور کہتے لیکن اندرونی طور پر کچھ اور۔ مَیں نے ایسی زبان سیکھ لی جس کے اسلوبِ بیاں کے لئے کنایوں اور اشاروں کی ضرورت ہے۔ مَیں ایسے الفاظ یاد کرتا جو میرے لئے مفیدِ مطلب ہوتے۔ مَیں اپنے خیالوں میں لڑکیوں کو چومتا، چاٹتا اور اندر ہی اندر رس میں ڈوبتا۔ مَیں کیا بدلا، ہر چیز بدل گئی! مَیں وہاں جا بسا جہاں زمین و آسمان محوِ بوس و کنار ہیں اور ستارے اوڑھنیوں کی زینت بن کر چاند سے چہروں کا رُوپ نکھارتے ہیں۔ میرے کمرے میں سوہنی مہینوال کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ سوہنی کا آفاقی حسن، نفسانی پاکیزگی کا آئینہ دار ہے اِس لئے باعثِ پرستش ہے لیکن اُسے دیکھ کر مجھ میں وُہ جذبہ نہ ابھرتا جو روایت و حکایت ہے۔

مَیں یہاں ایک اعتراف کرتا ہُوں اور اپنی صحیح اصلیت پر سے پُوری طرح نقاب اُٹھاتا ہُوں تاکہ میرے دوست قارئین، میرے ماس اور ہڈیوں میں چھپے اُس ریاکار کو دیکھ سکیں جس کی نابکاری، میری مسلسل پریشانی رہی ہے۔ زندگی کی وُہ بدصورتی، جس کی حقیقت مجھے نامعلوم تھی اور مَیں اُس سے نفرت کرتا تھا، اپنے اُسی گھناؤنے پن کے ساتھ مجھ پر اپنی اصلیت میں آشکار ہُوئی لیکن میری پسند بن گئی۔

باب ۳۲

دمکتے چہرے جہاں پر دھنک ہو سینوں کی
وہیں پہ ڈالو پڑاؤ بہار کے دِن ہیں (شاطر)

مَیں خوش ہوں! اِس لئے خوش ہوں کہ میرا خیالِ فلک پیما عناصر کی قید سے آزاد ہے۔ میرا حسنِ تصوّر، خاکۂ حیات میں وُہ رنگ بھر رہا ہے جو اپنی نظیر آپ ہیں۔ مَیں فطرت کی انجمن آفرینی کا قائل ہُوں لیکن جو چیز مجھ پر گراں گزرتی ہے وُہ ہے میرا جمودِ حیات۔ مَیں خوش رہنے کے لئے خیال ایجاد کرتا ہُوں۔ "زندگی کیکر کا پیڑ ہے لیکن اِس پر جُھمکوں جیسے سُنہری پھُول لگتے ہیں جنہیں گاؤں کی گوریاں کان اور ناک میں سجا کر اِتراتی ہیں۔"

اِنسانی زندگی کے بارے میں تایاجی کا ایک اِنتہائی معقول اور عُمدہ خیال ہے "اِنسانی زندگی وُہ انوکھا پیڑ ہے جِس کے پھُول پھَل، کام کاج ہیں۔"

مَیں ان پھُولوں پھلوں کو کیسے کیسے چُنتا ہُوں! مَیں ڈانگر چَراتا ہُوں اور ہری نرم گھاس توڑ کر بچھڑے کو کھلاتا ہُوں۔ چُوں کہ اُس کا دُودھ نہیں بڑھایا ہے، وُہ گھاس کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور گھاس اُگل دیتا ہے۔ مَیں اُس کی باچھیں پکڑ کر مُنہ کھولتا ہُوں اور گھاس اُس کے مُنہ کے اندر تک گھُساتا ہوں۔ وُہ گردن جھٹک جھٹک کر مُنہ ہلاتا ہے جیسے اُس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو۔ میری ایسی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب مَیں بے دِلی سے کام کرتا ہوں۔ مَیں دِل سے کام کرتا ہُوں تو میری ترنگ دیدنی ہوتی ہے! مَیں کام کے ساتھ بولیوں سے لُطف اُٹھاتا ہُوں۔ بولیاں، پنجاب کی اَز حد بڑی کویتا کلا ہیں۔ اِن کے بغیر پنجابی ماحول کا تصوّر ایسے ہے جیسے سُر کے بِن سنگیت۔ میری مادری زبان مجھ پر کس قدر مُسلّط ہے! مَیں پنجابی میں سوچتا ہُوں اور اُردو میں لکھتا ہُوں۔ آپ جو پڑھ رہے ہیں وُہ میرے اَصلی خیال کا عکسِ ثانی ہے۔ مَیں ڈھیلے اکٹھے کرتا ہوں، ڈاپچے پر چڑھتا ہُوں اور توتے اُڑانے کے لئے گوپیا بھرتا ہوں۔ یہ میرا نیا گوپیا ہے اور میرے پہلے گوپئے سے زیادہ حسین اور کار آمد۔ تایاجی نے اِسے سَن کی ایک ہی باریک رسّی سے بنایا ہے اور میرے کہنے پر پدّا بڑا رکھا ہے۔ مَیں گوپیا چڑھاتا ہُوں اور شور بھی مچاتا ہُوں۔ پرندوں میں سے توتا سب سے بدذات اور کسان دُشمن پرندہ ہے۔ حیرت ہے کہ اِسے پالنے کے لئے پکڑتے ہیں اور کسان دوست پرندے جیسے تِلیر، مور، بٹیر، کبوتر، فاختہ .... کھانے کے لئے۔ آپ توتے کو مصروفِ کار دیکھئے اور میری بات پرکھئے! وُہ ایک ٹھونگ کے لئے پُورا بِٹّا، پُورا پھَل لے اُڑتا ہے اور دُوسری ٹھونگ کے لئے دُوسرا، کھاتا کم اور گنواتا زیادہ ہے اِسی لئے ہری مِیگ کے نام سے بدنام ہے۔ توتا، رَتی اور کام دیوتا کا باہن ہے، جِس کی موجودگی نفس پرستی کی ترنگ کی ترجمانی کرتی ہے۔ پنجابی کے لوک گیت توتے کی حمد و ثنا سے بھرے پڑے ہیں اور دُنیائے ادب میں بے مِثال ہیں۔

ناموکہندی توتیا یارا	(نامو اپنے توتے یار سے کہتی ہے)
چُنج ناں اپنی کُتر میرا ناڑا	(میرا ناڑا اپنی چونچ سے کُتر کر کھول)

شو دیئے بھگتینے   اے شو شنکر کی پجارن

تیرے گل ۔ دی مالا   تیرے گلے میں ۔ کی مالا ڈالتا ہوں

بھوک لگتی ہے تو میں موسم کے لحاظ سے کچی سبزیوں اور کچروں سے پیٹ بھرتا ہوں ۔ ویسے تو ہر شے سواد ہے لیکن ہرے چنوں کی کونپلوں کا کھٹا میٹھا ذائقہ خوب ہے ۔ اُسے خوب تر بنانے کے لئے میں نمک میں پسا ہرا دھنیا اور نمک میں پسا ہرا پودینہ دو الگ الگ پڑیوں میں رکھتا ہوں ۔ چنے پھلتے ہیں تو میں ڈوڈوں سے مزہ لیتا ہوں ۔ یہ مزہ دوچند ہے ، زبان کے ساتھ دانت بھی رس میں ڈوب جاتے ہیں ۔ ہر کام کی الگ اہمیت ہے ۔ میں بھینسوں کو جوہڑ سے نکالنے کے لئے اُن پر ڈھیلے پھینکتا ہوں ۔ کئی بار وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ہیں اور مجھے جوہڑ میں اُترنا پڑتا ہے ۔ میں گھاس کھودتا ہوں ، ہرا نکالتا ہوں ، ہل چلاتا ہوں اور رہٹ کی گاہدی پر بیٹھ کر بیل ہانکتا ہوں اور قطرت کے اُس سنگیت کو سنتا ہوں جو موہن سنگھ نے اپنے لفظوں میں سمویا ہوا ہے ۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی !   او بہن ! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے !

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی !   او بہن ! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے !

ایہ دی گاہدی بنی نواری   اس کی گاہدی نئی نروئی ہے ۔

اگے وگدا بلد ہزاری   آگے بیلوں کی ہزاری جوڑی جُڑی ہے ۔

کر اس اُتے اسواری   اس پر سواری کرنا ،

بھل جاندے دونوں جگ نی   دونوں جہاں کو بھلانا ہے ۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی !   او بہن ! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے !

ایتھے گھم گھم وگن ہواواں   یہاں ہواؤں کا تانتا لگا رہتا ہے اس لئے کہ

ایتھے گھمریاں گھمریاں چھاواں   ٹھنڈے سائے انہیں مسلسل للچاتے رہتے ہیں

نی میں اگ سرگاں نوں لاواں   میں آسمانی جنت کو بھاڑ میں جھونکتی ہوں ۔

جد پے ایتھے ہی لبھ نی   کیوں کہ میری جنت دھرتی پر موجود ہے ۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی !   او بہن ! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے ۔

میں تھاں تھاں ٹبی لائی   میں نے سب تیرتھ نہائے ہیں

نہ میل کسے بھی لاہی   لیکن کہیں نہ میرے تن کا میل اُترا اور نہ من کا

شابا! اوتھے آئی   یہ باعثِ فخر ہے کہ میں جوں ہی رہٹ کے حوض میں نہائی

جس میل وکھائی سب نی — میرے تن اور من پاک ہو گئے

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی! — او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

سن ٹھک ٹھک ریں ریں، واں — رہٹ کے سنگیت کا جادو ناقابلِ بیاں ہے۔

میں اڑ اڑ اوتھے جاواں — وہ مجھے اڑا کر وہاں لے جاتا ہے

جتھے پہنچے ٹاواں ٹاواں — جو لاکھوں میں کسی ایک کی منزل ہے

اتے ورتی جاوے لگ نی — اور پھر میں ایسے کھو جاتی ہوں کہ خود کو پا لیتی ہوں۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی — او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

میری شوخی اپنے شباب پر ہے۔ کوئی لڑکی رہٹ پر پانی پیتی ہے تو میں للک سے اس کے مموں پر جھانکتا ہوں جو جو بچہ پر جھکنے سے اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ خود پسند انگ ہیں جو کپڑوں کے اندر کم اور باہر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی خوب صورتی میں برماتی ہوئی دل کشی ہے۔ سوکھی الف سی لڑکی میرے اندر وہ ہلچل نہیں مچاتی ہے جو بھر پور چھاتی والی۔ اوپر آسمان کی دائمی متانت اور نیچے گیتی کی متواتر بدلتی فراست ہے، جس کا ہر حسن دوشیزگی سحر کی طرح اصلی ہے۔ وہ چہرہ در چہرہ میرے سامنے ہے، میں اس کی تصویر اتاروں تو کیسے! فطرت کا خمیر اس قدر پر اسرار اور پرکار ہے کہ اس کی حقیقت میں جھانکنا سرود و رعنائی کی بنیاد و کشاد پانا ہے۔ ذرہ ذرہ نغمہ سرا ہے، ہر ذرے کی اپنی لے ہے اور اپنی سحر کاری۔ کوئی مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے! فطرت کی ہم آہنگی میں گزرا ہوا ایک لمحہ، صدیوں کی فہم و فراست پر افضل ہے کیوں کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں۔

سرمئی اجالا ہے، چڑیاں چہچہا رہی ہیں، میں نیند کا نشہ توڑنے کے لئے انگڑائی لیتا ہوں۔ خمار اور سونے پر اکساتا ہے لیکن سکول جانے سے پہلے چارا لانا ضروری ہے۔ میں لٹ پٹی پگڑی باندھتا ہوں اور درانتی اٹھا کر کھیتوں کو چل پڑتا ہوں۔ نسیمِ صبح گاہی نے اعضا کو گدگدا کر کھلا اور مہکا دیا ہے، میں تقاضائے طبیعت سے بیتاب ہوں، پو نیا چلتا ہوں اور اسی تیزی سے اتار پر اترتا ہوں۔ میں گرتے گرتے، لڑھکتے لڑھکتے سنبھلتا ہوں اور اپنی چابک قدمی پر ناز کرتا ہوں۔ اپنی ادا کو نئی ترنگ دینے کے لئے میں درانتی کو آلۂ کار بناتا ہوں، اور اسے کلائی میں ڈال کر گھماتا ہوں، تیز سے تیز اور ہولے سے ہولے، وہ گرنے لگتی ہے تو گھمانے کی رفتار بڑھا کر اسے سنبھال لیتا ہوں۔ میری تجربہ کاری میری ہوشیاری ہے اور میری محتاط جبلتوں کی بیداری۔ گندا پار کر کے میں نے کھیتوں کا رخ کیا ہے۔ میں اپنے سامنے شاہدِ فطرت کو دیکھتا ہوں جو زندگی در زندگی کی صورت جلوہ گر ہو رہا ہے۔ روئے سحر، بچے کی مسکان کی طرح فسونِ نیاز ہے اور نباتات محوِ غسل حسینہ کی طرح جلوۂ ناز۔ فضا اس عیش پسند

دوشیزہ کی سی ہے جسے اپنے حسن وجمال کو بانٹنے میں لطف آتا ہے۔ چرند وپرند کی حرکات پر جذبۂ شادمانی محیط ہے۔ دیکھنے میں لگتا ہے کہ لڑ رہے ہیں لیکن کھیل رہے ہیں۔ میری آنکھیں لطف ونشاط کی سروسامانی ہیں اور سانس، روحِ مستی کی روانی۔ میری چال، موجِ شمیم جیسی سُبک ہے۔ مَیں پودوں سے اٹھکیلیاں کرتا ہوں۔ مَیں پودا ہلا کر اُس کے نیچے سے بھاگتا ہوں لیکن شبنم کی زد میں آجاتا ہوں۔ میری ناکامی ہی میری کامیابی ہے اور میری شوخی میری مستی۔ مَیں اپنی جہلیں دہراتا ہوں اور اپنی حماقتوں پر ناز کرتا ہوں۔ پودے، مستانوں سے جھومتے ہیں۔ اُن کی خود نمائی مجھے اُکساتی ہے اور میرے وجود کو مہکاتی ہے۔ میرے خیال لطیف جذبات سے مچلتے ہیں اور اعضا چھیڑے ہوئے تاروں کی طرح تھرکتے ہیں۔ مَیں نغمہ سرا ہوں،

بلّے بلّے! اھبئی بنتو بھانے گم پھٹ پئے
پھاہے بہن دی ٹکوراں کر دی

(بنتو کی معصومیت دیدنی ہے! وہ اپنے سینے پر پھاہے باندھتی ہے اور ٹکور کرتی ہے
نادان سمجھتی ہے کہ دُنبل نکل آئے ہیں)

کچھار شروع ہو گیا ہے۔ تلوں سے چمٹی اور اُنگلیوں سے لپٹی چپچپی دلدل کی ٹھنڈک میں حرارت آمیز راحت ہے۔ مَیں چھپڑ چھپاک چل رہا ہوں۔ میری بے ڈھبی میری کھری خوشی ہے اور اُسی طرح اونچے نیچے سُروں کی جُگل بندی۔ مَیں جبڑوں (کچھار کے کھیت) میں پہنچ گیا ہوں۔ ہوا دلدلی بُو سے بھاری ہے اور نمک آمیز بھی ہے۔ راہ کے دونوں طرف ایکھ کے کھیت ہیں۔ اِس راہ پر مَیں آج پہلا راہ گیر ہوں۔ میرے وثوق کی دلیل یہ ہے کہ راہ پر جھکے ہوئے گنّے اوس سے لدے ہوئے ہیں۔ مَیں اُس پار پہنچتے پہنچتے مساموں تک بھیگ جاؤں گا۔ اپنے بچاؤ کے لیے مَیں نے گنّا کاٹا ہے، بدھیا گنّا! اور درانتی کو پیچھے پیٹھ پر کالر سے لٹکا لیا ہے۔ مَیں گنّے کو جھنڈے کی طرح آگے ہلاتا ہوا، اُس کے پیچھے چلتا ہوں اور اپنی پسند اور ایجاد پر خوش ہوتا ہوں۔ پنجابی میں ایکھ کو کماد کہتے ہیں، کماد کے کھیت ختم ہو گئے ہیں۔ مَیں نے گنّے کی کھوری (گنّے کے سوکھے پتّے) اگ (گنّے کا اگلا ہرا بھرا حصّہ) اور پاندھ (گنّے کا اگلا پھیکا حصّہ) اُتار کر ایک ہاتھ میں پکڑ لیا ہے اور دوسرے ہاتھ سے مُنڈھ (گنّے کا نیچے کا میٹھا حصّہ) چھیلتا ہوں۔ گنّا کتنا کولا ہے! تین تین، چار چار پور لمبا چھلکا اُترتا ہے۔ گنّا کتنا رسیلا ہے! چکت مار کر زور سے چوسنے سے غوطہ کھانے کا گمان گزرتا ہے۔ کچھار کے گنّے تھوڑے سلونے ہوتے ہیں اور رس کا مزہ دوہرا، منہ اور رگیں ایک ساتھ سرشار ہو اُٹھی ہیں۔ سُندر سنگھ کا کھیت سب سے آخر میں آتا ہے میں اس کا ذکر بطور خاص کرتا ہوں۔ کیوں؟ اِسے دیکھتے ہی میرا خیال بندھ جاتا ہے۔ اِس کے گرد سنکڑے کی باڑ ہے جس کے پھول پُشپا کی آنکھوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میرا ذوق لطیف! مَیں اُن آنکھوں کو نرگسِ شہلا سمجھتا ہوں۔

پنجابی کے مقابلے میں فارسی کی دُور رس تشبیہہ بھلی لگتی ہے۔ پُشپا جوان ہوگئی ہے اور چالاک بھی۔ وُہ اپنی اداؤں سے مجھ میں چاہتیں اُبھارتی ہے لیکن انہیں پُورا کرنے کا اِرادہ نہیں رکھتی ہے۔ آبِ رواں میں پاؤں پڑتے ہی مَیں چونک پڑا ہُوں۔ پاؤں سے لپٹی ہُوئی مٹّی پانی میں گُھل رہی ہے۔ مَیں شپا شپ پاؤں مارتا اور چھینٹے اُڑاتا چلتا ہُوں۔ کنارے کے قریب تیرتی ہُوئی مچھلیوں کی رَوڈر کر تتّر بتّر ہوگئی ہے۔ سینۂ آب، رُوئے شبنم کی طرح صاف ہے۔ تَل میں سفید ریت پر بھُورے گھونگے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ نرم ملائم لہریں ایک دُوسرے کا پیچھا کرتی ہیں۔ فطرت کی پُرکاری! سادہ سے سادہ چیز، نقشِ جمال ہے۔ میرے چلنے سے لہروں میں اِرتعاش پیدا ہوگیا ہے۔ مَیں خود پر ناراض ہُوں کہ مَیں اُن کا رُوپ بگاڑتا ہُوں۔ مَیں ٹھہر جاتا ہُوں اور انجانے میں ایک سُہانے نظّارے کو جنم دیتا ہُوں۔ میری ٹانگوں کے گرد پانی بھنور بناتا ہے۔ میری نظر کی دِل فریبی مجھ سے کہتی ہے کہ کچھ دیر یُوں ہی کھڑے رہو لیکن میری ذِمّہ داری مجھے آگے بڑھنے پر مجبُور کرتی ہے۔ پانی گہرا ہوتا جاتا ہے اور ٹخنوں سے پنڈلیوں، پنڈلیوں سے گھٹنوں اور گھٹنوں سے رانوں تک چڑھ آتا ہے۔ مَیں اپنے دامن اور کاچھے کو اُوپر اٹھا کر بھیگنے سے بچاتا ہُوں۔ پانی اُترنے لگا ہے جیسے مجھے چوکس پاکر مایُوس ہوگیا ہو۔ مَیں نے ٹانگیں جھٹک کر دامن اور کاچھے کو چھوڑ دیا ہے۔ سامنے اُونچا کراڑا ہے۔ ایک کے اُوپر ایک اور پھر اُس پر دو آدمی کھڑے ہو جائیں تو بھی اُوپر کا آدمی اُس پار نہ دیکھ سکے۔ کسی بھلے مانس نے کراڑے میں پَیڈّے بنائے ہُوئے ہیں اور راستہ ٹیڑھا میڑھا اُوپر چڑھتا ہے۔ مَیں جب جب یہ راستہ طے کرتا ہُوں، رحیم خان خاناں کا یہ دوہا بے اِختیار گُنگناتا ہُوں۔

جو رحیم اوچھو بڑھے تو اَت ہی اترائے
پیادے سے فرزیں بھیو، ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

میری ترنگ! مَیں ہر پگ میں ایک، کبھی دو اور کبھی تین پَیڈّے سَر کرتا ہُوں اور اپنی توانائی سے لُطف اُٹھاتا ہُوں جیسے کوئی سُہانے مِلن سے رَس لیتا ہے۔ مَیں اُوپر چڑھ کر سیدھا کھڑا ہوتا ہُوں۔ میرے سامنے مناظر کھُلے ہُوئے ہیں اور ہر منظر میری سرشاری کی تائید کرتا ہے۔ اُفق پر کُندن ہی کُندن بِکھرا ہُوا ہے لیکن یہ مال اُسی کا ہے جو اِسے بڑھ کر سمیٹ لے۔ اِس مال کی ستم ظریفی! اِسے پانے کے لئے ہاتھوں کے برعکس حُسنِ طلب درکار ہے۔ مَیں انوکھا غنی ہُوں، ترالا تونگر ہُوں! مَیں دامنِ دل کو متاعِ مسرّت سے بھرتا ہُوں۔ میری طرفگی! فرشِ سبزہ میرے قدموں میں بچھا جاتا ہے! شبنمی نَورنگ مجھ پر نچھاور ہوتے ہیں! ملکۂ سحر سونے کے تھال سے نُور چھلکاتی ہُوئی میری آرتی اُتارتی ہے! کرنیں میرا منہ چُومتی ہیں اور مجھے خُوش آمدید کہتی ہیں! آسمان سجدے میں گرتا ہے اور اپنی بندگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اِن سب سے بالاتر لہلہاتے کھیت ہیں جو

میری روزی روٹی کی ضمانت دیتے ہیں۔

چشم بد دور! میں اِس لامحدود سلطنت کا بے تاج بادشاہ ہوں۔

لیکن اُف! میں اپنے فرض کا غلام ہوں۔ میں اُن کبوتروں کی آزادی پر رشک کرتا ہوں جو تارا سنگھ کے ساونیں کھیت (وہ کھیت جس میں صرف اساڑھی بوئی جائے) میں چُگتے کم اور غٹر غوں زیادہ کرتے ہیں۔ پرندوں میں سے مجھے کبوتر ہی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ اِن کو دیکھنا پرانی یادوں کو تازہ کرنا ہے۔ جینا کا سینہ غٹر غوں کرتے کبوتر ہی کی طرح خوبصورت تھا۔ میری نازک خیالی میری تیز خرامی بن گئی ہے۔ میں سپاٹے بھرتا ہوا کھیت میں پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ عجیب بات ہوئی ہے! میں تر و تازہ ہو گیا ہوں جیسے جامِ حیات پی لیا ہو۔ میں آگ اور کھوری کھیت میں رکھتا ہوں، اوس لدے باجرے کو دیکھتا ہوں اور پاندھ سے اُسے ہلا کر کاٹنے بیٹھتا ہوں۔ میرے آغاز ہی میں انجام کی جھلک ہے۔ ایک جگہ درانتی روڑے سے ٹکرا کر ہاتھ کو آئی ہے اور چھوٹی انگلی پر خراش لگ گئی ہے۔ میں دم بھر کے لئے رُکتا ہوں اور پھر اُسی رفتار سے درانتی چلاتا ہوں۔ میں حسبِ ضرورت پُھٹے کاٹتا ہوں، جو نا بٹتا ہوں، جو نا بچھا کر پُھٹے اکٹھے کرتا ہوں اور گٹھا باندھتا ہوں۔ میں پازیب کی جھنکار سُنتا ہوں اور حیران ہو کر اپنے پیچھے پگڈنڈی کی طرف دیکھتا ہوں۔ لال اور پیلے رنگ کے کپڑے پہنے لاجونتی آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ گوری گاؤں کی دھوبن ہے اور میلے کپڑوں کے ساتھ ضرورت مندوں کے تن بھی دھوتی ہے۔ وہ آنکھیں ملاتی ہے تو نازک جذبات کو اُبھارتی ہے اور یہ راز ظاہر کرتی ہے کہ جسموں کے ملن سے پہلے روحوں کا ملن ضروری ہے ورنہ رگیں اُس عرق کو پیدا نہیں کرتی ہیں جو پھولوں میں خوشبو اور منہ میں پانی کہلاتا ہے۔ وہ عرق روحوں کی رغبت کا بے ساختہ عطیہ ہے جو جسموں کے ہزاروں سالوں کے ملاپ کا مقدور نہیں ہے۔ کئی ناسمجھ اُسے شاملات کہتے ہیں اور ناشکرے کانک کی کُتیا! میں اُس کا احسان مند ہوں۔ وہ میری ہیجان خیز جبلت کی جائے پناہ ہے۔ اُسے دیکھ کر میرے من میں شگوفے پھوٹ پڑے ہیں اور اندر کھلبلی مچ گئی ہے۔ میں اُسے گٹھا اُٹھوانے کے لئے بلاتا ہوں اور درانتی کو گٹھے میں جُونے کے پاس گاڑتا ہوں۔ لاجونتی مُسکراہٹ کو روکتی ہے اور میری بیباک نگاہی سے شرما کر اوڑھنی سنوارتی ہے۔ میں اُس کے بدن کی گہرائیوں اور اُٹھانوں کو، اپنے بدن کی گہرائیوں اور اُٹھانوں سے ناپ چکا ہوں۔ لیکن اُس کی سادگی! وہ خود کو نامحرم کی طرح چھپاتی ہے۔ اُس کی یہ عادت نرالی ہے کہ کھولنے سے پہلے شرماتی ہے، پھر تو بس!

گُھٹ گُھٹ پا جپھیاں

تیرے نکلے ہڈاں دی گرمی

(مجھے باہوں میں لے کر زور زور سے بھینچ تاکہ ہڈیوں کی گرمی اُن کے مغز تک پہنچ جائے)

میں شاعر نہیں ہوں لیکن میرے اعضا اُن الفاظ کو گنگنا رہے ہیں جو لذتِ حیات کے نمائندے ہیں۔ نظامِ فطرت، جسے اہلِ دانش اور اہلِ خدا اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتے ہیں، مجھ پر میری رگوں کے ذریعے منکشف ہو رہا ہے۔ میں زندگی کے مرکزہ کا مرکزہ ہوں۔ لاجونتی کے رسیلے ممّے! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا ہے، ذائقہ ہی بدل گیا ہے جیسے لذیذ میوہ کھا لیا ہو۔ میں اُس کے جوبن کی تعریف میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے جذبات میری خواہشِ اظہار پر غالب آ گئے ہیں اور مجھے لفظوں میں اُلجھا گئے ہیں۔ میں اُسے چپ چاپ دیکھتا ہوں۔ وہ گٹھا اُٹھوانے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں۔

کسی نے دیکھ لیا تو؟! وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور پھر سہمی سہمی پر بات ٹالتی ہے۔ میں ڈر گیا ہوں، دُور تک نظر دوڑا کر واپس آیا ہوں اور مطمئن ہوں۔ اس تنہائی میں ہم دونوں کے پاس کوئی اور ہے تو وہ میرا کام دیو اور اُس کی کام دیوی۔ میں اُسے باجرے کے اندر کھینچتا ہوں۔ اُس کا پاؤں گٹھے سے اُلجھ کر اُکھڑ گیا ہے لیکن میں نے اُسے باہوں میں سنبھال لیا ہے۔ وہ میرے ماس میں ہڈیوں تک دھنس گئی ہے۔ اِس قبل از وقت لذت سے بھرپور میں آگے بڑھتا ہوں اور اُسے اپنے پیچھے سے اپنے آگے کھینچتا ہوں۔ وہ رُکتی ہوئی چلتی ہے اور میرے ساتھ باجرے میں گم ہو جاتی ہے۔

لاجونتی سے ملن ایک ناقابلِ تسکین فعل ہے۔ میں مبتلائے تازہ ایسے خالی ہو جاتا ہوں جیسے لبریز گلاس ٹھوکر سے اُلٹ جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ اصلی خوشی، بھوگ بلاس سے بڑھ کر، انتظار میں ہے یا دوسری باری میں۔ لیکن دوسری باری کے لئے وہ کبھی کبھار ہی رُکتی ہے اور جب رُکتی ہے تو مزہ دو چند ہوتا ہے۔ دراصل دوسری باری کئی پہلی باریوں سے لذت آمیز اور تسکین پرور ہے۔ میرے اندر جاتے ہی باہر آ جانے سے وہ میرا ٹھٹھا اُڑاتی ہے۔ میں اپنی کمزوری کا راز تلاش کرتا ہوں۔ ڈولا بنانے میں پکڑے جانے کا اندیشہ میری رگوں کو کمزور بنا دیتا ہے اور اُن پر میرا اختیار گھٹا دیتا ہے۔ میرا ناقابلِ تسخیر رویہ اپنی پست ترین حالت میں ہوتا ہے جب میں طے شدہ وعدے پر لاجونتی کا انتظار کرتا ہوں۔ میں اُس گھڑے کی طرح بجرتا، رستا ہوں جس کے مسام زیادہ ریت کی ملاوٹ کی وجہ سے نم رہتے ہیں۔ شو مندر میں شو لنگ کو کیوں گیلا رکھتے ہیں؟ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ علامتی اور اصلی زندگی میں کتنا تضاد ہے! میں اِس روایت کو حقیقت ماننے لگا ہوں۔" ہر آدمی شو کا سروپ ہے۔"

باب ۳۴

کھنکتے لہجے، اُبلتی ہوئی اداؤں کے
کوئی نہ روکے بہاؤ، بہار کے دن ہیں (شاطر)

قارئین! مَیں برملا اعتراف کرتا ہوں! مَیں الفاظ کی بامعنی اور بے معنی حیثیت پر اُلجھن میں ہوں اور اِن کی لطافت و کثافت پر حیران۔ یہ میرے سانس کی مانند میرے پرانے ساتھی ہیں لیکن میری بے ہودگی! مَیں نے اِن کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اِس نازک گھڑی میں اِن کی حقیقت پر غور کر رہا ہوں۔

الفاظ دیکھنے کو بے جان ہیں لیکن ہیں جان دار۔ اِن کا پُر اسرار وجود! اپنی جان سے وصال پانے کے لئے اِنہیں اِنسان کے احساس کا لباس پہننا پڑتا ہے۔ یہ ایسا نہ کریں تو اِن کا ارضی ضمیر، سماوی ضمیر میں منتقل نہیں ہوتا۔ اِن کی فطری کمزوری! اِن کو ملو تو دل سے ملو۔ اور دِل نفرت و محبت کا ایسا رقیق سانچا ہے جس کی حقیقت بے اعتباری سے عبارت ہے۔ چوں کہ الفاظ کی اپنی حقیقت اِنسان کی حقیقت پر منحصر ہے، اِس لئے میرے الفاظ کی معنی آفرینی، عبارت و اشارت سے زیادہ پڑھنے والے کی دِلی کیفیت پر موقوف ہے۔

دُوسری ہر تخلیق کی طرح الفاظ بھی کسی کی تخلیق ہیں۔ اِس تخلیق کی بدبختی! کوئی نہیں جانتا کہ اِس کا خالق کون ہے۔ اِس تخلیق کی دِلکشی!! ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی تخلیق ہے اور تخلیق کا خالق سے وُہی رِشتہ ہوتا ہے جو جسم کا جان سے۔ تخلیق کی آفاقی خوبی ہے کہ یہ اپنے خالق سے زیادہ ابدی ہوتی ہے۔ یہ اُسی ابدیت کی فسوں کاری ہے جسے رُوحانیت پسند رُوح سمجھ لیتے ہیں۔

ویسے تو ہر طرح کی جبلت آبروئے حیات ہے لیکن مَیں تحفظِ ذات کے بعد جنسی جبلت کو بالاتر مانتا ہوں۔ اِنسان کی ہر جبلت عرصۂ نشو و نما سے گزری ہے اِس کے باوجود اپنے کمال کو نہیں پہنچی ہے۔ اِسی طرح اِنسان کے اعضا ہیں۔ ماں باپ اپنے بچّوں کو ہر ہُنر سکھاتے ہیں لیکن عضوِ تناسُل کی تہذیب سے بے بہرہ رکھتے ہیں۔ وُہ اِس کے بارے میں از خود سیکھتے ہیں اور کمال حاصل کرتے ہیں۔ چُوں کہ عضوِ تناسل کی تہذیب، تہذیبِ افزائش ہے یہ عبارت و اشارت کی گرفت سے باہر ہے۔ اِس کی وُسعت و رِفعت کا اندازہ پروازِ خیال کو ہو تو ہو۔ اِس کی عظمت سے دھرتی کی زرخیزی، پانی کی تری، آگ کی گرمی، ہوا کی بے کلی اور فضا کی بزرگی نے امان مانگی ہے ورنہ یہ پانچوں عناصر (جو زِندگی کے کرتا دھرتا مانے جاتے ہیں) اپنی جگہ بے معنی ہوتے۔ یہ تہذیب اپنے آپ میں مکمل ہے اِس لئے بڑی شوخی سے کاشفِ ذات میں سرگرم ہے۔ یوں نہ ہوتا تو اِنسان اِس تہذیب سے چشم پوشی کرتا اور انجانے میں فطرت کے تخلیقی کام میں رکاوٹ ڈالتا۔

مَیں عضوِ تناسُل کی نعمتِ غیر مترقبہ سے محظُوظ ہُوا اور محسُوس کیا کہ مَیں پہلا آدمی ہُوں جس نے اِس کا پُر اسرار کردار دریافت کیا ہے۔ مَیں ایسا نہ کرتا تو یہ اپنی خوبی سے بے خبر گوشت کے ذلیل لوتھڑے کی طرح گوشۂ حقارت میں پڑا نابُود ہو جاتا۔ اپنی حقیقت میں یہ جن پُر اَنک کتھاؤں کا حامل تھا، اُن میں اِس کا مرتبہ خلیفۂ خُدا کا تھا۔ اپنی بے خبری کی وجہ سے مَیں، اُن پر یقین نہ کرتا تھا۔ مجھے یقین آیا تو مَیں نے اپنی مدد سے اِسے اُس مقام پر پہنچا دیا جس کی مجھے اُمید نہ تھی۔ اِس کی مجھ سے پہچان، زبان سے پھل کی سی تھی جیسے چکھ کر ہی لذت و لطافت کا تعیّن ہوتا ہے۔ بیرج رواں ہوتا، مَیں اپنی مد میں تمنا کرتا کہ میرا وجُود بھلے پگھل کر اُس رَو کی تیزی میں مل جائے لیکن وُہ رَو نہ تھمے۔ مَیں ضبطِ انزال کی کوشش کرتا لیکن ایسا ممکن نہ ہوتا۔ میری کمزوری میری برہمی کا باعث ہوتی جس میں شرمندگی کا شائبہ ہوتا۔ میری ہوس کی بے تسکینی! انزال کے آغاز و انجام کا درمیانی وقفہ، مجھے بالکل چھوٹا لگتا۔ اُس کی عارضی لذت اُس نوالے کی سی ہوتی جو ہاتھ سے سیدھا حلق میں جا پڑے اور ہونٹوں کے ساتھ زبان تک کو ترستا چھوڑ دے۔ اِس کے باوجود اعضا و حواس کا وُہ اتصالِ حقیقی ایسا خالص اور خاص لمحہ تھا جو ایک بے کیف اور بے فیض عُمر سے کہیں بہتر تھا۔

دُوسرا ہر عمل اپنے کمال کا ادھورا حاصل ہے لیکن نفسانی عمل لا انتہا کی انتہا ہے۔ مَیں اپنی جس انتہا کو کتابوں، اوزاروں اور ستاروں میں ڈھونڈتا تھا، اُسے مَیں نے اپنے اندر پایا تھا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ ممکن ہے! اپنے یقین کی خاطرداری کے لئے مَیں چاہتا کہ اُسی فعل میں مصرُوفِ عمل رہُوں۔ اُسے میری فطری تائید تھی۔ مَیں اُس عمل میں آزاد، بے تکلف، آسُودہ خاطر اور یکتائے عصر محسُوس کرتا تھا جیسے اپنی خلوت میں خُدا۔ میرے ہیجان کا مقدس ارتفاع! مجھے وحی سی آئی! "تُم وُہ برگزیدہ فرد ہو جسے ہم نے اپنے کارِ افزائش کی ترمیم کے لئے مخصُوص کیا ہے۔ تُم پر فرضِ عین ہے کہ تم ہر قابل عورت کو حاملہ بنا دو اور پُرانی نسلوں کو مٹا کر نئی نسل کا آغاز کرو۔ ہم اِنسان کی شکل کو عقل کا ہم سر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میرے پیارے قارئین! مَیں اپنے بیان کے تسلسل کو توڑ رہا ہُوں۔ یہ اِس لئے ضرُوری ہو گیا ہے کہ مجھے اِنسان کے اِس فعل کے بارے میں تایا جی کے خیالات محفُوظ کرنے ہیں اور یہ میرے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا اپنی حقیقت رقم کرنا۔ "دُنیائے فطرت میں ہر ذرّہ حُسنِ عمل کی سرگرمی سے سرشار ہے اور یہ عمل دو رُخی ہے، کمال سے جمال کی طرف اور زوال سے جمال کی طرف۔ چُوں کہ اِنسان کا عمل صرف زوال سے کمال کی طرف ہے یہ اپنے عمل میں بے دِل ہے اور سرگرمی کے فیض سے نا آشنا جو عمل کا حقیقی صِلہ ہے۔ اور بھوگ بلاس ایسا طبیعی فعل ہے، جس کی حقیقت مکمل عمل کی سی ہے۔"

اِحساسِ شباب، حرکت اور اضطراب کا طالب ہے۔ یہ سچائی میرے اندھے وجُود سے نُور بن کر

ظہور پزیر ہوئی تو میرے تصوّر کی ہر تصویر دھندلی پڑ گئی۔ یہ تغیّر باطنی ہو کر بھی ظاہری تھا۔ ایسا طوفان تھا جس کا انجام، آغاز سے خوبصورت تھا۔ در اصل میرا عمل اِکسیر تھا، کیمیا تھا جو میرے لہُو کو چند گرم قطروں میں ڈھال کر اُن میں جاں گداز لذت اور حیرت انگیز تڑپ بھر دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سو نوالہ غذا سے ایک قطرہ خون اور سو قطرہ خون سے ایک قطرہ منی بنتی ہے۔ لیکن اِس تفصیل کی تحقیق کی فکر کسے تھی! منی اپنی ضرورت آپ پوری کرتی تھی۔ لاجونتی کی صحبت اتفاقیہ تھی کیوں کہ اُس کی دریا دِلی روایت تھی،

رانان چھوٹیاں یار بتھیرے
کیدا کیدا دِل رکھیئے

(رات چھوٹی ہے اور میرے چاہنے والوں کی تعداد، لاتعداد، مَیں کس کس کا لحاظ رکھوں)

میری کایا ہی پلٹ گئی۔ مَیں کہیں جھاڑیوں اور کہیں فصلوں میں چھپ کر لاجونتی کا اِنتظار کرتا۔ مجھے سانپ کا ڈر تھا اور نہ بچھّو کا خطرہ۔ ہمہ رنگ زندگی یک رنگ ہو گئی۔ انتظار! اور عشرتِ انتظار اس کے سوا اور کیا ہے کہ آدمی، عورت کے بارے میں سوچتا رہے اور خیالِ وصل سے لُطف اُٹھاتا رہے۔ نفسیاتی اور عضویاتی فعل میں حدِ فاصل نہیں ہے۔ مَیں اپنے ارمانوں میں جو رس بھرتا وہی انگوں سے ٹپکتا۔ لاجونتی کی آمد سے نا امید ہونے پر میرے نتھنے اُس سُہانی خوشبو کی آرزو کرتے جو میرے لہُو کا راز تھا۔ مَیں اُس خوشبو کے ماخذ کا خیال کرتا جو پھول نہ تھا لیکن پھول کی طرح میرا حِصّہ تھا اور کائناتِ ممکنات کی حدِ کمال تھا۔ اُس سے موجودات کی ہر خوب صورتی اور لذت پیدا ہوتی تھی اور اُسی میں انجام پاتی تھی۔ مَیں اِس پُرانی روایت کا قائل ہو گیا، "پانی، آگ سے پیدا ہُوا تھا اِس لئے پانی ہر چیز کا مُقدّر ہے۔" مَیں بے اختیار ہو کر اپنے پھول سے ساتھی کو دیکھتا اور دیکھتے دیکھتے سہلانے لگتا۔ وُہ ایک مترنّم لہجے کی طرح اپنے گوشۂ خاموشی سے اُبھرتا اور اُس تہذیب کا معتبر مُشتہر بن جاتا جو میری رگوں میں مُضمر تھی۔ اُس کی خوشنودی کی خاطر مَیں نے بھٹّی کے یاروں سے مُنہ موڑ لیا۔ مجھے میرا وُہ ساتھی بھلا تھا جس کی اکیلی ذات میں انجمن تھی۔ "لِنگ سُوگوِنز ہوتا ہے اِس لئے سُوکارج کرتا ہے۔" مَیں نے پہلی بار اِس کہاوت کے معنی کُلّی حیثیت سے سمجھے۔ مَیں اُن دھارمک باتوں کا مُنہ چِڑاتا جو بندے کو موہ مایا کا کیڑا بتاتی ہیں، اِسے ذلیل کرتی ہیں اور جوبن رُوپ کو مانس جیون کی ذِلّت بتاتی ہیں۔

رَس پیجئے آنکھ سے، مُکھ سے بھجئے رام
تُلسی وُہ نر کوڑھ ہیں جو گِھسیں چام سے چام

مَیں مرد و زن کے اِس رشتے پر غور کرتا جس سے افزائشِ آدم جاری و ساری ہے اور جسے ناپاک بتایا گیا ہے۔ مَیں خُود سے سُوال کرتا، "کیا مَیں اپنے ماں باپ کے ناپاک جذبات و احساسات کی پیداوار ہُوں؟"

میرا ضمیر اِس جھوٹ کی تردید کرتا، "تُو اپنے ماں باپ کے پاک عمل ہی کی پیداوار ہے۔ ناپاک عمل، حُسنِ افزائش کی نفی ہے اور اُس ناقص بیج کی طرح ہے جس کی زندگی، بوسیدگی کی پراگندگی ہے نہ کہ عملِ افزائش کی رنگارنگی!"

میرے قارئین! مَیں اعتراف در اعتراف کرتا ہوں۔ میرا یہ اعتراف میرے سارے اعترافوں سے نازک تر ہے کیوں کہ یہ اُس حیوانی جذبے کا ترجمان ہے جسے اِنسانی تہذیب نے مار کر اپنی بُنیاد میں دفن کر دیا تھا اور کسی بُنیاد کو کھودنا، اُس پر کھڑی تعمیر کو گراتا ہے۔

زندگی کی ہر جِبلّت ایک جذبۂ ہوس میں ڈھل گئی۔ اور شدّتِ ہوس! مَیں اپنی بہنوں کے پاس بیٹھتا تو اُن کے اندر کی عورت، مجھے رِجھانے اور لبھانے لگتی۔ وہ گاتی باندھے ہوتیں یا آڑبند پہنے ہوتیں تو اور بھی مَن موہنی لگتیں۔ اُس گمراہ کُن فسوں کو توڑنے کے لئے مَیں، اُنہیں مجبور کرتا کہ وہ پُورے کپڑے پہنیں۔ وہ اپنے جذبات کی خود نمائی پر مُصر رہتیں، مَیں اُن سے لڑ پڑتا اور اپنے جذبات کو دبانے کے لئے اُن سے دُور بھاگ جاتا۔ مَیں کھیتوں میں جاتے ہُوئے اُنہیں ساتھ نہ لے جاتا جس کے نتیجے میں مجھے زیادہ کام کرنا پڑتا۔ میری ہَٹ دھرمی میری ماں نہ سمجھ سکتی اور نہ مَیں اُسے سمجھا سکتا۔

تایاجی آدمی کی جو حقیقت بیان کرتے تھے وہ نہایت فلسفیانہ ہے اور بوالہوس کے لئے ناقابلِ قبول، "ہر جیو، آدھ جیو ہے اور اپنی آتما کی پُورنتا کے لئے اپنے دُوسرے حصّے کا خواہش مند۔ اِسی طرح مانس آدھا مانو ہے اور اِستری، آدھ انگی۔ اِن دونوں کا اِتصال، تائیدِ تولید کی ضمانت ہے۔ لیکن اِنسانی زندگی کا مفہوم اِس سے بڑھ کر ہے کیوں کہ اِنسان، حیوان نہیں ہے! اِنسان پر لازم ہے کہ یہ اپنی نفسانی طاقت کو کسی تخلیقی کام میں بھی لگائے اور زندگی کو نئی سمت دے، ورنہ بھوگ بلاس کا کیڑا بن کر رہ جائے گا۔"

لیکن میرا نفسانی رویّہ، لوک کہانیوں کے آدم خور دیو کا سا تھا۔ وہ کہیں سامانِ شکم دیکھتا ہے تو خوشی سے آدم بُو، آدم بُو، پکارتا ہے۔ جیسے اُس کی حیاتیاتی حاجت اُس کی حیات تھی اسی طرح میری نفسانی ضرورت میری زندگی۔

حالات کی ناموافقت اور میری اختراعی صلاحیت نے مجھے خود پرور بنا دیا۔ میں اُس انوکھے پھول کی طرح تھا جو بھونروں سے بچے لیکن اپنا رس آپ پینے لگے۔ ایک بدخوابیاں، دُوسرے خود فریبیاں، تیسرے شاہ خرچیاں، وہ کون سی حسین لڑکی تھی جسے مَیں نے تصوّر میں زیر نہ کیا ہو۔ میرا اِنزال: میرے اندرونی وجود کا باہری وجود سے وِصال تھا۔ اُس ہم آہنگی کے دَوران، مَیں مستی سے چِلّاتا۔ وہ مستی، جس رُوحانی بے خودی کا فیض تھا، اُسے سراسر جمالیاتی تجربے سے نسبت ہے۔ تجربہ کوئی بھی ہو، مرہُونِ بیان نہیں ہوتا۔ اُس سعادت کو پانے

کے لئے اُسی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے، جو اُس کا ماخذ رہی ہو۔ مَیں قطرے قطرے سے دھار دھار نچڑنے لگا اور جریان کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ ناخن اور گال، رگوں کے آئینے میں اور خون کے عکاس۔ وُہ پیلے، ہلدی سے نظر آنے لگے تو میری ماں کو تشویش ہُوئی کہ میرا لاڈلا پڑھائی کے بوجھ سے مرا جاتا ہے۔ وُہ رات کو دیر تک نہ جاگنے کی ہدایت کرتی اور میرا دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لئے مجھے تیوڑ (آدھے بلوئے ہوئے دہی میں تازہ دودھ کی دھاریں مارنے سے جو چیز بنتی ہے، تیوڑ، کہلاتی ہے) پلاتی اور باسی روٹی کے ساتھ مکھن کھلاتی لیکن میری حالت وُہی رہی جو اُس حال میں ہونی چاہیئے تھی۔ میری ماں، میری بھولی نادان ماں کو خبر نہ تھی کہ مَیں جسمانی بیماری کے برعکس ذہنی عیاشی میں مبتلا ہُوں جس کا واحد علاج، عورت ہے۔

باب ۳۵

دِل تباہ میں یُوں حسرتِ وصال پلے
کسی مزار پہ جیسے کوئی چراغ جلے
(شاطر)

مَیں ہوس پرستی کی ایسی حالت میں تھا جب بھائیا جی نے لامبڑے میں ٹک (درختوں کا کاٹنا) لگایا اور وہیں رہنے لگے۔ ایک اِتوار دوپہر کے قریب وُہ بے اعلان کھیتوں میں پہنچے۔ کارن یہ تھا کہ انھیں اُس کام کا معائنہ کرنا تھا جسے وہ بطورِ خاص مجھے سونپ گئے تھے، سَن کا کملا مارنا۔ کملا مار دوا کی عدم موجودگی میں اُسے مارنے کا ایک ہی مؤثر طریقہ تھا، پودوں کو ہلا کر کملا نیچے گراؤ اور اُسے پیروں سے کچلو یا رَمبے سے مارو۔ یہ کام جھک کر کرنا پڑتا تھا اور مَیں صبح سے مسلسل کر رہا تھا۔ میری کمر دُکھنے لگی اور مَیں ڈانڈے پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

کِسان کی زندگی میں کام کے دوران آرام کا خیال سِرے ہی سے غائب ہے۔ وُہ کھیتوں میں ہوتا ہے تو صرف نقل پانی کے لئے بیٹھتا ہے ورنہ کام میں جُٹا رہتا ہے۔ کوئی مُلاقاتی آجائے تو اُسے صُورتِ حال کے لحاظ سے نباہنا پڑتا ہے۔ کِسان بیٹھے بیٹھے کام کرتا ہو تو مُلاقاتی اُس کے پاس بیٹھ جاتا ہے، کھڑے کھڑے کام کرتا ہو تو اُس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے، چلتے چلتے کام کرتا ہو تو اُس کے برابر چلتا ہے۔ کِسان کہیں کام کرتے کرتے رُکتا ہے تو بس آفتِ ناگہانی میں وُہ گھنٹوں کَسّی، بگوڑی، درانتی، رَمبا، ہَل ..... چلاتا ہے، پرات ختم کر کے اُٹھتا ہے بقایا کام پر نظر دوڑاتا ہے اور نئی پرات دھرنے کے لئے تازہ دَم لگتا ہے۔ چُوں کہ متواتر کام، کِسان کا غرورِ روزگار ہے اِس لئے طاقت پذیری بھی ہے۔

تایا جی کام کے بارے میں کہتے تھے، وُہ جاہل ہیں جو کہتے ہیں کہ کام جینے کا وسیلہ ہے! کام،

دانش کا اختیارِ قطعی ہے اور انسان کی عالی ظرفی۔"

میری ماں کہتی تھی، "کام جتنا زیادہ ہو، میں اتنی ہی تنی تویلی محسوس کرتی ہوں!"

بھائیا جی کہتے تھے، "کام، انسان کی جان ہے!"

کسان کے کام میں تمام کا تصور ہی نہیں ہے۔ اُس کا کام دسوں دِشاؤں میں پھیلا ہوا ہے۔ تایا جی، میری ماں اور میرے بھائیا جی کی طرح کسی گمنام شاعر نے کام کے تکلیف دہ سلسلے کو کسی نئی بیاہتا کی نظر سے دیکھا ہے۔

ماہی تیرے کم کاج نے،
ساڈا میل بنایا سپنا
جتھے تیرا ہل وگدا
اوتھے ڈاواں چرخہ اپنا

(میرے ساجن! تیرا کام کاج ہمارے میل جول میں رکاوٹ بن گیا ہے اور ہوتے ہوتے ہمارا ملاپ، خواب ہو گیا ہے۔ مجھے ایک جگت سوجھی ہے! جس کھیت میں تو ہل چلاتا ہے، میں وہاں چرخہ کاتا کروں)

میری بے ہودگی! میں کام بیچ میں تج کر آرام کر رہا تھا۔ بھائیا جی کو سر پر کھڑے دیکھ کر میں جلدی سے اٹھا لیکن انہوں نے مجھے اُٹھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا اور مجھ پر کام چور کا بہتان لگا دیا۔ میری بدبختی! میرے منہ سے نکل گیا کہ میری کمر دکھتی ہے۔ اُن کی تندی ابتدا ہی میں اِنتہا کو پہنچ گئی، "نئی عمر اور ٹوٹی کمر! بول حرامی بول، تجھے کون چونگھ رہا ہے!؟"

میرے رازدار قارئین! مجھے حوصلہ نہ ہوا کہ میں انہیں اپنے راز میں شریک کر سکوں۔ میں جانتا تھا کہ میں حدِ اعتدال سے گزر رہا ہوں۔ میں خود کو چونگھے سے گریز کرتا لیکن اُس وقفے کی مدت بہت کم ہوتی۔ مانا کہ کوئی کتا تلاشِ معاش میں اپنے زخم کو چاٹنا بھول جائے۔

کملا مارنے کی حد سے بڑھ چکا تھا اور آدھی سے زیادہ سن کھا گیا تھا۔ مجھے ادھ موا کر کے بھائیا جی نے کھیت کا جائزہ لیا اور جو کچھ سن بچی تھی اُسے الدمے ہل (وہ ہل جو اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی مٹی اوپر کرتا ہے) سے کھیت میں باہ دیا اور اُسے ہری کھاد کے طور پر برت لیا۔

تایا جی کو میری 'بیماری' کا علم ہوا۔ انہوں نے میرے لئے پکے ہوئے لسوڑے تجویز کئے۔ لسوڑوں کا موسم نہ تھا، انہوں نے وقتی طور پر کمر کس کھانے کو کہا اور ساتھ ہی جتایا۔ "تیری بیماری منووگیانک (نفسیاتی) ہے

وُہ مجھے زیادہ کام کرنے اَور کم سونے کی ہدایت کرتے۔ اُن کی پُوچھ تاچھ کے دوران مَیں نے اُنہیں بتایا کہ سپن دوشس تب ہوتا ہے جب سپنے میں موہنی (موہ مایا کی دیوی) آتی ہے۔ وُہ مُسکرا کر بولے۔ "مَن میں بسے سو سپنے دِکھے!"

بھائیا جی ٹک پر رہتے تھے، اپنی روٹی آپ پکاتے تھے اَور وہاں روٹی کی پُوری سامگری رکھتے تھے۔ اُن کے پاس جتنا سامان ہوتا تھا، چھپّر کی بڑی کا بَجن (وُہ لکڑی جس پر چھپّر کی اُونچائی کا اِنحصار ہوتا ہے) سے بندھا ہوتا تھا۔ کبھی مجھے ٹک پر رہنا پڑتا تو مَیں اپنی روٹی آپ پکاتا۔ شرُوع شرُوع میں میری روٹی، ہندوستان کے نقشے سے ملتی تھی لیکن آخر مَیں توے جیسی گول روٹی بنانے لگا تھا۔

میری بڑی بُوا کا چھوٹا لڑکا بنتا سنگھ میرے گاؤں آیا۔ اُس سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ وُہ الغوزے بجانے میں ماہر تھا اَور مَیں مرزا صاحباں گانے میں، مجھے گھر میں نہ پاکر وُہ سیدھا ٹک پر چلا آیا۔ مَیں نے اُسے اپنے راز میں شریک کیا، اُس نے بتایا کہ وُہ خُود اِس مرض میں مُبتلا تھا۔ اُس نے جھٹ آزمُودہ دوا تجویز کی، افیون، مَیں افیون کہاں سے لاتا؟

رومیش کہتا تھا، "لُطفِ جماع سے رگوں کو پُوری تسکین ملتی ہے اَور ڈھیلی رگیں کس جاتی ہیں، جن کی وجہ سے دھات گرتی ہے۔"

تایا جی اپنی رائے دیتے تھے، "مانس شریر وُہ تروینی ہے جو شریرک، مانسک، آتمک (جسمانی، نفسانی، رُوحانی) دھاروں سے بنتی ہے۔ یہ دھارا نرمل ہو تبھی مانس نروگ رہتا ہے۔"

اِن دونوں نُسخوں میں سے مجھے پہلا آسان اَور قابلِ اعتبار لگتا تھا۔ خیر، مَیں کسی سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ ایک کے اجزا مُیسّر نہ تھے اَور دُوسرے کو آزمانے کے لئے میرے پاس راسخ اِرادہ نہ تھا۔

گُلِ لالہ کی بہار تھی جو ہمارے ٹک کے مشرق سے شرُوع ہو کر لدڑاں کی حد سے آگے نکل گئی تھی۔ ڈوڈے لگ رہے تھے، جن کا رنگ پتّوں کی طرح سبز تھا۔ اُن پر نظر دوڑاتے ہُوئے بنتا سنگھ نے کہا، "تیرے عِلاج کا بندوبست ہو گیا ہے۔"

"کیسے! کہاں سے؟" مَیں نے بیتاب ہو کر پُوچھا۔

"مجھے دھن وَنتری کا بتایا ہُوا فن آتا ہے۔" اُس نے چار پائی سے اُٹھتے ہُوئے اَور پوست کے کھیت کا رُخ کرتے ہُوئے اپنی بات کو جاری رکھا، "دھن وَنتری نے سپن دوشس کے لئے یہ اکسیر بتائی تھی اَور اِس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا تھا۔" وُہ کھیت میں بیٹھ گیا اَور ڈوڈوں کو دیکھنے لگا۔

تایا جی دھن وَنتری کو حکیمِ زمانہ مانتے تھے اَور اُس کا حوالہ دیتے تھے۔ "ہر جڑی بُوٹی کی افادیت مُسلّم ہے،

کسی کو معلوم نہیں ہے تو وہ اُس کی اپنی جہالت ہے !" وہ بذاتِ خود بوٹیوں، بیجوں، نمکوں کے گن ایسے جانتے تھے جیسے کسی تاریخ داں کو شاہی خاندان کے حسب و نسب معلوم ہوں۔ حکومتِ خدا کے برعکس وہ سلطنتِ زمیں کی اِس تکوینی ماہیت کے ثناخواں تھے۔

عالمِ حیوانات

عالمِ نباتات عالمِ معدنیات

جو برتاؤ دھرتی، بیج سے کرتی ہے وہی برتاؤ گیان، اِنسان سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تایا جی کی باتیں حقیقت افروز اور اعتبار افزا تھیں۔ پرکاش کور گربھ وتی تھی۔ گربھ کے دن پورے ہو چکے تھے لیکن دردِ زہ کے آثار نہ تھے۔ اُس کا پیٹ بہت بڑا تھا اِس لئے ہر کوئی فکر مند تھا۔ سنتی دائی کہتی تھی کہ پہلونٹھی کا بچہ ہے اور جو گھڑی اُوپر ہو رہی ہے، حاملہ کے حق میں خطرناک ہے۔ اُس نے اُسے ملائی میں کستوری رکھ کر کھلائی جو بیکار ثابت ہوئی۔ تایا جی سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے دلاسا دیا اور جنگل سے چرچٹا کی جھڑیں لائے اور سنتی کو دے کر بولے "ایک جھڑ کو گربھ وتی کی ناف پر کمر کے گرد باندھ دے اور اپنا دوسرا سامان تیار کر لے۔"

سنتی نے تائی ماں سے پانی گرم کرنے کو کہا اور خود کترنی کو سینک کر ٹھنڈا کرنے لگی۔ اُس کے بعد اُس نے سوت کا دھاگا بٹا اور اُن دونوں چیزوں کو تھالی میں رکھ دیا۔ وہ تائی ماں سے کچھ پرانے کپڑے اور کچھ روئی کا اِنتظام کرنے کے لئے کہہ رہی تھی کہ پرکاش کور درد سے کراہنے لگی۔ سنتی نے ایک کے بعد ایک، سارے بچوں کو وہاں سے بھگایا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد خبر ملی کہ پرکاش کور نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا ہے۔

اجیت سنگھ کا بیاہ قرار پایا تھا تو تایا جی کی تجویز پر ماں نے ریشِ برگد گھوٹ کر پی لیا تھا۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ ساس اور بہو ایک ساتھ بچے پیدا کریں۔ یہی بات کسی شاعر کو بھی ناپسند ہوگی ورنہ وہ بہ طنز کیوں کرتا؟

نوہ سس دونوں گبھناں

کون کس نوں دوے پنجیری؟

(بہو اور ساس دونوں پیٹ سے ہیں۔ دونوں میں سے کون، کس کو پنجیری دے؟)

میں افیون کھانے سے ڈرتا تھا۔ اس کی ایک برائی، جسے میں بچپن سے جانتا تھا، قبض تھی۔ تایا جی کی ہنس رس کہانیاں افیونیوں اور پوستیوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ میں افیون اس لئے کھانا چاہتا تھا کہ اس کا چمتکار دیکھنا چاہتا تھا۔ بنتا سنگھ کے لفظوں میں افیون بہتے دھارے کو باندھ سکتی ہے، ہریانہ کے رام لیلا کے میلے میں سنیاسی ایسی کار آمد جڑی بوٹیوں کا مرکب بیچتے تھے اور اُس کے بارے میں ایسے چٹکلے سناتے تھے جو نفس کی خوابیدہ رگوں کو جگا کر گرما دیتے تھے۔ بنتا سنگھ کہتا تھا کہ اُن ساری جڑی بوٹیوں کے گن ایک افیون میں

موجودہ ہیں۔ وہ جیسے افیون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک نہایت دلچسپ معاملہ ہے اور وہ اس میں ماہر تھا۔ وہ ایک بار گھر سے بھاگ گیا تھا اور مالوہ میں افیون اکٹھی کر کے روزی کماتا رہا تھا۔ ہمارے علاقے میں کسانوں کے پاس پوست بونے کا لائسنس تھا، افیون نکالنے کا نہ تھا اور لائسنس کے بغیر افیون نکالنا جرم تھا۔

"کسی نے ہمیں افیون نکالتے دیکھ لیا تو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ اس علاقے کے پورے کسان بھابا جی کو جانتے تھے۔ میں نہ چاہتا تھا کہ کوئی پرخطر بات ان تک پہنچے جو میری شامت کا سبب بنے۔

"ہم نے کون سی من بھر نکالنی ہے! شام کو کسان گھروں کو چلے جائیں گے اور ہم تھوڑے سے ڈوڈے چھیڑ دیں گے۔" اس نے بے دھڑک کہا۔

وہ ڈوڈے چھیڑنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے جھنڈ میں سے ایک کانٹے دار جھاڑی تلاش کی جس کے کانٹوں کی لمبائی باریک درانتی کے دانتوں سے آدھی ہو گی۔ چاقو سے ٹہنی کاٹ کر اس نے بالشت بھر لمبا قلم بنایا، اسے دیکھا، پرکھا اور مجھ سے پوچھا، "اس میں کیا خاص بات ہے۔؟"

میں نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر دیکھا لیکن وہ نکتہ نہ پا سکا جس کا اسے علم تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا، "یہ کانٹا مڑی ہوئی بچھڑ کی طرح ہے۔ اس سے کتنے ہی ڈوڈے چھیڑو، یہ ثابت رہے گا۔"

اس نے کانٹے پر انگوٹھا پھیرا جیسے کاریگر، تیغ کی دھار دیکھتا ہے۔ مجھ پر دھاک جمانے کے لیے یا اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنے کے لیے، اس نے اپنی بانہہ پر خراش لگائی۔ ماس پر لال لکیر پڑ گئی، لہو نہ نکلا۔ میں حیران تھا کہ اس نے ویسا کیوں کیا؟ میں پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کانٹے کی تعریف کرنے لگا۔ کانٹے کی لمبائی بالکل ٹھیک ہے! آنکھیں بند کر کے بھی خراش لگاؤ تو خراش، ڈوڈے کے گال کے اندر، باہر نہیں نکلے گی۔ اس کام میں بھی احتیاط لازم ہے ورنہ افیون، ڈوڈے کے اندر رس جاتی ہے اور آدھی بھی ہاتھ نہیں آتی ہے۔"

وہ چوتھی جماعت سے آگے نہ پڑھا تھا۔ اس کی تجربہ کاری نے اس پر جیسی فنی باریکیاں ظاہر کی تھیں وہ بصورتِ دیگر ناممکن تھیں۔ وہ چاقو جس سے اس نے قلم تراشا تھا، اسی کا بنایا ہوا تھا۔ اس کا پھل، باز کی چونچ جیسا تھا اور اسی شکل کا اس کا شیشم کی گری کا دستہ، جس میں تانبے کی میخیں ٹھونکی ہوئی تھیں۔ وہ کس فخر سے کہتا تھا، "میں جس کسان کے پاس کام کرتا تھا وہ تار سے ڈوڈے خراشتا تھا۔ میں نے اس کے لئے جو قلم بنایا تھا اس سے افیون کا حاصل بڑھ گیا تھا۔"

بھتا سنگھ ان پڑھ سہی، ہنرور تھا اور میں پڑھا لکھا جاہل۔ علمی اور عملی رسائی میں اندھیرے اجالے کا فرق ہے۔ یہ کہاوتیں یوں ہی وجود میں نہیں آئیں۔

۱۔ کرتا انسان، نہ کرتا شیطان۔

۲۔ کرتا کرتار ، نہ کرتا اوتار۔

۳۔ کرتے کی بدیا۔

۴۔ نیم حکیم خطرۂ جاں۔

حافظ اِتنے بڑے عالم تھے لیکن علم پر عمل کی برتری گردانتے تھے۔

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روی شود ہر کہ در و غش باشد

(دُنیا میں اگر تجربہ کی کسوٹی ہوتی تو جھوٹے، رُوسیاہ ہوتے)

مَیں گھر سے بھاگنے کا اِرادہ کرتا لیکن مجھ پر یہی خوف طاری رہتا کہ مَیں اپنی روزی کیسے کروں گا؟ بنتا سِنگھ کو خُود پر اِس قدر اِعتماد تھا کہ وُہ جب چاہتا گھر سے بھاگ جاتا۔ پھُوپھا کی غیر یں وُہ پوری سیپی (کسانوں کا کام جِس کی اُجرت اساڑھی اور ساونی پر جِنس میں ملتی ہے۔) اکیلا سنبھالتا اُس کی ماں اُسے دُودھ اور مکھن کم دیتی، وُہ اڑ جاتا، "برابر کماتا ہُوں، کم کیوں کھاؤں؟"

اُس نے ایک ڈوڈے پر دو خراش لگائیں، ایک اِدھر دُوسری اُدھر۔

جلد گھائل ہوتے ہی اُس میں سے دُودھیا رَس نکلا اور سطح پر ایسے ٹھہر گیا جیسے لبریز ساغر پر پانی۔ اُس نے خوش ہو کر کہا، "کل شام تک یہ دُودھ جم جائے گا جیسے کھرچ کر گولیاں بنالیں گے۔" اُس نے لئے بھی ایک قلم بنایا تھا۔ مَیں بھی ڈوڈے چھیڑنے لگا اور جب کام سے فارغ ہُوا، میری اُنگلیاں سُرخ ہو رہی تھیں۔ مَیں نے اُسے اُنگلیاں دکھائیں، اُس نے کہا، "یہی اَفیون ہے، اِسے چاٹ لے۔"

مَیں نے اُس مواد کو چکھا اور اُسے گھناؤنی حد تک کڑوا کسیلا پایا۔ اُس سے میرا خر وش ٹھنڈا کیوں کہ مَیں اُس انوکھی اِکسیر کی تاثیر دیکھنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اپنے ہاتھ کو ایسے چاٹا جیسے کُتّا اپنے بہتے لگاتار چاٹتا ہے، اور پھر وقفے وقفے سے۔

تایا جی اَفیون کو نزلہ، زُکام اور جُلاب وغیرہ کے لئے دوا مانتے تھے۔ وُہ یہ تو ہرگز نہ بتاتے تھے چیز، دھات کے لئے بھی مُفید ہے۔ اُن کے پیٹ کا درد ناقابلِ برداشت ہونے پر وُہ انڈے کی سفید تھوڑی سی اَفیون ملا کر اُس کا لیپ لگا لیتے اور دیکھتے ہی دیکھتے آرام سے سو جاتے۔ کئی بار وُہ لیپ سے کرتے اور کام میں جُٹ جاتے۔ اُن کے چہرے کا تناؤ جاتے جاتے جاتا رہتا اور وُہ کام سے لُطف اُٹھا لگتے۔ اُن کا عمل اِس فِراست کا ثبوت تھا کہ کام، درد کا بھی عِلاج ہے۔

سُورج چھپ گیا اور مجھے رات کی روٹی کا فِکر ہوا۔ بنتا سِنگھ نے کہا، روٹی کا چکر چھوڑ

چُوستے ہیں اور رات کاٹ لیتے ہیں۔"

ٹک سے کچھ دُور کماد کا کھیت تھا ہم دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے گئے اور دس بارہ گنّے چُرا لائے۔ سردی چُبھنے لگی تھی۔ ہم نے دھُونی جلائی اور آگ تاپتے ہُوئے گنّے چُوسنے اور باتیں کرنے لگے۔

بنتا سنگھ نے کہا، "مَیں تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہُوں، کسی سے نہ کہنا!"

"ٹھیک ہے۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟" مَیں نے اِشتیاق سے پُوچھا۔

"بالکل خاص! گھر کی بات ہے۔" اُس نے میرے شوق کو بڑھاوا دیتے ہُوئے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے؟" میرا لہجہ پہلے سے زیادہ بے قرار تھا۔ بنتا سنگھ سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ وُہ اپنا ہر راز مجھے ملتے ہی بلا تامّل بتا دیتا تھا۔ مَیں حیران تھا کہ وُہ ایسی کون سی بات ہے جو اُس نے اِتنی دیر سے چھُپا رکھی ہے۔ اُس کی ہچکچاہٹ پر غور کرتے ہُوئے مَیں نے پھر پُوچھا، اُس نے کہا، "کسی سے نہیں کہنا! مَیں اپنی بھابی سُرجیت کور سے پھنس گیا ہُوں۔ کل دوپہر ہم لگے ہُوئے تھے کہ اُوپر سے ماں آ گئی۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا، لیکن مجھے گھر سے نِکال دیا۔ یہ بات ابھی تک ہم تینوں کے بیچ تھی۔" اُس کی اِبتدائی جھجک نِکلتے ہی وُہ کھُل گیا اور کہنے لگا۔ "بھگت سنگھ نامرد ہے اور سُرجیت کور کھڑا سوار چاہتی ہے۔"

ٹھنڈی رات میں گنّے چُوسنے کا مزہ وُہی جانتا ہے، جو کبھی اِس عمل سے گُزرا ہے، لیکن اُس رات گنّے چُوسنا رعمل برائے عمل تھا۔ ہم کبھی باتیں کرتے اور کبھی گنّے چُوستے اور اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے تجربے بیان کرتے۔ عملی طور پر بنتا سنگھ مجھ سے کہیں آگے تھا۔ ایک موقعے پر اُس نے گنڈیری توڑ کر کہا، "کنواری کے اعضا گنڈیری کی طرح ہوتے ہیں، جِسے دانتوں سے چُوسا جاتا ہے۔"

میری نفسانی کیفیت! مَیں جب تک گنّے کھاتا رہا، اُن کنواریوں کے انگ چُوستا رہا جِن تک میری خیالی رسائی تھی۔ باتوں باتوں میں دِن چڑھ آیا اور وُہ یہ کہہ کر لامبڑے چلا گیا کہ وُہ شام کو آئے گا۔ لامبڑے میں اُس کی بہن پریتم کور کا سُسرال تھا جِس کا پتی لابھ سنگھ انڈین آکسیجن دلّی میں سُپروائزر تھا۔ بنتا سنگھ اُس دِن شام کو نہ آیا۔ میرا سارا دِن چھوٹے موٹے کاموں میں گُزر گیا۔ مَیں نے کئی بار ڈوڈوں پر افیون جمی ہُوئی دیکھی لیکن مَیں نے اِکٹھی نہ کی۔ وُہ دُوسرے دِن دوپہر کو آیا۔ اُسے دیکھتے ہی مَیں نے حیرت سے پُوچھا، "مَیں نے سمجھا تھا کہ تو چلا گیا ہے۔"

"کہاں؟ دِلّی جانے کا منصُوبہ بنایا ہے۔ بی بی نے کہا ہے کہ وُہ کچھ مدد کر دے گی۔ مَیں گاؤں نہیں جاؤں گا۔" اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"یہ تو اچھا ہُوا! تو بڑھئی کا ہُنر جانتا ہے، کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔ امر سنگھ کہتا ہے، دِلّی

ہر دِشا میں پھیل رہی ہے، غبارے کی طرح!" مَیں نے اَمر سنگھ کے حوالے سے اُسے تسلی دی، "اب اِن کا کیا کرنا ہے؟" مَیں نے کھیت کی طرف اِشارہ کیا۔

"اُس کا کیا کرنا ہے؟ اُسے اِکٹھی کرتے ہیں۔" اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے کہا۔ اُس کی نظر گنّوں کے چھلکوں پر جا کر رُکی اَور وُہ اُن کی طرف چل پڑا۔ اُس نے دو چھلکوں سے دو کھرپے بنائے اَور ایک کھرپا مجھے دے کر کہا، "کھرپے کے باہر کے پاسے پر اَفیون کھرچنا۔ اَندر کا پاسہ کھردرا اَور کبڑا ہے، اُس پر سے اَفیون اُتارنی مُشکل ہوگی۔"

مجھے لگا کہ وُہ جو کام جانتا ہے اُس کے بارے میں پُوری جانکاری رکھتا ہے۔ مَیں اُسے پُوچھے بغیر نہ رہ سکا، "تُو اِتنا ہوشیار ہے، سکُول سے کیوں بھاگ گیا؟"

"مَیں نے بہت زور مارا، چھوٹے بھائی! کالے اَکشر میری سمجھ سے باہر ہیں۔" وُہ اپنی بے بسی پر مُسکرا کر بولا۔

ہم اَفیون کھرو چنے لگے اَور کٹوریوں میں اکٹھی کرنے لگے۔ وُہ کام ختم ہُوا۔ اُس نے ہاتھوں کو سرسوں کا تیل مَل کر اَفیون کو ہاتھوں میں لیا اَور ایک اَنٹا بنا لیا۔ مَیں نے دیکھنے کے لئے مانگا، اُس نے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ہدایت آمیز لہجے میں کہا، "سنبھال کر رکھنا، نیچے نہ گرا دینا، ابھی آتا ہُوں مَیں!"

مَیں نے اَندازہ لگایا کہ اُس اَنٹے کا وزن اُس حجم کے گُڑ کے گولے سے کہیں زیادہ ہے۔ وُہ اَرنڈ کے دو پتّے توڑ کر لایا، اُنہیں کپڑے سے صاف کر کے تیل سے چُپڑا، مجھ سے اَنٹا لے کر اُس کے ایک جیسے دو اَنٹے بنائے اَور ایک مجھے دے کر کہا، "اِسے تُو رکھے گا کہاں؟"

مَیں نے اُسے چھپانے کے لئے پہلے ہی نہایت موزُوں جگہ سوچ رکھی تھی، جھٹ کہا، "نواڑی پلنگ کے بیچ میں!" اُس نے میری تائید میں کہا، "اچھّی جگہ ہے! مَیں اپنی چیزوں کو اپنے بکس میں رکھتا ہُوں۔" اُس نے اپنا اَنٹا پگڑی کے لڑ میں باندھ کر پگڑی میں اُڑس لیا۔ مَیں نے اپنا اَنٹا دبا کر چپٹا کیا اَور جیومٹری بکس میں رکھ کر بستے میں باندھ دیا۔ بنتا سنگھ نے اپنے کھیسے میں سے دو گولیاں نکالیں جو قطر میں چنوں کے دانوں سے چھوٹی تھیں۔ اُس نے ایک گولی اپنے مُنہ میں رکھی، لُعابِ دہن سے گلے میں اُتاری اَور دُوسری مجھے دے کر کہا، "لے کھا لے۔ خُوراک کا بھی یہی حساب رکھنا۔"

گولی کھانے کے لئے مَیں نے اُسی کا اَنداز اپنایا۔ وُہ چیز، دھات اَور سِین دوش کے حق میں واقعی اِکسیر تھی لیکن اُس سے مَیں ایک ناگوار اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ مَیں جب کبھی خُود فریبی پر مائل ہوتا، میرے آغاز کو اَنجام بڑی مُشکل سے ملتا۔

باب ۳۶

اک مرے چاہنے سے بنتی نہیں بات کوئی
تم بھی کچھ بات بناؤ تو کوئی بات بنے (شاطر)

میں اپنی ماؤسی شوکور کے ہاں کندھالے جارہا تھا۔ راستے میں سین پور پڑتا تھا جہاں میری ماں کی سہیلی بسنتی رہتی تھی۔ ماں نے اُس کے لئے شکر قند باندھ دی اور کہا، اُس سے کہنا کہ گھر کی ہیں، بادی نہ ہوں تو اور منگوا لے۔"

میں شکر قند کی گانٹھ، بسنتی کو دے کر کھڑے کھڑے لوٹ رہا تھا کہ اُس نے پیپل پائے کے سہارے کھڑی ایک لڑکی کو سمجھا دیا،" نرمل، گیان تیرے گاؤں جا رہا ہے۔ تو جانا چاہتی ہے تو اِس کے ساتھ چلی جا، آخر کا ساتھ ہے۔"

نرمل کو میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اُس کے بارے میں کتنا کچھ جانتا تھا! اُس کے ساتھ سماجی حادثہ ہوا تھا جو اُس کا جذباتی مسئلہ بن گیا تھا۔ اُس کی بڑی بہن کیسری مرگئی اور اُس کے باپ نے اُسے اپنے رنڈوے داماد گرمیت سنگھ کے گھر بٹھا دیا۔ جب نرمل کم سن تھی اِس لئے گونا ملتوی رکھا گیا۔ نرمل بر پراپت (سیانی) ہوئی، اُس کا گونا دینا طے پایا تو وہ اڑگئی اور اُس نا انصافی سے لڑنے کے لئے تیار ہوگئی جو اُس کے ساتھ بچپن میں ہوئی تھی۔ گرمیت سنگھ نے پنچ اکٹھے کئے، اُنہوں نے اُس کے ہت میں فیصلہ دیا اور نرمل کو سمجھایا۔ وہ نہ مانی تو اُسے ڈرایا اور دھمکایا۔ اِس پر وہ دھڑلّے سے بولی،" جسے ہمدردی ہے، وہ اپنی لاڈلی اِس بڈھے کے گلے باندھ دے۔ جہاں تک میرا سوال ہے؟ میری جانے جوتی!"

اُس نے جوتی اُتاری تھی اور بڈھے کے دے ماری تھی!

اُسے سبق سکھانے کے لئے پنچوں نے فیصلہ سنایا،" گرمیت سیاں! یہ تیری چیز ہے! تو اِسے اُٹھا کر لے جا!"

اُن کی شہ پاکر گرمیت سنگھ آگے بڑھا لیکن گاؤں کے کچھ من چلے نرمل کے پکش میں کھڑے ہوگئے اور گرمیت سنگھ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ جب پنچایت اُس کا حق دِلانے میں ناکام رہی تو اُس نے کچہری کا راستہ اپنایا اور مقدمہ چلنے لگا۔ نرمل کی ساکھ چھلنی میں ڈالا چھاج میں اُڑایا کی سی تھی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ لڑکی کیسل ہے! جس سے ملتی ہے، دھنس کر نکلتی ہے اور پھر اُسے تڑپنے، مرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ اُس کے بارے

میں کیسی کیسی باتیں گردش میں تھیں ۔ اُن میں کِتنا سچ تھا اور کِتنا جھوٹ ! مَیں کیا جانوں ۔ ہاں مَیں اپنے تجربے کی بِنا پر یہ وُثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ غیبت وُہ دائمی ندی ہے جو کسی سرچشمے کے برعکس آدمی کی زبان سے پھُوٹتی ہے اور زبان ، زبان سے ہوتی ہُوئی کہیں بھی جا نکلتی ہے ۔

نرمل کا نام سُن کر مَیں نے اُس لڑکی کو دوبارہ دیکھا جو بیل پائے کے سہارے برآمدے کی ملگجی روشنی میں کھڑی تھی ۔ اُس ماس اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو اُس کے نام نے جو معنی دیئے وُہ روایتی اور کِتابی نہ تھے ۔ اُن کی 'نرملتا' کانٹے کی سی تھی جو زیادہ قریب آئے تو لہُو لہان کر جاتا ہے ۔ اپنی سچائی وُہ آپ جانتی ہوگی ، لیکن جو مَیں نے دیکھا وُہ الگ تھا ۔ اپنے ارادے اور دِل گُردے کے مُقابلے میں وُہ معمُولی ڈیل ڈول کی لڑکی تھی ۔ مجھے اعتبار نہ آیا کہ وُہ لڑکی جو بیل پائے کے سہارے کھڑی ہے ، پنچوں سے ٹکّر لے سکتی ہے اور جج کے سامنے بیان دے سکتی ہے ۔ اُس کا قد مُجھ سے کُچھ کم تھا اور بدن اکہرا ۔ کوئی سُندر انگ تھا تو وُہ اُس کے ذرا سے اُبھرے ہُوئے ہونٹ تھے ۔ جو سامنے سے دکھائی نہ دیتے تھے لیکن پہلُو سے دیکھو تو کاسۂ زانو کی طرح نظر آتے تھے ۔ بسّی کی تجویز نما بات سُن کر نرمل اندر بھاگی ، جھٹ پٹ تیار ہُوئی ، باہر آئی اور اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی ۔ اُس کی جلد بازی پر تبصرہ کرتے ہُوئے بسّی نے کہا ، " یہ کیا ؟ مَیں نے تو یُوں ہی کہا تھا ، تُو سچ مُچ تیار ہو گئی ! "

مَیں مُسکرا پڑا اور اپنی مُسکراہٹ چھُپانے کے لئے پگڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ اِتنے میں بسّی نے مُجھ سے اور اپنی بیٹی سے ایک ساتھ مُخاطب ہو کر کہا ، " مٹیارے (دوشیزہ) ! مہمان کو لسّی ، چائے پِلا ، کیا پیتا ہے پُتّر ؟ "

" کُچھ نہیں ، مَیں گھر سے کھا پی کر چلا تھا ۔ مَیں نے نرمل کی جانِب دیکھتے ہُوئے کہا ۔ اُس دوران نرمل شرمندہ سی سُکڑ گئی ۔ شرمانے سے پہلے اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور جذبات سے عاری ، بے رنگ خاکے کی طرح ۔ اُس کے شرماتے ہی وُہ نسوانیت کی دِلکشی سے نکھر گیا ۔ وُہ جِس انداز سے ایک انجانے کے ہمراہ سفر کرنے پر آمادہ ہُوئی تھی ، اُس سے اُس کی خُود اعتمادی جھلکتی تھی ۔ میرے تصوّر کی پرواز مجھے لے اُڑی اور مَیں اس خوش فہمی میں مُبتلا ہو گیا کہ وُہ مُجھ پر مرمٹی ہے ۔ اِس سے پہلے کہ کوئی میری خاطر داری پر دوبارہ دھیان دیتا ، مَیں لمبے سفر کا بہانہ کرکے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ سچ تو یہ ہے کہ میری جلدی میں تشویش کو دخل تھا ۔ مُجھے خدشہ لگ گیا تھا کہ بسّی نرمل کو روک نہ لے ۔

ہم پیدل چلتے چلتے گاؤں کے باہر پہنچے ، مَیں آگے تھا اور وُہ پیچھے ۔ اِس عرصے میں میرے دِل میں کئی خیال گُزرے ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مَیں ہر ایک کی حقیقت پرکھنا چاہتا تھا ۔ اُن میں سے کوئی خیال ایسا نہ تھا جس کی اُٹھان میں نفس کا خمیر نہ ہو ۔ فرق اِتنا تھا کہ کوئی خیال سہما سہما ، ٹیڑھا ٹیڑھا منزلِ مقصود تک پہنچتا تھا اور کوئی دلیرانہ سیدھا ۔ وُہ چھوٹا سا فاصلہ جو ہمارے درمیان تھا ، مَیں اُسے کیسے کیسے مٹا چُکا تھا ۔ مَیں نے رُک کر پیچھے مُڑ کر دیکھا ، اُس کی اُونچی ایڑی کی جُوتی اُس کی مُشکل بنی ہُوئی تھی ۔ اُس کی دُشواری سے لُطف اُٹھاتے ہُوئے مَیں نے

کچھ ہچکچا کر کہا، "یہ کسی نے تیرے ہی جیسی کے لئے کہا ہے، نرمل!"
"کیا؟" اُس نے جھینپ کر لیکن فوراً پوچھا۔
"جُتّی کسُوری پیریں نہ پُوری، ہائے ربّا وے میں‌نوں ٹرنا پیا۔ میری جُوتی کسُور کی بنی ہُوئی ہے لیکن تنگ اور تکلیف دِہ ہے۔ اِس پر مُصیبت یہ ہے کہ مُجھے چلنا پڑ رہا ہے" اُسے رضامند پاکر میری تشویش، زِندہ دِلی میں بدل گئی اور مَیں نے برجستہ کہا۔
"یہ جانتے ہُوئے بھی تُم مُجھے پیدل چلا رہے ہو! سائیکل پر کیوں نہیں بٹھا لیتے؟"
وُہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آگے بڑھی اور سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے پیازی ساٹن کی قمیض شلوار پہنی تھی اور اُسی رنگ کی اوڑھنی جو سینے پر بے مطلب پڑی تھی۔ اُس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے اوڑھنی اُتار کر سر سے باندھ لی اور اُسے اِس ڈھنگ سے ڈیڑھ گرہ دی کہ اُس کے دونوں سِرے اُوپر نیچے لہرانے لگے۔ وُہ جِس زاویے پر کھڑی تھی وہاں سُورج کی روشنی، چہرے پر سیدھی پڑتی تھی جِس کی چمک کو وُہ ہاتھوں سے روک رہی تھی۔ اُس کی دوشیزگی، ہو نہ ہو دیوار کے سائے میں بُجھی بُجھی سی تھی، برملا بھی ویسی ہی تھی۔ اُس میں کوئی دِلکشی نہ تھی، کوئی کُچھ تھی تو وُہ میری ہوس پرستی کی لپک سے تھی۔
"تُم جانتے ہو کہ مَیں تُمہیں پہلے ہی سے جانتی ہُوں؟" اُس نے جِس بے اِختیاری سے کہا اُس سے شوقِ ملاقات ظاہر ہوتا تھا۔
"وُہ کیسے؟" مَیں نے سُوال کا جواب سُوال میں دیا اور بڑی مُشکل سے اُس فاصلے کو برقرار رکھا جِسے میرے لحاظ سے اُس نے مٹا دیا تھا۔
"ست پال کور نے مُجھے تُمہارے بارے میں بہت کُچھ بتا رکھا ہے۔ تُم گاتے بھی ہو۔ جُتّی کسُوری گا کر سناؤ ناں!" اُس نے اپنی خواہش کا اِظہار مُسکرا کر کیا۔
وُہ بار بار مُسکرا رہی تھی جیسے وُہ جانتی ہو کہ اُس کی مُسکراہٹ اُس کی سادگی میں رنگ بھرتی ہے۔
اُس ناگہاں مُلاقات کا نرالا پہلُو یہ ہے کہ اُس وقت تک مَیں اُس سے ہزاروں باتیں کر چُکا تھا۔ اُن باتوں کے الفاظ دِل نواز اور معنی جاں گُداز تھے۔ وُہ اِس قدر لطیف تھے کہ مَیں اُنہیں زیرِ لب بھی ادا کرتا تو اُن کا جمال، پامال ہو جاتا۔ لہکتی مہکتی ہریالی، مناظر کی خوش ادائی، جاں آفریں تنہائی اور اُن سب سے زیادہ دِل آرا تصوّر سازی! مَیں وُہ البیلا تھا جِس کی دِلداری کے لئے نرمل کے بھیس میں 'موہنی' اُتری تھی۔
کِسی اور موقع پر میری بے اِختیاری میری ترنگ ہوتی تھی۔ مَیں گاؤں میں کِسی لڑکی سے دُور ہوتا، اُسے رجُوع کرنے کے لئے اُونچی تان میں گاتا اور تمنّا کرتا کہ اُسے پاس بٹھا کر گیت سناؤں۔ نرمل مُجھ پر وارد ہُوئی

تھی اَور وُہ خواہش کرتی تھی کہ مَیں اُسے گیت سناؤں لیکن اُس کی خواہش سے مَیں خُوش نہ تھا۔ مَیں نے اپنی حالت اپنے دِل کے آئینے میں دیکھی۔ میری رگیں آپس میں اُلجھ رہی تھیں اَور میری آمد میں کشمکش کی بدنظمی تھی۔ میرے متلوّن لفظوں اَور نرمل کی اداؤں میں کوئی ربط نہ تھا۔ مَیں نے اَپنے خیال میں گیت کے سُر گنگنائے جو بالکل پھیکے تھے۔ مَیں اَپنی تحقیر کے ڈر سے خاموش رہا اَور اَپنی کھوئی ہُوئی سنجیدگی کو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ فاصلے پر رہٹ چل رہا تھا، جس کا پانی پگڈنڈی کاٹ کر گزرتا تھا۔ نرمل نے آڑ میں سے چُلّو بھر کر مُجھ پر پھینکا اَور اَدا سے مچل کر کہا، "سُناؤ ناں! ست پال کہتی تھی کہ تُم بہت اچھا گاتے ہو۔"

وُہ آڑ پر بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی اَور مُجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے ضیافتِ نظّارہ دے رہی ہو۔ مَیں اُسے دیکھتے دیکھتے للچا گیا اَور مَیں نے اِظہارِ مدّعا کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اپنی راہ ہموار کرنے اَور اُسے بھرمانے کے لئے، مَیں گانے لگا۔ وُہی اَلفاظ جو میری لَے کی روانی ہوتے تھے، جیسے سے تھے۔ مَیں نے اُنہیں رگوں کی پُوری گرمی دے کر پگھلایا، وُہ قدرے رواں ہُوئے لیکن اُس گرمیِ سرُود سے بیگانہ رہے جو میری تنہائی کا نازد نمو ہوتی تھی۔ میرا گیت بے جان اَلفاظ کا سِلسلہ تھا جو میرے حلق سے شُروع ہو کر ہونٹوں پر ختم ہوتا تھا۔ میرے اندر کا کلاونت گھُٹے گھُٹے سانس لے رہا تھا جیسے بیمار ہو۔ وُہ مُجھے حیرت سے دیکھنے لگی، مَیں خاموش ہو گیا۔ مَیں کیا کروں؟ مَیں کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا۔ جیسے تالاب میں کنکر پھینکنے سے دائرہ دَر دائرہ کئی دائرے ایک دُوسرے میں ضم ہوتے ہُوئے حسین لگتے ہیں لیکن بے معنی ہوتے ہیں، میری حالت کچھ ویسی ہی تھی۔ ایک خواہش پُوری طرح واضح نہ ہوتی تھی کہ دُوسری سر اُٹھا لیتی، اُسی طرح تیسری، چوتھی اَور ... اچانک وُہ مُسکراتی ہُوئی اُٹھی، میرے پاس آئی، گنگناتی ہُوئی مُڑی اَور جا کر اُسی جگہ بیٹھ گئی اَور پھر پانی سے کھیلنے لگی۔ اُس کی یہ ادا تتلی کی طرح تھی جو کسی کے سامنے پھُول پر سے اُڑے، لہرائے، رِجھائے اَور وہیں جا بیٹھے جہاں سے وُہ اُڑی تھی۔ وُہ دِل رُبا انداز جذبے کی خُوشبُو سے لبریز تھا۔ خُوشبُو کی خُوبی ہے کہ یہ جسے چھُو لے اُسے مہکا دیتی ہے۔

"تُم چُپ کیوں ہو گئے؟"

"تُمہیں دیکھ کر مُجھے کُچھ ہو رہا ہے!"

"کیا ہو رہا ہے؟"

مَیں عاشقانہ جذبات سے مخمُور تھا۔ میری رگِ جاں، میری زبان ہی کی طرح کانپ رہی تھی جیسے وُہ کسی ناگہاں خطرے سے دوچار ہو۔ مَیں اُسے چھُونا چاہتا تھا، 'پیار' کرنا چاہتا تھا لیکن حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ہم خیالی سے شہ پا کر مَیں ازار سے باہر نکل پڑا۔ "آؤ، وہاں جھاڑیوں میں چل کر بتاتا ہُوں!"

"مَیں ایسی ویسی نہیں ہُوں! مَیں ..." اُس نے اَپنے غُصّے پر کسی قدر قابُو پا کر کہا اَور مُجھے تیز نگاہی سے

دیکھا۔ اُس کے الفاظ، اُس کے مجروح جذبات کا عکس تھے۔

مَیں دھک سے رہ گیا۔ مَیں اُس ردِ عمل کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ مَیں نے اُس کے سامنے جو تجویز رکھی تھی وُہ میری بوالہوسی کی ننگی تصویر تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ وُہ میری تجویز پر لبیک کہے گی اور خُود کو خُوشی سے میرے حوالے کر دے گی۔ اُس کے منفی رویے پر مَیں خوف سے کانپ گیا۔ گاؤں میں ایسا ہوتا، مَیں بھاگ کر کھیتوں میں چُھپ جاتا، رات گئے باہر نکلتا وُہ بھی اِدھر اُدھر دیکھتا ہُوا، لڑائی کی بُو باس پاتا ہُوا۔ اَب کیا ہوگا؟ اپنی بدذاتی پر شرمندہ ہو کر مَیں نے نظر جُھکا لی اور مَیں افسردہ چل پڑا۔ مَیں وقتی طور پر بھُول گیا کہ نرمل میرے ساتھ ہے۔ میری خُوش فہمی کہ ہر لڑکی مجھ پر مرتی ہے اور جان چھڑکتی ہے، غارت ہوگئی۔ پہلی بار مجھے اپنے ناک نقشے کی خُوبصورتی پر شک ہُوا۔ میرے ذہن سے آوارہ سا بھی خیال نہ گزرا تھا کہ کوئی لڑکی مجھے اِنکار کر سکتی ہے۔ میرے اِسی خیال نے میری بزدلی کا حوصلہ بڑھایا تھا اور مجھے پیش دستی پر اُکسایا تھا۔ مَیں نے سائیکل کے آئینے میں دیکھا، چہرے کی جاذبیت وُہی تھی جو ہونی چاہیئے تھی۔ آنکھوں میں سنجیدگی تھی جو شوخی سے بھلی لگتی تھی۔ پگڑی کے دونوں لڑ آنکھوں کے بیرونی گوشوں کو چھُو رہے تھے اور برابر کھنچی دو کمانوں کی صُورت مستعد دکھائی دے رہے تھے۔ مَیں چلتا چلتا رُک گیا۔ ابرُو، ہتھیلیوں سے سنوارے، پلکیں، پوروں سے سہلائیں، اور ہونٹ، زبان سے تر کئے، اپنے رنگ ڈھنگ سے مرعُوب ہو کر مَیں نے نرمل کو اُس کی نظر بچا کر دیکھا۔ وُہ میرے مقابلے میں معمُولی سی لڑکی تھی۔ میری 'خودی' نے مجھے باور کروایا، تُو نے اُس کے سامنے ایسی تجویز رکھ کر اُس کی عزّت بڑھائی ہے۔

اِس وقت مَیں نے انجانے میں خُود سے سُوال کیا ہے، خُودی ہے کیا بلا؟

میرے ضمیر نے مجھ سے جو کہا ہے وُہ میرے بیان کے بالکل اُلٹا ہے۔ مَیں پریشان ہُوں اور اُس کی بات کو نظر انداز کرنا چاہتا ہُوں۔ مَیں مزید واقعہ بیان کرتا ہُوں تو میرا ضمیر شور مچاتا ہے اور اِصرار کرتا ہے کہ مَیں اُس کی بات کو رقم کروں اور مَیں لکھنے پر مجبُور ہُوں۔ خودی، مَن مانی، گستاخی، زبردستی، چھینا جھپٹی . . . . ہرگز نہیں! رضامندی، پاسداری، رواداری . . دلیل ہے۔ جو اوّل صُورتِ حال کو خُودی سمجھتا ہے، وُہ نراج کا حامی ہے اور غارت گر ہے۔

نرمل نہ آہستہ نہ تیز اپنی رفتار سے آ رہی تھی اور جُوتی اُتار کر ہاتھ میں پکڑے ہُوئے تھی۔ وُہ برہم نہ لگتی تھی۔ اُس نے سر سے چُنری کھول کر سینے پر اوڑھ لی تھی اور سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی دلجمعی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ سوچ کی رعنائی میں عجب رسائی ہے! یہ اِس سے ملتی اُس سے بچھڑتی اپنی رعُونت میں کہاں سے کہاں جا نکلتی ہے۔ ویسے حالات میں مَیں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا اور دُوسروں کو اپنی مدد کے لئے بلُایا تھا۔ نرمل نے اپنی حفاظت کرتے ہُوئے مجھے صرف ڈانٹا تھا اور دراز دستی سے روکا تھا۔ اُس کی اخلاقی جرأت نے اُس کے بارے

میں میرے سارے گمانوں کو جڑ سے اُکھاڑ دیا۔ میں نے اُس کے ساتھ جو بدمستی کی تھی، اُس پر مجھے افسوس ہُوا میں رُک گیا اور نادم سا اُس کا راستہ دیکھنے لگا۔ وُہ میرے قریب آئی اور خلافِ اُمید رُک گئی۔ وُہ پریشانیِ خاطر سے عاری تھی اور مطمئن سی تھی جیسے اُس نے میری بدتمیزی کو مُعاف کر دیا ہو۔ اُس نے مجھ سے نظر ملا کر جس حیا سے آنکھ چرائی، اُس میں دوشیزگی کی پاکیزگی تھی۔ وُہ اچھُوتی ہے! یہ لطیف اِحساس مجھے پہلی بار ہُوا۔ میری رگِ جاں سازِ رُوح افزا کی طرح بج اُٹھی۔ وُہ ایک طرح سے میری کھری مِثال تھی۔ میں کیسے کیسے روندا گیا تھا! بدنام ہُوا تھا! حالاں کہ میری بدنامی میں سچائی برائے نام نہیں تھی۔ میں مہک گیا جیسے میں نے پُرانے کپڑے اُتار کر نئے پہن لئے ہوں۔ میں نے شرماتے اور جھجکتے ہُوئے کہا، ”نِرمل جی! میں اپنے کیے پر خجل ہُوں، مجھے مُعاف کر دیجئے!“

اُس نے جوتی، کیرئیر پر رکھ کر میرا بازُو تھام لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے کہا، ”یہ کیا ہے! میں تمہیں، خُون مُعاف کر سکتی ہُوں! تم جیسے ہو، اچھّے ہو اور میرے ہو! میں ایسا نہ سمجھتی تو تمہارے ساتھ نہ آتی۔“

نِرمل جو تھی، تھی! دلیر لڑکی تھی۔ اُس میں میری دِلچسپی بڑھ گئی۔ اُس کی مُصالحت نے میری ہوس کو پھر ہوا دی اور مجھے بہکا گئی۔ نِرمل کُنواری ہے اور تُم پر مرتی ہے! تُم کُنوارے ماس کی لذّت سے نا آشنا ہو، وُہ چیز ہی اور ہے! یہ نادر موقعہ چلا گیا تو چلا گیا! میری رگیں لُطفِ تازہ سے ناچنے لگیں۔ میں نے اُس نازک جذبے اور بُلند اَخلاق کو بے حِسی اور بدکاری کی آگ میں جھونک دیا جس کی میں نے اپنے اہانت آمیز حالات میں دُوسروں سے آرزُو کی تھی۔ میرے قارئین میری ریاکاری پر غور کریں! اپنے خرُوجِ نفس کے لئے میں ہر بدرَو میں ڈُوبتا پھرتا تھا لیکن میرا ناپاک دِل پوتّر جل کا پیاسا تھا۔

تایا جی کہتے تھے، ”عدیل، دُوسرے کی غلطی سے سیکھتا ہے اور اپنی غلطی سے عِبرت حاصل کرتا ہے۔ ذلیل، دُوسرے کی غلطی اُچھالتا ہے اور اپنی غلطی چُھپاتا ہے اور اپنی سہل پسندی کی وجہ سے اپنا مُقابلہ اپنے سے کم تر سے کرتا ہے اور یُوں پستی سے پستی میں گرتا ہے اور آخر کار حدِ ضمیر سے گزر جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ طریقے سے انجام کو پہنچتے ہیں۔ پہلا اپنے کمال سے اور دُوسرا اپنے زوال سے۔“

میں ابھی تک دُوسروں کے اعمال کا نکتہ چیں رہا ہُوں۔ میں زِندگی کے اُس موڑ پر آ گیا ہُوں جہاں محاسبۂ نفس ضرُوری ہے ورنہ میری کہانی کی یکتائی برقرار نہ رہے گی۔ محبّت اور عِشرت، فِطری اور ابدی جذبے ہیں۔ اِن میں بہت نازک فرق ہے جسے سمجھنے کے لئے کڑی دیانت داری درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکتہ چیں کسی کے بارے میں کچھ بھی بکتا ہے لیکن جب اپنی بات کرتا ہے تو اپنے عیب میں ہُنر دیکھتا ہے اور جانب داری قائم رکھتا ہے۔ اِس رُو سے سکُول کے زمانے کی ایک یاد تازہ ہو گئی ہے۔ کئی بار اُستاد، خُود سزا نہ دیتے تھے اور قصُوروار سے

کہتے تھے کہ وہ اَپنے مُنہ پر آپ تھپّڑ مار لے۔ وہ جِس طرح اپنے مُنہ پر تھپّڑ مارتا تھا اُس کی وضاحت ضروری نہیں ہے۔ آپ میں سے ہر کسی نے وہ منظر دیکھا ہوگا! ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت تجربہ بھی ہوا ہو۔ اِس کے عِلاوہ اپنی کمزوری اپنے مُنہ کی بدبُو کی طرح ہے، جو محسُوس نہیں ہوتی ہے اور اگر کبھی ہوتی ہے تو بُری نہیں لگتی ہے۔

"گیان جی! مجھے رنج سے بڑھ کر افسوس ہے کہ آپ نے بھی مجھے دُوسروں سے الگ نہیں جانا!"

نرمل نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر جذبات سے چھلک کر کہا۔ اُس کے لہجے میں تنبیہ نما شکایت تھی۔ اُس کی بے گناہی کہہ رہی تھی کہ وہ میرے دِل سے مخاطب ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے کچھ اور بھی کہا جس کی تفسیر اِس شعر میں ملتی ہے۔

تیری میری اک جندڑی
ربّ دو کلبُوت بنائے

اُس نے خُود کلامی کے سے انداز میں مجھ سے کہا، "تم میرے تصوُّر کے شہزادے ہو۔ مَیں سین پُور آئی ہی اِس لئے تھی کہ تم سے رسم وراہ پیدا کر سکوں۔ مَیں بدنام ہُوں، مَیں جانتی ہُوں۔ مَیں تمہارے گاؤں اِس لئے نہ آئی کہ تمہاری ماں مجھے پہچانتی ہے لیکن میری تمنّائے رسا تمہیں میرے پاس کھینچ لائی ہے۔ مَیں سانجھ سویرے تمہارے گاؤں کی طرف سَیر کو جاتی تھی اور 'لُوہاراں دے باغ' میں بیٹھ کر تمہاری راہ دیکھتی تھی۔ مَیں کاگوں اور ہواؤں کے ذریعے تمہیں سندیش بھیجتی تھی، سوتے وقت تُمہارا نام لے کر سوتی تھی، عین اپنے دیوتا کی طرح! مجھے تمہیں بھوگ لگانا ہے جِس کے لئے میرے پاس انمول پدارتھ ہے۔ اِس کا کوئی بدل نہیں! کیوں کہ وہ صرف کنواری کا دھن ہے"

تخیّل پر جذبات مُسلّط ہوں تو یہ سراب کی مانند ہے اور خطرناک حد تک ناقابلِ حصول اور گمراہ کُن۔

اُس کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مَیں پہلی بار عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ میرے ذاتی نفس کو باہر دھکیل کر میرے اندر بدکار گھس بیٹھا تھا جو رواداری کے معنی نہ جانتا تھا۔ اُس کی رگوں میں لہروں کی نرم روی کے برعکس طُوفان موجزن تھا جو نکاس کی راہ ڈھونڈتا تھا۔ ہم چلتے چلتے بُلوال کے قریب پہنچ گئے۔ آب جُو کے اُدھر آموں کا گھنا باغ تھا۔ نرمل کے مشورے پر مَیں نے اُدھر کا رُخ کیا اور مَیں باغ کے وسط میں جا کر رُکا۔

چیت کا رُوح پرور مہینا تھا۔ یہی وہ وقت ہے جسے بسنت رانی نے سیر و تماشا کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اُس کی آمد کی نوید پا کر درخت پُرانے لباس اُتارتے ہیں اور نئے پہنتے ہیں۔ فصلیں لہلہاتی ہُوئی گنگناتی ہیں، گویا دوشیزاؤں کے رقص و سُرود کی نقل اُتارتی ہیں۔ پھُول بھونروں کو رس دیتے ہیں اور بدلے میں اُن سے بیج لیتے ہیں۔ ہوائے بہار، جو ہر حیات لُٹاتی ہے اور پرندوں کو خوشبُوئے نفس سے سرشار بناتی ہے۔ اُن کی پرواز میں نغمے کی لے اور آواز میں مستی مے ہوتی ہے۔ اُن کی ایک سی خُوبی، اُنہیں ایک دُوسرے کے قریب لاتی ہے اور

اُن میں باہمی چاہت کی ترنگ اُبھارتی ہے۔ وہ پر پھلاتے، پر پھیلاتے، پر پھٹ پھٹاتے من موہنی حرکتیں کرتے ہیں اور ایک دُوسرے کے دِل جیتتے ہیں۔ یہ اُسی فضا کی کرامت ہے جو کوئل کو ترنّم دے کر کوّے سے جُدا کرتی ہے اور اُس کے کالے رنگ میں ایسی چمک بھرتی ہے کہ وہ سیاہ پتّوں میں چھُپی صاف دکھائی دیتی ہے حاسد کوّے، اُس کا پیچھا کرتے ہیں، اُسے ستاتے ہیں لیکن وہ دِل رُبا انداز میں چہچہاتی ہے گویا اُن کا ٹھٹھا اُڑاتی ہے۔ اُس پیارے نظارے کا حصّہ بننے کے لئے نیلا آسمان، دھرتی پر اُتر آتا ہے لیکن اپنی اِنفرادیت قائم رکھنے کے لئے اَلسی کے پھُولوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

میرے قارئین! مَیں اپنی طبیعت کی ایک انوکھی کیفیت بیان کرتا ہُوں، جس کے برتنے پر مَیں اپنی کہانی لکھنے میں کامیاب ہُوا ہُوں۔ مَیں اِس قدر نازک مزاج ہُوں کہ حسّاس لمحوں میں اپنی بیتابی کی اِنتہا کو پہنچ جاتا ہُوں۔ لمحے عیش کے ہوں یا غم کے دونوں اَپنے اَپنے طریقے سے مجھے اُکساتے ہیں اور اپنے اِضطراب میں ایسا اُودھم مچاتے ہیں کہ میرا دماغ بدنظمی کا رزم گاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ میرے اِحساسات کی حالت اُن بے کسوں کی سی ہوتی ہے جو بھگدڑ میں ڈھیے پڑے ہوں۔ اُن میں سے اکثر پِس کر نابُود ہو جاتے ہیں، جو کمالِ تقدیر سے بچ نکلتے ہیں وہ شدّتِ غم سے گُونگے رہتے ہیں۔ میرے چاہنے پر بھی وہ میرے بارے میں کُچھ نہیں بتاتے جس کے وہ چشم دِید گواہ ہوتے ہیں۔ میرا ہٹیلا پن! مَیں مطلوب حادِثے کو اُس کی خاک سے کُریدتا ہُوں، اُن ذرّوں کو اکٹھا کرتا ہُوں جو میری بے کسی کے شاہد ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں اور سچّے دوستوں کی طرح مجھ سے ہمدردی جتاتے ہیں اور اُس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس کی تفصیل مَیں بھُول چکا ہُوں۔ دِھیرے دِھیرے لیکن پُورے اِعتماد سے مَیں اُس واقعے کا مکمل حِصّہ بن جاتا ہُوں جو کبھی ہو کر بھی نہیں ہُوا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں میرے جذبات، میرے مُشاہدات میں شریک ہوتے ہیں اور صحیح اَلفاظ چُننے سے پہلے مجھے اُسی حقیقی زِندگی سے مُتعارِف کرواتے ہیں۔ اُن کے اِس رَوّیے سے میرے عیش و غم کی عُمر اُس کی اصلی عُمر سے جہاں لمبی ہُوئی ہے وہاں دِل گداز اور فکر انگیز بھی۔ اپنی بُنیادی حقیقت میں میرے حادِثے کسی معنوی خُوبی سے محرُوم تھے اور اُسی طرح میری دھڑکنوں کی کیفیت کوئی حقیقت نہ تھی۔

مَیں نرمل کو ممنوعہ پھل کی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ جس بیباکی سے گھر سے بھاگ جانے کی تجویز رکھتی تھی وہ اِنتہا کی حد تک ٹھیک لگتی تھی۔ اُس کا کردار اِس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے آگ میں سے گُزر سکتی ہے۔ اُس کی یاری توڑ نبھانے، مرنے دم تک وفاداری والی بات تھی وہ اپنے بچّوں کے بارے میں سوچتی ہُوئی اِس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اُس کے بچّے، میری طرح خوبصورت ہوں گے۔ اُس نے اپنے پہلے بچّے کا نام تک چُن رکھا تھا، نرمل گیان! جو لڑکی اور لڑکے دونوں ہی کے لئے مناسب ہے۔ وہ میرے زانُو پر سر رکھے

پینے بساتی اور میرے پاس ہو کر کئی بار دُور نکل جاتی۔

میری رگوں میں جو طرب ہوس موجزن تھی وُہ نفس کے محدُود حلقے سے نکل کر خیالوں کی بسیط فضا میں پھیل گئی تھی۔ ہر جذبے کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وُہ مرکزِ جمال سے بھٹک جائے تو اپنی بے راہ روی میں معدوم ہو جاتا ہے۔ مَیں خُود کو سمجھتے ہوئے اور اپنے مُستقبل پر نظر رکھتے ہُوئے تہیہ کر چکا تھا کہ مَیں بیاہ نہیں کروں گا۔ نرمل کی باتوں میں بیاہ کی بات (اور وُہ بھی گھر سے بھاگ کر) یوُں آتی کہ ہر بات اُسی بات سے شرُوع ہوتی اور اُسی بات پر ختم۔ مَیں اپنے جنُون میں بھی ویسا نہ سوچتا تھا۔ مَیں باتوں ہی باتوں میں اور حرکتوں ہی حرکتوں میں اُس پر واضح کرتا کہ مجھے اُس کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی اُسے، میری لیکن اُس طرح نہیں جِس طرح وُہ چاہتی ہے، جِس طرح مَیں چاہتا ہوں۔ وُہ میری بات کو خاطر میں نہ لاتی۔ جوُں ہی مَیں ممنوع حدوں سے آگے تجاوز کرتا۔ وُہ مجھے پرے دھکیل دیتی، دوستانہ ملامت بھری نظر سے دیکھتی اور دُور جا کر بیٹھ جاتی۔ ایک ایسے ہی موقع پر وُہ میرے پاس نہ آنے کی سوگند کھائے بیٹھی تھی کہ اُس پر بھونرا منڈلایا۔ اُس نے دُوپٹے کی آڑ سے خود کو بچایا اور اُسے مار بھگایا۔ آن کی آن میں بھونرے نے دوبارہ حملہ کیا اور پھر تو جیسے اُن دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اُس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بھونرا ہٹیلا تھا۔ وُہ گھبرا گئی۔ اپنے مُنہ پر دُوپٹہ تان کر اُٹھی، اُسے چکمہ دے کر بھاگی اور جھپاک سے مجُھ پر آ گری۔ اُس نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا اور وُہ ڈر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ مَیں نے سرسری ہاتھ اُٹھایا جو اُس کالے کلوٹے پر پڑا۔ وُہ ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھا۔ نرمل نے اِس سے استخارہ لیا، مجھے تحسین آفریں مسرت سے دیکھا اور اپنے ہاتھ کا بوسہ دیا۔ اُس میں سے گُلاب کی بھینی بھینی خوشبو آئی۔ کچھ دیر پہلے اُس نے کھیت کی باڑ میں سے تازہ گُلاب توڑا تھا اور توڑتے ہی مسل ڈالا تھا جیسے اُس کا کِھلنا اُسے ناگوار گزرا ہو۔ اُس نے احساسِ حمایت سے میری آنکھوں میں دیکھا اور پھر جھٹ سے مجُھ سے چپک گئی جیسے مقناطیسی کشش کی زد میں آگئی ہو۔ کچھ دیر ویسے ہی چپکی رہی اور پھر میری آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

میری ریاکاری! مَیں نے جب دیکھا کہ میری جلد بازی بے سُود ہے، مَیں نے پہل نہ کرنے کا فیصلہ کیا، اِس لئے وُہ جِس حالت میں پڑی تھی، اُسے پڑی رہنے دیا۔ کچھ دیر بعد مَیں نے محسُوس کیا کہ وُہ سُبکیاں لے رہی ہے۔ مَیں نے اُس کا چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ پلکیں گالوں تک بھیگ رہی تھیں۔ میری ہوس کاری نے ہمدردی کا رُوپ دھار لیا۔ مَیں نے اُس کی حسرت بھری آنکھوں میں تاکا جو ایک خاص انداز سے حسین تھیں۔ وُہ اُنہیں بند کرتی تو نیم چشم، پنکھڑیاں لگتیں اور پلکیں، رگ گُل۔ میرا خیال ہے کہ ایسی ہی آنکھ دیکھ کر کسی کو نرگسِ شہلا کا خیال آیا ہو گا۔

"گیان جی، یقین کیجئے! مَیں آپ سے محبّت کرتی ہُوں۔ مَیں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!"

اُس نے آہ بھر کر نظر چرائی اور اپنا چہرہ میرے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

مَیں نہایت جذباتی ہو کر جذباتی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نرمل جب سے بیاہ کا تذکرہ کر رہی تھی، میں اُس سے ڈرنے لگا تھا۔ یک جہتی کے لئے دو دلوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ورنہ کچھ کہنا سُننا نہ کہنے سُننے کے مترادف ہے۔ وہ میری طرح جذباتی تھی لیکن الگ طریقے سے اور دل پر قابو کئے ہُوئے تھی۔ مَیں کئی بار رُکتے رُکتے آگے بڑھا، اُس کے اقرار و گریز کو سمت دیا اور اُسے سپردگی پر آمادہ کیا۔ اُس کی مصالحت، آغاز میں مجبوری سی تھی جو رفتہ رفتہ پسندیدگی کی صورت اختیار کر گئی۔ مخالف جذبات کی آلکسی، خواہشِ وصل کی ہمّت بنی اور اُسے شوقِ وصل پر آمادہ کی۔ اُس وقت ہمارے اعضا اُن آشناؤں کے سے تھے جو ایک دُوسرے کی اُمنگ کا پُوری دیانت داری سے احترام کرتے ہوں۔ باہمی اعتمادِ نفس کا فسوں اُس وقت ٹوٹا جس وقت میرے اعضا، دیانت میں خیانت کے قصور وار ہونے کے نزدیک تھے۔ نرمل کا محتاط رویّہ، مجھے احساس دلا رہا تھا کہ اُس کی مجھ سے محبت شعوری ہے اور میری ہیجانی۔

مَیں جن حالات میں پل کر بڑا ہُوا تھا اُن نے مجھے ازدواج بے زار بنا دیا تھا۔ مَیں شادی کو زندگی کی خوشیوں کا مدفن سمجھتا تھا اور بچے غیر ضروری ذمّہ داری۔ جہاں تک خروجِ سیلِ نفس کا سوال ہے، مَیں مستقل عورت پالنے سے خود فریبی کو یکساں اطمینان بخش جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے قارئین مجھے بدخو اور گمراہ سمجھ کر کوئی الزام عائد کریں، مَیں بچوں کے بارے میں مزید وضاحت کرنا چاہتا ہُوں کیوں کہ مَیں بچوں کو آدمی کی اخلاقی ذمّہ داری سمجھتا ہُوں۔ زندگی ایک حادثہ ہے! مَیں پیدا نہ ہوتا تو یہ کوئی افسوسناک معاملہ نہ تھا، لیکن یہ ضرور شرمناک بات ہے کہ مَیں بچے پیدا کر کے اُن کی پرورش سلیقے سے نہ کرتا۔ مَیں اِسے فراوانیِ فطرت کہوں کہ اسرافِ فطرت! گُمانِ حمل سے یقینِ حمل تک کھربوں کھرب زندگانیاں تلف ہو جاتی ہیں۔ المیہ اُن کا ضائع ہونا نہیں، المیہ یہ ہے کہ جو پیدا ہو، اُس کا پالن پوسن ناقص طریقے سے ہو۔ جس کسی کے ساتھ ایسی ناانصافی ہُوئی ہے، اُس کا وجود اسقاطِ حمل سے بدتر ہے۔

میرا یقین صادق ہے کہ محبّت کرنا تو بڑی بات ہے، دو آدمی ایک چھت کے تلے نہیں رہ سکتے اگر وہ ہم خیال نہ ہوں۔ راوی کا بیان ہے، "جوڑیاں جگ تھوڑیاں، نرڑ بتھیرے۔ دو دلوں کا ملن شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ ایسے ہے جیسے مرکھنے بیل کے گلے سے باندھی ہُوئی اصیل گائے۔"

مَیں نے کوئی گھر ایسا نہ دیکھا تھا جہاں میاں اور بیوی میں جوتیاں نہ لڑتی ہوں۔ تایا جی فہم و فراست کی مثال تھے لیکن وہ تائی سے جیسے نباہتے تھے، وُہی نباہ سکتے تھے۔ اُن کے چلن سے مرعوب ہو کر مَیں ذہنی رشتوں کا ایسا قائل ہُوا کہ یہ تاثّر پُوری انفرادیت کے ساتھ مجھ پر ابھی تک مسلّط ہے۔

نرمل نے یہ تجویز بار بار رکھی کہ ہم ننديڑ بھاگ چلیں اور وہاں جاکر شادی کرلیں۔ میں ایسی لاابالی کی رسوائی جانتا تھا۔ میرے گاؤں کی امر کور، سرائن سنگھ کے ساتھ ادھل گئی تھی۔ کئی سال بعد اُن کی خبر ملی تھی کہ وہ ننديڑ کے گردوارے میں لنگر کے جھوٹے برتن صاف کرتے ہیں اور وہیں کھانا کھاکر جیتے ہیں۔ میں اُس کے منصوبے کو صاف لفظوں میں رد کرچکا تھا اور وہ ایسے ہی کئی اور امکان تجویز کرچکی تھی۔ جذبہ کوئی بھی ہو، اُس کی نفسیاتی خوبی دیوار میں اُگے پودے کی سرکشی سے ملتی ہے۔ اُسے توڑو، مروڑو، اکھاڑو۔۔۔۔ وہ ہر بار نئی توانائی سے سر اُٹھاتا ہے اور اپنے چھوٹے سے وجود کے برعکس نمایاں لگتا ہے۔

سورج ڈوبنے لگا۔ درختوں کے نئے پتے نرمل شیشوں سے چمکنے لگے۔ شام کی خنکی، دن کی گرمی پر اثر انداز ہونے لگی۔ ہریالی ٹھنڈی ہوکر سکڑنے لگی گویا اوس کا بوجھ اُٹھانے کے لئے خود کو تیار کرنے لگی۔ ادھ کھلی کونپلیں، شاخوں کی جانب لڑھک پڑیں جیسے سردی میں شیر خوار بچے، ماؤں سے گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ آسمان صاف تھا۔ دُور مغرب میں بادلوں کے مہین مہین ٹکڑے ہلکے ہلکے رنگوں سے چمک رہے تھے۔ اُن میں وہ بھڑک نہیں تھی جو عام طور پر اُفق کی رنگینی میں ہوتی ہے۔ بدی کے پہلے دن کا پاکھ تھا، چاند بے نور نکلا۔ تاحدِ نظر دھوئیں کا نشان نہیں تھا۔ ہم آبادی سے کافی دُور تھے۔ پرندے واپس لوٹ رہے تھے جن میں کوّں کی کی تعداد زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ اِن کے بارے میں تایا جی پیشن گوئی کرتے تھے، "ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر طرف کوّے ہی کوّے دکھائی دیں گے! وہ اپنی بات کو اِس طرح حق بجانب بتاتے تھے کہ کوّں کو نہ کوئی کھانے کے لئے پکڑتا ہے اور نہ رکھنے کے لئے۔ یہ ہر کسی کے انڈے پی جاتے ہیں لیکن اپنے انڈوں کے پاس کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے۔ اِس طرح اِن کی آبادی بے روک ٹوک بڑھ رہی ہے۔ پرندے گھونسلوں میں مطمئن ہورہے تھے اور باغ کا برہم شدہ سکوت دھیرے دھیرے اپنی اصلیت کی طرف لوٹ رہا تھا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن حسبِ معمول ڈراؤنی نہ لگتی تھیں۔ اُن میں دُور برپا ہنگامے کی سی لے تھی۔ سپت رشیوں نے دن سے آنکھ مچولی کھیلنا بند کیا اور رات کے آنگن میں ڈیرا جمالیا۔ زُہرہ کے چہرے کی لالی پھیکی پڑی، چاندنی دودھیا ہوگئی اور سایے، سیاہ۔ پتّوں کے سایوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی، میدانی چاندنی سے زیادہ سفید تھی۔ درخت پُراسرار طریقے سے آسمان کو چھونے لگے اور اُن میں چمکتے ہوئے جگنو ننھے منّے ستارے سے دکھائی دینے لگے۔ شبنم اثر برگ و بار، تبیجر نده آئینوں سے دھندلا گئے لیکن فضا کو بھینی بھینی خوشبو سے مہکا گئے۔ میرے خواب و خیال شوق و ہیجان اور رگ و ریشہ خود زادہ گرمی سے پکنے لگے، جو شدتِ آرزوئے وصل کا حاصل ہوتی ہے۔

ہم وہیں رات گزارنے کا ارادہ کرچکے تھے اور یہ فیصلہ نرمل ہی نے کیا تھا۔ وہ مجھ سے نڈر تھی

اَور بیباک بھی ۔ جہاں تک بھوک پیاس کا مسئلہ تھا ، دونوں میں سے کسی نے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جیسے رواداریِ نفس ہی جسمانی ضرورت کا مداوا ہو ۔ ہم جس کرب سے گزر رہے تھے اُس کی انتہا نشاط تھی ۔ اُس کیفیت کو پانے کے لیے نرمل میری ہی طرح بے چین تھی لیکن اپنے عہد و پیماں پر ۔ چونکہ وہ میری طرح بدچلن نہ تھی اِس لیے میرے برعکس شانت اَور مُتامّل تھی ۔ رات گہری ہوئی ، رگوں کی گرمی فضا کی برف کو روک نہ سکی اَور وہ ہڈیوں میں اُترنے لگی ۔ بھاری کپڑوں کے بغیر کھُلے میں رات کاٹنی مُشکل تھی ۔ مجھے اِس کا اندازہ تھا اَور مَیں نے اپنی ساتھن کو خبردار کیا تھا لیکن وُہ 'جو ہو سو ہو' کی ترنگ میں تھی ۔ ہم بیٹھے بیٹھے جمنے لگے اَور اُٹھ کر گھومنے لگے ۔ رات کا جادو چل نکلا تھا ۔ ہر چیز وُہی تھی لیکن رات کے اندھیرے اُجالے میں انوکھے طریقے سے دِل فریب ہو گئی تھی ۔ ہر وُجود نے اپنی کایا ہی پلٹ لی تھی ۔ آب جو میں درختوں کے سایے ایسے نظر آتے تھے جیسے سیاہ مست ، آئینہ دیکھ رہے ہوں ۔ ریتلے کنارے مرمریں راستوں سے چمک رہے تھے ۔ ہریالی ، کالے ہرے لباس میں زیادہ راحت آمیز تھی اَور خوش گوار جذبے کی طرح خوش نُما بھی ۔ دھرتی کی ممتا پُر خلوص ماں کے مماثل تھی جو بوقتِ آرام اپنے لاڈلوں کو لوری دے کر سُلاتی ہے اَور درازیِ عمر کی دُعا بھی دیتی ہے ۔ چاند ایسا مُسافر تھا جسے منزل پر پہنچنے کی جلدی نہ ہو ۔ ستارے اُن مُشتاق طالبِ علموں کی طرح تھے جو اپنے دانش ور معلّم سے رازِ آفرینش سُننے کے لیے سراپا گوش ہوں ۔

اِدھر اُدھر خرام کرتے ہُوئے ہم نے باغ کے آخر میں تُوڑی کا کُپ دیکھا ، جو لگا ہُوا تھا ۔ ہماری مسرّت بے تکلف اَور مُکمّل تھی ۔ ہم نے کُپ کے مُنہ پر سے چھاپے اُٹھائے اَور اندر گھُس گئے ۔ تُوڑی کی گرمی اَور نرمی میں پلنگ کے بستر کا آرام تھا ، اُس کے باوجود ہم نے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری ۔ مجھے نیند آتی تو نرمل مجھے کھُجلا کر جگا دیتی اَور وُہ سوتی تو مَیں ، اُسے اپنے طریقے سے ۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے مَیں نے اُس سے وعدے کیے ، محبّت کے فریب دیے لیکن اُس کے پاس محبّت کے الگ معنی تھے ۔ اُس نے اپنی محبّت کے پردے میں مجھے معصومیت سے لُبھایا ، آنسوؤں سے بہکایا ، اداؤں سے بھرمایا اَور وعدۂ فردا سے گرمایا لیکن کسی حالت میں اُس حد سے آگے نہ بڑھنے دیا ، جہاں اُس کے خالق نے خود لکیر کھینچ رکھی تھی ۔

اُس کے جذبۂ نفسانی کی نفسیات ! آدمی کی عورت میں دِل چسپی ، اُس کی پاک دامنی تک ہے ۔ آدمی ، عورت کو رنڈی بنا سکتا ہے لیکن رنڈی کو گھر میں نہیں بسا سکتا ۔ میرے جذبۂ نفسانی کی نفسیات ! مَیں کاتک کے مستائے کُتّے کی طرح تھا ۔ وُہ اپنی مستی میں ہر کُتیا کو سُونگھتا پھرتا ہے اَور جہاں داؤ لگتا ہے ، پِل پڑتا ہے ۔

سویرا ہُوا تو مَیں نے آگے ماسی کے ہاں جانے کا اِرادہ بدل دیا اَور نرمل کو کھڈیالہ کے موٹر سٹینڈ پر

پہنچا کر گھر لوٹ آیا۔

باب ۳۷

بنایا آئینہ جس نے یہ اُس کا مقصد تھا
ہُنر میں اپنے کوئی عیب ہو تو دیکھ سکے (شاطر)

جہاں تک اخلاقی قدروں کا سوال ہے، سو میں سے ننانویں کسرِ نو سو ننانویں مردِ بد کار ہیں لیکن اعتراف نہیں کرتے ہیں۔ کسر صفر صفر ایک، جو شریف ہیں، اُن کی شرافت محتاجِ تحقیق ہے۔ ہُنر ہی ایسی سچائی ہے جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ہُنر، اخلاق نہیں، صحیح عمل ہے اور ایسی تحریک ہے جس کی حرکت لازوال ہے اور وقت کی مُعاصر بھی۔

تقسیمِ وطن کے بعد پنجاب میں قحط کی سی حالت ہو گئی تھی۔ گیہوں کا بھاؤ پانچ روپے سے بڑھ کر تیس روپے فی مَن ہو گیا تھا۔ گیہوں خرید کر کھانے والے اپنے غم و غُصّے کا اِظہار یُوں کرتے تھے، "پیسے کھا کر پیٹ بھرنا، کنک کھانے سے سستا ہے۔"

گھر میں باجرے، مکئی اور بیٹرڑے کی روٹی پکتی جو لسّی اور مکھّن کے ساتھ کھانے کے باوجود گلے میں اٹکنے لگتی۔ جس دن خالص گیہوں کی روٹی پکتی، گھر میں تقریب کا سا سماں ہوتا۔ ہر کوئی اپنی بے قراری کا اِظہار کرتا، پہلی روٹی میری ہے! پھر وقت آیا کہ ماں صرف مہمانوں کے لئے گندم کی روٹی پکاتی۔ مہمانوں کو لذیذ روٹی کھاتے دیکھ کر مَیں خون کے گھونٹ پیتا اور دل ہی دل میں انھیں کوستا۔ ایک واقعہ سُنیئے جو میری کم ظرفی کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ میرے پھوپھا کشن سنگھ آئے اور ماں نے گیہوں کی روٹی کا اہتمام کیا۔ مَیں اس قدر للچایا گیا کہ روٹی کا سواد میرے مُنہ سے رال بن کر ٹپک پڑا۔ کھانا، مہمان خانے میں پروسا گیا جو رسوئی سے کچھ دُور ہے۔ مَیں وہاں گرم گرم کھانا پہنچاتا اور ہر بار ایک دو روٹیاں راستے ہی میں ہڑپ کر جاتا۔ ماں نے تقریباً ایک آدمی کے لئے آٹا گُوندھا تھا، اُس سے دُو کا پیٹ کیوں کر بھرتا؟ اُس نے جھٹ پٹ اور آٹا گُوندھا، وقفہ پاٹتے ہوئے حیرت سے کہا "گیان! تیرے پھوپھا کچھ زیادہ ہی کھانے لگے ہیں۔"

بیکاری پہلے بھی تھی لیکن اِتنی نہ تھی۔ اب ہر کوئی بیکار تھا اور تلاشِ معاش میں نکل رہا تھا۔ شیر سنگھ

کہتا تھا کہ یہ بڑھتی ہوئی آبادی کی لعنت ہے، جس گھر میں ایک تھا وہاں کم سے کم پانچ ہیں۔ جو گھر آدمیوں سے بھرے رہتے تھے وہاں قسم کھانے کے لئے آدمی نہ تھا۔ دِلّی پر پنجابیوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ جو کوئی تنگے پیروں، پھٹوں پرانوں سے دِلّی جاتا، جنٹلمین بن کر لوٹتا اور ڈینگ مارتا، دِلّی جاؤ، کماؤ دھماؤ سُست سے سُست پنجابی، چُست سے چُست چار پُوربیوں کے برابر ہے! اس زبردست کُوچ کو حکمتِ عملی سے نہ روکا جاتا تو شاید پُورا پنجاب، ہندوستان کے دُوسرے شہروں میں جا بستا۔ مَیں نے پہلی بار اُن شہروں کے نام سُنے جنھیں میں تاریخ و جغرافیہ کے وسیلے سے جانتا تھا۔ جا کر جھیور کوروکشیتر اور پانی پت جا کر آیا۔ میں نے ازرہِ تجسّس اُس سے پُوچھا، کہتے ہیں کہ وہاں کی دھرتی لہو جیسی لال ہے! تُو نے تو دیکھی ہے، کیا یہ سچ ہے؟

"بالکل لال ہے شنگرف کی طرح!" اُس نے کچھ اِس طرح کہا کہ میرا شوق بڑھا دیا۔

دھرم چند کہتے تھے کہ انگلینڈ اور امریکہ کی خوش حالی کا راز، صنعت اور زراعت ہے۔ کچھ حکومت کے ایما پر اور کچھ عوام کی کوشش سے وُہی ہونے لگا۔ کسان گاؤں میں اور ہنر ور شہروں میں اپنے کمال دکھانے لگے۔ اَن سُنی سُنائی دینے لگی اور اَن ہونی ہونے لگی، دیسی مال چاہیئے کہ ولایتی؟ کئی دُکاندار دیسی مال کی سفارش کرتے، میرے بھروسے لے جاؤ! دِساوری کے برابر نہ چلے تو بدل مُفت! ہماری دُکان پر سیلزمین آنے لگے۔ وُہ اپنے مال کے بارے میں سینہ ٹھونک کر کہتے، یہ ایکسل، یہ کیپ، یہ رم، یہ گراری، یہ فری وہیل یہ چین۔۔۔ دِساور کے مال سے بڑھیا ہے پہلے استعمال کرو، پھر مول دو!"

ہریانہ میں چُنگی کھل گئی۔ درشن سنگھ ہوشیار پُور سے سائیکلوں کے پُرزے چھُپا کر لاتا اور چُنگی بچاتا چُنگی محرّر تاک میں رہتا۔ جب چُنگی بھرنی پڑتی، درشن چُنگی کے نظم و نسق کو رد کرتے ہُوئے کہتا، "ہم جتنا محنت سے کماتے ہیں اُس سے زیادہ یہ حرامزادے بیٹھے بٹھائے لے جاتے ہیں!" اُس کے رویّے سے لگتا جیسے محرّرِ محصُول وُصول کر کے گھر لے جاتے ہوں۔ سائیکلوں کا سامان تھیلے میں چھُپایا جا سکتا تھا اس لئے درشن، چُنگی بچانے میں کامیاب ہو جاتا تھا لیکن لکڑی، گڈّے میں بھر کر آتی تھی، بھایا جی اُسے کیسے چھپاتے! وُہ چُنگی محرّر سے مل جاتے۔ وُہ ایک دو گڈّوں پر محصُول دیتے اور کئی کئی گڈّے بچا لیتے۔

کستُوری لال بجاج، درشن سنگھ کا دوست تھا۔ وُہ اکثر دکّان پر آتا اور کپڑے لتّے کی باتیں کرتا۔ اُس کی ایک ایک بات اُس تہذیب پر روشنی ڈالتی جس کے بانی ہندوستانی تاجر تھے۔ "انگریزوں کے زمانے میں تھان تہ کے سچّے ہوتے تھے بلکہ ناپ سے ایک آدھ گز زیادہ نکلتے تھے۔ آج کل کے تھان کس کر ناپنے سے بھی پُورے نہیں اُترتے، آدھا پاؤ گز کم ہی پڑتے ہیں۔ پہلے جس تھان میں کپڑا ذرا خراب ہوتا تھا، اُس پر سیکنڈ کوالیٹی لکھا ہوتا تھا، اب یہ اُصول ہی ختم ہو گیا ہے۔"

مغربی پنجاب کا زرخیز اور نہری علاقہ پاکستان کے حصّے میں پڑا تھا۔ مشرقی پنجاب میں زیادہ تر مارا زمین تھی اور کھیتی کا انحصار چرس، رہٹ اور ڈھینکلی پر تھا۔ کسانوں کے کھیت بکھرے ہوئے تھے اور ڈانڈے مینڈے جھگڑے کا جھونپڑا بنے رہتے تھے۔ سڑکوں کا نام ونشان نہ تھا۔ کسان محنتی تھا لیکن منظم نہ تھا اِس لیئے غریب تھا۔ شرنارتھیوں کو زمین الاٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اِشتمالِ اراضی شروع ہوئی اُس صورتِ حال پر کسی شاعر نے شعر موزوں کیا جو کہاوت کی طرح مشہور ہوگیا۔

سِدھی سڑک مربعیاں نوں جاندی

انّھاں ہویاں راہ پُچھداں

(کوئی لڑکا کسی لڑکی سے بات کرنے کے بہانے پوچھتا ہے کہ کھیتوں کو کون سی راہ جاتی ہے؟ لڑکی غصّے سے کہتی ہے۔ لگتا ہے تو اندھا ہے! سامنے دیکھ، کھیتوں کو سڑک جاتی ہے۔)

پنجاب میں آتم نِرواہ (خود نموئی) کی جنگ چھڑ گئی۔ محکمۂ زراعت وترقیات کی سرگرمیاں سورج کی کرنوں کی طرح پھیلیں اور کھیت کھیت محسوس ہوئیں۔ پٹیسئے اور ڈاکیے کے ساتھ گاؤں کی لغت میں زراعتیئے کا اضافہ ہوا۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے اور کسانوں کو مشورے دیتے۔ پہلے ایکھ اور جوار کی کھیتی کو کسوا (سِلائی) پڑتا تھا جس کا علاج، راکھ سمجھا جاتا تھا۔ اب زراعت کے دفتر میں شکایت کرنے سے وہاں سے زراعتیئے آتے اور سپرے پمپ سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ یا دوسری کیڑا مار دوا چھڑکا جاتے۔ مٹّی کے معاینے ہونے لگے اور کیمیائی کھاد کے نمونے بانٹے جانے لگے۔ تقاوی کے طریقے جاری ہوئے اور اُس کے ساتھ ہی اعلیٰ قسم کے بیجوں کی تقسیم اور اُن کے بیجنے کے نئے طریقے۔ لیکن دھان کے بیجنے کا طریقہ وہی رہا، جو تھا اور کہاوت کی شکل میں دُہرایا جاتا تھا۔ بیٹی اور دھان کا پودا اُسی جگہ نہیں پھلتا، اِسے اُکھاڑ کر لگایا جاتا ہے باہمی مقابلے کا رواج پڑا۔ جو کسان فی ایکڑ زیادہ اُگاتا، انعام پاتا۔ کلّر اور بنجر نو توڑ کیے جانے لگے اور کمزور زمین کو طاقت کے ٹیکے دیئے جانے لگے۔

میرے سبھی قارئین میرے اِس عجیب بیان پر حیران ہوں گے کہ کمزور زمین کو طاقت کا ٹیکا کیسے دیا جا سکتا ہے؟ کمزور خطّے کی مٹی میں زرخیز خطّے کی مٹّی مِلانا پیوند لگانا ہے۔

اِس ترقّی کا اثر براہِ راست کسان کی جیب اور اُس کی سوجھ بوجھ پر ہوا۔ رہٹوں پر انجن لگائے جانے لگے اور 'بورویل' کے چرچے ہونے لگے۔ گاؤں میں پہلا بورویل، سردن سنگھ نے لگایا جو رہٹ کی ایک بٹا دس قیمت میں لگا۔ جو کوئی بورویل کی دھار کو دیکھتا وہ بے ساختہ کہتا، "چار رہٹوں کے برابر ہے! پہلا

ٹریکٹر کیلاش مہتے نے خریدا۔ اُس کا باہنا دیکھ کر شاید ہی کوئی ہوگا جس نے یہ نہ کہا، "اِس نے جتنی دیر میں ایکڑ بھر زمین باہی ہے، ہَل اُتنی دیر میں ایک تیاڑ لگاتا ہے۔"

چھوٹی صنعتوں کا کمال! کرلوسکر کے مُقابلے میں مقامی ڈیزل اِنجن ایک تہائی پر بِکنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے کسان بڑے کسانوں کی صف میں جا کھڑے ہُوئے۔ ایک ساہی زمین دو ساہی ہوگئی اور پھر تو زمین کئی کئی فصلیں دینے لگی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ کھادیان، تِلَن، دَلَن (کھانے والی اَشیا، تیل نکالنے والی اَشیا، دَلنے والی اَشیا) کا حاصِل بڑھ گیا۔

اِس ترقّی کو سراہتے ہُوئے تایا جی کہتے، "جو کام دُعاؤں، پُوجا پاٹھوں اور دیوی دیوتاؤں سے نہ ہُوا وُہ آخر اِنسان نے کر دکھایا۔ اِمتحان، ترقّی کا گربھ استھان ہے۔" اُس پرگتی سے ڈگ ملاتے ہُوئے اُنھوں نے اپنے خیال کو یُوں سنوارا،

لکھاں چندے اگون، سُورج چڑھن ہزار
گیان جوت بِن مانسا، جیون گھور اندھیار

(اگر لاکھوں چاند اُگ آئیں اور اُسی طرح ہزاروں سُورج! وُہ سب بیکار ہیں کیوں کہ اِنسان کے جیون کا اُجالا، گیان کی روشنی سے ہے۔)

پہلے گندم بس گندم تھا، اَب گندم، ناموں خاص کر نمبروں سے مشہُور ہونے لگا۔ نئی قِسموں کی خُوبی یہ ہے کہ اِن کے خوشے پرانی قِسم سے لمبے اور تنے چھوٹے ہیں۔ ہر طرف ایک نئے انقلاب کے چرچے ہونے لگے، سبز اِنقلاب!

بھاکڑہ ڈیم مشہُور ہو رہا تھا اور ساتھ ہی یہ افواہ کہ گورنمنٹ پانی میں سے بجلی نکال لے گی اور کسان کو کھیتی کے لئے پھوکا پانی دے گی جس سے فصل کا حاصِل گھٹ جائے گا۔

اِس ترقّی کے پسِ پردہ ایک زوال بھی آیا۔ میرے پڑھنے والے کہیں گے کہ کیسا زوال؟ کیمیائی کھادوں اور نئے بیجوں سے فصلوں اور سبزیوں کے حاصِل بڑھے لیکن اُن میں سے وُہ لطیف ذائقے جاتے رہے جو گوبر اور سبز کھاد کی پیداوار تھے۔ یہ زوال ایسا نازک زوال ہے جس کے ہونے کی تصدیق صرف وُہی ذوقِ سلیم کر سکتا ہے جو وقت کی پُرانی اور نئی قدروں سے اُلجھ رہا ہے۔

باب ۳۸

زندگی کے ہزار پہلو ہیں
اور کوئی نہیں کسی سے کم (شاطر)

میری کتاب کے اگلے صفحات میری زندگی کے تاریک ترین باب ہیں۔ اِس سے پہلے کہ مَیں اُن اندھیروں کا ذکر کروں، مَیں اپنے قارئین کے ساتھ کچھ ایسے لمحے بانٹنا چاہتا ہُوں جو میری فطرت پسند طبیعت کی دریافت ہیں اِس لئے میرا انوکھا ورثہ ہیں۔

بھایا جی نے ڈھولباہے سے پرے جنگل خریدا جو کوہ شوالک کے عین دامن میں ہے۔ مَیں بچپن ہی سے پہاڑوں سے رُومانی لگاؤ رکھتا ہُوں۔ پوس ماگھ کی برفبار سردی میں، مَیں سویرے چھت پر دُھوپ سینکتا اور ہمالہ کا نظّارہ کرتا۔ برف سے لدی چوٹیاں، خُوش لباس دوشیزاؤں کی طرح پہناوے بدلتیں اور اٹھکیلیاں کرتی لگتیں۔ اُس دوران ماں کبھی چھت پر آتی، سب سے اُونچی چوٹی کی طرف اِشارہ کر کے کہتی، "وہ ہے کیلاش پربت، شوجی، پاروتی کا مسکن! گنگا میّا وہیں سے نکلتی ہے۔"

مَیں پُوری یکسوئی کے ساتھ لہراتی اور بل کھاتی گنگا میّا کے کنارے شوجی، پاروتی کو دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن دُھندلی لکیروں اور بدلتے رنگوں کے عِلاوہ کچھ نہ دیکھ سکتا۔ بڑھتی ہُوئی روشنی کی چکاچوند میں کیلاش پربت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا اور مَیں سوچتا، جو پہاڑ اِس دُوری سے اِتنے مسرّت خیز اور حسین ہیں، وہ قریب سے کِتنے دِل، آویز اور رنگین ہوں گے!

مَیں نے سراپا شوق بن کر بھایا جی سے گزارش کی کہ مَیں جنگل میں اُن کے ساتھ جانا چاہتا ہُوں۔ وہ چنگی منودشا (اچھے مُوڈ) میں تھے، جھٹ مان گئے۔ زادِ راہ کے لئے ماں نے آٹے میں پیٹھ دے کر پراٹھے بنائے اور ان کے ساتھ آم کا اچار اور پیاز لوازم کے طور پر دیئے۔ بھایا جی اشیائے ضرورت کے لئے گاؤں آتے جاتے رہتے تھے۔ اُنھیں جو کچھ لے جانا ہوتا وہ رات کو پوٹلیوں میں بھر کر بوری میں رکھ دیا جاتا۔ مَیں نے بوری سائیکل کے کیریئر پر باندھی، چار سل کی ایور ریڈی بیٹری جھولے میں رکھ کر ہینڈل سے لٹکائی، کھڑے کھڑے لسّی پی اور سائیکل اندر سے باہر نکالی۔ بھایا جی پہلے ہی پر تلا باندھے اور کرنج لٹکائے صحن میں ٹہل رہے تھے،

کے نام جو ہوں سو ہوں! اُن کی دید راحت فزا تھی۔ بھائیا جی منزل کی دھن میں اور میں حُسنِ فطرت سے حظ اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں اُداس ہُوا اور نہ ہی تھکا، کیا تضاد تھا! میں آٹا پسانے کے لئے ہریانہ جاتا، وہ دو میل لمبا راستہ بڑی مشکل سے ختم ہوتا۔ میں گاؤں کو میلوں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور میں گلِ تر کی طرح تازہ۔ جہاں کہیں انوکھا منظر نظر آتا، میں نظارہ کرنے کے لئے رُک جاتا۔ میرے اور میرے بھائیا جی کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا، جیسے میں مست بچھیرے کی طرح بھاگ کر طے کرتا اور پسینے کے لُون سے جھک کر نو بہ نو ہو جاتا۔ میرا رویہ دو پُشتہ تھا۔ میں بگولے کی طرح تیز گام اور کہیں نسیم کی طرح نرم خرام تھا۔ میں کوئی نیا منظر دریافت کرتا اور اُس کے ساتھ چپک کر رہ جاتا۔ کھجور اور برگد کے درختوں کو آپس میں لپٹے دیکھ کر مجھے زرمل کی یاد آئی۔ وہ اسی طرح کھُب کر گلے ملتی تھی۔ اُس مزیدار یاد میں ریجھ کر میں منزل ہی بھول گیا۔ بھائیا جی نے مجھے پکارا تبھی وہ جادو ٹوٹا اور میں دوڑ کر اُن کے پاس پہنچا۔ وہ مولسری کے نیچے سائیکل کھڑی کر کے آب جو میں ہاتھ منہ دھو رہے تھے

حُسنِ فطرت ہر جگہ اپنی خوبصورتی کے کمال کو پہنچتا ہے لیکن یہاں اُس کے کمال کو جمال حاصل تھا۔ خوب تر خوب کا متناقض ہے! میرے گاؤں کی آب جو یہاں کے مقابلے میں ہیچ نظر آئی۔ گھنے جنگل میں وہ کھلا فطرت کا گوشۂ نمائش تھا۔ دودھیاریت، بے داغ سفید چادر تھی۔ آب جو کے کنارے، دو تارے کے تار تھے، جن پر وہ اپنا راگ الاپتی تھی۔ ابرق کے ذرے، نگینے تھے، گھونگے، ناتراشیدہ ہیرے اور سیپ، جیڈ کی ننھی طشتریاں۔ آفتاب، مینارِ نور تھا اور درخت اُس دولت بے بہا کے بے اُجرت پہرے دار۔

میں بے قابو ہو کر پانی میں کود پڑا۔ میں یہاں غوطہ لگاتا اور وہاں اُبھرتا۔ اِدھر تیرتا اُدھر لہریں پکڑتا۔ وہ سراپا نزاکت محبوب کی طرح لچک کر آغوش سے نکل جاتیں اور ذرا دور ہوتے ہی ادائے ناز سے لُبھاتیں۔ وہ دوشیزہ کی طرح پاکیزہ تھیں اور چھوئی موئی کی طرح باحیا۔ میری نظر سُبک رو بجرے کی طرح لہروں کے زیر و بم پر تیرتی کبھی شاہدِ نظارہ بن کر دُور دراز کا احاطہ کرتی اور فطرت کی کاریگری سراہتی۔ فطرت کی بے احتیاطی بھی قابلِ داد ہے! پہاڑ اُونچے نیچے نہ ہوتے تو بدصورت لگتے۔

عملِ فطرت، عملِ انسان کے برعکس حد کثرت سے گزر کر حُسنِ فطرت بنتا ہے، اس لئے عملِ فطرت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی زیادتی میں پاکیزگی ہے۔ اِس پاکیزگی کی فضیلت! اِس کی نفسیات محو بالذات ہے۔ اِس سے رسم و راہ پیدا کرنے کے لئے حُسنِ نظر کے ساتھ افراطِ اشتیاق ضروری ہے ورنہ یہ اپنی رفاقت کی لطافت سے بے نیض رکھتی ہے اور اپنی حقیقت بانٹنے سے احتراز کرتی ہے۔ وہاں ہر منظر اِس قدر حسین اور رنگین تھا کہ اُس کے سامنے اقبال کی آرزو پھیکی لگی۔

مَیں اُس حُسنِ لامتناہی سے کلول کرتا ہُوا بھایا جی کے پاس جا کر بیٹھا۔ وُہ گھٹنے پر پیاز رکھ کر مُکّے سے توڑ رہے تھے۔ اُنہوں نے پیاز ہتھیلیوں میں دبا کر نچوڑا، بیچ میں انگوٹھا گھُسا کر پھاڑا اور میرا حِصّہ مُجھے دیا۔ ہم نے پراٹھے کھا کر آب جُو سے پانی پیا اور ذرا استانے کے لئے لیٹ گئے۔ نرم ہوا کے جھونکے، جھُولے کی طرح جھُلا گئے جیسے لوری دے کر سُلا گئے۔ جھپکی کھُلی، مَیں نے دیکھا، مُجھ پر پھُول ہی پھُول پڑے ہیں۔ پھُولوں کے ماخذ مولسری کی دریافت میرے لئے حیرت و مسرّت کی موج تھی۔ وُہ لوگ کوتاہ بین ہیں جو کہتے ہیں کہ درخت بے زبان ہیں۔ میری رُوحانی پستی میں درختوں کی قُربت، میری بالیدگی کی تحریک رہی ہے۔ مَیں نے اپنے وَجد میں محسُوس کیا کہ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے آرنیانی (جنگل کی رانی) نے مولسری کا بھیس بدل لیا ہو۔

وُہ ماحول بساطِ رنگ و نُور تھا اور فطرت کا انوکھا میوزیم اور نیرالازد۔ اپنی نگرانی اور اپنی آرائش کی ذِمّہ دار کا اُس کی اپنی بڑائی تھی۔ کوئی شے نہ بے محل لگتی تھی اور نہ ہی نظر میں کھٹکتی تھی۔ جن جھاڑیوں پر پھُول نہیں تھے اُن کی کونپلیں پھُولوں جیسی تھیں۔ حُسنِ فطرت کا جمال بے مِثال ہے۔ زوالِ حُسن بھی کمالِ حُسن ہوتا ہے۔ ہرے پتّوں میں مُرجھائے پیلے پتّے، آسابِ زینت تھے۔ مکڑی کے جالے، کتّاں کے دامن اور اُن میں پھنسی ہوئی تتلیاں، رنگ برنگے بیل بُوٹے تھے۔

آدمی کی طرح درختوں کو بھی بڑا بننے کا خبط ہے اور جو کامیاب ہوتے ہیں وُہ اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ آدمی سے زیادہ بے رُخی سے کرتے ہیں۔ بڑے درختوں کے نیچے چٹیل میدان نظر آتے ہیں۔ ایسا نظارہ اکا دُکا ہوتا ہے ورنہ شہرِ فطرت کی گہما گہمی، ہمہ بُودی کے اُصُولوں پر مبنی ہے۔ آم کے پاس سنگترہ، سنگترے کے پاس انگور، انگور کے پاس شہتُوت، شہتُوت کے پاس زرد آلُو، اِس پر طُرّہ یہ کہ ہر کوئی اپنی ذاتی خُوبی سے مالا مال اور طرزِ حیات پر نازاں۔ یہاں کے باشندوں میں مُسابقت جذبہ بدرجہ اتم ہے۔ اِن کے حیرت انگیز طور طریقے بیان کرنے کے لئے مزید مشاہدے اور الفاظ کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلیِ وطن کے جو انداز اِختیار کرتے ہیں وُہ نرالے ہیں۔ کچھ اپنے بیجوں کے ذریعہ فضا میں اُڑتے ہیں، کچھ ندیوں میں تیرتے ہیں اور کچھ پرندوں کو اپنا حامل بناتے ہیں۔ میرے گاؤں کے نخلستان میں شہتُوتوں کے چند درخت تھے، جن کے بارے میں مشہُور تھا کہ ویسے نمُونے چمن، بلوچستان میں ہوتے ہیں۔ ایک برگد کی بڑائی اور داڑھی کو دیکھ کر گمان گزرا کہ وہ اُس شہرِ تمدّن کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔ یُوکلپٹس کے درختوں کے جھُولنے سے جو سنگیت پیدا ہوتا تھا اُس کی ترنگ خُوشگوار خیال کی سی تھی۔ درختوں کی طرح پرندے بڑے اور خُوبصورت تھے۔ کوّے بہت بڑے تھے اور تیل پوتے توے سے چمکتے تھے۔ ہمہ قسم پرندوں کے جھُنڈ جُدا جُدا چُگتے تھے۔ اُن کے رکھ رکھاؤ میں پریشانی اُس خطرے کی نشانی تھی جو دُور جھاڑیوں میں یا آسمان پر منڈلاتا تھا۔ کوئی جھُنڈ اُڑتا جس کے پھڑاٹے سے اپنی ہی قسم کا نغمہ پیدا ہوتا جو فضا کو جھُولا جھُلا جاتا۔ سبزی اِس قدر کثیر اور اعلیٰ قسم کی تھی کہ مریل سا

یشو وہاں ہفتہ بھر چرلے تو موٹا تازہ ہو جائے۔

ہم منزل پر پہنچے۔ پرچھائیں، قد سے لمبی ہو رہی تھی۔ وہاں رہنے کے لئے بھایا جی نے درخت پر مچان بنائی ہوئی تھی اور زمین پر سرکی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے کیریئر سے سامان کھول کر کچھ مگری سے لٹکایا اور کچھ اولتی سے۔ سورج ڈوبا نہیں تھا لیکن درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ سرکی سے کچھ دور الاؤ کی جگہ تھی بھایا جی وہاں آگ جلانے لگے۔ آگ کے مچنے تک اندھیرا چھا گیا اور دھرتی کا دوسرا روپ ابھرنے لگا۔ چاند ستاروں میں آبادی کی سی رعنائی نہ تھی۔ جھینگروں کی آواز پُرخطر ماحول کی غماز تھی۔ پتوں کی سرسراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایکانت کا جمود توڑتے اور رات گزارنے کے لئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ تنہائی کی اداسی سے متاثر ہو کر میں گنگنانے لگا اور گنگناتے گنگناتے گانے لگا۔ میرے گیت بھایا جی کو ایک تان نہ بھاتے تھے لیکن اُس اُداس رات وہ میرے گیت سننے لگے۔ کچھ دیر ایک تنے پر بیٹھے رہے اور پھر کمر کے پیچھے ہاتھ پکڑ کر الاؤ کے گرد گھومنے لگے۔

اُن کی عادت ہے کہ وہ مخالف حالات میں ہوتے ہیں تو اپنی حفاظت کی سوچتے ہیں اور آگ جلا لیتے ہیں۔ درندوں اور بھوتوں کے ڈر سے جہاں لوگ دن کے وقت گھبراتے تھے وہاں وہ اکیلے راتیں بسر کرتے تھے۔ وہ ایسے بے لچک کردار کے آدمی تھے، جنہیں نظم و ضبط میں رکھنے کے لئے آئینِ بیاباں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نامساعد حالات میں اُن کی درندگی، درماندگی میں بدل جاتی۔ وُہی نازک لمحہ اُن کی ذہنی افزائش کی قرارداد ہوتا اور انسانی قدروں کے بارے میں ظہورِ ثانی۔ میں نے 'کانگڑی' اور 'مقام' کے جنگل میں کچھ راتیں اُن کے ساتھ گزاری تھیں اور اُن کا رویہ دردمندانہ پایا تھا۔ اپنے نازک جذبات سے رس لیتے ہوئے، وہ حسنِ ضمیر کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ اُن کے چہرے سے وہ احساس خاطر ظاہر تھا جو رفیع حالات میں شفقتِ پدری کا جلال ہوتا ہے۔

میرے تحمل اور بے تحملی کے ساتھی قارئین، سچ جانیے! وہ ویسے ہی تھے۔ اُن کی زُود پریشانی اور بد زبانی وہ فتنہ پرداز طاقت تھی، جو اُن کے دل کش نقش و نگار کو بگاڑ کر قابلِ حقارت بنا دیتی تھی۔

کیف و سرور کا سماں چھایا ہی تھا کہ بھایا جی کے دو آوارہ پالتو کتے بھونکتے ہوئے سرکی کی جانب لپکے۔ پُرلطف ماحول فساد کے شور سے گونج اُٹھا اور میں چپ ہو گیا۔ بھایا جی تیزی سے پلٹے، لاٹھی پر جھپٹے اور کتوں کے پیچھے بھاگے۔ کتے جہاں رُکے، وہاں آگے بڑھے اور زمین پیٹنے لگے۔ میں اُن کے پیچھے پہنچا اور دیکھا میرے بازو جتنا موٹا سانپ پس کھول رہا ہے۔ اُس کے سر کا بالشت بھر حصہ لال تھا اور شب کے اندھیرے میں دہکتے کوئلے کی طرح چمک رہا تھا۔ اُسے وہیں گول کر کے وہ کہنے لگے، "یہ سانپ اجگر ہے، زندہ آدمی کو ثابت نِگل جاتا ہے۔"

مَیں نے اَجگر پہلی بار دیکھا اور اُس کی غیر معمولی خُوبی پر حیران ہُوا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وُہ اَجگر، جس کا مُنہ چپّا بھر ہے، آدمی کیسے نِگل سکتا ہے! مَیں نے بھائیا جی سے پُوچھا، اُنھوں نے کہا، "اِس کا مُنہ لچکدار ہوتا ہے اور جِتنا دکھائی دیتا ہے اُس سے دَس گُنا زِیادہ بڑا ہو جاتا ہے، ربڑ کی طرح۔"

میری حیرت، اِستعجاب میں بدل گئی۔ مَیں دِل ہی دِل میں اندازہ کرنے لگا کہ وُہ اَجگر کِتنا موٹا آدمی ہڑپ کر سکتا ہوگا؟ دُرست اندازے کے لئے مَیں اپنا سینہ ناپ رہا تھا کہ بھائیا جی نے ایک اِنکشاف کیا جو روایت شکن ہے اور قُدرتی طور پر پہلے سے زِیادہ حیرت انگیز۔ "یہی سانپ ہے جِسے لوگ مَنی راج کہتے ہیں! ایسا ہی سانپ مَیں نے 'مقام' میں بھی مارا تھا۔"

"مَنی راج کے بارے میں جو کہانیاں مشہُور ہیں؟" مَیں نے پُوچھا

"سب مَن گھڑت ہیں!" اُنھوں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

مَیں نے غور کیا تھا کہ اُن کی بڑھتی ہُوئی عُمر کے ساتھ اوہام پرستی گھٹ رہی تھی۔ سانپ کو ٹوکرے سے ڈھانک کر وُہ اُس پر لکڑیاں رکھنے لگے۔ مَیں نے پُوچھا، اِسے ڈھانک کیوں رہے ہیں آپ؟ دبا کیوں نہیں دیتے؟"

"سویرے کامگاروں کو دکھائیں گے۔" اُنھوں نے آخری لکڑی رکھتے ہُوئے فخر سے کہا، ٹوکرے کے گرد چکّر لگایا، کتّوں کو دھتکارا، جو ٹوکرے کے آس پاس گھُوم رہے تھے۔ "کُتّا، سانپ کھالے تو باؤلا ہو جاتا ہے!" وُہ الاؤ کی طرف لوٹتے ہوئے بولے۔

مچان پر گھاس پھُونس کی موٹی تہ بستر کا کام دیتی تھی۔ مَیں سانپ کی موت پر غور کرتا ہُوا رنجیدہ ہو گیا۔ اپنی مُوذی خصلت کے باوُجُود، وُہ خُوبصورت چیز تھی۔ اُس کی موت دَرد بھری تھی۔ وُہ کیسے لوٹتا پوٹتا اور تڑپتا پھڑکتا مرا تھا۔ کہاوت ہے کہ آدمی کی رُوح سَر میں اور سانپ کی ہڈیوں میں ہوتی ہے۔ مَیں رُوح کے وُجُود کا قائل نہ تھا لیکن وقتی طور پر مجھے لگا کہ سانپ کی رُوح، ہڈیوں اور جوڑوں سے رینگتی ہُوئی نکلی ہے۔ رات کے جانوروں کی آوازیں بڑھتے بڑھتے بازگشت بن گئیں۔ اُلّو کی تُرر رُو، سب سے خوف پَرور تھی۔ یہ بھی کہاوت ہے کہ اُلّو اپنی آواز کی حد تک بیاباں کی آرزو کرتا ہے اور آدمی کی موت کی دُعا مانگتا ہے۔ یہ کہاوتیں بھی عجیب ہیں! میرا خیال ہے کہ ہر نفسِ مضمون پر کہاوت موجود ہے۔ مَیں افسردہ ہو گیا جیسے سانپ کی موت میری موت کی پیش رو ہو۔ مَیں ڈر کر سُکڑ گیا اور بھائیا جی کے قریب ہوتے ہُوئے بھی غیر محفُوظ محسُوس کرنے لگا۔ یکایک گیدڑوں کی پِدرم سُلطان بُود، بالکل پاس سے سُنائی دی۔ بھائیا جی نے اُدھر پہلو بدلا اور پھیپھڑے بھر کر اُنھیں ماں کی گالی دی۔ اپنی نسل کی برتری کا اِعلان اُن کی زبان پر ادھورا ہی رہ گیا جیسے اُنھوں نے گالی کا مطلب سمجھ لیا ہو اور اپنی نسل کی سچائی

پر شک ہُوا ہو۔ بھائیا جی اُٹھ کر اکڑوں بیٹھ گئے، کھنکورے مارنے لگے اور اندھیروں کو گھورنے لگے جیسے اُن میں منڈلاتے ہُوئے خطروں کو ڈراتے ہوں۔ اُن کے سایۂ عاطفت کا اثر تھا خوف بھرے ماحول میں نیند کی سرشاری صبح تک بنی رہی۔

اُس پُرلطف سحر کے نقیب، سُریلے پرندے تھے۔ وُہ جس بیتابی سے حُسنِ سحر کو خُوش آمدید کہہ رہے تھے، اُس سے لگتا تھا کہ اُنہوں نے ڈراؤنی رات سے بڑی مُشکل سے نجات پائی ہے۔ میری آنکھیں نیند کے خُمار سے بے نیاز تھیں اور میرے اعضا سُستی سے۔ یہ اثر سورج کی اُن کرنوں کا تھا جو درختوں میں سے چھنتے ہُوئے جو آر بھالے کی طرح مُجھ تک پہنچتی تھیں اور مجھے اپنے حُسن کا نظّارہ کرنے پر اُکساتی تھیں۔ مَیں بستر پر ہی تر و تازہ تھا۔ میں خُوشبوئے سحر کی لطافت میں سانس لیتا ہُوا مچان سے نیچے اُترا اور باغ سے باہر نکلا منظرِ فطرت کھلا ہُوا تھا۔ نباتات کی لہک، چھلک رہی تھی، فضا کی چہک اُچک رہی تھی اور ہوا کی مہک، لپک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہر شے سنگار کیے اپنے کسی چاہ والن کی راہ دیکھتی ہے۔ اُن سب میں سے شفق کی بے قراری دیدنی تھی جو اُس کے چہرے پر لالی بن کر دوڑتی تھی۔ پرندے چہچہاتے تھے کہ خُوش آمدید کا نغمہ الاپتے تھے! مَیں جدھر جاتا تھا سبزے پر راہ بناتا تھا۔ میرا تصوّر! مجھے لگا کہ میں جو نئی راہ پیدا کرتا ہُوں، دوسروں کے لئے باعثِ تقلید ہو گی۔ تر و تازگی میں نے کی سی خُوشگواری تھی۔ میری رگوں میں گردش نفُوط تھا جیسے کوئی بانہیں پھیلائے گلے ملا ہو۔ جھاڑیوں پر شبنم آبدار موتیوں سی چمکتی تھی۔ میری نظر سے وُہ چہرے گزر گئے جو اپنے آپ کو عرُوسِ فطرت کی طرح سجاتے تھے۔ اُس سجیلے ماحول سے مُتاثّر ہو کر مَیں نے نیم کی داتن توڑی اور اُس کے آخر میں پتّوں کی لڑی رہنے دی۔ مَیں داتن کرتا تو ہلتے ہُوئے پتّے، چنور لگتے۔ مُجھے لگا کہ مَیں نے انجانے ہی اُس فضا کی سُندرتا میں اضافہ کر دیا ہے۔ مَیں اپنے خیال پر مُسکرا دیا اور اِدھر اُدھر دوڑنے لگا جیسے بچھڑا کلیل کرتا ہے۔

قارئین! مناظر کی خُوبصورتی، دھرتی جتنی ہی پُرانی ہے لیکن لُطفِ احساس وقتی ہے۔ کتنے اہلِ دل ہیں جنہوں نے ایسی کیفیت سے حظ اُٹھایا ہے اور عارضی طور پر اپنے آپ کو اُس ناقابلِ بیان اور ناقابلِ گرفت حُسن و خُوبی کا حصّہ محسُوس کیا ہے۔ ایک مَیں ہُوں، جس نے اُن اُڑتے ہُوئے لمحات و جذبات کو اسیر کر لیا ہے۔ یہی وُہ صلاحیت ہے جو شاعر اور ادیب کو دِگیانک اور ہُنر ور سے برتر بناتی ہے۔

بھائیا جی نے جہاں سے درخت کاٹے تھے وُہ مقام، نئے لباس میں پیوند لگتے تھے۔ مَیں اُنہیں شاداب زمین کے سینے پر ویران و بریاں داغ کہوں تو زیادہ درُست ہو گا۔ وُہ پامالی دیکھ کر مُجھے بڑی کوفت ہُوئی۔

درختوں کے کاروبار نے بھائیا جی کو اُن کے بارے میں محقّق بنا دیا تھا۔ وُہ پیڑ کا پیٹا دیکھ کر قریب قریب اور تنہ دیکھ کر ٹھیک ٹھیک اُس کی عمر بتا دیتے تھے۔ وُہ کہتے تھے "تنہ، درخت کی رُوح ہے۔ کوئی جانتا

چاہے تو یہ اپنے بارے میں سب کچھ بتاتا ہے۔" اُس کی پرتیں گن کر وہ بتاتے تھے کہ اُس نے کتنی بہاریں دیکھی ہیں
اُن کے پاس اردو میں ایک کتاب تھی، جس کے ورقے بھورے پڑ گئے تھے لیکن تڑے مڑے نہ تھے۔ اُس میں
سینکڑوں ناپ کی لکڑی کے حجم درج تھے۔ وہ اُس کتاب کے ورقوں کو جس نزاکت سے اُلٹتے تھے، اُن کی سخت
مزاجی پر حجت ہے۔ اُن کی مہارت، اُن کا پیشہ تھا۔ وہ جس نیلامی میں دلچسپی رکھتے اُسے ہرگز نہ چھوڑتے۔
کوئی بیوپاری اُن کے منصوبے کو ناکام بنانا چاہتا تو اُس سے ساز باز کر لیتے۔ انہوں نے جب تک بیوپار کیا،
ہر بانہ شام چورامی سڑک کی بولی کسی اور کے نام ٹوٹنے نہ دی۔ اپنے مال کی شناخت کے لئے وہ پوروں کے دونوں
سروں پر اپنا ٹھپہ مارتے گویا اُن بے زبانوں کو زبان دیتے تاکہ بوقتِ ضرورت بتا سکیں کہ وہ کون ہیں اور کس کا دھن
ہیں۔ اُن کے ٹھپے کا تھیوا کانسے کے برعکس اسپات کا بنا ہوا تھا۔ ٹھپے کو عمل میں لا کر وہ اُسے صاف کرتے،
تیل لگاتے جیسے بندوقچی بندوق چلا کر اُس کی نالی کو۔

کامگار مُردہ سانپ دیکھ کر بھی خوف کھانے لگے اور پھر سانپوں کے بارے میں اپنے علم کا مظاہرہ کرنے
لگے جیسے اُس موضوع میں ماہر ہوں۔

"یہ سلیڑا (لوہا) ہے۔" ایک نے کہا۔

"نہیں، یہ ناگ منی ہے۔" دوسرے نے پہلے کی بات کاٹی۔

"یہ اجگر ہے۔" تیسرے نے بھائیا جی کی بات کی تائید کی۔

سانپ کے مُردے کو چیونٹیاں لگ رہی تھیں۔ کامگاروں نے سطحی سا گڑھا کھودا اور اُسے گاڑنے
لگے۔ بھائیا جی نے دیکھا تو تنبیہ کرتے ہوئے کہا، "گہرا گڑھا کھود کر گاڑو۔ ورنہ کتّے کھود کر کھا لیں گے اور باؤلے
ہو کر لوگوں کو کاٹتے پھریں گے۔"

انہوں نے کھودے ہوئے گڑھے کو اور گہرا کیا، سانپ کو گھسیٹ کر اندر ڈالا اور بھائیا جی کے کہنے
کے مطابق اُسے پتھروں کے نیچے داب کر مٹی سے پاٹا۔ اُس کام سے فارغ ہو کر کامگاروں نے ہتھیار اُٹھائے، درختوں
کی طرف ایسے بڑھے جیسے وحشی لوگ، امن پسند شہریوں پر ہلّہ بول دیں۔

باغوں کے درمیان کھلے میں تالاب تھا۔ اُسے دیکھ کر گمان گزرا کہ کربِ تخلیق کی تاب نہ لا کر خلاقِ
فطرت نے سمندر رویا اور پھر سکون پایا لیکن اُس کی چشمِ گریہ میں ایک آنسو بچ رہا جو کمالِ واقعہ سے وہاں گرا۔
بھائیا جی اُس پانی کو اُبال کر پیتے اور نہانے دھونے کے لئے ویسے ہی برتتے۔ وہ پانی مجھے بدمزہ لگا۔ میری
شکایت پر انہوں نے سُجھاؤ دیا۔ "یہاں سے کچھ دور جھرنا ہے۔ جاؤ، وہاں سے پانی بھر لاؤ۔"

اُبلے ہوئے پانی کی بے سوادی نے جھرنے کی بات کو اور شیریں بنا دیا۔ میں نے بالٹی اُٹھائی اور

جھرنے کی راہ لی۔ باغ کے پاس سے گڈّے لیک سیدھی وہیں جاتی تھی۔ مَیں جھرنے سے کچھ دُوری پر تھا کہ مَیں نے پانی گرنے کا شور سُنا جو میری گرمیِ رفتار ثابت ہُوا۔ باقی سارا راستہ مَیں نے بھاگتے ہُوئے طے کیا۔ ایک گھاٹی کے اُوپر سے پانی کی دھار گرتی تھی جو نیچے آکر چاندی کی چادر سی پھیل جاتی تھی۔ دُور دُور تک پھُوئیاں پھُوئیاں مینہ برستا تھا۔ گھاٹی کے پیروں میں دُودھ سا بہتا تھا جو ایک خاص مقام پر پہنچ کر پانی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اُس بہاؤ میں ایک لکیر دکھائی دیتی تھی جو دُودھ کو پانی سے جُدا کرتی تھی۔ مَیں جاکر وہیں بیٹھا اور اُس منظر دَر منظر دَر منظر . . . کا حصّہ بن گیا۔ مَیں پانی سے کھیلنے لگا۔ پھُوئیوں میں بھیگنے لگا اور اپنا مُستقبل سنوارنے لگا۔ آپ قارئین حیران ہوں گے کہ وُہ کیسے! مَیں نیّت باندھتا کہ مَیں فلاں پتّھر کو نشانہ بناؤں گا۔ نشانہ ٹھیک لگا تو مَیں کلاس میں اوّل آوں گا ورنہ، ورنہ! نشانہ ٹھیک لگنے کی صُورت میں میری خُوشی بے اختیار ہوتی اور بے مثال بھی۔

آپ میں سے کِتنے ایسے تجربے میں سے گُزرے ہُوں گے اور مسرُور ہُوئے ہوں گے۔ کِتنے اور ایسے واقعے ہیں جو مَیں نے لکھ لکھ کر مٹائے ہیں۔ آپ اپنی زِندگی پر نظر دوڑائیں اور اُن لمحوں کو یاد کریں جن کی اِس وقت کوئی اَہمیت نہیں ہے۔ آپ کی بازگردی میں، مَیں آپ کے ساتھ شریک ہُوں۔

مَیں پانی لے کر واپس جا رہا تھا کہ، ایک خیال آفریں نظّارہ دیکھا جو قبل ازیں جھرنے کی شوکت نہ تھا۔ اُس پر قوسِ قزح دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی حسینہ کے گلے میں ست لڑا، ست رنگا ہار۔ مَیں روز پانی لینے جاتا اور کوئی نہ کوئی نیا منظر دریافت کرتا۔ درختوں پر سبزے کی بھرمار تھی جس میں سے طرح طرح کے پودے اُگ رہے تھے۔ وُہ پودے زمین پروردہ پودوں سے زیادہ سیاہ مست تھے۔ کچھ ایسا ہی منظر مَیں نے اپنے گاؤں میں الگ طریقے سے دیکھا تھا۔ چھجّروں پر لگی چھچڑیاں دُوسری چھچڑیوں سے زیادہ صحت مند ہوتی تھیں۔

گھاٹی سے نیچے اِدھر ایک بھاری پتّھر تھا۔ اُسے بے سِلسِلہ دیکھ کر مَیں سوچتا، یہ یہاں کیوں کر آیا؟ مَیں کوئی فیصلہ نہ کر پاتا۔ ایک رات اپنی بے خیالی کے عالم میں مجھے خیال آیا کہ خالقِ کُل کسی متصوّر غایت کے تحت اُسے وہاں لایا لیکن اپنی خود دائم مصرُوفیّت میں اُس کی تشکیل کرنا بھُول گیا۔ دُوسرے دِن مَیں اُس پتّھر کے اُوپر چڑھ گیا تاکہ اُسے نزدیک سے غور سے دیکھ سکوں۔ اُوپر کی سطح کا خاکستری رنگ تلے کے مُقابلے میں بھُورا خاکستری تھا۔ اُس میں خُوبی یہ تھی کہ وُہ اُوپر سے نیچے کی طرف یکساں روی سے گہرا ہوتا گیا تھا۔ اُس ٹھنڈے رنگ کے اُوپر بھڑکیلا قرمزی، نارنجی، بسنتی، آسمانی، دھانی ایک دُوسرے کے تقابُل میں خُوش نُما بھی تھا اور خُوش گوار بھی۔ وُہ کینوا اِس کسی اِنسان فنکار کے بس کی بات نہ تھی۔ صرف فنکارِ فِطرت ہی کا کرشمہ تھا۔ ہر نقش اِس قدر نازُک تھا کہ اُسے دیکھ کر محسُوس کرنا پڑتا تھا۔ مَیں وہاں سے گزرتا، اُس پتّھر کو دیکھتا اور خُوش ہوتا۔ دیکھنے میں وُہ کس قدر بھُونڈا اور

ہیبت ناک تھا لیکن میرے احساسِ جمال نے اُسے حسین اور لطیف بنا دیا۔ راستے میں کوئی تنکا یا پتا میری نظر کو بھاتا، میں اُسے اُٹھا لیتا، صاف کرتا اور ایسے دیکھتا جیسے وہ میرے کسی ناقابلِ بیان جذبے کا مُفسِّر ہو۔ میں یوں ہی کوئی دُھن گنگنانے لگتا اور محسوس کرتا کہ میں اُس کے گونگے حُسن کو زبان دے رہا ہوں۔ جھرنے سے کچھ دُور گھاٹی کے وسط میں سے پانی کی اِنچ بھر موٹی دھار گرتی تھی۔ میں نے اُس کے نیچے نہانا چاہا لیکن پانی کی چوٹ اِتنی شدید تھی کہ میں اُسے جھیل نہ سکا۔ میں کھڈ کے اُوپر نیچے گھومتا اور خُوبصورت بٹیاں اِکٹھی کرتا۔ میں نے ایک بیضہ نُما لال پتھر دیکھا جو تین اُنگل چوڑا اور بالشت بھر لمبا تھا۔ وہ ماں کے کام کی چیز تھی۔ اُسے تھوڑا سا مسالا گُوٹنا ہوتا تو وہ شکایت کرتی کہ اِتنے مسالے کی آدھی مقدار پتھروٹی کی تہ میں رہ جاتی ہے۔ اِس کے لئے بٹا ہو تو کتنا اچھا ہو! تایا جی نے ماں کو نیم کا گھوٹنا خراد کر دیا تھا لیکن وہ اُس سے خُوش نہ تھی۔ وہ بٹا، پتھروٹی کے عین ماپ کا تھا۔ میں نے جتنی بٹیاں اور بٹے جمع کئے تھے، اُن میں سے وہ میری اِنعامی تلاش تھی۔

ایک تو میری پڑھائی میں ہرج ہو رہا تھا اور دُوسرے میرا وہاں رہنا غیر ضرُوری تھا۔ اُسی ہفتے لکڑی کے گڈے، ہریانہ کے لئے لادے گئے اور میں بچن سنگھ کے گڈے پر بیٹھ کر گاؤں لوٹ آیا۔

باب ۳۹

جس نے لڑ لڑ کے اندھیرے سے اُجالا چھینا
اُس پہ یہ راز کھُلا کون خُدا ہوتا ہے؟

میں اپنی فطرت کا صحیح تجزیہ کرتا ہُوں اور اِس نتیجے پر پہُنچتا ہُوں کہ میں بُزدِل سے زیادہ نازک خیال ہُوں۔ میرے جذبات مجرُوح ہو جائیں تو میں اپنے آپ سے اُلجھ جاتا ہُوں، مطلُوب سمت کھو بیٹھتا ہُوں اور میرے حریف اُس صُورتِ حال سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

میں میٹرک کا اِمتحان دے چُکا تھا اور نتیجے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ میں ٹال پر رہتا، دُکان پر کام کرتا اور فالتو وقت میں بلوندر کو ٹیوشن پڑھاتا۔ میرے نہ چاہنے کے باوجُود وہ میری مُنہ بولی بہن بن گئی اور مجھے بھائی صاحب کہہ کر بُلانے لگی۔ میں اُس کے اندازِ گفتگو کو پسند نہ کرتا اور اُس کی موجُودگی میں بے چین سا رہتا۔ میں اِرادہ کر ہی رہا تھا کہ وقت کی کمی کا بہانہ کر کے ٹیوشن ترک کر دُوں لیکن بلوندر نے اِس کا موقع نہ دیا۔ اُس نے اداؤں اداؤں اور باتوں باتوں میں واضح کر دیا کہ وہ علم الکتاب کے ساتھ ساتھ علم الانسان سیکھنے کی بھی خواہش مند ہے۔ اِس سے پہلے کہ میں اپنی اور اُس کی خواہش کا اِحترام کرتا، میرے ضمیر نے مجھے روکا۔ اُوپرے دِل

ہی سے سہی، میں اُس رشتے کا لحاظ کرنے پر آمادہ ہوگیا جو بلوندر نے مجھ پر لاشعوری طور پر لادا تھا۔ مجھے راہ پر لانے کے لئے اُس نے بے جھجک کہا، "یہ رشتہ میں نے اِس لئے گانٹھا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ کہنے سے کوئی بھائی تھوڑا ہی ہو جاتا ہے!"

کسی کی اصل دیکھنی ہو تو اُسے کھلی چھٹی دے دو اور پھر اُس کا رنگ ڈھنگ دیکھو! ہم کہاں کہاں ملتے! کیسے کیسے پلٹتے! اپنی آگ ٹھنڈی کرتے لیکن ہر بار محسوس کرتے کہ وہ جو ٹھنڈی ہوئی ہے، آگ نہیں، اُس کی لپٹ ہے۔

میں کلاس میں فسٹ نہ آیا، ہاں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ جس دن میرا نتیجہ نکلا اُسی رات میرے مستقبل کی بات چلی اور بھائیا جی نے کھری کھری سُنائی، "درشن سنگھ نے آگے پڑھ کر کیا اُکھاڑا ہے جو تو اُکھاڑنا چاہتا ہے؟ دکان پر جایا کر اور کام کیا کر!"

ہریانہ کے دونوں سکولوں میں سے جتنے شیڈول کاسٹ پاس ہوئے تھے، وہ سب ہریانہ کے کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں سے کتنے کالج کو 'کل جگ' بولتے تھے لیکن اِس میں کیا قباحت تھی، وہ سب 'کالجی ایٹ' تھے اور وظیفے پاتے تھے۔ اُن میں سے کئی نئی سائیکلوں پر شان بگھارتے اور دن میں ایک آدھ بار دکان کا چکر ضرور لگاتے اور کسی نہ کسی طرح موقعہ نکال کر یہ شعر سُناتے،

عیش کر لو دوستو کالج کی دیواروں میں
کل سے لکھے جاؤ گے سب بیکاروں میں

انہیں اونچے مقام پر دیکھ کر میں بظاہر خوشی کا اظہار کرتا لیکن اندر ہی اندر ایرکھا کی آگ سے جلتا۔

میری فسٹ ڈویژن میری رُسوائی کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیسے؟ ہمارے گاؤں اور کوٹلہ نوندسنگھ کے درمیان کبڈی کا میچ ہو رہا تھا جہاں میں بھی تماشائی تھا۔ ملکیت سنگھ ہر دم میں نمبر لا رہا تھا اور داد پا رہا تھا۔ وہ حریف کے میدان میں ہوتا، وہاں کے کھلاڑی ایسے بھاگتے پھرتے جیسے بکریوں کے باڑے میں شیر گھس پڑے۔ وہ اپنے میدان میں لوٹتا ہوا، پالوں کے پاس سے ناچتا ہوا پچھاڑی چلتا اور اگر حریف کھلاڑی اُسے مارنے کی کوشش کرتا وہ اُس پر جھپٹتا اور اُسے وہیں داب لیتا۔ ہمارے گاؤں کی ٹیم جیت گئی اور اُسی کے بل بوتے پر جیتی۔ میں نگینہ سنگھ کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "دیکھا میرے ملکیت کو! تو بھی کھیلا کر۔"

شیر سنگھ وہیں کھڑا تھا، وہ میری طرفداری میں بولا، "نگینہ سیاں! کبڈی نہیں کھیلتا تو کیا ہوا؟ میٹرک میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوا ہے۔"

"فسٹ ڈویژن! گانڈ میں لے لے فسٹ ڈویژن!! میرے بیٹے کے ایک تھپیڑ کی مار ہے۔"
اُس نے میرا منہ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں خاموش کھڑا رہا اور حیراں حیراں دیکھتا رہا۔ وہ حدِ سماعت سے دُور نہ گیا تھا کہ شیر سنگھ، اُن سے مخاطب ہو کر بولا، "نگینہ سیاں! لگتا ہے، اِس کی فسٹ ڈویژن تیری گانڈ میں گھسی ہوئی ہے، جبھی تو درد سے بلبلا رہا ہے۔"
اِسی سے مِلتا جُلتا ایک اور واقعہ یاد آیا ہے۔ ہندو مُسلم ہائی سکول ہریانہ اور خالصہ ہائی سکول بجواڑہ میں فٹ بال کا مُقابلہ تھا۔ ہریانہ کی ٹیم کا مینیجر راول سنگھ تھا۔ جب ٹیم میدان میں اُترنے کے لئے تیار ہُوئی راول نے اپنی ٹیم کو جیسی ہدایت دی وہ سپورٹس مین شِپ کی نرالی مثال ہے۔ ایک گول کیسے بھی کر لینا! پھر فٹ بال باہر پھینکتے جانا۔
کھلاڑی اپنی ٹیم کا کلر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ جوں ہی بُوٹ پہن کر میدان میں اُترے، پھدکنے اور بھاگنے لگے جیسے اُن کی ساری شرارت اور طاقت بُوٹوں میں ہو۔ ہریانہ کی ٹیم کا گول کیپر بلدیو سنگھ تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ گول میں دیوار ہے۔ میچ شروع ہوتے ہی کھلاڑی اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ہاف ٹائم تک دونوں پاسے برابر رہے۔ دُوسرے ہاف میں میرے دوست شنگارا سنگھ نے میدان کے اپنے حصّے میں سے فٹ بال چھُوا کے پیروں سے چپکا لیا۔ اُس کی حرکت کا اثر سارے کھلاڑیوں پر پڑا اور لگا کہ وہ بھاگتے ہُوئے کسی خیالی فٹ بال کا تعاقب کر رہے ہیں۔ مہارت اور طاقت، مستعدی اور ہوشیاری کا وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ کسی کو فریب دیتا، کسی کو پچھاڑتا، کسی کو للکارتا، کسی سے اُلجھتا آگے بڑھا، ایک ناقابلِ تسخیر رَو کی طرح۔ اُس کی چپ و راست کی نقل و حرکت میں آفاقی تال میل تھا۔ اُس کے فاتحانہ انداز سے مجھے پھریری آئی اور میں نے محسُوس کیا کہ اُس کی جگہ میں میدان میں ہُوں۔ میں فٹ بال نشانے پر لایا لیکن گول کیپر کو گول کے درمیان چوکس پایا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا جھکاؤ داہنے ہے۔ میں نے دُوسری طرف نشانہ لگایا۔ وہ پھرتی سے اُدھر لپٹا اور فٹ بال پر جھپٹا مگر فٹ بال، اُس کے اور گول پول کے بیچ میں سے سرکر کر نکل گیا جیسے اُسے میری عظمت کی حرمت منظور تھی۔ لیکن حریف بھیڑ اِسے برداشت نہ کر سکی اور بیک زبان چِلّائی، "کون ہے یہ حرامی؟ اِس کی ٹانگ توڑ دو!"
دُنیا ایک رن بھُومی ہے جہاں ہر کوئی جیتنا چاہتا ہے۔ کون ہے جسے ہار پسند ہے؟ یہ جبلت بچے سے لے کر بُوڑھے تک میں پُوری تندی سے موجُود ہے۔ میں نے اِس جبلت کے اتنے رنگ دیکھے ہیں، جنھیں میں الگ الگ بیان کروں تو کئی کتابوں کا مواد ہے۔ چُوں کہ یہ میری کہانی ہے، میں اپنی بات کرتا ہُوں۔ میرے بھایا جی اپنے رویے پر فخر کرتے ہیں، "میں نے تجھے گھر سے نکالا، تبھی تو ڈبلیو۔ ایچ۔ او۔ میں انجنیئر کے

مرتبے تک پہنچا، ورنہ گاؤں میں دو ٹکے کا مزدور ہوتا۔"

کالج سے نا اُمید ہو کر مَیں گھر کے کاموں میں اُوبی اُوبی دلچسپی لیتا تھا۔ درشن سنگھ مجھے رائے دیتا کہ مَیں فالتو وقت میں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھ لوں لیکن میرے پاس فالتو وقت تھا کہاں؟ گھریلو جھگڑے بڑھنے لگے اور اُن کے ساتھ میری بدتمیزی اور زبان درازی۔ تایا جی سمجھاتے، "بیٹا، کوئی ہُنر سیکھ لے، ہُنر میں ترقی ہے!" ہُنر سیکھنے کے لئے تین چار سال کی شاگردی درکار تھی اور بھائیا جی اُمید کرتے تھے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی دوڑنے لگے بلکہ کما کر لانے لگے۔ زندگی روز افزوں اجیرن ہو رہی تھی۔ کوئی خوشی تھی تو وہ بلوندر سے مِلن کی تھی۔

قارئین! ویسے زندگی ہے کیا؟ بے انتہا جذبوں کا ایک مجموعہ ہے اِس لئے اِس کی سفاکی متواتر ہے۔ جذبہ نفس کے سوائے ہر جذبے کا کمال انتہائی کوشش سے بھی نہیں ملتا، اِس لئے یہ جذبہ آدمی کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ طاقت اِس لئے کہ اِس کا کمال، مکمل اور یقینی ہے، کمزوری اِس لئے کہ اِس کی تکمیل میں تسکینِ عناصر آسانی سے ہو جاتی ہے۔ کسی اور جذبے کا انجام کسی دوسرے جذبے کا آغاز ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس کا انجام اِسی کا آغاز ہے۔ یہ ایسی حیاتیاتی و نفسیاتی حقیقت ہے جو جسمانی و نفسانی خوبیوں کی سخاوت ہے۔ اِس کی سرپرستی میں آدمی کی حِسِ لطیف، حُسنِ بصیرت سے تعبیر ہوتی ہے۔ مَیں اِس کے اِس مخصوص وصف سے کئی بار فیضیاب ہوا ہوں، خاص طور پر تب، جب الجبرا کے مشکل سوال حل نہ ہوتے تھے۔

مَیں درشن سنگھ کی روٹی ٹال پر پہنچا کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اُجالا جھٹپٹی اندھیرے میں بدل رہا تھا۔ اپریل کی گرمی دوہرا اثر رکھتی ہے۔ دِن کو گرم پانی کی طرح زمین میں جذب ہوتی ہے اور رات کو بھاپ کی طرح اُٹھتی ہے۔ گرد آلود ہوا عطسہ آور ہوتی ہے اور ریگ مال کا کام کرتی ہے۔ ماس، ہڈیوں سے اُکھڑتا جان پڑتا ہے۔ نہ تن پر کپڑا برداشت ہوتا ہے اور نہ مَن میں تلملاہٹ۔ اُمس سے مساموں میں سے موبل آئیل نکلتا ہے، جہاں ہاتھ لگاؤ چپک ہی جاتا ہے اور کھینچ کر جُدا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں جی چاہتا ہے کہ کام کاج کو بھاڑ میں جھونکو اور پانی میں ڈبکیاں لگاؤ۔ گاؤں کی آبجُو میں پہنچ کر مَیں نے جودھال دی اُمبی' کا رُخ کیا۔ مسلمانوں کے ترکِ وطن کرنے سے مقاموں کے نام بھی بدل گئے تھے، پہلے یہی جگہ 'بھاگ دی اُمبی' کہلاتی تھی۔ اُس کا سیدھا راستہ آبجُو میں سے تھا، مَیں نے وُہی اپنایا۔ پانی سے اُلجھ کر چلنے میں مجھے وُہ لُطف آ رہا تھا جو کسی سرکش کو بار بار زیر کرنے میں آتا ہے۔ ڈھم کی سطح پر دھول جمی ہوئی تھی گویا آلودگی سے بچنے کے لئے اُس نے نقاب اوڑھ رکھی ہو۔ مَیں نے ایک بڑا ڈھیلا اُٹھایا، ڈھم کے وسط میں پھینکا اور اُس کے مطلوب ردِعمل پر خوش ہوا۔ میرے کپڑے اُتارنے اور پانی میں اُترنے تک پوری دھول کناروں پر جمع ہو چکی تھی۔ مَیں دیر تک نہاتا رہا اور نا خوشگوار ماحول کو خوشگوار بناتا رہا۔ نہاتے ہوئے میرے دِل میں ایک مُبہم سی

تمنا ہوئی، کیا خوب ہو اگر دُھم کے کنارے میرا گھر ہو۔ چاند کا زرد چہرہ نکھرنے لگا تھا۔ اُفق پر پھیلے ہُوئے سُرمئی بادل پہاڑوں کا سلسلہ لگتے تھے۔ ٹھور ٹھکانوں کو لوٹتے ہُوئے کسان، مویشی، پرندے اُس نظارے کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے۔ کسی چرواہے کے نغمے کی سحر طرازی نے اُس خواب پرور وادی کو نغمۂ بیدار میں بدل دیا تھا۔ میری ترنگ دوہری تھی اور یہ کیفیت پہلی بار میری ہم نوا ہوئی تھی۔

جیسے شہر کی شوکت اُس کی بڑی جسامت اور ترقی میں ہے، گاؤں کی بڑائی اِس کی سادگی اور بے تکلّفی میں ہے۔ میرے حواس پر گاؤں کا سایہ نہ ہوتا تو میرا وُجود اُس صحرا کی طرح ہوتا جس پر آفتاب غروب نہ ہوتا ہو۔

اندھیرے بڑھنے لگے۔ اپنے گلّوں اور جھنڈوں سے بچھڑے ہُوئے چرندے اور پرندے دکھائی دینے لگے۔ وہ اپنی ڈکراہٹ اور آواز سے گھبرائے ہُوئے لگتے۔ وہ کسی گلّے اور جھنڈ کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھتے، کچھ دُور تک ساتھ چلتے، اپنی غلطی محسُوس کرتے اور اپنے صحیح مقام کی تلاش جاری رکھنے کے لئے اکیلے پڑ جاتے۔

جب مَیں گھر پہنچا، مجھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ بھائیا جی کسی بات پر بھڑکے ہُوئے میری ماں کو گالیاں دے رہے تھے۔ میری نانی آئی ہُوئی تھی۔ وہ بے چاری گوشہ کے اپنی آغوش میں سر چھپائے رو رہی تھی۔ مجھے یُوں لگا جیسے کوئی قطعی امر پیش آنے والا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مَیں نے پھاوڑا اُٹھایا اور بھائیا جی کو للکارا "تُو چُپ نہ ہُوا تو تیرا سر پھاڑ دوں گا! تجھے گھر آئے مہمان کی بھی شرم نہیں ہے۔"

"تُو گھر سے نکل جا! ابھی، اِسی وقت!" وہ گالی دے کر بولے اور مجھ پر لپکے۔ مجھے خوشگوار حیرت ہُوئی کہ وہ آگے بڑھ کر پیچھے مڑ گئے۔ اُنھوں نے پھر گالی دی۔ اُن کا دبا دبا لہجہ ایسا تھا جیسے گلے میں پھانس پڑ گئی ہو۔

"جب چاہُوں گا۔ چلا جاؤں گا۔ تُو کون ہوتا ہے مجھے گھر سے نکالنے والا؟" مَیں نے چلّا کر چھاتی بجا کر کہا۔

اُس گھر میں پہلی بار ایک دُوسری آواز بلند ہُوئی تھی۔ وہاں کی ریت تھی کہ کوئی دُوسری آواز پیدا ہوتے ہی دبا دی جاتی تھی۔ اُس گھر کے مالک کا نظریہ تھا کہ اُس کی موجُودگی میں نہ کوئی راست سوچ سکتا ہے اور نہ کسی کو سوچنے کا حق پہنچتا ہے۔ کاش وہ جانتا کہ وہاں کے مکین سوچتے تھے! سمجھتے تھے! گھُٹی گھُٹی ہی سہی، اپنی دُنیا الگ، اپنے ڈھنگ سے بسانا چاہتے تھے، جہاں اُس کی طرح وہ بھی من مانی کر سکتے۔ یُوں نہ ہوتا تو بیٹا باپ سے اور بھائی، بھائی سے جُدا نہ ہوتا۔ آدمی کی خُود پسندی کا بانکپن! یہ اپنے بنائے ہُوئے دوزخ کو دُوسرے کے دیئے ہُوئے بہشت سے بہتر جانتا ہے۔ مَیں سمجھنے سے قاصر ہُوں کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو آدمی سے خُدا کی ارضِ موعُودہ کے لئے سجدے کرواتا ہے اور خُود کو حقیر ماننے پر مجبُور کرتا ہے۔

وہ ناموس را ؤلا سُن کر پڑوسی حیران تھے اور تماشا دیکھنے کے لئے اپنی اپنی چھت پر چڑھ گئے تھے۔

ایسے ہتک آمیز حالات میں ہمارے گھر کے درودیوار میں رخنے ابھر آتے تھے۔ تایا جی نے دروازے کے اندر جھانکا، رُکے اور پھر آگے بڑھ گئے، اُنہیں دیکھ کر میرا غصّہ تھوڑا ٹھنڈا ہُوا اور مجھے لگا کہ مَیں نے گھر کی عزّت خاک میں ملادی ہے۔ لیکن بھائیا جی کو دیکھ کر میرا تنفّر اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور مَیں نے خود گوئی کے سے انداز میں کہا، "اِس گھر کی عزّت تھی ہی کہاں؟" اِتنے میں بھائیا جی پچھلے دروازے کی جانب بڑھے جو باہر کھلتا تھا۔ اُس کی کُنڈی کھول کر اُنہوں نے اُسے زور سے لات ماری، پٹ کھلے، چوکھٹ سے ٹکرا کر پلٹے، بند ہوئے اور پھر آدھے کھُل کر رہ گئے۔ وُہ باہر نکلے، مُڑ کر اندر دیکھا اور چلّائے، "دیکھ لوں گا تجھے! دیکھ لوں گا!"

مَیں پھاوڑا پھینک کر نانی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اُسے باہوں میں بھر کر پیار کیا۔ اُس نے مجھے آغوش میں لیا، میرا مُنہ چوما گویا میرے کیے کو سراہا۔ میری ماں حیران و پریشان چوکے میں کھڑی تھی اور ناخوش لگتی تھی۔ اِس پر دھیان نہ دیتے ہوئے، مَیں اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا، سربلند اور طاقتور۔ اُس نے مجھ سے مُنہ پھیر لیا اور سرزنش کرنے کے لہجے میں کہا، "جا کر دیکھ! تیرے بھائیا جی کہاں گئے ہیں؟ اور ان سے مُعافی مانگ!"

مجھ پر بھائیا جی کے ظُلم وستم کے وقت اُس کی آنکھوں میں جو نرم و نازک جذبہ ہوتا تھا وُہ غائب تھا۔ وہاں ایک سنگینی تھی۔ یہ متضاد صُورتِ حال مجھ پر پہلی بار ظاہر ہُوئی تھی۔ اپنے جذبے کے نشّے میں مجھے ماں کا جوابی عمل بُرا لگا اور مَیں نے غُصّے سے کہا، "نہیں، ہرگز نہیں!"

"وُہ تیرے باپ ہیں!" وُہ دانت پیس کر بولی۔

"ہونے دو!" مَیں نے تیزی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ مَیں چھت پر چڑھ گیا، اور ایک کونے میں پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ مَیں ہرچند خوش تھا لیکن ماں کے برتاؤ نے مجھے افسردہ بنا دیا۔ مَیں سوچا کرتا تھا کہ مَیں بڑا ہوں گا اور ماں کی حمایت کروں گا اور اُس سے جزا پاؤں گا۔ لیکن جب وُہ وقت آیا، اُس نے مجھے ہی قصُوروار ٹھہرایا۔ مجھے اُس سے جو ہمدردی تھی، جاتی رہی۔ مَیں نے محسُوس کیا کہ وُہ اُس ہدایت پر پُوری سنجیدگی سے چل رہی ہے جو بیاہ کے وقت ہر سُہاگن کو دی جاتی ہے۔ تیرا پتی، تیرا پرمیشور ہے! وُہ، تجھے جیسے رکھے گا، تُو رہے گی، فریاد نہ کرے گی۔ اُس کا ہر لفظ تیرے لیے قانون ہے! تُو اُس کی لمبی زندگی کی کامنا (آرزو) کرے گی اور اُسے پھُولتے پھلتے دیکھنے کے لیے برت رکھے گی۔ پتی سیوا، تیرا دھرم ہے، کرم ہے اور اُس کے بغیر جینا کُکرم (بُرا کرم) سُہاگن کا استھان، بھگوان سے برتر ہے اور بیوہ کا بیسوا سے بدتر۔ ہاں بیوہ کی آبرو ستی ہونے میں ہے۔ ستیوں کے مندر اِس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

اِس خیال کی تائید کے لیے ستیہ وان ساوتری اور ستیوں کی کہانیاں ہیں۔ جو ابھاگن ستی نہ ہو سکتی تھی اُس کے پچھتاوے کے لئے دُوسرا طریقہ تھا۔ وُہ تیرتھ استھانوں پر جا کر رہے اور اپنی مُکتی کے لئے بھگتی کرے۔

مُکتی کے لیے ضابطے کو چھوٹا کرنے کا ایک مارگ اَور تھا۔ مُکتیشور میں ایک مُکتی دھام تھا جہاں بیوائیں انگ دان کرکے بیکنٹھ سِدھار سکتی تھیں۔ جو کوئی سہاگن مرتی تھی اُس کی مُکتی سمپورن تھی۔ شام سنگھ کا باپ مرگیا، اُس کی ماں اَپنے پَتی کے پھول، کاشی چڑھانے گئی اَور اُن کے ساتھ جَل سَنسکار کرلی۔

وُہ کِتنا دِیانت دار ہے جِس نے کاشی کی 'پوترتا' کا سانچا رُوپ گرنتھوں اَور روایتوں سے الگ انداز میں دیکھا ہے۔

رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی
اِن سے بچے تو سیوے کاسی

مَیں، ماں کے لئے پرایا تھا اَور بھائیا جی اُس کے اپنے۔ مُجھ سے زِیادہ اُسے، اُن پر بھروسا تھا اَور میری دی ہُوئی عِزّت سے اُن کی تھوپی ہُوئی ذِلّت پر فخر تھا۔ مُجھے اپنے گھر سے جو نفرت تھی وُہ اَور زِیادہ ہو گئی۔ میرا ماضی منظر دَر منظر میری آنکھوں سے گزرنے لگا۔ کِتنے سَر، دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لہُولہان ہو رہے تھے! کِتنے دِل، پیروں تلے روندے اَور مَسلے پڑے تھے! کتنے نالے، کمروں میں کُلبلاتے تھے کیوں کہ وُہ دَر و دیوار کی قید توڑ کر فِرار نہ ہو سکتے تھے! کِتنے اَعضا، کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے، ٹھٹھرے پڑے تھے! کِتنے شوق، ادا دیلے بَن کر ہونٹوں پر دبے بیٹھے تھے۔ کِتنے دیدے، رحم وکرم کی اِلتجا کرتے کرتے پتھرائے ہُوئے تھے! کتنے وَلولے، حسرتوں کے نیزوں سے رگِ جاں میں ٹُوٹ رہے تھے۔

قارئین! وہ گھر، اَذیت کدہ تھا! اُسے سہمے، سُکڑے، گُونگے، بہرے، روندے، کُچلے، تڑپتے، سِسکتے ..... بے کَس پسند تھے۔ اُس کی رسم و راہ زمانے سے جُدا تھیں۔ جو زَخم کھائے وُہ زَخم لگانے والے کا اِحسان بھی اُٹھائے۔ اگر وہاں کے دَر و دیوار بولنے لگیں اَور اُن حادِثوں کا ذکر اپنی زبانی کریں، جِن کے وُہ سچے شاہد ہیں تو اُن کی رِقّت بالکل الگ ہوگی۔

باب ۴۰

یہ میرے دِل کی آبادی کہ بربادی کے ساماں ہیں
مِرا شوقِ نُمو آواز دیتا ہے بہاروں کو (شاطرؔ)

بھائیا جی گھر واپس آئے تو تایا جی، اُن کے ساتھ تھے۔ مَیں کُرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُٹھ کر تایا جی کے قدم لئے، سَر نِوایا، وُہ کُرسی پر بیٹھے اَور مَیں پاس ہی کھڑا رہا۔ بھائیا جی دُور دَروازے کے سہارے جا کھڑے

ہوئے اور کہنے لگے، "بھائیا جی! آپ اِسے کہہ دیجئے کہ یہ گھر سے چلا جائے۔ جہاں چاہے چلا جائے اور بے شک لوٹ کر نہ آئے۔ لیکن یہاں سے چلا جائے ورنہ ......"

میرے بھائیا جی، تایا جی کو بھائیا جی کے نام سے بُلاتے تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا کرتار سنگھ میرے بھائیا جی کا ہم عمر تھا۔ بھائیا جی نے غصّہ روک کر کمالِ برداشت سے کہا اور جُملہ ادھورا چھوڑ دیا جیسے موزوں الفاظ نہ ملے ہوں۔

"رتن سیاں! ماں باپ کے گھر اُن سے زیادہ بچّوں کے ہوتے ہیں۔ تم جس طرح کہتے ہو، اُس طرح نہیں کہتے!" تایا جی نے مصلحت آمیز دُور اندیشی سے کہا۔

جیسے کہنا چاہیئے، آپ کہہ دیجئے لیکن یہ گھر سے چلا جائے!" اُن کا لب و لہجہ پہلے سے سخت اور بے قرار تھا۔

"لیکن ایک بات ہے"، تایا جی کی نرمی برقرار تھی "ٹھیک ہے! مَیں اِسے جانے کے لئے کہہ دیتا ہوں۔ اِسے کون سا ہُنر آتا ہے جس کے بل بُوتے پر یہ جیئے گا، اپنی روزی پَیدا کرے گا"، اُنہوں نے نئے طریقے سے میری طرفداری کرنی چاہی۔

"سیکھ لے گا!" وُہ لاپرواہی سے بولے۔

"تمہیں یاد ہے؟ تم نے کتنے برس بڑھئی کا کام سیکھا تھا اور پھر مُسافری پر گئے تھے، وُہ بھی گھر کے بندے گربخش سنگھ کے ساتھ!" بھائیا جی کو رام کرنے کے لئے اور اُنہیں کی زندگی کا حوالہ دیتے ہُوئے، تایا جی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "بچّوں کو یُوں گھر بدر نہیں کیا کرتے!" اُنہوں نے میری طرف دیکھا جیسے وُہ کسی سمجھوتے کے خواہش مند ہوں۔

"وُہ اور بات تھی!" اُنہوں نے بات کو سمجھنے سے گُریز کرتے ہُوئے کہا۔

"کیا بات تھی؟" تایا جی نے اُنہیں کُریدا۔

"مَیں بچّہ تھا!" وُہ اپنی حمایت میں بولے۔

"یہ بھی بچّہ ہی ہے!" تایا جی نے میری تائید میں کہا۔

بھائیا جی نے مجھے برچھیوں دیکھتے ہُوئے شیطنت سے کہا۔ "اِس بچّے کو آج ایک عورت لادو، وُہ نَو ماہ میں بچّہ نہ جن دے تو مَیں اپنی داڑھی مُوچھ، مُوت سے مُنڈوا دُوں گا!"

تایا جی اپنی بات کہہ کر نیچے دیکھ رہے تھے۔ وُہ مُطمئن سے تھے جیسے اُنہوں نے ساری اُلجھنوں کا حل نِکال لیا ہو۔ وُہ اُن کے نِرالے ہیجان پر مُسکرا دیئے اور مَیں بے تکلّف ہنس پڑا۔ بھائیا جی کا پارہ چڑھ گیا اور اُنہوں نے

کھنچ کر دو ٹوک کہا، "مَیں نے جو کہنا تھا کہہ دیا" اُنھوں نے باہر کا رُخ کیا اور اپنے پیچھے بیٹھک کا کواڑ زور سے مارا جو قبضوں سے اکھڑ کر ٹیڑھا ہو گیا۔ چوکھٹ کے اُوپر کا سیرو ہلا اور ڈاٹ پر سے پلستر ٹوٹ کر گرا جو پہلے ہی کچھ اکھڑا ہوا تھا ________ تایا جی نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ وُہ خاموش تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بات کیسے شروع کریں! بھایا جی اندر گھسے اور قدم مارتے ہوئے اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ اُن کی بے قراری اُس وحشی کی سی تھی جسے پہلی بار پنجرے میں ڈالا گیا ہو۔

"سائیکل کہاں ہے میلو؟" وُہ میری طرف دیکھتے ہُوئے میری ماں پر چلّائے۔

"وہیں، جہاں ہوتی ہے! برآمدے میں"۔ اِس سے پہلے کہ ماں بولتی، مَیں بول پڑا۔

بھایا جی! اُنھوں نے 'جی' پر زور دے کر دانت کچکچائے، "مَیں اپنے نُطفے کو پیدا ہوتے ہی تالاب میں پھینک دُوں تو وُہ تیر کر کنارے جا لگے۔ ڈوب جائے تو سمجھو کہ حرام کا ہے!"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میری ماں نے کچھ سہم کر اور کچھ لجا کر کہا، "اپنے بچّوں کے بارے میں کوئی ایسا کہتا ہے؟"

"کوئی کہے نہ کہے، مَیں کہتا ہُوں"۔ یہ کہتے ہُوئے اُنھوں نے جیب میں سے کچھ رُوپے نکالے اور ماں کی طرف پھینکے، اِسے دے دینا! تاکہ زِندگی میں یہ نہ کہہ سکے کہ گھر سے خالی ہاتھ نِکالا تھا۔"

یہ پہلا موقعہ تھا جب اُنھوں نے مجھے بِن مانگے کچھ دیا تھا لیکن دینے کے انداز میں وُہی حقارت آمیز ترحّم تھا۔ وارث شاہ کے اِس شعر میں کتنی سچائی ہے!

وارث شاہ نہ عادتاں جاندیاں اے
بھاویں وڈھّیے پوریاں پوریاں ای

(اے وارث شاہ، آدمی عادتوں کے اِتنے سخت ہوتے ہیں کہ یہ پور پور کٹوا کر بھی وُہی کریں گے جو کرتے آئے ہیں)

"مَیں جا رہا ہُوں!" وُہ باہر سے چلّائے۔

"کہاں؟ سُنیے! میری ماں اُن کے پیچھے بھاگی اور سانسے سے چِلّائی۔

"اندھے کنُویں میں!" وُہ پُورے اِرادے سے لیکن ہیجانی لہجے میں بولے۔

اُن کا جوتا برآمدے کے کونے کے پاس رکھا تھا جس پر کپڑے کی دھجّی پڑی تھی۔ اُسے جھاڑے جھٹکے بغیر اُنھوں نے جوتا چڑھایا اور دھجّی گھسیٹتے ہُوئے چل پڑے۔ ماں نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ پکڑا لیکن اُنھوں نے جھٹک کر چھُڑا لیا۔ اِس سے پہلے کہ ماں کوئی اَور جتن کرتی، بھایا جی سائیکل لے کر گھر سے باہر نِکل گئے۔ ماں کچھ دُور اُن کے

پیچھے" اجیت کے بھائیا سنو تو! اجیت کے بھائیا، سنو تو!" پکارتی گئی آخر لوٹ آئی۔ اُس نے بکھرے ہوئے روپے اکٹھے کیے اور شرمسارسی اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

بھائیا جی کو اپنے نطفے پر ایسے بھروسا تھا جیسے کسان کو صحت مند بیج پر ہوتا ہے۔ بیج کے بارے میں کسان کا رویہ صدیوں پرانا ہے۔ کسان کھیتی کا وہ حصہ بیج کے لئے الگ رکھتا ہے جس کی اُٹھان پورے کھیت سے اچھی ہو۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ گھر میں جھگڑا ہوا تھا اور کوئی رو نہیں رہا تھا۔ ماں کسی حد تک برہم تھی لیکن مجموعی طور پر صورتِ حال مانوس اور سکون پرور تھی۔ میری نانی اور ماں اُٹھ کر تایا جی کے پاس بیٹھ گئیں۔ ماں نے تایا جی سے ہلکے سے گھونگٹ کی آڑ سے پوچھا۔ "بھائیا جی، اب کیا ہوگا؟"

اُنہوں نے میری پیٹھ تھپک کر وثوق سے کہا، "تو بڑا ہو گیا ہے۔ تجھے اپنا گھر بسانا ہی ہے اور اپنے طریقے سے جینا ہے۔ اِس سے پہلے ضروری ہے کہ تو دنیا کو اپنے طور پر دیکھے اور اچھے، بُرے میں تمیز کرنا سیکھے۔ آدمی اپنے تجربے سے زیادہ سیکھتا ہے نسبتاً دوسرے کے بتانے سے، کیوں کہ اُسے ہر سبق کے لئے کچھ نہ کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ آدمی اُس جگہ کی صاف طور پر نشان دہی کرسکتا ہے جہاں اُسے ٹھوکر لگی ہو۔ اپنے سے سیکھنے اور کسی سے سیکھنے میں اِسی حقیقت کا فرق ہے۔ تجھے کون سا ہنر راس آئے! تیری رُچی پر ہے لیکن ہنر کوئی بھی ہو، دیانت داری سے جینے کا وسیلہ ہے!"

میں گھر سے نکل جانے کا تہیہ کر چکا تھا اور کسی بھی مصیبت کے لئے تیار تھا۔ ہوتے ہوتے میں جھگڑوں کا عادی ہو گیا تھا اور سوال جواب کرنے لگا تھا۔ میں نے 'جی ہاں'، 'ہاں جی' کہتے ہوئے اُن کی باتیں سنیں۔ میں اُن کی ہر بات اِسی لگن سے سنتا تھا جیسے کہانیاں۔

"بھائیا جی، یہ دِلّی میں رہے گا کیسے؟!" ماں نے تشویش ظاہر کی۔

"عقل مند آدمی کہیں رہے، اکیلا نہیں ہوتا! اُس کی فہم و فراست اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔" اُنہوں نے جہاں ماں کی ڈھارس بندھائی وہاں میری تعریف بھی کی۔ میری ناقابلِ اعتبار صورتِ حال پر وہ رنجیدہ تھے لیکن سنجیدہ تھے جیسے اپنے دُکھ، سکھ میں ہوتے تھے۔ وہ اُٹھ کر جانے لگے، ماں نے کہا" بھائیا جی، آپ بیٹھیے! میں چائے بناتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں باہر صحن میں بیٹھتا ہوں۔" اُنہوں نے ماں کی بات مانتے ہوئے کہا۔ وہ چائے شوق سے پیتے تھے۔

"بیٹی! میں نہ تیرے پاس آتی اور نہ یہ لڑائی ہوتی!" میری نانی میری ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اُس کا لہجہ احساسِ قصور سے چھلک رہا تھا۔

"نانی ماں! یہ لڑائی آپ کے آنے سے نہیں ہُوئی۔ بھابیٔے کے مُنہ کے لئے چھینکا چاہیئے جو کوئی دیتا ہوا ڈرتا ہے۔ اجیت سنگھ کے بیاہ پر کیا ہُوا تھا؛ اِس نے پُورے رِشتے داروں کو بے عزّت کر کے گھر سے نکالا تھا۔" اِس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتی، مَیں نے آواز نیچی رکھنے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔

"تُو چُپ رہ! بڑوں کی بات میں چھوٹوں کا بولنا بدتمیزی ہے۔ باہر جا کر بھائیا جی کو سرہانہ دے، اُن کے پاس بیٹھ اَور کوئی عقل کی بات سیکھ! سارے خاندان میں ایک ایسا نہیں جو اُن پر گیا ہو!" اُس نے مجھے دھتکار کر وہاں سے بڑھا دیا اَور مَیں سوچنے لگا، "کاش! مَیں تایا کا بیٹا ہوتا!" مَیں نے اندر سے سرہانہ اُٹھایا، لے جا کر تایا جی کے سر کے نیچے رکھا اَور اُن سے پنکھا لے کر اُنہیں جھلنے لگا۔ مَیں تایا جی کی بات پر غور کرنے لگا۔ وُہ ٹھیک کہتے تھے، مجھے اپنا راستہ آپ تعیّن کرنا تھا اَور زندگی کی سچائی کو اپنے طریقے سے پرکھنا تھا۔ میرے سامنے زندگی تضاد ہی تضاد تھی۔

اِتنے میں ماں چائے لے کر آئی اَور چائے کی گڑوی سٹُول پر رکھ کر چلی گئی۔ تایا جی آنکھیں بند کئے لیٹے ہُوئے تھے۔ مَیں نے اُنہیں آواز دی اور گڑوی میں سے گلاس میں چائے ڈالی۔ وُہ ایسے اُٹھے جیسے تھکے ہُوئے ہوں۔ میرے ہاتھ سے گلاس لے کر وُہ چائے پینے لگے اور چند گھُونٹ پی کر کہنے لگے، "بیٹا! آدمی کی زندگی خُود کو سمجھ کر آگے بڑھنے میں ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وُہ کہیں نہیں پہنچتا! ادھُورا رہتا ہے۔ ادھوری شے نہ اپنی تسکین ہوتی ہے اَور نہ کسی دُوسرے کی۔ زندگی کے ایک ہی معنی ہیں، حُسنِ عمل۔ اِدھر دیکھ!" اُنہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کا انگُوٹھا دکھایا جہاں کچھ دن پہلے پٹّی بندھی ہُوئی تھی۔ "یہاں سے درانتی سے ماس اُڑ گیا تھا۔ یہ گڑھا بھر کر ماس کے برابر آ گیا ہے اَور انگُوٹھا پہلے کی طرح خُوبصورت لگتا ہے۔ آدمی کی عملی زندگی، اسلُوبِ فطرت کے مطابق ہے۔ جس آدمی میں حُسن پرستی کا عنصر نہ ہو وُہ فیضِ خُود زائیدگی سے محرُوم رہتا ہے اَور فرحت آفریں لمحوں کی نازکی سے بے بہرہ۔"

مَیں اپنے تایا جی کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتا ہُوں اَور کسی مُناسب وقت کے اِنتظار میں ہُوں۔ اِس وقت یہ چند سطُور ہدیۂ رُخصت کے طور پر لکھ رہا ہُوں۔

تایا جی کے کردار میں جو قوّتِ حیات تھی اُس کا سرچشمہ خالص اُن کی اپنی ذات تھی وَرنہ دھرتی ماں کسی اَور کو بھی ویسی خُوبی سے نوازتی جو صرف اُنہیں کی پُونجی تھی۔ اُن کی طبیعت میں نرمی اَور ہمدردی، پھُول کی خوشبو کی طرح تھی جو دُور دُور تک محسُوس ہوتی ہے۔ جیسے کال کوٹھڑی میں چھوٹا سا سُوراخ، آفتاب کی سی حیثیت رکھتا ہے ویسے ہی مُصیبت میں اُن کی قُربت تھی۔ اُن کی بول بانی لفظوں کے معنی ہی بدل دیتی تھی۔ اپنے دُکھوں سے گھبرا کر میری ماں اپنی موت کی چاہ کرتی، وُہ اُس غریب بے کس کی ڈھارس یُوں بندھاتے، "میرے بیٹے! مَیں تجھے مرنے سے ہرگز نہ روکتا لیکن مرنے کا ایک ہی ڈھنگ ہے اَور جینے کے انیک۔ موت کو پچھاڑنے کی ہمّت کا نام ہی

زندگی ہے۔"

اُس مبداءِ فیاضی و سخاوت اور گنجِ فہم و بصیرت کا نام سادھو سنگھ ہے۔ نام کی ریاکاری کہاوت ہے، نام بڑا اور درشن چھوٹے۔ لیکن وہ اپنے نام کے معنی سے بہت بڑے تھے۔ وہ الفاظ کو عملی جامہ پہناتے تھے تو اُن کے رسمی معنی، بے ربط لگتے تھے جیسے خوشبودار پھولوں کے سامنے بے خوشبو پھول۔

دُوسرے دن سویرے ہی مَیں دِلّی کے لئے تیار ہوگیا۔ ماں نے مجھے پندرہ روپے نقد دیئے جو پچھلی رات بھایا جی میرے لئے 'دے گئے تھے'۔ وہ ناقابلِ اعتبار گھڑی آ پہنچی اور میری ماں لگی مجھے ہدایت کرنے۔ وہ جان کر نہیں جانتی تھی کہ مجھے اُنگلی پکڑ کر چلنا چھوڑے ہُوئے سترہ سال ہوگئے ہیں۔ میری رُخصت کا سماں دیدنی تھا! ماں نے دہلیز پر تیل چوایا، میری بہن ترسیم کور نے کنبھ کی، مَیں نے سیدھا پاؤں دہلیز کے باہر پہلے رکھا اور میرے پیچھے ہر کوئی باہر نکلا۔ میری حیثیت میرِ کارواں کی سی تھی۔ میرے ہی خواہوں میں کوئی نہیں تھا تو میرا بھایا میرا باپ۔ راستے میں کنُواں پڑتا تھا۔ تیرتھ کور پانی کا گھڑا لئے آتی ملی۔ اُسے دیکھ کر ماں کی آنکھیں اُمید و مسرت سے چمک اُٹھیں۔ اُس نے اُس کا مُنہ چُوما، جگ جگ جیو، سہاگن بسو کی دُعا دی۔ اُس شُبھ شگون کو ہر کوئی سراہ رہا تھا اور ماں کو بدھائی دے رہا تھا۔ میرے گھر بدر ہونے کی خبر ہمدردی بن کر پھیلی تھی۔ بڑی بوڑھیاں فکرمند تھیں کہ اُن کے خط کون لکھے گا؟ کئی میرے ساتھ تھیں جن میں سے تائی پربھی اور بھابی سُمرن کور قابلِ ذکر ہیں۔ تائی پربھی لاڈ سے کہا کرتی تھی، "تو میرا کوّا ہے!" اُس نے جذباتی ہو کر کہا۔

کون رانجھڑے خبر کرو کا داں

ہیر بمار پئی

(میرے کوّے! اب کون میرے رانجھے یار کو خبر دے گا کہ تیری ہیر بیمار ہے)

بھابی سُمرن کور شرم سے کچھ نہ بولی حالاں کہ مَیں اُس کا رازدار تھا۔ بھائی صاحب آسا سنگھ کو وہ جیسے خط لکھواتی تھی، اُن کے مضمون راز میں رکھنے کے لئے مجھے چوری چھپے مکھن کھلاتی تھی۔ اُن کا مطلب کم و بیش ایک سا ہوتا تھا۔ آپ نوکری چھوڑ کر گھر آجاؤ، تاکید ہے۔ میرا اکیلاپن، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا! یہاں کھانے پینے کے لئے سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نوکری چھوڑ دو، تاکید ہے، پھر تاکید ہے۔ اِس خط کو تار سمجھنا۔

اُس دیہاتن کی باتیں، کھرے جذبے سے سرشار ہوتی تھیں اور دیہاتی مشاہدے سے بھرپور۔ آپ کو باہر گئے کتنا عرصہ گزرا ہے! مَیں اَن پڑھ کیسے جانوں؟ آپ کے ہوتے ہُوئے گائے نے جو بچھڑا دیا تھا، وہ مُوا اَب مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتا! پُورا بیل ہوگیا ہے!

میری ماں ہر طرح سے مطمئن تھی۔ اُسے ایک ہی بات کھٹکتی تھی کہ اُس کے کہنے پر مَیں گرُودوارے نہ گیا تھا اور اِس طرح گرُو کی آشیرباد سے محروم رہ گیا تھا۔ گاؤں کے باہر بچھڑتے ہُوئے مَیں نے بڑوں کے پاؤں ہاتھ لگایا اور چھوٹوں سے گلے ملا۔ کوئی سوگوار تھا اور کوئی اشکبار، کوئی آواز غم سے رُندھی ہُوئی تھی اور کوئی سسکیوں سے ٹوٹی ہُوئی۔ مَیں جس سے مل کر جُدا ہوتا وہ کوئی نہ کوئی دُعا دیتا۔ ماں نے بار بار کہا ”ربّ راکھا! تیرا واہگرُو راکھا!“ مَیں نے تایا جی کے پاؤں چھُوئے تو انہوں نے مجھے گلے سے لگایا، پیار کیا اور قدرے توقف سے کہا ”تُو اپنا راکھا آپ ہے! اپنا خیال رکھنا! مَیں تجھے، تجھی کو سونپتا ہُوں۔“

اُنہوں نے ایک تہ کیا ہُوا کاغذ میری جیب میں ڈالا، میرے سَر پر ہاتھ پھیرا اور گاؤں کی طرف مُڑ گئے۔

مَیں اپنی حالت کیا بَیان کروں! مَیں اُن سے ایسے جُدا ہُوا جیسے آنسو، آنکھ سے ٹوٹتا ہے۔

میرے آنسو میری عُمرِ گزشتہ کا ایسا جوہر ہیں، جس کی کیمیاگری ہمہ صِفت ہے۔ کہیں معصومیت کا اِحساس ہے اور کہیں چال بازی کی بُو باس، کہیں مُردہ دِلی کی بے کسی ہے اور کہیں زِندہ دِلی کی سَرگرمی، کہیں بچپن کا اُلجھاؤ ہے اور کہیں جَوانی کا سُلجھاؤ، کہیں خیال کے خاکے ہیں اور کہیں عمل کے نقشے، کہیں شکست کی قنوطیت ہے اور کہیں فتح کی رجائیت۔ مَیں کہیں ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا تو میرے آنسو ہی مجھے سنبھالتے اور سہارا دیتے۔ انہوں نے میری پرورش اُس لاچار پَودے کی طرح کی ہے جسے ٹھیک سمے پر برکھا کا امرت نہ ملے تو وُہ اپنی ہی آگ میں جَل جائے۔

شاستروں کے لحاظ سے آدمی، اَشوتھم ہے (وُہ سدا بہار درخت جس کی جڑیں آسمان میں اور شاخیں دھرتی پر ہیں)، تایا جی کہتے تھے کہ آدمی، درخت کی طرح دھرتی کی پَیداوار ہے لیکن اِس کی جڑیں، دِماغ میں ہیں۔ دِماغ، اِنسان کے وجُود میں چھٹا عنصر ہے اور اُن پانچوں عناصر سے زیادہ اہم ہے جن کی مذہب دلیل دیتا ہے۔ دِماغ سے اِنسان کا عرفان ہے اور عرفان ہی اِنسان کی قوّت ہے۔ یہ اِسی عرفان کا اِحسان ہے کہ مَیں ماں کی محفُوظ گود سے نکل کر ناقابلِ اعتبار دُنیا میں اکیلا کھڑا ہُوں۔ مَیں اُس سفر پر آمادہ ہُوں جس کی بے اعتباری کا اِدراک صرف سفر کے راستوں کو ہے۔ جس طرح جسم کی تشکیل میں پٹھوں کو بڑا دخل ہے اُسی طرح آدمی کی زِندگی میں راستوں کو۔ خون کے لئے رگیں اور آدمی کے لئے راستے لازم و ملزُوم ہیں۔ سمجھو تو راستے، کتابِ حیات کے ورقے ہیں جن پر ہر آدمی اپنے اپنے نقش بنا رہا ہے۔ اِن اَوراق کی خُوبی! اِن پر کروڑہا نقوش باہم دِگر ثبت ہیں لیکن ہر کوئی اپنے طور پر صاف اور واضح ہے۔ آدمی کے سوائے ہر چیز کی اِنفرادیت اُس کے خمیر میں ہے لیکن آدمی کو اپنی انفرادیت تلاش کرنی پڑتی ہے۔ مَیں خُود سے سُوال کرتا ہُوں۔ کیا مَیں اپنی اِنفرادیت تلاش کر سکوں گا؟

گیان سنگھ شاطر

۴۶ ۳۸۷

اِخلاص کی اِفراط کِسے مِلتی ہے
یہ عُمدگی ذات کِسے مِلتی ہے
تقدیر سے مل جائے جِسے مِل جائے
یہ لذّتِ سوغات کِسے مِلتی ہے

۴۷ ۳۹۱

دانے میں نہاں دام نظر آتا ہے
آزاد بھی ناکام نظر آتا ہے
دِل جہد کے جذبے سے اگر عاری ہو
آغاز بھی انجام نظر آتا ہے

۴۸ ۴۰۳

طُوفاں کو ڈراتا ہے سفینہ جِن کا
دریاؤں کا رُخ موڑ دے سینہ جِن کا
وہ زہرِ غمِ روز میں ہیں ڈُوبے ہُوئے
امرت سے بھی بڑھ کر ہے پسینہ جِن کا

۴۹ ۴۰۸

جذبات سے دیوانہ ہُوا جاتا ہُوں
حالات سے بیگانہ ہُوا جاتا ہُوں
جب سے مَیں ہُوا اپنی حقیقت کا نقیض
بے جوڑ سا افسانہ ہُوا جاتا ہُوں

۵۰ ۴۱۵

وُہ جو رکھتے ہیں اپنے کام سے کام
دَرحقیقت وُہی سیانے ہیں

۵۱ ۴۲۳

شاطؔر زمانہ دے گا ضمانت دوام کی
خُود میں مگر کمال تو پیدا کرے کوئی

۵۲ ۴۳۲

ہم اُسے آدمی نہیں کہتے
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی

۵۳ ۴۴۰

ہر کام میں ہے دیر جدھر بھی دیکھو
تقدیر کا ہے پھیر جدھر بھی دیکھو
ہر سمت نئے پاپ جنم لیتے ہیں
اندھیر ہے اندھیر جدھر بھی دیکھو

۵۴ ۴۵۰

ہوں خشک دہن دشت کے خاروں کی طرح
ویران ہوں بوسیدہ مزاروں کی طرح
سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں طوفاں
خاموش ہوں دریا کے کناروں کی طرح

۵۵ ۴۶۰

چہرہ ہے غمِ دہر میں جلتی سی کتاب
آنکھیں ہیں امیدوں کے فسردہ سے گلاب
جینے کی تمنا پہ گماں ہے ایسا
گھر لوٹتا ہے جیسے کوئی خانہ خراب

۵۶ ۴۷۱

نفرت کے خداؤں کی عبادت چھوڑو
تفریق کے سنگین بتوں کو توڑو
تم چاند ستاروں کی طلب سے پہلے
انسان سے انسان کے رشتے جوڑو

۵۷ ۴۷۸

اخلاص اُسے راس نہیں ہوتا ہے
قدروں کا اُسے پاس نہیں ہوتا ہے

کس بات میں کیا حُسن ہے، کیا معنی ہے؟
کم ظرف کو احساس نہیں ہوتا ہے

باب ۴۱

یاس و اُمید کے دوراہے پر
دم میں جیتا ہُوں دم میں مرتا ہُوں (شاطر)

بسوں کے اڈّے پر جانے سے پہلے مَیں ٹال پر آیا۔ رکّھا جامن کے نیچے اینٹ پر سر رکھے پڑا تھا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ مَیں دلّی جا رہا ہُوں۔ وُہ ویسے ہی آرام سے پڑا رہا جیسے پڑا ہُوا تھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ اُس نے میری بات نہیں سُنی، مَیں نے بات دُوہرائی۔ اُس نے میری جانب پہلُو بدلا اور سر کا بوجھ ہاتھ پر لے کر کہا، تُم جو کرنا، کرنا، اُدھار نہ کھانا۔ یہ پَودا جتنی آسانی سے لگتا ہے اُس سے ہزار مُشکل سے اُکھڑتا ہے۔ جاؤ، کام کرو، بڑھو پھُولو، خُوش رہو۔

مَیں مُشکل سے دو قدم پیچھے مڑا تھا کہ رکّھے کو بولتے سُنا۔ وُہ پہلے ہی کی طرح چِت پڑا تھا اور خُود سے کہہ رہا تھا "پرائی چکنی چُپڑی سے اپنی سُوکھی بھلی!" وُہ خُود سے اخلاقی باتیں کیا کرتا تھا۔

جسے اپنی مُراد و مقصد کو پانا ہو اُسے اپنے عہد و عزم کی تجدید بار بار کرنی چاہیئے!

دیانت داری اپنا گھر شیشے سے بناتی ہے جسے لوبھ کا ہلکا کا پتھر چُور چُور کر سکتا ہے۔

رکّھا اور تایا جی کے سوائے مَیں کسی کو نہیں جانتا، نہیں پہچانتا، جس کے کہنے اور کرنے میں مماثلت ہو۔ تایا جی کہتے تھے، "کسی سے کبھی کچھ مت لو! اگر لو تو وعدے سے پہلے اُس کے گھر دے کر آؤ، یہ عزتِ نفس کی علامت ہے۔"

دلّی دُور کی بات ہے، مَیں نے جالندھر نہیں دیکھا تھا جہاں سے دِلّی کو ریل گاڑی جاتی تھی۔ مَیں نے ہوشیار پُور بھی چار بار دیکھا تھا اور وُہ بھی کسی خاص مقصد کے تحت، جب کوئی نہ کوئی میرے ساتھ تھا۔ اِن سفروں کی تفصیل کچھ اِس طرح ہے۔ پہلی بار مَیں شیش محل، گندہ بروزہ کا کارخانہ اور باؤلی دیکھنے

کے لئے گیا تھا، دوسری بار پنڈت جواہر لال نہرو کو دیکھنے کے لئے، تیسری بار سنسار پکچر دیکھنے کے لئے اور چوتھی بار سائیکلوں کے لئے کل پرزے خریدنے کے لئے۔ ہریانہ سے جالندھر مشکل سے تین گھنٹے کا سفر ہوگا لیکن مَیں گھر سے سویرے ہی روانہ ہو پڑا تھا۔ گاؤں کا رواج ہے کہ سفر افراتفری میں نہیں کرتے ہیں۔ دیسراج شہری ٹھگوں اور اُچکوں کے قصے سُناتا تھا۔ گاؤں والوں میں عام چرچا تھا کہ شہری، دیہاتی سے زیادہ لالچی اور فریبی ہوتا ہے۔ اِس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ کسان منڈیوں میں صاف ستھری پیداوار بیچتے ہیں لیکن جب وُہی چیزیں دکانوں سے خریدتے ہیں تو اِن میں مِلاوٹ ہوتی ہے۔ مُجھے ہر کوئی مشکوک نظر آرہا تھا۔ جالندھر تک شاید ہی کوئی مقام گزرا تھا جہاں کسی نے چھت پر سے سامان اُتارا ہو اور مَیں نے دیکھا نہ ہو۔ اِس کی ایک وجہ اور تھی، بس پر لکھا ہوا تھا، سواری اپنے سامان کی ذمہ دار آپ ہے۔ جالندھر میں بسوں کے اڈے سے ریلوے سٹیشن زیادہ دُور نہ تھا اور میرے پاس وقت بھی تھا۔ مَیں اپنا سامان آسانی سے اُٹھا سکتا تھا اور چل کر وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن مَیں نے ایسا نہ کیا۔

مَیں آپ سے اپنی ایک اور کمزوری بیان کرنا چاہتا ہُوں۔ مَیں گاؤں میں جس کام کو ہنسی خُوشی کرتا تھا، وُہی کام شہر میں کرتا ہُوا کُڑھتا تھا۔ گاؤں سے ہریانہ آتے ہُوئے بودُو رام میرے ساتھ تھا جِس نے میرا ٹرنک اُٹھایا ہُوا تھا۔

مَیں نے اپنا سامان قُلی سے اُٹھوایا اور سائیکل رکشا پر بیٹھ کر سٹیشن پہنچا۔ ویسے تو کئی گاڑیاں دِلّی جاتی تھیں، مَیں نے شام کو جنتا میل سے جانے کا پروگرام بنایا۔ اَمر سنگھ کہتا تھا کہ جنتا میل میں بھیڑ کم ہوتی ہے۔ ٹرین کا ٹکٹ، ٹرین آنے سے گھنٹا بھر پہلے ملتا تھا، مَیں مسافر خانہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

پلیٹ فارم کی گہما گہمی مُسافر خانہ سے الگ تھی۔ خوانچے والوں کے بُلاوے، چائے فروشوں کے بہکاوے، دُھواں اڑاتے اِنجن، کانٹے بدلتے پہیوں کی ٹھن ٹھن، بوجھل ہوا، شور، فضا۔ شہری زندگی سراسیمگی اور پریشانی سے پُر تھی اور جوکسی طلب تھی۔ مُستقبل سے زیادہ مَیں نئے ماحول کے خوف کا اسیر تھا۔ مَیں جس بنچ پر بیٹھا تھا وُہ کئی بار بھر کر خالی ہُوا تھا۔ مَیں نے خواب میں نہ سوچا تھا کہ اُس ایک لائن پر سے اتنی ٹرینیں گزر سکتی ہیں اور وُہ بھی الگ الگ سمتوں میں۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ بڑھتی اور ٹرین آتے ہی ساری کی ساری بھیڑ اُس میں سمٹ جاتی۔ میری بڑی پریشانی میرا قُلی تھا۔ وُہ مُجھے وہاں بٹھا کر اور بھروسا دِلا کر چلا گیا تھا کہ وُہ ٹرین آنے سے پہلے آئے گا اور اچھی سی سیٹ پر بٹھا جائے گا۔ اُس نے سامان اندر اُٹھا کر لانے کی مزدوری نہیں لی تھی، اِس کے باوجُود مُجھے لگ رہا تھا کہ وُہ وقت پر نہیں آئے گا اور

مجھے ٹرین پر اکیلے ہی چڑھنا پڑے گا۔ میری بے قراری میری بے اِعتباری تھی۔ مَیں ایک نظر آگے اور ایک نظر پیچھے سامان کو دیکھتا، آگے پلیٹ فارم کے کنارے کی طرف بڑھتا اور پٹڑی کو حیرت سے دیکھتا جو نامعلوم مقام سے آتی ہُوئی دکھائی دیتی تھی اور اُسی طرح نامعلوم مقام میں گُم ہوتی ہُوئی۔ میرا سامان میرا مسئلہ تھا۔ مَیں سوچتا کہ مَیں تن تنہا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! جنتا آرہی ہے! کہیں سے اڑتی ہُوئی آواز آئی اور خطرے کے سائرن کی طرح گونج گئی۔ ہر کوئی نئی صُورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے بے چین نظر آیا اور پھر جہاں تھا وہیں دم بستہ ہوگیا جیسے خود نہاد ضابطے کے قانون پر ایمان لے آیا ہو۔ ٹرین آئی اور ایک منظم ریلے کی طرح گزرنے لگی۔ اُس کا آغاز تھا اور انجام نامعلوم۔ مَیں سکتے میں آگیا اور بھُول گیا کہ وُہ ٹرین ہے اور مجھے اُس پر سوار ہونا ہے۔ اِتنے میں میرا قلی سر پر مُڈاسا باندھتا ہُوا میرے سامنے آکھڑا ہُوا۔ اُس نے جلدی جلدی مُڈاسا باندھا، ٹرنک اُٹھا کر دوڑنے کی سی رفتار سے چلنے لگا اور اُس کے پیچھے میں۔ وُہ بھیڑ میں جیسے چل رہا وُہ اُسی کا کرتب تھا۔ مَیں نے اُسے بار بار کھو کر پایا۔ ٹرین پُوری طرح رُکی نہ تھی کہ اُس نے لپک کر ڈبے کا ہینڈل پکڑا، اُچک کر فٹ ریسٹ پر چڑھا اور دروازہ دھکیل کر اندر گھُس گیا۔ اُس نے میرا ٹرنک اُوپر ریک پر رکھا اور کہا، "اِس پر قبضہ جمالو، آرام سے سوکر دِلّی پہنچ جاؤ گے۔" وُہ اپنی مزدُوری لے کر ایسے غائب ہُوا جیسے حاضر ہُوا تھا۔

ٹرین جالندھر کینٹ کے سٹیشن پر رُکی اور روانہ ہُوئی۔ ایک سردار جنٹلمین، ٹرین کی راہ داری میں آکر کھڑا ہوگیا اور اُونچی تیکھی آواز میں مُسافروں کو مخاطب کرنے لگا۔ "بھائیو اور بہنو، اِدھر دیکھو یہ بیوپاری آپ کے لئے کیا کیا لایا ہے؟ مہربان، قدردان اِدھر دھیان دیجئے۔ خریدیئے نہ خریدیئے، مال ضرور دیکھئے ایسا سُود مند بیوپار نہ آپ نے سُنا ہے، نہ دیکھا ہے، نہ کیا ہے!"

وُہ اپنے پیروں میں پڑے بڑے سے بیگ پر جھُکا اور اُسے ٹٹولنے لگا۔ وُہ ٹٹولنے کے ساتھ بول بھی رہا تھا، آواز دھیمی پڑگئی تھی لیکن سُنائی دے رہی تھی۔ وُہ سیدھا کھڑا ہُوا، اُس کے ایک ہاتھ میں گڑوی اور دوسرے میں کنگھی تھی۔ ہاں تو بھائیو اور بہنو، یہ گڑوی بکاؤ ہے۔ جس کی بولی اُس کی گڑوی۔ میرے لحاظ سے بولی ٹھیک ہوگی تو مَیں گڑوی دُوں گا ورنہ یہ کمیشن دے کر گڑوی رکھ لُوں گا۔ اُس نے گڑوی پر کنگھی مار کر گھُما پھرا کر دکھائی۔ گڑوی کانسے کی ہے اور نکل کی ہُوئی ہے۔ جو سچ بولنے سے ڈرے، کوڑھی ہو کر مرے! مجھے کھرا سودا بیچنا ہے اور آپ کو کھرا سودا خریدنا ہے اور اِس ٹرین میں جاتے آتے ہزار بار ملنا ہے۔ مَیں دھوکا کروں گا تو دُوبارہ آپ کو مُنہ کیسے دکھاؤں گا؟

میری بولی پانچ روپے۔

وُہ بولی دے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن ہر کوئی چُپ رہا۔

"بھائی صاحب کُچھ تو بولیئے!" وُہ سامنے بیٹھے ایک سردار جی سے مُخاطب ہُوا جو اپنی پگڑی اُتار کر گود میں رکھے ہُوئے تھا اَور لڑ سے خود کو ہَوا جھل رہا تھا۔ اُسے بے اثر دیکھ کر اُس نے اُسے بہکانے کے سے انداز میں کہا "شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے، جو جی میں آئے بولیئے۔ مُجھے گڑوی بیچنی ہے اَور آپ کو خریدنی ہے۔"

"چھ روپے" کسی دوسرے آدمی نے کُچھ شرماتے ہُوئے اَور کُچھ مُسکراتے ہُوئے بولی لگائی۔ اُس کے چلن سے ظاہر تھا کہ اُسے گڑوی کی ضرورت نہ تھی، وُہ محض دِل لگی کر رہا ہے۔

"چھ روپے! دو سیر کی کانسے کی گڑوی چھ روپے میں۔ چھ روپے ایک، چھ روپے دو، بولی لگایئے بھائی صاحب! جس نے کی شرم اُس کے پُھوٹے کرم۔ چھ روپے ایک، چھ روپے دو، چھ روپے تین۔ لایئے جناب چھ روپے۔"

بیوپاری نے ہاتھ بڑھا کر گاہک سے رُوپے وصُول کیے، سب کے سامنے گِنے اَور سب کو دِکھاتے ہُوئے کنگھی کے ساتھ واپس کر دیئے۔

وُہ انوکھا بیوپاری اپنے بیگ میں سے نیا مال تلاش کرنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میری طرح اَور کئی پچھتا رہے ہوں گے۔ خریدار کے پڑوسی اُس سے کنگھی لے کر دیکھتے اَور بیوپاری کی حقیقت پسندی کی تعریف کرتے۔ اُس بار بیوپاری کے ہاتھ میں کٹلری کا سِٹ تھا۔ ہلکے پیلے رنگ کی لکڑی کے ڈبے کے اندر نیلی مخمل میں سجائے ہُوئے کانٹے، چُھریاں اَور چمچے، نیلم کے ٹکڑے لگتے تھے۔

"بھائیو اَور بہنو، میرا یہ مال ---"

"دکھاؤ تو؟" ایک مُسافر نے ہاتھ بڑھا کر اُسے بیچ میں ٹوکا۔

وُہ خُوبصُورت سِٹ جس نے دیکھا، اُسی نے سراہا۔ جو کوئی بیوپاری کو بے یقینی سے دیکھتا تھا اُسے بھی اُس کی دیانت داری پر یقین ہو گیا تھا۔ تماشائیوں کے چہروں پر سے تناؤ جاتے رہے تھے اَور اُن کے خیالات یکسر بدل گئے لگتے تھے۔ کانٹے بدلتی، ہچکولے کھاتی ٹرین یارڈ پار کر کے سیدھی لائن پر آ گئی تھی اَور چلتی ہُوئی ساکن نظر آتی تھی۔ اُس کی رفتار میں لطیف سنگیت سمو گیا تھا اَور بھلا لگتا تھا۔ کھڑکی سے آگے کے درخت اَور کھمبے، ٹرین کے مُنتظر دکھائی دے رہے تھے اَور کھڑکی سے پیچھے وُہ سب اُس چور کی طرح بھاگ رہے تھے، جس کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔

"مال سولہ آنے کھرا ہے بھائی صاحب! باہر کا مال ہے۔ ہندوستان کا ہوتا تو شک کی گُنجائش تھی۔

بڑھیا مال، بڑھیا کیشن!" اُس نے تہ کیا ہُوا رُومال جھٹک کر کھولا۔ سفید رُومال میں کناروں سے دو انچ اندر آدھا انچ چوڑا نیلا حاشیہ تھا۔ میرے جی میں آئی کہ بولی لگاؤں اور کیشن حاصل کروں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اُس نے کیشن دینے سے پہلے رُوپے دیکھے تھے اور میرے پاس اِتنے رُوپے نہیں تھے۔ تایا جی کے پانچ روپے ملا کر میرے پاس کُل بیس رُوپے ہُوئے تھے، جن میں سے مَیں تقریباً بارہ رُوپے خرچ کر چُکا تھا۔ بیوپاری نے رُومال کاندھے پر رکھا، صافہ سنوارا، فِکسر سے چپکی ہُوئی داڑھی پر اِحتیاط سے ہاتھ پھیرا، جیب میں سے رنگین رُومال نکالا اور اُس سے گردن کو ایسے پُونچھا جیسے کوئی تازہ تحریر کو سیاہی چُوس سے سُکھاتا ہے۔ جب تک وُہ اپنی وضع قطع سے مُطمئن ہُوا، کٹلری سِٹ ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہُوا واپس اُس تک پہنچ گیا۔ وُہ پہلے سے زیادہ اِعتماد سے بولا، "بھائیو اور بہنو! میری بولی پندرہ روپے۔ اِس قیمت میں مُجھے کوئی سو سٹ دلوا دے، مَیں خریدار ہُوں۔"

"سولہ رُوپے"

جِس گاہک نے بولی دی، اُس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

سولہ رُوپیہ! میڈ اِن انگلینڈ مال کا مول سولہ رُوپیہ۔ بھائی صاحب، انگریز لوگ خراب ہیں، اُن کا مال اچھا ہوتا ہے۔ اِتنے اچھے مال کے سولہ رُوپے۔ سولہ رُوپیہ ایک،"

"سترہ رُوپیہ"

جِس نے بولی بڑھائی اُس کی آواز تسکین آمیز تھی۔

"سترہ رُوپے۔ اِنگلش کٹلری سِٹ سترہ روپے میں۔ سٹین لِس سٹیل انگریزوں کی نئی ایجاد ہے، اُس کا کٹلری سِٹ سترہ روپے میں۔ سترہ ایک، سترہ دو، سترہ"

"اٹھارہ رُوپیہ"

جو آدمی پہلے بولی دے چُکے تھے وُہ بابُو تھے۔ اِس بار جِس نے بولی دی وُہ سردار تھا۔ وُہ بولی دے کر اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے بولی بڑھانے والے سے لڑنے پر آمادہ ہو۔

"اٹھارہ رُوپیہ ایک، اٹھارہ رُوپیہ"

"بیس رُوپیہ"

جِس آدمی نے پہلے سولہ رُوپیہ بولی دی تھی اُس نے بولی بڑھائی اور کپڑوں کو سنوارتا ہُوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بیوپاری نے اُسے غور سے دیکھا اور کہا، "بیس رُوپیہ۔ اِسی لئے ماں باپ کہتے ہیں کہ بیٹا پڑھو لکھو اور آتم وشواش بڑھاؤ۔ بیس رُوپیہ ایک، بیس رُوپیہ دو، بیس رُوپیہ تین۔"

اُس نے ہر بولی دینے والے سے بولی کے رُوپے لئے اور جس نے دو بولیاں دی تھیں اُس سے دو بولیوں کے۔ اُس نے کنٹری سِٹ بند کر کے جھولے میں رکھ لیا اور ایک بولی دینے والے سے مخاطب ہُوا آپ نے ایک بولی دی ہے، یہ لیجئے اپنے رُوپیے اور ایک رُومال کیشن۔ اِس طرح اُس نے ہر بولی دینے والے کو ایک رُومال کیشن دیا اور دو بولیاں دینے والے کو دو رُومال۔ بولیاں دینے والے کیشن پا کر اِترا رہے تھے اور بیوپاری جھولے میں سے نیا مال نکالنے میں مصرُوف تھا۔ اِس بار اُس کے ہاتھ میں کالا نیا بُوٹ اور چمکتا دمکتا بگھونا تھا۔ اُس نے دونوں چیزوں کو نُمایاں طور پر اُوپر اُٹھایا اور گویا ہُوا "بھائیو اور بہنو بُوٹ باٹا کے ہیں اور بگھونا سٹین لس سٹیل کا۔ باٹا اور ٹاٹا کا نام کون نہیں جانتا! اِس سودے کا کیشن، پائلٹ پین ہے۔ میری بولی بیس رُوپیہ۔"

"بائیس رُوپے"

"تیئس رُوپے"

"چوبیس رُوپے" بائیس رُوپے بولی دینے والے نے بولی بڑھائی۔

"پچیس رُوپے"

"چھبیس رُوپے" تیئس رُوپے بولی دینے والے نے بولی بڑھائی۔

بولی جتنی تیزی سے بڑھی تھی اُتنی ہی تیزی سے رُک گئی اور ایک، دو، تین ہو گئی۔ بیوپاری نے جُوتا اور بگھونا جھولے میں رکھ دیا اور اپنے ہاتھ میں پائلٹ پین لئے کھڑا رہا۔ اُس کی ادا سے ظاہر تھا کہ اُسے اُس کے مال کی مطلُوب قیمت نہیں ملی ہے۔ ٹرین پھگواڑہ ریلوے سٹیشن کے یارڈ میں داخل ہو چکی تھی اور جلدی جلدی کانٹا بدل رہی تھی۔ خریدار مطلوب رُوپیہ بیوپاری کے ہاتھ میں پکڑا چکے تھے اور کیشن کے اِنتظار میں تھے۔ جس آدمی نے چھبیس رُوپے بولی دی تھی اُس کے پاس رقم کم پڑی، اُس نے اپنے ساتھی سے اُدھار لے کر دو بولیوں کی رقم پُوری کی اور بیوپاری کو دی۔ ٹرین پلیٹ فارم کی حُدود میں پہنچ گئی اور لگاتار رفتار کھونے لگی بیوپاری نے رُوپیہ جیب میں رکھا اور مال دینا شرُوع کر دیا۔ پہیّوں پر بریکوں کے رگڑنے کی آواز آئی اور ٹرین رُکنے کے آخری مراحل میں داخل ہو گئی۔ ٹرین کے رُکنے تک اُس نے سب گاہکوں کو بھگتا دیا اور نیچے اُترنے کے لئے دروازے میں جا کھڑا ہُوا۔ جب تک خریداروں کو اپنی نادانی سمجھ میں آئی، پھگواڑے سے چڑھنے والی جنتا ایک ریلے کی صُورت ڈبّے میں گُھس رہی تھی۔ ہر گاہک نے ایک ہی مال کی الگ الگ قیمت چکائی تھی۔ جو اُس کاروبار میں تماشائی تھے وہ بھی اپنی رائے دینے لگے تھے۔ میری طرح ہر کوئی بیوپاری کی دیدہ دلیری پر حیران تھا اور تُہمت طراز بھی۔ ایک بُوڑھے دیہاتی نے اُس کی فطرت کا جیسے تجزیہ کیا وہ قابلِ

ذکر ہے، "شہری لوگ، سنار ہوتے ہیں جو اپنی ماں کے زیور تک میں کھوٹ ملا دیتے ہیں۔"

شہریوں کے بارے میں میرے دل میں ایک خیال آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ میری ماں نے مجھے دلی میں لابھ سنگھ کے پاس رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ میری دو بوؤں کا ایک داماد تھا اور ماں کا لاڈلا۔ وہ اپنے رہن سہن پر ناز کرتا تھا اور اجمل خان روڈ کے پاس ریگر پورہ میں رہتا تھا۔ وہ جب چھٹی آتا، ماں سے ضرور ملتا اور اصرار کرتا، "مامی جی! آپ میرے پاس دلی چلئے، آرام کیجئے اور کام کاج کو خیر باد کہیئے!"

ماں اس کے آدر سے خوش ہوتی، اسے سیر، دو سیر گھر کا گھی دیتی اور نادم سی کہتی، "بیٹا یہ میری تقدیر کہاں! تم جب آتے ہو، مل جاتے ہو۔ میرا جی خوش ہو جاتا ہے۔ میرا ٹبّر بڑا ہے دودھ گھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ یہ تھوڑا بچایا ہوا ہے، لے جا، شہر میں یہ سوغات ہے۔"

میرا دل قدرے ٹھہر گیا اور میں نے خود سے کہا، میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ دلی میرے خوابوں کا شہر تھا۔ کورو پانڈو کے ہستنا پور نے کتنے انقلابوں سے گزر کر یہ چھوٹا سا دل ربا نام اپنایا تھا۔ استاد گرچرن سنگھ دلی کو توڑ کر 'دل لی' بولتے تھے اور حضرت ذوق کے حسنِ انتخاب کی داد یوں دیتے تھے۔ استاد نے تنگدستی سہی، بے قدری جھیلی، دلی نہ چھوڑی۔ اسے دلی سے جذباتی لگاؤ تھا۔

ذوق کا یہ شعر گرچرن سنگھ کے بیان کی سند ہے۔

میں نے یہ مانا، دکن میں ہے بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر!

کون جائے ذوق!!! یہ تین الفاظ اس کے ماضی، حال، مستقبل کے نمایندے ہیں جن کے معنی شش جہت کا احاطہ کرتے ہیں۔

دلی کا چپّا چپّا، تاریخی یادگاروں سے بھرا پڑا تھا۔ میرے خیال میں قطب مینار، اشوک کی لاٹھ، فیروز شاہ کا کوٹلہ، لال قلعہ، دیوانِ خاص، دیوانِ عام، چاندنی چوک، سیس گنج ۔۔۔ کے خاکے ابھرتے۔ اِن سے بڑھ کر جمنا کے پیارے کنارے، جو رادھا کرشن کی پریم کتھاؤں کے چشم دید گواہ تھے۔ دلی وقت کا ایسا ورق تھا جہاں تاریخ بولتی سنائی دیتی تھی۔ عدالت یار اِس جملے کو کیسے توڑ توڑ کر گاتا تھا اور کہتا تھا کہ اِسے کئی راگوں میں گایا جا سکتا ہے۔

سکھی ری سکھی چل جمنا کے تیر

مَیں نے غالب مغلوب کو یاد کیا۔ وہ خود سرنوکر ہُوا، جاہل بلّی ماروں میں جیا، بھوکا مرا لیکن دلّی سے رام پور نہ گیا اور اپنے اِس نظریے پر مر مٹا۔

کیا پُوچھے وجُود و عدم اہلِ شوق کا
خُود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

مَیں نے اِس خیال میں تسکین پائی کہ اُس زمین میں آسمانی کشش ہے جِسے دلّی کہتے ہیں۔ میں اُن لوگوں پر رشک کرتا جو دلّی میں رہتے تھے۔ دلّی گھٹی، دلّی بڑھی، دلّی اُجڑی، دلّی بسی اور اُجڑتی بستی رہی اور اپنی ہر صُورت میں نئی جاذبیّت کے ساتھ اُبھرتی رہی۔ اُس کا اُجڑنا اُس کے لئے فالِ نیک تھا۔ تایا جی یہی بات ہُنر کے بارے میں کہتے تھے، پُرانا ہُنر، نئے ہُنر کے لئے ایسے ہے جیسے کویہ میں ریشم کا کیڑا۔ مَیں محمّد تغلق کی بے شعوری پر حیران ہُوا جو دلّی جیسی جنّت کو ٹھکرا کر دکن کی طرف چل پڑا تھا اور بالآخر پچھتایا تھا۔ جانن سنگھ کہتے تھے "تختِ طاؤس پر یہ شعر کندہ ہے۔"

اگر فردوس بر رُوئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

تاریخ کا یہ باب پڑھاتے ہُوئے وہ تاریخ داں کی زبان دُرست کرتے تھے، "یہ شعر لکھا ہُوا نہیں، کندہ ہے"۔ جو کوئی عبارت کو جُوں کی تُوں پڑھ دیتا، وہ اُس کی گوشمالی کرتے اور سمجھاتے "کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا لکھ سکتا ہے لیکن کندہ کرنے کے لئے ہُنر ور چاہئے۔ تختِ طاؤس ہُنروری کا نقشِ کامل ہے اِس لئے اُس پر لکھنے کا تصوّر، خیالِ باطل ہے۔"

جب مجھے احساس ہُوا کہ مَیں دلّی میں ہُنر سیکھنے اور تقدیر بنانے جا رہا ہُوں، جانن سنگھ کی وضاحت نئی سمت اختیار کر گئی۔ شیخ ابراہیم ذوق غریب گھرانے سے تعلّق رکھتا تھا لیکن اپنے ہُنر سے اُستادِ شہ کے مرتبے تک پہنچا تھا۔ میرا گاؤں مجھے حقیر اور بے معنی لگا۔ اُس کی نہ کوئی تاریخی اہمیّت تھی اور نہ تہذیبی۔ کیا فضُول سا نام تھا! ڈڈیانہ کلاں۔ اِس کے لغوی معانی ہیں، مینڈک کی سی اونچی آواز میں ٹراتے والا۔ ہریانہ کے باسی اِس نام کا ٹھٹھا اُڑاتے تھے۔ ڈڈیانہ، ڈڈو کھانا، ڈڈو کھا کے مُکر جانا۔ ڈڈیانہ کے لوگ مینڈک کھا کر گزر بسر کرتے ہیں لیکن مُکرتے ہیں۔

دلّی تو دلّی تھی، اُس کے گرد و نواح تک تاریخ ساز اور داستاں خیز تھے۔ پانی پت کا میدان اپنی پیاس ہی خُون سے بُجھاتا آیا تھا۔ اُن لڑائیوں کا چرچا کرتے ہُوئے دھرم چند کہتے تھے "پانی پت کے میدان کی مٹّی، لہُو کی طرح لال ہے"۔ مَیں اُس خُوں خوار میدان کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہوگیا جیسے وہ کوئی عجُوبہ ہو۔

مَیں اُس وقت انبالہ میں تھا۔ مَیں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے نرالا تجربہ ہوا۔ میری ٹرین کھڑی تھی لیکن مجھے چلتی لگی۔ یہ طلسم اُس وقت ٹوٹا جب ساتھ والے پلیٹ فارم پر سے ٹرین گزر گئی۔ نیوٹن کے لا آف ریلیٹو موشن ایفکٹ کا عملی ثبوت کس قدر حیران کُن تھا۔ ایک آدمی، جس نے نیلی وردی پہن رکھی تھی، کے ہاتھ میں لمبے دستے والی ہتھوڑی تھی۔ وُہ اُسے ٹرین کے ہر پہیئے پر مارتا، آواز سُنتا اور اگلے پہیئے کی جانب بڑھ جاتا۔

"آپ یہ کیا کرتے ہیں؟" مَیں نے ٹرین سے نیچے اُتر کر اُس سے پُوچھا۔

"پہیئے چیک کر رہا ہوں" اُس نے پہیئے پر ہتھوڑی مار کر کہا۔ پہیئے کی آواز کسی قدر باریک اور دیرپا تھی۔

"پہیئے میں کیا چیک کر رہے ہیں؟"

وُہ پہیئے چیک کرتا جارہا تھا اور چلتا جارہا تھا جیسے جلدی میں ہو۔ مَیں نے اُس کے ساتھ چلتے ہُوئے وضاحت چاہی۔

"مَیں چیک کر رہا ہوں مبادا کسی پہیئے میں بال آگیا ہو۔"

اِتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی۔ مَیں اپنے ڈبے کی طرف بھاگا، اپنی جگہ بیٹھا ہی تھا کہ ٹرین رینگنے لگی۔ مَیں اُس کاریگر کے بیان پر غور کرنے لگا، وُہ بال آئے پہیئے کو دُوسرے سے کیسے جدا کرتا ہوگا؟ اچانک ہریانہ کے گنگو کمہار کے آوے کا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وُہ آوے سے بھانڈا نکال کر اُسے ٹنکارتا تھا اور کس یقین سے بُرے کو اچھے سے الگ رکھ دیتا تھا۔ میرے کتنے تجربے دھرم چند کے بیان سے زیادہ عجیب اور سچّے تھے۔ جیسے جیسے ٹرین دِلّی کی طرف بڑھتی گئی، میرے ذہن میں پانی پت اُبھرنے لگا اور ہولے ہولے میرا خروش بننے لگا۔ میری نیند اُڑ گئی تھی۔ مَیں سفر کی تکان کے باوجود تر و تازہ محسُوس کر رہا تھا۔ جس سٹیشن پر ٹرین رُکتی، مَیں اُس کی تختی پڑھنے کی کوشش کرتا، نہ پڑھ سکتا تو پلیٹ فارم پر گھومتے پھرتے کسی فرد سے اُس کا نام پُوچھتا۔ کرنال کے بعد کوروکشیتر آتا تھا اور پھر پانی پت۔ جیسا اُس کے بارے میں کہتے تھے اُسی طرح کوروکشیتر کے بارے میں۔ شرون کمار کی کہانی سناتے ہُوئے، ماں زور دے کر کہتی تھی، "کوروکشیتر کی دھرتی اتنی برموہی ہے کہ اُس کے زیرِ اثر شرون جیسا سپُوت اپنا فرض بھُول گیا تھا اور اپنے اندھے ماں باپ کو جنگل میں بھُوکا پیاسا مرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔"

شرون کمار اور مہابھارت کی کہانی سُن کر مَیں سوچتا تھا، کوروکشیتر کی دھرتی کیسی دھرتی ہے جو انسانوں میں درندوں جیسا جذبہ اُبھارتی ہے اور انھیں لڑنے مرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن ایک بار مجھے ذاتی تجربہ ہُوا، جس کی سچائی کُھلی ہے۔ میری ماں کو بھائیا جی نے بُری طرح مارا پیٹا۔ اُس کا دُکھ بانٹنے کے لئے مَیں نے

چھلکتے ہوئے جذبات سے اُس سے کہا، "ماں، تو کوروکشیتر کی دھرتی کو زرموہی اور دربھاگی کہتی ہے لیکن اُس سے کہیں زیادہ زرموہی اور دربھاگی ہمارے گھر کی دھرتی ہے!"

"تو ٹھیک کہتا ہے، بیٹا"! اُس نے بے ساختہ کہا جیسے میرے خیال سے اُس میں نیا احساس جاگ پڑا ہو۔

بھائیا جی کی بربریت سے متاثر ہو کر تایا جی کہتے، "عدم رواداری ایسی آگ ہے جس کا ایندھن اِنسان ہیں۔ اِس آگ کا پُراسرار اختلاط! مُبتدی اس میں خود جلتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو جلاتا ہے۔"

پانی پت آیا اور میں نے رات کے دُھندلکے میں کھڑکی کے باہر غور سے دیکھا۔ دھرتی کا لال چہرہ کہیں نظر نہ آیا لیکن زخمی اور کلبلاتی رُوحوں کے سایے سے دکھائی دیئے۔ اُن کے ہجوم مجھ پہ لپکتے لیکن ٹرین کی تیزی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے۔ اُس بھیانک منظر سے گھبرا کر میں نے کھڑکی بند کر لی۔ میں ڈرنے لگا، اپنے آپ سے، مستقبل سے۔ میں زندگی کے موافق و ناموافق پہلوؤں پر غور کرتا ہُوا محوِ سفر تھا۔ ڈبے میں کھسر پُسر ہونے لگی اور ہوتے ہوتے دِلّی آئی، دِلّی آئی' کے شور میں بدل گئی۔ جو جاگ رہے تھے وہ اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں کو جگانے لگے اور جن کا کوئی ساتھی نہ تھا وہ شور سن کر اپنے آپ اُٹھنے لگے۔ ہر کوئی سامان سنبھالنے لگا اور باہر جھانکنے لگا۔ میں بھی ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ اُف! میں نہ کھڑکی کھولتا نہ باہر دیکھتا اور نہ میرے خیالوں کا جادو ٹوٹتا! دُھواں اُگلتی فیکٹریاں، مکانوں پہ چڑھے مکان، اِنسان اُگلتی گلیاں، ریلوے لائن کے ساتھ بیٹھے ٹٹّی کرتے عوام، ننگے ستروں کو دیکھتی للچائی نظریں، گھُٹی گھُٹی فضا، میدانوں اور سبزہ زاروں کا نشان تک نہیں تھا۔ ٹھنڈے سجیلے رنگ، اوس لدے کھیت، چہچہاتے پرندے، کلیلیں کرتے مویشی، جو میری سحر کی سرخوشی اور سرمستی ہوتے تھے، میلوں پیچھے رہ گئے تھے۔ میں نے پہلی بار خود کو اکیلا محسوس کیا اور گھبرا کر اندر منہ موڑ لیا لیکن دِلّی کی بدصورتی اور گھناؤنی تصویر میری آنکھوں سے چپک گئی۔ میں آنکھیں مُوند کر اپنے بکھرے خوابوں کو سمیٹنے اور سنوارنے لگا۔ اِتنے میں دِلّی آگئی اور ہر کوئی ٹرین میں سے بھاگنے کے سے انداز میں اُترنے لگا جیسے وہاں مزید بیٹھنے والے کو جان کا خطرہ لاحق تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اُترا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ریل کے ڈبے سے زیادہ بھیڑ تھی۔

باب ۴۲

پہلے کاندھوں پہ صلیبوں کو اُٹھا لو یارو
پھر جہاں چاہو پھرو اہلِ تمنا بن کر (شاطر)

ریگڑھ پورہ کے لئے سالم تانگا مہنگا پڑتا تھا۔ مَیں نے دُوسری تین سواریوں کے ساتھ تانگا سانجھے کرایے پر لیا۔ تانگے والے نے مجھے بڑی سڑک پر اُتار دیا۔ مَیں سامان سر پر اُٹھائے لابھ سنگھ کے گھر پہنچا۔ وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ میری ساری مشکلوں کا حل نکل آیا ہے۔ مَیں سامان سر سے اُتار کر اُس کے پاؤں پڑا۔ مَیں مہک رہا تھا۔ مَیں اُس کے قریب تر کھڑا ہو گیا کیوں کہ میرا تجربہ تھا کہ جب مَیں اُس کے پاؤں پڑتا تھا، وہ مجھے باہوں میں لے کر پیار کرتا تھا۔ وہ انجان اور بے حرکت کھڑا رہا۔ مجھے بُرا لگا اور میرا ایک طرفہ تپاک ٹھنڈا پڑ گیا۔ مَیں اُسے شرمندہ سا دیکھنے لگا۔

"او تُو!" اُس نے آہ بھرنے کے سے انداز میں پُوچھا۔

"جی ہاں، مَیں گیان!" حالاں کہ مَیں رنجیدہ تھا، مَیں یک بیک کھِل اٹھا اور بات میں ہنسنے ہنسانے کا انداز پیدا کیا۔

وہ نہ ہنسا، نہ مُسکرایا، نہ ہی بولا، نہ ہی ایسا اِشارہ کیا جس سے اُس کی اندرُونی حالت کا اندازہ ہوتا۔ مَیں نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے اُس کے جو معنی سمجھے وہ خلافِ ضرورت تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر دِل میں بھی خوش نہ ہُوا تھا ورنہ آنکھیں، دِل کی چُغلی ضرور کھاتیں۔ اُس کی آنکھیں گھنی جھاڑی میں سے جھانکتی بلّی کی سی تھیں۔ سر کے بال چہرے کو ابرُوؤں تک ڈھانکے ہُوئے تھے اور پلکوں کے نیچے داڑھی۔ اُس کی آواز کے سوائے اُس سے بات کرنے کا دوسرا ذریعہ آنکھیں تھیں۔ مَیں نے اُن آنکھوں کو مُسکراتے دیکھا تھا، باتیں کرتے سُنا تھا۔ اُنھیں بالکل خاموش دیکھ کر میری گرم جوشی ٹھنڈی پڑ گئی۔ مجھے گھر کی چابی تھما کر وہ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اُس کی آنکھیں پلکوں کے بیچ سِمٹی رہیں جیسے جمی ہُوئی ہوں۔

گاؤں کی کھُلی فضا سے نکل کر مجھے جالندھر ہی میں گھُٹن لگ رہی تھی، ریگڑھ پورہ میں پُوری گھُٹن تھی اور اُس میں سے حبس لپک رہا تھا۔ میرا مغز بھِنّا گیا اور دم اُلٹنے لگا۔ میری حِسِ لطیف دم توڑنے لگی۔ مَیں نے ناک داب لی اور میں مُنہ سے دم لینے لگا گویا سانس گِننے لگا۔

لابھ سنگھ کا گھر کیا تھا، چھوٹا سا بے روشندان، سر سے کچھ اُونچا دکھنا تھا۔ کولتار کے خالی ڈرم چادروں میں پیٹ کر چھت پر ڈالے ہُوئے تھے جن کو سنبھالنے کے لئے اُن پر بھاری پتھر رکھے ہُوئے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے بر گے کڑیوں اور بالوں کا کام دے رہے تھے۔ چادروں میں چھید تھے۔ وہاں سے کولتار پگھل کر گرتی تھی اور فرش پر کھرنڈوں کی طرح جم جاتی تھی۔ کولتار کے جو تار لٹکتے تھے وہ پتلے کالے ناگوں کی طرح چمکتے تھے۔ دیوار سے لونی جھڑی ہُوئی تھی جو اُس کے پیروں میں تہ در تہ جمی ہُوئی تھی۔ دھوئیں میں لتھڑے ہُوئے مکڑی کے جالے، جٹاؤں کے سے تھے۔ ایک کونے میں لکڑی اور چھپٹی کا ڈھیر تھا، دُوسرے میں اوزاروں کی پیٹی، تیسرے میں چُولہا، ٹوکرا، چند برتن اور چوتھے میں دروازہ تھا جو اندر کو کھلتا تھا۔ کواڑ کی زنجیر نیچے تھی جسے کھول کر لٹکانے کے لئے تختے میں کانٹا لگایا ہُوا تھا۔ دروازہ کھولتے اور بند کرتے ہُوئے چوکھٹ ہلتی اور دیوار سے مٹی گرتی۔ چوکھٹ کو مضبوط رکھنے کے لئے باہیوں اور دیوار کے بیچ فانے مارے ہُوئے تھے۔ چوکھٹ کا جھکاؤ باہر کی طرف تھا۔ کواڑ باہر سے اندر دھکیلنے سے کھلتے تھے اور انھیں کھلا رکھنے کے لئے روک لگانے پڑتے تھے۔ دروازوں کا رنگ اندر سے کالا اور باہر سے خارش زدہ کُتّے کا سا تھا۔ گھر کا سارا فرنیچر لے دے کر مُونج کے بان کا ایک جھلنگا تھا جو پڑوالیوں پر رکھا تھا تاکہ اُس کے نیچے ٹرنک سما سکے۔ جھلنگے کے پائینتی کی طرف بے ترتیب گول کیا ہُوا بستر رکھا تھا۔ کالے ہرے رنگ کی توشک کے ننگندے ٹُوٹے ہُوئے تھے اور رُوئی سرکنے سے گتھل صاف دکھائی دیتے تھے۔ ٹُوٹے ہُوئے بان کے کچھ سرے نیچے لٹکتے تھے۔ وہیں ڈالڈے کا چپٹا چنگیرا، زنگ لگا ڈبہ پڑا تھا اور اُس کے قریب دروازے کی جانب جھاڑو، جو دراصل سفیدی کی پُرانی کوچی تھی۔ سامنے کی دیوار میں سُوراخ تھا جس میں سے سُورج کی روشنی اُجلی لاٹھ سی اندر گھُس رہی تھی۔ اُس میں کروڑوں ذرّے ایسے اُڑتے تھے جیسے گھمّن گھیری میں پھنسے ہوں۔ سامنے اور پیچھے کی دیوار کے ساتھ اُلگنی بندھی تھی جس پر تازہ دُھلا کاچھا، بنیان اور صافہ لٹکتا تھا۔ اُن کپڑوں کا رنگ دیواروں سے ملتا تھا جن کی سفیدی، سیاہی کے نیچے سے جھانکتی تھی۔ اُلگنی کی اُونچائی اِتنی نیچی تھی کہ دائیں سے بائیں جاتے ہُوئے سر جھکانا پڑتا تھا۔ سامنے کی دیوار کے دائیں کونے میں اَن گھڑت شلف تھی جس پر چند آدھی بھری اور خالی شیشیاں رکھی تھیں۔ اُن کی حالت چھت سے زیادہ خراب تھی۔ چھت کی غلاظت دھوئیں کی سیاہی سے ڈھکی ہُوئی تھی اور شیشیوں کی غلاظت شیشے کے پس منظر سے چمکتی تھی۔ اُن پر اُنگلیوں کے نشان، اُتو لگتے تھے۔ کمرے کے درمیان آٹے کا کنستر تھا، جس کی کُنڈی ٹُوٹی ہُوئی تھی۔ لوہے کے چُولہے کے پیچھے توا پڑا تھا اور سامنے میلی کچیلی لون دانی، اُسی طرح کی پرات اور اُس سے بُری چنگیری۔ چھت کی درمیانی کڑی سے بجلی کا بلب باندھا ہُوا تھا اور سوئچ سے تار اور تار سے بلب تک میلا ٹپکتا تھا۔ سیمنٹ کے فرش

پر راستے بنے ہوئے تھے۔ کچھ چھوٹا موٹا سامان اور بھی تھا۔ چپلیں تھیں، جن کی گھسی ہوئی ایڑیوں پر جونکنے بچھوؤں کا گمان ہوتا تھا۔ موزے، ایڑیوں اور پنجوں پر پھٹے ہوئے تھے اور بھبھکتے تھے۔

قارئین! تہذیب و تمدّن کی بنیاد مُسلّمہ اُصولوں پر رکھی گئی ہے اور انسان نے ہر عمل، ہر شے ہر فعل..... کا معیار مقرر کیا ہے۔ اُس لحاظ سے اُس گھر میں کوئی شے اپنے معنی میں پوری اُترتی تھی تو وہ گندگی تھی۔ مجھے اپنی ماں کی یاد آئی جو کوڑے کی بالٹی کو برتن کی طرح صاف کرتی تھی۔

مَیں کھڑا کھڑا تھکتا تو چارپائی پر بیٹھ جاتا، بیٹھا بیٹھا اُکتاتا تو دروازے میں جا کھڑا ہوتا۔ اُٹھتے بیٹھتے اور بیٹھتے اُٹھتے چولیں بولتیں گویا احتجاج کرتیں۔ اُس گندی فضا اور گھناؤنی ہوا سے مجھے متلی ہوتی تھی۔ مَیں اپنی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں جس شے کو دیکھتا، میرے ماضی کی بدنامی اور کڑواہٹ کی پرچھائیں لگتی۔ مَیں سوچنے لگا کہ میری تقدیر یہی ہے تو مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے۔ اُس گھر کا محلِ وقوع کیا بیان کروں؟ گھر سے باہر سڑک اور سڑک سے باہر گھر تھا۔

گاؤں کی لہکتی اور مہکتی فضا سے نکل کر مَیں دِلّی میں اُس چار دیواری میں منتقل ہو گیا جس سے ہمارا طویلا صاف ستھرا اور صحت افزا تھا۔ ٹینوں کی گرمی، کھالوں کی سڑاند، جذبات کی پستی..... اُن سب سے بالاتر غیر واضح مستقبل! میری حالت اُس طائرِ نوپر کی سی تھی جو گھونسلے سے اُڑتے ہی طوفانِ بادِ باراں میں گھر جائے اور پر تڑوا بیٹھے۔ میرا میزبان کام سے تب لوٹا جب میری بھوک کی آگ پیٹ سے بڑھ کر نسوں اور سانسوں تک پھیل گئی۔ زادِ راہ سے بچے کھچے پراٹھے مَیں نے دوپہر سے پہلے ہی کھا لئے تھے۔ بھوک وہ بدکار ذات ہے جو بیکاری اور غریبی میں زیادہ مُنہ زور ہوتی ہے۔ مَیں اور برداشت نہ کر سکا، مَیں نے ہچکی سی لے کر کہا، "جیجاجی! مجھے بھوک لگی ہے۔"

میرا یہ ایک جملہ اُن ہزاروں جملوں کا خلاصہ تھا جنہیں مَیں خود سے کئی بار دُہرا چکا تھا۔ وہ خاموش اور بے حرکت رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ مَیں اُلجھن میں تھا کہ اپنی بات دُہراؤں کہ چُپ رہوں، اُس کی مونچھوں نے آنکھوں کی زبانی کہا، "وہاں ایک ہوٹل ہے۔" اُس کے ساتھ ہی اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اپنی بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ مَیں نے اُدھر دیکھ کر جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ میری جلد بازی کا مقصد یہ تھا کہ اُس کی بات پورے طور پر سمجھنے کے لئے اُس کی طرف دیکھنا لازم تھا۔ مونچھوں کے ساتھ داڑھی بھی ہل رہی تھی، آواز پہلے سے صاف تھی جیسے اُس کی روح نے جسم کی تمام ذلیل قوّتوں سے ساز باز کر کے الفاظ کی صورت نمایاں ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ میرا قیاس درست تھا۔

"وہاں دوّنی کی روٹی اور دال مُفت ملتی ہے آ....." وہ بولتے بولتے رُک گیا جیسے اِن چند لفظوں

نے اُس کی ساری طاقت چھین لی تھی۔ وہ نڈھال سا اُٹھا اور کمزور سا بولا، "چل، تجھے دکھا آتا ہوں"۔ پھر وہ ایسے چُپ ہو گیا جیسے ماتم زدہ لمحات میں ہوتا ہے۔ مَیں اُس کے پیچھے چل پڑا اور اُن یادوں میں کھو گیا جو براہِ راست اُس سے منسوب تھیں۔ وہ ہمارے گھر میں مہمان ہُوا ہے۔ مَیں بھاگ کر اُس کے قدم لیتا ہوں، پاؤں چھوتا ہوں اور راہ نمائی کے سے انداز میں ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ اِس سے پہلے کہ وہ بیٹھک میں قدم رکھے، مَیں دوڑ کر ماں کو خبر کرتا ہوں۔ وہ ہنستی پیشانی سے اُس کی بلائیں لیتی ہے اور صندوق میں سے ان لگ بستر نکالتی ہے۔ نئے کپڑوں کی خاص خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی ہے۔ مَیں ماں کے سلیقے کی داد دیتا ہوں۔ پلنگ پر بستر بچھاتا ہوں اور چادر چاروں کونوں سے باری باری پکڑ کر کھینچتا ہوں اور پھر ہاتھ پھیر کر سلوٹیں نکالتا ہوں۔ ماں خوشی سے دمکتی ہے جیسے لابھ سنگھ کا آنا مبارک فال ہو۔ اُس کے آدرستمان میں ایک میلان ہے جس کا اِحساس اُسے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ تاکہ وہ حسبِ خواہش آرام سے بیٹھ سکے، لیٹ سکے، ماں اُسے گاؤ تکیے کے ساتھ سرہانا بھی دیتی ہے۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ کر سب کی خیریت و عافیت پوچھتی ہے اور کہتی ہے، بیٹا، کبھی کبھار اپنی خیریت کا خط لکھتے رہا کرو، دِل تیری طرف لگا رہتا ہے۔ رِشتوں کی فسوں کاری! اُس کی بھاری بھدّی اور چرچری آواز مجھے سُریلی لگتی ہے۔ ناک سے بُجھ سے نکالنا، بال اکھاڑنا اور ٹٹّے کھجلانا اُس کی بے ہُودہ اور بے شرم عادت ہے جسے مَیں غلیظ نہیں سمجھتا ہوں۔ وہ جنگل جانے کے لئے تیار ہے، مَیں پانی کا گڑوا لئے کھڑا ہوں عین ذاتی نوکر کی طرح۔ کہیں مناسب جگہ دیکھ کر مَیں گڑوا رکھتا ہوں اور دُور جا کھڑا ہوتا ہوں، اُس کے اُٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ وہ ہاتھ دھو کر گڑوا وہیں رہنے دیتا ہے۔ مَیں گندگی سے آنکھیں بچاتا، کراہت سے لڑتا گڑوا اُٹھاتا ہوں، مانجتا ہوں اور گھر لوٹ کر اُس کے نہانے کا اِنتظام کرتا ہوں۔ وہ ناک میں پانی چڑھا چڑھا کر ناک سِنکتا ہے، غرغر کر کے غرارے کرتا ہے، جسے دیکھنے سے قے آتی ہے۔ وہ نہاتا ہے اور گیلا کاچھا وہیں رہنے دیتا ہے۔ کاچھے میں تن میل (وہ میل جو دھاگے کے اندرونی حصّے تک پُہنچ چکی ہو) پڑی ہُوئی ہے۔ مَیں اُسے صابُن لگا کر تھاپلی سے کُوٹتا ہوں، نیل لگاتا ہوں۔ تاکہ نیل اِکسار لگے، اُسے دبا کر نچوڑتا ہوں، جھٹکتا ہوں، دھوپ میں پھیلاتا ہوں لیکن کوئی خاص فرق نہیں دیکھتا ہوں۔ ماں کھانا پروستی ہے۔ وہ دال اور سبزی کی کٹوریوں کے ساتھ نرے گھی کی کٹوری بھی رکھتی ہے۔ لابھ سنگھ کھانا کھاتا ہے اور مَیں اُسے پنکھا جھلتا ہوں۔ وہ بگھاری ہُوئی دال اور سبزی میں نرا گھی ڈالتا ہے اور چپڑی ہُوئی روٹی کو دوبارہ چپڑتا ہے۔ اِس کے باوجود گھی بچ رہتا ہے جسے وہ پنڈلیوں اور داڑھی پر مل لیتا ہے۔ وہ تھالی میں ہاتھ دھونے لگتا ہے، مَیں اُسے چلمچی کی جانب راغب کرتا ہوں۔ وہ میری بات پر دھیان نہیں دیتا، تھالی ہی میں ہاتھ دھوتا ہے اور کُلّی بھی کرتا ہے۔ اُس کی مونچھیں، داڑھی میں ٹپک رہی ہیں۔ وہ اُنھیں ہاتھ مار مار کر صاف کرتا ہے اور چھینٹے اُڑاتا ہے۔ مَیں اُس کے سامنے کھڑا ہوں، ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ وہ بستر پہ لیٹتا ہے اور مَیں اُس

کی ٹانگیں دباتا ہوں۔ وہ غنودگی کے عالم میں کہتا ہے، "تو میٹرک پاس کرکے دلّی آجانا۔ میرا بڑا صاحب، انگریز ہے اور میرا دوست ہے۔ میں تجھے انڈین آکسیجن میں انجنیئر رکھوادوں گا۔"

وہ تقریباً سو رہا ہے۔ ماں دودھ کا گلاس رومال میں لپیٹ کر لائی ہے اور اُسے اپنی میٹھی آواز میں پکارتی ہے، "لابھ سیاں! سو گئے کیا؟"

"نہیں مامی جی!"

وہ ہڑبڑا کر اُٹھتا ہے، اُس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیتا ہے اور گرم دودھ، سڑپے مارتا ہُوا پیتا ہے۔ بھاری بھدی اور اڑپ سڑپ آواز سُن کر ٹائیگر اپنے اگلے پیروں پر سے سر اُٹھاتا ہے اور اُسے بھونکتا ہے۔ میں اُسے ڈانٹتا ہوں اور چُپ کرواتا ہوں۔ لابھ سنگھ دودھ پی کر گلاس مجھے تھماتا ہے، مونچھیں ہونٹوں میں دبا دبا کر اُن میں پھنسی ہوئی ملائی چوستا ہے، مونچھوں پر پھونکیں مارتا ہے اور اُنھیں ہلا ہلا کر پھوک اُڑاتا ہے۔ ماں گلاس لینے کے لئے آتی ہے، وہ اُس سے کہتا ہے، "مامی جی، رومال بہت اچھا ہے! لگتا ہے، آپ کے ہاتھ کا بنا ہُوا ہے!"

ہاں بیٹا! تجھے پسند ہے تو رکھ لے۔ ماں اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے اور گلاس لے کر چلی جاتی ہے۔

اُس دلدری کے گھناؤنے طور طریقے اور بھنکتی صورت مجھے اچھی لگتی ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اُس کی باتیں میرے مستقبل کی ضمانت ہیں۔

"وہ سامنے ہوٹل ہے۔ تو کھانا کھالے، میں آتا ہوں۔" میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا۔ میں چونک پڑا۔

لکڑی کے پرانے تختوں کی ہلڑ جلڑ اوٹ کا نام 'ہوٹل تاج محل' تھا۔ رسوئی سامنے اور کھانا پروسنے کا انتظام پیچھے تھا۔ باہر پکوان کی خوشبو اور اندر میل کی بدبو تھی۔ کچّا گیلا فرش، ڈھیلا ڈھالا فرنیچر، چب کھڑبے بھانڈے، ادھ ننگے بیرے، ایک کراہت در کراہت تھی جو کھانا سامنے آنے پر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا ہی تھا کہ ایک منڈے نے پانی کے گلاس تھپ سے میز پر پٹخے۔ اُن میں سے پانی کے قطرے اُڑے، کچھ میز پر گرے اور کچھ میری تھالی میں۔ وہ پانچ اُنگلیوں میں چار گلاس اُٹھا کر لایا تھا۔ اُس نے گلاسوں میں سے اُنگلیاں نکالیں، ناخنوں سے غلاظت ٹپک رہی تھی۔

میری جگہ کوا ہوتا تو اُس گندگی کو دیکھ کر خوشی سے پھُدکتا۔ لیکن میں اُس گندگی سے گھبرا گیا، قے خیز کیفیت پر قابو پاکر اُسے کھایا اور باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ میرا میزبان میرے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی گھناؤنی

ہیئت، مجھ پر اِس قدر مسلّط تھی کہ مَیں جس چیز کو دیکھتا تھا اُسی کا غلیظ سایہ نظر آتا تھا۔ یہ وُہ مرحلہ تھا جب اُس نے مجھ سے میرے دِلّی آنے کا سبب پوچھا۔ میرے یاس گزیدہ دل میں اُمید کی کرن پھوٹ پڑی جو ابھی تک نہ جانے کہاں گھٹی پڑی تھی اور مجھے بوکھلائے ہُوئے تھی۔ مَیں نے خُوشی سے جگمگا کر اُسے اپنے میٹرک پاس کرنے کی خبر سُنائی اور ساتھ ہی اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔

ارے پاگل لڑکے! آنے سے پہلے خط لکھ کر پُوچھ لیتے۔ جس انگریز صاحب سے میری دوستی تھی، وُہ ریٹائر ہو گیا ہے اور جو نیا آیا ہے، ہندوستانی ہے۔ بڑا اکڑفوں ہے، حرامی! میرا صاحب ہوتا، مَیں تجھے سویرے کام پر لگا دیتا، اب مُشکل ہے۔" وُہ جلدی جلدی بولا کرتا تھا اور کئی بار اُس کی بات کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اُس نے جو کہا، ایسے نپے تُلے لہجے میں کہا کہ وُہ ہر لفظ کو دُہراتا جان پڑا۔

"کسی دُوسرے کام کا انتظام کر دیجئے؟" مَیں نے اِلتماس کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"مشکل بات ہے! دیکھوں گا، وعدہ نہیں کرتا۔" اُس نے اِنکار نُما اِقرار کیا۔

"ایسی بات ہے تو میرا گزارہ کیسے ہوگا؟" مَیں نے دَرپردہ اپنی مالی حالت کی طرف اِشارہ کیا۔

"میرے ساتھ رہنا ہے تو آدھا کرایہ دینا ہوگا اور اپنا دُوسرا خرچ اُٹھانا ہوگا۔"

اُس نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور گھر واپس آتے ہُوئے مجھے صابن اور تیل خریدنے کو کہا۔ اُس کے اُس بے وزن رویے کی وجہ حیرت انگیز ہے! مَیں اُس کے ساتھ رہنے کا قصد نہ کرتا تو اِس کا اِنکشاف ناممکن ہوتا۔ وُہ اِس قدر صفائی پسند تھا کہ کسی دُوسرے کا اِستعمال کیا ہُوا صابن اور تیل وغیرہ اِستعمال نہ کر سکتا تھا۔ وُہ سامان خرید کر میری جیب میں جو بچا وُہ بھان تھا۔ اُس کی کمینی بات سے مجھے گھِن ہُوئی، ایسی گھِن جو آنکھوں کے سامنے پڑی گندگی سے ہوتی ہے۔ ہم جس راستے سے گھر لوٹے وُہ پہلے سے لمبا اور اندھیرا تھا۔ اُس نے کمرے کے باہر چارپائی پر اور مَیں نے نیچے سڑک پر بستر ا بچھایا۔ سونے سے پہلے اُس نے کپڑے اُتارے، مَیں نے پہلی بار ان میں چھپی ہُوئی ڈراؤنی شکل دیکھی۔ ہتھیلیوں اور تلوں کو چھوڑ کر اُس کے بدن پر چنڈال بالوں جیسے بال تھے۔ ایڑیاں سُوکھے ہُوئے جوہڑ کی طرح شق تھیں۔ ناخنوں کے نیچے کا ماس ناخنوں سے بڑھا ہُوا تھا، جس پر ناخن چیتھڑوں پر چیتھڑوں کے پیوند لگتے تھے۔ وُہ شخص، اِنسان نہیں! غمِ روزگار کا سدھایا ہُوا جھموُرا تھا۔

اجنبی فضا، بھٹکتا ذہن، سُلگتی نفرت، مَیں لوہار کی بھٹی میں اُس لوہے کی طرح تھا جو ہتھوڑے کی چوٹوں اور اپنی آخری شکل سے بے خبر ہو۔

وُہ رات ماحول ہی کی طرح سنگین تھی۔ مریضانہ اندیشے مجھے رات بھر جھنجھوڑتے رہے۔ مَیں سویرے بیدار ہُوا تو میرے بدن پر پتھروں کے گہرے نِشان تھے۔ دِلّی نے میرا جیسا خیر مقدم کیا تھا، سنگ انداز، سنگ سار

کیے جانے والے کا کرتا ہے۔ مَیں نے چاہا کہ گھر کے کام کاج میں لابھ سنگھ کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میں اُس اثر کو توڑ نہ سکا جو اُس کی بے رُخی سے مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ وُہ کام پر چلا گیا، مَیں نے اَز سرِ نَو گھر کا جائزہ لیا، ہر چیز میرا مُنہ چِڑاتی ہوئی نظر آئی۔ وُہ اکثر جتلاتا تھا، "میرا گھر، اجمل خاں روڈ سے پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ ہمارے علاقے کے ترکھان ٹاپروں اَور بارکوں میں رہتے ہیں۔ مَیں ڈیوٹی کرتا ہُوں اَور وُہ دِہاڑی۔"

اجمل خان روڈ کا ٹھاٹھ باٹ مشہور ہے، اُس کا ریگڑھ پُورہ سے کیا رِشتہ بنتا ہے؟ وُہی جو خوبصورت مکان کا بدرَو سے۔ مَیں نے اپنی بے چارگی میں اُس غریبی کی بے کسی کا اندازہ کیا جو دُوسرے ترکھانوں کی زِندگی تھی۔ میری رُوح کانپ گئی۔ اُس نفسیاتی صدمے کا اثر! مَیں نے اُس گھر کو دوبارہ دیکھا، وُہ مجھے بُرا نہ لگا۔

فطرت کا بُلاوا آیا۔ مَیں ڈبّے میں پانی لے کر بیتُ الخلا گیا۔ وہاں دوہری بدبُو اَور حاجت مندوں کی دوہری قطار تھی۔ اُنھوں نے اپنے سر کپڑوں میں ایسے لپیٹ رکھے تھے جیسے ریگستان کے سفر پر آمادہ ہوں۔ قطار مینڈک کی طرح پُھدک کر آگے بڑھتی اَور رُک جاتی۔ ڈبّے کے پیندے میں چھید تھا، اُس کے اندر پانی گھٹنے لگا اَور میرے اندر دباؤ بڑھنے۔ میری باری تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ میری بے قراری کا چمتکار! بدبُو نابُود ہو گئی مجھے اُن کاہلوں پر غُصّہ آیا جو وہاں اندر آرام سے بیٹھے تھے۔ مجھ سے اگلا آدمی میری ہی طرح مُضطرب تھا۔ وُہ آنکھیں بھینچتا ہُوا گُھٹی گُھٹی آواز میں کہتا، "حرام زادے! اندر یُوں بیٹھے ہیں جیسے آرام گاہ میں۔" میری نظروں کے سامنے دُھند چھانے لگی اَور کانوں میں 'ساں ساں' کی آواز آنے لگی۔ میرا جسم ناکارہ پڑنے لگا اَور ڈبّا ہاتھ سے پھسلنے لگا۔ مَیں بار بار گرفت مضبوط کرتا اَور اُسے سنبھالتا۔ مَیں نے کئی بار سوچا کہ سامنے نالی پر بیٹھ جاؤں لیکن حوصلہ نہ پڑا۔ میری باری آنے تک میری سُدھ بُدھ جانے کے قریب تھی۔ بے چینی اِنتہا پر پُہنچ کر کپکپی بن گئی تھی اَور اُنگلیاں ناڑے سے اُلجھ رہی تھیں۔ مَیں پیروں پر ڈھے پڑنے کے سے انداز میں بیٹھا۔ جُوں ہی میرا بوجھ ہلکا ہُوا، میرا مُردہ اِحساس زِندہ ہو گیا۔ وُہ مکروہ جگہ واقعی آرام گاہ تھی۔ مَیں شہر میں نہ آتا تو اِس دو دھارے تجربے سے محرُوم رہتا۔ مجھے ڈبّے کی ضرورت پڑی، اُس میں دو چُلّو سے زیادہ پانی نہ تھا۔ مَیں نے جیسے اپنی گندگی دھوئی اُس سے گندگھسنی اچھی تھی۔ کراہت سے میرے گلے میں پھانس پڑ گئی۔ مجھے اُن حالات سے پہلے ہی نفرت تھی، اب خُود سے بھی نفرت ہو گئی۔ مَیں اِس صُورتِ حال سے کئی بار گزرا تھا، اپنی بُزدلی کے لمحوں میں، بے کسی کے لمحوں میں، نااُمیدی کے لمحوں میں، ناکامی کے لمحوں میں۔ مَیں اپنی نفرت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھ پر ظاہر ہُوا کہ میری نفرت میری بدبختی ہے۔ چُوں کہ میری بدبختی مُسلسل تھی اِس لیے میری تعمیر میں اِس کا حِصّہ خُوبی سے زیادہ تھا۔

میری ہی تعمیر میں کیوں؟ یہ ہر کسی کی تعمیر میں سرگرم ہے۔ زِندگی کا اہم اَور بُنیادی جُزو ہے اِس

لئے آدمی اسے فنا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی کے بل بوتے پر آدمی نے اپنی تہذیب و تمدّن کی بنیاد رکھی اور اپنے کیسے، کتنے آفاقی انداز دکھائے۔ ایک انداز، اندازِ محبّت ہے جو اس نے اپنی ریاکاری سے سازباز کر کے رُوحانیت کے پردے میں دکھایا اور اس کی آڑ میں تمام حقیقت شناس جبلّتوں کا صفایا کر دیا۔

یہ تھی میرے خوابوں کے شہر سے میری آمنے سامنے مُلاقات! گندگی میں کیڑوں کی طرح رینگتے ہُوئے اِنسان، بارِ روزگار سے دبے ہُوئے اِنسان، اِحتیاج کے توڑے مروڑے اِنسان، اپنی کم مایگی سے وَحشت زدہ اِنسان، جن کا مقصودِ حیات ایک ہی تھا، خُود کو زندہ رکھنا۔ اُن کی زندگی کے دو مفہوم تھے، روٹی اور کام۔ گندگی میں رہتے رہتے اُن کا اِحساس اس قدر پس چکا تھا کہ وہ اپنی کم اصلی کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اِنسان اشیائے ضرورت کے گڑھے تھے جو اپنی تاریکی اور فرسودگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔

رنگین خواب صاف سادہ کپڑوں میں بُنے جاسکتے ہیں، اُمید افزا جذبات تازہ کھُلی فضا میں پیدا ہوسکتے ہیں، لیکن مسوستے فاقوں، آلودہ دِلوں اور بیمار رُوحوں کے ساتھ آزاری، کم ہمتی اور نفی پلتی ہے۔ آدمی نظمِ حیات کا حصّہ ہو کر بھی اس سے الگ ہے۔ کیوں کہ یہی ایک ایسا جاندار ہے جو اپنی نسل کے علاوہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی اُپج میں ہر شے اپنے خلقی کمال کو پہنچتی ہے اور وہی اس کی زندگی کا جمال ہے۔ چوں کہ آدمی کی زندگی کی خُوبی تحریکِ تخلیق سے عبارت ہے اس لئے جس کے تخلیقی رُجحان کا نشوونما لاچار ہے اُس کی زندگی، نابکار ہے۔ ایسے فرد کو انسان کہنا غلطی تو ہے، جُرم بھی ہے۔

قانونِ فطرت ہے کہ گندگی کا کیڑا گندگی سے نکال کر پھول پر رکھ دیا جائے تو وہ اس کی حیات آفریں لطافت میں مر جاتا ہے، پھول کا رس پینے والے بھونرے کا مرگ آسا گندگی میں کیا حال ہوگا؟ اس طرح حقیقتِ آدم ہے! اچانک تغیّر سے اِنسان مُستفید نہیں ہوسکتا، یہ اُسے ہڑپ کر سکتا ہے۔ کر جاتا ہے، مَیں نہیں کہہ رہا ہُوں! اس لئے کہ آدمی صُورت گرِ حیات ہے اور تعمیرِ نفس کی اِستعداد رکھتا ہے۔ کوئی کسی نقطۂ نظر کا حامی ہو، میرا یقین ہے کہ عملِ تغیّر میں آدمی کے بننے سے بگڑنے کے اِمکان زیادہ ہیں۔

مَیں نل سے پانی بھر کر لایا اور لابھ سنگھ کی طرح سڑک میں کھڑا ہو کر نہایا۔ مَیں پہلے ہی اڑوسیوں پڑوسیوں کے تجسّس کا مرکز تھا، اُن کی نظروں کے تندوے (اوکٹوپس) مجھے سمیٹنے لگے جیسے میری ظاہری عُریانی اُن کی تسلّی کے لئے کافی نہیں تھی اور وہ اُسے ہڈیوں تک دیکھنا چاہتے تھے۔

دِلّی اور دِلّی والے ابرق کے اُن ٹکڑوں کی طرح تھے جو ندی کی ریت میں بہہ کر آتے ہیں اور کرنوں کی زد میں آکر ہیروں سے چمکتے ہیں۔ میں اُنھیں دیکھ کر بے تاب ہو جاتا تھا، آنکھوں سے اُن کے مقام کا تعیّن کر کے اُن تک پہنچتا تھا اور ابرق دیکھ کر مایوس ہو جاتا تھا۔ راوی کا بیان ہے، "ہیرے

ایسے ہی ریت میں بہہ کر آتے ہیں لیکن قسمت والے کو ملتے ہیں۔"

میری جیب جالندھری میں مجھے ڈرانے لگی تھی، دِلّی میں اُس سے مَیں ڈرنے لگا۔ اُسے یُوں دیکھنے لگا جیسے وُہ خوف ناک اژدہے کا بِل ہو۔ مَیں کمرے کو تالا لگانے کے لئے تالا ڈھونڈھ رہا تھا کہ میری آنکھیں چنگیری میں رکھی میلی کچیلی گانٹھ پر ٹھہر گئیں اور اُسے سُونگھنے کے سے انداز میں دیکھنے لگیں۔ اُس گندی چیز میں سے روٹی کی خوشبو اُٹھی اور میرے نتھنوں سے لپٹ گئی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اُس گانٹھ کو کھولا" آدھی روٹی کا گول کیا ہوا ٹکڑا پایا، جس میں چمچہ بھر سبزی بھی تھی۔ وُہ وہاں کیوں اور کس کے لئے تھی؟ اِس پر غور نہ کرتے ہُوئے مَیں نے وُہ روٹی کھا لی۔ اُس نے میری بھوک ایسے بھڑکا دی جیسے مدّھم آگ پر تیل چھڑک دیا جائے۔ مَیں نے جلدی سے، گلاس بھر پانی اندر انڈیلا اور اپنی ادھوری تسلّی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ مَیں نے محسُوس کیا کہ اِن در و دیوار سے میرا وُہی رشتہ ہے جو کسی بدشکل انسان کا اپنے اعضا سے ہوتا ہے۔

مَیں نے برتن مانج کر ٹوکرے میں رکھے، چُولہا کھسکا کر دیوار سے لگایا، الگنی کھول کر سامنے کی دیوار سے متوازی باندھی، لٹکتے ہُوئے جالے جھاڑے، لُونی اُٹھا کر باہر پھینکی، کولتار کے کھرنڈ کھرچے، چارپائی کی ادوان کسی، بستر ٹھیک سے تہ کر کے رکھا، شلف اور شیشیاں صاف کر کے جھاڑو دی۔ اُس تھوڑی سی ردّوبدل سے وُہ کمرہ زیادہ کُشادہ اور قابلِ قبُول دکھائی دیا۔ مَیں نے اپنے کام کو نکتہ چیں نگاہوں سے دیکھا۔ اُس گندگی میں کتنی صفائی اور چھپی ہُوئی تھی۔

باب ۴۳

دُنیا سے نرالے ہیں قرینے اپنے ، صدیوں میں گزرتے ہیں مہینے اپنے
ناکام تمنّاؤں کے مدفن جیسے ، دیکھے تو کوئی کھود کے سینے اپنے (شاطر)

مَیں نے دروازے پر تالا لگایا اور تلاشِ معاش میں نکل پڑا۔ بڑی سڑک پر پُہنچ کر مَیں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں؟ ہر کوئی جدھر جا رہا تھا مصرُوف لگتا تھا۔ کوئی میری طرف دیکھتا، میرا دِل کہتا' یہی تیرا بہی خواہ ہے! مجھے حوصلہ ہوتا لیکن وُہ میرے پاس سے بے تعلّق گزرتا تو میرا دِل مسوس جاتا۔ میری اُمید آرائی بھوکے کُتّے کی سی تھی۔ وُہ غریب کسی کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے اور اُسے اپنی طرف متوجہ نہ پاکر گردن ڈال

کر آگے چل دیتا ہے۔ ایسے خوب صورت مکان، جن کے پیش والان کی قیمت ہمارے گھر سے کئی درجہ زیادہ ہوگی! ایسی سجیلی دکانیں، جن کے سائن بورڈ کی مالیت سے ہماری دکان جیسی کئی دکانیں بنائی جاسکیں! دِلّی میں کتنی دولت تھی! لیکن اُس افراط میں، مَیں پیٹ بھر روٹی کا محتاج تھا۔ مَیں وہاں سے آیا تھا جہاں سے ہر کوئی آتا ہے لیکن وہاں جا رہا تھا جہاں مجھے اکیلے جانا تھا۔ چوں کہ مجھے معلوم نہ تھا، مَیں نالاں تھا، متزلزل تھا، محروم تھا...... وُہ سب کچھ تھا جس کا رشتہ غریبی، بیکاری، بیکسی...... سے ہے۔ مَیں ست نگر سے ہوتا ہوا سلیوان سکول کے سامنے سے گزر کر پچکوئیاں روڈ پہنچا جسے چوڑا اور پکا کیا جا رہا تھا۔ عورتیں اور مرد اکٹھے کام کر رہے تھے۔ کوئی کولتار کے ڈرم توڑتا، کوئی بھٹی جھونکتا، کوئی ٹرف میں بجری بھرتا، کوئی مکسر کے برتن میں پگھلی ہوئی کولتار، کوئی پھوارے سے کولتار چھڑکتا، کوئی مِلائی ہوئی بجری پنجے سے بچھاتا، کوئی پرانی سڑک کے کنارے برش سے رگڑ کر صاف کرتا اور کوئی صاف کی ہوئی مٹی اُٹھاتا۔ روڈ رولر کی رفتار سے قدم مِلاتی ہوئی عورتیں چل رہی تھیں، جنھوں نے پہیّوں پر بھیگی بوریوں کے بھاہے پکڑے ہوئے تھے۔ ہر کوئی کولتار کی بدبو اور سیاہی میں لتھڑا ہُوا تھا۔ سحر اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھی لیکن گرمی سے جھلاہٹ اور بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ سورج میرے گاؤں کے سورج سے زیادہ غضب ناک تھا جیسے دِلّی والوں کے تلخ مزاج سے راست متاثر ہو۔ مزدوروں میں کوئی ننگے پاؤں تھا اور کوئی پاؤں پر ٹاٹ باندھے ہوئے۔ جو کوئی ان دو زمروں میں نہ آتا تھا اُس نے پرانا فوجی بوٹ پہنا ہُوا تھا۔ وہاں ہر کوئی روڈ رولر کی بھک بھک سے مرعوب تھا۔ وُہ خوف ناک شے حکایات کے دیو کی سی تھی جس کا مُنہ بھرنے کے لیے شہر کا ہر شہری کچھ نہ کچھ بہم پہنچاتا ہے۔ ظاہرا طور پر ہر کوئی اپنے عمل میں آزاد لگتا تھا لیکن در پردہ روڈ رولر کی حرکت کا قیدی تھا۔

وہاں ایک آدمی تھا جو اُس ہنگامے سے الگ ہو کر بھی اُسی کا حصّہ تھا بلکہ اُس ہنگامے کا دُہی بانی تھا۔ وُہ سر پر چھتری تانے ایک جگہ کھڑا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر کسی کا تعاقب کر رہا تھا۔ وُہ جسے کاہل اور نااہل سمجھتا، اُس کی نہایت شدّت سے سرزنش کرتا۔ پھاوڑوں کی رگڑ دگڑ، بجری کی چرچراوں روڈ رولر کی بھک بھک، اِنسانی آوازوں کا شور...... اُس آدمی کی ایک جھڑکی میں ڈوب جاتا۔ اُس جھڑکی کا ردعمل عجیب تھا! ہر حرکت سہم کر سکڑتی اور سکڑ کر اُبھرتی اور پھر اپنی تیزی کی اِنتہا کو پہنچ جاتی اور بہت دیر تک بدستور رہتی۔ اُس آدمی کا لقب جمعدار تھا۔ وُہ مزدوروں کو تیز چلتے اور بھاگتے دیکھ کر ایسے خُوش ہوتا تھا جیسے اُسے ہر سست رفتار شے سے نفرت ہو۔ مَیں اُس سے تھوڑی دُور کھڑا خُوں چکاں عقدوں، دِل فگار ضرورتوں اِنسانی ہمتوں کا تجزیہ کرتا ہُوا سوچنے لگا، کتنا اچھا ہو جو یہ کام مجھے مل جائے! مَیں اپنی اُمید سے نااُمید ہو کر اُسے بھولنے ہی والا تھا کہ اُس نے میرا حوصلہ بندھایا۔ مَیں نے پاس سے گزرتے ہوئے مزدور کو روک لیا اور

اُس سے کام کے بارے میں بات کرنے لگا۔ میری بات ادھوری ہی تھی کہ جمعدار نے دیکھ لیا اور اُسے آوارہ کُتّے کی طرح جھڑکا۔ وہ چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی جمعدار نے مجھے ہاتھ اور سر کے اِشارے سے آگے بُلایا۔ میرا اُس سے کوئی تعلّق نہ تھا لیکن مَیں ڈر گیا اور ہچکچاتا ہچکچاتا، رُکتا رُکتا آگے بڑھا اور قریب پُہنچا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور غُصّے سے کہا، ”سِکھا، کٹھ پتلیوں کا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟ چل اپنی راہ پکڑ۔ تیرا مُنہ بندر کے چُوتڑوں کی طرح لال ہے“۔

اُس نے میرا ہاتھ جھٹک کر چھوڑا، بازو پھیلا کر مجھے پرے دھکیلا اور اپنے کام میں مصرُوف ہو گیا۔

مجھے اُس سے جو ڈر لگ رہا تھا، جاتا رہا۔ مَیں وہیں کھڑا رہا اور اُس کی طنز و ملامت پر غور کرتا رہا۔ وہاں جو ہوتا تھا وہ کٹھ پتلیوں ہی کا تماشا تھا۔ جو آدمی بے سوچے سمجھے کام کریں، کِسی کے اِشارے پر ناچیں، وہ کٹھ پتلیاں ہیں۔ میرا مُنہ سردی کی نرم دُھوپ میں تمتمانے لگتا تھا اور وہ تو تھی گرمی کی چلچلاتی دُھوپ۔ میرے بُزدِل نے میری پیٹھ تھپکی، چل کہیں گھنی چھاؤں میں بیٹھ! لیکن خالی جیب کے لسلسے نے میرے تلوے پکڑ لیے اور میرا پیٹ پیرِ تسمہ پا کی طرح مجھ پر سوار ہو گیا۔ اُس نے مجھے جھٹکا دے کر جتلایا، ”مجھے روٹی چاہیے! مَیں بھوکا ہُوں“۔ اُس کی شِکایت پر دھیان نہ دیتے ہُوئے، مَیں وہاں سے چل پڑا۔ مجھے بے پروا پا کر اُس نے میرے گلے پر گرفت کڑی کر دی۔ مَیں گرتے گرتے سنبھلا، رُکا تو اُس نے دباؤ گھٹایا۔ مَیں نے اپنے جابر ساتھی کے رویے پر غور کیا اور اُسے دُرست پایا۔ آدھی روٹی پر کوئی پُورا دِن کیسے گزار سکتا ہے! پُوری روٹی حاصل کرنے کا ایک ہی وسیلہ تھا، کام۔ میرے ساتھی نے میرے خیال کی تایید کی اور مجھے سمجھایا، ”مجھے روٹی کی ضرورت ہے اور تجھے آدھے کرایے کی اور یہ مسئلہ تیرے کام کرنے ہی سے حل ہو گا“۔ مَیں نے اُس کی خود غرضی میں ہمدردی دیکھی اور خاموشی سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے مجھے وقت پر یہ بھی یاد دلایا، ”تو کل ہی سے مکان کے کرایے میں آدھے کا حصّہ دار ہے“۔ مَیں نے سوچا کہ مَیں نے کرایہ نہ دیا تو کیا ہو گا؟ مجھے وہیں جواب مِل گیا اور مَیں دہل گیا۔

باغوں اور کھیتوں کی بات الگ تھی۔ مَیں وہاں آرام سے رہتا تھا۔ کیوں کہ وہاں بے گھری کا اِحساس ناپید تھا۔ کٹائی پر مَیں ضد کر کے کھیتوں میں سوتا تھا اور اُس تنہائی کو اپنے گیتوں سے بساتا تھا۔ میری لَے، رات کے سنگیت سے ہم آہنگ ہو کر سوز و سازِ فطرت لگتی تھی۔ مکھیوں کے چھتے سے بھنبھناتے شہر میں بے گھری اور بے کاری! میرے کلیجے میں دراڑ پڑ گئی اور کام کی اہمیّت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ کام سے میری زندگی کی نغمگی تھی، رگوں کی گرمی تھی اور سانسوں کی روانی۔ ایک وہی عمل تھا جو میری حیات کے فرضی خاکے میں حُسنِ یقیں کے رنگ اُبھار سکتا تھا۔ مَیں نے اس عمل کے کئی چلن دیکھے تھے، ایک چلن تھا غلامانہ۔ میرے بھایا جی مزدوروں کو بے حسی سے گالیاں دیتے تھے، بے رحمی سے لاتیں جماتے تھے اور وہ بے چارے اُف نہ کرتے تھے۔

وہ جس کو کام سے نکالنے کی دھمکی دیتے، وہ غریب کس عاجزی سے کہتا، "سردار جی، پیٹھ کی مار مارنا، پیٹ کی مار نہ مارنا!"

مَیں جمعدار کی جانب سَرکا اور سماجت سے کہا، "جمعدار جی، مجھے کام پر رکھ لیجئے!"

میری گزارش کا ردِ عمل ناقابلِ مصالحت تھا۔ وہ میری ہنسی اُڑاتا ہُوا مزدوروں سے بولا "ہے! سُنا تُم نے؟ اِسے کام چاہیئے۔" وہ رُک رُک کر بولا، مانا ہر لفظ چبا چبا کر اُگلا۔

کتنی آنکھیں ایک ساتھ اُٹھیں اور اُس کی آنکھوں سے ہوتی ہُوئیں مجھ پر آکر ٹھہر گئیں، بے باک آنکھیں، معصوم آنکھیں، کٹھور آنکھیں، حساس آنکھیں، شوخ آنکھیں، حیران آنکھیں، متجسس آنکھیں، بے تعلق آنکھیں، خِردمند آنکھیں، گنوار آنکھیں، بولتی آنکھیں، خاموش آنکھیں ــــ آنکھیں ہی آنکھیں میرے جسم کا ہر حِصّہ کئی کئی آنکھوں کی مار سے چھلنی لگا جیسے مَیں بے تحاشا بھیڑ کے خلاف چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کام ٹھہر گیا۔ لیکن جمعدار خُوش تھا۔ اُس نے ساری آنکھوں میں بیک وقت تاکا، میری طرف دیکھا اور بے شرمی سے کہا، "لونڈے! تُو کام کرنے کے لئے پیدا نہیں ہُوا! گانڈ مروا اور پیسے کما! اِسی میں تیری، میری اور سب کی بھلائی ہے۔" اُس نے میری طرف، اپنی طرف، اُن کی طرف اشارہ کیا جیسے میرا پیشہ اُن کے خروجِ نفس کا سامان مہیا کرنا تھا۔ مجھے پوری طرح بے عزت دیکھ کر اُن آنکھوں پر کیا گزری ہوگی مَیں نہیں جانتا کیوں کہ اُس وقت میری آنکھیں بارِ ندامت سے جھکی ہُوئی تھیں اور میری اپنی حالت نزع پذیر تھی۔ میری نا اُمیدی کا دھندلا اُجالا گھپ اندھیرا ہو گیا جیسے بند کمرے کا کمزور سا چراغ بُجھ جائے۔ مجھ پر سکتہ چھا گیا جو بے بس کی ذلت و اہانت کی پیداوار ہوتا ہے۔

کام واسنا، اِنسان کی فطری ضرورت ہے۔ اِسے جذبۂ محبت کہنا غلطی ہے، حالاں کہ یہ دو جسموں کے ملاپ سے تحریک پاتی ہے اور تسکینِ عناصر بنتی ہے۔ اِس میں بے دردی، بدکاری، درندوں کی سی بے رحمی ہو تو یہ کس احساس کی تشفی ہو سکتی ہے؟ صرف فنا و ابطال!

تایا جی کہتے تھے، "جذبۂ شہوت، کمالِ لطافت کی بیش از وقت قرار داد ہے۔ اِس کی نازکی اِس کی شکیبائی ہے اور یہ ایسی نفیس زندگی ہے جسے جینے سے پہلے اُس سے لُطف اُٹھایا جاتا ہے۔" اِس کے باوجود وہ اِسے حیوانی جذبہ کہتے تھے اور اپنے خیال کی وضاحت یُوں کرتے تھے، "جو عمل خُود آموز اور ثمر آور ہے وہ حیوانی زندگی کی خصوصیت ہے۔"

آہ! اِس بے رحم دُنیا میں کمزوروں اور حاجت مندوں کی حیثیت کیا ہے؟ اُن کی عِزت کے کیا معنی ہیں؟ وہ زندہ رہنے کے لئے گُناہوں کے راستوں پر چل نکلتے ہیں تو بے قصُور ہیں۔ اپنی ناکامی سے گھبرا کر خودکشی

کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خودکشی، ردِ عمل ہے اِس لیے بہادر، حاجت مند کے برعکس حاجت روا ہوتا ہے۔ مَیں ریزہ ریزہ ہوکر سالم رہا اور زخم زخم ہوکر خاموش۔ میرے ضبط کے باوجود میری رُوح نے تڑپ کر چیخ ماری جسے مَیں نے اپنی ہڈیوں اور ماس کے ڈھیر میں جذب کر لیا۔ میرے بدخواہ کی ملامت، کام کے شور میں ڈوب گئی اور مَیں اِحساسِ ذِلّت کی آزردگی کو پالتا ہُوا، بے جان بُت کی طرح کھڑا رہا۔ میری بے چارگی نے رنگ پر رنگ بدلا لیکن کوئی اُجاگر رُوپ دھارن نہ کیا۔ نہ جانے کیسے! میری بے مائیگی، گداز ی رند سے معمور ہوگئی اور میرے پُرانے لفظوں کو نیا آہنگ دے گئی، "جمعدار جی، مجھے کام پر رکھ لیجیے!"

اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا جیسے میری بات آنکھوں سے سُنی ہو۔ وُہ جلدی سے میری جانب بڑھا اور مَیں ڈر کر پیچھے ہٹا۔ مَیں ڈرتا اور پیچھے ہٹتا دِلی کی بے دلی کا شکار ہونے ہی والا تھا کہ اُس نے گرگٹ کی طرح سر ہلا کر مجھے آگے بُلایا اور چھتری ایک طرف جُھکا کر اُسے گُھمانے لگا۔ اُس کی ادا، اُس کسان کے مماثل تھی جو بوجھ سے پھنسی گاڑی کا پہیہ مار کر اُسے قابلِ حرکت بناتا ہے۔

"ٹھیک ہے، کل سے آجا" میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے نرمی اور مہربانی سے کہا۔ اُس کا یہ چھوٹا سا جملہ، خُوشبُو کے اُس جھونکے کی مانند تھا جِس کی سمت چاروں سمت ہو۔ کولتار کا دُھواں، دُھواں نہ رہا، دھوپ کی تلخی، تلخی نہ رہی، روڈ رُولر کی بھک بھک، بھک بھک نہ رہی، شور و غُل، شور و غل نہ رہا دُوسری ہر شَے کی طرح میری بے کسی، بے کسی نہ رہی، میری توانائی بن گئی۔ میں نے بلا خوف کہا، "جمعدار جی! مجھے آج ہی کام دیجیے، مَیں کل سے بھوکا ہُوں۔"

اُس کے بارے میں میرا جذبہ یکسر بدل گیا۔ ویسے جذبہ ہے کیا؟ کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ ہے!

جُھوٹ بول کر مجھے سچ بولنے کی سی تسلّی ہُوئی۔ وُہ آدمی جو کچھ دیر پہلے غنڈے اور پھبتی باز کی علامت نظر آتا تھا، مَیں نے اُسے ہمدرد اور مددگار کی شکل میں دیکھا۔ آدمی کی نفسیات اپنے ساتھ ہر شَے کے معنی بدل دیتی ہے! مَیں اُسی گھڑی اُن مزدوروں کا حِصّہ بن گیا جو کچھ دیر پہلے مجھے اجنبی سے دیکھ رہے تھے اور نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے!

باب ۴۴

روتے ہیں لہُو چھالے کہ جلتے ہیں چراغ، یا گردشِ دوراں میں ہیں قسمت کے ایاغ
کہتے ہیں جنھیں چاند ستارے شاطر، لوحِ غمِ اِمروز پہ فاقوں کے ہیں داغ (شاطر)

اِن مزدوروں کو دِلّی میں باگڑیئے کہتے تھے ۔ اِن کے دَل کے دَل روزی کمانے کے لئے راجستھان سے دِلّی آتے اَور وہیں کے ہو رہتے ۔ اِن کے چہرے مُہرے راجپُوتوں کے سے تھے ۔ فرق بس اِتنا تھا کہ یہ دوشالوں کے بدلے پھٹے پُرانے پہنتے ، غازوں کے بدلے دُھول میں لتھڑتے ، قالینوں کے بدلے گندگی روندتے ، گُلاب جَل کے بدلے پسینے میں نہاتے ، سرود و نغمہ کے بدلے بدکلامی سُنتے ، رُسوائیوں میں جیتے اَور حسرتوں میں مرتے ۔ یہ مہارانا سنگرام سنگھ ، مہاراجا پرتاپ سنگھ کی طرح مصرُوفِ جنگ تھے لیکن اِن کی اَور اُن کی جنگ میں بُنیادی فرق تھا ۔ وُہ ملک و قوم کی آزادی کے لئے حملہ آوروں سے لڑے تھے اَور یہ زِندہ رہنے کے لئے بھُوک سے لَڑ رہے تھے ۔ آزادی کی جنگ وقتی تھی لیکن بھُوک کی جنگ ابدی ۔ کہاوت ہے کہ یہ آدم و حوّا سے شرُوع ہُوئی تھی لیکن اِس کی تُندی کی توانائی ! یہ جاری و ساری ہے ۔ کوئی نِظام ، کوئی اِزم ، اِسے روک نہیں سکا کیوں کہ یہ عناصرِ حیات کی ضرورتِ موجُودات ہے ۔

جہاں کہیں کام ہوتا یہ مزدُور وہیں کہیں میدان تلاش کرتے اَور اُس میں جھونپڑے بنا لیتے ۔ شان دار مکانوں کے درمیان وُہ گندے جھونپڑے ایسے لگتے جیسے خُوبصُورت چہرے پر چیچک کے دھبّے ۔

دوپہر کی چھُٹی ہُوئی ۔ مزدُوروں کے بچّے پاس کے درختوں اَور دیواروں کے سایوں میں رینگ رہے تھے ، وُہ اپنی ماؤں کو دیکھ کر اُن کی جانب لپکے ۔ بجھے بجھے چہرے ایسے روشن ہو گئے جیسے اُن کے اَندر چراغ جل اُٹھے ہوں ۔ وُہ چھاتیوں سے آئینوں سے عکس کی طرح لپٹے ۔ مزدُور جس حالت میں کام سے ہٹے تھے اُسی حالت میں روٹیاں کھانے لگے ، موٹی سُوکھی باجرے کی روٹیاں ! مَیں ہاتھ پاؤں موکلے کرنے کے لئے لیٹ گیا اَور نہ چاہتے ہُوئے بھی اُن کی طرف دیکھنے لگا ۔ مَیں نہ دیکھتا تو میری حیرت مجھے اُکساتی کہ مَیں معلُوم کروں کہ کاٹھ کی سی وُہ روٹی ، سُوکھی کیسے کھا رہے ہیں ؟ اُس میں وُہ کون سی لذّت ہے جو اُسے گلے سے نیچے اُترنے میں مدد کرتی ہے ؟ وُہ روٹی جیسی تھی ، نام کی روٹی ہی تھی ۔ اُسے دیکھ کر میری مری ہُوئی بھُوک جی اُٹھی اَور مُنہ میں پانی آ گیا ۔ مَیں دانت بھینچ کر گالیں نچوڑتا اَور پانی نِگلتا ۔ مجھے محسُوس ہوتا کہ میرے دانت آپس میں جُڑتے جاتے ہیں اَور مُنہ میں رکھے گتّے کی طرح گھُلتے جاتے ہیں ۔ مُنہ کھولنے سے رال ٹپکتی اَور مُنہ بند کرنے سے بے قراری بڑھتی ۔ مَیں نے خیال بدلنا چاہا لیکن بدل نہ سکا ۔ مَیں اُٹھ کر بیٹھ گیا اَور اُنگلی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا ۔ مَیں حیران رہ گیا ! میری ہر لکیر روٹی سے مِلتی تھی ۔ مَیں اپنی دھُن میں لکیریں کھینچتا رہا اَور روٹیاں بناتا رہا ۔ میری روٹی ، چاند کی سی تھی ۔ وُہ بھُوکے کو اُمید دلاتی ہے ، اُس کا پیٹ نہیں بھرتی ہے ۔ اِتنے میں کام کا گھنٹا بجا اَور مَیں اُس دِل فریب خیال سے بھی محرُوم ہو گیا ۔

مزدُوروں نے اوزار تب رکھے جب اُن کے سایے رات کے اندھیرے سے جا ملے ۔ وُہ جھونپڑوں

کی جانب ایسے بھاگے جیسے اُس ذاتی کام کے لئے اُنھوں نے اپنی طاقت چوری چھپے بچا رکھی تھی اور اُس پر جمعدار کی نظر نہیں پڑنے دی تھی جمعدار چھتری بند کرکے اپنی چھڑی کی نوک سے دھرتی کریدتا تھا اور اُن مزدوروں کو دیکھتا تھا جو سامان چوکیدار کے حوالے کرتے تھے۔ میں اکیلا اوٹ پٹانگ سوچتا کھڑا تھا کہ اُس نے مجھے بلایا دو روپے دیئے اور میری پیٹھ تھپک کر کہا، "کل سویرے جلدی آنا۔"

حالات کا وہ موڑ کتنا خوش گوار تھا! رُوپوں کی موجودگی سے میری تنہائی کا خوف کم ہوگیا جیسے میری بے اعتباری میں مجھے قابلِ اعتبار ساتھی مل گئے ہوں۔ اُن خطرناک حالات میں، میں نے بے خطر محسوس کیا۔ میری مسرت میں حیرت کی ملاوٹ تھی۔ دو رُوپے میں نے کئی بار خرچ کئے تھے، کمائے نہ تھے۔ انھیں پانے کے لئے میں کیسے نشیب و فراز سے گزرا تھا۔ اِن کے سامنے گنجِ قاروں کی کیا حقیقت تھی! جو لوٹ کھسوٹ کا حاصل تھا۔ میں گھر کی طرف زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ رُک گیا۔ مجھے لگا۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، میرا خدشہ میرا واہمہ تھا۔ میں نے رُوپے ہاتھ میں محفوظ نہ سمجھے، دُوسرے ہاتھ سے جیب کھول کر تھاہ میں رکھے اور اُوپر سے داب لئے۔ میرے دِل میں آیا، برابر آتا رہا کہ میں جیب میں سے رُوپے نکال کر دیکھوں لیکن حوصلہ نہ پڑا۔ اندھیروں نے راستوں کو رَلا ملا دیا تھا اور میں صحیح سمت نہ پا رہا تھا۔ میں نے کتنے راہ گیروں سے ریگڑھ پورہ کا راستہ پوچھا اور گھر پہنچا، دروازہ کھولا جو چرچراتا ہُوا کھلا۔ میری رُوحانی ترنگ! میں نے اُسے 'مبارک ہو' سے تعبیر کیا۔ میں نے بلب جلایا، جیب میں سے نوٹ نکالے، اُلٹ پلٹ کر سرسری دیکھے اور پھر غور سے۔ میں نے ایک روپے کے دو نوٹ پہلی بار نہیں دیکھے تھے لیکن اِنھوں میں اور دُوسروں میں بُنیادی فرق تھا، یہ میری محنت کی پیداوار تھے۔ میں نے جذباتی ہو کر سوچا، اِن نوٹوں کا خالق میں ہوں! فقط میں!! یہ نوٹ قابلِ پرستش ہیں اور میری آنے والی نسلوں کے لئے تبرک۔ یہ لاقیمت ہیں! مجھے سنبھال کر رکھنے چاہئیں۔ میں نے اُن پر لکھی ہُوئی اُن کی قیمت پڑھی، مجھے غصّہ آیا، اُن کی قیمت کس قدر گھٹا کر رکھی گئی تھی۔ اُس گھڑی میری نفسیات ماں کی سی تھی۔ ماں کتنی ہی غریب ہو، خود پسند لمحوں میں اپنے بچے کو راج دلار کے نام سے مخاطب کرتی ہے۔

میرے کپڑے اُس کاغذ کے سے تھے جو بھیگ کر سُوکھ جائے۔ وہ بدن کو ریگمال کی طرح چھیل رہے تھے۔ میں نے نہانے کے لئے کپڑے اُتارے جو زخم پر سے کھرنڈ کی طرح اُترے۔ ماس تپ رہا تھا۔ اُس پر پانی ایسے لگا جیسے تپتے توے پر گرا ہو۔ میں نے کسی احساس کے زیرِ اثر پنڈا نہ ملا اور ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔ گردن سے کاندھوں کے نیچے تک پِت سی اُبھر رہی تھی۔ میں نے اُس موادِ فاسد کو غور سے دیکھا، وہ خشخاش کے سے باریک چھالے تھے۔ میں نے نہا کر تولیے سے پنڈا اِس احتیاط سے پونچھا جیسے زخم کو پھاہے سے

صاف کرتے ہیں۔ ہاتھوں میں سے پوروں کی حالت دیگر تھی۔ وہ اتنی گھس گئی تھیں کہ ماس کی پتلی پرت کے نیچے خون صاف نظر آتا تھا۔ اُن میں نمک چھڑکے زخموں کی سی جلن تھی۔ اُنھیں دبانے سے لگتا کہ اُن میں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑیں گے۔

ہوٹل کا فاصلہ اور روٹی پروسنے کا وقفہ دُکھ کی گھڑی کی طرح طویل ہوگیا۔ سامنے روٹی دیکھ کر دل و جان کی ساری بے صبری ہاتھوں میں سمٹ آئی۔ میری بھوک پیٹ سے، آنتوں سے، حلق سے زبان سے ہوتی ہوئی دانتوں پر آکر جم گئی۔ اُس لمحے کے اُتار چڑھاؤ مجھے ایسے یاد ہیں جیسے قطبی ستارے کو مسافروں کے راستے۔ میں سانسوں کی لطافت و قباحت کے ساتھ اُن کی رفتارِ گم گشتہ کو محسوس کرتا ہوں اور اُن کی حیات سازی کی طرفگی پر حیران ہوتا ہوں۔

میرا ہاتھ جہاں تھا تہاں رک گیا اور اُنگلیاں لاحرکت ہوگئیں۔ کہنیوں پر میز کی چبھن جاتی رہی۔ گاہکوں، بیروں، برتنوں کا شور بند ہوگیا۔ سلونے کی گرم خوشبو، سلونے میں ٹھنڈی ہوگئی۔ بھوک کی شدت دانتوں میں نابود ہوگئی۔ منہ میں بھرا ہوا پانی سوکھ گیا۔ روٹی، آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ میری تمام عناصر پرور قوتیں، قوتِ لامسہ میں ڈھل گئیں۔ گرم روٹی نے گھسی پوروں پر پھاہے کا اثر کیا اور میں اُنھیں سہلانے لگا۔ میرے لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہی پوروں کا سویا ہوا درد تیزی سے جاگا۔ مجھے لگا کہ میں نے اُنھیں کاٹ کھایا ہے۔ میں نے تشویش سے دیکھا، پوریں تازہ زخم کی سی لال تھیں لیکن ثابت و سالم تھیں۔ میری حالت عجیب تھی! میں جتنی دیر لقمہ چباتا اُس سے زیادہ دیر روٹی سے پوریں سہلاتا۔ پہلا لقمہ، دانتوں میں گھُل کر حلق میں اُتر جاتا تبھی دوسرا توڑتا۔ یہ اُسی تسکین کی تسلی تھی کہ ایڑیوں تک بھوکا ہونے کے باوجود میں معمول سے زیادہ کھانا نہ کھا سکا۔

میں گھر لوٹتے ہوئے برف کا ڈلا خرید کر لایا اور اُس کے گھلنے تک اُس سے چھالوں کی گرمی ٹھنڈی کرتا رہا۔ وہ تلملاہٹ، وہ جھن جھناہٹ، وہ سنسناہٹ، میں نے رات سوتے جاگتے گزاری۔ ماس، دنبل کی طرح دکھتا رہا، ہڈیاں کرچوں کی طرح چبھتی رہیں، جوڑ کروٹ کروٹ درد اُگلتے رہے، سانس سے نتھنے جلتے رہے جیسے اُن پر انگارے رکھے ہوں۔ میرے خواب حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور تھے۔ اور خواب وہ عجیب و غریب منظر ہیں جو جیون کے اُلجھے ہوئے تانے بانے کو سلجھاتے ہیں اور سلجھے ہوئے کو نکھارتے، سنوارتے ہیں۔ یہ وہ کیمائے صحت ہے جو بیماروں کو تندرستی اور تندرستوں کو تازگی سے نوازتے ہیں۔

دِلّی شہر حسین و رنگین نہیں تھا، کلفت و نکبت کا اکھاڑہ تھا اور اِس قول کی تصدیق کہ کمزور

طاقت ور کی غذا ہے۔

لابھ سنگھ مُنہ اندھیرے بیدار ہُوا اور اُسی کے ساتھ مَیں۔ اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ انگنی کھول کر ویسے ہی باندھی جیسے پہلے تھی۔

جو کوئی یہ توقع کرتا ہے کہ اُس کے جذباتی لگاؤ کا صلہ اُسی جذباتی لگاؤ سے ملے، وُہ نادان ہے لیکن اتنی توقع عین فطری میلان ہے کہ اُس رشتے کا کچُھ لحاظ رکھا جائے۔ اُس وقت وُہ مجُھے ناقابلِ برداشت حد تک مکروہ لگا۔ میرے دِل میں نفرت کا سیلاب اُمڈ آیا۔ مَیں نے جیسے کیسے اُس پر قابُو پایا لیکن اتنا کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "ویسے اچھّی ہے! ایسے سَر کو لگتی ہے۔"

"جو چیز جیسے ہے اُسے ویسے ہی رہنے دے۔ بڑا آیا 'مجُھے سِکھلانے والا'! اپنے پَر نہیں نکلے مجُھے اُڑنا سکھاتا ہے۔" وُہ غصّے سے اتنا اُونچا بولا کہ سیدھا حلق سے بولتا جان پڑا۔ اُس کی مُونچھوں نے آواز کی تیزی اکہری کر دی ورنہ دو دھاری ہوتی۔ اُسے مُونچھوں کی بے ہُودگی کا عِلم تھا۔ اُن پر اپنی بیزاری ظاہر کرنے کے لیے اُس نے اُنھیں کھینچ کر اُوپر اُٹھایا اور گرایا۔ اُس کا انداز ہریانہ کی کھترانیوں کا سا تھا۔ وُہ راہ گیروں کے سامنے شلوار سرکاتی تھیں اور جھٹ سے بیٹھ جاتی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ گورے ستروں کے نظّارے کے برعکس اُس کے دانت پیلے گھناؤنے تھے۔

مَیں دِل برداشتہ باہر گھُومنے لگا اور وُہ اندر اپنا کام کرنے لگا۔ جب وُہ بیتُ الخلا گیا، اُس نے ڈبّے میں مٹّی ڈال کر پانی بھرا اور آکر اُسے دھو کر رکھ دیا۔ اُس نے ایسا کیا لیکن مجُھے ڈبّے میں پانی بھرنے کا فن سِکھا دیا۔ وُہ کام پر چلا گیا۔ اُس کی مخالفت پر بھی، مَیں اُس مُشکل کے مُستقل حل کے بارے میں سوچنے لگا۔ آدمی کے سیکھنے کی قابلیت میں اختراعی صلاحیت کا عنصر خود افزا ہے۔ اپنی غریبی اور بے قدری کے باوجُود غالب و میر نے علم کی جو دولت چھوڑی ہے وُہ استمراری ہے۔ اِن سے قابلِ رحم ارشمیدس کی کہانی ہے۔ وُہ علمِ ہیئت کا کوئی مسئلہ حل کر رہا تھا کہ کسی حملہ آور بادشاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن وُہ مُمتاز ہندسہ داں، ہندسوں میں زندہ ہے۔ ہنرؤروں کی شان و شوکت اِن کی بالیدگی ہے! ورنہ یہ سُلطانوں کی جھُوٹی ٹیپ ٹاپ کی طرح نابُود ہو گئے ہوتے۔

مہارت، عمل کی روانی اور تیزی ہے لیکن اختراعیت، خیال کی تازگی اور برجستگی ہے۔ مَیں نے پتھر سے ڈبّے کا جوڑ رگڑ کر صاف کیا۔ چھت کے ایک کونے میں کولتار کا ڈھیلا تھا۔ مَیں نے اُسے اُتارا، ڈبّے کے اندر جوڑ پر رکھ کر چُولھے پر گرم کیا اور ڈبّا گھُما کر پُورے جوڑ پر پھیلا دیا۔ مَیں نے ڈبّے میں پانی بھر کر اُوپر اُٹھایا، معاینہ کیا اور اپنی کامیابی پر خُوش ہُوا۔ مَیں کام پر جانے کے لیے تیّار ہُوا اور کپڑے پہننے لگا۔ اُن میں

سے بغل گند سے ملتی بدبُو آ رہی تھی۔ لیکن میری خوشی کی خوشبو اِس قدر تیز تھی کہ وہ بدبُو دب کر رہ گئی۔ کمرے کی ہر شے ویسے ہی پڑی تھی جیسے کل تھی۔ اپنے ضمیر کی تنبیہ کے خلاف میں نے چنگیری میں پڑا پونا (روٹیاں رکھنے کا کپڑا) ٹٹولا اور اُسے خالی پایا۔ میں زندگی کی اُس راہ پر تھا جہاں سانس سانس نیا درد اور قدم قدم نیا زخم تھا۔ لیکن میری جرأتِ نبرد آزما! مجھے اپنی شکست پر فتح کا گمان ہوا اور میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ طاقت ور کی وہ طنز تھی جو کمزور دشمن کو لڑائی پر آمادہ دیکھ کر ہونٹوں کا بے ساختہ لوچ ہوتا ہے۔ میں نے پرات، کو ٹھوکر ماری، چوٹ کھائی لیکن مسرت پائی۔ میں کام پر روانہ ہُوا تو پاؤں میں درد ہو رہا تھا۔ عناصر کی خود اعتمادی میں حسن خود آرائی ہے، یہی وجہ ہے کہ فطرت میں ہر بیماری کا علاج اور ہر زہر کا تریاق موجود ہے۔ میں ست نگر سے اِدھر ہی تھا کہ درد غائب ہوگیا۔ میری چال میں چُستی، دِل میں خوشی اور خیال میں نیرنگی تھی۔ سامنے آفتاب طلوع ہو رہا تھا جو مجھے کاروانِ رنگا رنگ نظر آیا۔ بچکوئیاں روڈ پر لمباڑے کام پر جاتے ہوئے مل گئے۔ لمباڑنوں کی جھانجھنوں کی جھنکار نے مجھے لہکا دیا اور میں گنگنانے لگا۔

وِدھ تاراں نوں جھانجھراں تیریاں
تیریاں پہچون خبراں
(تیری جھانجن، ڈاک گھر کے تار سے اچھی ہے، تیرے آنے کی خبر سیدھی پہنچاتی ہے)
میرا لونگ ہی گڈی دے وچ گُمیا
اَگ لاماں ٹکٹاں نوں
(کوئی لڑکی شہر سے لونگ خرید کر ریل گاڑی میں آ رہی ہے اور اُسے ٹکٹ کے ساتھ باندھ کر جیب میں رکھے ہوئے ہے۔ دورانِ سفر ٹکٹ چیکر آتا ہے اور لڑکی سے ٹکٹ پوچھتا ہے۔ اُس وقت اُسے پتا چلتا ہے کہ ٹکٹ گم ہوگیا ہے اور اُس کے ساتھ لونگ بھی۔ ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھنے پر اِصرار کرتا ہے، وہ جھلّا کر کہتی ہے، لعنت پڑے تیرے ٹکٹ پر، خود تو مُوا گیا، میرا لونگ بھی لے گیا)

کام شروع ہُوا۔ وہی روڈ رولر کا شور، کولتار کا دھواں، پتھروں کی دھڑاک پڑاک، پھاؤڑوں کی رگڑ رگڑ، پھوارے بدلتے ہاتھ، چلتے بھاگتے پاؤں، دھول میں اٹے چہرے، میل میں لتھڑے پنڈے، کوئی جھکے، کوئی کھڑے، کوئی ننگے، کوئی ڈھکے، کوئی چوکس، کوئی سُست، کہیں ہنسی خوشی ہنکار، کہیں جانی بوجھی تکرار...... سخت دھوپ میں محنت کا ایسا گلزار جسے تفصیل سے بیان کرتا تو درکنار اُس کا تصور بھی مشکل ہے۔ میں نے سات رنگوں، سات سوادوں، سات سُروں اور سولہ سنگاروں کی بات

سُنی تھی اور یہی تمثیل اِنسانی زندگی کے عمل و اسلوب کی مکمّل تفصیل سمجھی تھی، لیکن محنت کے اِتنے رنگ رُوپ ہیں کہ انھیں نام دینا تو ناممکن ہے گِننا بھی ناممکن ہے۔ دوپہر نہ ہُوئی تھی کہ میری گھسی ہُوئی پوروں نے منہ کھول دیئے۔ وُہ لہُو روتے لگیں اور درد سے چلّانے لگیں۔ مَیں اُن سے ہمدردی جتلاتا تو میرا کام متاثّر ہوتا اور وہاں کام سے زیادہ پیاری چیز کام تھا۔ کام پیارا نہ کہ چام، یہ محاورہ کسی نے ایسی ہی صُورتِ حال میں گھڑا ہوگا۔ وُہ کام ایسا منظّم سِلسلہ تھا کہ ہر کامگار زنجیر کی کڑی کی طرح تھا۔ ایک کا ٹوٹنا سِلسلے کا درہم برہم ہونا تھا۔ ایسا ہُوا ہی چاہتا تھا کہ بسنتی نے میرے ٹُوٹنے کے کرب کو پہچان لیا۔ اُس نے تسلہ پھینکا، میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور دونوں طرف کے کامگاروں کو وقت سنبھالنے کو کہا۔ مجھے بُری طرح زخمی دیکھ کر وُہ اُس ماں کی طرح چلّائی جس کا ننھّا اپنی نادانی سے خُود کو مُشکل میں ڈال لے۔ اُس نے میرے ہاتھ چُومے، دُوپٹہ پھاڑ کر زخموں پر پٹیاں باندھیں اور مَیں پھر اُسی زنجیر کی کڑی بن گیا۔

اُس کے لگاؤ میں وُہی سرد کا رنگ تھا جو شفیق ماں کو بیمار بچّے سے ہوتا ہے۔ مَیں اُس کے حُسنِ سلوک سے بہت مرعُوب ہُوا۔ میری زبان نے ایک بار اور دِل نے سو بار اُس 'نرس ماں' کا شکریہ ادا کیا۔ وُہ پٹّیاں' ہمدردی کا ایسا پھل تھیں، جسے مَیں نے پہلی بار چکھا تھا۔ فرطِ جذبات کہوں کہ تحسینِ جذبات میری آنکھیں بھر آئیں۔ جہاں ایک درد سویا وہاں دُوسرا جاگ پڑا جسے مَیں نے زخموں کے رفو میں پایا تھا۔

مَیں اپنے قارئین سے مُعافی چاہتا ہوں! مَیں نے جن لوگوں کو کٹھ پُتلیاں کہا ہے وُہ حقیقی معنوں میں اِنسان تھے اور جاہل ہو کر اُن جذبوں کے ترجمان تھے جو دردمند دِل ہی میں جنم لے سکتے ہیں۔ اُن کے سخت ہاتھ، نازک لمس کے سرچشمے تھے۔ آنکھیں بظاہر طاقِ نِسیاں تھیں لیکن حقیقت میں اِحساس کی پٹاریاں۔

دوپہر ہُوئی، کام بند ہُوا اور وقت وُہی منظر دُہرانے لگا جس کا ذکر مَیں کرچُکا ہُوں۔ صرف ایک بات نئی تھی، مَیں اپنے زخموں کو دیکھ رہا تھا۔ مَیں سویرے سے نہار مُونہہ تھا اِس لئے بھُوک کے خنجر کی دھار تیز تر تھی۔ مَیں اپنی محرُومی میں غُربت کی دست درازی پر دِل ہی دِل میں تبصرہ کر رہا تھا کہ میری نظر کے سامنے رنگ ہی رنگ لہرا گئے۔ مَیں حیران ہو کر اُٹھا اور اپنے سامنے بسنتی کو کھڑا پایا۔ آگے وُہ میرے زخموں کا مرہم بن کر آئی تھی اور اب میرے پیٹ کے درد کا درماں لائی تھی۔ اُس کے سراپا ہمدرد رویّے نے اُس کے نام کے معنی ہی بدل دیئے۔ وُہ شکیل کے لغوی معنوں سے زیادہ شکیل تھی اور فیّاض سے بڑھ کر فیّاض۔ وُہ میری لئے کسی کو سہارا دے کر چلی گئی اور میرے گرد وُہ فضا پیدا کر گئی جو روٹی کی خُوشبُو سے زیادہ دِل پذیر تھی اور رُوحانی اِحساس سے بڑھ کر لطیف۔ اُس کی ایک نِسوانی ادا، رُوپ، پیار اور ممتا کے کئی قرابے لُنڈھا گئی اور مجھے مسرُور بنا گئی۔

مَیں اُس روٹی کے بارے میں اپنے تاثّرات لکھ چکا ہُوں جو میرے اِس نئے تجربے کی روشنی

میں بالکل غلط ہیں۔ وُہ روٹی، لکڑی کی طرح سخت تھی اور نہ ہی بے مزہ مواد! اُسے کھا کر مجھے اور روٹی کی تمنّا ہُوئی تھی۔ قارئین! روٹی جیسی بھی ہو، اپنے مخصوص ذائقے سے بھرپور ہوتی ہے! اُس کی نفاست کی لطافت بھوک کی شِدّت پر ہے نہ کہ اُس کی غذائیت پر۔

باب ۴۵

نُقصان میں جب تجزیۂ ذات کرو، کچھ عقل کو بھی شاملِ جذبات کرو
رونے سے ٹھہر جائے گی ہر ساعتِ غم، اِس طرح نہ تُم ماتمِ حالات کرو (شاطر)

کچھ دِنوں میں روڈ بِلڈنگ کا کام ختم ہوگیا اور مَیں شاخ سے ٹوٹے پتّے کی طرح بھٹکنے لگا۔ ایک دِن میں گھر ہی میں تھا کہ لابھ سنگھ کا دوست، ڈرائیور گُربخش سنگھ آیا۔ اُس کے ساتھ صاحب سلامت ہو رہی تھی کہ ایک جوان لڑکی آئی اور دروازے میں کھڑی ہوگئی۔

"ارے باہر کیوں کھڑی ہے؟ اندر آ۔ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے، تیرا دیور ہے۔" اُسے مدعُو کرتے ہُوئے اور مجھے اُس سے مُتعارف کرواتے ہُوئے گُربخش سنگھ نے بے تکلفی سے کہا۔

میری بھابی' نے پائل کی جھنک کے ساتھ دہلیز پر پاؤں رکھا، مُسکرا کر میری طرف دیکھا' ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس کا انداز بے تکلّف سے زیادہ بے باک تھا۔ میری رگِ جاں میں شُعلہ سا کانپ گیا۔

بہت خُوب! اِسے ست سری اکال بُلا' یہ تیری بھابی ہے۔ گُربخش سنگھ طنز آمیز سنجیدگی سے بولا جیسے وُہ اپنی بیوی کے بیباک رویّے پر نکتہ چیں ہو اور اُس رِشتے میں تکلّف کا آرزُومند۔

مَیں نے اُس کے طرزِ تخاطب سے اثر نہ لیا۔ وُہ چُٹکلے باز آدمی تھا اور اُس کا بُردباری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وُہ جیسی باتیں کرتا تھا انھیں برداشت کرنے کے لیے بے شرمی درکار تھی۔ وُہ اپنے اندازِ بیان پر اِتراتا تھا۔ "کوئی حاملہ عورت میری اصلی بات سُن لے تو حمل گرا دے۔"

وُہ بیس سال سے شادی شُدہ تھا لیکن بے اولاد تھا۔ وُہ اپنی بیوی کے بانجھ پن کی وجہ بیان کرتا تھا، "زمین کتنی ہی زرخیز ہو! اُس میں کتنا ہی بڑھیا بیج بیجو! اُس میں روز ہل چلانے سے بیج نہیں اُگتا۔"

بچّے، آدمی کی کمزوری ہیں۔ کوئی اُس سے ہمدردی جتلاتا تو وُہ اُس کا مُنہ چِڑا دیتا، "بچّے اچھے

ہیں! لیکن وُہ جو نَو مہینے پیٹ میں رہتے ہیں، اچھا نہیں کرتے! اُتنے دن گُربخش سنگھ کہاں رہے گا؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ لابھ سنگھ جیسا کم آمیز آدمی بھی اُس کا آدر بھاؤ کرتا تھا۔ وُہ لابھ سنگھ کے لئے ایک کیلنڈر لایا اور کمرے میں لٹکا دیا۔ کیلنڈر میں نیم عُریاں انگریز حسینہ کی تصویر تھی جو ریلے لیڈی سائیکل کے سہارے کھڑی تھی۔ اُس نے اِعتراض کیا، گُربخش سنگھ نے دھڑلّے سے کہا، "برادر، تُم اکیلے تَنے رہتے ہو! اِسے دیکھو گے تو کُچھ ڈھیلے رہو گے۔ اے انگریز قوم کچھ تیرے نصیب!"

بھابی چھم سے اندر آئی، دونوں ہاتھوں سے قمیص کی پیٹھ اُٹھائی اور دھم سے بِستر پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا بوجھ ہاتھوں پر لیا اور مجھے ایسے دیکھا جیسے پُوچھ رہی ہو، کیا حال ہے؟ اُس کا سارا چہرہ ہونٹوں میں سمٹا ہُوا تھا جو باچھوں تک پھیلے ہُوئے تھے۔ دوپٹّہ کاندھوں سے سَرک کر ہاتھوں پر گِر پڑا لیکن اُس نے اُسے وہیں رہنے دیا۔ مجھے لگا کہ ننگا سینہ مجھے للکار رہا ہے، "مَیں یہاں کھڑا ہُوں، تیرے سامنے! تُو میرا کیا بگاڑے گا؟"

"چھوٹے بھائی، زور کی پیاس لگی ہے۔ کیا گرمی ہے! دِلّی، ہندوستان کا مُلتان ہے!" گُربخش سنگھ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اُس کی بات سُن کر بھابی مُسکرائی۔ اُس کے ہونٹ کنپٹیوں تک پھیلے اور دانت کوندے کی طرح لپک گئے جیسے وُہ اپنی جھلک دِکھانے کے لئے اُسی لمحے کے اِنتظار میں تھے۔ مَیں نے بالٹی میں سے پانی کا گلاس بھرا اور گُربخش سنگھ کو دیا۔ اُس نے مجھے ڈانٹتے ہُوئے مجھ سے سُوال کیا، "تجھے معلُوم ہے کہ مَیں مُلتان کا رہنے والا ہُوں؟"

"مُلتان میں کیا خُوبی ہے؟" میں نے بھابی کی طرف دیکھتے ہُوئے جواب دیا جیسے سُوال اُس نے کیا ہو۔ وُہ اُٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک ہاتھ سے ممّوں کو تھاما، دُوسرے سے کُرتے کے اُوپر سے انگیا کی کٹوریاں پکڑ کر باری باری نیچے کھینچیں، پچھایا دُرست کیا اور پھر کُرتے پر جھٹکا دیا۔ اُس کی دبی دبی سی چھاتی ایسے اُبھری جیسے برسات میں دھرتی میں سے کھُمبی پھُوٹتی ہے۔ مجھے متوجّہ پا کر وُہ مُسکرائی، مُسکراہٹ پہلے سے زیادہ دل نواز تھی جب وُہ اندر آئی۔ چمکتے ہُوئے گالوں سے پتا چلتا تھا کہ پسینہ پھُوٹنے کو ہے، اب ماتھے، اُوپر کے ہونٹ اور ٹھوڑی کے پاس باریک قطرے دکھائی دینے لگے تھے۔ وُہ کمرے کی گھُٹن سے بے آرام تھی لیکن اُس نے شکایت نہ کی تھی۔ اپنی مانگ پٹّی کو بچانے کے لئے وُہ پسینہ پُونچھنے سے پرہیز کر رہی تھی اور دُوپٹّے کے سِرے سے پنکھے کا کام لینے لگی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ وُہ دُزدیدہ نگاہ سے کیلنڈر کو دیکھ رہی ہے اور کچھ خیال آراسی ہے۔ مَیں بہک گیا اور سوچنے لگا کہ اگر بھابی چولی اور کاچھی پہن کر کھڑی ہو جائے تو انگریز حسینہ کے مُقابلے میں کیسی لگے؟ اِتنے میں گُربخش سنگھ نے مجھے کاندھے سے ہلایا اور کہا، "مُلتان

میں آدمی نہیں تحفے رہتے ہیں!

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد و گرما، گدا و گورستان

اور وہاں کا پانچواں تحفہ ہے، گربخش سنگھ! اُس کے ساتھ ہی اُس نے پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھمایا اور حکم دینے کے سے انداز میں کہا۔ "بھاگ کر تین بوتل کوکا کولا لے آؤ، دلّی میں ملتان اِسے کہتے ہیں۔"

میں دُکان کی طرف چلا، وُہ دروازے میں کھڑا ہو کر اُن بچّوں پر چلّایا جو اُس کی بلیک اوسٹن کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے، بھاگو وہاں سے! عورتیں، سڑک کی جانب مُنہ کرکے بچّے جنتی ہیں جبھی تو گھروں کی بھیٹر، سڑکوں میں نظر آتی ہے۔ اُس کی ڈانٹ سُن کر بچّے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ میں اِس خیال سے خُوش تھا کہ میرے پاس کار والے مہمان آئے ہیں۔ کار کے قریب سے گزرتے ہوئے، میں نے اُس پر گرے نیم کے پتّوں کو جھاڑا اور اُن بچّوں پر خفا ہُوا جو کار کی دُوسری طرف دبکے بیٹھے تھے۔ میں اندر ہی اندر گربخش سنگھ کی رفاقت پر ناز کرنے لگا اور لابھ سنگھ کو بُرا بھلا کہنے لگا جو آٹھ آنے کا مٹّی گھڑا نہ خرید سکتا تھا۔ اُسی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لابھ سنگھ سپروائزر نہ تھا، کارپنٹر تھا۔

اُن دِنوں دِلّی میں کوکا کولا کی دُھوم تھی۔ میں نے کوکا کولا پیا نہ تھا لیکن اپنے خیال میں اُس کی بڑائی کا قائل تھا۔ کوکا کولا پینے کے پہلے اِمکان پر میں کئی یادوں سے گُزر گیا۔ ہریانہ میں سوہنا سوڈا واٹر ورکس، کی دُھوم تھی۔ دُسہرے کے میلے میں وُہ اپنی دُکان، ٹال کے برابر لگاتا تھا جس سے ٹال کو اوٹ ہوتی تھی۔ اُس خسارے کو وُہ یُوں پُورا کرتا تھا کہ سنگترے، مالٹے، جنجر، گُلاب ... وغیرہ کی بوتلیں، ہمیں مُفت پلاتا تھا۔ وُہ گولی والی بوتلیں، کوکا کولا کے برعکس نہایت پیاری سیٹی کے ساتھ کُھلتی تھیں، خُوش ذائقہ بھی تھیں لیکن اُن کی شُہرت ہریانہ کی حدُود سے باہر نہ تھی۔ سومتر سنگھ کے کہنے کے انُوسار کوکا کولا، امریکہ کی ٹاپ کلاس ڈرنک تھی اور دُنیا گیر شہرت رکھتی تھی۔ وُہ کوکا کولا کو لطیف لہجے میں کولا کہتا، چٹخارا بھرتا گویا زبان میں چھُپے ہوئے پُرانے مزے کی تجدید کرتا۔ میں نے اُسے کوکا کولا پیتے دیکھا نہ تھا لیکن اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ اُس کی نفاست پسندی کوکا کولا پر ختم ہے۔

آدمی کا جذبۂ خود آرائی، عزّتِ نفس کو اُبھارتا ہے اور اُسے اپنی ہانکنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر جذبے کے پیچھے یہی نفسیات کارفرما ہے جو اُسے مُکمّل طور پر مرنے سے روکتی ہے اور بوقتِ ضرورت اُس کا اِحیا پُوری تندہی سے کرتی ہے۔ میں بھی ہریانہ میں پیے ہوئے مشروبات کی تعریف کرتا۔ وُہ مجھے جھڑکتا، چل ہٹ، کہاں امریکہ! کہاں ہریانہ! وُہ کوئی پروڈکٹ ہے؟ کوکا کولا میں امریکن میڈ ایسنس ہے اور

فلٹرڈ واٹر۔ جس کا نام تُو لیتا ہے اُس میں ہریانہ کے جوہڑوں کا پانی ہے۔ مَیں کسرِ نفسی سے خاموش ہوجاتا اَور وُہ میری خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر کہتا، یہ ہندوستانی! انھیں اپنے نام کے ساتھ انگریزی نام جوڑنے کا پاگل پن ہے۔ انگریز چلے گئے اَور اپنے دوغلے بچّے پیچھے چھوڑ گئے۔ سوہنا سوڈا واٹر ورکس نام ہی سے ملاوٹ ظاہر ہے۔ جیسے انگریزی خالص زبان ہے ویسے ہی انگریزوں کی بنائی ہُوئی چیزیں۔

مَیں اکیلے میں امریکن ایسنس پر غور کرتا۔ امریکن لڑکیوں کے سُنہری بالوں اَور شنگرفی رنگ کی طرح وُہ نام واقعی خالص اَور دل فریب تھا۔

اُن دِنوں دِلّی میں پیپسی کولا کی بوٹلنگ شرُوع ہُوئی تھی۔ اُس کی مقبُولیت بڑھانے کے لئے چہکتی مہکتی دوشیزائیں اُسے مُفت بانٹا کرتی تھیں۔ وُہ ایسا تنگ لباس پہنتی تھیں جو اُن کے اعضا کی دِلکشی بڑھا کر شہوت خیزی کی حد تک پہنچا دیتا تھا۔ اُن کے سینے کی گھاٹیاں اَور کمر کی وادیاں، وُہ عشرت گاہیں تھیں جہاں پُوری عمر ایک کروٹ میں بسر کی جاسکتی تھی۔ مَیں اپنے جذبات اُن کے ساتھ بانٹنے کے تیّار رہتا تھا لیکن اُن کی دعوتِ انکار طلب کی وجہ سے ایسا نہ کرسکتا تھا۔ جہاں کہیں اُن سے مُلاقات ہوتی، مَیں اپنے شوق کو ہوا دینے کے لئے اُن سے وُہ مشرُوب لے کر پیتا۔ صاحبِ ذوق کہتے تھے کہ پیپسی کوکا کولا کے مقابلے کی چیز نہیں ہے۔ نہیں ہوگی! مَیں کون سا پارکھی تھا! لیکن یہ میرا راسخ یقین تھا کہ کوکا کولا کتنا ہی لذیذ و نفیس ہو اُن حسینوں سے بہتر چیز نہیں ہے۔ اُن سے بوتل لے کر مَیں اپنے تصوّر میں کھوجاتا اَور زیرِ لب گُنگُناتا،

ماں دیئے بند بوتلے

تینوں دیکھیاں نشہ چڑھ جاوے

(او لڑکی! تو کس ماں کی بند بوتل ہے!؟ تجھے دیکھتے ہی نشہ چڑھ جاتا ہے)

اُن کی دید میری خواہش تھی۔ مَیں جُوں ہی بستر پر لیٹتا، اُن حسینوں کا خیال میرے اعضا میں خُوشگوار حرکت بھر جاتا۔ وُہ حرکت، حرارت میں بدل جاتی اَور پھر کسی نہ کسی حسینہ کا رُوپ دھارن کرلیتی خاص کر اُس کا، جس کا جوبن کھِلتا ہوتا۔ مَیں اُس کے جاں گُداز ہاتھوں سے بوتل لیتا اَور جان بُوجھ کر اُنگلیاں اُنگلیوں سے چھُواتا اَور مطمئن ہوتا۔ تصوّر، اُمید کو مُتشکّل کر کے زِندگی سے معمُور کر دیتا ہے۔ میری اُمید میری نفسانی تسلّی کو پہنچتی اَور خواب کا مزہ دوچند کر دیتی۔

مَیں نے دُکان پر سائی دی، کوکا کولا اَور چابی لی اَور اپنے مہمان کی خُوشنُودی کے لئے بھاگتا ہُوا واپس آیا۔ دُور ہی سے دروازہ بند دیکھ کر مَیں ٹھٹھک گیا اَور نیم کے سائے میں کار کے سہارے کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ مَیں کوکا کولا کی دِل فریبیاں بھُول گیا اَور کمرے میں منائی جانے والی رنگ رلیوں

کے بارے میں سوچنے لگا۔ مَیں جتنی دیر وہاں کھڑا رہا، میری آنکھیں دروازے کی دراڑیں بنی رہیں۔ دروازہ کھلا اور مَیں بوتلیں لئے پہنچا۔ اندر داخل ہُوا ہی تھا کہ گربخش سنگھ مسکرا کر بولا، بڑی دیر کر دی! اجمل خان روڈ سے لائے ہو کیا؟ لاؤ! پیاس، آگ کی طرح لگی ہے۔"

مَیں شاید چُپ رہتا لیکن اُس کی دیدہ دلیری سے مجھے زبان مل گئی، "مَیں کب سے باہر کھڑا ہوں! دروازہ بند تھا۔"

بھابی، بُچی ہوئی مرغی کی طرح بستر پر بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں سے جو کچھ سنوار سکتی تھی، سنوار چکی تھی۔ مجھے جاننے میں دیر نہ لگی کہ وُہ لڑکی اُس کی بیوی نہ تھی۔ مَیں نے موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور بوتلیں چار پائی پر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگا۔

ارے! یہ کیا؟ گربخش سنگھ نے مجھے روکا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچتا ہُوا باہر لے گیا۔ وُہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے کار میں جا بیٹھے اور چلے گئے۔

مَیں دروازے میں کھڑا رہا جیسے کسی کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ بھولی کپور آتی دکھائی پڑی۔ میرے زناکار خیال کی انتہائی! مجھے لگا کہ وُہ میرے پاس آرہی ہے۔ اُسے متاثر کرنے کے لئے مَیں نے کوکا کولا کی بوتل اُٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اُس نے سرسری طور پر میری طرف دیکھا اور مَیں عاشقانہ انداز میں مسکرایا۔ وُہ میری مسکراہٹ لوٹائے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مَیں نے اُسے کوتاہ بیں اور دقیانوسی کہا اور پھر اُس کامنی کی یاد میں کھو گیا، جس کی مہک کمرے میں رسی بسی تھی۔ مَیں نے جانچ کر اپنی نشست اُسی جگہ جمائی جہاں وُہ بیٹھ کر گئی تھی اور اُڑتی ہوئی تسکین پائی۔ اُس خیالی مِلن سے مزہ لیتے ہوئے، مَیں نے بوتل کھولی، چابی پھسل گئی۔ مَیں نے دوبارہ چابی لگائی، چابی پھر پھسل گئی۔ مجھے بوتل کی سرکشی پسند آئی۔ مَیں نے اُسے غور سے دیکھا اور احتیاط سے چابی ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ بوتل بھک سے کھلی۔ مجھے یوں تسلی ہوئی جیسے مَیں نے کسی خود سر چیز کو زیر کیا ہو۔ بوتل کھلنے کی آواز، دل ربا تھی۔ میری اداکار فطرت نے اُس کی طرح اُڑانی چاہی۔ مَیں نے منہ میں اُنگلی گھسائی اور گال پر دباؤ دیتے ہوئے باہر پھسلائی۔ اُس سے جو لَے پیدا ہوئی وُہ بوتل کی آواز سے تصوّر آفریں تھی۔ کوکا کولا ویسے ہی گلا خراش تھا جیسے پیپسی کولا، مجھے زیادہ پسند نہ آیا۔ باقی کی دو بھری بوتلیں، میں ویسے ہی دُکان پر لوٹا کر بقایا لے آیا۔ مجھے لگا جیسے وُہ روپے میری معاونت کا انعام ہوں۔

لابھ سنگھ آیا، مَیں نے اُسے گربخش سنگھ کے بارے میں بتایا۔ مَیں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میری صداقت پسندی میں سو فیصدی رقابت کارفرما تھی۔ اگر اُس لوٹ میں میرا حصّہ ہوتا، مَیں اُس واقعے کو راز ہی میں رکھتا۔ وُہ ہتھیلی کی پُشت پر سے چند بال اُکھاڑ رہا تھا۔ میری بات سُن کر اُس کے

بال اکھاڑنے کی رفتار تیز ہوگئی جیسے وہ اپنا غصہ ان پر نکالنے لگا ہو۔ وہ رکا اور مجھ پر پیلا ہونے لگا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میری بزدلانہ خاموشی میرے کام آئی اور بات اتنی ہی بڑھی جتنی اس نے بڑھائی۔

جو ہوا سو ہوا، آیندہ ایسا ہوا تو مجھ سے برا نہیں! اس نے فہمائش کرکے چپ سادھ لی اور میں نے اسی میں خوش قسمتی سمجھی۔ لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ کم ظرف کا اعتبار کرنا، نہ کرنا برابر ہے، وہی بات ہوئی۔ کچھ دیر آرام کرکے وہ نہانے کے لئے اٹھا اور الگنی پر سے تولیہ اتار کر اسے اس چوکسی سے سونگھنے لگا جو موتنے سے پہلے کتّے کی ہٹ ہوتی ہے۔ میرا خوف ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ اس نے ناک منہ سکوڑا، تھوکا اور تولیہ سڑک میں پھینک دیا اور پھر میرا سامان۔

باب ۴۶

اِخلاص کی اِفراط کِسے ملتی ہے ! یہ عُمدگیِ ذات کِسے ملتی ہے !

تقدیر سے مل جائے جِسے مِل جائے ، یہ لذّتِ سوغات کِسے ملتی ہے ! (شاطرؔ)

وہ سڑک پھیل کر دِلّی بن گئی جو میری آشنا ہوکر بھی نا آشنا رہی۔ میرے لئے ہر چہرہ اجنبی تھا اور ہر قدم اجنبیت کا احساس۔ مجھے وہ راستے یاد آئے جو میرے بچپن کے ہم راہی تھے اور دکھ سکھ کے ساتھی، میری خوشی میں میری بڑھوتری تھے اور میرے غم میں میری دِل جمعی۔ میں ان پیارے ساتھیوں کے لئے اداس ہوگیا جن کے سامنے میں اپنا دکھڑا روتا تھا اور دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔ میں ان درختوں کی آرزو کرنے لگا جن سے لپٹ کر میں اپنی ڈھارس باندھتا تھا۔ جن کی دید، قاطعِ یاس تھی اور امید کا سرگم۔ زبان دراز اور ظالم انسانوں سے بچھڑ کر میں ان بے زبان غم خواروں سے ملتا تھا۔ انہیں بوجھل دل سے دیکھتا تھا اور ان سے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہتا تھا۔ لابھ سنگھ ہیچ سا ہیچ تھا! اس نے سڑک میں رات گزارنے تک کی اجازت نہ دی جیسے وہ اس کی جاگیر تھی۔

زیادہ قریب سے دیکھنے سے خط و خال دھندلے لیکن رشتے ناتے صاف دکھائی دیتے ہیں اور عین متعین بھی ہوتے ہیں۔

اس محلے میں کرتار سنگھ، سومتر سنگھ اور جگت سنگھ رہتے تھے۔ میں سامان اٹھائے ان کے پاس پہنچا۔ پہلے دونوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جتنے رقبے میں رہتے تھے، وہی جانتے تھے کہ کیسے؟ جگت سنگھ کی بیوی جاپے جنے کے لئے پنجاب گئی ہوئی تھی

وُہ کوئی نا نکرّ کئے بغیر مجھے ٹھیرانے کے لئے راضی ہوگیا لیکن دوٹوک سُنا بھی دیا، میرے ساتھ رہنا ہے تو آدھا کرایہ بیعانہ دینا ہوگا۔"

جگت سنگھ کا مکان کیا تھا، ایک جھوت تھی جس کے اُوپر چھت ڈال کر دروازہ لگایا گیا تھا۔ اِس مکان کی صورتِ حال جیسی بھی تھی پہلے سے اچّھی تھی۔ اُس نے سارا سامان چھت، دروازے، دیواروں، شلفوں اور کھونٹیوں پر لٹکایا ہُوا تھا جسے اُتارنے اور لٹکانے کے لئے آنکڑے والا ڈنڈا رکھا ہُوا تھا۔ حُسنِ ترتیب اَور صفائی کی وجہ سے وُہ چھوٹا سا رقبہ بڑا لگتا تھا۔ اُس کی ایک دیوار پاخانہ سے ساجھی تھی۔ بڑے تڑکے محلّہ جاگ پڑتا اور وہاں سے کھانسنے، کھنکارنے، تھوکنے، سِنکنے اور چھیڑ چھیڑ کی آوازیں آنے لگتیں۔ ایک آواز بند ہوتے ہی دُوسری آواز ایسے اُبھرتی جیسے پہلی کو دُوسری نے دبوچ لیا ہو۔ اُس پاخانہ کی ایک بات بڑی دِلچسپ ہے۔ سومتر سنگھ قبض کا شکار تھا۔ وُہ رفعِ حاجت کے لئے جاتا ہُوا اپنے ساتھ اخبار لے جاتا۔ جو کوئی شدید حاجت میں مُبتلا ہوتا، وُہ دروازہ دھڑ دھڑ پیٹتا اور چِلاّتا۔ سومتر سنگھ چُپ چاپ باہر نکل آتا اور اخبار پڑھتا ہُوا قطار کے آخر میں جا کھڑا ہوتا۔ لابھ سنگھ کے مکان میں بدبُو تبھی آتی تھی جب ہوا، کھال کنڈوں کی سمت سے چلتی تھی۔ یہاں بدبُو لگاتار تھی لیکن قدرے کم تھی۔ ہر وقت ناک دابے رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اِس کے باوجود مَیں خُوش تھا کیوں کہ وہاں آتے ہی میرا دِلدّر چلا گیا۔

جگت سنگھ نے مجھے اپنے دوست سچّا سنگھ کے پاس ترکھان کے کام پر لگوا دیا۔ کام کا اڈّہ بڑے نالے کے پار ست نگر میں تھا۔ سارے کاریگر مجھے گھورنے لگے جیسے طویلے کے پُرانے مویشی نئے اِضافے کو دیکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں عداوت و مُخالفت کی مِلی جُلی جھلک تھی جو کسی کے حلقۂ اِختیار میں مُداخلت کا ردِّ عمل ہوتی ہے۔ اِس کام کا رواج ہے کہ کام پر چڑھنے سے پہلے کاریگر اُوپر کپڑے اُتارتے ہیں۔ مَیں اِس صورتِ حال سے پہلی بار دوچار ہُوا تھا۔ مَیں جھجکتا ہُوا کھڑا رہا، وُہ مجھے تاڑنے لگے جیسے مَیں ننگا تھا اور وُہ کپڑے پہنے ہُوئے۔ اُن کی خاموش طنز کی بے باکی نے مجھے کمزور بنا دیا اور مَیں شرم سے سُکڑ گیا۔ میری غیر ضروری تاخیر سچّا سنگھ پر گراں گزری۔ اُس نے جِھڑکا، "تو یہاں تماشا دیکھنے آیا ہے کیا؟" مَیں نے چار و ناچار کپڑے اُتارے۔ کاریگروں کی سفّاک تہ بیں نگاہیں! ہرنام سنگھ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا، واہ، کیا مال ہے! مَیں خُون پی کر رہ گیا۔ میری حالت اُس میمنے کی سی تھی جو بھیڑیوں میں گھر جائے۔

مَیں اڈّے پر جھاڑو دے کر، بُرادے سے چِھپٹی رول کر جُدا ڈھیر لگا رہا تھا کہ سچّا سنگھ تُنک مزاج برہمی سے بولا، "جلدی کر! کیل، پیچ ملے تو اُسے ڈبّے میں رکھ اور جلدی کر۔ کام سے چپک

نہیں جاتے۔"

جب تک میں خطیا یا ہُوا مال اُٹھا کر اڈّے پر لایا، وُہ تیغ تیز کر کے رندے میں رکھ چُکا تھا اور اُسے اِدھر اُدھر پیٹتا ہُوا، اُس کا دم دُرست کر رہا تھا۔ چوکھٹوں کے پاتام رندنے کا منصوبہ تھا، میں رندے کے آگے اور وُہ پیچھے جُٹ گیا۔ وُہ کاندھے اور ایڑیاں اُوپر اُٹھا کر رندے پر دباؤ ڈالتا اور میں اُسے کھینچنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا۔ رندے کا گھسّا پار نہ ہوتا تو وُہ میری گردن مارنے کے سے انداز میں مُجھے دیکھتا۔ میرے پٹھے جیسے جیسے کستے گئے، رندہ رُکنے کے وقفے بڑھتے گئے۔ ہوتے ہوتے وقفے لگاتار ہوگئے۔ سچّے کی زبان، مُنہ سے اُٹھ کر دِل میں بیٹھ گئی اور اُس کے جذبات کی نُمایندگی کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں بات، گالی تک پہنچ گئی۔ گالی سے دست درازی تک کا مرحلہ بڑا مال کار تھا۔ اُس نے ڈنڈا اُٹھایا اور میری آنکھوں میں تاکا۔ وُہ اُس کی تندی کی تاب نہ لاسکیں اور جھک گئیں۔ کاش! وُہ اپنی بزدلی کا انجام جانتیں! میں اڈّے کی رونق اور کاریگروں کی دِل لگی کا سامان بن گیا۔ سُچّا سنگھ کے پلکتے اور برسنے میں دیر ہوجاتی تو دُوسرے مُجھے بدگمانی سے دیکھتے۔ ملتے ملتے وُہ سارے اُس سے مِل گئے۔ کیوں نہ ملتے! ہر رذیل دُوسرے رذیل کے فعل میں مُلوّث ہوتا ہے ورنہ وُہ اُس کے بھائی چارے کا دم کیسے بھر سکتا ہے؟ وُہ مُجھ پر تحقیر آمیز طعنے کستے جیسے سُچّا سنگھ کے سنکارے ہُوئے ہوں۔

"بڑھئی کی اولاد پڑھنے چلی، واہ بھئی واہ!"

"باپ کے کچّھے میں بُرادہ پھنسا ہُوا ہے اور بیٹا انجنیئر بننے کے خواب دیکھتا ہے!"

"کھاتی کے ہاتھ میں کاتی چلتی ہے، کانی (قلم) کا کیا مطلب؟"

کیا آدمی کی اپنی بے ہُودگی بھی جائے تضحیک ہوتی ہے؟ میں کام کے کسی معیار پر پُورا نہ اُتر سکا۔ جب کام بند ہُوا، میں بظاہر بھلا چنگا تھا لیکن اندر ٹُوٹا ہُوا۔ میری مظلومیت ننگی ناچتی رہی تھی اور میرے اپنوں کا سامانِ راحت بنتی رہی تھی۔ میرے جذبات، بہہ کر جمے ہُوئے خُون کے مانند کالے ہوگئے۔ میری ہر سُوجھ بُوجھ نفرت میں بدل گئی۔ اِس بار اُس نفرت کی نوعیت الگ تھی۔ اُس کا ماخذ وُہ نسل تھی جس سے میں خُود کو پہچانتا آیا تھا۔ جس کا میں اٹُوٹ حِصّہ تھا۔ ایسا اٹُوٹ حِصّہ جو نسل در نسل مُجھ تک پہنچا تھا اور آنے والی نسل کی مُجھ پر امانت تھی۔

میری ماں کہتی تھی کہ میرا کام، میری رُوح کی لذّت اور جسم کی لطافت ہے۔ لیکن میرے کام نے میرا نقشہ ہی بگاڑ دیا اور میری طاقت کا آخری کس تک نچوڑ لیا۔ سارے کاریگر سائیکلوں پر سوار ہوکر آگے نکل گئے۔ میں وہیں سے واپس اڈّے پر لوٹ آیا، اپنی کم اصلی پر نالاں بُرادے کے ڈھیر

پر گر گیا اور اُگلے ہُوئے نوالے کی طرح وہیں پڑا رہا ۔ پسینہ سُوکھ کر بھبھک اُٹھا اور برادے کی بدبُو، میری سڑاند میں دب گئی ۔ مَیں گندگی کے انبار کی طرح تھا جو اپنی فرسودگی میں زیادہ گھناؤنا اور ڈراونا ہوتا ہے ۔ اپنے گھر میں کام کرتے ہوئے مَیں بارہا اِس پسینے سے زیادہ تربتر ہُوا تھا لیکن اِس ناگواری، بدنامی، بدحواسی اِنتشاری ـــــ سے ناواقف تھا جو اِس پسینے کی مخلوق تھی ۔ بدن ٹھنڈا ہُوا تو ہر انگ کیل ٹھونکا ہُوا سا اور ہر جوڑ، توڑ کر جوڑا ہُوا لگا ۔ دھڑکن ٹل کر اوپر چڑھ گئی اور سینے میں دھڑکنے لگی ۔ میں پہلو بدلتے ہوئے درد کے شُعلے کی طرح کانپتا ۔ کھچنی کی مُسلسل پکڑ سے انگلیاں، لکڑیاں بن گئی تھیں ۔ میں نے انھیں چٹخایا تو ان میں لمس کا اِحساس آیا ۔ حلق، کانٹے کی طرح، زبان، ٹھُنٹھ کی طرح، ہونٹ، سریش پوتے کاغذ کی طرح اور نتھنے، انگاروں کی طرح سُلگ رہے تھے ۔ سانس میں ریت کے ذرّے ملے ہُوئے لگتے تھے ۔ ناف کے پاس بل پڑ گیا تھا ۔ قے آتی تھی لیکن آتی نہ تھی ۔ مَیں گھر روانہ ہُوا تو لگا کہ بغلوں میں چھالے پک رہے ہیں ۔ لڑکھڑاتے ہُوئے چلنے میں توازن برقرار رکھنا مُحال تھا ۔ میری آنکھیں، اشکِ غم سے دھندلائی ہُوئی تھیں لیکن میرے درد کی خود انکشافی ! میں اپنے انگ انگ کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ وُہ الگ الگ درد کی الگ الگ شِدّت سے تڑختا تھا ۔

تایاجی، کام کو تحریکِ حیات سمجھتے تھے اور اِنسانی زندگی کا مُقدّس فریضہ ۔ "کام، زِندگی کی حِفاظت کرتا ہے اور اسے مائل بہ عظمت رکھتا ہے ۔"

لیکن کام نے مجھے تباہ کر دیا تھا ۔ اُس نے مُجھے جو ہزیمت دکھائی تھی اُس کی اِنتہا ناگواری تھی اور ناگواری ایسی پستی ہے جس کی بُلندی نہیں ہوتی ۔

میری بھوک کی آگ ہمیشہ کی طرح تیز تھی ۔ وُہ ذلیل بُجھتی ہی کب تھی ! وُہ آگ، گیلی لکڑی کی چِتا سمان تھی ۔ شروع شروع میں وُہ بُجھی بُجھی لگتی ہے اور پھر خوفناک الاؤ کی طرح بھڑک اُٹھتی ہے ۔

میری حالت دیکھ کر جگت سنگھ قہقہے مارنے لگا ۔ اُس کے کٹھورپن کی تاب نہ لا کر میں رو پڑا ۔

میرے گریۂ بے اختیار نے اُس کے دل پر اثر کیا، وُہ کمالِ ہمدردی سے بولا، "اُٹھ، تیری مالش کر دوں ! تو سویرے تک بچھیرے جیسے کُلیلیاں مارنے لگے گا ۔" مَیں مالش کروانے کے لئے اُٹھا، اُس نے سرگوشی میں کہا ۔ "دیکھا بیٹا، پیسہ یُوں کماتے ہیں ! ایک ہی دن میں پھٹ گئی تیری ! بڑا آیا میٹرک لیٹ !" روز روز کی پھبتیاں سُن کر مجھے لگنے لگا تھا کہ میٹرک پاس کرنا بُرائی بھی ہے اور جُرم بھی ۔ وُہ مالش سے میرے اکڑے ہُوئے پٹھے نرم کرنے لگا ۔ مَیں ناقابلِ برداشت درد سے کراہتا اور سماجت کرتا، "تھوڑا ہولے ! تھوڑا ہولے !" وُہ میری تکلیف کو خاطر میں نہ لاتا اور اپنے مطلب سے مطلب رکھتا ۔ میری پنڈلی کی مالش

کرتے کرتے وہ رُکا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "یار، تُو نیچے پڑی کنواری طرح تڑپ رہا ہے۔"
نہ مجھے کنواری کا تجربہ تھا اور نہ میں اُس حالت میں تھا کہ ٹھٹھے کا لطف اُٹھاتا، میں دانت پیس کر رہ گیا۔ مالش کے رگڑے اور میرے کراہنے میں وہی تھپک تھی جو رگڑے سے رگڑے میں ہوتی ہے۔ میری مالش کر کے اُس نے میرا پیٹ ملا، دھرن کو مُکی دے کر درست کیا، پاؤں کے انگوٹھوں میں دھرن باندھی، میرے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مجھے اُٹھایا، بٹھایا اور میری پیٹھ کو مَل مَل کر گرمایا۔ اُس نے پانی گرم کر کے اُس میں نمک ملایا، مجھے نہلایا، بستر پہ لٹایا، لحاف اُوڑھایا اور یہ کہہ کر چلا گیا "یوں ہی لیٹے رہنا، میں گیا اور آیا"!
میں نے پہلو بدلا، مجھے لگا کہ میں پہلے سے قدرے آرام دِہ ہوں۔ وہ ہوٹل سے میرا کھانا لایا اور بازار سے 'آیوڈکس' کی شیشی۔ اُس نے مجھے لحاف ہی میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھلایا، نیم گرم پانی پینے کو دیا اور میرے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر پوچھا، "کیوں، کیسا لگ رہا ہے!؟"
"پہلے سے ٹھیک ہوں!" میں نے اِحسان مندی سے کہا۔
"ابے، تو سویرے دیکھنا! اب اِس سے مالش کروالے ذرا۔"
اُس نے میرے گال پر چٹکی بھر کر آیوڈکس کی شیشی کھولی۔
میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اُس نے میرا پسینہ پونچھا اور آیوڈکس کی مالش کر کے میرا انگ انگ گرما دیا اور مجھے لحاف میں گھسا دیا۔ مٹی کا جنس اور اُس پر لحاف کا سرپوش، میں ساری رات پسینے میں بھیگتا رہا، سویرے اُٹھا تو کسی حد تک ٹھیک تھا۔ میں محنت زدہ نے دہاڑی نہ توڑی، کیسے توڑتا! میری دہاڑی مجھے میرے فاقے سے ایسے جدا کرتی تھی جیسے صبح، رات کو دِن سے۔

باب ۴۷

دانے میں نہاں دام نظر آتا ہے، آزاد بھی ناکام نظر آتا ہے
دل جہل کے جذبے سے اگر عاری ہو، آغاز ہی انجام نظر آتا ہے (شاطر)

تشریر میں پہلے دِن جِتنا بَل نہ تھا۔ کام صبح ہی سے ڈھیلا رہا اور سچا سنگھ رُوکھا، اکھڑا اکھڑا سا ہوا۔ اُس کی بد زبانی مستقل صورت اِختیار کر گئی۔ کام کا دباؤ اِس قدر زیادہ تھا کہ کسی عمل کے دوران پسینہ پونچھنا، کام روکنا تھا۔ فضا پر گھُس کا دور دورہ تھا اور اعضا، چشمِ گریاں کی طرح

برس رہے تھے۔ مَیں اُسی وقت ناک صاف کرتا جب لگ بھگ چھینکنے کے قریب ہوتا۔ میری صفائی پسندی میری لعنت تھی۔ میرے ساتھیوں کی ناک بہتی تھی اور وُہ مضطرب ہُوئے بغیر کام میں مصرُوف رہتے تھے، لیکن ویسی حالت میرے لئے عذاب سے کم نہ تھی۔ سر کا پسینہ، ماتھے کے پسینے سے مل کر سیٹرھ کی طرح بہتا اور دیدوں میں نمک بھرتا۔ رُومال میرے پاس کہاں تھا! مَیں نے قمیض سے کام چلایا جو شام تک ایسے ہوگئی جیسے گندی نالی میں لت پت کوئی شے۔ اڈّے سے رگڑ کھا کھا کر میرا کاچھا پھٹ گیا۔ بغل گند، پسینے کی بدبُو سے زیادہ گھناؤنی تھی۔ وُہی حالت میرے چڈّوں کی تھی۔ میرا سر چیونٹیوں کا بھون تھا جسے مَیں کھجلاتا نہ تھکتا تھا۔

"پڑھائی لکھائی میں کیا دھرا ہے؟ کاریگر کے بیٹے ہو، ہُنر سیکھو!" بھایا جی کا یہ جُملہ جسے مَیں مُتعصب اور ملعون ذہن کی پیداوار سمجھتا تھا، مجھے بالکل ٹھیک لگتا۔ میری غلطی کی دُرستی ممکن نہیں تھی۔ میری نجات کی ایک ہی سبیل تھی، جھیلو، جھیلو، جھیلو اور یہ طریقِ عمل صبر آزما تھا۔ نامساعد حالات سے لڑنے کے لئے آدمی میں اخلاقی جُرات ہونی چاہیئے یا کسی ساتھی کی پُشت پناہی۔ پہلی کا مجھ میں فُقدان تھا اور دُوسری کا عالم نِرالا تھا۔ سچّا سنگھ کو مجھ سے وُہ ہمدردی تھی جو قصائی کو بکرے سے ہوتی ہے۔ اپنے حالات کو قابلِ تسلیم بنانے کے لئے مَیں اُس کام میں دلچسپی لیتا لیکن سچّا سنگھ کی بدکلامی میری بے دِلی اور بے زاری کو اُبھارتی۔ مَیں اپنی رُسوائی اور بدنامی میں اُس ہُنر میں لذّت اور عظمت تلاش کرتا۔ مجھے لگتا کہ اُس ہُنر میں بصیرتِ ہُنر کم اور وحشتِ ہُنر زیادہ ہے۔ اُس مشقّت میں رحمت ہوگی لیکن میری آزُردگی اُسے مجھ پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ مَیں اُس ہُنر سے نفرت کرتا اور میرا منفی رویّہ میری ہمت کی شِکست ہوتا۔ میری حالت گلیا بیل کی سی تھی جو کام اپنے ساتھی جتنا ہی کرتا ہے لیکن ڈنڈے اور گالیاں اُس سے کہیں زیادہ کھاتا ہے۔ جب تک دُوسرا کام نہ ملے اُس وسیلۂ روزگار سے کنارہ کشی حماقت تھی۔ میرے جِسمانی آزار پُوری طرح کم نہیں ہُوئے تھے کہ مجھے سُدّے پڑنے لگے۔ رفع حاجت کے وقت لگتا کہ انتڑیاں، پیٹ سے ٹُوٹ کر گر رہی ہیں۔ میری ماں نے لابھ سنگھ کے لئے دو سیر گھی بھیجا تھا جو مَیں نے اُسے دیا نہ تھا۔ وُہ اُس اڑی (مُصیبت) میں کام آیا۔ میری جِسمانی حالت نئے موڑ پر تھی۔ ہاتھوں کے چھالے پھر پھُوٹ کر گٹے بن گئے۔ ہاتھ پہ ہاتھ رگڑنے سے ہاتھ کھڑ کھڑ بجتے جیسے اپنی نئی کیفیت کا دعویٰ کرتے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہر بند اپنے انداز میں بگڑ کر سنور گیا۔ گالوں کی ہڈیاں نُمایاں ہوگئیں اور چہرے کی قوسیں بیضوی، نتھنے پتلے ہوگئے اور ناک کا بانسا اُونچا، بھرے بھرے نرم ہونٹ تیکھے اور سخت ہوگئے، چہرہ زیادہ فانہ نُما ہوگیا اور گورا چمکیلا رنگ، گندم کی ٹھس جیرا لایا۔ میری کمر

کے گرد گہری لکیر اُبھر آئی جو صحت مند جسم کی نشانی ہوتی ہے۔ وزن کم ہُوا، ڈھیلا ماس کھنچ گیا اور
مَیں ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اُن کُل جزدیات کا مجموعی اثر قابلِ ستائش ہے۔ میرا کنٹھ نکل آیا اور
میری ناپختہ آواز میں پختگی آگئی۔ میری صورت میں نسوانیت کی کچھ جھلک تھی، وُہ جاتی رہی۔ میری ماہیت
اُس پودے کے مماثل تھی جو پھل پر آتا ہے تو بڑھنا پھولنا بند کر دیتا ہے لیکن بھراپُرا لگتا ہے۔
اُس جسمانی کمال کے ساتھ مجھ میں رُوحانی زوال بھی آیا۔ مجھے نرم گرم اُٹھانے کی عادت
پڑگئی اور اپنی ذلت آمیز نامردی میں عزت افزائی محسوس ہونے لگی۔ مَیں ماحول زدہ ہوگیا اور مجھ پر ترکھان
کا ٹھپّا لگ گیا۔ مَیں ہُوبہُو اِس کہاوت کی تصدیق تھا 'بھیت' بھٹّے سے ہو کر آرے تو اوینٹ کہلاتی
ہے'۔ مَیں ریگڑھ پُورہ کی بدبُو سے مانوس ہوگیا۔ صابُن کی کمی کے سبب مَیں کیس اور کپڑے پانی سے
بھنیچ کر سکھاتا۔ میری جوئیں میرے ایسے خانہ زاد تھے جن کی صحت مندی میری ناپاکی پر موقوف تھی۔
کھجلاتے کھجلاتے کہیں جُوں ہاتھ لگ جاتی تو مسلنے سے نہ مرتی۔ اُسے ناخن پر رکھ کر ناخن سے مارنا
پڑتا۔ مَیں اُس جیتے جاگتے اور لال سُوہے خُون کو افسوس سے دیکھتا جو میری رگِ حیات کا جاں فزا حصّہ
تھا لیکن کس ناگوار طریقے سے ضائع ہُوا تھا! یہ باتیں اُس ماحول کی خُوبیاں ہیں، جس پر میری زندگی کا
دارومدار تھا۔ میری دہاڑی کی اُجرت ڈیڑھ رُوپیہ طے ہُوئی جو مزدُور سے آدھی تھی۔ سچّا سنگھ کچھ دینا ہی
نہ چاہتا تھا۔ وُہ کہتا تھا، "مَیں جس ہُنر سے تجھے مالامال کر رہا ہُوں وُہ تیری عمر بھر کے روزگار کا ضامن ہے
اِس کے باوجود مَیں، تجھے کچھ صِلہ دے رہا ہُوں، لے نہیں رہا ہُوں۔"
وُہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پُرانے زمانے میں گرُو، چیلوں سے گرُو دکشنا لئے بغیر کوئی ہُنر نہ
سکھاتے تھے۔ تایا جی کہتے تھے کہ ہندوستان علم و فن میں ساری دُنیا سے آگے تھا، اِس کے زوال کا
کارن ایسے ہی گرُو تھے۔ وُہ گرُو اور پجاری میں فرق کرتے تھے، "گرُو، اَن داتا ہوتا ہے اور پجاری'
بھکشار تھی (بھکاری)" وُہ یہ بھی کہا کرتے تھے، "جو محنت کش، محنت سے پیٹ نہیں بھر سکتا
وُہ حیوان سے بدتر ہے۔ کیوں کہ محنت کش اپنی ضرورت میں اکیلا نہیں ہوتا، اُس کا کوئی نہ کوئی دست نگر
ہوتا ہے۔ اُس کی کم اُجرت اُس کے لئے ایسے ہے جیسے بڑی مچھلی کے لئے اُتھلا پانی۔"
اور مَیں یہ بات حقارت آمیز دیانت داری سے تسلیم کرتا ہُوں کہ میری مزدُوری کم سہی،
دِل و جاں کو یکجا رکھنے کے لئے کافی تھی۔ نہ کسی کا پاس، نہ کسی سے آس، نہ اپنے آپ سے نراس،
میرے دِل میں ایک ایسے اِحساس نے جنم لیا جس کی اہمیت اندھے سکُون کی سی تھی۔
میری کائنات ترکھانوں، اوزاروں، لکڑیوں، اذیت خواہوں، پھبتی بازوں، حریفوں

..... کی ہمہ جہت کائنات تھی۔ مَیں اُس سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ میری کوشش، چَرخ کی طرح واپس پلٹتی اور مجھے پہلے سے زیادہ مجرُوح کرجاتی۔ میری دماغی کیفیت اَندھے پرندے کی سی تھی جو پرواز بھرتے ہی کسی سدِّراہ سے ٹکراجاتا ہے۔ وہاں دِل بہلاوے کا ایک ہی سامان تھا، کام! گھر سے کام اَور کام سے گھر، صُبح سے شام تک ایک ہی کام، ایک ہی خیال، ایک ہی دُھن میری زندگی کا محدُود راستہ سیدھا تباہی کے پاتال تک جاتا تھا۔ اِن سارے عذابوں سے بڑھ کر میلانِ طبعی کا اِبطال اور اِبطال کوئی بھی ہو، تنزّل کی نِشانی ہے۔ جِس آدمی کے تخلیقی وجدان اور نازک رُجحان مفلُوج ہوجائیں اُس کے اِدبار کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔

مَیں مُشقّت کی کم مائیگی میں شجرِ کُلفت کی طرح پَل رہا تھا۔ بے صبُوری، بے شعُوری، بے طرحی، بے سروسامانی، بے آہنگی..... میری خواری تھی، میری معذُوری تھی۔ مَیں ایسا وحشی تھا جو اِنسانوں کی بَستی میں جا بسا تھا اور اُن کے رہنے سہنے کے طور طریقے سیکھتا تھا۔ مَیں اپنے مَطلب کا کوئی جملہ سُنتا تو مُجھے اپنی سماعت پر شک گزرتا۔ مَیں گاؤں سے زیادہ اَکھڑ اور گنوار لوگوں میں گِھرا ہُوا تھا۔ اُن کا شمار زِیادہ نہ سہی، خیر! لیکن تقدیر، وُہ ہر جگہ موجُود تھے۔ اُن کی زَد سے بچ نکلنا، آتش کدے میں پاؤں رکھ کر جَل کا نہ کھانا تھا۔ اُن میں سے کُچھ اِتنے بے پردے اور اَدھورے تھے کہ اُن سے چھوٹی سی مُلاقات سخت دِن کو سخت ترین بنا دیتی۔ میری بے دِلی فزُوں ہوجاتی اور ہمت سر نگوں۔ نفرت انگیز حالات آدمی کے لئے ایسے ہیں جیسے بارانی کھیتی کے لئے اَوڑا (پانی کا قحط)! اور نفرت اُس ماحول کی آرزُو تھی، نفرت اُس ماحول کی آبرُو تھی، نفرت اُس ماحول کی جستجُو تھی۔ اور نفرت وُہ انوکھی گندگی ہے جو نجاست خانوں، بدروؤں اور تاریک زاویوں کے برعکس عَین اِنسان کے دِل میں پلتی ہے۔ یہ جانی پہچانی گندگی سے زیادہ گھناؤنی اور سریع الاثر ہے۔ اِس کی ایک حرکت لامحدُود اُجالوں کو عمیق اندھیروں میں غرق کرجاتی ہے۔ یہ اِنسان کی طبعی موت سے قبل، غیر طبعی موت ہے، جیتی جاگتی موت! مرنے والا اِسے دیکھ سکتا ہے، چاہے تو اِس کا ماتم کرسکتا ہے۔

میرے ساتھی لازوال عمومیت اور معمُولیت کے بوجھ سے مرے جاتے تھے لیکن کوئی کمال اور نیا پَن دکھانے کے لئے بھی بے قرار رہتے تھے۔ جہاں کہیں ایک سے دو ہوتے تھے وہاں اینٹوں کی چنائی، دیواروں کی لپائی، چوکھٹوں کی ٹھکائی، جالوں کی بچھائی، فرشوں کی ڈھلائی، حوضوں کی کھُدائی، پاڑوں کی اُونچائی، سڑکوں کی لمبائی، نالوں کی چوڑائی کی باتیں چل نکلتیں ہر کوئی اپنے فن کی ڈینگ مارتا اور زورِ بازُو کی شیخی بگھارتا۔ میری دُنیا ترکھانوں، معماروں، لوہاروں، بَندھانیوں،

بہشتیوں، مزدوروں کی دُنیا تھی۔ کیا تقدیر تھی؟ وُہ دُوسروں کے لئے اُجلے اور کھُلے مکان بناتے تھے لیکن خود گندے اور اندھیرے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ خُوب صُورت اور شیریں زندگی کے پاس رہ کر وُہ اپنی زِندگی کو اور پُر آزار بنا رہے تھے۔ وُہ اپنی ناداری اور کم اَصلی کی تسلّی کے لئے جیسے طریقے اِختیار کرتے تھے وُہ حقارت کی بجائے ہمدردی کا مقام ہے۔ وُہ اپنے حسب نسب کی کھوج ایسے انداز میں کرتے کہ اُسے کسی نہ کسی شاہی خاندان سے لے جا ملاتے یا کسی بزرگ سے۔ اِس کے باوجود وُہ اپنے نام کو قائم و دائم رکھنے کے جیسے طریقے ایجاد کرتے، وُہ قابلِ ذکر ہیں۔ کوئی اپنا نام اینٹوں پر کھودتا اور کوئی پلستر پر، کوئی ریئنفورسیمنٹ میں سرنامہ لکھتا اور کوئی محرابوں پر، کوئی چوبوں پر مردانگی کے نقش بناتا اور کوئی پائاموں پر۔ سنتا سنگھ زمانے بھر سے نرالا تھا۔ وُہ جہاں بیٹھ کر اُٹھتا وہاں مُڑ کر دیکھتا جیسے اپنی رُوح کو وہیں چھوڑ آیا ہو۔ اپنے ننھّے سنتا سنگھ کو وُہ کھٹکوں اور ٹونٹیوں سے چھُواتا، اُس وقت اُس کا چہرہ جِس اِحساس سے جھلکتا اُس سے لگتا کہ اُس کے تجربے نے کسی نئی فکر کو جنم دیا ہے۔

"تو ایسا کیوں کرتا ہے؟" مَیں ہکّا بکّا پُوچھتا۔

"مجھے اچھا لگتا ہے!" وُہ اپنے سے رس لیتا ہُوا کہتا۔

تجھے کیوں اچھا لگتا ہے؟

اُس کی حرکت میں مجھے کوئی مُدعا واضح نظر نہ آتا اور میں اُسے جاننا چاہتا۔

"کیوں بتاؤں تجھے؟ اچھا لگتا ہے، اچھا لگتا ہے!"

آخری دونوں جملوں کا مفہُوم ایک ہے لیکن وُہ جِس ادا سے اُنھیں بولتا، اُن کا مطلب جُدا جُدا ہوتا۔

"بڑے بھائی، تمھیں میری قسم! بتاؤ، کیا بات ہے۔ ایک بار مَیں نے اُس کا ہاتھ دبا کر اِلتجا آمیز لہجے میں پُوچھا۔"

ٹھیک ہے، بتاتا ہُوں۔ اُس نے یُوں صاد کیا جیسے مجھ پر اِحسان کر رہا تھا۔ وُہ ایک لکڑی کے قریب کھڑا تھا، اُسی پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ مَیں ہمہ تن گوش ہو گیا جیسے مَیں زِندگی کا اہم ترین راز جاننے والا تھا اور اُس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو نظر انداز کرنا اُس کے معنی کھونا تھا۔

یہ سب لوگ جب اِن مکانوں میں رہیں گے، اِن چیزوں کو اِستعمال کریں گے اور اِس طرح میرے اِسے! وُہ ایسے تڑپ کر اُٹھا جیسے اعصاب میں درد اُٹھا ہو اور پھر کاچھے کے اُوپر سے ہاتھ میں

پکڑ کر چِلّایا ، اِسے ! اِسے !! اِسے !!!"

اُس کا ہیجان اِس حقیقت کا ترجمان تھا کہ وُہ پُرانی تہذیب کو پامال کر کے نئی تہذیب بسانا چاہتا ہے جس کا اوّل قانون اُس کا لِنگ ارجن ہو ۔ اُس کا یہ جذبہ میرے بھائیا جی کے اِس جذبے سے زیادہ مُہذّب تھا جو اپنے کِسی دُشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تو اُسے یوُں ذلیل کرتا " وُہ ہے کیا ؟ مَیں چاہوُں تو اُس کی ساری پُشتیں اپنے مُوت کی دھار میں بہا دوُں !"

وُہ بیل کی طرح گردن ڈالے چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھُومنے لگا اَور بیک وقت خُود سے اَور مُجھ سے باتیں کرنے لگا ۔ "مَیں پُشت ہا پُشت سے ترکھان ہُوں ۔ تُو جانتا ہے ، مُجھے کیسے معلوم ہے ؟ بزرگوں کے اَوزار تبرّکات کی طرح پُوجے جاتے ہیں ۔ میرے بچے ترکھان ہی ہوں گے ! کیوں ؟ بچے کچے گھڑے کے سے ہوتے ہیں ، جس پر جیسا نِشان پڑ گیا ، پڑ گیا !"

"ترکھان کا بچّہ ، ترکھان نہیں کہلائے گا تو کیا کہلائے گا ؟ جیسے کِسان کا بچّہ کِسان !" مَیں نے منطق بگھاری ۔

وُہ نظر نیچی کئے خاموش رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو ۔ وُہ کچھ دیر یُوں ہی گھُومتا رہا اَور پھر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا " ہم جھونپڑوں میں اِس لئے رہتے ہیں کہ ہم اپنی محنت بیچتے ہیں ۔ اپنے لئے مکان وُہ بنواتے ہیں جو دُوسروں کی محنت خرید سکتے ہیں ۔ ہم اپنے لئے مکان نہیں بنوا سکتے ! کیوں کہ ہم اِس قابل نہیں ہیں کہ دُوسروں کی محنت خرید سکیں "۔

"اِس کا کیا علاج ہے ؟" مَیں نے اُسے کُریدا ۔

"ایک ہی علاج ہے !" اُس نے ہی پر زور دیا جیسے اُس کا خیال اِس سماجی مسئلے کا اکیلا حل تھا ۔ اُس کے لب و لہجے کی بیباکی اُس شخص کی سی تھی جو کِسی کے حلقۂ اِختیار میں مداخلت کا اِرادہ رکھتا ہو ۔ "ہمیں اِن لوگوں کو مار دینا چاہیئے اَور مکانوں پر قبضہ کر لینا چاہیئے "۔

"تم سوچتے ہو کہ تُمہارے ایسا کرنے سے حکُومت چُپ دیکھتی رہے ؟" مَیں نے اُس کی بات کو رد کر کے اپنی بات کہی ۔ "پاکستان کے ہنگامے میں ایسا ہُوا تھا ۔ لوگ مُسلمانوں کی زمینوں اَور گھروں پر قابض ہو گئے تھے لیکن پھر سب کو چھوڑنے پڑے تھے ۔" مَیں نے تقسیمِ وطن کا حوالہ دیا جب ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگا ہے ، اُسی کا ہے ۔

"تو پھر حکُومت کو چاہیئے کہ وُہ ہمیں مکان بنا کر دے !"

اُس نے اپنی بات کو نیا موڑ دیا جیسے اُسے اپنی بات میں کھوٹ نظر آیا ہو ۔

"پہلے تمہاری مانگ تھی کہ چھ دِن کام کرنے کے بعد ساتویں دن اُجرتی چھٹی ہو۔"

"یہ کامگار کی کم سے کم مانگ ہے! مجھے آرام کرنے دے، یہ باتیں تیری سمجھ سے باہر ہیں۔" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصّے سے کہا اور چلا گیا۔

سنتا سنگھ ساتھ والی کوٹھی پر اپنے طور پر کام کرتا تھا اور کھانا اُسی ہوٹل پر کھاتا تھا جہاں مَیں۔ اُس کا ایک مخصوص جذبہ تھا، وُہ سمجھتا تھا کہ سارے ہُنرور وِشواکرما کی سنتان ہیں۔ چوں کہ سرشٹی کا رچنا کار وِشواکرما ہے اِس لئے ہر چیز پر پہلا ادھیکار ہُنرور کا ہے۔

میرا ہوٹل، گھر سے کافی دُور تھا۔ اِس جیسے دُوسرے ہوٹل بھی قریب تھے لیکن مَیں اِسے چھوڑتا نہ تھا۔ میری پسند کی وجہ بالکل سیدھی سادھی اور عملی تھی۔ اِس ہوٹل کی روٹیاں، دوسروں سے بھاری تھیں اور پیٹ بھرنے کے لئے دو کافی تھیں۔ اِتنی تسکین کے لئے دُوسرے ہوٹلوں کی تین روٹیاں کھانی پڑتی تھیں جس سے مجھے ہر روز چار آنے کا خسارہ ہوتا تھا۔ اِس ہوٹل کا مالک نریندر سنگھ دال خُوب بگھارتا تھا اِس لئے مزے سے کھانا کھانے کے لئے سپیشل سبزی کی ضرورت نہیں رہتی تھی، جس کا نرخ دونی کی روٹی کے ساتھ الگ دینا پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں وہاں کھانے کے ساتھ کبھی پیاز اور کبھی مولی کے چند ٹکڑے ملتے تھے جو کھانے کا سواد بڑھا دیتے تھے۔ سنتا سنگھ دیو نگر میں رہتا تھا اور کام کے بعد اکثر ہوٹل پر ملتا تھا۔ وُہ اپنی چھوٹی ذات پر نالاں تھا لیکن اُونچی ذات والوں کو گالیاں دیتا تھا جیسے مذہبی لوگ، شیطان پر لعنت بھیج کر مقدّس فریضہ ادا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کی ساری رذیل حرکتوں کا ذِمّہ دار وُہی تو ہے۔

ایک رات مَیں گھر سے ہوٹل جا رہا تھا کہ وُہ مجھے راستے میں مِل گیا۔ وُہ سائیکل پر سے اُترا، میرے ساتھ پیدل چل پڑا اور رسمی بات چیت کے بعد گویا ہُوا، "چھوٹے بھائی، منُو نے جات پات بنا کر مانَو کے ساتھ بڑی نا اِنصافی کی ہے۔"

"کیسے؟" مَیں نے حیرت سے پُوچھا۔

"اُس نے جو بدنامی ہماری قسمت میں لکھ دی ہے، انمٹ ہے!"

اُس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے ایک ملعون دُوسرے کو دیکھتا ہے اور اِس خیال سے تسکین پاتا ہے کہ اپنی بدقسمتی میں وُہ اکیلا نہیں ہے۔

اِس میں منُو کا کیا قصور ہے؟ جو جیسا کام کرتا ہے، ویسا ہی نام پاتا ہے۔ تُم یہ کام چھوڑ دو کوئی دُوسرا کرنے لگو، وُہی کہلاؤ گے۔" مَیں نے اُسے زندگی کی حقیقت بتائی۔

"تو نے وہ کہاوت سُنی ہے؟" اُس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی خصوصیت تھی کہ وہ جس کسی کے ساتھ ہوتا، اپنی ہی گاتا اور دوسرے کی بالکل نہ سُنتا۔ وہ دوسرے کی بات پر اُسی قدر دھیان دیتا جس قدر اُسے ضرورت ہوتی۔

"کون سی کہاوت؟" میں نے اپنی مجروح خودی کی ڈھارس بندھاتے ہوئے پوچھا۔

"بڑی کڑوی ہے! میں نے پہلی بار سُنی تھی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میرے جی میں آئی تھی کہ اُس کا خون کر دوں! لیکن میں سنبھل گیا تھا کیوں کہ میں اُس کے گھر میں کام کرتا تھا۔" وہ مجھے دھکیلتا ہوا سڑک سے ایک طرف لے گیا، اپنے اطراف دیکھا جیسے کوئی کسی کا راز کہنے سے پہلے خاطر جمع کر لے کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔

ایسی کون سی کہاوت ہے؟ اُسے دیر کرتے دیکھ کر میں نے بیتاب ہو کر اپنا سوال دُہرایا۔

"سُنو!" اُس نے مجھے جھنجھوڑنے کے سے انداز میں تاڑا جیسے میری سخت جانی کا اندازہ کیا۔ "جیسے کُتّے کا بچّہ کُتّا، ترکھان کا بیٹا ترکھان!"

اُس کی بات مجھے تیر کی طرح لگی لیکن میں سہار گیا۔ میری ذلّت میری ڈھال بنی رہتی تھی لیکن وہ یہ کہہ کر جذباتی ہو گیا "ہم جنم جنم سے وہی ہیں جو تھے! جیسے امیروں کے کُتّوں اور بلّیوں کے نسب نامے ہیں ویسے ہی ہم کاریگروں کے صداقت نامے۔ جہاں کام کرنے جاؤ پہلے پوچھتے ہیں، خاندانی کاریگر ہو کیا؟ کہاں کہاں کام کیا ہے؟"

"اِس میں کیا بُرائی ہے؟ ہُنر وہ قوّتِ عمل ہے جو اِنسان کو تخلیق کرتی ہے اور اِسے ادنیٰ سے اعلیٰ بناتی ہے۔ کوئی ہُنرور کے بارے میں ایسا پوچھتا ہے تو وہ اُس کی عزّت بڑھاتا ہے۔ جسے اپنے بارے میں بات کرنے سے عار ہے، وہ فریب کار ہے۔"

تہذیبِ اخلاق، قدرِ عافیت کا مبدا ہے۔ جو کوئی اِس میں عملی شرکت کرتا ہے وہ صورتِ حال کے ساتھ خود کو بھی سنوارتا ہے، جب کہ دوسرا اپنے ماحول کی طرح خود بھی ادھورا رہتا ہے۔ اُس کی نفسیات گندگی کی مکھی کی طرح ہوتی ہے! وہ صاف سُتھرے ماحول میں بورا جاتی ہے اور کہیں آرام سے بیٹھ نہیں پاتی ہے۔ وہی حالت میری تھی لیکن میں نے تایا جی کا قول دُہرایا۔

"نہیں! ہرگز نہیں!!" وہ غصّے سے چلّایا۔ "ہُنرور اونچے اور سانچے ہوتے تو ہم، کامگار نہ کہلاتے۔ ہماری بیویاں، ترکھان، لوہار، ریگڑھ، جولاہے نہ جنتیں!"

اُس نے سائیکل کا اگلا پہیہ اُٹھا کر زمین پر پٹخا جیسے وہ سب پہیے کا قصور تھا۔

میں نے اُسے کچھ خوف سے دیکھا اور چپ رہا۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہُوا تھا اور آنکھوں سے شعلے پھُوٹ رہے تھے۔ وُہ دُوسروں کو حقیر سمجھتا تھا لیکن کوئی اُسے حقیر سمجھے! وُہ یہ نہ چاہتا تھا اُس کی نفرت ذاتی ہوکر مجموعی نوعیّت کی تھی اور ناقابلِ مصالحت بھی۔ وُہ اپنی اِنتہا میں اپنے سوائے ہر کسی کو ذلیل وخوار دیکھنا چاہتی تھی۔

تُو نے یہ کہاوت سُنی ہوگی؟ اُس نے بے چینی سے کہا اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارا جو میری پگڑی کو مس کرتا ہُوا لگا۔ سپُت، سپُت۔۔" میں نے پگڑی سنبھالتے ہُوئے اُسے ذرا غصّے سے دیکھا۔ وُہ کہاوت بھُول گیا تھا اور اپنا ماتھا ٹھونک رہا تھا۔ وُہ کہاوت مجھے یاد تھی۔ میں نے اُس کی بات کی کڑی اُٹھائی جو میرے غصّے کو گرمجوشی میں بدل گئی۔

سپُت جنن کھترانیاں.

ویشانیاں' باہمنیاں.

(کشتریوں، ویشوں اور برہمنوں کی بیویاں سپوُت جنتی ہیں)

یہ سُنتے ہی سنتا سنگھ بھڑک اُٹھا۔ اور بولا، ہاں ہاں، یہی یہی! تجھے بھی یاد ہے۔ اِس کا مطلب کیا ہے؟ اُن کے سوا ہر عورت، کپوُت جنتی ہے۔ جب تک جاتوں پاتوں کے بھرم بھید میں ہماری تقدیر اپنے آپ کو دُہراتی رہے گی۔"

"یہ بدنامی مِٹ سکتی ہے کیوں کہ اِس کی وجہ معاشی پستی ہے نہ کہ ذات پات! تُم اپنے بچّوں کو پڑھاؤ اور اُنھیں اِس قابل بناؤ کہ وُہ اپنی تقدیر بدل سکیں۔" میں نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

"تُو نے پڑھ کر کیا اُکھاڑ لیا ہے؟"

اُس نے میرا مذاق اُڑایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے میری بات سُن کر اُس کا راست جواب دیا تھا۔

"میری تعلیم اَدھوری ہے!" میں نے اپنے خیال کی مدافعت کرتے ہُوئے کہا۔

"پُوری کرلے! پھر میں دیکھوں گا کہ کیا کرلیتا ہے تُو؟" اُس نے اپنے سخت انداز کو برقرار رکھا۔

"پُوری کیسے کرُوں! تُم جانتے ہو کہ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔" میں نے اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ میرے سچّے اِظہار نے اُس کے تعصّب کا پردہ پھاڑ دیا اور اُسے جذبات کے اندھیرے سے اُٹھا کر سوچ وِچار کے اُجالے میں لا بٹھایا۔ اُس کا تناؤ، اِحساس میں بدل گیا جیسے اُس کا اور میرا مسئلہ ایک ہو۔ اُس نے ایک ہاتھ سے سائیکل پکڑی، دُوسرے ہاتھ سے میری کلائی تھامی

اور ہوٹل کی طرف چل پڑا اور شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا۔" ہم غریبوں کا یہی رونا ہے! جو پڑھ سکتا ہے، اُس کا ماحول اُس کے خلاف ہے اور جسے کوئی پڑھانا چاہتا ہے، وُہ پڑھنے میں نکھد ہے۔ تُو لاکھوں میں ایک ہے! اُس نے میری کلائی چھوڑ کر میری پیٹھ تھپکی، پھر کلائی پکڑلی اور بات جاری رکھی،" ترکھانوں کے بچّے پڑھتے کہاں ہیں؟ میرے بچّے کتابوں کو اوزاروں کی طرح برتتے ہیں۔ وُہ اُن کے ورقے ایسے الگ کر دیتے ہیں جیسے وُہ کل کے پُرزے ہوں اور دوبارہ جوڑے جا سکتے ہوں۔ کتاب کا ایک لفظ یاد نہیں لیکن پیٹی میں رکھے ہر اوزار کا نام اور کام معلوم ہے"۔

"یہ اچھی ہی بات ہے! مجھے دیکھو، مَیں نہ اِدھر کا ہوں نہ اُدھر کا! بے ہُنر کوئی جنتر کھول کر جوڑتا ہے تو آخر میں کچھ پُرزے زیادہ پاتا ہے۔ ہم لوگ بہت اچھے انجینیر بن سکتے ہیں۔ ہُنر کے پُورا جاننے ہی میں ترقّی کا راستہ ہے۔ کرنیل سنگھ اور سوبھا سنگھ کو دیکھو، آج کس مقام پر فائز ہیں۔ ہُنر ہماری گھُٹّی میں پڑتا ہے لیکن پنپ نہیں پاتا ہے کیوں کہ ہم اپنے فن کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُس کی پیروی بے دِلی سے کرتے ہیں۔" مَیں نے اپنی ذِلّت میں نئے طریقے سے عِزّت کا پہلو تلاش کیا۔

"تم بڑی عقل کی باتیں کرتے ہو!" اُس نے پہلی بار مجھے کچھ ادب سے مُخاطب کیا۔" کس نے بتایا تمہیں یہ سب کچھ!" اُس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پُوچھا۔

"تایا جی نے! وُہ کہتے ہیں کہ جب تک اِنسان اپنے تعصّب سے چھٹکارا نہیں پاتا، حق و باطِل میں اِمتیاز نہیں کر سکتا اور نہ صحیح سمت میں!"

مَیں نے تایا جی کا حوالہ دیا۔ وُہ تعصّب کو اِنسانی زندگی کے آئینے کا تیزاب جانتے تھے اور محبّت کو زنگار۔

"تُم ٹھیک کہتے ہو! ہم اپنے پیشے کو ذلیل کہیں گے تو دُوسرے اِسے کیوں سراہیں گے؟ راشٹرپتی بھون اور پارلیمنٹ کے گنبدوں کی سنٹرنگ کرنے میں انگریز انجنیر ناکام رہے تھے جسے ایک ترکھان نے سر انجام دیا تھا۔ ترکھان، وِشوا کرما کا اوتار ہے۔"

ترکھان کے پیشے کو نئے معنی دے کر اُس نے خُود کو جس اِعتمادِ نفس سے دیکھا، وُہ فتح و نُصرت کے لمحے کی شان و شوکت ہے۔

ہم ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھے، اُس نے اپنی جانب سے میرے لیے آلو پنیر کی سپیشل سبزی منگوائی، مَیں نے اِنکار کیا تو اُس نے فخر سے کہا،" میری خُوشی کے لیے! مَیں آج بہت خُوش ہوں۔ تُم نے مجھے میری گُم کردہ شخصیت کا چہرہ دِکھایا ہے"۔

وُہ کبھی کبھی نرم و نازک باتیں کرتا تھا۔ اُس کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھ کر مجھے گمان گزرتا کہ کوئی مہاں پنڈت وید سنانے کا جتن کر رہا ہے۔ عام طور پر وُہ بے لوچ اور بدظن رہتا تھا۔ مکمل ہوتے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر وُہ کہتا "گیان، یہ امیر کتنے حقیر ہیں! تجھے کیا معلوم؟ مَیں ان کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ جس دِن یہ، اِن میں آ بسے حُسنِ اتفاق سے ہم اِدھر سے گزرے اور اپنی تخلیق کے اِن شاہکاروں کو دیکھنے کے لئے رُک گئے، یہ، ہمیں آوارہ، بدچلن اور چور سمجھ کر دھتکار دیں گے۔" مَیں اُس کی تنگ نظری پر یقین نہ کرتا، وُہ میری ناتجربہ کاری پر تُف کہتا، "تُو لونڈا ہے! تُو کیا جانے؟ آزما لینا! میرا کہا غلط ہُوا تو میرے مُنہ پر تھوک دینا۔"

اُس کے جذبات کی گرمی، گندمی رنگ پر پیازی لہر دوڑا جاتی اور دیر تک دکھائی دیتی جیسے اُڑتے ہُوئے لمحے ٹھہر جائیں۔

گھر بھروائی سے پہلے گھروں کے مالک اپنے بال بچّوں سمیت آتے۔ وُہ اِس دروازے کو کھولتے، اُس کھڑکی کو بند کرتے، ٹُونٹیاں گھماتے پھراتے، سنتا سنگھ کا رنگ دمک اُٹھتا۔ اُس کی اندرُونی حالت سے باخبر، مَیں سوچتا کہ اِس تعمیر کی بُنیاد اُس کے خُون پسینے سے رکھی ہُوئی ہے۔ اُس کا اِس تخلیق سے رشتہ اِحترام کا ہے، وُہ اِس سے نفرت کیوں کرتا ہے؟ مَیں اُس کی نفسیات کو سمجھ نہ سکتا اور اُس کے رویّے پر حیران ہوتا اور کبھی کبھی پریشان۔

میرے ساتھی اپنے وجُود کی سفاکی سے فرار پانے کے لئے گرُو گرنتھ میں سے حوالے دیتے،

جو تینوں مارن مُکیاں، تِناں نہ مارِیں گھُم
آپ نیڑے گھر جائے کے پیر تِناں دے چُم
(جو کوئی تجھے مُکا مارتا ہے تُو اُسے پلٹ کر مُکا مت مار۔ اُس کے پاس جا، پاؤں چُوم
اور کہہ کہ آپ مجھے مارنے کے لئے اِتنی دُور کیوں آئے؟ مجھے بلا لیتے، مَیں حاضر ہو جاتا)

لیکن عملی زندگی میں وُہ ذرا سی مخالفت پر بپھر جاتے اور مرنے مارنے پر اُتر آتے۔ مَیں اُن کے دِل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھتا، جہاں ناکامیوں کے اندھیروں کی حکومت تھی اور لعنت بھی۔ اُن اندھیروں کے دُوسرے نام محرُومی، بے نوائی، تہی دستی، بے چارگی، کم اصلی --- ہیں۔

میرے کپڑے گھِستے گھِستے کہنیوں، گھٹنوں اور چوتڑوں پر سے پھٹ گئے۔ مَیں چاک پر پیوند لگاتا، پُرانا پیوند نئے بخیوں کا ساتھ نہ دیتا، جہاں کہیں دباؤ پڑتا، وُہ لچر پڑوسی کی طرح مُنہ کھول لیتا، میرا مُنہ چڑاتا اور مَیں آزُردہ خاطر، اُس کا مُنہ تکتا۔ مَیں اپنے بچپن میں اِس

طرح اپنے زخموں کو دیکھتا تھا۔ میرے کپڑوں کے پیوند ایک طرح سے میرے رُوحانی زخم تھے جو کسی نہ کسی شکل میں میرا ساتھ نباہ رہے تھے۔ نئے کپڑوں کی توفیق کسے تھی! میں اُترن خرید کر پہننے لگا۔ مجھے جاننے پہچاننے والے میری تعلیم کی ہنسی اُڑاتے، میرے کام پر لعن طعن کرتے اور میری غریبی کو نشانہ بناتے۔ اُن سے میل جول رکھنا، گندگی میں رہنا تھا۔ اپنے ماحول کو قابلِ برداشت بنانے کے لئے میں ادبی باتیں کرتا۔ وُہ مجھے چڑاتے،

"اُردو کوئی زبان ہے! جدھر دُوسری زبانوں کا سر ہے، اِس کے پیر ہیں، پائیں نیچے کی طرح
جب لگی پھٹنے، شعر لگا پھرنے۔"

اُن کی زبان درازی کے کئی نمُونے پیش کر سکتا ہوں لیکن گریز کر رہا ہوں۔ اُن نامعقولوں سے دُور رہنے کے لئے میں اکیلا گھومتا اور کسی کے اِس خیال کی تائید کرتا۔

جہاں نہ اپنا گن چلے تہاں نہ اپنی تھاؤں
دھوبی رہ کر کیا کرے دِیگمبر کے گاؤں (دیگمبر، ننگا)

اکیلاپن ذی شعُور جوئندہ کے لئے سُود مند ہو سکتا ہے لیکن بے راہ رَو کے لئے ایک خلا ہے، وحشت کدہ ہے۔ وُہ میری رگوں کا ضُعف تھا جس نے میرے جنُون کو اُس کے مُنتہائے کمال تک نہ پہنچنے دیا اور اُسے مجنُوں کی سی بے سرو سامانی سے محرُوم رکھا جس سے اُس غریب کو شہرتِ دوام ملی تھی۔ دِلّی نے مجھے چند ہی مہینوں میں بدحواس کر دیا تھا۔ میں اُن لوگوں کے بارے میں سوچتا جو وہاں سالہاسال سے بستے تھے، وہیں پیدا ہوئے تھے اور کہیں جانے کا اِرادہ نہ رکھتے تھے۔ مجھے لگتا کہ وُہ لوگ میری ہی طرح آدھے پاگل ہیں لیکن اپنے پاگل پن سے بے خبر ہیں۔

اپنا دِل بہلانے کے لئے میں نے انوکھا طریقہ دریافت کیا۔ میں خُود کو اشعار سُناتا اور محظُوظ ہوتا۔ میں اِس فن سے گاؤں میں دِل بہلایا کرتا تھا لیکن شہر کی بھیڑ میں اِسے بھُول گیا تھا۔ اپنے شوق کی خُوشنُودی کے لئے میں نے اپنی تنہائی کے اوقات بڑھا لئے۔ وُہ یُوں کہ میں منہ اندھیرے کام کے لئے نکل پڑتا اور رات گئے لوٹ کر آتا۔ میں جب کبھی اس ٹھہراؤ سے گھبرا جاتا، سوچتا کہ میں خُود کو زمانے سے چھُپا رہا ہُوں یا اپنے آپ سے۔ میں اپنی بے نوائی میں اپنی ہمت طرح طرح سے باندھتا اور اپنے ملعُون و مطعُون حالات میں ندرت و نفاست پیدا کرتا۔ یہی وُہ زمانہ تھا جب میں شعر کہنے کی طرف مائل ہُوا۔ میرے جذبات میرے الفاظ پر اِس قدر حاوی تھے کہ میں اُن کی تشریح نہ کر پاتا۔ میری ناکامی میری شوریدہ سری کا باعث ہوتی۔ مجھے لگتا کہ میرا جسم الگ اور میری

رُوح الگ جی رہی ہے۔ میرا احساس دُرست تھا۔ میرے اعضا کل پُرزوں کی طرح اپنا اپنا کام کرتے تھے اور میری رُوح، عذابِ وقت سے نبرد آزما تھی۔ میں اُس ہر شَے سے دُور جی رہا تھا جس کی قربت جاں افزا خیالات کو جنم دیتی ہے۔ نرمی و نازکی میری زندگی سے کوسوں دُور تھے۔ میری تحقیر میری زنجیر تھی اور میری محرُومی میری بدحواسی۔ میں ہر بُری شَے سے نفرت کرتا تھا۔ رنگڑھ پورہ سے، ہوٹل سے، سیجا سنگھ سے، ساتھیوں سے ---- یہاں تک کہ اپنی صُورت سے! جو ہوتے ہوتے آم کی چُوسی ہُوئی گٹھلی کی مانند ہوگئی تھی۔ کہاں میں آئینے کے بوسے لیتا تھا، کہاں میں نے اُسے گرا کر توڑ دیا۔ میری وَحشت یہ برداشت نہ کرسکی کہ کوئی مجھے میری ذِلّت اور ہزیمت دکھائے۔ لیکن جُوں ہی میں نے آئینہ توڑا، میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا، تجھ میں ہمت ہے تو اپنی مجبُوری کا محاصرہ توڑ! تو اِتنی آسانی سے زندگی کی سچائی نہیں جُھٹلا سکتا! تُو کبُوتر دماغ ہے! جو بِلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔

میں اپنے کیے پر شرمندہ ہُوا اور آئینے کے ٹکڑے چُننے لگا۔ اُن میں مجھے اپنے مسخ شُدہ عکس نظر آئے۔ مجھے لگا کہ وُہ میری اندرونی اور بیرونی شخصیت کے سچّے نمایندے ہیں۔ میں اُنھیں خاکداں میں پھینک کر آیا، میرے دِل میں رخنہ پڑگیا۔ میں نے محسُوس کیا، "اپنی شکست کا ذِمّہ دار خُود میں ہُوں۔"

میں بے ساختہ رونے لگا، گویا اپنا ماتم کرنے لگا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی! میں اپنا ماتم کرنے کا عادی تھا اگرچہ ہر بار اُس کی وجہ الگ ہوتی تھی۔

باب ۴۸

طوفاں کو ڈراتا ہے سفینہ جن کا ، دریاؤں کا رُخ موڑ دے سینہ جن کا
وُہ زہرِ غمِ روز میں ہیں ڈُوبے ہُوئے ، اَمرت سے بھی بڑھ کر ہے پسینہ جن کا (شاطر)

آسمان کے نیچے کوئی عجُوبہ ہے تو وُہ دھرتی ہے، دھرتی پر کوئی عجُوبہ ہے تو وُہ آدمی ہے اور آدمی سے بڑھ کر کوئی عجُوبہ ہے تو وُہ آدمی کا دِل ہے۔ میں اپنے دِل کی منظر کشی کرتے ہُوئے کتنے ممکن و ناممکن مراحل سے گزرتا ہُوں۔ جیسے سمندر کناروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کرب و بلا کی داستان کہتا ہے ویسے ہی میرے دِل نے کاغذ و قلم کو ذریعۂ نوا پیرائی بنایا ہے۔ سمندر کی بے کلی کسی حد تک اُس

کی ظاہری کیفیت کی عکاسی کرتی ہے، نہ کہ اندرونی حقیقت کی، وُہی حالت میرے دل کی ہے۔ مَیں اِنتہائی کوشش کے باوجود وُہ تفصیل دُہرانے کے ناقابِل ہُوں جو میری اصلیّت ہے۔ آدمی کے جذبات و احساسات، بھول بھلیّوں کے راستے ہیں۔ یہ اِسے ہر جگہ لے جاتے ہیں لیکن کہیں نہیں پہنچاتے ہیں۔ آدمی اپنی ناکامی کی پریشانی سے بدحواس رہتا ہے اور کامیابی کے ہزاروں طریقے سوچتا ہے اور جو کچھ کر سکتا ہے، کر گزرتا ہے۔

میری ناکامی و پریشانی میری اپنی کہانی ہے۔ مَیں دِلّی کی گلیوں کی طرح پھیل کر سُکڑا ہُوا تھا۔ گلیاں کیا معمّے ہیں! روشن سے روشن اور تاریک سے تاریک مقام تک پہنچتی ہیں، ہر کسی کا سُراغ دیتی ہیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں کہتی ہیں۔

کام بند ہوتا اور ہر کوئی گھر کی راہ لیتا۔ مَیں کسی نہ کسی بہانے وہاں رُک جاتا، بُرادے کے ڈھیر پر لیٹ جاتا، آسمان کے دِل میں گھورتا اور باربط، بے ربط خیالوں میں کھو جاتا۔ دورُخی زِندگی کی طرح وُہ کبھی مَن بھاونے ہوتے اور کبھی ڈراؤنے۔ مجھ پر کیا کیا گزر جاتی! مَیں خُوش ہوتا، مَیں غم زدہ ہوتا، مَیں مُتحیر ہوتا، مَیں مُتاثر ہوتا، مَیں خوابیدہ ہوتا۔ میرے جذبات کا اُتار چڑھاؤ اُس لہر کی طرح ہوتا جو ہر بار نئی توانائی سے اُٹھتی ہے اور کنارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ شام کے سائے کسی سوگوار کے غم کی طرح گہرے ہونے لگتے۔ اُس اندھیرے اُجالے میں مَیں کسی سِتارے کو جِھلملاتے دیکھتا جو میرے ہی دِل کی طرح دھڑکتا معلوم ہوتا۔ مَیں زندگی کی بے مصرفی پر غور کرتا کرتا پتھر سا ہو جاتا۔ میرے پپوٹے، ڈھیلوں پر کُھلے کُھلے جم جاتے۔ مجھے اُسی وقت خبر ہوتی جب وُہ ٹیس سے دُکھنے لگتے۔ مَیں انھیں جھپکتا، وُہ خزاں زدہ پتّوں سے ہوتے، جو ہوا کے جھونکے سے ٹہنی سے ٹوٹ سکتے ہیں، لہرا نہیں سکتے۔ مَیں پپوٹے کھینچ کر بند کرتا اور آنکھیں مَلتا۔ وُہ عمل اِس قدر لذّت انگیز ہوتا کہ مَیں وقتی طور پر ہر آزار بھول جاتا۔ وُہ مرغوب لمحہ گزر جاتا۔ رات کی تاریکی اور میری تنہائی اور جذبات کی پستی، وحشت انگیز ہوتی۔ اُس تسلّط کو توڑنے کے لیے مَیں پہلو بدلتا اور گہری سانس لیتا، جس میں ٹھنڈی آہ کا اثر ہوتا۔ مَیں کانپ جاتا اور محسُوس کرتا کہ میرے جسم کی گرمی نمی میں بدل رہی ہے۔ میری حالت گیلی مٹّی کے اُس بُت کی سی ہوتی جس کی گھانی میں پانی کی مقدار زیادہ رہ گئی ہو۔

بڑھتے بڑھتے اندھیرے بڑھ جاتے سِتارے سہمے سہمے اور کمزور کمزور ٹمٹماتے جیسے میرے حالات کی غمّازی کرتے۔ میرا دماغ ماؤف ہوتا، لیکن دِل اِحساس سے دھڑکتا اور خُود آگاہی پر

مجبور کرتا۔ میں اپنے کپڑوں کے پیوندوں کو دیکھتا، ہاتھوں کے گٹّوں کو سہلاتا، تھکے ماندے اعضا کو ملتا جیسے اُن کی درماندگی میں اُن کی ڈھارس بندھاتا اور درد بانٹتا۔ میں اُن کی غم خواری میں اِس قدر کھو جاتا کہ مجھے دِل کی دھڑکنوں میں سِسکیوں کی سی کسک لگتی۔ میرے خیال سے وُہ چہرے گزرتے جن کے درمیان میں بڑا ہُوا تھا۔ کوئی چہرہ مجھے ایسا نظر نہ آتا جس پر محنت کی کڑی چھاپ نہ ہو، جو دشواریِ حیات کی واردات نہ ہو۔ اِس کے باوجود اُس محنت اور اِس محنت میں بُنیادی فرق تھا۔ وُہ فرق کیا تھا؟ میں سمجھ نہ سکتا۔ وہاں ماں چکّی پیستی ہُوئی سُہاگ گاتی۔ بھائیا جی گڈّا چلاتے ہُوئے مرزا گاتے اور سانگی پر بیٹھے جھومتے۔ تایا جی آب پاشی کرتے ہُوئے بانی گُنگناتے گویا پانی میں جیون امرت گھولتے۔ میرا اپنا رویّہ دیدنی ہوتا! میں خربوزوں کی رکھوالی کرتا ہُوا کوڑی بناتا اور اُس میں جُگنو بھر کر سر پر سجا لیتا۔ میرے جذبے کی رعنائی! میں یُوں مسرور ہوتا جیسے کوئی شاہ زادہ اپنی تاج پوشی پر۔ وہاں جدّوجہد کی شدّت ضرور تھی، لیکن بے اطمینانی اور ناگواری کا جذبہ نامعلوم تھا۔ میں مقابلے کے کام میں اپنے سے دوگنے سے بھڑ جاتا تھا۔ لیکن یہاں میرا ہر اِحساس ناتمام ہر شوق بے رُوح اور ہر عمل مفلوج تھا۔

کہاوت ہے، اُتم کھیتی، مدھم بیوپار، نکھد چاکری، بھیک دوآر۔ میں اِس کہاوت پر غور کرتا۔ اِن تینوں میں سے مجھے نوکری ہی اچھی لگتی لیکن انجنیر کی نوکری۔ میں انجنیرنگ پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دِل کی بات امر سنگھ سے کہہ دی۔ اُس کمینے نے میری بات مجھے تہمت بنا کر لوٹائی اور میں میٹریکولیٹ کے بجائے انجنیر صاحب مشہور ہو گیا۔ اُن نامساعد حالات میں میرے لئے یہ لقب یُوں تھا جیسے اندھے کے لئے نین سُکھ۔

میں کام سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں بچتر سنگھ مل گیا۔ وُہ پڑھنے لکھنے میں یُوں ہی تھا اور پرائمری پاس کر کے راج گری سیکھنے لگا تھا اور پُورا معمار بن گیا تھا۔ وُہ اپنے بچپن میں کُتّوں سے ڈرتا تھا اور کھڑا کھڑا ہگتا تھا تاکہ کُتّا دیکھتے ہی بھاگنے میں آسانی رہے۔ جب میں اُس کا ٹھٹھا اُڑاتا تھا، اب وُہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے ذلیل کرتا تھا۔ وُہ تُرنت بولا "کیوں بھئی؟ سُنا ہے انجنیرنگ پڑھ رہے ہو!"

"بالکل پڑھ رہا ہُوں!" میں نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"خرچہ کیسے چلاتے ہو؟ گانڈ مرواتے ہو کیا؟" وُہ یہ بکواس کر کے مُسکرایا جیسے مجھ سے اپنے برمحل تبصرے کی داد چاہتا ہو۔

"تیری تو ماں کی ۔۔۔۔" میں گالی دیتے ہوئے سڑک کے کنارے پڑے پتھروں کے ڈھیر کی جانب لپکا لیکن جب تک اُسے پتھر اُٹھا کر مارا، وہ پتھراؤ کی زد سے دُور جا چکا تھا۔

میری زندگی میں کتنے لمحے آئے جب میری مجروح ذات مجھ سے کوئی بھی سنگین جرم کروا سکتی تھی اور دم بھر میں مجھے میری بدنصیبی کی انتہا کو پہنچا سکتی تھی۔ وہ خطرناک لمحے کسی طرح بخیر گزر گئے لیکن میرے دل میں بدلے کا جذبہ بھر گئے۔ میں یہاں ایک اعتراف کرتا ہوں جس کی نوعیت میری کہانی ہی کی طرح یکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا قانون ہے جو مجھے میرے خیالی جرائم کی سزا دے سکتا ہے تو میں سو بار، شاید ہزار بار پھانسی کا مستحق ہوں۔

دلی میں آدمیوں کے انبوہ تھے، پریشاں پریشاں، حیراں حیراں، دھواں دھواں، ویراں ویراں ۔۔۔۔ جیسے شیطانی طاقت نے انسان کے احساسِ تعمیر کو جذبۂ تخریب میں بدل دیا ہو۔ پرندوں کے چہچہے، موروں کے ناچ، لہلہاتے کھیت، جھرنوں کے نغمے ناپید سہی، موجِ صبا تک اُس لمس سے بیگانہ تھی جو اُداس غنچوں کو گدگدا کر کھلنے اور مہکنے پر مجبور کرتی ہے۔ آسمان پر ستارے تھے لیکن اُن کا جھلملانا کسی کو لبھاتا نہ تھا۔ چندا ماما کی طرف کوئی دیکھتا نہ تھا جیسے اُس میں کوئی دل کشی نہ ہو۔ پیٹ پالنے اور پیٹ مسوسنے کے جذبے کے سوا ہر وجدان غیر واضح اور بے آہنگ تھا۔ کائناتِ انسان اتنی چھوٹی تھی کہ روٹی کی ٹکیا میں سکڑی ہوئی تھی۔

گاؤں میں چاند ستاروں کی اہمیت اُن کی قدر و قیمت تھی۔ میری تائی ماں، چاندنی رات کو 'دودھ نہائی دلہن' کہتی تھی۔ چاندنی کی خوشگواری، حُسن کاری سے عبارت ہے۔ تر نجن (لڑکیوں کا مل بیٹھ کر چرخہ کاتنا، خاص کر چاندنی راتوں میں) میں بیٹھی گرمیت کور جیسی بدشکل لڑکی، خوش شکل لگتی تھی۔ کسان، چاند کے ساتھ کھیتوں کو جاتے، ہل چلاتے، فصل سنبھالتے، رہٹ ہانکتے کھاد پیڑتے، نلائی کرتے ۔۔۔۔ اور سورج طلوع ہونے سے پہلے گھروں کو لوٹ آتے۔ لوک گیتوں کی دھنیں، بیلوں کی جھانجوں کی جھنکاریں، چرخوں کی غوں غوں، پریوں کے افسانے تھے۔ اُن جگمگاتی جاگتی راتوں میں دھرتی اور دھرتی کی ہر شے سہانے اور مستانے رُوپ میں ڈھل جاتی تھی اور مدھر الاپ میں مگن لگتی تھی۔

ماں کہتی تھی، "سورج بنا سپتی اُگاتا ہے اور چاند اِس میں میٹھے، سلونے رس بھرتا ہے۔"

میں گاؤں کے چاند اور سورج کا شہر کے چاند اور سورج سے مقابلہ کرتا۔ اُن کے مقابلے

میں یہ مدقوق تو تھے ہی، بے کار بھی تھے، شاید اسی لئے شہریوں کی بے توجہی کا شکار تھے۔ شہر کے نزاعوں، اختلافوں، فسادوں، کینوں ۔۔۔ کو دیکھ کر لگتا کہ یہاں سورج، بناسپتی کی جگہ اُدھورے انسان پیدا کرتا ہے اور چاند، اُن میں کڑوے، کسیلے خیالات بھرتا ہے۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے نظاروں سے لطف اُٹھانا دور کی بات ہے، میں کئی کئی دن تک آسمان نہ دیکھ پاتا۔ کبھی دیکھتا تو اُس کی بے رنگی سے اخذ کرتا کہ وہ زمانے کے جھمیلوں سے چھٹکارا پانے کے لئے دور، بہت دور جا بسا ہے۔

میں جتنا اپنے باہر ویران تھا اُس سے زیادہ اپنے اندر سنسان۔ میں بُرادے کے ڈھیر پر مُردوں کی طرح پڑا رہتا حتیٰ کہ بھوک، کچوکے لگاتی اور مجھے میرے زندہ ہونے کا احساس دلاتی۔ میں کراہتا ہوا اُٹھتا اور پیٹ پاٹنے کے لئے ہوٹل کی راہ لیتا۔ میں بھوک کے سوائے ہر جذبے سے عاری ہوتا۔ میری افسردگی! مجھے ہر چیز دھندلائی اور مرجھائی نظر آتی۔ اپنی صحیح سمت کا جائزہ لینے کے لئے، میں کسی جانی پہچانی چیز کو پہچاننے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھ سے دور بھاگتی نظر آتی جیسے مجھ سے خوف زدہ ہو۔ آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی، سڑک، صبح کے مقابلے میں لمبی اور زیادہ چوڑی لگتی جیسے اُس کے دونوں کناروں پر مکین و مکاں میری آمد کی باس پا کر سکڑ گئے ہوں۔ میری اپنی سانس کا رویہ مجھ سے بدلا بدلا ہوتا۔ وہ اُس چنگاری کی مانند ہوتی جو کہ بیگا ہے الاؤ سے ٹوٹتی ہے اور ذرا اونچی اُڑ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں عاجز و لاچار ہوٹل پر پہنچتا۔ وہاں کوئی دوسرا گاہک نہ ہوتا اور بیرے بچا کھچا کھانا سمیٹنے میں مصروف ہوتے۔ وہ مجھے ایسے دیکھتے جیسے دل میں کہہ رہے ہوں، "تو اس وقت کہاں سے آمرا ہے؟" میں اُن کی تیوری کی گھُرکی سنتا لیکن خاموش رہتا اور بے وقت بھکاری کی طرح اُن کا مُنہ تکتا۔ اُن میں سے کوئی ایک بڑبڑاتا ہوا، تھالی میں کھانا پھینکتا اور اُسے جھٹکے سے میری طرف بڑھا دیتا۔ میں تھالی میں پڑے کھانے کے ساتھ اُس نفرت انگیز کردار کو دیکھتا جو میری بھوک کا چارہ کرتا۔ میں تھڑے پر کھڑے کھڑے کھانا کھاتا۔ جو بیروں کے جذبات کی طرح مکروہ ہوتا اور تھالی کی دھات کی طرح ٹھنڈا۔ میری تسکین اُس بھوکے بچے کی سی ہوتی جسے رونے اور چلانے ہی سے ماں کا دودھ نصیب ہو۔ اُس بے چارے کی رگوں میں دودھ کی شیرینی کم اور آہوں کی تلخی زیادہ ہوتی ہے۔

ہوٹل کے ملازم، گندے فرنیچر کو اُس سے زیادہ گندے کپڑے سے صاف کرتے اور اُسے اِدھر اُدھر کھسکا کر فرش پر بکھری ہوئی گندگی سمیٹتے۔ وہ ایک دوسرے کو اُس کی کاہلی پر

کوستے اور گاہکوں کی گنوارُد عادات پر ملامت کرتے، جن کی وجہ سے اُن کا کام، رات کے پچھلے پہر تک کھچ جاتا تھا۔ وہ جوں ہی اُس ناخوشگوار فریضے سے نجات پاتے، اندھیرے گوشوں میں سے میلی کچیلی گودڑیاں نکالتے، زمین پر بچھاتے اور اُن میں گھس کر ایسی رضا و رغبت کا اِظہار کرتے جیسے بدرو سے بھٹکے ہوئے کیڑے، اُس میں واپس رینگ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اُن بدنصیبوں سے ہمدردی جتاتا ہُوا، مَیں اپنے گھر پہنچتا۔ میرے جذبات کا عارضی پَن ! مَیں جوں ہی بستر پر دراز ہوتا، اُن کا غم بھول جاتا۔ میری تکان، تلووں سے اُٹھتی اور ایڑیوں ٹخنوں، پنڈلیوں، گھٹنوں، جانگھوں سے ہوتی ہوئی، وسط میں آکر بیٹھ جاتی جیسے وُہ جگہ آمد و رفت کا نُقطۂ اِرتکاز ہو۔ وُہ مجھے ترغیب دیتی کہ مَیں اُسے سہلاؤں۔ مَیں اِنکار کرتا تو اُس کا اِصرار بڑھ جاتا اور مَیں مجبور ہو کر اُس کا کہا مان لیتا۔ لُطف، حواس کا ناپائدار تاثر ہے لیکن حواس اور اعضا اپنے کمالِ اِتّصال سے اُس میں اِستمراری ناپایداری کی کیفیّت پیدا کر دیتے اور مجھے اُس مقام پر پہنچا دیتے جہاں رُوحانی حقائق مُنکشف ہوتے ہیں۔

باب ۴۹

جذبات سے دیوانہ ہُوا جاتا ہُوں، حالات سے بیگانہ ہُوا جاتا ہُوں
جب سے مَیں ہُوا اپنی حقیقت کا نقیض، بے جوڑ سا افسانہ ہُوا جاتا ہُوں (شاطر)

حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہاں ہر کوئی اپنے پیشے سے بیزار تھا لیکن دُوسرے کے پیشے کو بہتر سمجھتا تھا۔ اِس تعلّق سے کاریگروں میں نوک جھوک چلتی رہتی تھی۔ لیکن کئی بار نوک جھوک سے قولِ مُتناقض جھلکتا تھا۔

پیارا سنگھ نے جگت سنگھ پر چوٹ کی، "تیرا کام اچھا ہے! دھوپ پانی سے آرام ہے اور بالن مُفت کا۔ میری آدھی دہاڑیاں میگھ ناتھ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

"ناں بھئی ناں، کام تیرا اچھا ہے! ایک اینٹ ٹھیک سے نہ ٹُوٹی تو دُوسری توڑ لی، سائل میں نہ بیٹھی تو اُٹھا کر بٹھا لی، چُنائی ٹیڑھی ہو گئی تو پلستر میں سیدھی کر لی، تیرے تو مزے ہی مزے ہیں۔ بڑھئی کی آری اور درزی کی قینچی کا چلن ایک ہے، نظرثانی کو اِس سے معاملہ

ہی نہیں!" جگت سنگھ نے اُسے کھینچا۔

"دیکھو تو ہمارے پیشے سے جُلاہے کا پیشہ اچھا ہے! زیادہ تانیاں آگئیں تو اُٹھا کر اندر رکھ لیں اور دِن رات کام کر کے چار پیسے زیادہ کما لیے۔ ہماری جو دِہاڑی لگ گئی، لگ گئی"۔ پیارا سنگھ نے اُس کی ٹانگ لی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو!" جگت نے اِعتراف کیا۔ "جُلاہا کام کے لئے مارا مارا بھی نہیں پھرتا ہماری طرح! اُس کا کام اُسے ڈھونڈتا ہے۔ جِتنا وقت ہم کام پر جانے آنے میں برباد کرتے ہیں اُتنے میں وُہ گز، دو گز کپڑا بُن لیتا ہے"۔ اُس نے اپنی بات سے نیا نکتہ پیدا کیا۔

"پھر کیا ہُوا! آخر وُہ ہے تو جُلاہا ہی"۔ پیارا سنگھ نے اُس کی بات کو رد کرتے ہُوئے کہا۔

اِس سے پہلے کہ جگت سنگھ کچھ کہتا، وُہ ترارا بھر کر سائیکل پر سوار ہُوا اور یہ جا، وُہ جا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مُجھے اور کسی سے ہمدردی ہو تو ہو، مَیں کلرکوں کا نکتہ چیں تھا۔ وُہ دیر سے کام پر جاتے اور پہلے واپس آتے۔ ہفتہ وار چُھٹی کے علاوہ اُن کی دُوسری چھٹیوں کی بُہتات تھی۔ اُن تمام لیوز (مَیں ڈُمّوں کو نظر انداز کر رہا ہُوں۔ ڈُمّہ، بغیر درخواست کے چُھٹی لینا) ارنڈ لیوز، میڈیکل لیوز، کیثرُوئل لیوز، نیشنل ہولی ڈیز کو مِلا دَو تو دو ورکنگ ڈیز کے بعد تیسرا دن چُھٹی کا ہوتا ہے، لیکن وُہ اُس پر بھی مُطمئن نہ تھے۔ اُس وقت ایک ذِلّت آمیز روایت تھی اور اب بھی ہے۔ ایڈ منسٹریشن اور انڈسٹری کے ورکنگ آورز جُدا جُدا ہیں اور پہلی کے دُوسری کے مُقابلے میں کم ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ پہلے دِماغی اور دُوسرے جِسمانی کام کرتے ہیں جو زیادہ تکلیف دِہ ہے۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وُہ کون سا کام ہے جِس میں دِماغ خرچ نہیں ہوتا؟ مَیں شیر سنگھ کے حوالے سے ایک بات کہتا ہُوں۔ میاں، آدمی کو پاخانہ پھرنے کے لئے بھی دِماغ کی ضرورت ہے! اُس نازک گھڑی جو پانچ 'پ' کا خیال نہیں کرتا، وُہ جانور ہے۔

پ۱ پانی ساتھ رکھو۔

پ۲ پنڈ سے دُور جاؤ۔

پ۳ پاؤں کا خیال کرو۔

پ۴ پلّو سنبھالو۔

پ۵ پَون کا رُخ دیکھ کر پھرو۔

جن لوگوں نے اِن دونوں شعبوں میں فرق سمجھا ہے، وُہ ذلیل تھے! اَور جو اِس فرق کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، وُہ ذلیل تر ہیں! اس ترقی یافتہ فضا میں اُن کا دِماغ اُسی تنزّل کا شکار ہے جو صرف جاگیر دارانہ ذہنیت کی لعنت ہے۔

میرے شناساؤں میں ایک نئے نام 'رام سنگھ پیار' کا اِضافہ ہوا۔ وُہ شاعر نہ تھا لیکن تخلّص کرتا تھا۔ اُس میں خوبی یہ تھی کہ وُہ اَدب دوست تھا۔ میری رسائی اُردُو کتابوں اَور رسالوں تک ہوگئی۔ مَیں ساحر لُدھیانوی کے کلام سے متعارف ہُوا جو میرے حالات وجذبات کی کامل عکّاسی تھی۔ مَیں خُود سے اِستفسار کرتا " میرے کرب وبلا اَور رنج وغم کی باتیں ساحر کو کیسے معلُوم ہیں ؟ اِس چھوٹی سی تبدیلی کے بغیر میرا معمُول جُوں کا تُوں رہا۔ مَیں ساحر کے اَشعار گُنگُناتا تو میرا اِحساس گُلِ تر کی طرح مہک اُٹھتا۔ مَیں اپنے آپ کو اَور اپنے ماحول کو تازہ بصیرت سے دیکھتا، جو اِتنا خراب نہ تھا لیکن میری تنگ دِلی اَور کم نظری سے کُچھ زیادہ ہی خراب لگتا تھا۔ ساحر کے جذباتی مُطالعے سے مَیں کئی دُوسری جبلّتوں سے رُوشناس ہُوا، جو ہر بُحران کی تائید و تردید ہوتی ہیں۔ جب مَیں حوصلہ ہار دیتا مَیں اُن حالات کو اپنا نصیب سمجھتا جو میرے شب وروز بنے ہُوئے تھے۔ اگر مَیں روتا، مَیں گیلی مٹّی کا ڈھیر ہوتا، جس کی تشکیل، کمہار کی مرضی کی اِحسان مند ہے۔ مَیں حوصلہ باندھ لیتا تو آب دیئے لوہے سا بے لچک ہو جاتا۔ وُہ لوہا بظاہر لوہا ہی ہوتا ہے لیکن اُس کے اندرُونی اَوصاف بدل جاتے ہیں، وُہ کسی دُوسرے لوہے سے بھڑ تا ہے تو اُس کے سینے میں اُتر جاتا ہے۔

ایک رات مَیں کام سے لوٹ رہا تھا کہ مَیں نے چھوٹا سا جمگھٹا دیکھا جہاں کوئی غزل گا رہا تھا۔

خُدا نے زندگی میری غضب کے درمیان رکھ دی
اِدھر نوکِ سناں رکھ دی اُدھر برقِ تپاں رکھ دی
چمن کے رنگ وبُو نے اِس قدر دھوکے دیئے مُجھ کو
کہ مَیں نے ذوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

ناگہاں میرے سامنے کِشن سنگھ اُپاسک آ کھڑا ہُوا۔ وُہ سری رام بتیل کا ہم پیالہ اَور ہم نوالہ تھا، اُس رشتے سے مَیں اُسے حدِ ناپسندیدگی تک پسند کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت مَیں اُس کمزوری کا شکار تھا جسے غریب الوطنی کہتے ہیں۔ اِنسان کی بے کسی، شدّتِ جذبات سے کسی سہارے کی مُتلاشی ہوتی ہے اَور وطن کی جانب سے بادِ سموم بھی آئے تو ٹھنڈی اَور بھینی بھینی لگتی ہے۔ بُرے وقت میں اِتنا ہی

اور منفی جذبوں کی بے رحمی اپنے انجام پر ہوتی ہے۔ آدمی بھوکے وحشی کی طرح سبزہ زار دیکھتا ہے یا اُجڑے ویرانے۔ غزل کے سوز و گداز کا اثر ایسے زائل ہُوا جیسے لذیذ لقمہ کھاتے ہُوئے دانتوں میں کنکر آجائے۔ میری افسوسناک حالت دیکھ کر وُہ اُداس ہو گیا۔ اُس نے میرے ہاتھ چُومے، آنکھوں سے لگائے اور مجھے سنبھالتے ہُوئے کہا "گیان جی، آپ اِس کام کے لئے نہیں بنے! آپ کی منزل اور ہے۔ آپ میرے پاس رہیں، آگے پڑھیں اور اپنا مستقبل بنائیں۔" میری بے بال و پری کو پرِ پرواز دیتے ہُوئے اُس نے کتنے نام گنوائے، جن کو مَیں جانتا تھا لیکن پہچانتا نہ تھا۔ مَیں اُس کے حلقۂ احباب پر حیران تھا۔ وُہ میری نظروں میں کیا سے کیا ہو گیا! فخر کی بات یہ تھی کہ وُہ سب اُس کی کویتا کلا کی برکت تھی۔ فرطِ جذبات سے اُس نے مجھے گلے سے لگا کر بھینچا گویا وُہ مجھے سارِ ہستی سے بچا کر اپنے دِل میں رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے مل کر مجھے لگا کہ مَیں نے اپنے کسی کھوئے ہُوئے قیمتی ارمان کو پا لیا ہے۔ مَیں اُس کے ساتھ ہو لیا، یہ جانے بغیر کہ وُہ کہاں جا رہا ہے۔ اُس کے پاس ہرکولیس کی نئی سائیکل تھی جو میری دِلی آرزو تھی۔ اُس نے مجھے سائیکل پر آگے بٹھایا اور اجمل خاں پارک میں لے آیا۔ ہم ہری بھری گھاس پر بیٹھ گئے۔ وُہ میری کمر میں بانہیں ڈالے ہُوئے تھا اور مَیں اُس کی کمر میں۔ ہم ایسی خوشگوار باتیں کر رہے تھے جن کا واسطہ سُہانے حالات اور پیارے جذبات سے تھا۔ مَیں نے اُسے اُس آدمی سے الگ پایا جسے مَیں ہریانہ میں جانتا تھا۔ اِنتہائی خوشی کی بات یہ تھی کہ اُسے میری ناداری سے نفرت نہ تھی۔ اُسے میری قابلیت پر بھروسا تھا جسے میرا باپ اپنی کم ظرفی میں دیکھتا نہ تھا۔ مَیں ہر طرح سے بہل گیا اور دھڑکن دھڑکن اُسی کا ہو لیا۔ ضرورت اور عُسرت ایسے دَرد ہیں جو کسی کے اِحساسِ خاطر سے گھٹتے ہیں اور ترکِ احساس سے بڑھتے ہیں قارئین، میری حالت عجیب تھی! مَیں ہر کسی کو اپنے خُوش آیند زمانے کی خُوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ مَیں پارک میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کو اِکٹھا کر کے اپنا رازداں بنانا چاہتا تھا اور کسی بُلند مقام پر کھڑے ہو کر پُکارنا چاہتا تھا۔ "دُنیا والو! میری عاجزی کے اندھیرے مِٹ گئے ہیں! مَیں اُن اُجالوں میں گِھرا ہُوا ہُوں جو میری سربُلندی کا مینارۂ نُور ہیں۔"

میری رُوح کے پنکھ نکل آئے۔ مَیں زمین سے اُڑ کر آسمان پر جا بسا جہاں سے دِلّی کے عالیشان مکان، گھروندے نظر آ رہے تھے اور بجلی کے قمقمے، بے حقیقت شرارے۔ اُونچے درخت، زمیں بوس سبزے لگ رہے تھے اور کُشادہ سڑکیں، سکڑی ہُوئی پگڈنڈیاں۔ میرا شوقِ پرواز! عرشِ بریں میرے پیروں کے نیچے تھا۔ مَیں مُطلق العنان تھا اور سرکشی کی حدِ اکبر پر براجمان۔ میرے سامنے ہر شے حقیر تھی اور میرے رحم و کرم پر تھی۔ آدمی، گندگی کے رینگتے ہُوئے کیڑے تھے اور اُن کی زاری و نزاری میری

رُوحانی ترقی۔ اُنھیں فلاکت زدہ دیکھ کر مَیں مسرور تھا۔ میری ذِلّت و رُسوائی کی مُسلسل تکلیف نے مجھے بھیانک حد تک اذیّت خواہ بنا دیا تھا۔ اِنتقام جُوئی میں کیسی مسرت تھی! اپنی شرم ناک دُنیا کو تاراج کر کے مَیں نے اُس کے خرابے سے جو کائنات تخلیق کی تھی اُس کی شان و شوکت فوق الادراک تھی۔

میری نفرت نے مجھے نیا اِحساس دیا تھا، محبّت، محبّت کو جنم دے کہ نہ دے، نفرت، نفرت کو جنم ضرور دیتی ہے!

مَیں خُود آرا و خُود مُختار تھا۔ میری ایک خواہش کے ساتھ دُوسری خواہش جاگ رہی تھی۔ خواہش موافق ہو رہی تھی۔ مَیں سانس سانس سرُور تھا، انگ انگ نُور تھا، نظر نظر ظہور تھا۔ مجبُوری، کمتری، معذُوری، رنجوُری ۔۔۔۔ مَیں ہر اُس جبلّت سے دُور تھا جِس کو زوال و انحطاط سے نِسبت ہے۔

وُہ رنگڑھ پُورہ سے دُور آنند پربت پر رہتا تھا۔ آنند پربت! کیسا جذبات خیز نام ہے! راستے میں ایک جگہ رُک کر اُس نے مجھ سے کہا، "آپ جائیں اور سامان لے آئیں، مَیں یہاں اِنتظار کرتا ہُوں۔"

اُس کا مؤدّب لب و لہجہ اور سائیکل پکڑاتے کا شائستہ انداز! مَیں مہک گیا۔ مَیں سائیکل پر سوار ہُوا، اُس کے نئے پن کا لمس میری تجدید کر گیا۔ مَیں رنگڑھ پُورہ کے علاقے میں پہُنچا، کھالوں کی اَنٹ سڑاند کبھی اِتنی گھناؤنی نہ تھی۔ مَیں گھر میں داخل ہوتے ہی سامان اِکٹھا کرنے لگا۔ جگت سنگھ نے چھبتے ہُوئے لہجے میں پُوچھا، "کیا اِرادہ ہے؟ چھوٹے بھائی!"

اُس صُورتِ حال سے نپٹنے کے لئے، مَیں پہلے ہی سے تیار تھا۔ مَیں اُس سے آنکھیں چُراتے ہُوئے، سامان سمیٹتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ ممکن ہے، میرا چہرہ، دِل کا راز کہہ دے یا باتوں باتوں میں بات کھُل جائے۔ وُہ میرے سامنے ہوتا تو مَیں اُس سے مُنہ پھیر لیتا۔

"اوہ، یہ بات ہے!" اُس نے حیرت سے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھ! اپنی مرضی سے آیا تھا اور میری مرضی سے جائے گا!" اُس نے میرا ٹرنک بند کیا اور میرے ہاتھ سے سامان لے کر پھینک دیا۔

"لیکن کیوں؟" مَیں نے نرم سی زبان میں اِحتجاج کیا۔ اُس کا انداز مجھے زہر لگا لیکن میں اندر ہی اندر پی گیا۔

"کہہ تو دیا، میری مرضی!" اُس نے رُعب سے کہا۔

اُس کے سخت رویّے سے مَیں سوچ میں پڑ گیا اور کوئی راہ نہ پا کر مَیں نے بے دِلی سے

کہا، "میں جارہا ہوں!"

"جارہا ہوں۔ یہ کوئی جواب ہے؟" اُس نے جھڑکا۔

بظاہر یہ نہایت بامعنی الفاظ ہیں لیکن مجھے بے معنی لگے۔ میں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور چپ رہا۔ میں کچھ دیر رُکا اور پھر سامان سمیٹنے لگا۔ وہ راہ بستہ دیوار کی طرح میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور دو ٹوک بولا، "تو جانے پر بضد ہے، ٹھیک ہے، جا! لیکن بتا کر جا!" میں نے اِس پر بھی دم نہ مارا تو اُس نے فلسفہ بگھارا، "میرے پیارے، یاد رکھ! ٹوٹا بازو، گل جنڈڑا ہی سنبھالتا ہے! میں کتنا ہی بُرا سہی، تیرا پھُپھیرا بھائی ہوں۔" اُس نے جس جذباتی لہجے میں کہا، میں اُس سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنے بہی خواہ کی تلقین کے باوجود سب کچھ اُگل دیا جو مجھے راز میں رکھنا چاہیئے تھا۔

"اوہ، وہ!" اُس کے اظہار میں حیرت سے بڑھ کر استعجاب تھا۔ "وہ حرامی شاعر! تجھے کہاں مل گیا وہ؟"

اُس نے میرا مذاق اڑانے کے سے انداز میں منہ بنایا۔

یہ جان کر مجھے رنج ہوا کہ جگت سنگھ اُسے جانتا ہے لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا، "تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہوشیار پور کے جتنے بڑھئی دِلّی میں رہتے ہیں، میرے ناخنوں میں پڑے ہیں۔ میں جگت گرو ہوں! اور ترکھانوں کے پوتڑوں سے واقف ہوں کہ وہ انہیں کہاں سُکھاتے ہیں۔ وہ تو شاعر ہے، سونے پر سہاگہ! کیا وہ آنند پربت پر نہیں رہتا؟ ملٹری کی بارکوں کے اِدھر۔" اُس نے جس یقین سے کہا اُس میں گمان کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ دھم سے میرے ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ ٹرنک پورا بھرا نہ تھا، دھپ کی آواز آئی اور ڈھکن اندر دھنس گیا۔ میں نے اُسے تشویش سے دیکھا لیکن وہ بیٹھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا الزام دیتے ہوئے بولا، "جیسا تُو، ویسا ہی تھوتھا تیرا ٹرنک!" اِس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔ میں اُس کے کاٹنے چھانٹنے پر نالاں ہوا اور بچپن میں سنی ہوئی ایک کہاوت پر غور کرنے لگا۔ ترکھان ایسے بدذات ہیں کہ ایک ساتھ ہو کر اپنے مُردے تک نہیں پھونک سکتے۔ اِس کہاوت کی تفصیل ضروری ہے۔ جب ترکھان چِتا چُننے لگتے ہیں، ایک ترکھان چتا کی لکڑی ایک طرح سے رکھتا ہے، دوسرا اُسے اُٹھا کر دوسری طرح سے رکھ دیتا ہے، تیسرا اُسی لکڑی کو اپنے طریقے سے ترتیب دیتا ہے اور چوتھا اپنے طریقے سے، نتیجے کے طور پر وہ چِتا چُننے میں ناکام رہتے ہیں اور مُردہ پھونکنے سے بھی۔ اُن کی اِس نفسیات کا راز یہ ہے کہ ہر ترکھان اپنے آپ کو وِشوا کرما (وہ دیوتا جو سرشٹی کا کرتا دھرتا ہے)

کا اوتار مانتا ہے اور اپنے کام کے علاوہ ہر کسی کے کام کو ناقص گردانتا ہے۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جگت سنگھ میری خوش بختی پر تہمت طراز ہے۔ اتنے میں وہ سٹول اٹھائے اندر آیا، میرے سامنے رکھا اور اس پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا۔ مجھے گھور کر دیکھا جیسے میں نادان بچہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں کوئی بات کروں لیکن مجھے بے اثر دیکھ کر وہ اعلان کرنے کے سے انداز میں بولا "تو کس دنیا میں رہتا ہے؟ یہ دلی ہے، دلی! یہ چھنال اسی کی ہوتی ہے جو اسے لوٹ لے، جو اسے لوٹ نہ سکے یہ اسے لوٹ لیتی ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رک گیا اور میں ہکا بکا اس کا منہ تکنے لگا۔ میری تذبذب میری الجھن بنی ہوئی تھی۔ وہ سٹول پر سے ایسے اٹھا جیسے وہاں بیٹھنا اس کی بے چینی کا باعث ہو۔ وہ میرے برابر کھڑا ہو گیا، میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھ پر جو ہویدا کیا وہ دلی والوں کی پوشیدہ حقیقت ہے۔ "گاؤں والوں کے پاس دو زبانیں ہیں، ایک میٹھی اور دوسری کڑوی۔ لیکن دلی والوں کے پاس پانچ زبانیں ہیں، سمجھے!" وہ دوبارہ سٹول پر بیٹھ گیا اور میں اپنی مجہولیت پر نادم اس کے سامنے دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ وہ بظاہر مجھ سے مخاطب تھا لیکن اندرونی طور پر اپنے آپ سے۔ "دلی والوں کے پاس پانچ زبانیں ہیں، دل ایک بھی نہیں!" اس نے اپنی پہلی بات پر نظرِ ثانی کر کے اپنی بات بڑھائی، "پہلی زبان ان کے منہ میں ہے جو ان کے کاروبار چلاتی ہے۔ دوسری زبان ان کی آنکھوں میں ہے جو دیکھتی ہے کہ کہاں کون سی بات کہنی ہے۔ تیسری زبان ان کے کانوں میں ہے جو سنتی ہے لیکن چپ رہتی ہے۔ چوتھی زبان ان کے پیٹ میں ہے جو فقط اپنے مطلب کی بات کرتی ہے۔ اور پانچویں زبان ان کے دماغ میں ہے! اسے اپنوں سے مطلب ہے، نہ پرایوں سے۔ یہ اسی وقت سامنے آتی ہے جب اسے اورنگ زیب کا سا کردار ادا کرنا ہو۔ یہاں کوئی جو کہہ رہا ہے، اس کی سچائی سننے والے کی سوجھ بوجھ پر منحصر نہیں کہنے والے کی اصلیت پر موقوف ہے۔ چوں کہ دلی والے بے دل ہیں اس لئے بے تحمل ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصود ہے، اپنے فائدے کے لئے کسی کا نقصان کرنا۔"

میری نیت اس سناٹے کی طرح ٹوٹی جس میں کوئی چیخ مار دے۔ لیکن میں جوں ہی موافق و مخالف حالات کا تجزیہ کرنے لگا، میرا شاندار مستقبل مجھے پکارنے لگا۔ عین اس وقت گنڈوں کے احاطے کا دروازہ کھلا اور بھبک سے بدبو کا ریلا آیا۔ وہ متعفن شے کبھی اتنی متعفن نہ تھی۔ ایک اڑتی ہوئی نیتش بھی جو رگ و پے میں اتر گئی۔ ان حالات سے میری نفرت پھر بڑھ گئی اور میں سامان باندھنے لگا۔ مجھے غیر متاثر دیکھ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور افسوس سے کہا، "یار میں تو ان پڑھ ہوں! تو پڑھا لکھا ہو کر نہیں سمجھا کہ کوئی کسی کی بے مطلب مدد نہیں کرتا۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور باہر نکل گیا۔

وُہ جاتے ہی لوٹ آیا اور چھتری لے کر پھر چلا گیا جیسے موسم مشکوک ہو۔

مَیں نے اُس کی ہر بات پر سنجیدگی سے غور کیا، وُہ دُرست لگا۔ مَیں ارادہ بدلنے ہی والا تھا کہ میرے دِل نے مجھے بھڑکایا "گیان، یہ تیری ٹانگ کھینچ رہا ہے۔ یہ وُہی ہے جس نے آدھا کرایہ پیشگی لیا تھا۔ تُو چلا گیا تو اِسے پُورا کرایہ دینا پڑے گا۔ تیرے مستقبل سے زیادہ اِسے اپنے حال کی فکر ہے۔" اُس کی وُہ مہربانی جو اُس وقت رحمتِ ناگہانی لگی تھی، مجھے نشتر کی طرح کھٹک گئی۔

میرے قارئین! میری زندگی میں جو کوئی آیا، جس کسی نے میرے لئے کچھ کیا، مَیں نے کسی نہ کسی طریقے سے اُسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ یہ میری فطرت کی تلوّن مزاجی ہے یا احسان مندی کی کینہ پروری، جس کا حصول اپنے محسن کی تذلیل ہے۔

"وُہ تجھ پر اِتنا مہربان کیوں ہے؟"

مَیں نے خُود سے ایسے سوال کیا جیسے اوہام پرست کوئی بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے قرعۂ فال نکالتا ہے۔ خُود سے کوئی صاف جواب نہ پا کر مَیں دو حصّوں میں بٹ گیا۔ ایک جِتنا پُر اِعتماد تھا دُوسرا اُتنا ہی بدگمان۔ اُس دو دِلی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مَیں اُس کے پاس گیا لیکن سامان گھر ہی میں رہنے دیا۔ اُس نے پُوچھا تو مَیں نے جھوٹ بولا کہ جگت سنگھ گھر میں نہ تھا۔

باب ۵۰

بات ظالِم کی سُن کے چُپ رہنا
ظلم کا ایک باب ہے وُہ بھی (شاطر)

اُپاسک کا مکان میرے خیال کی ترنگ سے الگ تھا۔ چُوں کہ مَیں بہکا ہُوا نہ تھا، مَیں زیادہ مایُوس نہ ہُوا۔ مجھے خُوشی یہ ہُوئی کہ وہاں ریگڑھ پُورہ کی بدبُو نہ تھی۔ اُس نے پینے پِلانے کا اِہتمام کیا۔ اُن دِنوں مَیں سُونگھنے کے سے انداز میں پیتا تھا۔ شراب تھی بلیک نائٹ لیکن حنظل کی سی کڑوی تھی۔ اُس کی ترغیب کے باوجُود مَیں جام نہ چڑھا سکا۔ اُس نے اپنا جام غٹاغٹ پیا، پکوڑوں سے مُنہ سلُونا کیا اور دُوسرا بھر لیا۔ ہم تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر وُہ میرے کہنے پر اپنی نظم 'پاشو جوان ہو گئی' سُنانے لگا۔ اُس کے گہرے لطیف لہجے نے ہر شعر اُس بلندی پر پہنچا دیا

جہاں شوق کی جادوگری، ناقابلِ حصول خوابوں کو حقیقت بناتی ہے اور وہ بزمِ عیش سجاتی ہے، جس کی دِل نوازی قطعی ہے۔ وہ نظم سُنا رہا تھا کہ حُسن و معنی کا دریا بہا رہا تھا۔ وہ گیت سِسکتی حسرتوں، تڑپتی تمناؤں، اُبلتے جذبوں، بے باک اِظہاروں اور بے گناہ خاموشیوں کا بولتا منظر تھا۔ پاشو وہ جوان لڑکی تھی جو اپنے گاؤں، گلیوں، کھیتوں، کھلیانوں، میلوں، تیوہاروں، دِلوں، دِماغوں اور خیالوں کی رونق تھی۔ اُس کے بغیر وہ سب ویرانے تھے۔ ماحول میں جوانی کی طُغیانی آئی ہُوئی تھی۔ کم سِن، جوان ہونے کے خواہش مند تھے، جوان زمین پر پاؤں نہ دھرتے تھے، بُوڑھے، جوانوں کی سی حرکتیں کرتے تھے، اِس لئے کہ پاشو جوان تھی۔ مَیں نے اُپاسک کو تحسین آفریں نگاہوں سے دیکھا اور اُس کی شاعرانہ لیاقت کو سراہا۔ وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے لاڈ کرتے ہُوئے، میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ستروں پر رکھ لیا۔

بے آبرُوئی کی نفسیات، آبرُوریزی سے الگ ہے! پہلی اِبتدائے شِکست ہے اور دُوسری اِنتہائے شِکست۔ پہلی حالت میں مجرُوح کی بحالی کے اِمکان زیادہ ہیں، نسبتاً دُوسری کے۔ مَیں بھبھوکا سا اُٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا جو اندر سے بند تھا۔ اُس نے مجھے روکا۔ مَیں اُس پر لپکا، پیٹ میں سر کا ریلا دیا اور اُسے چارپائی پرے جا گرایا۔ تھوڑی ہاتھا پائی بھی ہُوئی جس میں میری پگڑی ڈھے گئی۔ مَیں نے کونے میں پڑا ڈنڈا اُٹھا لیا، وہ وہیں جم گیا جہاں پڑا تھا۔ مَیں نے پگڑی اُٹھائی، دروازہ کھولا، ڈنڈا پھینکا اور گھر کی راہ لی۔ میرے غم نے مجھے گُونگا بنا دیا۔ میری ناکردگی! مَیں اُسے گالی تک نہ دے سکا۔ کِسی کی بات ناپے تولے بغیر تسلیم کرنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ میری زُود اِعتباری نے مجھے کیسے کیسے ذلیل کیا ہے!

مَیں ریگڑھ پُورہ سے دُور ہی تھا کہ بُوندا باندی شرُوع ہو گئی۔ مَیں تیز تیز چلتا ہُوا گھر پہنچا اور ہچکچاتے ہُوئے اندر قدم رکھا۔ سارا اِحاطہ سو رہا تھا مگر جگت سِنگھ جاگ رہا تھا جیسے میرا منتظر ہو۔ اُس کی بڑائی! وہ مجھ سے ناراض بھی نہیں تھا۔ اُس کی خاموشی نے مجھے اُس شرمندگی سے بچا لیا جو شِکست خُوردگی کا پس اثر ہوتا ہے۔ اُس نے اپنا بِستر کچھ اُدھر کھسکایا اور مَیں برابر بِستر بچھا کر لیٹ گیا۔ میرا دِل بھر آیا۔ بادلوں کی گرج کے ساتھ بارش تیز ہو گئی جیسے آسمان میرے ماتم میں شریک ہو۔ مَیں غریبی میری رُسوائی تھی اور میری زِندگی اُن در و دیوار کے بیچ گھری ہُوئی دراڑ، جو میری بے ہمتی سے اور بھی سُکڑ جاتی تھی جیسے فشارِ قبر کی سزا بن گئی ہو۔ میری رُوح کی گلی سڑی لاش جِسے مَیں نازک خیالوں میں چھپانے کی کوشش کرتا تھا، میرے اندر سے نکل کر میرے جِسم سے لپٹ جاتی۔

اُس کی سڑاند اِس قدر چبھتی ہوئی ہوتی کہ سانس جیسی لطیف شے بوجھل لگتی۔

کانٹوں اور دُکھوں کا چلن ایک سا ہے۔ یہ اپنے حریفوں کے ساتھ جنم لیتے ہیں لیکن اُن کے برعکس زندہ رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آدمی کی رگِ جاں کے پاس دُکھوں کی باڑ گھنی ہوتی جاتی ہے اور پھر یہ پھندے کی طرح کستی کستی آدمی کو بدحواس و بدوضع کر دیتی ہے۔

گلفت، کلفت کا زچہ خانہ ہے اور مسرت، مسرت کا، میں اپنی ناداری میں منفی قدروں میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں بذاتِ خود خوشی کا متلاشی تھا لیکن کسی کو خوش دیکھ کر کینے سے جل مرتا میں سوچتا کہ وہ میری غریبی پر طعن کرتا ہے۔ میرا رویہ مجھے چڑچڑا اور سرکش رکھتا۔ میں اپنے پھٹے پرانے سے نفرت کرتا لیکن کسی کے نئے کپڑے برداشت نہ کر سکتا۔ مجھے لگتا کہ وہ میرے جلانے کے لیے نئے کپڑے پہنتا ہے۔ میرا دِل، کینہ پرور دِل مجھے ورغلاتا، تو اُس کے کپڑوں پر کیچڑ پھینک دے، انھیں پھاڑ دے۔ میری دماغی جھنجھلاہٹ اور روحانی کوفت اُس غلیظ سُور کی سی تھی جو اپنی تسلّی کے لیے اپنی ہی گندگی کھاتا ہے اور مطمئن رہتا ہے۔ مجھے مظلوم اور نادار لوگ ہی بھلے لگتے۔ میرا حسد، میری زندگی کی افیون تھی۔ اور حاسد کا کردار بچھو کی طرح ہوتا ہے، وہ کسی کو ڈنک مارنے میں ناکام رہے تو خود کو ڈنک مارنے لگتا ہے۔

میں اک نئی موت مر گیا۔ اُس چھوٹی سی مُلاقات نے مجھے بے پناہ کمزور اور بے پناہ لاچار بنا دیا۔ میرا معمول جان لیوا حد تک گھناؤنا ہو گیا۔ حسرت، ندامت، ذِلت، میرے نفس کی فِطرت تھی۔ میرے ضمیر میں دیر اثر زہر بھر گیا جو مجھے گھلا گھلا کر مارنے لگا۔ میری نفسیاتی حالت بگڑ گئی، کبھی وقت کی رفتار ٹھہری جان پڑتی اور کبھی چھوٹی سی گھڑی ہزاروں برس طویل۔

سُچا سنگھ کا دِن پوجا پاٹھ سے شروع ہوتا اور ملامتوں پر ختم۔ وہ میری ذرا ذرا سی کوتاہی پر لے دے کرتا اور بات بے بات مجھے کاٹتا اور پھٹکارتا۔ میری مظلومی اُس کا سامانِ نشاط تھا۔ میں اعتماد سے کہتا ہوں اور اپنا اِلزام دُہراتا ہوں۔ میری مظلومی اُس کا سامانِ نشاط تھا جس کی مخبری اُس کے چہرے کا رنگ کرتا تھا۔ معرکہ فساد و عِناد کی تحریکِ سرفرازی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جو جذبہ اُس کے جمال کی اکسیر ہے، اُس میں گاہے بگاہے روح پھونکتے رہو ورنہ اُس کی حالت گھاس پھوس کی آگ جیسی ہوگی جس کے فروغ کی مدت لپک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سُچا سنگھ کے نفرت بھرے فقرے، کاریگروں کے زہر بجھے آوازے، میرے خوابوں تک میرا پیچھا کرتے اور انھیں خوفناک بناتے۔ میں اُن سے دُور چلا جانا چاہتا لیکن حوصلہ نہ کرتا۔ میں قفس زاد کی سی زندگی گزارتا تھا۔ وہ

گرفتارِ حال، کھلی فضا سے ڈرتا ہے اور خود کو وہیں محفوظ سمجھتا ہے۔

مَیں پیارا سنگھ اور امر سنگھ سے اپنی بے بسی کا رونا روتا۔ مَیں چاہتا کہ وُہ مجھے معمار کا کام سکھا دیں لیکن وُہ ٹال مٹول کرتے تھے۔ میری فریاد کا اُن کے پاس ایک ہی جواب تھا، "ہاں ہاں، ضرور ضرور!" اِن چار لفظوں کی خرابی، اِن سے چار ہزار درجہ بڑھ کر تھی۔

فطرت اور انسان میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وُہ جو ہے، وُہی ہے اور یہ جو اِدّعا کرتا ہے ویسا نہیں ہے۔

پیارا سنگھ کی ظرافت میرے لئے سب سے بڑا آزار تھا۔ مَیں جب کبھی اُس سے کام کے بارے میں بات کرتا، وُہ کہتا، "گیان سنگھ جی، تم پڑھ لکھ کر انجنیر ہی بنو۔ ہُنر، لفظ کی طرح نہیں کہ کاغذ پر لکھ لیا، غلط ہو گیا تو ربڑ سے مِٹا کر دوبارہ لکھ لیا۔ ہُنر، ہم غریبوں کے لئے رہنے دو۔ پڑھے لکھے ہُنر سیکھنے لگے تو اَن پڑھ کیا کریں گے؟"

مَیں ہُنر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سُنتا آیا تھا اور اپنی رسائی کے لحاظ سے معمار کے ہُنر کو بڑھئی کے ہُنر سے آسان سمجھتا تھا۔ اینٹ ٹیڑھی لگ جائے تو اُکھاڑ کر سیدھی کی جا سکتی ہے۔ ایک اینٹ خراب ہو جائے تو دُوسری کے ملنے میں آسانی ہے۔ دیلی (آدھی اینٹ جسے پُوری اینٹ سے توڑ کر چنائی کی درز آگے پیچھے کرنے کے لئے سِرے کے ساتھ لگاتے ہیں)، گل سنڈے (دو اینٹوں کے بیچ مسالے کی تہ) سے گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے۔ ہم جسامت اور عمودی گل سنڈوں کے کام کے لئے مہارت درکار تھی لیکن گھڑ کر اینٹیں لگانے اور ٹھوکویں ٹیپ کا ٹھاٹ انگریزوں کے ساتھ اُٹھ گیا تھا۔ پلستر کا دور دورہ تھا جس کے لئے جیسی چنائی ہوتی تھی، میرا خیال تھا کہ مَیں ویسی چنائی کر سکتا ہُوں۔ معمار چھ سات رُوپے دہاڑی پاتا تھا۔ اُس کے تھوڑے سے اوزار جیسے تیشی، کرنی، مجھولا، گرمالا، ٹھانس، ساہول اور ڈوری دو دِن کی اُجرت میں نئے خریدے جا سکتے تھے۔ اِس کے بر عکس بڑھئی کے اوزار میں تیشے، کلہاڑے، کمانچے کی صنف ایک ہے، باقی اوزار صنف در صنف ہیں۔ آریاں، چورسیاں، رکھانیاں، رندے، ہتوڑے، برمے، گُنیے، پیچ کس۔۔۔ مَیں پُوری تفصیل میں جاؤں تو ایک لُغت کا مواد ہے۔ تایا جی کے پاس بڑھئی کے اوزار کا صندوق تھا، اِس کے باوجود وُہ سمجھتے تھے کہ اوزار کم ہیں۔ وُہ کہتے تھے، "جیسے جیسے ہُنر بڑھتا ہے ویسے ویسے اوزار! ہُنر وجدانِ نامیہ کی تحریک ہے اور نشاۃِ ثانیہ سے عبارت ہے۔"

کاٹھ گری میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اِس میں کوتاہی چھپ ہی نہیں سکتی۔ جگت سنگھ اپنے

ہنر کی تعریف یوں کرتا تھا، "اگر دو آدمی، کرنی اور ہتھوڑا رکھتے ہیں تو اُن میں سے ایک معمار ہے اور دوسرا لوہار۔ اُن کا بڑھئی سے کیا مقابلہ! بڑھئی، آئینہ ساز ہے۔"

قارئین! وہ ماہر تیشہ فرہاد تھا جس نے شیریں کے لئے جوئے شیر بہم پہنچائی تھی۔ میں تلخی روزگار کو شیریں بنانے کے لئے تیشے کا فن سیکھ رہا تھا۔

ہاتام گھڑنا، چولیں چیرنا، چھید ڈالنا، جھریاں مارنا، قبضے بٹھانا، پلّے چڑھانا۔۔۔ میں انگنت کام کرنے لگا تھا لیکن انھیں خوبی سے کرنے کے لئے میری پروگرس کم تھی اور پروگرس سچّا سنگھ کی جان تھی۔ چولی اور چھید کو لیجئے، دیکھنے میں معمولی سا کام ہے لیکن ڈھنگ سے نہ ہو تو اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ چول اور چھید کے خطوں کو خطوں تک اُڑا دیجئے اور نتیجہ دیکھئے۔ چوکھٹ ڈھیلی ہو گی سو تو ہو گی اُس میں کان پڑ جائے گی۔ ڈھیلی چولوں کو پچّڑوں سے کس لیا، کان کا کیا علاج؟ میں تایا جی کا بتایا ہوا گُر، ناکامیابی سے آزما رہا تھا۔ میں چول کے خط کھڑے رکھتا اور چھید کے خط اُڑا دیتا۔ لیکن خطوں کے کھڑے رکھنے اور اُڑانے میں جو نزاکت ہے، وہ آنکھ کی بصیرت ہے جسے چورسی، رکھانی اور ہتوڑی سے لکڑی میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جو مجھ سے بناتے بناتے بگڑ جاتی تھی۔

جہاں تک میری معاشی زندگی کا سوال ہے، میں ضرورت اور طمانیت کی سرحد پر کھڑا تھا۔ میں ہمت کر کے سچّا سنگھ سے اُجرت بڑھانے کی التجا کرتا۔ وہ مجھ پر جیسی تہمت لگاتا، میں اُسے کسی طرح جھٹلا نہ سکتا۔

"جتنا وقت میں تیرے بگاڑے ہوئے کام کو بنانے میں خرچ کرتا ہوں اُس سے آدھے وقت میں اُسے نئے سرے سے کر سکتا ہوں۔"

"ترکھانوں کے بچّوں میں رکھانی اور آری پکڑنے کی لیاقت پیدائشی ہوتی ہے۔ جس میں یہ طبعی صلاحیت نہ ہو، سمجھو کہ وہ حرام کا ہے۔"

اُن کاریگروں میں سے سب سے زیادہ زبان دراز ہرنام سنگھ تھا۔ ایک دن اُجرت کی بات چلی، اُس رذیل نے کہا، "تو اپنی مرواکر ایک روپیہ نہیں کما سکتا، یہاں تجھے ڈیڑھ روپیہ ملتا ہے۔"

میں اپنے غم میں شکایت آمیز خاموشی اختیار کر لیتا لیکن وہاں میری پروا کسے تھی! مجھے اُن سے میل جول رکھنا اور مون توڑنا پڑتا۔ میری حالت چولہے میں گیلی لکڑی کی سی تھی۔ وہ جلتی کم ہے اور رسوئن کی ملامتوں کے ساتھ پھونکنے اور چمٹے کے جرکے زیادہ کھاتی ہے۔ میں ہر زیادتی کو ضرورت سمجھ کر برداشت کرتا۔ جہاں جسمانی ضرورت، حیات کی شرطِ اوّل ہو وہاں یہ عادت بن جاتی ہے۔ ایسی

عافیت جبلّی ارتقا کے لئے رکاوٹ ہے اور نامیاتی زندگی کی نفی۔ اُف! آدمی کی بے بسی اُسے کہاں تک مختصر، نفر اور دست نگر بنا دیتی ہے۔

مَیں سُچّا سنگھ کی خدمت ایسے کرتا جیسے اُس نے مُجھے موت کے مُنہ سے بچایا ہو اور میری زندگی اُس کا مجھ پر قرض ہو۔ مَیں نے کام آمادگی اور محنت پسندی سے اپنی محبّت کی ضمانت دی۔ مَیں سب سے پہلے کام پر جاتا، اڈّے پر جھاڑو لگاتا، چھڑکاؤ کرتا، گھڑے میں پانی بھرتا، گلاس مانجتا۔۔۔۔ اوزار تیز کرتا۔ ایک رکھانی کا دستہ بے شام تھا جس کی کرچوں سے ہاتھ زخمی ہوتے تھے۔ میری لگن! مَیں چار آنے کے دو شام خرید کر لایا اور اُن سے نیا دستہ بنایا۔ کمانچے کی بدھی خراب تھی۔ جگت سنگھ کے پاس نئی بدھی کا بنڈل تھا۔ اُس سے بدھی لے کر مَیں نے کمانچہ مرمّت کیا۔ میری دِل چسپی اور عالی ظرفی نے ہُنر کا نیا پہلو پایا۔ ہُنر، بھوگ بلاس نہیں ہے کہ جس میں سرسری شرکت کرنے والا بھی اپنا کمال دیکھتا ہے۔ ہُنر گریز طلب عمل ہے، جو اِس پر دِل سے توجّہ دیتا ہے وہی لُطف اُٹھاتا ہے جب کہ دُوسرا اِسے بارِ خاطر سمجھتا ہے۔ ہر پُرخلوص کاریگر میرے تجربے کی تائید کرے گا اور میری باریک بینی کو سراہے گا کیوں کہ وہ ضرور اِن مراحل کا رسیا رہا ہوگا۔

میری فرماں برداری اِس قدر پُوری تھی کہ وہ ساری جگہ میرے عمل کی خوش ادائیگی سے چھلکتی تھی۔ سُچّا سنگھ نے میرے عمل کو سراہنے کے بجائے بدخُو کی طرح کہا، "اِس کی کیا ضرورت تھی؟"

میرے ساتھی جانتے ہی نہ تھے کہ محبّت کس بَلا کا نام ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچّوں کی باتیں کرتے تو اُن سے شہوت کی رذالت ٹپکتی نہ کہ ازدواجی زندگی کی رفعت۔ اُن سے میری توقّع، خلافِ توقّع تھی۔ جِسے موقع ملتا، وہ مجھے تمسخر کا نشانہ بناتا اور اپنی سخت زندگی میں لطافت پیدا کرتا۔ میری حالت بلدیہ کے بیت الخلا کی سی تھی۔ رفعِ حاجت کے وقت وہ ہر کسی کی ضرورت ہوتا ہے لیکن ذِمّہ داری نہیں۔

مَیں دِن بھر بے شمار جُملے سُنتا جن کا تعلّق مجھ سے اور میرے کام سے ہے۔ لیکن مَیں کچھ ہی جُملے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

"تیغ کا ڈنگا دوہرا کر دیا ہے، تیری آنکھیں ہیں کہ ڈوڈے!"

"آری کیسے بیندی ہے! (ہر دو دانت کے بعد آری کا ایک دانت اِدھر اور دُوسرا اُدھر موڑا جاتا ہے جس سے چیر، آری کے پترے کی موٹائی سے کُھلا ہوتا ہے اور آری، چیر میں صاف چلتی ہے ورنہ لکڑی، آری کو پکڑتی ہے) ایک دندانہ لاہور کو جاتا ہے اور دُوسرا پشور (پشاور) کو۔"

"یہ چھید تیرے چھید سے ٹیڑھا ہے!"

اِن فقروں کے ساتھ وُہ جیسے القاب جوڑتے تھے وُہ آدمی کی وحشی زِندگی کے گھناؤنے نمونے ہیں، جنھیں اِس نے سرمایۂ بزرگاں جان کر سینے سے لگا رکھا ہے۔ مَیں اُس لب ولہجے سے گریز کرتا ہُوں تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ میرا نشوونما وُہ نامُہذّب طرزِحیات مُسترد کر چُکا ہے۔ مَیں مُجرم کی طرح گردن ڈالے چپ کھڑا رہتا۔ سُچا سِنگھ مجھے یُوں دیکھتا جیسے کُتّا اپنی اُلٹی کے مواد کو، جِسے وُہ پچا نہ سکا ہو۔ میرا اذیّت خواہ، آدمی کی نسل سے تھا تو کیا ہُوا، اپنی عادتوں کے لحاظ سے آوارہ کُتّے کی طرح بے حِس تھا۔ اُسے کوئی پُچکارے بھی تو وُہ مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے اور ناک سے دُم تک تیر سا کھِچا رہتا ہے۔

وُہ شیوۂ روزگار اپنانے کے لئے، مَیں نے وُہ ماحول ناقابلِ برداشت حد تک برداشت کیا۔ میری صبر آزمائی کا ایک واقعہ سُنیئے۔ مَیں اڈّے پر کھانا کھا رہا تھا، نہال سِنگھ سامنے بیٹھا تھا، جِسے ناک سُڑکنے کی عادت تھی۔ اُس نے وہیں ناک سِنکی، کاچھے سے ہاتھ صاف کیا اور پھر کھانے لگا۔ مَیں نے حقارت سے کہا، "جہاں کھاتے ہو وہیں سِنکتے ہو! اُٹھ کر پرے جانے میں موت آتی ہے!

تیری روٹی پر جا پڑا ہے کیا؟" اُس نے سُوں سُوں کرتے ہُوئے کہا۔

میرے ہاتھ سے روٹی گر گئی اور مَیں نے قے کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے اُس ماحول اور کام کو بڑے دِل گُردے سے جھیلا لیکن اُس نے مجھے مُسترد کر دیا جیسے صحتِ مندزخم، کھُرنڈ کو کرتا ہے۔

تجربہ کاری، خُود محاسبی ہے! یہ غلطی پکڑتی ہے اور غلطی کرنے سے روکتی ہے۔ میری ناتجربہ کاری نے چوکھٹ چھوٹی خطیادی۔ جب پلّے چڑھانے لگے، 'میری کاریگری' سامنے آئی۔ سُچّا سِنگھ مُجھ پر پِل پڑا، تھپیڑوں اور لاتوں سے مطمئن نہ ہُوا تو ڈنڈا اُٹھا لایا۔ میرے نالے پتھروں پر پڑنے سے پتھر ٹوٹ جاتے۔ تماش بینوں کا ہجوم لگ گیا لیکن کِسی نے نہ آڑ لیا، نہ بیچ بچاؤ کیا۔ اُن کے پاس نہ کان تھے اور نہ زبان۔ اُن کے دیدے تک پھُوٹے ہُوئے تھے! کیوں کہ وُہ دیکھ سکتے تو بے حِس ستُونوں کے سے کھڑے نہ رہتے۔ میرے قارئین! مَیں نے بے حِسی کے اِس سے بھی حیرت ناک منظر دیکھے ہیں! وہاں لوگ آتشِ خاموش کی مانند جلتے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والے کو نہ سیک آتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے۔ میرے ہمدرد اعضا کے سوائے ہر کوئی مجھ سے بے غرض تھا۔ میری آنکھیں رو رہی تھیں، دِل تڑپ رہا تھا، زبان سماجت کر رہی تھی، ہڈیاں حملوں سے چُور تھیں پھر بھی میری قوّتِ برداشت کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ میرے غمگسار اعضا وُہ سب کُچھ کر رہے تھے جو عذاب و اذیّت میں

سچے دوستوں کا کرتب ہوتا ہے۔ یہ اُن کی مجموعی اِمداد کا حاصل تھا کہ اپنی ناداری کے باوجود، میں نے ہرجانہ بھرنا منظور کر لیا۔

"اِتنے رُوپے تو لائے گا کہاں سے؟ اپنی ماں کی ---- سے!"

اُس کی گالی، خُوں خوار خنجر کی طرح دِل سے ہوتی ہُوئی رگوں میں اُتر گئی اور ہیجانی کیفیت برپا کر گئی۔ زِندگی کے سارے قوائے عمل یکبارگی غیر معمولی شدّت سے بروئے کار آئے جیسے اُنھوں نے اپنی ساری توانائی اُسی مخصوص لمحے پر خرچ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ مَیں نے جواباً گالی دی لیکن میرے مُنہ سے چیخ ہی نکلی۔ مَیں اُس پر جھپٹا، اُس سے ڈنڈا چھینا اور بھِڑ گیا۔ وُہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اُس نے مجھے اُٹھا کر نیچے پٹخا اور میری چھاتی پر چڑھ کر میرا گلا دبانے لگا۔ مَیں نے اُسے کلائیوں سے پکڑا اور بڑھتا ہُوا دباؤ روکا۔ وُہ اُٹھ کر مجھ پر جُھک گیا اور پُورا زور لگانے لگا۔ میرا ٹینٹُوا اندر دھنسنے لگا، دم رُکنے لگا اور سر، دھڑ سے ٹُوٹنے لگا۔ وُہ دباؤ ایک چھن اور رہتا تو میرا کام تمام ہو جاتا۔ مَیں کسی طرح اُس کے پیٹ میں ٹانگیں گھسانے اور اُسے پرے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مَیں سنبھلا نہ تھا کہ اُس نے پھر مجھے نیچے گرا لیا اور نئے اِنتقامی جذبے سے مجھے گلے سے پکڑ لیا۔ ہم دو غیر مساوی لیکن مُخالف طاقتوں کی طرح تھے۔ مَیں اُس میں ضائع ہُوا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر اُس کے ٹٹّوں پر پڑی جو اُس کے ڈھیلے کاچھے سے باہر لٹک رہے تھے۔ مَیں پُورے زور سے جھٹکا مار کر اُٹھا، اُن پر جھپٹا اور دبوچ لیا۔ سچّا سنگھ چوٹ کھائے کُتّے کی طرح بلبلایا اور ڈھے پڑا جیسے مُردہ ہو۔ مَیں نے اُسے دھکا دے کر پرے ہٹایا، وُہ لوتھڑا سا بے حس و بے حرکت رہا۔ دُوسرے کاریگر، بنتا سنگھ، ہرنام سنگھ، نیتر سنگھ، نہال سنگھ اُس کی مدد کے لئے دوڑے، مَیں نے کلہاڑا اُٹھا لیا۔ میرے سر پر خُون سوار دیکھ کر جو جہاں تھا، وہیں رُک گیا۔

نفرت کا جذبہ جتنی تیزی سے بڑھتا ہے اُتنی ہی تیزی سے اپنے مفعول پر اثر انداز ہوتا ہے، جو اِس کے تصادم کی تاب نہ لا سکے، اُسے اپنی تحریک کی طاقت بنا لیتا ہے جیسے جلتی آگ سُوکھی گھاس کو۔ اِس کی نفسیات طبعی، جنُون ہے، اِس لئے اِس کی اِبتدا ہی اِنتہا ہے۔ چُوں کہ یہ جذبہ منفی قدروں کا حامل ہے، اِس کی شان و شوکت اِسی میں ہے کہ اِس کے سامنے ہر کوئی ملعُون و مطعُون رہے۔ اِس کی تکذیب پسندی! یہ اپنے حریف کو صرف باطل کرنے کے لئے باطل کرتا ہے۔

مَیں علی الاعلان سب کو گالیاں دینے لگا اور مقابلے کے لئے للکارنے لگا۔ کوئی آگے نہ

بڑھا۔ مَیں نے جیکارا بلایا، اپنا سامان اُٹھایا اور وہاں سے چل پڑا۔ میرا خروش ٹھنڈا ہُوا تو مَیں نے اپنے اندر خلا محسُوس کیا۔ میری رگوں کا چلن ہی بدل گیا اور مُستقبل کے خوف نے مجھے بے دست وپا بنا دیا۔ مَیں تیز گام مُسافروں سے ڈر کر سڑک سے دُور ہو کر رینگنے کے سے انداز میں چلنے لگا جیسے موسمِ سرما میں زنبُور، اُس کا ڈنک گر جائے تو طاقتِ پرواز بھی جاتی رہتی ہے۔

باب ۵۱

شاطر زمانہ دے گا ضمانت دوام کی
خُود میں ذرا کمال تو پیدا کرے کوئی (شاطر)

مَیں جِدھر جاتا وہی راستہ گھوم پھر کر ریگڑھ پُورہ میں جا پہنچتا جیسے سارے راستے اُسی میں مِل گئے ہوں۔ مَیں چاہتے ہُوئے بھی بھاپا جی کے اِس دعوٰی کو نہ جھٹلا سکا کہ آدمی کی جڑیں گھر میں ہوتی ہیں۔ ریگڑھ پورہ میں میرا ٹھکانہ عارضی سہی وہاں میری جڑیں نکل آئی تھیں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی جگت سنگھ کو جھگڑے کی اِطلاع مِل چکی تھی۔ سچّا سنگھ آیا تھا اور میرا حساب کر گیا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان کیا معاملہ رہا؟ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ جگت سنگھ نے محجُوب تبسّم سے مجھے دیکھا، میری پیٹھ تھپکی اور کہا "عزّت سے جینے کا یہی طریقہ ہے کہ شیر سے ببر ہو کر ملو۔" اُس نے عزّت سے جینے کا طریقہ بتایا لیکن آگے وہ راستہ نہ دکھایا جو میرے دیار روزگار تک جاتا تھا۔

مَیں اپنے بچپن میں 'گُرو گوبند' 'بندہ سنگھ بہادر'، 'بدھی چند' جیسے جیالوں کے منظُوم کارنامے پڑھا کرتا تھا اور گایا کرتا تھا۔ اُن کی بے نظیر شجاعت میرے فیضانِ رُوح کا باعث تھی اور اُن کے کردار میرے وجدان کے لئے مہمیز۔ کیوں نہ ہوتے! حکُومت کے سپاہی، اُن کا پیچھا کرتے تھے، مخبروں کے ذریعے اُن کا سُراغ لگاتے تھے، اُن تک پہنچتے تھے لیکن وہ، اُن کی آنکھوں کے سامنے رُوپوش ہو جاتے تھے، غائب غلّہ کی طرح۔ رائج سماجی اصُولوں کے لحاظ سے وہ غیر سماجی عناصر اور سزاؤں کے مستحق تھے لیکن اُن کے کارنامے نئی تہذیبوں کے پیش خیمے ثابت ہُوئے تھے آہستہ آہستہ وہ پُوجے اور گائے جانے لگے اور اُن کے دیوانے، اُن کے نام پر مر مٹنے لگے۔ میرے اندر کا گیان سنگھ مجھے اُکساتا کہ تیرے گھر سے بھاگنے کی دیر ہے، دولت تیری رکھیل ہو گی اور شہرت،

داسی ! تو بادشاہ ہوگا اور دُنیا تیری رعایا ! مجھے تصّور کے وُہ بھرپُور اور مسرور لمحے یاد آتے جب میں اُس خلائی رتھ پر اُڑتا تھا جیسے دھارمک تصویروں میں پیتامبر کرشن چلاتے ہیں۔ ساری کائنات میری اور صرف میری ہوتی تھی۔ میں اپنی سلطنت میں سے وفاداروں کو ریاستیں دیتا اور غلاموں پر نوازشیں کرتا۔ اُس وقت میں مُتوسّل تھا اور اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے ناقابل۔ اب میں آزاد تھا۔ اپنا راہبر آپ تھا ! جو چاہے کر سکتا تھا اور کُچھ نہ کر پا رہا تھا۔ کیسا حیرت انگیز تضاد تھا ! تخیّل، انسانی حقیقت کا ایسا فروغ ہے جو فروغ ہوتے ہوئے بھی دروغ ہے۔

انسان کی پہچان اُس سے نہیں بنتی جو وُہ کرنا چاہتا ہے، اُس سے بنتی ہے جو وُہ کرتا ہے۔ میری پہچان میری بیکاری تھی، جو میری بدحواسی بن گئی۔ آدمی کے کم سے کم وسیلے کا کھو جانا، دُودھ پیتے بچے کے مُنہ سے ماں کا دُودھ کھینچ لینے کے برابر ہے۔ میں کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ دِلّی جتنا گھنا شہر ہے، میں اُتنا ہی اکیلا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں دُکھنے لگتے۔ میں اپنے پاؤں کو دیکھتا اور کبھی نہ ختم ہونے والی راہ کو۔ مجھے لگتا کہ میں یُوں ہی چلتا چلتا نابُود ہو جاؤں گا۔ میرا یہ احساس جنابِ میر کے احساس سے کس قدر ملتا ہے !

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متّصل فنا
آبِ رواں سے ہم ہُوئے نابُود ہر جگہ

خود اعتباری، انسانی زندگی کی ایسی خُوبی ہے، جو اِسے گرنے سے روکتی ہے، اُوپر اُٹھاتی ہے اور مقصودِ حیات پانے میں مدد کرتی ہے۔ میری بے اعتباری میرے سانس کی نفسیات بدل دیتی۔ وُہ تارِ رگِ جاں کے برعکس پھندے کی طرح ہوتا اور ہر جزوِ بدن سے اُلجھتا، جو نتھنوں سے لے کر پھیپھڑوں تک اُس کے سامنے پڑتا۔ میں اپنے اندر تڑختا اور ریزہ ریزہ ٹُوٹتا محسُوس کرتا۔ پیٹ، پیٹھ سے جا لگتا اور انتڑیوں کی دیواریں، انتڑیوں کی دیواروں سے۔ بھوکے ڈکاروں کا اثر اُلٹا ہوتا۔ زبان، حلق میں اور ہونٹ، مُنہ میں سکڑنے لگتے۔ راستے میں نل یا پیاؤ دیکھ کر میں درماندہ سفر اُدھر بڑھتا اور پانی پیتا۔ اُس کی اِمکانی قوّت ٹھہرے ہُوئے اعضا کو حرکت دیتی اور نادانستہ طور پر اُن کی رہی سہی ہمت چھین لیتی۔ زورِ فاقہ، ضعفِ فاقہ میں بدل جاتا۔ میرے سامنے ترمرے ناچتے۔ وُہ مرئی تیروں کی طرح آنکھوں میں گھُستے اور مجروح کرتے۔ میرا سر چکراتا اور میں زمین پر گرتے گرتے مُشکل سے سنبھلتا اور سر، ہاتھوں میں تھام کر وہیں کہیں بیٹھ جاتا۔ میری ساری رگوں کا درد، دیدوں میں سمٹ آتا۔ اندرونی دباؤ سے ڈھیلے پھیل کر پھٹتے اور اعصاب ٹیس سے تڑپتے۔ درد کی گانٹھ کھُلتے کھُلتے کھُلتی، بصارت لوٹتے لوٹتے

لوٹتی اور طاقت ایسے بحال ہوتی جیسے روندا ہوا کیڑا پہلے کُنڈلی مارتا ہے، پھر اپنے بَل کھولتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ رینگتا ہے۔ مَیں کمزور کمزور چلتا اور پاؤں تلے کی دھرتی کو دیکھتا جو جُگا جُگ سے روندی جارہی ہے۔ مجھے لگتا کہ یہ دھرتی اُن چارہ سازوں اور غمگساروں کی طرح ہے جو ہر کسی کا دُکھڑا سُنتے ہوں لیکن اپنا حال کسی سے نہیں کہتے ہوں۔ دہقانی کہاوت ہے، رکھے بھی پیٹ تو مارے بھی پیٹ، مَیں اِس کہاوت کی مثال تھا۔ پانی پینے سے بھوک کا درد کم ہوتا لیکن پیٹ آدھ بھرے گھڑے کی طرح کھنکتا۔ مَیں پیٹ کی تال سے قدم مِلاتا ہُوا گرُودوارہ رکاب گنج پہنچتا۔ میرے قارئین جانتے ہیں کہ مَیں گرُودواروں کی تکریم و تقدیس کا قائل نہ تھا، پھر مَیں وہاں کیوں جانے لگا ؟ مَیں وہاں اپنی بھوک مٹانے جاتا تھا۔ پیٹ کی ضرورت، طمانیتِ حیات کی وُہ ناقابلِ اطمینان حالت ہے جو آدمی سے کچھ بھی کرواسکتی ہے۔ خود کو زندہ رکھنا آدمی کی قدیم ترین جبلّت ہے، جس پر کسی اخلاقی شرط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میرا عمل پھر بھی صُلح کُل تھا ورنہ جو آدمی کم سے کم اشیائے ضرورت کا محتاج ہے، وُہ کسی وقت بھی شہری قدریں پھلانگ کر قانونِ بیاباں کی پیروی کرسکتا ہے۔

مَیں ضرورت کو ایک الگ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ ضرورت، تسکین پسند بے تسکینی کی ایسی تحریک ہے، جس کی سمت، ہمہ سمت ہے اور ہر سمت کی اِنتہا، خودکشی ہے یا اِرتکابِ جرم۔ پہلی حالت میں اِنسان اپنے فعل میں اکیلا ہوتا ہے اور دُوسری حالت میں صُورتِ حال کے مُطابق اِنسان پُورے کنبے، پُورے محلّے، پُورے گاؤں، پُورے مُلک ---- پُوری نوعِ انساں کو اپنی ضرورت پر قربان کرسکتا ہے۔

آدمی کی اِسی ضرورت نے خُدا ایجاد کیا۔ پہلا خُدا غریبوں، لاچاروں، بیماروں، مظلوموں ---- کا یار و مددگار تھا، جسے پھر بادشاہوں اور غاصبوں نے اپنا لیا کیوں کہ وُہ سرکمالے رازوالے، کی حقیقت سے واقف ہُوئے تو اُنھیں اپنے کمال کو برقرار رکھنے کی ضرورت پڑی۔ اُس ضرورت کی نوعیت دوہری تھی، اپنے کمال کی بڑھوتری اور دُوسرے کے زوال کی برقراری۔ اِس لئے اُبھرتے کو دبانا اُن کا اخلاقی فرض ہوگیا۔ اُس جائز، فعل کی ناجائز تائید کے لئے اُنھوں نے ظِل اللہ خُداوند جیسے خطاب اِختیار کئے تاکہ بوقتِ ضرورت وُہ خُدا ہی کی طرح ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں کا صفایا کرسکیں۔ فرق اِتنا تھا کہ خُدا کا قہر پلیگ، چیچک، ہیضے، کال، بھونچال ---- کی شکل میں گُناہ گاروں پر نازِل ہوتا تھا اور بادشاہوں کا جبر، سزاؤں اور جنگوں کی صُورت میں کمزوروں اور باغیوں پر۔

لنگر کا وقت ہوتا تو میں لنگر کھاتا، وہ وقت گزر چکا ہوتا تو میں گرنتھی سے کڑاہ پرساد مانگتا وہ میری صورت سے ضرورت کا اندازہ لگاتا لیکن دیتا اُتنا ہی جتنا اُسے دینا ہوتا۔ میں کڑاہ پرساد لے کر اپنے گرد بھوکے کوّے کی مانند دیکھتا جو روٹی کا ٹکڑا پا کر گرد و پیش پر مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اُس تھوڑی سی خوراک سے میری بھوک مری کا احساس بڑھ جاتا اور میں آنتوں کی اینٹھن سے نڈھال ہو کر سامنے پارک میں لیٹ جاتا۔

نئی دلّی سبزہ زاروں اور درختوں کا شہر ہے۔ انڈیا گیٹ سے پارلیمنٹ ہاؤس تک سبزہ زار ہی سبزہ زار دیکھ کر میں سوچتا کہ یہ زمین کسانوں کے پاس ہو تو وہ اِس میں سے لاکھوں من اناج پیدا کریں۔ میں حاکمانِ وقت کی عقل پر ملامت کرتا، جو گھاس اُگانے کے لئے لاکھوں روپے کی محنت اور قیمتی پانی برباد کرتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کی سُست روی جمہوریت کی بھاگم بھاگ میں گُم تھی۔ میر، مومن، ذوق، غالب ـــــ کا تصوّر حقیقت کی چکّی میں پس رہا تھا۔ انگریزوں کا ڈسپلن ہندوستانیوں کی بے اصولی کا شکار تھا۔ ہر جگہ آزردہ، غیر مطمئن، اکھڑ ـــــ پنجابیوں کی بے اعلان حکمرانی تھی کنگز وے کیمپ پر سرکاری عملداری تھی لیکن سبزی منڈی، روشن آرا گارڈن، موتی نگر، پہاڑ گنج ـــــ کون سا مقام تھا جہاں کنگز وے کیمپ کے غیر سرکاری نمونے موجود نہ تھے۔

میرا کوئی قابلِ ذکر رفیق تھا تو وہ ساحرؔ کا کلام تھا۔ میں کسی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر 'تلخیاں' پڑھتا اور اُن فنکاروں، کاریگروں، محنت کشوں کی نامراد زندگی پر آنسو بہاتا جو نام رکھتے ہوئے بے نام ہی مرے تھے۔ اُن کے سامنے میری مصیبت کی حقیقت کیا تھی؟ لیکن اُن کی مصیبتوں کی کہانی پڑھ کر میرے دکھ درد ایسے کم ہوتے جیسے کریلے کو نمک کے ساتھ کھانے سے اُس کا کسیلا پن گھٹ جاتا ہے۔ میں کیسے کیسے خیالوں میں گھرا، حالات سے گزرا، سر مارا، میں سوچتا ہوں کہ اُن عناصر فگن حالات میں، میں سالم کیسے رہا۔

جیسے فصلِ گُل کی افزائش کے لئے زرخیز زمین اور دھوپ کی ضرورت ہے ویسے ہی آدمی کے نشو و نما کے لئے محنت اور محبت لازمی ہیں۔ محنت نقشِ اعتبار کو سنوارتی ہے اور محبت حُسنِ طبیعت کو نکھارتی ہے۔ کامیابی و برتری کا احساس سرچشمۂ مسرت ہے۔ ایک ہی لطفِ حیات ہے جو آدمی کے مزاج کو بہتے دھارے کی طرح صاف رکھتا ہے۔

قرول باغ میں دہاڑی دار ترکھانوں، معماروں، قلعی گروں اور پلّے داروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ میں قسمت آزمائی کے لئے اُن میں بیٹھنے لگا۔ وہاں ترکھان آریاں تیشے، معمار کرنیاں گرمالے،

قلعی گر کوچیاں ڈبے اور پلّے دار بھاری صافے، ٹوکرے، پھاوڑے سامنے رکھ کر بیٹھتے تھے۔ اپنے پیشے کی تصدیق کے لئے ہر کسی کے پاس کچھ نہ کچھ تھا۔ سب سے بڑھ کر اُن کی گندی بول بانی، دیہاتی حرکات، کھردرے چہرے، ناہموار جلدیں ایسی سندیں تھیں جنھیں وہ پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی علامتوں طور پر جسموں پر لٹکائے پھرتے تھے۔ میری ناگواری اور کشمکش نے مجھے اِس حد تک نہ بدلا تھا کہ میں اُن جفاکشوں کا مسلّمہ حصّہ کہلا سکتا۔ جیسے غولِ بیابانی میں گھریلو مویشی کا پہچاننا آسان ہے، اُن میں میری وہی علامت تھی۔

مَیں ہارے ہُوئے سپاہی کی طرح زخمی غیرت اور شکستہ حوصلہ تھا۔ نئے ملّاح کی بدحواسی کے لئے پیندا چھدی کشتی ہی کافی ہے، اُس میں ناامیدی اور تنگ نظری کے پتھر بھی پڑے ہوں تو آپ اُس کی ذہنی پریشانی کا قیاس کریں۔

مَیں پنڈارا روڈ سے گزر رہا تھا کہ مَیں نے نسوانی چہلیں سُنیں۔ ایک بنگلے کے 'لان' پر رنگ برنگے چھاتے گاڑے ہُوئے تھے۔ میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں سجائی جارہی تھیں۔ چند کرسیاں تھیں جو میزوں سے دُور رکھی تھیں۔ کئی دوشیزائیں گھاس پر ٹہل رہی تھیں اور ہنستی کھیلتی بھی تھیں، کچھ بے پروائی سے گھاس پر بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے ایک ہاتھوں پر بوجھ لے کر پیچھے جھکی ہُوئی تھی اور اُس جھرمٹ میں سب سے زیادہ بے حجاب تھی۔ ایک ہاتھوں میں ٹھوڑی لئے گھٹنوں پر جھکی، سکڑی ہُوئی تھی۔ دو آمنے سامنے پہلوؤں پر لیٹیں سر ہاتھوں پر تھامے ہُوئے تھیں۔ حسینوں کا ویسا جھرمٹ مَیں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مَیں باڑ کے پیچھے مسحور کھڑا تھا اور ایک جھروکے میں سے اُس رنگین ماحول کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اُن میں سے ایک سب سے الگ تھلگ چھتری کے نیچے کرسی پر رونق افروز تھی۔ اُس نے دھوپ چھاؤں سلک کا گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کے نین نقش اُس کے سراپے جیسے نازک تھے اور جلد نرم اور نرمل۔ وہ لڑکی لباس کے پرتو میں خوبصورتی کی مثال تھی۔ مَیں اُسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنی چھینی گئی دُنیا کو دیکھے، جس کے واپس ملنے کا اِمکان نہ ہو۔ میرے سامنے ایک ساتھ دو نعمتیں موجود تھیں۔ میری حسرت کا کمال! نہ میری رال ٹپکی اور نہ ہی میری رگوں میں ہل چل مچی۔ میرے لہو میں وہ نفیس گداز تھا جو معصوم حسن کی عزت و توقیر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ کھانا کھانے کا بُلاوا دیا گیا۔ وہ سب اُدھر یوں متوجہ ہُوئیں جیسے کسی کو جلدی نہ ہو۔ کھانا، کھانا سیدھا سادہ عمل ہے۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اِس عمل میں کوئی دلکشی پوشیدہ ہے۔ ہاتھوں اور چمچوں کا لوچ، دانتوں، ہونٹوں، گالوں، آنکھوں، ابروؤں، ماتھوں اور لباسوں پر اُبھر رہا تھا۔ ویسے تو ہر کسی کے چمچہ پکڑنے کا انداز خوب تھا

لیکن مَیں لال پری کی ادائے ناز بیان کرتا ہُوں کیوں کہ وُہ میری دِلچسپی کا مرکز تھی۔ وُہ داہنے ہاتھ کی چھنگلی اور اُس کے ساتھ والی اُنگلی کو باقی تینوں اُنگلیوں سے جیسے جُدا کئے ہُوئے تھی، وُہ اِحتیاط پسندی کی نظیر تھی۔ اپنے ہونٹوں کو دائرے کی طرح کھول کر وُہ چمچہ، مُنہ کے اندر گہرا لے جاتی اور نِوالہ دانتوں سے سنبھال کر زبان پر رکھتی، کُچھ دیر رُکتی، چمچہ مُنہ سے نکالتی، دھنک سی بناتی ہُوئی پلیٹ تک لاتی اور نِوالہ چوسنے کے سے انداز میں کھاتی۔ مَیں باڑ میں سے سیدھا اُس کے اِتنا قریب تھا کہ چمچے کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز سُن رہا تھا۔ رسیلے ہونٹ، لِپ سٹک سے اور رسیلے ہو رہے تھے۔ اُس کی اوڑھنی کھسکتی کھسکتی نیچے گرتی، جسے وُہ بار بار سنبھالتی۔ وُہ لڑکی جو گھٹنوں پر جھکی اور سمٹی بیٹھی تھی، ساڑی پہنے ہُوئے تھی۔ اُس نے پَلّو کو کاندھے پر بکسوا لگایا ہُوا تھا۔ وُہ مٹک مٹک کر چلتی تھی پھر بھی اُس کی ساڑی اُس کے لئے تکلیف دِہ نہیں تھی۔ میرے جی میں آئی کہ مَیں اُپنی پیاری، کو مشورہ دُوں کہ وُہ اوڑھنی کو کاندھے پر بکسوا لگالے یا گلے کے گرد بَل دے لے۔ اِتنے میں اُس نے چمچہ پلیٹ میں رکھا اور اوڑھنی اُتار کر کُرسی پر رکھ دی۔ اُس مُصیبت سے آزاد ہوتے ہی اُس کا چمچے سے برتاؤ اور بھی دِل فریب ہو گیا۔ اُس کے ممّے، مُرغی کے انڈے جتنے بڑے تھے لیکن اُس کی نازک بدنی پر پھبتے تھے۔ لمبی مخرُوطی اُنگلیاں، لمبے رنگیلے ناخنوں سے اور مخرُوطی ہو گئی تھیں۔ اُس نے کھانا کھا کر پانی پیا گویا گلاس کا بوسہ لیا۔ اُس لطیف کام سے فارغ ہو کر اُسے اپنے بناؤ سنگار کا خیال آیا۔ اُس نے ہونٹوں کو ایک دُوسرے کے اُوپر دبا کر اُوپر نیچے گھمایا اور اُن کے حاشیوں کو سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے سنوارا پھر اُسے ایسے دیکھا جیسے وُہ آئینہ ہو۔ میرا سویا ہُوا لمپٹ جاگتے جاگتے جاگ پڑا تھا اور اپنے تصوّر میں اُسے کہاں کہاں چوم رہا تھا بالکل ایسے جیسے بھونرا ایک پھُول کا رس چوس کر دُوسرے پر جا بیٹھتا ہے، پھر تیسرے پر ...۔ وُہ کرسی پر بیٹھنے کے لئے مُڑ رہی تھی کہ اُس کی نظر مُجھ پر پڑی۔ مَیں نفس پرستی کے جذبے سے مہکا ہُوا تھا مُسکرا دیا۔ میری مُسکراہٹ میں عاشقی و فریفتگی کے برعکس عاجزی و بیکسی ہو گی کہ اُس نے مُجھے گیٹ کی طرف آنے کا اِشارہ کیا اور ایک پلیٹ میں جھُوٹن اکٹھی کرنے لگی۔ مُجھے اپنی غلطی کا اِحساس ہُوا اور مَیں گیٹ پر رُکنے کے بجائے آگے بڑھ گیا۔ میرے خلافِ ادب رویّے پر اُس نے ناک بھُوں چڑھائی جیسے وُہ اِس بھکاری کے معیار پر حیران ہُوئی ہو۔ میرا نفسیاتی رویّہ اُن لوگوں کا ساتھا جو اپنی بے آبرُوئی اور مُفلسی سے لُطف اُٹھاتے ہیں اور اُس پر فخر بھی کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں جو زِندگی کی دوڑ میں اُن سے آگے نکل جاتے ہیں۔

مَیں دلّی کی چمکتی دمکتی دُنیا میں اپنی حسرتوں کا لاشہ اُٹھائے گھُوم رہا تھا۔ دُوسرے جتنے

مجھ سے عاجز تھے اُس سے زیادہ مَیں خود سے متنفّر تھا۔ وہ نظمِ حیات اِس قدر سفّاک تھا کہ کام پر مزدوروں میں بھگدڑ مچی رہتی تھی۔ پوری اُجرت پانے کے لئے طے شدہ پروگرس لازمی تھی۔ اُس کی تصریح بھیانک سی بھیانک ہے! وہاں آج سیاہ ہہ بھی بنتی تھی تو کل مسٹر رول تاکہ دہاڑی کا ایک بٹا دو، ایک بٹا تین، ایک بٹا چار بنانے میں آسانی رہے۔ دوسرے دن مسٹر رول پکّی کرنے میں ایک اور مصلحت تھی۔ کوئی فرد حادثے کا شکار ہوجاتا تھا تو ٹھیکیدار محذوف کو کام سے غیر حاضر دکھا کر معاوضے کے جھنجھٹ سے بچ رہتا تھا۔ تایاجی کا منجھلا لڑکا ترلوچن سنگھ اسی مصلحت کا شکار ہوچکا تھا۔

مَیں اُس دور کا مقابلہ اِس دور سے کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آدمی، آدمی کے استحصال کا کہاں تک شکار تھا! مزدوروں کی تنظیم نہ تھی۔ اپنی خود لاعلمی اور اجتماعی بے نظمی کی وجہ سے اُنھیں محنت کا صلہ معلوم نہیں تھا اِس لئے اُن پر اِنصاف کے دروازے بند تھے۔ وہ ٹھیکیداروں اور جمعداروں کو اپنا اَن داتا سمجھتے تھے اور اِس رشتے کی نزاکت جان کر نہ جانتے تھے کہ بن روئے ماں تک اپنے بچّے کو دودھ نہیں دیتی ہے۔ وہ اُن کی شان و شوکت سے خوفزدگی کی حد تک مرعوب تھے اور اُن کے خلاف منظم ہونے سے ڈرتے تھے۔ اُن کی کمزوری اور نامردی نے اُن کے اَن داتاؤں کو سنگدل سے بے رحم بنا دیا تھا۔ وہ جفاکش اِس قدر بھولے تھے کہ جانتے نہ تھے کہ وہ اپنے دور کے ہنومان ہیں۔

وہاں ایک دِن، ڈیڑھ دِن کے برابر تھا کیوں کہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ ہفتہ واری چھٹی اور آٹھ گھنٹے کام کے لئے جلوس نکالے جاتے تھے، ہڑتال کے نوٹس دیئے جاتے تھے لیکن ہڑتال کے دِن لیڈروں کے علاوہ ہر کوئی کام پر جاتا تھا۔ کامریڈ دھرنا دیتے۔ وہ مزدوروں کو اِدھر سے روکتے، وہ اُدھر سے کھسک جاتے، اُدھر سے روکتے تو اِدھر سے کھسک جاتے۔ وہ اُن کو اِدھر اُدھر دونوں طرف سے روکتے تو وہ کام پر ڈیرا ڈال لیتے۔

سُجان سنگھ پارک میں کرتار سنگھ دُگل کا کام چل رہا تھا۔ راج کماری اَمرت کور ہلتھ منسٹر کو ورلڈ ہلتھ آرگنائزیشن کے وفد کو ایک ورکنگ سائٹ دکھانی تھی، اُس نے اُسی سائٹ کا اِنتخاب کیا۔ مزدوروں کو دستانے، ڈسٹر، گم بوٹ اور صابُن دیئے گئے۔ اُنھیں یہ جملہ رٹایا گیا کہ وہ سامان اُنھیں ہمیشہ سے ملتا آیا ہے۔ مزدور گم بوٹ پہن کر مضحکہ خیز انداز سے چلتے اور اپنے آپ پر ہنستے۔ بڑوں کی حوائج ضروری کے لئے طہارت خانہ بنایا گیا اور بچّوں کی دیکھ بھال کے لئے کریچ۔ نرسوں کو دیکھ کر پریوں کا گمان ہوتا تھا۔ بچّوں کو نہلا کر کچّے دودھ کے سے نئے کپڑے پہنائے گئے اور اُن پر بکسوؤں

سے چِٹے رومال لگائے گئے۔ مائیں اپنے لاڈلوں کو صاف ستھرا دیکھ کر پھولے نہ سما رہی تھیں۔ اُن کے چہروں کی تھکن اور پژمُردگی، جو سالہا سال کی جمع شدہ غلاظت کی طرح گھناؤنی لگتی تھی، بالکل غائب ہو گئی تھی۔ یہ چمتکار کیسے ہُوا؟ اِس طرح کہ اُن کی کوکھ کے پودوں نے اپنا اصلی رُوپ دکھایا تو اُس کی تازگی کا عکس اُن کے چہروں پر در آیا۔ بچّوں کے کھیلنے کے لئے کھلونے اور پڑھنے کے لئے تصویروں والی کتابیں تھیں۔ کریچ کے باہر سفید رنگ کا واش سٹینڈ تھا جس پر سفید رنگ کی دو سلفچیاں رکھی تھیں۔ اُن میں سے ایک میں صاف دُوسری میں ڈیٹول ملا پانی تھا اور ساتھ ہی رکھا ہُوا بے داغ تولیہ جو روش، کریچ تک جاتی تھی، اُس پر لال دری بچھائی تھی، جس کے دونوں طرف پھولوں کے گملے سجائے تھے۔ دریاں، سائبان، کھونٹے، طنابیں، گملوں کا رنگ ۔۔۔۔ اِس بات کی تصدیق تھی کہ وُہ اِنتظام بالکل نیا ہے۔ اُس خوش نصیب دِن کی خُوش کُن بات یہ ہے کہ مزدُور اپنے آپ کو دیکھ کر مُسکرا رہے تھے جیسے اُن کا متصوّرہ مُستقبل اُنھیں گدگدا رہا ہو۔ کام کی جگہ کو قابلِ قبُول بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ حوض کے گرد کیچڑ بھرا رہتا تھا، اُسے ہٹا کر گز بھر چوڑا اینٹوں کا فرش باندھا گیا اور اِدھر اُدھر بکھرے روڑوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ مٹّی کے ڈھیر بچھا دیئے گئے اور ہر بلاک تک پہنچنے کے راستے بنا دیئے گئے۔ افسر کہتے تھے کہ راج کُماری، رسوئی گھر پر توجّہ دے گی۔ ایک گھر کی رسوئی خاص طور پر تیّار کی گئی جس کا سارا کام سُرجن سنگھ اور سرُوپ سنگھ نے کیا کیوں کہ وُہ بہت ماہر معمار مانے جاتے تھے۔ وفد کے معائنے کا وقت یُوں ترتیب دیا گیا کہ جب وفد پہنچے، بچّوں کو دُودھ اور پھل دیا جا رہا ہو۔ مَیں وفد سے زیادہ راج کُماری میں دِلچسپی رکھتا تھا کیوں کہ مَیں نے راج کُماری دیکھی نہ تھی۔ مَیں نے اُسے دیکھا، میرا تصوُّر چُور چُور ہو گیا۔ وُہ اُونچے قد کی مریل سی بُوڑھی تھی جس کا مُنہ نچوڑے ہُوئے آم کی طرح تھا۔ وُہ ایسے چلتی تھی جیسے اُسے اپنے اطراف گڑھے نظر آ رہے ہوں۔

دُوسرے دِن وہاں نہ کریچ تھا اور نہ نرسیں۔ بچّے دیواروں کے سائے میں کھیل رہے تھے جیسے وُہ کھیلا کرتے تھے۔ ’گم بُوٹ‘ اور دستانے مزدُوروں سے واپس لے لئے گئے، طہارت خانہ کو تالا لگا دیا گیا، اور حاجت مند اپنی حاجتوں کو ویسے ہی رفع کرنے لگے، جیسے وُہ کرتے آئے تھے

آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی، ہفتہ وار چھٹی اور دُوسرے حقُوق حاصل کرنے کے لئے جو کامریڈز گولیوں اور لاٹھیوں کا شکار ہوئے ہیں، مَیں اُن کی بارگاہِ شہادت میں سر جُھکاتا ہُوں۔ وُہ اپنی جان پر کھیل کر ایسا کام کر گئے جو بندوں کے خُدا نہ کر سکے۔ اُن کی حکمتِ عملی کے پودے کا پھل پُوری

کہ بچھڑے کو بد شگونی سمجھتے تھے۔ وہ رخصت کے وقت جیسے دل دہلا دینے والے آنسو روتے، اُنھیں دیکھ کر میری روح میں زلزلے آتے۔ وہ لوگ بیک وقت اوہام پرستی اور زندہ دلی کے دریا تھے۔ میں اُس میں غوطے نہ کھاتا تو یقین نہ کرتا۔ وہ عادی طور پر غریب سہی، دولتِ احساس سے مالا مال تھے۔ جس مٹّی نے اُن کا پالن پوسن کیا ہوتا، وہ اُسے خاکِ مقدس مانتے اور اُس سے ٹیکے لگاتے۔ وہ اپنی محنت کا حاصل، در و دیوار کو چومتے۔ اُن کے سنگلاخ چہرے ایک لطیف سی جھلک سے جگمگا اُٹھتے جیسے گھور اندھیرے میں کرن پھوٹ پڑے۔ اُس نازک گھڑی وہ در و دیوار، مٹّی کے بےجان انبار، اُن ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے لگتے اور اُن کی گرمیِ جذبات سے پگھلتے دکھائی دیتے۔

باب ۵۲

ہم اُسے آدمی نہیں کہتے
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی (شاطر)

پچھڑی ذاتوں کی چاندی ہی چاندی تھی۔ جو کوئی دلی آتا تھا ایک دو ماہ میں ملازم ہو جاتا تھا۔ میرے سامنے اجیت سنگھ، رام سنگھ، سنت سنگھ، پورن چند، کرم چند ـــ کتنے میٹرک اور نون میٹرک، بابو کہلانے لگے تھے۔ شیڈول کاسٹ دلی کی بھیڑ میں ایسے گم ہو رہے تھے جیسے سمندر میں بارش کے قطرے۔ اُن میں سے دو ایک معاشی طور پر ہم سے بہتر تھے لیکن وہ خاص رعایت انھیں بھی ملی تھی۔ اِس غیر منصفانہ بانٹ پر میں خون کے گھونٹ پیتا اور اپنے دکھوں میں اضافہ کرتا۔ میں اکثر سوچتا کہ گورنمنٹ جو مراعات دے رہی ہے وہ معاشی پستی پر مبنی ہونی چاہئیں نہ کہ ذات پات کی بنیاد پر۔ راج گری اور نجّاری میری دسترس سے باہر تھیں۔ مزدوروں کی تنظیم باگڑیئے جمعداروں کے ہاتھوں میں تھی۔ ٹھیکیدار، مزدوروں کی بھرتی سیدھی نہ کرتے تھے۔ اُن کا کام صرف جمعدار ہی کی مدد سے چلتا تھا۔ بے روک ٹوک نقلِ مکانی سے مزدوروں کی تعداد چھوت کے بیماروں کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اُن کا کوئی نام نہ تھا، وہ صرف اپنے جمعدار کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ لاکھوں عوام چند ناموں میں سکڑے ہوئے تھے جیسے گنگا سنگھ، مان سنگھ، بہادر سنگھ، بھوری سنگھ ـــ

وغیرہ۔ وہ اُن بیکاروں کو کھلاتے پلاتے، کام ملتا تو کام پر لگاتے اور اُن سے اپنا قرض اور کمشن دونوں وصول کرتے۔ ہر جمعدار کے مزدور اُس کی ذاتی فوج کی طرح تھے اور مخصوص احاطوں میں رہتے تھے۔

آجکل خاں روڈ کی چمک دمک مشہور تھی۔ میں جس دن اُدھر جاتا، ایک کونے میں کھڑا ہوکر انسانی چہروں کا نظارہ کرتا۔ اس نظارے میں انوکھی خصوصیت یہ تھی کہ وہ پانی کے دھارے کی طرح جذبات کی رو بدلتا تھا۔ میں نے وہاں جمّارام کو دیکھا۔ میں نے اسے پکارا، اُس نے مجھے دیکھا جب تک ہم گلے ملے، ہمارے چہرے کتنے ہی اسلوبِ اظہار سے گزر گئے۔ میری حالت نئے فقیر کی سی تھی اور اُس کی نئے امیر کی سی، پہلے کو لینے کی جلدی ہوتی ہے اور دوسرے کو ٹھاٹ دکھانے کی، میں پڑتے ہی اُسے اپنی مصیبت سنانے لگا۔ اُس نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا، "پہلے رس ملائی کھاتے ہیں پھر تیری بات سنتے ہیں۔"

اُس نے میری بات پورے دھیان سے سنی۔ دوسرے دن حسبِ وعدہ وہ مجھے قرول باغ میں ہریانہ کے ایم۔پی۔ جگت نارائن کے پاس لے گیا اور مجھے شیڈول کاسٹ کا سرٹیفکیٹ دلوا دیا۔ ہم وہاں سے واپس ہوئے تو اُس نے فخر سے کہا، "لے گیان! تیرا ٹٹو پار ہوگیا۔ یہ سرٹیفکیٹ جادو کی چھڑی ہے۔ اب تو امپلائمنٹ ایکسچینج میں نام درج کروالے، گورنمنٹ سروس مل کر ملی!" جمّا جہاں کہیں ملتا میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا اور کسی نہ کسی طرح میری خاطر کرتا۔ اُسے دیکھ کر میں خوش ہوتا اور پالتو کتے کی طرح بھاگ کر اُس کی اگوانی کرتا۔

میں اپنی خوشی دبا نہ سکا اور یہ راز رام سنگھ سے کہہ دیا۔ اُس نے مجھے ڈرایا، یہ سراسر جعل سازی ہے۔ نوکری ملتے ہی پولیس کی تفتیش ہوگی اور سچائی سامنے آجائے گی۔ سزا بھی ہوسکتی ہے!"

میں ڈر گیا اور اُسی وقت اُس جعلی دستاویز کو پھاڑ دیا۔ جمّارام نے مجھے بزدل کہا اور سمجھایا کہ اپنی ترقی کے لئے جو کرو جائز ہے! لیکن میں اُس سے اتفاق نہ کرسکا۔ میری بزدلی نے مجھے کئی بار ناخوشگوار صورتِ حال سے بچایا ہے۔ پھر اُس نے مجھے خود ہی سمجھا دیا، "تیرا نام دریا گنج کی امپلائمنٹ ایکسچینج میں درج کروا دیتا ہوں، پھر وہاں سے کوئی راہ نکالوں گا۔"

وہ ڈی۔ٹی۔یو۔ میں بس کنڈکٹر تھا۔ ہم دریا گنج کے لئے بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ حالاں کہ کئی بار بیٹھنے کے لئے جگہ ملی، اس نے دروازے ہی کے پاس کھڑا رہنا پسند کیا۔ وہ وہاں کھڑا بس

میں چڑھتی، اُترتی لڑکی کے کُولہے پر چٹکی بھرتا، کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا تو اُس سے ایسے بھڑتا کہ اُلجھ سا جاتا اور پھر 'ویری سوری' کہہ کر اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بس کنڈکٹر نے ٹکٹ کے لیے پُوچھا، اُس نے اُسے "سٹاف بلیز" کہہ کر ٹال دیا اور مجھے بھی ٹکٹ لینے سے باز رکھا۔ اِمپلائمنٹ ایکسچینج کی لمبی اور پر پیچ قطار سے نپٹنے کے لیے اُس کی عیّاری ہی کام آئی۔ چوں کہ ہم وہاں سے جلدی فارغ ہو گئے، وُہ مجھے لال قلعہ دِکھانے کے لیے لے گیا۔ انقلابِ وقت! وہاں بیگموں اور شہزادیوں کی جگہ سیاحوں کی بے لگام ٹولیاں تھیں۔ دیوانِ خاص اور دیوانِ عام بے رعونت تھے۔ جہاں تختِ طاؤس ہُوا کرتا تھا وہاں پتھر کا چبوترہ تھا۔ چھتوں اور دیواروں پر گڑھے پڑے ہُوئے تھے۔ جمارام نے بتایا کہ وہاں ہیرے، جواہرات جڑے ہُوئے تھے جو نادر شاہ نکال کر لے گیا تھا۔ اُس کی اور چانن سنگھ کی باتیں تاریخ کے اوراق میں نہ تھیں لیکن سچّی لگتی تھیں۔ چانن سنگھ دِلّی کے قتلِ عام کا ذکر اپنی زبان میں کرتا تھا۔ نادِر شاہ کے کچھ سپاہی لُوٹتے کھسوٹتے فوج سے دُور چلے گئے اور مقامی لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ نادِر شاہ کو خبر ہُوئی، اُس نے تاؤ کھا کر تلوار کھینچ لی، جس کا مطلب تھا، قتلِ عام! تین دن تک یہ گھمسان جاری رہا۔ اہلِ دِلّی، دِلّی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آخر سپاہیوں نے آکر شکایت کی کہ قتل کرنے کے لیے آدمی نہیں مل رہے ہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کا سپاہ سالار آصف جاہ بے بس دیکھ رہا تھا اور پاس ہی کھڑا تھا۔ وُہ آگے بڑھا اور دست بستہ بولا،

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

(تیغِ ناز کی مشقِ قتل کے لیے کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔ ممکن ہے تو مُردوں کو زندہ کرو اور اُنھیں دوبارہ مارو)

یہ سُن کر نادِر شاہ فخر سے مُسکرا دیا اور تلوار میان میں رکھ کر روشن الدولہ کی مسجد میں بیٹھ گیا، تب کہیں قتلِ عام بند ہُوا۔ نادِر شاہ کو رنگیلے کے خزانے سے حسبِ اُمید دولت نہ ملی، اُس نے قلعے کی بیگمات سے لے کر مُلک کی بھٹیاریوں تک کے زیور اُتروا لئے۔ ہندوستان سونے کی چڑیا اِسی لئے کہلاتا تھا کہ یہاں غریب سے غریب بھی سونا پہنتا تھا۔

چانن سنگھ کا بیان سُن کر مَیں سوچتا، "بادشاہوں اور لٹیروں میں کیا فرق ہے؟" مَیں ہمیشہ اِسی نتیجے پر پہنچتا کہ یہ ایک ہی جنس کے دو نام ہیں۔

مجھے مُلک کے بٹوارے کی بات یاد آرہی ہے جسے مَیں بھول گیا تھا۔ ایک صبح مَیں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں ہرے رنگ کی ایک چوکھٹ پڑی ہے اور اُس کے ساتھ دروازے۔ وُہ سامان پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ میں نے تایاجی سے پُوچھا، "تایاجی! محمُود سومناتھ مندر کے دروازے اکھاڑ کر لے گیا تھا اور بھایاجی، احمد خان کے گھر کے دروازے چُرا لائے ہیں، دونوں کے کردار میں کیا فرق ہے؟"

اُنھوں نے قدرے توقّف سے کہا، "بنُیادی طور پر دونوں چور ہیں اور قانُون کی نظروں میں مُجرم۔ لیکن حالات کے لحاظ سے فرق ہے۔ محمُود کا جُرم تاریخی حیثیّت رکھتا ہے اور رتن سنگھ کا جُرم وقتی نوعیّت کا ہے۔"

دوپہر ہو رہی تھی۔ جُمارام نے موتی محل میں کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ وُہ شاہانہ رکھ رکھاؤ، خواب پرور ماحول، چھُریاں کانٹے (جن کے استعمال سے وُہ کسی حد تک اور مَیں پُوری طرح ناواقف تھا) نفیس کھانے، صاف سُتھرے بیرے ۔۔۔ اور اُن سے بڑھ کر میرے میزبان کی باتیں، جو لال قلعہ کی تاریخ سے زیادہ بے رحم اور شر انگیز تھیں۔

میرے قارئین، تاریخ کتنی ہی سفّاک ہو، آدمی کے اپنے زخموں سے زیادہ سفّاک نہیں ہوتی! کیوں کہ ان کا درد ذی حیات ہوتا ہے۔ اُس کی تنخواہ سَو روپے سے کم تھی لیکن اُس کی بالائی آمدنی ہزار بارہ سو سے بڑھ کر۔ مَیں اُس سے نفرت کرنے لگا۔ اُس نفرت کی وجہ میری دیانت داری یا قومی جذبہ نہیں تھا، میرا گہرا حسد تھا۔ مَیں لشتم پشتم وقت کاٹ رہا تھا، چوبیس گھنٹے میں ایک بار گڑھا بھرتا تھا اور وُہ سَو رُوپے کو حقیر رقم سمجھتا تھا۔ وُہ مجھ سے ملتا، مجھے لگتا کہ وُہ میری غریبی کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ میری زبُوں حالی سے مُتاثّر ہو کر اُس نے مجھے اپنے کپڑے دیے جو نئے جیسے تھے۔ اُس اُترن سے ہزار درجہ بہتر تھے جسے مَیں بازار سے خرید کر پہنتا تھا۔ مَیں جب وُہ کپڑے پہنتا، جُما میرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور پلک جھپکنے تک کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا جیسے وُہ میری رُوح سے لپٹا ہُوا ہو۔ اُس کی رفاقت میری اذیّت بڑھا گئی۔ اُس سے نجات پانے کے لئے مَیں نے وُہ کپڑے کسی بھکاری کو دے دیئے۔ اُس سے میری نفسیاتی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا کیوں کہ میری خُودداری مجھ میں نیا احساس جگا گئی۔ مَیں اپنے آپ کو دیکھتا، مجھے جُوتے کسی کے نظر آتے، موزے کسی کے اور اُسی طرح پینٹ، قمیص، بنیان۔ میری حالت گُدڑی کی سی تھی، جس کی لیریں مانگے تانگے کی ہوتی ہیں۔ مَیں اپنے بہی خواہ سے جو حسد کرتا تھا وُہ قدرے کم ہُوا لیکن مَیں اُس سے چھٹکارا

نہ پاسکا۔ میں نے حسد کو نفرت سے سنگین پایا ہے۔ حسد، نفرت کی ابتدائی حالت ہے اور کچی بدرو کی طرح ہے جو ہر وقت بھبھوکتی رہتی ہے۔ میں جمّارام سے ملنے سے کتراتا۔ لیکن اپنے ایک نو آشنا جگجیت سنگھ کی دوستی پر ناز کرتا۔ وہ ریلوے میں گڈز کلرک تھا اور جمّارام سے زیادہ بدچلن اور زیادہ بد دیانت۔ میں اپنے متضاد رویّے کو کیسے بیان کروں! جمّارام میرے سکول کا دوست تھا اور میں اُسے اپنا حریف سمجھتا تھا۔ چوں کہ اُس کا موقف مجھ سے اچھا تھا اِس لئے مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔

شہریوں اور دیہاتیوں کی بُنیادی فطرت میں فرق نہ تھا۔ دونوں کی بدچلنی اور بددیانتی مُسلّم تھی، انداز جُداگانہ تھا۔ دیہاتی پسر چرانے اور فصل چُرانے میں ماہر تھے اور شہری روپے پیسے۔

سومتر سنگھ مجھے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کی رائے دیتا۔ میں جو موقع کھو چُکا تھا اُس پر پچھتا رہا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ تھا تو میری لاچاری تھی جس کی تثلیث یوں بنتی تھی
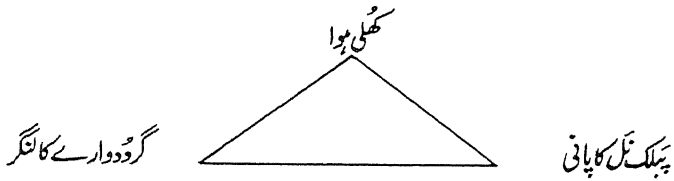
میری پونجی چند سکّوں میں سُکڑ گئی اور میری بدحواسی بڑھ گئی۔ پیارا سنگھ سے ملنے کے لئے میں ویسٹ پٹیل نگر گیا، وہاں وہ ہزاری لال کی کوٹھی کا کام کرتا تھا۔ اُس کی مکمل ہمدردی جگانے کے لئے میں نے رونی صورت بنا کر کہا، "بھائی صاحب! میں یوں ہی بیکار رہا تو بھوکا مر جاؤں گا!"

"ارے گاؤں میں کوئی بھوکا مر جائے تو مر جائے، دِلی میں کوئی بھوکا نہیں مرتا!"

وہ مسکرایا جیسے اپنی بات سے لُطف اُٹھا رہا ہو۔ اُس کی بات سُن کر، میں خاموش رہا۔ میری خاموشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، وہ بولا، "گردوارے میں لنگر کھاؤ، نل پہ پانی پیو اور مستی کرو!"

میں کبھی اُس کے سامنے نہ ہوتا تھا اور اُس کے ٹھٹھے مخول پہ مرحبا کہتا تھا۔ اُس وقت اُس کی بات مجھے تیر کی طرح لگی اور میں چلّایا، "یوں مستی ہوتی ہے تو تُو کیوں کام کرتا ہے؟"

ہزاری لال باتھ رُوم میں کھڑا ٹائیلوں کا مُعاینہ کر رہا تھا، اُس نے اُچک کر میری جانب

دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں لالہ جی!"

پیارا سنگھ میرے نزدیک آکر اُدھر کھڑا ہوگیا جدھر ہزاری لال تھا۔ اُس نے مجھے سختی سے دیکھا اور ہزاری لال کی نظروں سے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ وُہ مجھے باہر گیٹ کی طرف دھکیلتے ہُوئے، سڑک پر لے آیا۔ مَیں وہاں اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وُہ اندر جانے کے لئے مُڑا تو مَیں اُس کے پیچھے ہولیا۔ وُہ ڈر گیا اور مُصالحت آمیز انداز میں بولا، "میرا اچھا چھوٹا بھائی! آج رات گھر جاتے ہُوئے مَیں تیرے پاس آتا ہُوں اور اُس سے پہلے امر سنگھ سے مشورہ کر کے کوئی راہ نِکالتا ہُوں۔ کچھ دیر میں وُہ یہاں آرہا ہے۔ اَب تُو گھر جا۔" اُس نے پُچکاری دی اور میری پیٹھ تھپکی۔

مَیں تھوڑا سا نرم پڑ گیا اور اپنی اُمید و بیم سے لڑتا گھر لوٹ آیا۔ مَیں دِل ہی دِل میں جانتا تھا کہ وُہ میرے لئے کچھ نہیں کرے گا۔ لیکن وُہ خلافِ توقع اُسی شام آیا اور رِسّی کے لڑکے تخت سنگھ کے نام امر سنگھ سے خط لایا۔ اُس کی رسائی اور شناسائی کا ڈنکا تھا۔ مَیں دُوسرے دِن شام کے وقت پہاڑ گنج میں اُس کے گھر پُہنچا۔ اِحاطے کے پھاٹک سے لے کر گھر کے دروازے تک ہر شَے نفاست میں دُھلی ہُوئی تھی گویا اپنی دیکھ بھال کرنے والے کی تعریف کر رہی تھی۔ دروازے پر کال بِل تھی لیکن مجھ جاہِل کو اُس کی اہمیّت معلُوم نہیں تھی۔ مَیں نے دروازہ کھٹکھٹایا، کھُلنے میں دیر ہُوئی اور دوبارہ زور سے کھٹکھٹا دیا۔ باہر شام کا جھُٹ پٹا اور اندر اُجالا، دروازہ کھُلا گویا اندھیرے میں شگاف پڑھ گیا۔ وہاں ایک جوان عورت نمُودار ہُوئی جو سفید سِلک کی ساڑی پہنی تھی۔ اُس کے گندمی چمکتے رنگ کے پس منظر سے ساڑی، آب چادر کی طرح بہتی اور ناف سے نیچے اُن اسرار کی تفسیر کہتی لگی، جو گندم کھانے سے آدم پر کھُلے تھے اور جب سے اُس کی نسل کا مسئلہ بنے ہُوئے تھے۔ میری چشمِ شوق، منظرِ تن میں کھو گئی۔ اُسے پاتے اور راہِ راست پر لانے میں مجھے کچھ وقت لگا لیکن اُس سے پہلے مَیں نے تعارف نامہ آگے بڑھا دیا۔ راج کور نے وُہ کاغذ ایسے پکڑا جیسے کوئی گندگی میں پڑی کار آمد شَے کو حقارت سے دیکھتا ہے، اُسے جھجکتا ہُوا اُٹھاتا ہے، دُور سے نظر ڈالتا دیکھتا ہے اور ردّ و قبول کے مِلے جُلے جذبے سے مُتذبذب رہتا ہے۔

"کس نے بھیجا ہے تجھے؟" راج کور نے تلخی سے پُوچھا جِس میں قطعی تردید کی جھلک تھی۔

مَیں اپنے تصوُّر سے حقیقت کی دُنیا میں لوٹ آیا اور گھبرا کر امر کے لفظ میں اُلجھ گیا اور ہکلا کر بولا "امر، امر، امر سنگھ!"

"کون امر سنگھ ؟"

مجھے بیچ میں ٹوک کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اسے میری بات سے بدبو آئی ہو

"ڈ ڈ ۔۔ ڈڈیانہ کلاں ۔۔"

میں لڑبڑاتا ہوا جملے کے بیچ ہی میں تھا کہ اس نے مجھے کاٹ کر کہا، "اوہ اِدہ ت ر کھان !"۔

اس نے اپنی بات یوں کہی جیسے کوئی کھنکار اکر بلغم تھوکے۔

"مردار جی سے کیا کام ہے تجھے ؟"

اس کے لہجے کی درشتی بدستور تھی۔ میرا منہ اتر گیا۔ میری گھبراہٹ، بوکھلاہٹ میں بدل گئی اور میں نے مشتعل ہو کر دیہات کی اکھڑ زبان میں کہا، "او ہنوں ٹکرنا !" (اِن الفاظ کا لغوی معنی ہے کہ اس سے لڑنا ہے)

میری بات بڑھئی کی ہتوڑی کی وہ چوٹ تھی جو کیل کو لکڑی میں پورا مگر ٹیڑھا اتارتی ہے۔ وہ بھری کھڑی تھی، پھٹ پڑی، "یو فول گٹ آؤٹ اینڈ نیور شو یور فیس اگین ! تو یا جی یہاں سے نکل جا اور پھر کبھی اپنی گندی صورت لے کر اِدھر مت آ !" اس نے چوکیدار کو آواز دی، "چوکیدار تو کہاں مرا پڑا ہے ؟ جسے دیکھو تھوتھنی اٹھائے چلا آتا ہے !"

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور بھاگنے کی رفتار سے چلتا ہوا گیٹ کے باہر آ کر رکا۔ کچھ آگے جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا اور زمین پر ڈنڈا مار مار کر مجھے کوس رہا تھا۔ مجھ سے نظر ملتے ہی اس نے ڈنڈا ہوا میں لہرایا جیسے وہ مجھے ڈنڈا پھینک کر مارنا چاہتا ہو۔ میری بدکلامی اور ناشائستگی کی شکایت امر سنگھ تک گئی جو مجھے تہمت بن کر ملی۔

یہ تمام وحشتناک اور ہتک آمیز تفصیلات تایا جی کی اِس بات کی سند ہیں کہ رہنت ملوک ہے نہ کہ جات۔ آدمی کی بود و باش ہی اسے بادشاہوں کے سے طور و اطوار سکھاتی ہے۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت غارت ہو گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بھی بات چیت مجھ پر تہمت بننے لگی تھی اور میں نے اسے جان بوجھ کر بھلا دیا تھا۔ میں ویسا نہ کرتا تو اس گندے ماحول میں سانس نہ لے سکتا۔ آپ اپنے آپ سے یہ سوال کریں اور آپ ہی جواب دیں۔ پست حالات میں ارفع و اعلیٰ جذبات اور نفیس زبان کی کیا حقیقت ہے ؟ میرا تجربہ ہے کہ دیسا رویہ زیادہ ناگواری کا باعث ہے۔ بھٹکتے خیالوں کو سنبھالنے کا ایک ہی مؤثر طریقہ ہے، جہاں ہو ویسے ہو ! مطمئن رہو۔ اِختلافِ طبائع، زندگی

کی گونا گونی کا مبدا ہے لیکن کسی واضح سمت کا تعین کئے بغیر حالات سے نزاع تباہ کن ہے۔ جہاں فراست کا فقدان ہے وہاں ناداری، جمود ہے۔ فرید میرے ہی جیسے تجربے سے گزرا ہوگا، ورنہ وہ یہ کیسے لکھتا،

فریدا موتوں بھک بری (بھوک)
راتیں ستے کھائے کے صبح پھیر کھڑی (سوئے)

جیسے چراغ مردہ کے لئے تیل بیکار ہے، دلِ مردہ کے لئے اُمید۔ اپنے دل کے احیا کے لئے میں کیسے کیسے جتن کرتا! میری کوئی سمت نہ تھی اور نہ ہی غمِ حیات سے بے نیازی۔ میری بدبختی! میں اُن لوگوں میں گھرا ہوا تھا جو کسی کی بات سُننے سے زیادہ اپنی کہنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اِس میں اُن کا کوئی قصور نہ تھا۔ اُن کی سوجھ بوجھ بُنیادی ضرورتوں کا آئینہ تھا۔ وہ اپنی ذات سے پہلے کسی دُوسری چیز کو دیکھتے تھے تو وہ اُن کی ضرورت تھی۔ وہ شہر میں رہ کر بھی سراب زدہ تھے۔ وہ اپنے جس جذبے کو سراہتے تھے، دُوسرے کے اُسی جذبے کو جھٹلاتے تھے۔ غیبت اُن کی روشنی تھی، غیبت اُن کی تیرگی تھی، غیبت اُن کی برہمی تھی، غیبت اُن کی دلجمعی تھی ـــ۔ غیبت اُن کی زندگی تھی، پروازِ خیال تھی، اِس لئے وہ جالے میں پھنسی مکھی کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ اُن میں رقابت و کدورت کا جذبہ اِس قدر سرگرم تھا جو کسی وقت بھی جوالا مکھی کی طرح پھٹ سکتا تھا۔

میں خود فسادِ رُوح میں مُبتلا تھا۔ یہ دُوسری بات ہے کہ وہ زوال پزیر جبلت مجھے پوری طرح مغلوب نہ کر سکی تھی لیکن میرے اندر گندے گڑھے کی طرح سنسیاتی اور اُبلتی رہتی تھی۔ میری رُوح کی سب سے بڑی آزردگی وہ گندگی تھی جسے میں اپنے لباس کی شکل میں اپنے تن پر اُٹھائے پھرتا تھا۔ میں اُس بھیانک گندگی کو ناک کے علاوہ آنکھوں سے، ہاتھوں سے، رونگٹوں سے، مساموں سے، خیالوں سے سُونگھتا تھا۔ وہ رذیل لباس، سردی میں برف کی پرت، گرمی میں پسینے سے ریگمال اور برسات میں گیلے میل کا بھبھوکتا ڈھیر تھا۔ وہ اُسی وقت ذریعۂ راحت بنتا تھا جب پہننا نہ ہوتا تھا۔ اُسے اُتار کر دوبارہ پہننا، قے کیا ہوا نوالہ اُٹھا کر کھانے کے برابر تھا۔ میں جس دن اُسے دھو کر پہنتا وہ اِتنا ہلکا ہوتا کہ کئی بار مجھے لگتا کہ میں ننگا ہوں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر انسان جذبۂ نفاست سے عاری ہوتا تو آج بھی وحشی ہوتا۔

میرے احاطے میں پریتم کور نام کی ایک عورت رہتی تھی۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ کہ وہ دوسروں کے نئے کپڑوں میں بلیڈ پھیر دیتی ہے۔ اُس کے ڈر سے لوگ اپنے کپڑے اندر سُکھاتے

تھے یا اپنے سامنے۔ وہاں کوئی نہ کوئی کلیس اور جھمیلا کھڑا ہی رہتا تھا۔ کوئی کسی کے دروازے کے آگے کوڑا کرکٹ پھینک دیتا اور کوئی دوسرے کی دیوار کے ساتھ بچّے کو ہگا دیتا۔ ہر زبان اپنی تلوار کی سی تھی جو رات کے چند گھنٹے مُنہ کے نیام میں رہتی تھی۔ اُس تُو تُو، مَیں مَیں کی کِچ کِچ، کچّی کھالوں کی بدبُو سے زیادہ گھناؤنی اور سرکش تھی۔

باب ۵۲

ہر کام ہے دیر جدھر بھی دیکھو
تقدیر کا ہے پھیر جدھر بھی دیکھو
ہر سمت نئے پاپ جنم لیتے ہیں
اندھیر ہے اندھیر جدھر بھی دیکھو (شاطر)

میری آوارگی مجھے معاشی بدحالی سے چھٹکارا نہ دِلا سکی لیکن میرے غم کی تسکین بن گئی۔ دِلّی کے راستے مختلف المزاج باہوں کی طرح مجھے کہیں گراتے، کہیں سہارا دیتے اور کہیں اُٹھاتے ٹالکٹورا گارڈن تک لے گئے۔ وہ گارڈن، گارڈن نہ تھا، دامانِ دردمندی و شادمانی تھا جو قلبِ زمیں سے لے کر قلبِ انساں تک پھیلا ہُوا تھا۔ میں نامُرادی اور بے توجہی کا کچلا ہُوا وہاں ایسے پہنچتا جیسے کسی غرقاب کشتی کے مُسافر کو لہروں کے تھپیڑے کنارے پر لا پھینکیں۔ فضا کی مُصالحت سازی میرے اُجڑے تصوّر کو آباد کرتی، ہوا کی نرمی تھکے ماندے اعضا کو سہلاتی، پرندوں کے نغمے افسُردہ کانوں میں رس گھولتے، گُلِ تازہ دِل کے زخموں پر پھاہے رکھتے، سبزے کا گداز میری غمی کو خُوشی میں بدلتا اور شاخیں شفیق باہوں کی طرح جُھک کر مجھے اپنے سائے میں بُلاتیں۔ مَیں بے اختیار ہو کر اُدھر بڑھتا، اُنھیں چُومتا گالوں سے مَس کرتا جیسے وُہ مجھ مُصیبت زدہ کے دردمند ہوں۔

مَیں اُن حالات کا تجزیہ کرتا جن سے مَیں گزر چُکا تھا اور گزر رہا تھا۔ میرا ماضی پُرتشدّد اور ذِلّت آمیز سہی، مَیں اُس میں کم کم ہی سہی، پیٹ کے آزار سے آزاد تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اپنے خیالوں کی وادیاں آباد کروں لیکن اُن کی مٹّی خراب تھی۔ مَیں ساحر کے پُوجے اور چاہے ہُوئے گُم ناموں سے

زیادہ گُم نام، بے بسوں سے زیادہ بے بس اور بے سہاروں سے زیادہ بے سہارا تھا۔ اُن فن کاروں کی صلاحیتِ ایجاد وُہ شگفتہ جذبہ تھا جس کے طُفیل وُہ اپنی فلاکتوں کو حُسنِ کاریں ڈھالتے اور اُن سے نجات پانے میں کامیاب ہُوئے تھے۔ غم ذات کے غارت گر دور سے وُہ کس نادر طریقے سے گزرے تھے۔ اُن کے تعمیری وجدان نے بے حس چھینی کو حس دی، اور اُس سے جو عالم تراشے وُہ اُن کے گُونگے غم کے بولتے شاہکار تھے۔ اُن کے کربِ تخلیق کی کہانی دیوارِ چین کی طرح طویل، اہرام مصر کی طرح عظیم، تاج محل کی سی مرمریں، مونالیزا کی مسکراہٹ کی سی لطیف اور نائٹ واچ کی سی پُر تجسُس تھی۔

قارئین! جسے ہم تہذیب و تمدّن کہتے ہیں وُہ ایسے ہی گُم نام ہُنروروں کی نام ور کہانی ہے۔

مَیں اُن فن کاروں کے خیالی پیکر بناتا، اُن کی اذیتّوں کا اندازہ کرتا اور اِس نتیجے پر پُہنچتا کہ کوئی جتنا بڑا فن کار ہے اُتنا ہی ستم پروردہ ہے۔ اِنسان کا کھوکھلا پن عجب طریقے سے اپنے بھرے پُرے ہونے کا مُظاہرہ کرتا ہے! مَیں کچھ بھی نہیں تھا اور نہ ہی میری کوئی دِشا، لیکن اُس نازک گھڑی میں میرے ضمیر سے آواز آتی" تو اُن فن کاروں سے بڑا فن کار ہے! تو اُس تصویر کی طرح ہے جو رنگوں کے ڈھیر میں سکڑی سمٹی پڑی ہے!"

اُن فن کاروں کے اِحساسِ تخیّل کی بُلندی اور کربِ تخلیق کی شگفتگی پر مَیں حیران ہوتا۔ اُن کے دردو کرب میں وُہ خُوبیاں نہ ہوتیں تو نوعِ اِنساں، اِحیا اور اِرتقا کے راستے پر گامزن نہ رہ سکتی۔ وُہ فن کار، فرطِ تخلیق کے ایسے سرچشمے تھے، جنھیں مزاحمتِ زمانہ مجہُول نہ کر سکی تھی۔ وُہ ہر رکاوٹ کو روندتے ہُوئے اُس نصبُ العین کی جانب بڑھے اور بڑھتے رہے، جسے وُہ ریگ زارِ دہر پر نقشِ مُستقل کی صُورت ثبت کرنا چاہتے تھے۔ وُہ اپنی سرشاریِ تخلیق میں خُدا کو یُوں مُتبک کر گئے۔

ہَر مرے تاں ہم مریں
نَئیں تاں ہمری مرے بلا
(خُدا مرے گا تبھی ہم مریں گے ورنہ ہماری بلا مرتی ہے)

اُن فن کاروں کی فطرتِ کاملہ! اُنھوں نے انگوٹھے کٹوائے، ہاتھ قلم کروائے، زہر پیا سُولی پر چڑھے، سنگسار ہُوئے اور جلا وطنی کے ساتھ وُہ سارے ظُلم سہے جن کا اِحاطہ کرنا مُشکل ہے۔ اِنکشافِ اسرار کے اُن اُجالوں کو مُصیبتوں کے اندھیرے دُھندلا نہ سکے۔ وُہ اِنسان، حیرت انگیز

اِنسان ! آسمان کے برعکس دھرتی کے چاند ستارے تھے، آفتاب تھے اور آج بھی ہیں۔
تایا جی علم وفن کی حقیقت جانتے تھے اور اِسے ہُنرور کی زندگی سے جیسے جوڑتے تھے وُہ قُوّتِ ایجاد کی تحریک در تحریک ہے۔ "علم وہُنر لافانی اور انجام نا آشنا ہیں اور اُسی طرح اِن کے خالق۔ یہ آغاز در آغاز سے منسُوب ہیں اور ابدیّت در ابدیّت سے مُنسلِک۔"
جو ہُنرور تہذیبِ ہُنر کی رُوحِ رواں تھے، مَیں اُن کے کمالِ ذات میں کھو کر اپنی رُوح کا کمال دیکھتا۔ مجھے لگتا کہ ہُنروروں کے سوائے ہر بشر، مجذُوب بھنور ہے۔ بھنور کا ہَوکا مشہُور ہے! وُہ خُود کو جتنا بھرتا ہے اُس سے زیادہ خالی کرتا ہے۔ مجھے سِکندر، چنگیز، محمُود، نادر، نپولین، موسولینی۔۔۔ جیسے لوگ بھنور کے اِنسانی نمُونے لگتے۔ مَیں سوچتا کہ اُنھوں نے نوعِ اِنساں کو بجز خُوں خرابے اور تاراجیِ تہذیب کے کیا دیا ہے؟ اُن تاریخی مجرموں اور لُٹیروں میں اِقبال کو کیا خُوبی نظر آئی کہ وُہ اُن کے ترانے گانے لگا۔ مَیں اِقبال کے کھوکھلے پن پر حیران ہو کر سوچتا کہ ہمالہ، گُلِ رنگیں، حقیقتِ حُسن، جگنُو، سرگزشتِ آدم۔۔۔ کے اِقبال کو کیا ہُوا؟ وُہ کیسے بدل گیا؟ مَیں سوچتا، سوچتا اور سوچتا اور اِس نتیجے پر پہنچتا کہ اِقبال انحطاطِ ضمیر کا شِکار ہو کر موسمِ گرما کے تالاب کی طرح سُوکھ گیا۔ ایسے تالاب کا سِینہ پھٹ کر ہزاروں فریادی ہونٹوں کی تصویر نظر آتا ہے۔
میرے قارئین، مجھے مُعاف کرنا! مَیں اِقبال کا نکتہ چیں تو ہُوں لیکن مَیں خُود اُس چیخ کی طرح تھا جس کی وضاحت وصراحت نہ ہو۔ میرے دِل ودِماغ، شب باسیوں کے بسیرے تھے۔ اچھّا سوچنا اور اچھّا قدم اُٹھانا، پانی پر نقش ونگار بنانا تھا۔ میرا سب سے زیادہ دردناک کرب میری جسمانی ضرُورت تھی، جس نے میری رُوحانی اُپج کو دبا رکھا تھا۔ خُود کو صاف سُتھرا دیکھنا میری اوّلیں خواہش تھی۔ مَیں اپنے ذہنی تنزّل کو روکنے کی کوشش یُوں کرتا تھا جیسے دُوسری گلی کا کُتّا مقامی کُتّوں کی یلغار کی تاب نہ لا کر اندھی گلی میں دبک جائے، بھونکے کم اور غرّائے زیادہ۔ غریبی اور بیکاری کی وجہ سے میری آزُردہ دِلی نمک چھڑکے زخموں کی سی تھی۔ مَیں پیٹ سے سوچتا، آنتوں سے جھیلتا اور دِل سے محسُوس کرتا کہ میری ہڈیوں کو گھُن لگا ہُوا ہے۔ ہر وقت دیکھتے رہنے سے کپڑوں کے پیوند زیادہ بڑے اور زیادہ اُبھرے ہُوئے لگتے۔ اُن کے ٹُوٹتے اور اُدھڑتے ٹانکے میرے لرزاں دخیزاں جذبات کے نُمایندے تھے۔ اُن گھِسے پیوندوں اور بے جوڑ ٹانکوں کو دیکھ کر گُمان ہوتا کہ میرا جسم بے ترتیب اعضا کی یکجائی سے بنا ہے۔ میرا لباس اور جسم اُن نامعقول ہمسایوں کی طرح تھے، جو وقت، بے وقت ایک دُوسرے کی ہنسی اُڑائیں اور اپنے رویّے پر فخر کریں۔

مَیں لنگر کھانے کے لئے گردوارہ رکاب گنج پہنچا۔ وُہ دِن گرو ارجن دیوجی کا شہیدی پُرب تھا۔ تاحدِ نظر مہکتے چہکتے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ماتمی ماحول کے بجائے میلے کی سی چہل پہل تھی۔ کسی کے چہرے پر اُس نازک درد کا تاثّر نہ تھا، جو اُس مخصُوص وقت سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔ وہاں جو ہو رہا تھا وُہ اِعتقاد و احترام کے خلاف اور توہین آمیز تھا۔ گروجی نے ظلم پرست حکُومت کی تنبیہ اور اِنسانیت کی علم برداری کے لئے جان دی تھی لیکن وہاں اُس پُر ایثار اور پُر وقار مقصد کا فقدان تھا۔ گروجی کے جذبے میں حزن و ملال کا اِحتجاج تھا لیکن اُن کے جذبے میں عشرت و مسرّت کا اِمتزاج تھا۔

ہر کوئی اپنے انداز میں خُود کو ٹھیلتا ہے اور دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لباس کے حلقۂ عمل میں یہ دستُورِ عام ہے کیوں کہ یہاں دُوسرے کو کمتر ثابت کرنا آسان اور قطعاً ہے۔ اُن شُرفا میں میری حالت بھکاری کی سی تھی۔ مَیں اپنی زِندگی کے کسی موڑ پر اِس قدر پامال نہ تھا۔ میرا دِل خُود رحمی اور خُود آگاہی کے جذبے سے مسوس گیا۔ اُس کی دیانت داری! اُس نے بھائیا جی کی بدخواہی میں بہی خواہی دیکھی اور اِحسان مندی کے درد سے دھڑکا۔ عین اُس وقت میری خُود داری نے سر اُٹھایا اور چلّا کر کہا، ”تیری اِس گت کا ذِمّہ دار وُہی ایک تو ہے! تو جس آگ میں جل رہا ہے، وُہ اُسی کی لگائی ہُوئی ہے۔“

عام آدمی کی خُودی کی نفسیات اقبال کی بتائی ہُوئی تفسیر سے الگ ہے۔ مَیں نے اُس کے انوکھے رنگ دیکھے ہیں، صرف دو کی صُورت بیان کرتا ہُوں۔

سُریندر اور مَیں گاؤں میں تھے۔ ایک شام ہم گلی میں ٹہل رہے تھے کہ جوگندر کور (میرے دوست سویگ سنگھ کی بیوہ) اُپلے اُٹھائے اِدھر سے گزری اور ہم سے باتیں کرنے لگی۔ اُس کے ہاتھ سے ایک اُپلا گر پڑا۔ مَیں نے اُپلا اُٹھایا اور اُسے پکڑایا۔ اُس نے بھرے پُرے حقارت آمیز لہجے میں کہا، ”رہنے دیجئے! ایک اُپلے کی کیا حقیقت ہے!“

اُس کے خلافِ توقع بلکہ ہتک آمیز رویّے سے مَیں نہایت شرمندہ ہُوا۔ مَیں اُلجھن میں پڑ گیا کہ اُس اُپلے کا کیا کروں؟ مَیں نے اُٹھایا ہُوا اُپلا گرا دیا۔ مَیں کس نفسیاتی حالت میں تھا؟ میرا جذبۂ رفاقت، جذبۂ ندامت میں بدل گیا اور مَیں نے اُس کے سامنے حقیر محسُوس کیا۔ وُہ مُسکراتی ہُوئی چلی گئی۔ اُس کے بُشرے پر ایسی روشنی تھی جو احساسِ برتری ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

دُوسرے دن سویرے مَیں سیر کو گیا، سُریندر میرے ساتھ تھی۔ ہم نے جو دیکھا وُہ خلافِ قیاس تھا۔ جوگندر کور سڑک میں سے گوبر اکٹھا کر رہی تھی۔

سنتوکھ سنگھ پیدائشی لنگڑا تھا۔ اُس کے ماں باپ کی مُدافعت کے باوجود وُہ قیدوں (وارث شاہ کی ہیر کا فسادی کردار، جو لنگڑا تھا) کے نام سے موسُوم ہوگیا۔ جب کوئی اُسے اُس نام سے پُکارتا اُس کا ردِعمل دردناک اور خوف ناک ہوتا لیکن کئی اُس کی چڑ سے لُطف اُٹھاتے۔ وُہ اُن کا کچھ نہ بِگاڑ سکتا لیکن اُن کی تھوپی ہُوئی ذِلّت کا بدلہ اپنی ماں سے لیتا۔ "او ذلیل عورت! یہ سب تیرا قصور ہے! مَیں تیری وجہ سے خوار ہُوں۔ کِتنا اچھا ہوتا! اگر تُو مجھے پیدا نہ کرتی۔ پیدا کر ہی دیا تھا تو یہ جان کر کہ مَیں لنگڑا ہُوں، مجھے مار ڈالتی یا خُود مر جاتی۔ مَیں تیری منحوس صُورت برداشت نہیں کرسکتا!"

لیکن اُس کی ماں اُسے برداشت کرتی اور دل وجان سے چاہتی۔ ایک دِن وُہ سوئی پڑی تھی سنتوکھ نے اُس کے پیٹ پر اینٹ دے ماری جیسے وُہ اُس ماخذ کو برباد کرنا چاہتا ہو جس نے اُسے ادُھورا بنایا تھا۔ اُس کی ماں مرتی بچی۔ اُس نے پہلی بار اُسے مارا اور لتاڑا۔ وُہ اُسی رات گھر سے بھاگ گیا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ اُس کا کیا حشر ہُوا؟ وُہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نیچ سمجھ کر ہر کوئی مجھ سے کترا رہا تھا جیسے مَیں غلاظت کا چلتا پھرتا ڈھیر تھا۔ مجھ سے جو چھُو جاتا، مجھے وُہ اُس کراہت سے دیکھتا جو بدرو میں پاؤں پڑ جانے سے چہرے پر اُبھرتی ہے۔ اُن خُوش لِباس لوگوں کی رُوحیں ہولناک حد تک گھناؤنی تھیں۔ جب وُہ اپنی سرد مہری کا مُظاہرہ کرتیں، جگمگاتے چہرے، اندھیرے گڑھے دکھائی دیتے۔ پنگت بیٹھنے لگی اور اُن بھلے مانسوں کی بےحسی اپنے عرُوج پر پہنچ گئی۔ مَیں پنگت سے سرکتا، دبتا، سُکڑتا، اُٹھتا وہاں جا کھڑا ہُوا جہاں مجھ جیسوں کا ہجُوم تھا۔ وُہ ہجُوم سماجی اور اِنسانی قدروں کے اِبطال کی پیداوار تھا۔ وُہ اُس نفیس ماحول سے بےجوڑ تھا، اِس لئے وہاں یُوں لگتا تھا جیسے گھر کی حدُود کے ساتھ غلاظت کا ڈھیر۔ اُسے دُور دھکیل دیا گیا۔ اُس کی عاجزی، فروتنی، لاچاری، بدحواسی --- جو اپنی تردید آپ تھی، اُس میں اضافہ ہوگیا۔ مَیں اُس کے گھناؤنے پَن سے گھبرا کر دُور جا کھڑا ہُوا۔ لنگری دلاسا دینے لگے، "پنگت کے بعد تُمہاری باری آئے گی جب تک تُم یہیں ٹھہرو۔" وُہ لنگر بانٹنے لگے اور حاجت مند نا اُمیدی سے سہمے دِلوں کی طرح سُکڑنے لگے۔ حوصلہ افزا وعدوں کے باوجُود بھوکے آگے بڑھنے لگے۔ اُن کی بےقراری سے ظاہر تھا کہ وُہ وعدے اُن کے آزمائے ہُوئے ہیں۔ کیسا حسرت ناک منظر تھا! اُن بھُوکوں میں مجھ سے زیادہ بھوکے تھے اور زیادہ بےضبط۔ وُہ مُنہ میں اُمڈتے پانی کو یُوں نگلتے تھے جیسے آہیں بھرتے ہُوں۔ وُہ اپنی بےچینی میں آگے کھسکتے کھسکتے پنگت تک کھسک جاتے۔ وُہ اُنھیں ایسے دیکھتی جیسے اپنی بدصُورتی سے گھبرا کر کوئی آئینے سے مُنہ پھیرلے۔ اُس کی جھڑکی کھا کر وُہ پیچھے ہٹتے لیکن آگے بڑھنے

کے لیے۔ پنگت اُٹھنے لگی اور جھوٹی پتر ولیاں ایک کونے میں پھینکنے لگی۔ بھوکے اُدھر لپکے اور مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے وہاں جا اکٹھے ہوئے۔ جو جھوٹن، کتّوں بلّیوں اور کیڑوں مکوڑوں کا کھاجا تھا اُس کے لیے اِنسانوں میں لڑائی ہونے لگی۔

انواعِ حیات میں نوعِ اِنسان ناقابلِ تفسیرِ حیات ہے۔ مَیں نے اِنسانوں کو گوبری (گوبر میں سے نکالی ہوئی جنس۔ فصل کاٹنے کے موقع پر اناج عام پڑا ہوتا ہے۔ مویشی اُسے کھالیتے ہیں لیکن پچانے میں ناکام رہتے ہیں اور اُسے گوبر میں نکالتے ہیں۔ اُن دنوں غریب گوبر میں سے اناج پانے کے لیے گوبر اکٹھا کرتے ہیں) کھاتے دیکھا ہے۔ بھوک کی آگ وقت پر بُجھائی جائے تو حیات برقرار ہے ورنہ غارتِ گرِ عناصر ہے میری بھوک نے میرے ضبطِ نفس میں کیسے کیسے زلزلے پیدا کئے! کیسے کیسے رخنے ڈالے! لیکن کسی طرح وہ مجھے فنا نہ کرسکے۔ چوں کہ اِنسانی زندگی کا دارومدار کام پر ہے، کام ہر چیز سے انمول ہے۔ اِس حقیقت کے باوجود بیکاری پرست سادھو سنت اپنے طرزِ حیات کی حمایت کرتے ہیں۔

پنچھی کرے نہ چاکری، اجگر کرے نہ کام
داس مَلوکا کہہ گئے، سب کا داتا رام

حاجت کی وہ بھیانک شدّت میرے خیال میں بھی نہ تھی، جو شہر کی اِفراط کی تفریط کا نتیجہ تھا۔ میرا دِل متلایا اور اُچک کر منہ کو آیا۔ مَیں صاف سانس لینے کے لیے تڑپ اُٹھا اور پیٹ پاٹنے کے بدلے، پیٹ پکڑ کر بھاگا۔ وہاں بھاگنے کے لیے جگہ کہاں تھی! سڑک اور فٹ پاتھ اِنسانوں سے بھرے پڑے تھے، جو ایک دُوسرے کو روندنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ کئی میرے ساتھ ایسے ٹکراتے جیسے مَیں غیر مرئی شے تھا اور انھیں نظر نہ آتا تھا۔ مَیں ایک کے پہلو سے گھستا اور دُوسرے کے پہلو سے نکلتا، گول ڈاک خانے کے پاس جاکر رُکا اور وہاں سے نرم روی سے ٹالکٹورا گارڈن میں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے حالات یوں بحال ہوئے جیسے دِن کی سختی سے کملائے ہوئے پھول اور پتّے، شام کی نرمی سے لہک مہک جاتے ہیں۔

مایا دیوی پھولوں کو سیراب کر رہی تھی۔ مَیں نے جاتے ہی اوک سے پانی پیا۔ پانی حلق سے ڈھیلے کی طرح ٹکرایا اور مجھے اُچھو آگیا۔ مَیں سینہ پکڑ کر کھو کھو کرنے لگا۔ مایا نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا، میری پیٹھ تھپک کر ملی جب کہیں میری سانس کھلی۔ اُس نے مجھے ڈانٹا، "ذرا دم لے کر پانی پیتا تب کیا جاتا؟"

مَیں نے ہاتھ مُنہ دھویا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے پانی پیا۔ جو ہوا چہرے کو چھو کر گئی اُس میں بادِ بہاری کی سی تاثیر تھی۔ اُس کے لمس نے مجھے پور پور مہکا دیا۔ مایا پھولوں میں سے سبزہ بیگانہ اُکھاڑ رہی تھی۔ مَیں دِل بہلاوے کے لیے اُس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا اور پھولوں کے آئینوں میں رُوح کے مکھڑے دیکھنے لگا۔ مَیں ایک خیال سے کئی بار گزرا تھا، وُہ تازہ ہو گیا۔

جسم کتنا سادہ ہے، پھول کی طرح!

رُوح کتنی انوکھی ہے، بیج کی طرح!!

پھول اِس لیے سادہ ہے کہ اِس کا وُجود وقتی ہے، بیج اِس لیے انوکھا ہے کہ اِس کا وُجود دائمی ہے۔ اِس کے باوُجود کِتنے بیج ہیں جو عملِ افزائش سے گزر کر حسنِ نمُود تک پہنچتے ہیں؟ مَیں عملِ افزائش کی لاجواب مگر غیر مُعیّن تغیُّر پزیری پر حیران ہوتا، اِسے پابندیِ تقدیر سے منسُوب کرتا اور کبھی نیرنگیِ فطرت سے۔ اوّل حالت میں میرا دِل خوف سے بیٹھ جاتا۔ مَیں مذہب کے سایۂ عاطفت کے ساتھ خُدا کی غیابت کی حمایت کرتا اور کبیر کے اِس دوہے کو زِندگی کا محوَر سمجھتا۔

چلتی چاکی دیکھ کے کاہ کبیرا روئے

جو کھونٹن سے جا لگے بال نہ بیکا ہوئے

میری حالت اُس بچّے کی سی ہوتی جو ماں کے حلقۂ اثر سے باہر نہ نکلا ہو۔ وُہ کسی خطرے کا سامنا کرتے ہی ماں کی طرف بھاگتا ہے اور اُس کی مدد چاہتا ہے۔ مَیں اپنے بچپن میں اِس سے زیادہ نازک مراحل سے گزرا تھا۔ مجھ ستم رسیدہ کو ماں کی آغوش نہ ملتی تو مَیں چارپائی کے پائے کو تھام کر اپنی بے کسی کو سہارا دیتا۔ وُہ بے جان پایہ مجھے میرا ہمدرد جان پڑتا اور مَیں اُس سے لپٹ کر سو جاتا۔ مجھے خواب میں لگتا کہ میری ماں مجھے تھامے ہُوئے ہے۔ میری مظلُومیت کے ہیولے مجھے ڈراتے، مَیں پائے کو مضبُوطی سے پکڑ کر اُس کے قریب کِھسکتا اور اُس کی قُربت میں محفُوظ محسُوس کرتا۔

مَیں دُوسری حالت میں آزادیِ عمل پر یقین کرتا اور ہر ناکامی کو کامیابی کی سمت نیا قدم سمجھتا اور ساحر کی اِس پیش گوئی کو رہبرِ حیات۔

غم نہ کر جو ہے بادل گھنیرا

کِس کے روکے رُکا ہے سویرا؟

میری خوش اُمیدی میری پُشت پناہی ہوتی۔ جیسے اندھیرے میں اُگا ہُوا پودا اُجالے کی طرف بڑھتا پھولتا ہے اُسی طرح میری ترقّی پسندی مجھے پستی سے بُلندی کی طرف اُٹھاتی اور وُہی اُفتادِ طبع

میری شکستوں، بے اطمینانیوں، حسرتوں، محرومیوں، ذلّتوں ۔۔۔ کا واحد مُداوا ہوتی ۔

مَیں گھر روانہ ہُوا تو پیٹ میں شعلہ سا لپک رہا تھا ۔ راستے میں ایک بنگلے کے احاطے میں آم کا بیڑ تھا ۔ اُس کی کچھ شاخیں باہر سڑک کی طرف بڑھی ہُوئی تھیں جو گدرائے ہُوئے آموں سے بھری ہُوئی تھیں ۔ میں اُنھیں دیکھ کر للچا گیا اَور سوچنے لگا کہ اُنھیں کیسے چُراؤں ؟ سوچتے سوچتے مَیں نے سوچا کہ میں عین آم کے نیچے کھڑا ہو کر اُس پر پتّھر پھینکوں تاکہ وُہ بنگلے کے باہر گرے ۔ مَیں نے پتّھر ڈھونڈا اَور جیسا سوچا تھا ویسا ہی کیا ۔ پتّھر کسی آم کو نہ لگا لیکن جیسے اُوپر گیا تھا ویسے ہی نیچے آیا اَور میری پگڑی کی کھڑکی میں گرا ۔ مَیں دَرد سے ہائے ماں مر گیا، چِلّایا اَور وہیں بیٹھ گیا ۔ درد یُوں کم ہُوا جیسے ماں کا نام دافعِ درد اِکسیر تھا ۔ آج تک جتنے الفاظ ایجاد ہُوئے ہیں، اُن میں سے 'ماں' کا لفظ سب سے زیادہ پُرکار، پُرشکوہ پُرمعنی ۔۔۔ ہے ۔ کہیں یہ بچے کا حال ہے، کہیں مُستقبل ہے، کہیں جاہ ہے، کہیں اُمید گاہ ہے، کہیں غمی ہے، کہیں خُوشی ہے، کہیں غرور ہے، کہیں سُرور ہے، کہیں اپنائیت ہے اَور کہیں رجائیت ہے ۔ یہ لفظ مُکمّل کائنات ہے اَور بچّہ اِس کائنات کا جُزوِ لاینفک ہے ۔ لیکن اپنی خُود اداعائی کا بھرم باندھنے کے لیے وُہ ماں سے جُدا ہوتا ہے تو غمِ مفارقت برداشت نہیں کر پاتا ہے اَور آرزوئے وصل کے کرب سے نڈھال ہو کر اُسے پُکارتا ہے، اُس اَمن پرور ماحول کی امان مانگتا ہے، جہاں سے اُس کے خُود ساختہ حالات باہر نکال پھینکتے ہیں ۔ ماں پہلا لفظ ہے جو انسان نے بے ارادہ اَور لاشعوری طور پر تخلیق کیا لیکن اِس کے پیچھے اُس کی ساری نفسیات، ساری وجدانیت اَور ساری رُوحانیت کارفرما ہے ۔ ماں اِنسانی زِندگی کی اَزلی اَور ناقابلِ مُصالحت حقیقت ہے ۔

مَیں نے پگڑی اُتار کر چوٹ پر ہاتھ لگایا ۔ میرا سر پھٹ گیا تھا اَور بال، خُون سے کیچڑ ہو رہے تھے ۔ مَیں اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہُوا، اُٹھا اَور گھر کا راستہ لیا ۔ میرا سر، تن پر بوجھ تھا، سانس نتھنوں پر اَور جُوتا، پیروں پر ۔ میں نے جُوتا اُتار کر پگڑی کے لڑ میں باندھا اَور اُسے کاندھے پر ڈالا ۔ بھوک اَور دَرد سے میری بصارت جھائی دار آیئنے کی سی تھی ۔ مَیں نے سلیمان سکُول کے پاس ایک نلکے پر پانی پیا، پاؤں پر ترتڑا دے کر پاؤں کو دھویا اَور آنکھوں میں چھینٹے مارے ۔ میری تھکن کچھ دُور ہُوئی اَور وُہ راہ گزر جو میری بے دِلی سے انجانی سی لگ رہی تھی، جانی پہچانی دکھائی دی ۔

گھر سے ہوٹل دو فرلانگ آگے تھا ۔ وہاں جانے سے پہلے مَیں نے سستانا اَور نہانا چاہا ۔ منزلِ مقصود سامنے دیکھ کر میری آہ نکل گئی اَور توانائی بالکل شل گئی ۔ مَیں دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا، میرا سر لٹّو کی طرح چکرایا اَور مَیں سر کو ہاتھوں میں پکڑ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا ۔

جگت سنگھ اپنا کھانا گھر میں پکاتا تھا۔ کسی اشیائے خورد و نوش کی تلاش کرتے ہوئے میں نے برتن اُلٹ پلٹ کر دیکھے، نمکدان اور صُراحی کے سوائے سب میرے پیٹ کی طرح خالی تھے۔ میں نے سر کا زخم ٹٹول کر اُس پر ہلدی لگائی اور پھر گلاس بھر پانی میں نمک مِلایا اور پہلا گھونٹ قسطوں میں پیا۔ میرے عمل کی نرمی نے گھونٹ کی تلخی کم کر دی۔ میں نے پورا گلاس رُک رُک کر اور ہلکے ہلکے گھونٹوں پیا۔ میری کھوئی ہوئی طاقت مجھے ایسے مِلی جیسے ٹکور کرنے سے مجروح اعضا کا درد کم ہو جاتا ہے۔ چھینکا دیکھنے کو خالی لگتا تھا لیکن ٹٹولنے پر اُس کی تہ میں سے ایک باسی روٹی ملی۔ جانے وہ کب سے وہاں رکھی تھی؟ سُوکھ کر سخت ہو رہی تھی اور اُسے لال چیونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے روٹی ہاتھ پر مار مار کر اچھی طرح جھاڑی اور فرش پر رکھ کر مُکّے سے توڑی۔ روٹی کرکری تھی، ٹوٹ کر چھوٹے بڑے کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ میں نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھے کئے، پھانکے اور کُر کُر چبانے لگا۔

"گیان، تو چنے کھا رہا ہے کیا؟ مجھے بھی دے!"

میں نے اُس آواز میں بے انت کور کا لالچی چہرہ دیکھا۔ میں پیچھے مُڑا اور اُسے میرے اوپر سے مجھ پر جھانکتے پایا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور پھیلا دیا۔ اُس میں روٹی کے سُوکھے ٹکڑے دیکھ کر وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور اپنے اونچے بھدّے دانتوں کو دوپٹّے سے چھپانے لگی۔ میں نے مُنہ کا پھانکا کھایا اور اُس کے سامنے سُوکھے ٹکڑے ٹھنگیرتا رہا جب کہ وہ میرا ٹھٹھا اُڑاتی رہی۔ میری بے نوائی کی سنجیدگی! میں بالکل برہم نہ ہُوا۔ میں لوگوں کو اُن پُر درد حالات پر ہنستے دیکھ چکا تھا جہاں سراسر آنسو بہانے کا محل ہوتا تھا۔

وہ وقت نہایت صبر آزما وقت تھا! میرا بدن، پانی میں پڑے برف کے ڈلے کی طرح گھُل رہا تھا۔ کُولہے اور کمر دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط نظر آتے تھے اور پیٹ کے اوپر پسلیاں قوسیں۔ ہنسلیوں کے اوپر خوبصورت خم تھے، وہ بدنما گڑھے بن گئے اور گھائیاں نمایاں رہنے۔ ناخن، دُودھ سے سفید ہو گئے اور رنگ یرقانی۔ پٹھے گل کر رگوں میں رل گئے اور لہو کا دریا اُتر گیا۔ ہڈیوں پر جِلد مہین سی پوشش دکھائی دیتی اور دیدے، دراڑوں میں اٹکے ہوئے ڈھیلے۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، ابرِ باراں کے ہالوں کی طرح تھے جو برستے برستے ابرِ گریزاں میں بدل جاتے ہیں۔

ہر صورت اپنا رنگ دکھا رہی تھی! فاقہ مستی الگ، بیکاری الگ، آوارہ گردی الگ،

آزردگی الگ اور ۔۔۔ خود فریبی الگ۔ اِن میں سے کوئی بات میرے بس میں تھی تو وہ آخری تھی۔ میں اسے اپنے کردار کی کمزوری کہوں کہ ضرورت کی زیادتی! میں اُس سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اُس مکروہ زندگی میں دل بہلانے کا وہی ایک سُندر، سُپھل اور آزمودہ طریقہ تھا۔ میں جوں ہی خود فریبی پر مائل ہوتا میرا ننّھا اپنے گوشۂ خاموشی سے مترنم لہجے کی طرح اُبھرتا اور اُس تہذیب کا معتبر مشتہر نظر آتا جو میری رگوں میں مضمر تھی۔ اُس تہذیب میں سانس لیتے ہی میرے سارے اعضا کھِل کھِل اُٹھتے، جیسے بہار آنے سے پودے، پرندے انسان، حیوان ۔۔۔ ایک ساتھ جھکتے جھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُس اسباب بے اسبابی میں میری تمنائے خود تہذیبی اور شانِ خود اعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے پوری طرح یقین تھا کہ میں خود کو خود پر بے دریغی سے خرچ کروں گا تو بھی مجھ میں کمی نہ ہوگی۔ میری خود خرچی، میرے دِل کی تسکین آمیز راحت تھی اور رگوں کی روحانی قوّت، جو میرے جسم کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچاتی تھی۔ آدمی کی خود خرچی، دھرتی کی پُراسرار طاقت ہے، جس سے گردشِ حیات اور آفرینشِ اصل جاری ہے۔ جیسے وہ شکتی، قحط میں پوری جاں فزائی کا مظاہرہ کرتی ہے اور بناسپتی کو پالتی پوستی ہے، میری خود خرچی مجھے سنبھالتی تھی۔ اُس مقامی عمل میں کُلّی پھیلاؤ تھا جس میں حُسنِ غیب کا پرتو نظر آتا تھا۔ وہ متناہی کو لامتناہی سے ملاتا اور میرے مخفی وجود کو عالمِ شہود میں لے جاتا۔ جب تک وہ اِستحالہ جاری رہتا، میں نئی زندگی سے تھرکتا اور جوں ہی وہ عمل رُکتا، لگتا کہ میرا وجود ختم ہوگیا ہے۔

میں گھر میں باسی روٹی کھاتا ہوا ناک بھوں چڑھاتا تھا اور اب چوبیس گھنٹے اور کبھی اڑتالیس گھنٹے میں ایک بار کھاتا تھا۔ میری آنتڑیاں ایسے ہلتی رہتی تھیں جیسے خود کو بھوک کے جبڑوں سے بچا رہی ہوں۔ میرا پیٹ اُس چولہے کی طرح تھا جو آگ کے اِنتظار میں اندرونِ قلب تک سرد پڑجاتا ہے جسے گرمانے کے لئے ضرورت سے کئی گنا زیادہ ایندھن درکار ہوتا ہے۔ لیکن میرا صریحی تجربہ، چولہے کے برعکس ہے۔ میں معمول سے آدھا کھانا کھاتا، پیٹ بھرا محسوس کرتا اور ٹھنڈی رگوں کو پوری گرمی پہنچاتا۔ میں اپنی انوکھی کیفیت کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ میرا پیٹ سُکڑ کر آنتڑیوں سے جا ملا تھا اور آنتڑیاں رگوں سے۔ اُن کی مجموعی ضرورت کم ہوگئی تھی جیسے سانچے کُنبے میں ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن عافیت بیزار حالات میں، میں کسمپرسی کے اِحساس میں مُبتلا نہ ہوتا تھا۔ خود ساختہ مُصیبت میں آدمی کی قدر برداشت لاانتہا ہوتی ہے اور سرکشی ناقابلِ تسخیر۔ میں اُس عیب جوئی کی جبلّت سے بھی پاک تھا جو مجھے گھر میں گھیرے رکھتی تھی۔ میں اپنا مقابلہ دوسروں سے کرتا تو پریشان ہوجاتا۔ خوشی کا موقع بھی ہوتا تو میں اندرونی زخم کی طرح سُلگتا رہتا۔ میں اُن ناگوار جذبات سے نجات پانا چاہتا لیکن

کامیاب نہ ہوتا۔ میری نفسیاتی حالت برف کے تودے کی سی تھی۔ سورج کی کرنیں اُس تک پہنچتی ہیں لیکن اُسے گرمانے میں ناکام رہتی ہیں۔

باب ۵۴

ہوں خشک دہنِ دشت کے خاروں کی طرح
ویران ہوں بوسیدہ مزاروں کی طرح
سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں طوفاں
خاموش ہوں دریا کے کناروں کی طرح (شاطرؔ)

مَیں اُمید و یاس کے درمیان گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ مَیں پہلی کا سہارا لیتا تو دُوسری مجھے پُوری طاقت سے کھینچتی، دُوسری کے حلقۂ اثر میں ہوتا تو پہلی اپنی کشش آزماتی۔ مَیں جس دُنیا میں تھا وہاں مجھے نِت نئی کدورتوں، ضرورتوں اور محرومیوں سے پالا پڑ رہا تھا۔ میرے جذبات کی اونچ نیچ پُرانی سہی، اُن کی تاثیر بدل گئی تھی۔ مَیں کوئل کی طرح تھا جو موسمِ بہار گزر جانے پر اپنی رسیلی آواز کھو بیٹھتی ہے اور ٹیڑھی میڑھی بولیاں بولتی ہُوئی کاگوں سے جان بچاتی پھرتی ہے۔

مَیں نے درشن سنگھ کو سائیکل کے لئے لکھا تھا لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ جگت سنگھ گاؤں گیا، وہ درشن سنگھ سے مِلا اور اُس سے سائیکل لے آیا۔ میری آوارہ گردی آسان ہوگئی۔ مَیں سائیکل کے پہیے کی طرح کہاں کہاں گھوما اور کہاں کہاں پہنچا! لیکن مُجھے کام نہ ملا۔ میری جدوجہد کی گردش ختم ہوتی لیکن شرُوع ہونے کے لئے۔ اپنا گڑھا بھرنے کے لئے مَیں آج کچھ کرتا اور کل کچھ۔ مَیں نے بوجھ اُٹھائے، کھالوں کے کُنڈ صاف کئے اور وہ ذلیل کام بھی کیا جسے مَیں گھر میں اِس لئے نہ کرتا تھا کہ مجھے خود پر مرد ہونے کا فخر تھا۔ مَیں نے ہوٹل میں برتن مانجے۔ لیکن کیسا سانحہ تھا! مَیں جتنا حقیر کام کرتا، میری رُوح اُسی قدر ظلمت آشنا ہوتی جاتی۔ تایا جی کے کہنے کے برعکس ہر کام کی شان و شوکت نہ تھی، کِتنے کام ایسے تھے جو ذلّتِ نفس کو اُبھارتے تھے۔ مَیں جس دِن دباغت کا کام کرتا، راپی سے چھاتی پر نیل پڑ جاتے اور بغلوں میں پھوڑے سے سُلگتے۔ میری رُوحانی حالت جسمانی

حالت سے غیر ہوتی ۔ مَیں صابن سے مَل مَل کر نہاتا لیکن گندگی کو اُسی طرح دیکھتا جیسے وُہ تھی ۔ ہاتھ سے لُقمہ توڑ کر کھانا کھانے سے میرا دِل متلاتا ۔ مَیں کھانا نئے انداز سے کھاتا ۔ مَیں روٹی کی پُونی بنا کر ہاتھ میں پکڑتا ، اُس سے دانتوں سے نوالہ کاٹتا اور دال سبزی چمچے سے اُٹھا کر مُنہ میں ڈالتا۔ مَیں ذہن کو دُوسری طرف مائل کرتا لیکن کھالوں کا کریہہ منظر سامنے رہتا ۔ مَیں حیران ہوتا کہ جو لوگ مُسلسل گندے کام کرتے ہیں ، وُہ کیسے جیتے ہیں ؟

میں ناخُنوں کو ماس تک تراشتا ۔ چاقُو سے کچے ناخُن زخمی ہو جاتے ۔ اُس اَمرِ دُشوار کا حل مَیں نے اِس طرح نکالا کہ مَیں ریتی سے ناخُن رگڑتا اور پھر کپڑے کو صابُن لگا کر اُس سے ۔ اِس کوشش اور اِحتیاط کے باوُجُود ناخُنوں اور پوروں کی غلاظت پُوری نہ اُترتی ۔ مَیں ناخُنوں کو دیر دیر تک دیکھتا ۔ مجھے لگتا کہ وُہ ہر پَل ، ہر گھڑی ، ہر چھِن لگاتار بڑھتے ہیں ، چِچِنڈے کی طرح ۔ میرے ناخُن قُدرتی طور پر اُنگلیوں کی نوکوں تک لمبے تھے اور اُن کی زیبائش لگتے تھے ۔ روز روز کاٹنے اور رگڑنے سے ناخُن ، ماس کے اندر دھنسنے لگے اور پُورن سنگھ کے ناخُنوں کی طرح بدشکل دکھائی دینے لگے جو ناخُن کھاتا تھا ۔ اِس کے باوُجُود میرا مسئلہ میرا قضیہ رہا کیوں کہ وُہ غلاظت ، جسے مَیں صاف کرنا چاہتا تھا ، ناخُنوں کے برعکس میرے خانۂ دِل میں تھی اور ہٹیلی مکھّی کی طرح وبالِ جاں بھی ۔ مَیں اُن غلیظ پیشوں سے اُتنا ہی کماتا جتنا مجھے کم سے کم درکار تھا ۔

مَیں رات کو بستر پر لیٹ کر اپنے خیال کو کیسے کیسے ہوا دیتا ! مَیں اپنے مُثبت اور منفی رَوَیّے کو فرداً فرداً بیان کرنے سے قاصر ہُوں اِس لئے اُس کی مجمُوعی وضاحت کرتا ہُوں ۔ دُنیا کے بڑے بڑے جرائم اور بڑے بڑے کام ایسے ہی آوارہ خیالی کی پیداوار ہیں ۔ مَیں ایسا نہ کرتا تو میری حالت جالے میں پھنسی مکھّی کی سی ہوتی ۔ وُہ بے چاری تڑپتی لوٹتی فرار ہونے کے قریب آتی ہے تو مکڑی اُس کے اطراف نیا جال بُن جاتی ہے ۔ میری بے اِطمینانی ، جالا تھا اور میری شِکست ، مکھّی اور میری لاچاری بِھنبھناہٹ ۔

ٹالکٹورا میری جائے پناہ تھی ۔ پھُولوں کے تختے ، پرندوں کے چہچہے اور مایا کی ہمدردی مُجھے کسی طرح سنبھالے ہُوئے تھی ۔ مایا اَدھیڑ عُمر کی بیوہ مالن تھی جو اپنی جوانی میں اپنے سُسرال کے ظُلم کی تاب نہ لا کر یُو ۔ پی ۔ کے کسی گاؤں سے بھاگی تھی ۔ اپنے حالات کی روندی اور ماری ہُوئی ، وُہ جیس کے پاس پہنچی ، اُس نے اُسے گھر کے کام کاج کے بدلے مالن کی نوکری دِلوادی ۔ اُس کا ایک لڑکا تھا جو اُس کے بُرے وقت میں ہیضے سے مر گیا تھا ۔ مجھے دیکھ کر اُسے اپنے لڑکے کی یاد آتی اور وُہ

آزردہ خاطر ہو کر کہتی، "بر جو زندہ ہوتا تو تیرے جتنا بڑا ہوتا!" وہ مجھے دلاسا دیتی، "بیٹا، بُرے دن ہمیشہ نہیں رہتے! مجھے دیکھ! میں یہی سوچتی تھی کہ مجھے موت ہی راس آئے گی لیکن زندگی نے آپ بڑھ کر میری بانہہ پکڑ لی۔"

وہ میری بے کسی میں مجھے آس دے کر میری ڈھارس بندھاتی لیکن اپنی بے کسی کا بوجھ رو کر ہلکا کرتی۔ جب میں اُسے دلاسا دیتا تو وہ اپنے آنسوؤں کا جواز پیش کرتی، "جیسے اشنان، تن کے لئے امرت ہے، آنسو، من کے لئے۔"

غریبی میں اکثر ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز زندگی میں آجاتی ہے جو کچھ اہمیت نہ رکھتے ہوئے بھی زندگی کی عین خوشی بن جاتی ہے۔ اپنے اس تجربے سے پہلے میں کنجروں کو دیکھتا تھا اور انھیں بے وقوف سمجھتا تھا۔ ان غریبوں کو اپنی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے پھر بھی وہ کتے، پرندے، بندر، نیولے ۔۔۔ غرضیکہ ایسے جانور پالتے تھے جو کسی طریقے سے کارآمد نہیں ہوتے لیکن ذمہ داری کی طرح مسلط رہتے ہیں۔

ٹالکٹورا گارڈن میں ایک کُتیا رہتی تھی جو میری دوست ہو گئی تھی۔ اُس کے لال رنگ کی مشابہت سے میں نے اُسے لالی کا نام دے رکھا تھا۔ میں جس دن لنگر میں روٹی کھاتا اُس کے لئے کچھ نہ کچھ چھپا کر لے جاتا۔ میں نے اُسے دو تین فن سکھا دیئے تھے جیسے پتھر اُٹھا کر لانا، چھپے ہوئے کو ڈھونڈنا اور اونچی چھلانگ لگانا وغیرہ۔ میں اُس کی جگھیاں اور چچڑیاں مارا کرتا تھا جس کی وجہ سے اُسے کھجلوانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا اور اُس کی جانب راغب نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنے اگلے پاؤں سے کھجلا کھجلا کر ترغیب دیتی۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں اُس کے ان کہے جذبات کی جھلک ہوتی۔ وہ لاڈ کرتی کرتی آگے کھسکتی۔ میں اُس کی طرف دھیان نہ دیتا، وہ اُٹھ کر میری گود میں بیٹھ جاتی۔ میرے پیار کرنے کی صورت میں وہ چت لیٹ کر پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتی اور گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیتی۔ میں جوں ہی ہاتھ کھینچتا، وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور اپنی اُسی ادا سے بھرمانے لگتی۔ میں کئی بار اُس سے بہت اِدھر کسی دوسرے مقام پر رُک جاتا، اُسے آواز دیتا۔ اور اُسے بھاگتے آتے دیکھ کر چھپ جاتا۔ وہ میری سائیکل سونگھتی، ہوا سے میری بُو چُراتی چُراتی مجھ تک آپہنچتی اور پھر مستانہ وار بھاگتی، جھانسہ دے کر لوٹتی، میری ٹانگوں سے لپٹتی اور جب تک میں اُسے پیار نہ کرتا، اُسے چین نہ پڑتا۔ اُس کی چنچل اداؤں سے میں کھِل کھِل اُٹھتا۔

ایک دن جن پاتھ پر مزدوروں کا جلوس جا رہا تھا۔ 'زندہ باد'، 'مردہ باد'، 'اپنی مانگیں لے

کے رہیں گے' ..... کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ سڑک نے فٹ پاتھ کو ایسے ہڑپ کر رکھا تھا جیسے آدمی اپنی سخت ضرورت میں اپنے سارے وسائل کو کام میں لانے کا جتن کرتا ہے اور اپنے آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کئی بار ضرورت کے بارے میں سوچا ہے اور اُسے الگ الگ تجربے کی الگ الگ روشنی میں دیکھا ہے۔ اِس وقت میں اُسے الگ روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔

ضرورت سے بڑھ کر ہولناک شے، ضرورت ہے۔ اِس کا حلقہ ایسے غیر شعوری طریقے سے پھیلتا ہے کہ آدمی اِس کی روز افزوں افزائش سے بے خبر رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو دولت مند ہے وُہ اور زیادہ دولت کا خواہش مند ہے کیوں؟ ضرورت سے زیادہ دولت، بے ضرورت ہے اور جس شے کی جیسی حقیقت ہے ویسی ہی اُس کی نفسیات۔ بے ضرورت شے، بے ضرورت شے کو جنم دیتی ہے جس کے تصرّف سے ہوس بڑھتی ہے اور ہوس کی ایک ہی جہت ہے، تکذیبِ نفس!

تایا جی دولت اور ہنر کا مقابلہ کرتے ہُوئے کہتے تھے، "اِنسان کے لئے دولت ایسے ہے جیسے سبزہ نورفتہ کے لئے پاؤں۔ دولت ذہنی نشوونما کی تائید ہوتی تو دولت مند ہی ہنر کے سرچشمے ہوتے لیکن ہُنر صرف غریبوں کی پُونجی رہی ہے۔ جہاں ہُنر ہے، وہاں طمانیت ہے اور جہاں طمانیت ہے، وہاں اِنسان کی مادی ضرورت کم ہے کیوں کہ وہاں رُوحانی ترقّی کی فراوانی ہے۔ دولت مند کی دولت اُس کے ذاتی صرفے کے لئے ہوتی ہے اِس لئے وُہ کھرنڈ کے کیڑے کی طرح مرتا ہے جب کہ ہُنرور کا ہُنر دوسروں کے مفاد کے لئے ہوتا ہے، یہ داتا مرتا ہے۔ ہُنر ہی ایک شے ہے جس کی روایت ہر شے سے الگ ہے، یہ بانٹنے سے بڑھتا ہے۔"

وُہ ہُنرور کی حمد وثنا پُورے وثُوق اور دِل سے کرتے تھے، بے ہُنر کے لئے زِندگی، بد دُعا ہے اور دولت مند کے لئے بھیانک بد دُعا۔ پہلا جہالت کے تیرہ خانے میں وحشت زدہ ہے اور دُوسرا ذہنی فرسُودگی کی بدبُو سے مخبُوط الحواس۔ ہُنرور زِندگی کی بازیافت کرتا ہے اور اُس کی تقسیمِ جدید کر کے اُس میں اور خُود میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ کام صرف سچّائی اور خُوبصُورتی اور خُوشی ہی کے ماحول میں ممکن ہے۔ ہُنرور زِندگی کی اِن خُوبیوں کا محقّق ہے اور سرپرست بھی۔

جلوس زیادہ لمبا نہ تھا۔ چُوں کہ جلوس، ہجوم ہے اِس کی اُفتاد ہمہ رنگ ہوتی ہے ڈھٹائی، ناصبُوری، نکتہ چینی، آہستہ روی ..... اُسے یُوں اَفزُوں کر رہی تھی جیسے غم گرفتہ آدمی کی فریاد اُسے کثیر الانواع بنا دیتی ہے۔ جدھر دیکھو ایک ناقابلِ فہم تضاد تھا۔ کہیں خاموشی

کا نتیجہ شور تھا اور کہیں شور کا نتیجہ خاموشی، کہیں سختی کا اثر نرمی تھا اور کہیں نرمی کا اثر سختی، کہیں روانی میں ٹھہراؤ تھا اور کہیں ٹھہراؤ میں روانی۔ ہر کوئی بظاہر علیحدہ علیحدہ تھا لیکن نادیدہ طور پر ایک دُوسرے سے جُڑا ہُوا تھا۔ جو کوئی اِس زنجیر سے ٹوٹنا چاہتا، اُس کی تگ و تاز دیدنی ہوتی۔ وُہ پہلے اپنے گرد کے ہجُوم کا حلقہ توڑتا، آزاد ہوتا اور جدھر جانا ہوتا، جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وُہ اپنی زنجیر کے حلقے کو محض کھینچ کر بڑھاتا لیکن اُسے توڑ نہ سکتا۔ جو کوئی چِلّاتا، چِلّاتا اور جو کوئی چُپ رہتا، چُپ رہتا۔ اُنھیں دیکھ کر گمان ہوتا کہ پہلا اپنی طاقت کو اُسی کام کے لئے صَرف کرتا ہے جو اُس کا قطعی مقصد ہے اور دُوسرا اپنی طاقت کو اُس مقصد کے لئے محفُوظ رکھے ہُوئے ہے جس کا اُسی کو علم ہے۔ ہر کسی کی اپنی مرضی تھی۔ وُہ چاہتا تو ہنگامے کا مرکز بن جاتا اور نہ چاہتا تو اُس سے الگ تھلگ رہتا، اُس موج کی طرح جو دریا کا حِصّہ ہوتی ہے لیکن کنارے کنارے بہتی ہے۔ جلُوس جن پتھ سے ریڈنگ روڈ کی طرف مُڑا اور فیروز شاہ روڈ کی آمد و رفت سے ٹکرا گیا۔ وہاں ایسی کشمکش پیدا ہو گئی جیسے دو قوی الجثّہ دیو ایک دُوسرے کو روندنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ سڑک پر ٹھہرے ہُوئے طوفان کا گمان ہونے لگا۔ کچھ کاروں والے اُس میں پھنس گئے تھے، جن کی حالت بُری تھی۔ وُہ دبکے اور سہمے ہُوئے تھے اور اِدھر اُدھر پہلو بدلتے ہُوئے کمر ٹوٹے کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ ایک طرف بے اصلی، بے جگری، بے داد گری، بے دردی، بے ڈھنگی، بے رُخی، بے ضابطگی۔۔۔ تھی تو دُوسری طرف بے کسی، بے دِلی، بے دِماغی، بے ثباتی، بے سروپائی، بے سروسامانی، بے مقدُوری۔۔۔ تھی ایک فسادی زِندگی تھی جس کا انجام نامعلوم تھا۔

آدمی کی درندگی، جسے یہ تنہائی میں پالتا پوستا ہے، ہجُوم میں ایسے اُبھرتی ہے جیسے چنگاری دیکھتے ہی گھاس پھوس میں چھپی ہُوئی آگ۔ قارئین! تاریخ کے ورقے اُلٹیے اور اِنسانی خُون ریزیوں کی کہانیاں پڑھیے، وُہ مذہب کی تبلیغ میں ہُوئی ہوں کہ مُلک گیری کی ہوس میں، قوم پر قوم کی برتری ثابت کرنے کے لئے کہ جنگ کی حکمتِ عملی آزمانے کے لئے۔ اُن حادثوں کی نفسیاتی کارفرمائی ایک ہی ہے منظّم ہجُوم کی منظّم درندگی کی دیوانگی!

ایک لمبی کالی شورلیٹ کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک بچّہ بیٹھا ہُوا تھا اور پچھلی سیٹ پر دو عورتیں، جنھوں نے اپنی اطراف کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ اُن کے جُوڑا باندھنے کا انداز ایسا تھا کہ وُہ کار کے پچھلے شیشے سے خُوبصُورت لگ رہی تھیں۔ کبھی شوق سے آگے بڑھتے جھکتے، اندر جھانکتے اور پھر سامنے دیکھتے۔ اُن کے چہرے اِس بات کی تصدیق کرتے کہ اُنھوں نے

کوئی ناپسند شے دیکھی ہے۔ وہاں سے چند قدم آگے فاختی رنگ کی فی ایٹ کار تھی۔ اُس کی اگلی سیٹ پر جوان لڑکا اور لڑکی بیٹھے تھے، جو بھائی بہن تھے۔ آپ سوچیں گے کہ مَیں اپنے انجانے کرداروں کے بارے میں وثوق سے کیسے کہہ رہا ہوں! مَیں واقعے کی تفصیل پس از واقعہ لکھ رہا ہوں اور آپ قبل از واقعہ کی تمہید پڑھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے کھڑکیوں کے شیشے کھول رکھے تھے۔ جیسے اُنھیں ہجوم سے خطرہ نہ ہو۔ کاروں کو آگے راستہ نہ ملا، ڈرائیوروں نے انجن بند کر دیئے اور گردنیں باہر نکال کر پیچھے دیکھنے لگے۔

ایک جلوسی فی ایٹ کار کی کھڑکی کے برابر آیا اور اپنا ہاتھ لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا جسے وہ کھڑکی میں رکھے ہوئے تھی۔ لڑکی نے بگڑ کر اپنا ہاتھ اندر کھینچنا چاہا، لڑکے نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لڑکی مغرور اور دلیر تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے لڑکے کی بکھی میں گھونسا مارا اور ہاتھ آزاد کروالیا۔

"کیا ہوا دیدی؟"

بھائی کے لہجے میں احساسِ خاطر تھا۔

"کچھ نہیں، ایک بدتمیز کو تمیز سکھائی ہے!"

دیدی کے لہجے میں عزم تھا۔

"شیشہ اُوپر چڑھا دو!"

بھائی کی آواز خوف زدہ تھی۔

"ایسے ہی ٹھیک ہے!"

لڑکی کی آواز نڈر تھی۔ اِس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کے ساتھ جم کر بیٹھ گئی جیسے وہ کسی بھی خطرے سے نپٹنے کے لئے تیار ہو۔ اُس شرارتی لڑکے کے ساتھی اُسے کسی دوسری شرارت پر اُکسا رہے تھے لیکن وہ دامن چھڑاتا لگتا تھا۔ اِتنے میں کوئی دوسرا لڑکا معصوم سی صورت بنائے آگے بڑھا اور لڑکی کے گال پر جھپٹا۔ جب تک لڑکی نے جانا کہ کیا ہوا ہے، وہ گال کے چرائے ہوئے لمس کو چوم رہا تھا۔

"کُتّے، بدماش!" لڑکی نے چلاتے ہوئے ہاتھ باہر نکالا، کسی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اُسے مصیبت میں دیکھ کر بھائی نے کار سے باہر نکلنا چاہا لیکن دروازہ، ہجوم اور قبضوں کے درمیان ٹھس تھا۔

"ہم سائیکلوں کے لئے ترستے ہیں اور یہ حرامی کاروں میں گھومتے ہیں!"

کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"آگ لگادو اِن کو!"

کسی نے ترغیب دی۔

اُس ہجوم میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنی خواہش کا احترام نہ ہو۔ آدمی پہلے خواہش کرتا ہے پھر اُسے پورا کرنے کی راہ نکالتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا وُہ نہ اپنے آپ سے انصاف کرتا ہے اور نہ سماج سے۔ انسانی ترقی کے جو مناظر نظر آتے ہیں وُہ انفرادی خواہشوں کی مجموعی تصویر ہے۔ خواہش تخلیق کار کی تخلیقی تحریک ہے اور غاصب کی لوٹ مار۔ پہلے کے جذبے کی اصلیت، محبت ہے اور دوسرے کے جذبے کی حقیقت، نفرت۔ دیکھنے میں دُوسرا پہلے سے زیادہ اکٹھا کرتا ہے لیکن حقیقتاً وُہ اپنی ذات کے ساتھ سب کچھ گنوا دیتا ہے۔

ایک جلوسی نے جھنڈے میں سے ڈنڈا نکالا، گھمایا، کار کے ونڈ سکرین پر مارا اور اُسے چُور چُور کر دیا۔ پل بھر کا سناٹا، گالی گلوچ، بلوا، شور.... اور جلوس پیچھے مڑنے کے سے انداز میں رُک گیا۔ کچھ پولیس والے جلوس کے ساتھ چل رہے تھے، وُہ وردی نہ پہنے ہوتے تو جلوس کا حصّہ لگتے۔ اُن میں سے ایک ہچکچاہٹ سے مقامِ حادثہ کی طرف بڑھا۔ اُتنی دیر میں وُہ دونوں مجرم بھیڑ کی افراتفری میں گُم ہو گئے۔

"یہ اِسی کی غلطی ہے!"

"بھیڑ میں ایسا ہی ہوتا ہے!"

"بچّے ہیں، جانے دو!"

"یہ اِدھر آیا ہی کیوں تھا؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟ جو ہو گیا، سو ہو گیا!"

"مال اچھا ہے!"

کاروں والے مُردوں کی طرح بے حرکت تھے۔ جلوسی آگے بڑھنے لگے، کچھ اپنی مرضی سے اور کچھ پولیس کی ترغیب پر۔ ہوتے ہوتے کاروں والے جلوسیوں سے الگ ہو گئے جیسے باڑھ اُترنے پر اُس میں گھرے نبات و اشجار۔

ہر جلوسی، جلوس کا حصّہ ہو کر بھی ایک جُدا گانہ تحریک تھا۔ ایک کے پاس بھونپو والا ہارن تھا۔ وُہ پیچھے سے چپکے سے آگے بڑھتا اور کسی کے کان پر بھونپو بجاتا، کوئی جیتا چونکتا، وُہ اُتنا ہی خوش ہوتا۔ کسی نے اُس سے بھونپو مانگا لیکن اُس نے دینے سے انکار کر دیا۔ وُہ مایوس نہ

"تجھے بیمار کی پڑی ہے! یہاں اچھے بھلے مرتے ہیں اور کوئی دھیان نہیں دیتا ہے۔"
میں جس کے ساتھ بات کرتا تھا اُس کے ایک ساتھی نے اُس کی طرفداری کرتے ہوئے مجھے خاموش کر دیا تھا۔ اِتنے میں کسی دوسرے آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور مجھے اعتماد میں لے کر کہا تھا، "تو بھی شرنارتھی ہے! تجھے تو خبر ہے کہ ہم سب کتنے عذاب جھیل کر آئے ہیں۔ ان دِلّی والوں کو کیا معلوم کہ کیمپوں میں ہم پر کیا گزری ہے؟ کنبوں کے کنبے مر گئے یا مار دیئے گئے۔ دھرتی خالی لگتی تھی! دِلّی میں آکر دیکھا تو لگا کہ لوگ دِکھاوے کے لئے مرتے ہیں اور پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔"

وہ لوگ اِنسانی برادری کے رُکن تھے لیکن صرف اپنا بھلا چاہتے تھے۔ اُن کی اُمید، نُورِ اِرتقا کی طرح حیات پرور اور نا اُمیدی، تاریکی زوال کی طرح مُہلک تھی۔ وہ سب کچھ لینا چاہتے تھے اور دینے کے خیال ہی کو گُمراہ کُن سمجھتے تھے۔ اُن کی کم ظرفی نے اُن پر اِنسانی ہمدردی کی راہ مسدود کر رکھی تھی جو سماجی قدروں کی پاسبان ہے۔ اُن کی زندگی چھوٹی سی گلی تھی جو اُن کی ذات سے پرے ظلمت کی گہری کھائی میں بدل جاتی تھی۔

اپنی نفرت کی اِنتہا میں وہ بالکل میری طرح تھے۔ اُن کے اور میرے اندرون پوری مماثلت تھی۔ بس اِتنا فرق تھا کہ میں اپنی نفرت کا مظاہرہ اپنے خیال میں کرتا تھا اور وہ عملی طور پر۔

نعروں کا خروش بڑھتے بڑھتے بڑھ جاتا اور گھٹتے گھٹتے گھٹ جاتا۔ خروش بڑھتے سے لگتا کہ کوئی ہزاروں سروں والا ناگ پھنکار رہا ہے، اور خروش گھٹنے سے سانسوں اور پیروں کی آواز پر ٹِڈی دل کے گزرنے کا گمان ہوتا۔ میں تولہ ہوں تو تولہ اور ماشہ ہوں تو ماشہ قسم کا آدمی ہوں۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب میرے خون نے جوش مارا اور میں نعرے لگانے لگا۔ دوسرے لوگ نعرے لگاتے لگاتے تھک چکے تھے جب کہ میری آواز تندرست و توانا تھی۔ میں جلوسیوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ کچھ میری گرمیِ جذبات اور کچھ دوسروں کی حوصلہ افزائی نے مجھے صفِ اوّل میں پہنچا دیا۔ کسی نے مجھے عِزت بخشی اور ایک لال جھنڈی میری سائیکل کے اگلے چمٹے سے باندھ دی۔ اُس نے میرا وہ حال کیا جو تیز آنچ کچی کڑھی کا کرتی ہے۔

میری ذہنی کیفیت کی نفسیات کا مُناتی تھی۔ مذہبی عقیدے اور بھروسے کی طرح میں گُم راہوں کا راہنما، حاجت مندوں کا حاجت روا، مظلوموں کا بہی خواہ اور بے سہاروں کا عالم پناہ تھا۔ قارئین، میں اپنی پروازِ فکر کا صحیح اِحاطہ نہیں کر پایا ہوں! میں دوبارہ غور کرتا ہوں۔ میں عین اوتاروں کی طرح تھا جو ست جُگ، تریتا جُگ، دواپر جُگ اور کل جُگ میں آئے ہی اِس لئے کہ وہ نوعِ آدم

کو اُس کے دُنیاوی دُکھوں اور رُوحانی مسئلوں سے نجات دلائیں، غریبوں کو دولت، بیماروں کو صحت، بادشاہوں کو مُلک دیں اور مقہوروں کو مغفوروں میں شامل کریں۔ جب تک وُہ نہ آئے تھے اِس ملعون دُنیا میں عورتوں اور مردوں کے جسمانی رشتے ناجائز تھے۔ اُن کے آنے ہی سے وہ ناپاک رشتے پاک ہُوئے، حرام زادے، حلال زادے بنے اور قابلِ احترام ہُوئے۔

جلُوس میری راہنمائی میں پارلیمنٹ پہنچا۔ وُہ خُوبصورت اور رُعب دار عمارت مجھے حقیر و ادنیٰ لگی اور قومی راہنما اُس سے بھی حقیر و ادنیٰ۔ اُن کی بے ہُودگی! اُنھوں نے جتنے وعدے کئے تھے اُن میں سے ایک پُورا نہ کر سکے تھے۔

غُلامی بدستُور تھی!
بیکاری بدستُور تھی!!
غریبی بدستُور تھی!!!

وُہ ہر چیز بدستُور تھی جسے اِنسانی سماج کی لعنت کہا جاتا ہے۔ اُن سے میری نفرت میری کم ظرفی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ آزادی کے وقت ساحرؔ نے قومی نفسیات کا جو تجزیہ کیا تھا اُس کا عملی ثبوت تھا۔

یہ جشن، جشنِ مسرّت نہیں تماشا ہے، نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلُوس
ہزار شمعِ اُخوت بُجھا کے چمکے ہیں، یہ تیرگی کے اُبھارے ہُوئے حسیں فانُوس
یہ شاخِ نُور جسے ظُلمتوں نے سینچا ہے، اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گُل کے آنے تک، ضمیرِ ارض میں اِک زہر چھوڑ جائے گی

وہ حُبُّ الوطنی کے پردے میں دہشت پھیلا رہے تھے، جس کا ایک منظر مَیں نے پہاڑ گنج میں دیکھا تھا جہاں داد خواہ رفیوجیوں پر لاٹھی چارج ہُوئی تھی۔ مَیں رہنماؤں اور اُن کے وعدوں سے کس قدر مرعُوب تھا! پنڈت جواہر لال نہرُو ہوشیار پُور آئے تھے تو مَیں اُنھیں دیکھنے کے لئے بیس میل پیدل چلا تھا لیکن اُنھیں دیکھ نہ سکا تھا۔ مَیں مایُوس ہو کر بھی مایُوس نہ ہُوا تھا کیوں کہ اُن سے میری محبّت رُوحانی تھی۔ سردار پٹیل کی موت پر مَیں بے اختیار رو دیا تھا تو میرے ساتھیوں نے میرا ٹھٹھّا اُڑایا تھا۔ میرا خالص خلُوص! مَیں اُن نکتہ چینوں کا خیال نہ کرتے ہُوئے بھڑاس نکال کر ہی چُپ ہُوا تھا۔ مَیں نے اُن سے یہ جُملہ کہا تھا تو مجھے اِس کی نوعیّت تاریخی لگی تھی، ”تُم جاہلوں کو معلُوم نہیں ہے کہ یہ قومی سانحہ ہے اور مُلک کا ناقابلِ تلافی نُقصان!“

دِلّی میں وُہ ہر چیز موجُود تھی جس کی راہنما تردید کر رہے تھے۔ اُن کے کردار دوہرے تھے!

وُہ دے کر کچھ نہ دیتے تھے اَور دیکھ کر کچھ نہ دیکھتے تھے۔ وُہ پارلیمنٹ، کمیں گاہ تھی جہاں انگریزوں کی جگہ اپنے چھُپے بیٹھے تھے۔ وُہ آپ تنے، اُس عمارت کے پتھّروں کی طرح بے حِس اَور اندرون کی طرح کھوکھلے تھے۔

مَیں نعرے لگاتا ہُوا اِحاطے کی دیوار پر چڑھ گیا اَور ساحر کی نظم 'بُلاوا' سُنانے لگا۔ مجھے محسُوس ہُوا کہ مَیں جو بول رہا ہُوں، وُہ آفاق کا اسرار ہَے جسے ظاہر کرنے کے لئے وقت نے مجھے چُنا ہَے۔ میرے سُننے والوں کی خاموشی میری خود بینی کی ترجمان تھی۔ وُہ غیر مرئی اَلفاظ کو دیکھتے اَور اُن کی خُوبصورتی اپنے اَندر جذب کرتے لگتے تھے۔ میرے اَندر کا مُصلح اَور مُجاہد پیدا ہُوا ہی چاہتا تھا کہ ایک ناگہانی حادِثہ ہُوا۔ کسی ناعاقبت اندیش نے 'کامریڈ ڈانگے زندہ باد' کا نعرہ لگا دیا۔ اُس ہنگامے سے وُہ اعجاز خیز نفُوذِ باہمی رُک گیا اَور مَیں اپنی طبعی حالت میں لوٹ آیا۔ میری آواز میرے گلے میں لڑھک گئی۔ ناٹے قد کا ایک آدمی، جس کی چال بے رعُونت تھی اَور چہرہ مُہرہ بے ربط، اُس طرف بڑھنے لگا جہاں مَیں کھڑا تھا۔ وُہ ہجُوم اُس کے قدم لینے کے سے انداز میں راستے سے ہٹ گیا اَور اُسی طرح مَیں۔ ہجُوم کا چلن نرالا ہَے! اپنی دیوانگی میں یہ کسی کو تخت پر بٹھاتا ہَے اَور کسی کو تختے پر، پھر اپنی دائمی نیند سو جاتا ہَے جس سے وقتی طور پر جاگتا ہَے۔

میری جگہ جو دُوسری آواز بلند ہُوئی وُہ کمزور اَور بے لُطف تھی لیکن ہر کوئی اُسے غور سے سُن رہا تھا۔ میرے قارئین، میرے زوال کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے! جو نہیں سمجھے، اُن کی اِطلاع کے لئے عرض کرتا ہُوں کہ کامریڈ ڈانگے کی راہ بری کی تصدیق ہو چکی تھی لیکن میری عظمت حُسنِ نمُود کی مُنتظر تھی۔

باب ۵۵

چہرہ ہَے غمِ دہر میں جلتی سی کتاب
آنکھیں ہیں اُمیدوں کے فسُردہ سے گُلاب
جینے کی تمنّا پہ گُماں ہَے ایسا
گھر لوٹ کے آتا ہَے کوئی خانہ خراب (شاطِر)

مَیں یُونیورسٹی سے دُور سہی لیکن علم وفن کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مَیں اس بارے میں کس قدر جذباتی تھا! مَیں کسی کالج کے پاس سے گزرتا، کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر طالب علموں کو دیکھتا لیکن اُن کے رُوشن چہرے دیکھ کر بجھ جاتا۔ اُن در و دیوار کو مَیں بھاری دِل اَور اُداس نظروں سے تکتا جو انسانی زندگی کے نشوو نما کی ضمانت تھے۔ مَیں خواہش کرتا کہ اُنھیں چھوؤں اَور محسُوس کروں لیکن اُن خُوش نصیبوں اَور خُوش لباسوں کے سامنے میری ہمت نہ پڑتی۔ مَیں اَفسردہ و نامراد آگے بڑھ جاتا، مجھے لگتا کہ مَیں وہاں خُود کو چھوڑے جا رہا ہُوں۔ اُن در و دیوار کے لمس میں وُہ گرمی تھی جو لہُو کو رگوں میں آتشِ شوق بنا دیتی تھی۔ اِرتقائے نفس کے وُہ نازک لمحے مجھے اُس دُنیا میں اُڑا لے جاتے جہاں آرزوئے زندگی، نشاطِ آگہی ہوتی۔ مَیں نازُک خیالوں سے رَس لیتا ہُوا گھر پہنچتا اور اُس رات اکثر میٹھے سپنے دیکھتا۔

میرے جذبات کی یہی نُدرت تھی جو اُس دِن مجھے پارلیمنٹ سے کھینچ کر دلّی پولیٹکنک لے گئی تھی۔ سردار سادھو سنگھ مان وہاں شیٹ میٹل فورمین تھے۔ وُہ خُوش اطوار اَور خُوش مزاج واقع ہُوئے تھے۔ مُلازمت کے سِلسِلے میں، مَیں اُن سے تیمار پُور میں گھر پر مِل چُکا تھا لیکن کبھی اُن کے پاس کالج میں نہ گیا تھا۔ کالج کے ساتھ پولیس چوکی اَور اسلحہ خانہ تھا جس کے اَندر سے بھی کالج کو سڑک جاتی تھی۔ جس کسی نے میری رہبری کی، اُس نے مجھے وُہی راہ دکھائی۔ صدر دروازے سے آگے صاف سُتھرا باغیچہ تھا۔ تھالی جتنے بڑے ڈیلیا کے رنگ برنگے پھُول، باغباں نے دوشاخوں پر تھام رکھے تھے۔ گُل داؤدیوں کی کیاری موتیوں کا جڑاؤ ہار لگ رہی تھی۔ مہندی کی سیاہی مائل سبز باڑ ایسے مہک رہی تھی جیسے خُوشبُو کے کنستر کو کھُلا چھوڑ دیا گیا ہو۔ تراشی ہُوئی گھاس کیاریوں کے کناروں تک پھیلی ہُوئی تھی اَور کیاریاں گھاس سے بالکل صاف تھیں۔ ذرا تخیّل کو دوڑاؤ تو لگے کہ اِحساسِ کمتری سے نجات پانے اَور پھُولوں کی قُربت کا لُطف اُٹھانے کے لئے گھاس نے پتّوں کا رُوپ دھار لیا ہے۔ نرم رَو ہوا چلتی تھی کہ موجِ شراب بہتی تھی۔ مَیں اِتنا مسرُور ہُوا کہ سائیکل کھڑی کر کے ایک کیاری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھ میں تتلی کی رُوح سرایت کر گئی۔ مَیں پھُولوں کو چُومنے لگا، سُونگھنے لگا اَور گالوں سے مَس کرنے لگا۔ میری مستی میرے اِحساسِ ہستی پر چھا گئی اَور مَیں نے آنکھیں مُوند لیں۔

میرے فطرت پسند مزاج کی پُرانی خُوبی ہے کہ مَیں کہیں حسین منظر دیکھتا ہُوں تو اُس کا حصّہ بن جاتا ہُوں۔ اِس رِشتے سے ایک بھُولا ہُوا واقعہ یاد آیا ہے۔ ہمارے کھیت میں سُورج مُکھی کھلتی۔ مَیں ہر پودے کے پاس کھڑا ہو کر اُسے اپنے قد سے ناپتا اور جو پودا میرے قد کے برابر ہوتا اُسے میری مُکھی کا نام دیتا۔ مَیں اُس کا زیادہ خیال رکھتا اور اُسے دیر تک گال سے لگائے رکھتا جیسے مَیں اُسے اپنے اندر سمونا چاہتا۔ اپنے

رُوحانی اِہتزار میں مجھے لگتا کہ وُہ میری شخصیت کا حِصّہ ہے اور اُس کے بغیر میرا وجُود ادھورا ہے۔

"ہینڈز اَپ"

ایک تیز طرّار آواز آئی اور لوہے کی جھنکار میں مِل کر زلزلے کی طرح گزر گئی۔ میں کانپ گیا اور گرتا گرتا سنبھلا۔ ہاتھ اوپر کئے ایسے اُٹھا جیسے میں دھرتی میں دھنس کر باہر نکل رہا تھا۔

"ویسے ہی ہاتھ اوپر کئے میری جانب مُڑ ورنہ گولی مار دُوں گا!"

اُس حکم کی سختی سنگین سے زیادہ سنگین تھی جو میری پیٹھ میں چُبھتی تھی۔ میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میرے ساتھ دھرتی بھی گھومتی ہے۔

میں ہریانہ کے تھانے کے باہر بندوق بردار سپاہی کو دُور سے دیکھ کر اُس کی چُستی و چوبندی پر خُوش ہوتا تھا اور اُسے قریب سے دیکھنے کی آرزو کرتا تھا۔ میری دیرینہ آرزو پُوری ہُوئی لیکن میں خوف سے کانپنے لگا۔ میں جس کے سامنے کھڑا تھا۔ وُہ سپاہی نُما سانپ تھا جسے اِنسان ڈسنے کی عادت پڑی ہُوئی تھی۔

"مجھے مُعاف کردو، مجھ سے غلطی ہوگئی۔"

یہ جانے بغیر کہ میں نے کیا قصُور کیا ہے، میں نے قصُور مان لیا۔

"چل پیچھے ہٹ!"

اُس کی دُرشتی برقرار تھی۔ وُہ میری عاجزی سے بسیجا نہ تھا۔

"مجھے مُعاف کردو! مجھے مُعاف کردو!"

میری خوف زدہ تکرار اُس مظلُوم کی سی تھی جو طاقت ور ظالم کے سامنے بے بس پڑا ہو اور اُس کے آخری فیصلے سے باخبر بھی ہو۔ اُس نے سنگین کو آگے بڑھایا، میں پیچھے ہٹتے ہُوئے مہندی کی باڑ میں اُلجھ گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وُہ مجھ پر لپکا جیسے میں نے اُسے دھوکا دینے اور بھاگنے کی کوشش کی ہو۔

"ہوشیاری دکھائی تو پرو کر رکھ دوں گا!"

اُس نے سنگین میری چھاتی پر رکھ کر دبائی اور اپنا اِرادہ واضح کر دیا۔ میں اُس وقت زمین سے چپک نہ گیا ہوتا تو وُہ بے لچک لوہا میرے پار نکل جاتا۔

"میں بھاگ نہیں رہا تھا، باڑ میں پھنس کر گر پڑا تھا" میں نے اپنی بدحواسی پر قابُو پاکر کہا۔

وُہ تھوڑا پیچھے ہٹا اور سنگین اوپر نیچے کرتے ہُوئے مجھے اُٹھ کر کھڑا ہونے کا حکم دینے لگا۔ میں

گھٹنوں تک اُٹھا اور اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ وہ اُچک کر پیچھے ہٹا جیسے مَیں نے اُس پر حملہ کیا ہو۔ میرے گرنے سے میرا صافہ ڈھے گیا اور میرا جُوڑا کھل گیا۔ اُس نے میرے صافے کو ٹھوکر مار کر باڑ میں پھینک دیا مجھے کیسوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور کشاں کشاں تھانے کے اندر لے جانے لگا۔ سائیکل، راہ میں کھڑی تھی۔ اُس نے اُسے دیکھا اور میرے کیسوں پر جھٹکا دے کر پُوچھا، تیری ہے؟

"جی ہاں" میں نے جھٹکے سے پیدا شدہ درد کو مُشکل سے برداشت کرتے ہُوئے کہا۔ اِس کے باوُجود میں اُس آہ کو نہ روک سکا جو میرے بے قصُور دِل سے اُٹھی تھی۔

"اوہ، شر پسند!"

لال جھنڈی دیکھ کر اُس نے اِلزام لگایا اور سائیکل کو ٹھوکر مار کر گرا دیا۔ میرے کیسوں کو اُس نے اور کڑا کر کے پکڑا اور مجھے گھسیٹتا ہُوا تھانے کے اندر لے گیا۔ یہاں اُس نے میرے کیس چھوڑے اور پیچھے سے دھکّا مار کر آگے کر دیا۔ اِس سے پہلے کہ میں کیس باندھ کر نئی صُورتِ حال کا جائزہ لیتا، میں تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور مجھے پکڑنے والا سپاہی مجھ پر ٹریسپاسنگ کا اِلزام لگا چُکا تھا۔

"کوئی ہے؟"

تھانیدار نے شاید اُن سپاہیوں کو بُلایا جو باہر برآمدے میں بیٹھے تھے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اُن میں سے دو تابڑ توڑ آئے اور میرے گرد کھڑے ہو گئے۔ میں اُن کے درمیان بھیڑیوں کے حلقے میں ہرن کے بچّے کی طرح کھڑا تھا۔

"اِس کی تلاشی لو۔" اُس نے کھڑکنے کے سے انداز میں حُکم دیا۔

وُہ میری تلاشی لینے لگے۔ میرے پاس ایسا کیا تھا جِسے وُہ ڈھونڈ نکالتے۔ میری جیب میں سے ایک روپے کے نوٹ کے ساتھ کچھ بھان نکلی۔ اِتنے میں کوئی دُوسرا سپاہی میری پگڑی اور سائیکل اُٹھا لایا۔ اُس نے سائیکل باہر کھڑی کر دی اور اُس سے جھنڈی کھول کر پگڑی کے ساتھ میز پر رکھ دی جہاں مجھ سے برآمد شُدہ میری دُوسری پُونجی پڑی تھی۔

"اوہ، شر پسند کمیونسٹ!" تھانیدار دانت بھینچ کر بولا۔

قارئین! اِنسان، حیوان نہیں ہے کہ اِس کے دیکھتے ہی کوئی اِس کی فطرت کا صحیح تجزیہ کرلے۔ انواعِ حیات میں ایک اِنسان ہی ہے جس کے خمیر میں تفاوت ہے۔ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ ایک فِرقے کے سارے افراد کو ایک ہی لٹھ سے ہانکا جائے؟ قانُون کا ایسا روّیہ آفاقی نفرت کا مُرتکب ہوگا اور بغاوت کا علم بردار۔ ہر ہتھیار کی طرح قانُون ایک مُہلک ہتھیار ہے جس کا بے سوچا سمجھا

استعمال سوچے سمجھے قتل کے مترادف ہے۔ مجرم کتنا ہی نڈر ہو، قانون سے ڈرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُس کا فعل غیر قانونی ہے۔ چوں کہ قانون کے نگران کو قانون کی تصدیق حاصل ہے، اس پر ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ یہ اپنے اختیارات کا استعمال منصفانہ کرے ورنہ یہ اپنی کارگزاری میں مجرم کو پچھاڑ جائے گا۔ قانون اور انصاف کی جنگ میں انصاف کی فتح لازمی ہے ورنہ قانون، منصف کے فیصلے کے برعکس ظالم کا خوں خوار خنجر ہوگا۔

تھانیدار کی آنکھوں میں ایسی روشنی تھی جو اذیّت پسندی کی خوبی ہے۔ وہ سوال کرنے لگا۔ میں جتنی بے کسی ظاہر کرتا، وہ اُتنی ہی بے دردی۔ میری بے گناہی کا عذر تمسخر آمیز تھا۔ میری بے وطنی اور بے کاری کی سچائی جان کر اُسے یقین ہو گیا کہ میں خاطی اور ایرا دھی قسم کا آدمی ہوں۔ وہ مجھے قید میں ڈالنے کی دھمکی دینے لگا۔ میں کچھوے کی سکڑ گیا، بارے میرے پاس اعضا چھپانے کے لیے خول نہ تھا۔

"بوٹ اُتار!" وہ کتّا بھونکا لیکن میں نے اُس کا مفہوم سمجھ لیا کیوں کہ وہ انسان کی زبان بولتا تھا۔

میں نے کانپتے ہوئے بوٹ اُتارے۔

"پاجامہ اُوپر اُٹھا کر پاؤں دِکھا!" وہ پھر بھونکا لیکن مجھے سمجھنے میں تکلیف نہ ہوئی۔

میں پاجامہ اُٹھا کر پاؤں دِکھانے لگا لیکن اپنی کپکپاہٹ کی وجہ سے کھڑا نہ رہ سکا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے کر پہلے ایک پاؤں دِکھایا اور پھر دُوسرا۔

"ہاتھ دِکھا!"

میں نے اُس کتّے کو حکم دیتے سُنا اور ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ دِکھائے۔ مجھے لگا کہ وہ میرے صاف سُتھرے ہاتھ اور پاؤں دیکھ کر کچھ مرعوب ہُوا ہے، جو لڑکیوں کی طرح خُوبصورت تھے۔

"دانت دکھا!" وہ غرایا۔

میں نے باچھوں تک ہونٹ سکیڑ کر دانت دِکھائے۔

وہ مجھے ایسے دیکھتا تھا جیسے بھاؤ تاؤ کرتے ہُوئے خریدار، جانور کو آنکتا ہے۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مرعوب نہ ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے پر نرمی کی جو جھلک دیکھی تھی وہ حقیقت میں حیوانیت کی پرچھائیں تھی نہ کہ انسانیت کی۔

"کپڑے اُتار!"

اُس نے ایسے کہا جیسے وہ میری آبروریزی کا ارادہ رکھتا ہو۔ میری جان ہی نکل گئی۔ سر پا نہ

کے تھانے میں ملزموں پر تشدّد ہوتا دیکھ کر میں سوچتا تھا، "امن پسند شہریوں کے تحفّظ کے لئے پولیس جو کرتی ہے بالکل ٹھیک کرتی ہے" لیکن پیارا سنگھ بینگڑی والے کا مُشاہدہ مجھ سے الگ تھا۔ وُہ کہتا تھا، "مجھے بدمعاش بنانے میں پولیس کا ہاتھ ہے" میں نے کبھی اُس کی بات پر یقین نہ کیا اور سمجھتا رہا کہ پولیس جرائم کی روک تھام کے لئے ہے، یہ کسی کو جُرم کرنے پر کیوں اُکسائے گی ؟

"صاحب، مَیں بے قصور ہوں! میری یہی بھُول ہے کہ مَیں پھُول دیکھ کر بے قابو ہوگیا اور کیاری میں گھُس گیا۔"

مَیں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے اطراف دیکھا جیسے مَیں اپنے ساتھ کھڑے سپاہیوں سے اپنے بیان کی تائید چاہتا تھا۔

"مجھے معلوم ہے!"

تھانیدار نے سر ہلایا جیسے وُہ میرے اعتراف کی داد دے رہا ہو۔ اُس نے میرے جملے کو دُہراتے ہُوئے کہا، "مجھے معلوم ہے کہ تُو بے قصور ہے اور صاحبِ ذوق بھی۔"

اِس حُجّت میں جو تُہمت پوشیدہ ہے وُہ مُحتاجِ بیاں نہیں ہے۔ بے حس آدمی کی ہٹ دھرمی نفی پسند ہے، اِس لئے یہ اپنے حریف کو ذلیل و رُسوا اور بے دست و پا دیکھنا چاہتی ہے۔

"اِس بھٹیچر کو دیکھو!" وُہ سپاہیوں سے مخاطب ہُوا اور پھر مجھ سے، "حرام زادے! یہ پھُول تیرے جیسوں کے لئے ہی لگائے ہیں کہ وُہ یہاں آئیں اور آرام کریں!"

"میری غلطی ہوگئی صاحب! آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

مَیں نے اپنی غلطی مانی اور مُعافی چاہی۔

"تُو کہاں تک پڑھا ہُوا ہے ؟"

اُس نے میری بات پر دھیان نہ دیتے ہُوئے سُوال کیا۔

"میٹرک صاحب، لیکن مَیں بے قصُور ہُوں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔"

مَیں نے پُوری بے کسی کا چہرہ لگا کر آخری الفاظ کہے۔

جتنا پُوچھتا ہُوں اُتنا ہی جواب دے، سمجھا! ورنہ اِسے تیرے وہاں گھُسیڑ دُوں گا!

اُس ذلیل نے میز پر رکھا ڈنڈا اُٹھایا اور اُس کی پُوری لمبائی پر ہاتھ پھیرا جیسے وُہ اُس کے آزمُودہ عمل کا صداقت نامہ ہو۔

تُو نے گیٹ پر بورڈ نہیں پڑھا! نو تھورو فیئر، ٹرِسپاسرز وِل بی پروسیکیوٹڈ۔ یہ شارعِ عام

نہیں ہے۔ خطا کار سزا کے حق دار ہیں۔" اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"نہیں جناب!

میں نے چاہا کہ اپنی لاعلمی اور لاپروائی پر سر پیٹ لوں جو میری شامت کا باعث ہوئی تھی۔

"اِس میں میرا قصور ہے۔"

اُس نے میرا مضحکہ اُڑایا۔ وہ کرسی پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوری اُونچی آواز میں اپنا بھولا ہوا حکم یاد کر کے دُہرایا، "کپڑے اُتار!"

میں نے اپنے کپڑے کھال کھینچنے کے سے انداز میں اُتارے اور بغلوں میں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی اپنی عُریانی ڈھانکنے کی بے سُود کوشش کرے۔ وہ میرے قریب آیا، میرے گرد گھومنے لگا اور مجھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر سانپ رینگ رہا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ سانپ اُوپر چڑھ آئے، دم سادھے پڑے رہو، مُوذی رینگتا ہُوا گزر جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ سانپ، اِنسان نُما تھا، اُس نے رینگتے رینگتے ڈس لیا۔ میں پہلے چیخا کہ تڑپا، یہ یاد نہیں ہے ہاں یہ صاف یاد ہے کہ اُس کے ڈستے ہی میں نے اُسے پہلے اپنے رونگٹوں سے دیکھا، پھر ماس سے اور پھر آنکھوں سے۔ میرے پیٹ پر بڑا نیلا داغ ایسے اُبھر آیا جیسے لکڑی میں برمائے ہُوئے چھید کے اطراف بر (کگر)۔

"تُو رہتا کہاں ہے؟" اُس نے اچانک پُوچھا۔

"ریگر گڑھ پُورہ میں!

اُس کے عِتاب سے بچنے کے لئے میں نے اُتنا ہی جواب دیا جتنا اُس نے کہا تھا۔

"اِدھر کیوں آیا ہے؟"

اُس کا رویّہ بدستُور مشکوک تھا۔

"سردار سادھو سنگھ مان صاحب سے مِلنے!"

میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہُوئے کچھ اعتماد سے کہا۔ میرے اِعتماد میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اُنھیں دِلّی کا ہر فرد جانتا ہے اور یہ بھی ضرُور جانتا ہو گا۔ سچ جانئیے کہ مجھے افسوس ہُوا کہ میں نے اُن کا حوالہ پہلے کیوں نہ دیا؟

"وہ جو پولیٹیکنک میں فورمین ہیں؟" اُس نے کچھ جھینپ کر سُوال کیا۔

"جی ہاں، وُہی!"

میرا لہجہ بھرپور اور نڈر تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نظر کی دھار پہلے سے کُند تھی۔

"تُو اُنھیں کیسے جانتا ہے؟"

وُہ کچھ حیران، پریشان اور بدگمان نظر آیا۔ اُسے اُلجھن میں دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا اور اُسے مرعُوب کرنے کے لیے مَیں نے جھُوٹ بولا، "وُہ میرے رِشتے دار ہیں!"

میرے قارئین! مَیں اُن کا رِشتے دار نہ تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے مَیں نے اُن سے جس طرح کا رِشتہ جوڑا ہے اِس سے پہلے مَیں اُس کی تذلیل کر چکا ہُوں۔ شاید آپ بھُول گئے ہوں! یاد دہانی کے طور پر دوبارہ لکھتا ہُوں، وُہ میرے ہم فِرقہ تھے۔

"وُہ تیرے رِشتے دار ہیں!؟"

اُس کی حیرانی، پریشانی اور بدگمانی بدستُور تھی اور صاف دکھائی دیتی تھی۔

"جی ہاں!"

اُس کے بدلے ہُوئے روّیے سے فائدہ اُٹھانے اور کچھ اپنی خُودداری ظاہر کرنے کے لیے مَیں کپڑے پہننے لگا۔ پہلے تو وُہ مجھے یُوں ہی دیکھتا رہا پھر اپنی درندگی کو اِنسانی سَمت دیتے ہُوئے بولا، "کم بخت! مجھے تُو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

اِنسان کی خُوب صُورت زبان، نام اور لباس کی ریاکاری اُتنی ہی پُرانی ہے جتنی تہذیب و تمدّن کی دِل فریبی۔ اِس نقاب میں ہر ذلیل چیز، جس سے اِنسان کو موسُوم کیا جاتا ہے اپنے معنی بدل لیتی ہے۔ یہی حال رُتبے اور سِلسلۂ نسب کا ہے۔ یہ دونوں ایسے ہیں جیسے کھوٹے سونے کے لیے تاؤ بند۔

اُس تھانیدار کا نام ہردیال سنگھ تھا۔ باہمی رنجش اور تناؤ کو مزید کم کرنے کے لیے اُس نے سپاہیوں کو باہر بھیج دیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

یہ جھنڈی تُو نے کہاں سے لی؟

مَیں ایک جلُوس کے ساتھ پارلیمنٹ گیا تھا، کسی جلُوسی نے میری سائیکل کے ساتھ باندھ دی"

میں نے دانستہ طور پر کامریڈ کے لفظ سے اِحتراز کیا۔

"اِسے یہیں رہنے دو"

اُس کا لب و لہجہ اچانک مؤدّب ہو گیا۔ میرے پیٹ میں مروڑ پڑ رہا تھا، مَیں نے اُس کا

درد کم ہوتا محسوس کیا۔

"ٹھیک ہے جی!"

"سردار صاحب میرے دوست ہیں! میں کتنے دنوں سے اُن سے نہیں ملا ہوں۔ میں تیرے ساتھ چلتا ہوں اور اسی بہانے اُن سے مل بھی آتا ہوں۔"

میں نے پہلی بار اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ اُس میں مضایقے کی کوئی بات نہ تھی میں نے جو کہا تھا اُس میں جھوٹ سے سچ کا جُز زیادہ تھا۔ مان صاحب کی ورکشاپ وہاں سے چند قدم پر تھی۔ انھیں دیکھتے ہی میں اُن کے قدموں پر ڈھے پڑا۔ وہ میرے خلوص کے قائل تھے اور میری مدد کرنا چاہتے تھے لیکن کسی موافق صورتِ حال کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے مجھے اُٹھا کر گلے سے لگایا اور اپنے مترنم لہجے میں میری گھبراہٹ کا سبب پوچھا۔ میں تذبذب میں تھا کہ کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں؟ میرے دشمن نے میری مشکل آسان کردی۔ اُس نے میری ٹرسپاسنگ کی واردات سُنادی اور باقی بات چھپالی۔ مان صاحب نے چائے کا اہتمام کیا۔ جب تک بیرا چائے لے کر آیا، میں اپنے آنسوؤں سے لڑتا ہوا گمان کرتا رہا کہ ہردیال سنگھ مجھ سے اپنی زیادتی کی معافی مانگے گا اور اپنے کٹھور رویے پر شرمندہ محسوس کرے گا لیکن اُس نے ایسا نہ کیا۔ وہ جیسے خوش گپیاں ہانک رہا تھا اُس سے ظاہر تھا کہ وہ میرے حادثے کو یکسر بھلا چکا ہے۔ میں چائے پی کر اجازت لے کر چلا آیا لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔

میرے قارئین، قانون اور جرم ایک ہی درندے کے دو نام ہیں۔ چوں کہ قانون انسدادِ جرم کے لیے ہے اس لیے جرم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اور طاقت پر اختیار نہ ہو تو یہ زندگی اور موت کے درمیان باریک سی لکیر ہے۔ جیسے جنگل کی آگ، حیوانات و نباتات کو جلا کر دھرتی کی زرخیزی کو پامال کرتی ہے، جس کی تجدید نہایت دشوار گزار ہے اُسی طرح مظلوم انسان کی خاطر داری اور تشکیلِ نو کے لیے بڑی جگر کاوی درکار ہے۔

میرے ستم گر نے ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جو میرے دل کے زخم کا مرہم ہوتا یا جس سے میں یہ اخذ کرتا کہ وہ اپنے غلط رویے پر شرمسار ہے۔ میرے اندر جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ اگر وہ پھٹ پڑتا میرے وجود کے ساتھ اُسے بھی بھسم کر ڈالتا۔

انسانی زندگی تضادوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک تضاد ہے کہ معاشی بدحالی میں یہ دو طرح سے نمایاں ہوتا ہے۔

اوّل، یہ مصیبت کو حقارت سے دیکھتا ہے، اُس پر ہنستا ہے، اُسے زندگی کی لعنت

سمجھتا ہے، اُس کے خلاف بے جگری سے لڑتا ہے، جینے کے لئے لوٹ مار کرتا ہے اور لٹیرا بن جاتا ہے۔

دوسرے، یہ مصیبت سے ڈرتا ہے، اُس کا احترام کرتا ہے، بے کسی کی زندگی گزارتا ہے رحم وکرم پر جیتا ہے اور بھکاری کہلاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں معاشی تفاوت کم ہو وہاں ایسے سماجی مسائل کم ہوتے ہیں اور ان دونوں قسم کے لوگ نہ ہونے کے برابر۔ اصلیت کی ظرفگی! دیکھنے کو مشرق ومغرب میں بُعد ہے لیکن نہیں ہے وُہی بات اِن دُونوں مُخالف جذبوں کی نفسیات میں ہے۔ دونوں کی مُجمل خُوبی ایک ہے کہ یہ حیرت و اِستعجاب کو رغبت دِلاتے ہیں، اپنے مداح پیدا کرتے ہیں اور اپنے کمال کو پُہنچتے ہیں لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ۔

یہ جذبے اور اِن سے پیدا شُدہ نتیجے اُتنے ہی پُرانے ہیں جتنے اِنسانی تہذیب کے قصّے۔ پہلے جذبے کے شیدائی نے قتل وغارت کو اپنا پیشہ بنایا، اِسے طرزِ تمدّن ٹھہرایا، اپنے اِثبات میں کمال کو پُہنچا اور راجا بنا۔ اُس نے اپنے جاں بازوں کو اُن کی جاں بازی کا صِلہ رُتبوں، جاگیروں تنخواہوں دوشیزاؤں۔۔۔ کی صُورت میں دیا۔ جس کسی نے اُس کی برتری کے خلاف سر اُٹھایا، اُس نے اُس کا پیچھا کیا، اُسے پکڑا، جان سے مارا یا قید میں ڈالا۔

راجا کا دبدبہ اُس کا اصل تھا۔ وہ اپنی مستی کی تشفّی کے لئے نئے نئے قانُون بناتا اور اِس طرح اپنی رعایا کے سیاہ وسفید کی توثیق کرتا۔ راجا قانُون سے بالاتر تھا لیکن اُس نے اپنے دبدبے کے شایانِ شان قانُون بنایا۔ جو اُسے پسند ہو وہ اُسے عزّت دے اور ناپسند ہو تو اُسے بے عزّت کرے۔

دُوسرے جذبے کا شیدائی اپنی نفی کی اِنتہا کو پُہنچا اور پیر کہلایا۔ وہ اپنے مُریدوں کے نان ونفقہ پر پلتا تھا لیکن اُن کی خدمات کا صِلہ نہ چُکاتا تھا۔ تاکہ اُس کے مُرید صِلے کی اُمید ہی نہ رکھیں وُہ اُنھیں نفس مارنے کی تلقین کرتا، عُسرت پسند اور حسرت گزیدہ بناتا، اِس دُنیا کو دُکھوں کا مسکن جتاتا اور دُوسری دُنیا کو سُکھوں کا گہوارہ۔ راجا کی طرح پیر کو بھی اپنا تسلّط بڑھانے کا خبط تھا۔ اُس نے اپنے مُریدوں کو اپنی اور اپنے خُدا کی تمام ترفیاضی اور دردمندی کا یقین دلایا اور زور دیا کہ اُس کے اِرشادات پر ایمان لانے ہی سے وُہ پاک دامن اور جنّت نشین ہوں گے ورنہ آلودہ دامن اور دوزخی۔ اُس نے منحرفوں کو گُناہ گار ٹھہرایا، عذابِ دُوزخ سے ڈرایا لیکن یہ بھی باور کروایا کہ میں! صرف میں ہی تمھیں قہرِ خُدا سے بچا سکتا ہُوں۔ تم مرنے سے ایک سانس پہلے بھی میری حفاظت میں آ گئے تو تمھاری مغفرت کا ذمّہ دار،

مَیں ہوں۔ مَیں تمہیں دائم جلتے دوزخ سے نکال لاؤں گا اور جنّت کے سدا بہار سایے میں پہنچا آؤں گا۔

راجاؤں کے مُقابلے میں پیروں نے جو نظام تشکیل دیئے، اُن کی تعریف کرتے ہی بنتی ہے

راج بھوَن	سورگ
راج بھوج	دیوتا بھوج
پانی	امرت
راج اُدیان	مُدھوبَن
جھوٹ	دَھرمی
شَستَر	اَستَر
شِما	کلیان
داس	گَندَھرو
داسی	اَپسرا
دارُو	سوم رَس
کوتوال	دھرم راج
بھگوڑا	پاپی
نربَل	اَدَھرمی
بَندی گرہ	نرک
بھُول	پاپ
جلاّد	جَم دُوت

اَور آدمی اِس خُرافات کو دُھر دی بانی (ربّی بانی) سمجھنے لگا۔

اِس کی وجہ کیا ہے؟

جاہِل اَپنے اَدھورے پن کو تصوّر سے پُورا کرتا ہے اَور عاقِل اَپنے عمل سے۔ زندگی کی حقیقت بھی یہی ہے! عمل کتنا ہی نزار ہو، تصوّر سے پُر کار ہوتا ہے۔

باب ۵۶

نفرت کے خداؤں کی عبادت چھوڑو
تفریق کے سنگین بُتوں کو توڑو
تُم چاند ستاروں کی طلب سے پہلے
اِنسان سے اِنسان کے رشتے جوڑو (شاطر)

مَیں کالج سے باہر نکل کر سائیکل پر سوار ہُوا تو معلوم پڑا کہ 'فری وہیل' پر سے چین اُتری ہُوئی ہے۔ مَیں اپنی طرف کھڑے کھڑے اُسے چڑھانے لگا لیکن کامیاب نہ ہُوا۔ مَیں نے سائیکل 'سٹینڈ' پر کھڑی کی، دُوسری طرف بیٹھ کر گراری پر سے چین اُتاری اَور پہلے فری وہیل پر چڑھائی پھر گراری پر۔ ایسے ہی آڑے وقت کے لئے مَیں نے کاٹھی کے کور اَور سپرنگ کے درمیان ایک کپڑا رکھا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُسے نِکالا، ہاتھوں کو پُونچھا اَور اُسے وہیں رکھ دیا۔ مَیں کچھ دُور تک پیدل چلتا رہا اَور آل نٹ ہوسٹل کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ کِدھر جاؤں؟ مَیں بے ٹھکانا سا تھا۔ مَیں پیارا سِنگھ کے پاس جانا چاہتا تھا جو کشمیری گیٹ کے جی۔پی۔او۔ کے سامنے کے ریلوے کوارٹرز میں اپنے خُسر دیپ سِنگھ کے ساتھ رہتا تھا۔ وُہ سات بجے کے قریب کام سے آتا تھا اَور اُس وقت تقریباً چار بجے تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد مجھے میرا ٹھکانہ مِل گیا، مَیں قدسیہ پارک میں جا کر لیٹ رہا۔

پیارا سِنگھ اِس کوارٹر میں رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ وُہ وہاں اِس لئے رہتا تھا کہ اُسے کئی طرح سے بچت تھی۔ مکان کے کرایے کی، مصارف کی اَور ایندھن کی۔ مکان کے کرایے کی بات سیدھی سی ہے رہی مصارِف کی بات، وُہ اُنھیں اپنے خُسر سے آدھے آدھے بانٹتا تھا حالاں کہ اُس کا کنبہ اُس سے بڑا تھا۔ وُہ کوارٹرز ریلوے یارڈ کے قریب تھے جہاں 'لوکوموٹوز' کے لئے کوئلے اَور پانی کا اِنتظام تھا۔ اُن کوارٹرز میں کچھ فائرمین رہتے تھے۔ جو کوئی ڈیوٹی پر ہوتا وُہ اپنا 'لوکوموٹو' کوارٹرز کے پاس سے گُزرنے والی ریلوے لائن پر لاتا اَور دیوار کے اُوپر سے اِدھر کوئلہ پھینکتا۔ جب تک وُہ یہ کام کرتا، ڈرائیور بھاپ اُڑاتا، سیٹی بجاتا اَور تاکتا جھانکتا۔ کہتے ہیں کہ چور، شریف آدمی سے زیادہ دریا دِل ہوتا ہے۔ اِس کہاوت

کی سچائی یہاں دیکھنے میں آتی تھی۔ چند فائر مین سارے مکینوں کو ایندھن مہیا کرتے تھے۔ وہ کوئلہ کچّا ہوتا تھا جس کا کاربن جلا کر انگیٹھی کے قابل بنانا پڑتا تھا اِس لئے ہر گھر کے آگے کوئلے کا ڈھیر جلتا رہتا تھا اگر ریلوے یارڈ کی جانب سے ہوا چلتی، وہ 'لوکوموٹو' کے دھوئیں کے ساتھ اُن جلتے ڈھیروں کا دھواں بھی اندر سمیٹ لاتی۔ تڑختے کوئلوں کی چنگاریوں سے آنکھوں کو ایسے بچانا پڑتا تھا جیسے گڑ منڈی میں منہ کو مکھیوں سے۔ اِس صورتِ حال کے بارے میں پیارا سنگھ کا ردِ عمل تہمت آمیز تھا۔ یہ نظارہ شمشان گھاٹ سے بڑھ کر ہے! وہاں بیک وقت ایک دو مسان جلتے ہیں اور یہاں پورے پندرہ!

اُس کے پاس جاتے ہوئے مَیں اِس بات کا خیال رکھتا تھا کہ رات کا کھانا وہیں کھاؤں اور ایک وقت کی روٹی کے پیسے بچاؤں۔ پیارا سنگھ کی بیوی کا نام گیان کور ہے۔ سکھوں میں ناموں کی ساخت بالکل الگ ہے، کسی کے آدھے نام سے اُس کی صنف قائم کرنا محال ہے۔ گیان کور کے بارے میں اُس کی ساس کہتی تھی، "اپنی صورت کے ساتھ اِس کی ماں نے اِسے کوکھ بھی دے دی۔ وہ وہاں بلائیں جنتی ہے اور یہ جہاں!"

اپنی جنس کی طرف عورت کا منفی رویّہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد کئی ایسی عورتیں بھیک مانگنے آئیں۔ اُن کے دُودھ کاٹے ہوئے اور جسم کے نازک حصّوں پر کچوکوں اور چرکوں کے نشان تھے وہ عورتیں زیادہ تر عورتوں ہی سے اپنا دُکھڑا روتیں اور وہ انھیں بے دردی سے لتاڑتیں۔ "تمہارے ساتھ جو ہوا ہے اچھا ہی ہوا ہے۔" ایک بار میرے تایا جی نے تائی کو ایسا کہتے سنا، انھوں نے بے اختیاری سے کہا، "اذیت خواہی کی حد ہوتی ہے! اگر اِن کی جگہ تو ہوتی، اپنے زخموں کی مسکرا کر نمائش کرتی اور انھیں حقیر جتاتی، جن کے ساتھ ایسی دُرگھٹنا نہیں گھٹی ہے۔ وہ تیرے جیسی ہی تھیں! جنھوں نے اپنی بیوہ بہنوں کو چیتاؤں میں دھکیلوایا، جلوایا، اُن کے زخموں سے لُطف اُٹھایا اور انھیں ستی کا مقدس مقام دیا۔"

اپنے سکول کے دوران مَیں نے ایسی مثال دیکھی تھی۔ میرا ہم جماعت محبوب علی عزاداری میں کھائے زنجیروں اور چھریوں کے زخموں پر اتراتا تھا، اُن کی نمائش نہایت شان سے کرتا تھا اور اُسے حقیر کہتا تھا جو ویسا نہ کر سکتا تھا۔

گیان کور نے اپنی ساس کے اِلزام کو جھٹلا دیا تھا۔ وہ فطری طور پر بدل گئی اور چہکتی مہکتی رہتی جیسے اُس کی عمرِ گُزراں اُسے جینے کے نئے انداز سکھا گئی ہو۔ پیارا سنگھ خود لہکا مہکا رہتا۔ اُس کے مزاج سے نیا ڈھنگ ہویدا تھا اور وہ خود کو مردوں کا امام سمجھنے لگا تھا۔ سیوا سنگھ کی لڑکیوں کو عمر کے لحاظ سے

کھڑا کرو تو سیڑھی بنتی تھی۔ پیارا سنگھ نے اُسے [illegible] کا پیدا کرنے کا گُر بتایا، عمل کے دوران بیوی کے سر پر پگڑی باندھ کر، شرطیہ لڑکا ہوگا! کہتے تھے کہ اُس نے ہُوبہُو وہی کیا جو پیارا سنگھ نے اُسے بتایا لیکن بُرا ہو اُس چل کا جس نے عین وقت پر درشن کور کے سر پر سے پگڑی گرادی۔

گیان کور نے اِستخارہ لے کر لڑکے کا نام ملکیت سنگھ رکھا لیکن اُس کا باپ اُس کے نام سے خُوش نہ تھا جیسے اُس کا جذبہ استخارے سے زیادہ پاک اور مُبارک ہو۔ وُہ اُسے جانشین کہہ کر بُلاتا اور اپنی مردانگی کے ثبوت میں اُسے ننگا رکھتا۔

پیارا سنگھ کے جذبے سے ملتا جُلتا جذبہ مَیں نے نمبردار جگت سنگھ میں دیکھا تھا۔ ایشر سنگھ اُس سے طنزاً کہا کرتا تھا "تمہارے مرنے کے بعد یہ سب کچھ میرا ہی ہے! اِسے جیتے جی مجھے دے دو اور جو روٹی دو روٹی کھانی ہے، آرام سے میرے پاس کھائے جاؤ۔ دن رات کس کے لیے مرتے ہو؟"

یہ تہمت آمیز جملے سُن کر جگت سنگھ کے چہرے کے اُسلوب ایسے بگڑ جاتے جیسے کوئی بھری بزم میں کڑوی کسیلی شے مُنہ میں رکھ لے اور شرم سے نہ اُسے اُگل سکے اور نہ نگل سکے۔ وُہ اپنے سر کو سینے پر جھکائے رکھتا جیسے کسی مُجرم کے گلے میں بھاری طوق ڈال کر پاؤں سے جکڑا ہُوا ہو۔ ایک رات پچھلے پہر اُس کی بیوی نے اُسے بیٹے کا تحفہ دیا۔ جگت سنگھ چھت پر چڑھ گیا اور تھالی پیٹنے لگا۔ رات کے سنّاٹے میں اُس کا رویّہ عدم میں اپنا وجود منوانے کے مساوی تھا۔ وُہ تھالی پیٹتا رہا جب تک کہ سارا گاؤں اُسے مُبارک باد دینے کے لیے اُس کے گھر میں نہ پہنچ گیا۔ اُس دن سے اُس کے جینے کے طور طریقے بدل گئے۔ وُہ سر اکڑائے، طُرّہ چھوڑے ایشر سنگھ کے دروازے پر جاتا اور چلّاتا، ایشر سیال کیا حال ہے؟ اُس کا گُستاخ انداز اِس حقیقت کا غمّاز تھا کہ وُہ ایشر سنگھ کا حال پُوچھنے کے پردے میں اُسے اپنا حال بتا رہا ہے۔ اُس کی نفسیات ہی بدل گئی تھی۔ وُہ بستر پر لیٹا آسمان کو گھورتا جیسے اُس پر کمند پھینکنا چاہتا ہو۔ وُہ کسّی چلاتا ہُوا ایسی آواز نکالتا جیسے ساری دھرتی پر اپنی وراثت کا دعویٰ کرتا ہو۔ اُس نے اپنے جذبے کے شایانِ شان اپنے بیٹے کا نام بوٹا سنگھ رکھا۔ وُہ بڑا ہونے لگا، کسی سے کچھ سیکھنے لگا اور کسی سے کچھ لیکن اُس کے باپ نے اُسے جو سکھایا، وُہی سکھا سکتا تھا! بوٹا سنگھ اپنی پھُنّو ہاتھ میں پکڑ کر ایشر سنگھ سے پُوچھتا "تایا جی! یہ کیا ہے؟"

مَیں پیارا سنگھ کے گھر جانے کے لیے اُٹھا تو قدسیہ پارک روشن ہو چکی تھی۔ وُہ کام سے لوٹا نہ تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر مَیں نے اوپرے دل سے کہا "اچھا بھابی، مَیں چلتا ہُوں! بھائی صاحب جانیں کب آئیں؟"

"جلدی جانا ہے تو مَیں کھانا ابھی بنائے دیتی ہوں، ورنہ مِلکیّت کے بابُو کا اِنتظار کر، وُہ آتے ہی ہوں گے!" بھابی نے مُلتمس لہجے میں کہا۔

بھابی پہلے پیارا سنگھ کو اَوتار (اُن کی بڑی لڑکی کا نام) کے باپُو کے نام سے بُلاتی تھی۔ اُس کے بعد اُس کے دو لڑکیاں اَور ہُوئی تھیں لیکن اُس نے اپنا طرزِ تخاطب بدلا نہ تھا۔ اُس میں اچانک تبدیلی پاکر میں نے مذاقاً پُوچھا، "بھابی! اَوتار کے باپُو کو کیا ہُوا؟ وُہ کہاں چلا گیا؟"

"اُسے پاکستان بھیج دیا ہے!" اُس نے ہنسی روکتے ہُوئے جواب دیا۔

"ٹھیک کیا، اَب اُسے آنے بھی مت دینا!" میں نے اُس کی بات سے لُطف لیتے ہُوئے، اُسے مشورہ دیا۔

"میرا بھی یہی اِرادہ ہے!"

اُس نے میری ہاں میں ہاں مِلائی اَور گھر کے کام کاج میں مصرُوف ہوگئی۔ بیٹھے بیٹھے مُجھے خیال آیا کہ کیوں نہ مَیں مِلکیّت کو باہر گُھما لاؤں۔ اُس نے چلنا شُروع نہیں کیا تھا لیکن اُنگلی پکڑ کر سیدھے ٹیڑھے پاؤں اُٹھانے لگا تھا۔ اُسے بِستر پر سے اُٹھا کر مَیں باہر لے جانے لگا۔ بھابی نے مُجھے روکا، "ذرا ٹھہر" وُہ اَندر گئی، نیا پوتڑا لائی، مِلکیّت کا پوتڑا بدلا، اُسے اُٹھا کر مُجھے دیا اَور اِحساسِ خاطر سے کہا، "تیرے کپڑے نہ خراب کر دے!"

مَیں کون سا کمخواب پہنے ہُوئے ہُوں!

مَیں نے مِلکیّت کو اُٹھاتے ہُوئے بظاہر ٹھٹھے سے کہا لیکن مَیں اَندرُونی طور پر کسرِ نفسی میں مُبتلا تھا۔ بھابی خاموش اَور سنجیدہ رہی اَور مَیں مِلکیّت کو کاندھے سے لگائے باہر نِکل گیا۔ وُہ سڑک کی گہما گہمی سے مُتاثر ہُوا اَور کاندھے پر سے سَر اُٹھا کر آمد و رفت کو دیکھنے لگا۔ اُس کی سہولیت کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے، مَیں نے اُسے باہوں میں لے لیا اَور کانا باتی کُر، کرتا ہُوا اُس سے باتیں کرنے لگا۔

"یہ دیکھو، سائیکل ہے!"

"وُہ دیکھو، کار ہے!"

"وُہ بس ہے، بولو بس!"

وُہ چُپ تھا اَور حیرت سے ہر چیز کو دیکھتا تھا جیسے اُس کی تفسیر اَپنے طریقے سے سمجھتا ہو۔ اُس کا چہرہ اَپنے باپ سے اِس قدر مِلتا تھا کہ وُہ اُس کا چھوٹا نقشہ نظر آتا تھا۔ مَیں کوارٹروں کے اِحاطے کے دروازے پر کھڑا تھا اَور اَپنے ننّھے ساتھی کو طرح طرح سے بہلاتا تھا کہ مَیں نے لال قلعہ کی طرف فُٹ پاتھ

پر غیر معمولی بھیڑ پائی۔ میں نے غور سے دیکھا، مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہاں بے بتّی سائیکل سواروں کے چالان ہو رہے ہیں۔ میں چلتا چلتا ریلوے پُل کے پاس پہنچ گیا جو دِلّی ریلوے سٹیشن کو جمنا پُل سے جوڑتا ہے۔ کشمیری گیٹ کو جانے والی سڑک وہاں پر دو شاخے میں بدلتی تھی اور جہاں ریلوے کوارٹرز ختم ہوتے تھے وہاں پھر ایک ہو جاتی تھی۔ اہلِ دِلّی کے نزاعی رویے میں، میں نے کہیں ہم آہنگی دیکھی تھی تو وُہ یہ تھی کہ جہاں ایسی پکڑ دھکڑ ہوتی تھی، دُوسری طرف سے آنے والے سائیکل سوار اِس طرف سے جانے والے بے بتّی سائیکل سواروں کو خبردار کر دیتے تھے اور یہ پیدل چلنے لگتے تھے۔ میں کئی بار ایسے حالات میں پھنسا تھا اور ایسے ہی ہمدرد، سائیکل سواروں کی وقتی اِعانت سے پُولیس کے چنگل سے بچا تھا۔

یہ بات میں ہزار وُثوق سے کہتا ہُوں کہ جُرم میں ساتھ مِلانے کے لئے آدمی کو نہ ترغیب دینے کی ضرورت ہے اور نہ بُلاوے کی، یہ ایک دم پُورے کا پُورا آمادہ رہتا ہے۔ لیکن کسی جائز مُہم میں حِصّہ لینے کے لئے اِسے ہر طرح سے مائل کرنے پر بھی اِس کی بے دِلی مُستقل رہتی ہے اور شرکت کی توقّع ادھُوری۔ تایا جی کہتے تھے، "مہابھارت کے زمانے میں سارے دانش وَر جانتے تھے کہ جنگ اِنسانیت کے خلاف سب سے بڑا جُرم ہے لیکن وقت آیا تو ہر کوئی کِسی نہ کِسی بہانے اِس فریق سے جا مِلا یا اُس سے۔ نوعِ اِنسان اپنی منفیت میں ایک ہے لیکن قطعیت میں الگ! اور یہی اصلی اِنسان کی پہچان ہے کہ وُہ بھیڑ میں اکیلا ہوتا ہے۔"

پُولیس نے وُہ مقام بڑی دُور اندیشی سے چُنا تھا۔ میں پُل کے اِدھر کھڑا ہو گیا تاکہ پیارا سِنگھ آئے اور میں اُسے آگے چھُپے ہُوئے خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے میرا ذاتی جذبہ کُلّی بن گیا اور بے بتّی سائیکل سواروں نے اُتر کر چلنا شرُوع کر دیا۔ اُس کام کے لئے میری مزید ضرورت نہ تھی۔ میں وہاں سے آگے چل پڑا اور ٹریفک کنٹرول آئیلینڈ کے پاس جا کر رُکا۔ میرا ننّھا ساتھی اپنی دُنیا میں چُپ چُپ مست تھا۔ میں جب ایک پہلو تھکتا اُسے دُوسرے پہلو اُٹھا لیتا۔ پیارا سِنگھ آیا، میں اُسے پہچان نہ سکا۔ وُہ ریلی کی نئی سائیکل پر سوار تھا جس پر ڈائنموفٹ تھا۔ وُہ مجھے دیکھ کر حیران ہُوا اور پھر خُوش ہو کر مجھ سے اپنے جانشین کو لے لیا اور سائیکل مجھے تھما دیا۔ میں نے بے قابُو ہو کر پیارا سِنگھ کو بتایا کہ میں نے کیسے چالان کرنے والوں کا بھانڈا پھوڑا ہے ورنہ وُہ جیسے چھُپ کر بیٹھے ہُوئے ہیں، اُن سے کوئی بچ نہ سکتا تھا۔ وُہ خلافِ اُمید سائیکل والوں پر تُہمت لگاتے ہُوئے بولا، "جو سائیکل خرید سکتا ہے وُہ بتّی کیوں نہیں لگوا سکتا؟"

میں اُس کی بدلی ہُوئی نفسیات پر حیران رہ گیا۔ جب اُس کے پاس پُرانی سائیکل تھی، جس

پر بتی نہ تھی، وُہ چالان کرنے والوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ ہم گھر پہنچے، بنی ٹھنی بھابی نے دروازہ کھولا۔ پیارا سنگھ لہک کر بولا، "لگتا ہے کہ دُوسرے جانشین کے اِستقبال کی تیاری ہو رہی ہے!

"کچھ شرم کیا کرو!" اُس نے لجا کر کہا۔

"گیان، مَیں اب سمجھا کہ تیری بھابی اِتنی سیوا کیوں کرتی ہے؟ جب مَیں کام سے آتا ہوں مجھے گرم پانی سے غُسل کرواتی ہے۔ کہتی ہے کہ تکان سے جُڑے انگ کھُل جاتے ہیں۔"

اُس نے 'انگ کھُل جاتے ہیں' کچھ ایسے کہا جیسے اُس کے کہنے کا مطلب کچھ اَور ہو۔

"تیرے بھیّا نے شرم، مِٹھائی سمجھ کر کھا رکھی ہے!"

بھابی نے یہ جُملہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اَور پھٹکارنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ وُہ اپنے مُنہ پھٹ پتی کو غُصّے سے دیکھتی ہُوئی اندر چلی گئی جیسے کوئی بھُولا ہُوا کام یاد آ گیا ہو۔ پیارا سنگھ نے غُسل کیا، لیونڈر کے دو پھاہے بنائے، ایک مجھے دیا اَور دُوسرا اپنے کان میں رکھ لیا۔ اُس کی ہر ادا اُس کی خوش قامتی کی طرح دِل پسند تھی۔ اُس میں ایک ہی بُری بات تھی، وُہ مجھے کسی کام پر نہ لگاتا تھا۔ بھابی کھانا پروسنے لگی۔ مَیں ہاتھ دھونے کے لئے غُسل خانہ میں گیا۔ پیارا سنگھ میرے ہاتھ دُھلانے کے بہانے وہاں آیا اَور رازدارانہ انداز میں بولا، "کچّا ماس کھایا ہے کبھی!؟"

"بالکل نہیں! وُہ کیسے کھایا جا سکتا ہے؟"

مَیں نے حیرت سے اُسے دیکھا اَور ہاتھ دھوتا دھوتا رُک گیا۔

"آج بتاؤں گا تجھے! میں کھانا کھا کر تیرے ساتھ چلُوں گا۔"

اُس نے میرا کاندھا دبایا اَور مجھے تولیہ پکڑا کر باہر چلا گیا۔

مَیں نے سمجھا کہ وُہ مذاق کرتا ہے۔ مَیں کھانا کھا کر گھر جانے لگا اَور وُہ میرے ساتھ ہو لیا۔ پُرانی دِلّی کی سڑکیں نئی دِلّی کے مقابلے میں تنگ ہیں اَور شام کے وقت گزری لگنے سے اَور تنگ ہو جاتی ہیں۔ مَیں نے پہلی بار دیکھا، وُہ سائیکل چلانے میں مجھ سے ماہر ہے۔ مَیں اُس کا ساتھ نہ دے سکتا اَور اُسے آہستہ چلنے کے لئے کہتا۔ وُہ قُطب روڈ پہنچ کر رُکا تو اُس کا سُوال میری سمجھ میں آیا۔

قارئین، میری نَفس پرستی کی کج روی وَضاحت طلب نہیں ہے۔ مَیں گندگی کے کیڑے کی طرح تھا جو اپنی تسلّی کے لئے گندگی ہی کُریدتا ہے۔ لیکن اُس وقت میری شِدّتِ احساس یُوں نُمایاں ہُوئی جیسے کوئی معصُوم تشدُّد کی تاب نہ لا کر سہم جاتا ہے۔

ضرُورتِ حیات، بے چارگیِ حیات، حمایتِ حیات کی تثلیث، بقائے نَفس کی کیسی تمثیل

تھی! قصد و عزم کے فقدان نے اوجِ ہستی کو کس پستی میں لے جا گرایا تھا۔ انسانی زندگی ادا بدلی کا دوسرا نام ہے۔ اِسے کہاں، کیا ہو جاتا ہے؟ مَیں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! یہ صحیح الدماغ رہے تو ایک بات لازم ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ بننے کے لئے عزم صادق چاہیئے۔

اِنسان کی دوسری ضرورتوں کی طرح بھوگ بلاس ایک ضرورت ہے اور واحد ضرورت ہے جو خیال سے ارمان تک اور ارمان پورا ہونے تک لذت آمیز ہے۔ چوں کہ اِس کا آغاز اور دوران اور انجام عشرت دیدہ ہے اِس ضرورت میں نفاست قائم رکھنا مشکل ترین عمل ہے۔ اِس کی فطرت میں ایسی حواس باختگی ہے جو ہر وقت اپنی خوں آشامی پہ ناز کرتی ہے لیکن کبھی اپنی بے صبری کی خاطر جمعی نہیں ہوتی ہے۔

لباسوں کی چمک، گیسوؤں کی مہک، مانگوں کا سیندور، ہونٹوں کے گلاب، اداؤں کی پزیرائی، باتوں کی نغمگی، لہجوں کی دھنک۔۔۔ ہر چیز مدھر مِلن کی طرح تھی۔ وہ حسن مقناطیسی کشش رکھتا تھا اور سراپا نیاز لگتا تھا۔ لیکن وہ مجبوری، جسے اُس نے اپنی رُوح کی گہرائی میں گاڑ رکھا تھا، اُس کی جھلک مَیں نے اپنی رُوح میں دیکھی۔ مَیں اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلا آیا، کمزور کمزور، شرمندہ شرمندہ، اُداس اُداس!

پیارا سنگھ حجرۂ عروسی سے باہر نکلا، مجھے سامنے دیکھ کر زہر بجھے تمسخر سے بولا، کیوں اندر گئے کہ باہر ہی سے باہر آ گئے؟

مَیں گونگا سا کھڑا رہا اور بے کسی سے اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے کسی محرم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر آیا ہے۔ اُس نے میرے جیسے بھوکے پیٹ کو اپنے کھنڈے چاقو سے کاٹا ہے اور بدلے میں اُسے روٹی کا ٹکڑا دیا ہے۔

میری کہانی شروع سے لے کر یہاں تک مجموعۂ اضداد ہے اور یہی میری حقیقت ہے۔ میں اپنی حقیقت کی طرفداری نہیں کرتا ہوں لیکن کوئی اور حقیقت، جسے تمام تر پاکیزگی اور پوری بے عیبی سے منسوب کیا جاتا ہے، حقیقت نہیں ہے۔ جو کوئی ایسی حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے، ریاکار ہے! مکّار ہے!!

پیارا سنگھ کو میری حقیقت معلوم ہوئی اور دُوسرے ہی دِن میرے بارے میں یہ چرچا ہونے لگا کہ مَیں نامرد تھا۔

اپنی نظم 'مادام' میں ساحر لکھتے ہیں،

نورِ سرمایہ سے ہے رُوئے تمدّن کی جِلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پَل سکتی
مُفلسی حسِّ لطافت کو مِٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

اِن اشعار کا مفہوم میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی روشنی میں دیکھتا ہوں اور اپنا نتیجہ اخذ کرتا ہوں۔ اُن سنگدل حالات میں میری حسِّ لطیف مرتے مرتے بچی تو وہ میری فطرت بینی اور سخن رسی کا کمال ہے۔ ورنہ جو کوئی فن کار نہیں، اُسے سوز و گداز سے سروکار نہیں۔ ایسا شخص امیر ہو کہ غریب شجرِ حیات پر ٹھنٹھ ہے، جسے کوئی بہار ہرا نہیں کر سکتی۔

بازارِ ہوس میں جسم اور نوٹ مساوی ہوتے ہیں کیوں کہ ہاتھوں ہاتھ بدلتے ہیں۔ دونوں کے چلن ایک ہیں لیکن انجام جُدا جُدا۔ مسلنے اور مروڑتے پر نوٹوں کی قیمت یکساں رہتی ہے لیکن جسموں کی قیمت گرتی جاتی ہے اور گرتی جاتی ہے اور بازار کی چلا چلی میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جہاں انھیں غیر ضروری اشیا جان کر گوشۂ گمنامی و ناکسی میں پھینک دیا جاتا ہے۔

اُن مَسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیوں کے منظر کا نفسیاتی اثر! میں کئی دِن تک اُداس رہا جیسے اُن کی تقدیر کا ذِمّہ دار میں ہوں۔

باب ۵۷

اِخلاص اُسے راس نہیں ہوتا ہے
قدروں کا اُسے پاس نہیں ہوتا ہے
کس بات میں کیا حُسن ہے؟ کیا معنی ہے؟
کم ظرف کو اِحساس نہیں ہوتا ہے (شاطر)

سانپوں کی سبھا میں زبانوں کی لپالپ مشہور ہے۔ جہاں میں تھا وہاں جتنے مُنہ تھے اُس سے کئی گُنا زیادہ زبانیں تھیں اور ہر زبان کی بے ہودگی دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی۔ میں چُپ رہتا تو مجھ پر

پھبتیاں کسی جاتیں اور بات کرتا تو مجھے جھڑکیاں پڑتیں۔ ہر عمل کا اپنا ردِ عمل ہے، میری بیکاری نئے طریقے سے میری لعنت بن گئی۔ جس کسی کو بازار سے سودا سلف لانا ہوتا، گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹوانا ہوتا، اُس کی نظر مجھی پر پڑتی۔ میری غریبی نے دوسروں کی خدا ترسی کا روپ دھار لیا۔ خدا ترسی، حقارت آمیز رحم دلی کا لطیف انداز ہے۔ میں اُترن اور بچے کھچے کھانے سے نوازا جانے لگا۔

تایا جی کہتے تھے "غریبی سے لڑنے کا عزم ہو تو غریبی نعمت ہے کیوں کہ انسان کی کوشش اس پر زندگی کے اُن نازک پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے جو کسی بھی غور و فکر کی دست رس سے باہر ہیں۔ لیکن جہاں عزم کا فقدان ہو وہاں غریبی فقط لعنت ہے۔"

مجھ میں غریبی سے لڑنے کا عزم تھا لیکن میں اسے لعنت سمجھتا تھا۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ تایا جی زندگی کے جن نازک پہلوؤں کی بات کرتے تھے وہ تخلیقی رویّے کی بصیرت ہے نہ کہ بیکاری کی بے عنوانی۔ جیسے شہرِ فطرت میں ہر شہری کی نفسیات الگ ہے وہی حالت ہر بشر کی ہے۔ میں اپنا موازنہ کس سے کروں؟ میں اُس پودے کی طرح تھا جو دھرتی سے دور دیوار کی دراڑ میں اُگتا ہے اور اپنی غذا دھرتی کے برعکس ہوا سے حاصل کرتا ہے، بھلے پست قامت رہے، ہرا بھرا رہتا ہے میرے تخیّل کی پرواز میری فطری طاقت تھی۔

جو کوئی مجھے کپڑا دیتا، میں اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیتا کہ یہ چھوٹا ہے، یہ بڑا ہے۔ میرے کپڑے جیسے تھے، مجھے اچھے لگتے تھے۔ اِس کی وجہ نرالی ہے! میں اُس جذبے سے پاک تھا جو غریبی کی بدنامی، کم ہمتی اور بد اخلاقی ہے۔ اگر کوئی مجھے کھانا دیتا، میں اُس سے کہتا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ بے انت کور مجھے جس طرح ذلیل کرتی تھی، میرا خیال ہے کہ وہی نفسیات ہر اُس آدمی کی ہے جو کسی کو بچی کھچی چیز دیتا ہے۔ وہ کہتی "گیان، تھوڑا کھانا بچ گیا ہے، کھا لے! ورنہ مجھے کتّے کو ڈالنا پڑے گا۔"

سومتر سنگھ کو گانے اور گنگنانے کا شوق تھا۔ اُس کا من پسند گانا تھا۔

راجا جی کی آئے گی برات
رنگیلی ہو گی رات
مگن میں ناچوں گی

اُس کے ڈھیل منہ سے یہ کومل بول سُن کر میری لطیف حس مجروح ہوتی اور میں اُسے رائے دیتا، "سومتر، تم کوئی دوسرا گانا گایا کرو، اگر یہی گانا ہے تو اِس کے بول یوں بدل لیا کرو۔

کا سویا ہوا کلاونت جاگ پڑتا۔ وہ گانے لگتا۔ گاتے گاتے اُس کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور وہ مجھ سے کہتا
"یار، کچھ تو بھی سُنا! کب تک مجھی سے سُنے گا!"

اُس کے کہنے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے گانے پر میں مجبور کرتا تھا اور دم نہ لینے
دیتا تھا، لیکن سچائی اِس کے اُلٹ ہے۔ میں دِل میں کُڑھتا تھا کہ وہ مجھے موقع نہیں دے رہا ہے۔

ایک رات، چاند گھٹنوں پر رینگتے رینگتے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اُس کا مدقوق چہرہ
ایسے روشن ہو گیا تھا جیسے بیمار مسافر شوقِ سفر سے تازہ رُو ہو گیا ہو۔ جنوری کے جاڑے کی بھینی بھینی
خوشبو فضا میں رچی بسی تھی۔ ہوا کا رُخ تک بدلا ہوا تھا جیسے وہ ریگڑھ پورہ کی ساری گندگی کو سمیٹ
کر انسانی بود و باش سے دُور لے جا کر دفن کر رہی ہو۔ اِس فیاض ماحول میں میرے دِل کی حالت اُس نامراد
کی سی تھی جو کسی سخی کے دروازے پر بے نیل و مرام کھڑا ہو۔ میں نے ہیر کی دُھن چھیڑی، جس
میں کسک ہی کسک تھی۔

گیا بھجّ تقدیر دے نال ٹھوٹھا	(او جوگی، تیرا پیالہ مجھ سے ٹوٹ گیا ہے اور تقدیر کو یہی منظور تھا
ساتوں تُو لے جا قیمت مٹّ دی وے	(تو چاہے تو میں تجھے گھڑے کی قیمت دے سکتی ہوں۔
تقدیر اللہ بِن کون روکے	(تقدیر کو اللہ کے سوائے اور کون روک سکتا ہے!
تقدیر پہاڑاں نُوں پٹ دی وے	(تقدیر پہاڑوں تک کو اُکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔
یُوسف جہے پیغمبراں زادیاں نوں	(تقدیر اتنی بلوان ہے کہ اس نے یوسف جیسے
تقدیر کھُوہے وِچ سٹ دی وے	(پیغمبر زادے کو کنوئیں میں پھنکوا دیا تھا۔
سُلیمان جھوکے بھٹ ماچھیاں دا	(تقدیر ہی نے سُلیمان کو تخت پر بٹھایا اور پھر
تخت چاڑھ تقدیر اُلٹ دی وے	(اُس سے تخت چھین لیا۔
داڑھی مُنڈ تقدیر ۔ ۔ ۔	(داڑھی مونڈ کر تقدیر ۔ ۔ ۔

"ارے وہ دیکھ، کون کھڑا ہے؟" سومِتّر نے مجھے ٹھوکا دے کر کہا۔

اُس کی بے صبری نے اِس چھوٹے سے جُملے کو اور بھی چھوٹا کر دیا۔ میری لے میرے گلے میں
ایسے ڈُوب گئی جیسے رگِ آواز ٹوٹ گئی ہو۔ اُس کی بے جا مُداخلت مجھے بُری لگی اور میں نے اُدھر
دیکھے بغیر جھلّا کر کہا، "کون ہے! ہوگا کوئی! مجھے کیا لینا ہے اُس سے؟"

"پاگل! وہ تیرا ماما سردن سنگھ ہے!" اُس نے سانس روک کر جوش سے کہا۔ اُس نے سانس
لی تو اُس کی آواز صاف سُنائی دی۔

مَیں نے چونک کر ماما جی کو دیکھا۔ وُہ قمیض شلوار پہنے ہُوئے وہاں سے کچھ دُوری پر کھڑے تھے۔ اُن کی طُرّہ دار پگڑی، دراز قامتی کو اَور دراز کر رہی تھی۔ وُہ میرے سگے ماما نہ تھے، میری ماں کے پھُپھیرے بھائی تھے۔ وُہ جہاں کھڑے تھے اُس کا پس منظر ویران اَور سُنسان تھا۔ اُنھیں اکیلے دیکھ کر گُمان گُزرتا تھا کہ وُہ کسی کارواں سے بچھڑے ہُوئے مسافر ہیں۔ قارئین، وُہ کارواں ہی کے فرد تھے۔ آج بُوا مُٹھی بھر آٹا گُوندھتی ہُوئی اگلے دِنوں کو یاد کر کے کہتی "مَیں پُورے بیس مُونہوں کے لئے پرات بھر آٹا گُوندھتی تھی اَور لوہ پر روٹیاں پکاتی تھی۔ جب سارا پریوار ایک ساتھ کھانے بیٹھتا تھا، بھاگ بھری لوہ چھوٹی پڑتی تھی۔ آج مُوا توا بڑا لگتا ہے! مَیں مر سکوں تو آج مر جاؤں!"

وُہ آہ بھر کر اپنی بات پُوری کرتی اَور کئی بار گھُٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگتی اَور روتی رہتی، روتی رہتی اَور کسی کے دِلاسا دینے تک روتی رہتی۔ اُس کا پُورا پریوار کوئٹے کے یکم مئی، ۱۹۳۵ کے بھونچال میں دَب کر مر گیا تھا۔ اُس آفتِ آسمانی سے ایک سَرَوَن سنگھ بچا تھا۔ دَھنّا سنگھ بُوا کا بڑا لڑکا تھا جو اپنے ڈِیل ڈَول اَور حوصلے کی وجہ سے پرشرام کہلاتا تھا۔ اُسے یہ نام اُس کے یاروں نے اِس لئے دیا تھا کہ وُہ کلہاڑا چلانے میں ماہر تھا۔ لکڑی کے جِن مُگدروں سے وُہ ورزش کرتا تھا اُنھیں سیسا پِلایا ہُوا تھا۔ مَیں نے وُہ مُگدر دیکھے تھے۔ جب تک بُوا جیتی رہی، اُن مُگدروں کو سینے سے لگا لگا کر روتی رہی۔ گھر میں کوئی مہمان آتا، وُہ پہلے اُسے، اُن کے پاس لے جاتی جیسے وُہ تبرکات ہوں اَور جائے اِظہارِ عقیدت۔

دَھنّا سنگھ اَور میرے بھایا جی ٹھیکیدار سُندر داس کے پاس کام کرتے تھے۔ دَھنّا سنگھ اڈّے کے کام میں یکتا تھا اَور بھایا جی باہر کے کام میں۔ سنٹرنگ کا کام تھا اَور اِتفاق یُوں ہُوا کہ وُہ دونوں ہم رتبہ کمروں کا کام آمنے سامنے کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں مُقابلے کی بات چل نکلی اَور اُن دونوں میں ٹھن گئی۔ اُس معرکے کی تفصیل بھایا جی یُوں بیان کرتے ہیں۔ مَیں لچکدار اَور پھُرتیلا، دَھنّا سنگھ سخت اَور طاقت ور، آغاز ہی میں انجام کی دُہائی مچ گئی۔ لکڑی میں آری، مکھن میں چھُری کی طرح اُترتی۔ ہتھوڑی کی پہلی چوٹ میں میخ کھڑی اَور دُوسری میں لکڑی کے اندر، بیٹھے بیٹھے اُچک کر اِدھر اَور اِدھر سے لپک کر اُدھر، پسینہ پُونچھنا منظور نہ تھا۔ اِس قدم پسینہ بہتا اَور اُس قدم ٹپکتا۔ آنکھوں میں نمک، مُنہ میں نمک، ناک میں نمک ـــ بدن لبریز نمکدان کی طرح چھلکتا تھا۔ سنٹرنگ، آری، ہتوڑے اَور کیل کا کام ہے۔ ہر کام میں نکتہ ہوتا ہے جو مُقابلے کے کام میں بہت کام آتا ہے۔ مَیں ڈبے سے زِیادہ کیلیں اُٹھاتا اَور مُنہ میں رکھتا اَور پھر مُنہ سے کیل لیتا۔ مُنہ

اور ہاتھ میں وہ رشتہ ہے جو زبان اور بات میں، دھنّا سنگھ کیل کیل پچھڑنے لگا۔ وہ اپنے کام کے وسط میں تھا کہ میں نے اپنا کام ختم کیا، اُس پر آوازہ کسا اور بکرا بُلا دیا۔ اُس نے کام وہیں چھوڑا، کلہاڑا اُٹھایا اور مجھے مارنے کے لئے دوڑا۔ دوسروں نے اُسے روکا لیکن وہ نہ رُکا اور مجھے کوئٹہ چھوڑنا پڑا۔"

بھایا جی کے گاؤں چلے آنے کے کچھ ہی دن بعد بھونچال آیا اور تباہی مچا گیا۔ اُس خوں چکاں اور دردناک حادثے کو کسی نے نظم کیا ہے جو مجھے کسی حد تک آج بھی یاد ہے۔ اُس طویل نظم کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے،

کوئٹہ کل سی شکل گلزار دی

اوہنوں موت سی جھاتیاں ماردی

(کوئٹہ کل گلزار کی صورت دکھائی دیتا تھا لیکن موت اُس کی تاک میں کھڑی تھی)

جب وہ زلزلہ آیا تو تایا جی وہاں تھے۔ وہ اُس کی تفصیل جیسے بیان کرتے تھے، وہ اُس کی پیش گوئی ہے۔

رات کا دوسرا پہر تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ اچانک کتّے رونے لگے اور پرندے انوکھی سی بولیاں بولنے لگے میں نے کرتار سنگھ کو جگایا اور اُسے کمرے سے باہر لے آیا کیوں کہ مجھے لگا کہ بھونچال آنے والا ہے۔ ہمارے کٹڑے کے احاطے میں اخروٹ کا درخت تھا جس کے پیروں میں کیڑیوں کا بھون تھا۔ دھرتی میں رہنے والے کیڑوں مکوڑوں کو بھونچال آنے کی خبر پہلے سے ہو جاتی ہے۔ کیڑیاں بھون سے نکل کر کالی چادر کی طرح پھیل رہی تھیں۔ ہم نے کہیں چلّا کر اور کہیں دروازے پیٹ کر لوگوں کو جگایا۔ جو جلدی سے نکل آئے، نکل آئے، باقی سب دب گئے۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ ہم کھڑے کھڑے لڑکھڑا گئے۔ صحن میں اخروٹ کا درخت جھک کر سیدھا ہوا اور ایسے کئی جھٹکے لگے۔ سب مکان ڈھے گئے۔ ہمارے گاؤں کے باسٹھ لوگ مرے تھے، جن میں سے آٹھ ہمارے گھر سے تھے۔ گربخش سنگھ، اُس کی بیوی دھنتی، اُس کے چار بچے، ماڑا سنگھ اور ملکھی رام کا بڑا بیٹا ہیم سنگھ۔

ماما جی کو میں نے دیکھا نہ تھا لیکن اُن کے بارے میں، میں کیا کیا کچھ جانتا تھا۔ اُن کی بیوی بھاگ ونتی نہایت بدکلام اور منہ زور تھی جس کی تاب نہ لا کر وہ گھر سے بھاگ گئے تھے اور لاپتا تھے۔ اُن کے اِس سخت فیصلے کی ایک وجہ اور تھی۔ بھاگ ونتی اُن کی ماں کی روٹی نہ پکاتی تھی۔ اُنھوں نے اُس پر ہر سختی برتی تھی لیکن وہ ہٹ کی پوری نکلی تھی۔

اِنسان کے بیدردانہ رَدّیے ، اندھے عقیدے ہیں اَور نوعِ انسان کی ہر مُصیبت کے مُواخذ دار ۔ ایسے جذبوں کو پالنے والے نہ دلیل سے راغب ہوتے ہیں اَور نہ سزا سے ۔ اِن کی انوکھی فطرت! یہ ہر ظُلم کو اُسی بے حِسی سے بَرداشت کرتے ہیں جِس بیدردی سے کسی پر ظُلم ڈھاتے ہیں ۔ ہر فرقے کی تاریخ ایسے رَزمیوں سے بھری پڑی ہَے ۔ ایسے لوگوں کے تعصّب اَور جہالت کی اِنتہا ! یہ اپنے بزرگوں کی حماقتوں کو تہذیب کا سرمایہ سمجھتے ہیں اَور اُن پر ناز کرتے ہیں ۔ برہمنوں میں کہاوت ہَے کہ شُودر کا مارنا پُورا پُن اَور برہمن کا مارنا پُورا پاپ ہَے ۔ اِقبال اپنے اَسلاف کی دَرِندگی میں بُزرگی دیکھتا ہَے اَور اُس کا قصیدہ پڑھتا ہَے ۔

تُو ہی کہہ دے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کِس نے ؟ شہرِ قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سَر کِس نے ؟
توڑے مخلوق ، خُداوندوں کے پیکر کِس نے ؟ کاٹ کر رکھ دیئے کفّار کے لشکر کِس نے ؟

کِس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو ؟
کِس نے پھر تازہ کیا تذکرۂ یزداں کو ؟

ایک دھرم کے ماننے والے دُوسرے کو ادھرمی جانتے ہیں ۔ دُنیا میں کتنے مَذہب ہیں اَور ہر کوئی اپنے مَذہب کی یکتائی پر ناز کرتا ہَے اَور اُسی کی برتری کا دم بھرتا ہَے ۔ اِقبال کی شیخی اَور تعلّی کا مطلب یہ ہَے کہ اُٹھو اَور اپنے عقیدے کو عام کرنے کے لئے دُوسروں کو نیست و نابُود کر دو ۔ ایسے پاگل پن کا ردِّ عمل اُلٹا بھی ممکن ہَے ۔ ساحر اَپنی نظم پرچھائیاں میں کِس پیش بیں اِحساس سے آگاہ کرتا ہَے ۔

گُذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اِس بار
عجب نہیں ہیں کہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گُذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اِس بار
عجب نہیں ہیں کہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

خُدا کو خالقِ کُل ، اِدراکِ کُل ، اَسرارِ کُل کا سَرچشمہ کہا جاتا ہَے ۔ اُس کے بارے میں ، میرے دِل میں کئی سُوال اُٹھتے ہیں ، مَیں صرف دو پہ اکتفا کرتا ہُوں ۔

دُنیائے حیات میں ہر ذی حیات اپنے بچّوں کی حِفاظت کرتا ہَے اَور اُنھیں مُسلسل دیکھنا چاہتا ہَے ۔ کیا خُدا ہر جانی پہچانی حقیر شَے سے زیادہ حقیر ہے جو یہ اپنی آل اولاد کو پامال کرنا چاہتا ہَے ؟ !

کب تک اِنسان اپنے عَمل کا ذمّہ دار ، خُدا کو ٹھہرائے گا ؟ اپنے نیست و نابُود ہونے تک ؟ !

ایک روز میں اَپنی ماں کے ساتھ ہریانہ جا رہا تھا ۔ اُدھر سے بھاگ وَنتی آ رہی تھی ، ہمیں

ڈی ۔ اے ۔ وی ۔ ہائی سکول کے پاس ملی ۔ وُہ اِتنی خُوبصورت تھی کہ اُسے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا ۔
ایک دو رسمی باتیں کر کے ماں نے اَزراہِ ہمدردی پُوچھا، "بھابی! بھائی صاحب کی کوئی خبر ملی ہے؟"

"ملی ہے!"

اُس نے اِتنی عُجلت سے کہا جیسے وُہ خبر دینے کے لئے بے تاب ہو ۔

"کہاں ہے؟"

ماں کے لہجے کی بے قراری اُس شخص کی سی تھی جسے اپنے کھوئے ہُوئے عزیز کی تھانگ ملی ہو اَور وُہ اُس کے بارے میں مزید جاننے کا تمنّائی ہو ۔

"اپنی ماں کی ۔۔۔ میں!"

اس نے یہ پانچ لفظ جتنی تیزی سے کہے اُتنی تیزی سے وُہ اپنی راہ پر آگے بڑھ گئی ۔ میری ماں اپنے پاؤں پر گڑ سی گئی ۔ وُہ اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہُوئی میرے کاندھے پر لڑھک گئی اَور میرے سہارا دینے کے باوجُود زمین پر ڈھے پڑی جیسے ناگہاں بیمار ہو گئی ہو ۔ وُہ سر کو ہاتھوں میں پکڑے کتنی دیر یوں ہی بیٹھی رہی ۔

مَیں نے اُس روز پہلی بار سرون سنگھ کو نالی کے پُل سے پرے کھڑے چاند کی روشنی میں دیکھا تھا لیکن مَیں اُنہیں برسوں سے جانتا تھا ۔ اِنسانی رِشتوں کا فسُوں! میں نے دوڑ کر اُن کے پاؤں چھُوئے اَور بولا، "ماما جی، ست سری اکال!"

وُہ نیچے جھُکے اَور مجھے باہوں میں لے کر درد بھرے لہجے میں بولے، "بیٹا! تو کون ہے؟ مَیں نے پہچانا نہیں ۔"

وُہ کیسے پہچانتے مجھے؟ مَیں نے خُود اُنھیں سوتر سنگھ کی وساطت سے پہچانا تھا ۔ جُوں ہی مَیں نے اپنی پہچان کروائی، اُنھوں نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اُوپر اُٹھایا، غور سے دیکھا اَور نیچے اُتار کر سینے سے لگا لیا جیسے میری دید اُن کی دِلی تسکین کا باعث نہ ہُوئی ہو ۔

"بہن کیسی ہے؟"

اُنھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اُن کا ہاتھ اِتنا بڑا تھا کہ میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں گُم ہو گیا ۔ مَیں اُن کے سامنے کھڑا بونا لگتا تھا اَور گردن اُوپر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھتا تھا ۔

"اچھی ہے!"

"اَور جنوائی بھائی؟"

"وہ بھی اچھے ہیں!"

"ہیر کون گا رہا تھا؟"

اُنھوں نے سومتر سنگھ کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہیں پُل پر بیٹھا ہُوا تھا۔

"مَیں! مَیں گا رہا تھا!" مَیں نے خُوشی سے لپک کر کہا۔

چل آ، وہیں بیٹھتے ہیں اور ہیر سُنتے ہیں۔ تُو خُوب گاتا ہے!" اُنھوں نے میری پیٹھ تھپک کر پُل کی جانب بڑھتے ہُوئے کہا۔ "مَیں دُور اُس سڑک پر جا رہا تھا،" اُنھوں نے اُس سڑک کی طرف اِشارہ کیا جو ریگڑھ پُورہ سے آنند پربت کو جاتی تھی، "مَیں نے ہیر سُنی اور اِدھر لوٹ آیا۔"

ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سومتر سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مَیں نے اُسے ماما جی سے مُتعارف کروایا۔ اور پھر ہم تینوں اُسی چھوٹے سے پُل پر بیٹھ گئے۔ ماما جی نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا "باتیں پھر کریں گے، پہلے ہیر سُنیں گے!"

مَیں نے محسُوس کیا کہ مَیں بڑا گویّا ہُوں اور مجھے اپنے فن کا کمال دِکھانا ہے۔ مَیں اُن کے پہلُو سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور عین گویّے کی طرح کھانس کھنکار کر گانے لگا۔ وہ پُورا بند مَیں نے دوبارہ سُنایا اور اور اُس کے بعد ایک بند اور۔ اُس گھڑی کی سُہانی یاد مجھے یہ کہنے پر اُکساتی ہے کہ اگر اُستاد وارث شاہ زندہ ہوتے اور اُس وقت اپنا کلام میری زبانی سُنتے تو اُس کے سوز و گداز اور گہرائی و گیرائی پر حیران رہ جاتے کیوں کہ جہاں اُنھوں نے اپنے نفسِ مضمون کے لئے صحیح الفاظ کا صحیح اِنتخاب کیا وہاں مَیں نے اُنھیں اپنے حُسنِ بیاں سے کمالِ معنی تک پُہنچا دیا۔ وہ اپنے وجُود کی حدیں توڑ کر کائناتی وُسعت اِختیار کر گئے۔ شاعری، سنگیت ہے اور الفاظ، سُر لیکن اُنھیں یہ مرتبہ دلانے کے لئے سنگیت کار کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ فن اُسی حالت میں تخلیق کیا جا سکتا ہے جب فن کار کو معاشی فراغت حاصل ہو یا اُس کا فن، معاش پیدا کرنے کا ذریعہ ہو۔ اُن دونوں میں سے ہر وسیلہ حُسنِ ایجاد کا فروغ تو نہیں ہے لیکن تحریک ضرور ہے اور تحریک میں اِحساس کی مِلاوٹ ہو تو کمال تک پُہنچنا آسان ہے۔ حسّاس فن کار کی نفسیاتی کیفیت رحِم مادر کی سی ہے، جس کی اپنی تکلیف، تخلیقی وِجدان کی طاقت اور بے قراری ہوتی ہے۔

دُوسرے سارے فن، فن کاروں ہی کی ماہیّتِ قلب کے ذِمّہ دار ہوتے ہیں اور اُنھیں کے جذبات کو بے محیط کرتے ہیں اور اُنھیں کی مسرت کا باعث بنتے ہیں لیکن نغمہ و رقص کا مُعاملہ الگ ہے یہ جِتنا فن کاروں کو مسحُور کرتے ہیں اُتنا ہی تماشائیوں کو کیوں کہ اِن کا راست رِشتہ جذبات سے ہے۔

اِن فنون اور دوسرے فنون میں وہی فرق ہے جو گفتہ اور نوشتہ میں ۔ نوشتہ تاریخ سے منسوب ہے اور گفتہ وقت سے ۔ تاریخ منجمد ہے اور وقت متحرک اور وہ شے جو حرکت کرتی ہے ، دل رُبا اور دل گداز ہوتی ہے۔

ماما جی ، میرا نغمہ سنتے سنتے محجوب ہو گئے ۔ وہ اپنے دل فریب وجد اور دل نواز کیفیت سے اُبھرے تو انھوں نے مجھے بے تکلف سراہا اور پیار کیا ۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا ۔ اپنی سرفرازی میں مجھے لگا کہ میرا غم میرا واہمہ ہے ۔ پہلی بار مجھے اپنی ناداری بُری نہ لگی ۔ مجھے لگا ، آدمی کی معاشی حالت کیسی بھی ہو ، وہ اپنے فن سے خود پرور ہے ۔ معمولیت ، مجہولیت اور کمالیت ، رجولیت ہے ۔ اب سے میں بچے کی طرح نہیں تھا ، جس کی قوتِ ارادی نہیں ہوتی ۔ میری آتشِ شوق تیز تر ہو گئی ۔ زندگی رواں دواں اور ہر لمحہ تغیّر پزیر ہے اِس لئے حال ، مستقبل کا پُل ہے ۔ وہ پُل کتنا انوکھا ہے ! میں اُس کی تلاش شہر میں کرتا تھا لیکن وہ اُس ویرانے میں میری راہ دیکھ رہا تھا ۔ ماما جی پٹی بلڈنگ کنٹریکٹر تھے اور پالم کے ہوائی اڈّے پر بارکیں بناتے تھے ۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کام پر بُلا گئے اور دس روپے رونمائی کے طور پہ دے گئے ۔ میری جذباتی حالت اُس پیاسے کی سی تھی جو سراب کا پیچھا کرتے کرتے چشمے پر پہنچ جائے ۔ دوسرے دن میں نے راجگیری کے اوزار خریدے اور ذرا دیر سے کام پر پہنچا ۔ ماما جی میری راہ دیکھ رہے تھے اور کچھ پریشان سے تھے ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے اور مجھے سُرجیت سنگھ کے حوالے کر دیا ۔ انھوں نے اُسے سمجھا دیا کہ اسے مجھے کام سکھانا ہے ۔ یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا ۔ ماما جی کو وقت ملتا تو وہ خود مجھے کام کے نکتے سمجھاتے ۔ ایک دن اُنھوں نے کہا ، " محراب میں فانے کی اہمیت تالے میں چابی کی سی ہے ۔ فانہ ٹھیک لگا کہ ہو تو محراب ، تالے کی طرح بند رہے گی اور توڑنے ہی سے کھُلے گی ۔ " ریگر ڈھ پورہ سے پالم کافی دور ہے ۔ میرا خروش ! مجھے بالکل پاس جان پڑتا ۔ میری ذاتی اور جذباتی کیفیت کا چمتکار ! پہروں لمبا دن ، لمحوں اور ہفتہ ، پہروں میں سُکڑ گیا اور پندری (دو ہفتے کے بعد اُجرت ملنے کی تاریخ) آ گئی ۔ مجھے پورے کاریگر کی اُجرت ملی ۔ میری بے قراری اُدھے غریب کی سی تھی جو کسی نہ کسی طریقے سے اپنی غریبی کے دھبّے دھونے کی فکر میں رہتا ہے ۔ میں نے احاطے میں مٹھائی بانٹی ۔ بے انت کور میرے لاابالی پن پر ایسے ہنسی کہ اُس کے دانت مسوڑوں میں سے اُٹھ کر ہونٹوں پر بیٹھ گئے ۔

بے انت کور میرے تایا جی کی بڑی بہو تھی اور بڑی چرتر ہار تھی ۔ وہ سارا دن چہکتی مہکتی ۔ مٹی پلید کرتار سنگھ کے گھر لوٹنے کا وقت قریب آتا تو بجھاتے ہوئے کوئلے کی طرح ٹھپ ہو جاتی ۔ بیٹھے بیٹھے اُس کے دَرد اُٹھ کھڑا ہوتا اور وہ اَٹوانی کھٹوانی لے کر لیٹ جاتی ۔ اُس کا دَرد

درد نہ تھا، ابنِ سبیل تھا جو آج یہاں اور کل وہاں بسیرا کرتا ہے۔ اُس دن وہ وقت بھلے چنگے بیت گیا جیسے درد اپنا چلن بھول گیا ہو۔ اُسے خلافِ معمول دیکھ کر کرتار سنگھ نے پوچھا، "جوگندر کی ماں، اودھم سنگھ گاؤں سے واپس آگیا ہے کیا؟"

اُس نے ٹھیک ہی پوچھا تھا! جس دن بے انت کور کا بھائی اودھم سنگھ ناگپور سے آیا تھا، وہ اُسی طرح مسکرائی تھی جیسے اُس وقت۔ اُس کا چہرہ ایسا بھونڈا تھا کہ مسکراہٹ ہی ہیں قابلِ برداشت ہوتا تھا۔ نتھنے پھول کر پھیل جاتے اور طوطے جیسی ناک ذرا چپٹی ہو کر خوبصورت لگتی۔ اپنے اونچے جبڑے کو چھپانے کے لئے وہ موٹے بھدّے ہونٹ غیر فطری طور پر آگے بڑھائے رکھتی تھی۔ مسکرانے سے وہ تناؤ جاتا رہتا، چند کی نرمی دانتوں اور ہونٹوں پر چھا جاتی اور دونوں اپنی اپنی جگہ اچھے لگتے۔ بڑی بڑی آنکھیں نوچنے کے سے انداز میں جھانکتی رہتی تھیں۔ اُس رَو میں وہ اپنی بدشعاری بھول جاتیں اور نرم جذبات سے رسی بسی لگتیں۔ اُس رواروی میں گالوں کی خودکاری دیکھنے کے قابل ہوتی! وہ اپنے پیلے پن میں ہلکا سا سیندور ملا لیتے اور گندمی نظر آتے۔

جب کبھی ایسا ہوتا رنگیڑ پورہ کی فضا میں تناؤ بڑھ جاتا۔ اصول سے دیکھا جائے تو تناؤ کم ہونا چاہیئے۔ وہ ذلیل فضا ایسی پیچیدہ تھی جس کا تسلّط صرف دو طریقے سے ٹوٹتا تھا۔ ایک جب بے انت کور کراہتی تھی اور دوسرے جب دو پڑوسی آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔

اودھم سنگھ نے وہاں جتنے دن قیام کیا، بے انت کور کا درد حیلہ باز سویا رہا۔ اور وہ بات بے بات مسکراتی رہی۔ باہر سے انگیٹھی اٹھا کر اندر لانا تو بڑی بات ہے، اُس نے کرتار سنگھ کو انگیٹھی بھرنے اور سلگانے تک کا موقعہ نہ دیا۔ وہ اُن کاموں کو سالہا سال سے دست کاری کی سی نفاست سے کرتا آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے بیدار ہوتا، کوئلہ پھوڑتا، کوئلہ رولتا، چورا جدا کرتا اور جھنجھری پر بچّریں اور برادہ رکھ کر انگیٹھی بھرتا۔ وہ اُسے اُٹھا کر سڑک میں لے جاتا اور اُس کا منہ اُدھر رکھتا جدھر سے ہوا کا رُخ ہوتا۔ وہ انگیٹھی کو آگ دیتا اور کوئلوں میں سے لپکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر خوش ہوتا جیسے وہ اُس کا کوئی دبا ہوا جذبہ ہو۔ اُس کے نہانے اور انگیٹھی سلگنے کا تال میل شاید ہی ٹوٹتا تھا۔ اُسے قائم رکھنے کے لئے وہ جو احتیاط برتتا تھا، وہ یہ تھی کہ وہ ہوا کا دباؤ پرکھ کر چمنی، انگیٹھی پر رکھتا تھا۔ اِس چوکسی کے باوجود کبھی انگیٹھی نہ جلتی۔ وہ اُس وقت جو ترکیب کام میں لاتا، اُس کی اہمیت تازہ خیال کی سی ہے۔ وہ کوئلوں پر تھوڑا سا نمک چھڑک دیتا۔ کوئلے پٹ پٹ، پڑ پڑ کرتے ہوئے ہلنے لگتے جیسے خود شعلوں کو ہوا دینے لگے ہوں۔ ایک ماہ میں ایک بار کرتار سنگھ اپنے معمول کو تبدیل کرتا، جس کا مقصد اپنے معمول کو پابندی سے قائم رکھنا اور

اُس غلاظت کو سمیٹتا ہوتا جو چوُرے کی شکل میں بڑھتی جاتی تھی۔ اُس دِن وُہ رات کو تیسرے پہر جاگ جاتا گوالے کے گھر سے گوبر لاتا، اُسے کوئلے کے چوُرے میں گوُندھتا اور گوئے بنا کر چھت پر رکھتا۔ گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام اُس کی زِندگی کا بے ندامت معمُول تھا، جس کے بدل جانے سے وُہ اَدھورا لگتا تھا۔ وُہ چارپائی پر بیٹھ کر بے اَنت کور کو دیکھتا جیسے کوئی بیمار حسرت سے صحّت مند کو دیکھے۔ اُدھم سنگھ کے جاتے ہی اُس کا معمُول لوٹ آیا اور وُہ اُس میں گھر کر مکمّل نظر آنے لگا۔

کرتار سنگھ کے غیر متوقّع سوال نے بے اَنت کور کو اُلجھا دیا۔ اُس نے اُسے غصّے سے دیکھا اور پھر اپنے آپ پر قابُو پا کر کہا، "ناں جی! آج گیان کو پنڈری ملی ہے اور اُس نے مٹھائی بانٹی ہے!"

بے اَنت کور کے چہرے پر عجیب سی نرمی چھا گئی۔ وُہ کیفیّت اُس کی تب ہوتی تھی جب وُہ شاخیں کھنچوا کر آرام سے لیٹ رہی ہوتی تھی۔ وُہ کہتی تھی کہ اُسے فاسد خوُن کی شکایت ہے۔ جب وُہ گاؤں میں تھی، مَیں اُس کے لئے جونکیں پکڑ کر لاتا تھا اور اُنھیں نچوڑ کر اُس کی پنڈلیوں پر لگاتا تھا۔

میرے کپڑے غور طلب تھے لیکن میرا دِھیان کہیں اور تھا، اُن رُوپوں پر جو بھائیا جی نے مُجھے گھر سے نِکالتے وقت دیئے تھے۔ قارئین، دیئے کہاں تھے! میرا مُنہ چڑا کر میرے مُنہ پر مارے تھے۔ وُہ ذلیل رُوپے مُجھ پر جلتا ہُوا بوجھ تھے جسے اُتار کر پھینکتے وقت مَیں نفرت و محبّت کے جِس ہنگامے سے گزرا تھا، مَیں ہی جانتا ہوں۔

کئی قرار دادیں نامعقُول ہو کر معقُول اور صحیح ہو کر غلط ہوتی ہیں۔ نازک فرق یہ ہے کہ خاص حالات میں اُن کا تجزیہ کرنا مُحال ہوتا ہے۔ آم اپنی شیرینی سے بے بہرہ ہے اور حنظل اپنی تلخی سے! اِسی طرح آدمی کے جذبات کی بھلائی اور بُرائی ہے۔ وُہ رشتے ناتے جو زنجیر سے مضبُوط ہوتے ہیں، شدّتِ جذبات کے ایک ہی جھٹکے سے ٹوُٹ جاتے ہیں۔ محبّت و نفرت کی دُنیا نرالی ہے! میری بات میں کتنی سچائی ہے؟ اِس کا فیصلہ آپ کریں، مَیں وُہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے اِس اِحساس کی تحریک ہے۔

ہم پانچ بھائی ہیں لیکن اکیلا مَیں ہی ہوُں جو ماں باپ کی خِدمت لگاتار کرتا آیا ہوُں۔ ایک تقریب میں ہم سب اِکٹھے تھے۔ بڑے بھائی اجیت سنگھ نے تجویز رکھی کہ ہر کوئی ماں باپ کو پچاس روپے مہینہ بھیجا کرے۔ مَیں نے کہا کہ اِتنے کیوں! ایک سو بھیجو، جِتنے میں بھیج ہی رہا ہوُں۔ میرے اِتنا کہتے ہی بات بگڑ گئی جیسے مَیں نے اُنھیں گالی دے دی ہو۔ میرے بھائیا جی نے بھی مُجھے ہی لتاڑا، "تو اپنے رُوپے اپنے پاس رکھ! مُجھے نہیں چاہیئے تیرے رُوپے! مَیں بھوکا مر جاؤں گا لیکن تیری دی ہُوئی بھیک نہیں کھاؤں گا!"

اُن کے یہ کہتے ہی ہر کوئی مجھ پر برس پڑا لیکن کسی نے اُن سے یہ نہ پُوچھا کہ اُن کی کھوکھلی نکتہ چینی کا کیا مطلب ہے؟ میری مُعاملہ فہمی میری پریشانی بن گئی اور مَیں اپنے سکُون کے لئے ایک گوشے میں سمٹ رہا۔ مَیں نے اپنے رویّے کے بارے میں ہر زاویے سے سوچا اور بھائیوں کی مُخالفت کو اُن کے احساسِ کمتری سے تعبیر کیا لیکن بھائیا جی کا چلن میری سمجھ میں نہ آیا۔ مَیں نے اپنے دِل پر پتھر رکھ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ جو اچھے اور بُرے میں اِمتیاز نہ کر سکے، وُہ جیئے یا مرے، میری بَلا سے! مَیں وہیں پڑا رہا اور اپنے بدصُورت خیالوں کے گھناؤنے چہرے دیکھ کر خُود سے اُلجھتا رہا۔ مُجھے تایا جی کی یاد آئی اور مَیں نے اُن کے خیالوں میں پناہ لینی چاہی۔ وُہ کہتے تھے، "اپنی ضرورت کے لئے اِنسان نے طرح طرح کے اَلفاظ ایجاد کئے ہیں اور شکریہ اُسی سِلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اِحسان مند اپنے محسن کا شُکریہ ادا کرتا ہے تو یہ اپنے ساتھ اُس کی رُوح کو بھی قبض پہنچاتا ہے۔"

اِنسان کی ہر فراست کی حقیقت اِس کے عمل سے ہے، وَرنہ یہ بے وجُود ہے۔ سُریندر کور میرے لئے کھانا لائی مَیں رُکھائی سے پیش آیا اور کھانے سے اِنکار کر دیا۔ اُس نے اِصرار کیا تو مَیں نے تھالی پرے دھکیل کر نیچے گرا دی۔ وُہ بسورنے لگی۔ میری کٹھورتا! مَیں نے اُسے بسورنے دیا اور اُس سے مُنہ پھیر کر لیٹ گیا۔

خُوبصُورت سے خُوبصُورت شَے بھی اپنی مسخ شُدہ حالت میں گھناؤنی ہوتی ہے، یہی صُورت نازک جذبے کی ہے۔ اِسے کچل دیا جائے تو یہ بے حسی کی شکل میں اُبھرتا ہے جو اِنسان کا بدترین ہے۔ میری ماں کو اطلاع ہوئی، وُہ میرے پاس آئی۔ مَیں نے اُس کی طرف دِھیان نہ دیا اور جیسے پڑا تھا، پڑا رہا۔ وُہ میری بے ہُودگی کو نظر انداز کر کے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میری رنجش دُور نہ ہُوئی، وُہ میرے اَور قریب کھسک آئی اور میرے سر کو آغوش میں لے کر میرے کیس سہلانے لگی۔ اُس کے سُتھرے اَور کھرے سلُوک سے میرے مُردہ دِل میں جان پڑ گئی۔ اُس کی رغبت میں نوائے اِحساس کی وُہ لے تھی جس کی لطافت کی بالیدگی، تخلیقی لمحے میں فن کار کا خلوص ہوتا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا، "مَیں پیٹ سے تھی بھاری کام کرنے سے مجھے خُون پڑنے لگا۔ گاؤں میں دوا دارُو کہاں! مَیں نے دائی کو بلایا۔ اُس نے فرش پر بستر لگا کر پائنتی کو اُوپر اُٹھایا اور مجھے اُس پر لٹا دیا۔ مجھے فراش دیکھ کر تیرے بھائیے کا پارہ چڑھ گیا۔ تُو جانتا ہے! وُہ ویسے ہی کُتیے، بیٹے کے نام سے دُھتکارتے رہتے ہیں، اُن حالات میں میری کیا دُرگت بنی ہوگی؟ مَیں کام کرنے کے لئے اُٹھتی تو سنتی (میری دائی) اگر بھ بات کا ڈر دیتی۔ بھائیا جی (میری ماں میرے تایا جی کو بھائیا جی کہتی تھی) نے اشوک چھال کا سفُوف دُودھ کے ساتھ تجویز کیا لیکن بیماری آتی ہے

تو جاتے جاتے جاتی ہے۔ مَیں نے بنتا رام کو تیرے ننھیال دوڑایا، وہ اُسی دِن تیری نانی کو لے آیا جب تک تیری تائی ماں نے کام چلایا۔ وہ دُکھ مَیں نے کئی مہینے بھوگا اور گرو کرپا سے پیٹ گرتے گرتے بچا!" اُس کی باتوں میں تسکینِ قلب کی خوشبو مضمر تھی جو صرف اُسی گھڑی ظاہر ہوتی ہے جب ناممکن کام ممکن ہو جاتا ہے۔

"تو جانتا ہے پھر کیا ہوا؟"

اُس نے میری آنکھوں سے میرے دِل میں جھانکا۔

مَیں جانتا تھا کہ پھر کیا ہوا! لیکن مَیں اُسے بتا نہ سکا۔ میری عاجزی نے میرا سارا حوصلہ چھین لیا اور مجھے بے کس بنا دیا۔

تیرا جنم ہوا تھا! اُس نے اِضطراب آمیز سکون سے کہا جیسے دردِ زہ کے آخری مراحل سے گزر رہی ہو۔

اُس کی کمزور آواز جذبۂ فخر سے معمور تھی۔ مَیں نے اُسے اجرِ غیر ممنون سے دیکھا اور اُس نے مجھے ہمدردی سے جیسے اپنی رِفعت میں دو پاک رُوحوں کے ایک دُوسرے میں ملنے سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسے ماحول کی خوبصورتی دُنیاوی سے الگ رُوحانی ہوتی ہے۔ اُس نے میرا مُنہ چُوما اور مجھے اپنے پیٹ میں بھینچ لیا جیسے وہ اُس سے ٹوٹے ہوئے رِشتے کو پھر سے جوڑنے کی خواہش مند ہو۔

"تو پیدائش کے وقت رُوئی کے گالے کی طرح نرم اور سپید تھا۔ چھوٹا سا شریر، چھوٹے چھوٹے نین نقش، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، مونگ کی پھلیوں سی اُنگلیاں، سانس لیتا ہُوا ہلتا نہ تھا۔ تجھے چھو کر معلوم ہوتا تھا کہ تُو زِندہ ہے۔ چھ ماہ تک تُو نے پاسہ نہ مارا۔ تجھے مَیں جیسے لٹاتی تو ویسے ہی لیٹا رہتا۔ تیرا پوتڑا بدلنے کے لئے مَیں تجھے اُٹھا کر دُوسری جگہ رکھتی پھر پوتڑا بدلتی۔ تو سال بھر کا ہوگا جب تُو نے مُٹھیاں کھولیں۔ تجھے مَیں کسی کو اُٹھانے نہ دیتی، کوئی زبردستی کرتا تو مجھے اچھا نہ لگتا۔ مَیں ڈرتی، تجھے سر سے پاؤں تک کپڑے میں گول لپیٹے رکھتی تھی"۔ اُس کی رُندھی رُندھی آواز آہوں میں بدل گئی۔ اُس کی ڈھارس بندھاتے بندھاتے مَیں خود رونے لگا۔ ہم دونوں فلاکت زدہ بچّوں کی طرح تھے جو ایک دُوسرے کے آنسوؤں کی ہمّت ہوں۔ جب ہم ایک دُوسرے کے سر ہوئے، ہم اُس گرمی اور خوشبو سے بھر گئے جو ماں کو صرف بچّے اور بچّے کو صرف ماں کے تن سے مِلتی ہے۔ اُس نے اپنی بات یُوں مکمّل کی۔ "یہ سب کچھ مَیں نے اِس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے تیری کمائی کھانی تھی! اِس لئے کہ تُو میری کوکھ کا ٹکڑا تھا اور تیرا پالن پوسن میری محبت تھی محبت اور ذمّہ داری میں فرق ہے! وہ دل کا قرار ہے اور یہ دِل کا بار، اِس لئے آدمی اِسے بانٹنا چاہتا ہے۔"

ہاں قارئین! ماں اور بچّے میں جو میل جول ہے اُس میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ اپنی سالجھے داری جس دیانت داری سے نباہتے ہیں وہ اپنی عمدگی کی مثال ہے۔ یہ رشتہ اوّل سے آخر تک مکمّل مثبت قدروں پر پنپتا ہے اور جسمانی، اخلاقی، ذہنی، تخلیقی ۔۔۔ قوّتوں کی فضیلت بنتا ہے۔ وقت کے لحاظ سے ہر رشتے میں زوال آیا ہے لیکن اِس کا کمال وُہی ہے جو عین آغازِ حیات میں تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اِس رشتے کا کسی اور رشتے سے مقابلہ کروں لیکن مَیں نے اِرادہ ترک کر دیا ہے۔ کامل کا مقابل نہیں ہوتا ہے۔

اِتنے میں بھائیا جی اُدھر سے گزرے، مجھے ماں کے زانو پر سر رکھے دیکھ کر کڑکے، "تو ابھی تک اِس کُتّے کے پاس بیٹھی ہے! تجھے اور کام نہیں ہے کیا؟"

بد خُو کی نفسیات نرالی ہوتی ہے! وُہ کسی کے نازک جذبے کو زیر کرنے کے لئے ہی رد کرتا ہے کیوں کہ وُہ اُس کے جذبے کی افزائش میں اپنے اُسی جذبے کی نفی دیکھتا ہے۔ کاش وُہ جانتا! کسی پاکیزہ جذبے کو سراہنا، اپنے میں مساوی جذبہ پیدا کرنا ہے۔

اُنھیں وہیں اڑے کھڑے دیکھ کر میری ماں جلدی سے اُٹھی اور چلی گئی۔ اُس کے یُوں چلے جانے سے مجھے لگا کہ مَیں خلا میں اُڑ رہا ہوں، بے حقیقت، بے سلسلہ، بے سمت ---- اور بے ٹھکانا۔

یادوں کی رُوداد میں ایک یاد اور آتی ہے اور اِس احساس کو بڑھاوا دیتی ہے کہ ماں، دُنیا کی سب سے بڑی فن کار ہے اور فطرت کی لاجواب کیمیاگر۔ اِس کے سامنے اعلیٰ سے اعلیٰ عمل، ہیچ ہے کیوں کہ ماں تخلیقِ حیات کی عظمت ہے۔

میرے چھوٹے بھائی جوگندر سنگھ کی پیدائش کے وقت میری ماں کا پیٹ بہت بڑا تھا۔ دائی نے افواہ پھیلادی کہ جُڑواں ہوں گے۔ وُہ ماں کے پیٹ سے کان لگا کر کُچھ سُنتی اور اپنی پیش گوئی دُہراتی۔ تائی ہیرو نے حیران ہوکر ماں سے پُوچھا، "میلو! یہ ڈھول سا پیٹ تجھے بھاری نہیں لگتا؟"

"بھابی! درخت پر پھل بھاری ہوتا ہے کیا؟ تانت سی بیل کو کتنے بڑے کدّو لگتے ہیں! اُسی طرح ماں ہے"! اُس نے مسکرا کر لطیف جذبات سے رس لے کر کہا۔

میری ماں کے اوصاف کیسے اوصاف ہیں! وُہ دُکھ اور سُکھ کے بھید بھاؤ بیان کرتی تو اپنی اپنی جگہ دونوں دُرست لگتے۔ وُہ اِنسان اور فطرت کی حقیقت کا موازنہ اِس طرح کرتی ہے

ماں پیو جہا نہ میوہ ڈِٹّھا
جِتّاں پکّا اوناں کھٹّا

(ماں باپ نرالا میوہ ہے! جتنا پکتا ہے اُتنا ہی کھٹّا ہوتا جاتا ہے)

بچے جہانہ میوہ ڈِٹّھا
جِنّاں کچّا اوناں مِٹّھا

(بچہ نرالا میوہ ہے! جتنا کچّا ہو اُتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔)

میرے قارئین، معاف کریں! باتوں باتوں میں بات طویل ہوگئی ہے اور وہ بات ادھوری کی ادھوری ہے جس کی اونچ نیچ سے یہ بات شروع ہوئی تھی۔

رُوپوں کی رسید کے ساتھ بھایا جی کا خط بھی مِلا جس کا مضمون کچھ اِس طرح تھا۔ سُنا کرتا تھا کہ تقدیر اچھی ہو تو نکھٹّو بیٹا اور کھوٹا پیسا بھی کام آجاتا ہے! مَیں یقین نہیں کرتا تھا، آزما کر دیکھ لیا۔

مَیں نے تایا جی کو بھی منی آرڈر بھیجا تھا۔ اُن کی خیر خبر کے ساتھ یہ پیام آیا "تیرے رُوپے آئے تھے، مَیں نے واپس کر دیئے۔ جاننا چاہو گے کیوں؟ تیرے رُوپے مجھے اُسی وقت مِل گئے تھے جب تُو نے رُوپے بھیجنے کا خیال کیا تھا۔ اپنی رفعت میں جذبے اور عمل کی کارگزاری ایک ہوتی ہے۔ تُو پردیس ہے، تجھے اِن کی زیادہ ضرورت ہے۔

بے انت کور کو تایا جی کی فیاضی کی خبر ملی، وہ بولی، یہ روایت ہمارے گھرانے کا ورثہ ہے۔ خدا جانے اِس میں رتن سنگھ کہاں سے آگیا؟

میری خوشی وجدانی تھی۔ مَیں بھایا جی کے بدخو تبصرے سے دِل برداشتہ ہوا اور نہ ہی بے انت کور کی غیر ضروری بک جھک سے۔ مَیں تایا جی کے ردِ عمل پر کسی قدر ناخوش تھا لیکن میری مجموعی خوشی کا سیلاب اِتنا تُند تھا کہ وہ چھوٹی سی ناخوشی اُس کی روانی میں بہہ گئی۔

تیسری کتاب

باب ۵۸

ہُوا کوئی نہ ثانی آج تک مہرِ درخشاں کا
سجانے کو سجایا ہے بہت شب نے ستاروں کو (شاطرؔ)

میری جیب کیا بحال ہُوئی، میری حالت ہی بدل گئی۔ مَیں پھُول کی طرح تھا جو کانٹوں میں رہ کر بھی خُوش رہتا ہے۔ مَیں خُوش تھا اور بس خُوش تھا۔ جہاں تھا، جیسا تھا، خُوش تھا! اُٹھتا ہُوا، بیٹھتا ہُوا سوتا ہُوا، جاگتا ہُوا، کام پر جاتا ہُوا، کام سے آتا ہُوا، خُوش تھا۔ مَیں نے اپنے دِل کو کھو کر پایا جو مُجھے، خُوشبُو کے جھونکے کی طرح اُڑائے پھِرتا۔ میرے اعضا ہرے بھرے ہو گئے اور خیال مسرور و مخمور۔ لاجونتی اور بلونِندر کے جِسموں کی قُربت مَیں سینکڑوں میل کی دُوری پر محسُوس کرنے لگا۔ میری خُوشی کا پیالہ نرالا ہے! جِتنی جلدی خالی ہوتا ہے اُتنی جلدی بھر بھی جاتا ہے۔

لیکن جیسے دھوئیں کی زِندگی آگ سے ہے، میرا رِشتہ محرُومی سے رہا ہے۔ مَیں اپنی اثر انگیز داستان میں کہیں دِل جمعی کا پہلو تلاش کرتا ہُوں لیکن میرا بجوگ! میری زِندگی کا ہر واقعہ پہلے سے زیادہ دُکھ بھرا ہے۔ میری خُوشی کی دُنیا ایک بار پھِر بستے ہی اُجڑ گئی۔ دراَصل اُجالوں نے مُجھے وہمی بنا رکھا تھا اور مَیں خُوشی کو غم کا پیش خیمہ سمجھتا تھا۔ میرا وہم، یقین میں بدل گیا اور مُجھ پر ہزاروں غموں کا پہاڑ ٹُوٹ پڑا۔

مَیں نے تایا جی کی بیماری کی خبر اُڑتی اُڑتی سُنی۔ اُن کی قوتِ برداشت، اُن کی عالی حوصلگی تھی وُہ اپنا دُکھڑا نہ روتے تھے اور نہ کِسی سے کہتے تھے، کِسی کو اِطلاع کیوں کر دیتے؟ اُن کا ضبطِ غم آبِ رواں پر بند کی طرح تھا لیکن اُس کی نفسیات بند سے الگ تھی۔ وُہ چھلکتا تھا تو اُن کے تخلیقی رُجحان کو سیراب کرتا تھا اور اُسے تر و تازہ بناتا تھا۔ وُہ کہتے تھے، اِنسان کے لئے دُکھ، دارُو ہے، سُکھ، روگ ہے اور کام باعثِ اِرتقائے حیات۔ جہاں اِحساس ہو وہاں تخریبی رُجحان، تعمیری سمت اِختیار کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل دوہا اُن کے کِردار کی مُکمّل عکاسی کرتا ہے،

جِتّھے کِرت کرم دا راج (جہاں کام اور عمل کا راج ہے،

او تھے سنورے سکلا کاج (وہاں زندگی پوری طرح سنورتی ہے۔

کر میں کلا، کلا آکار (ہاتھوں میں ہنر مضمر ہے اور ہنر ہی سے ہر چیز کا روپ سروپ سامنے آتا ہے۔

مانس ! کرنی، سوچ وِچار (اِنسان، عمل اور سوچ وِچار کا نام ہے۔

اُن کے پیٹ میں رسولی تھی جس کا درد اُن کا پُرانا دشمن تھا۔ ایک بار اُنھوں نے رسولی پر گلاس لگایا۔ اُس سے رسولی کٹ گئی۔ وہ کچھ قے سے خارج ہوئی اور کچھ پاخانے سے۔ اُنھوں نے پیٹ کے درد سے آرام پایا لیکن اِس طریقِ علاج میں خون بہت بہہ گیا جس کا اثر اُن کی صحت پر ہوا۔ اُنھوں نے اپنی حکمت آزمائی، پردھان حکیم کی دوا کھائی لیکن کھوئی ہوئی طاقت واپس نہ آئی۔

گھر کی کھیتی ایسا کام ہے جس میں جتنے ہاتھ ہوں، کم ہیں۔ میں جب گاؤں میں تھا اُن کی ہر ممکن مدد کرتا تھا۔ میں جس سال دلی آیا اُس سے ایک رُت پہلے وہ گھر جوت تیاگ چکے تھے اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ اُن کے لڑکے کرتار سنگھ، امر سنگھ اور پیارا سنگھ گھر کے حالات واضح طور پر جانتے تھے۔ وہی جانیں! اُنھیں تایا جی کی بیماری پر شک کیوں ہوا؟ وہ گاؤں کو خط لکھ کر خبر کی تصدیق کرنے لگے۔ میں نے جس دن سنا اُس کے دوسرے دن گاؤں روانہ ہوا۔ میں جسمانی طور پر ٹرین میں تھا لیکن روحانی طور پر تایا جی کے پاس۔ میں سوچ رہا تھا، کاش، میرے پر پرواز ہوں اور میں اُڑ کر اُن کے پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے جتنی عجلت تھی، ٹرین اُتنی ہی سُست رفتار۔ اندھیرے میں جھانک جھانک کر میرے دیدے دُکھنے لگے۔ میں کہیں سوتا تو بس جاگنے کے لیے۔ وہ رات لمبی نہ تھی، شبِ غم کی طرح رُکی رُکی سی تھی۔ لگتا تھا کہ اُس رات کی سحر نہیں ہے۔ اُڑمڑ ٹانڈہ کے قریب اُجالے کی جھلک دیکھتے ہی میں بے اختیار چلا یا۔ دِن چڑھ آیا، دن چڑھ آیا۔ میرے والہانہ انداز سے گھبرا کر میرے پڑوسی مسافر جاگ پڑے اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ہریانہ سے گاؤں پہنچنے کے لیے میں سواری کا ضرورت مند نہ تھا۔ میرا کل سامان مختصر سا جھولا تھا۔ میں کہیں بھاگتا اور کہیں تیز چلتا ہوا گاؤں کی آب جو میں پہنچا۔ وہاں سے ایک پگڈنڈی پھوٹتی تھی جو شمشان گھاٹ کے پاس سے گزر کر سیدھی گاؤں پہنچتی تھی۔ ایک تازہ جلی بجھی چتا دیکھ کر میری دھڑکنوں کی شدت، تشدد کی حد تک پہنچ گئی۔ میں نے گھر میں قدم رکھا تو میں تقریباً ہانپ رہا تھا۔ وہاں کا سکون ہر سانحے کی تردید کرتا تھا۔

میری بہنیں شیلندر کور اور ترسیم کور آنگن صاف کر رہی تھیں۔ سال بھر میں دونوں الگ الگ طریقے سے جوان ہوئی تھیں، پہلی ہاتھوں پیروں سے اور دوسری سینے سے، جیسے وہ اوڑھنی سے ڈھلنے ہوئے

تھی۔ اُس میں ایک اور تبدیلی واضح دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے چوٹی کے ساتھ مینڈیاں گوندھنی چھوڑ دیں تھیں اور زُلفیں چھوڑی ہوئی تھیں۔ میں اُس عمر میں تھا تو کسی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے عناصر میں ردّو بدل ہوا ہے۔ اُس کے اور میرے عناصر کی نفسیات بھی الگ ثابت ہوئی تھی۔ وہ میرے برعکس لاجونتی سی ہو گئی تھی اور گلے ملتی ہوئی ہچکچائی تھی۔ ماں حویلی میں تایا جی کے پاس تھی۔ میں نے جھولا اندر کھونٹی سے لٹکایا اور حویلی کا راستہ لیا۔ یکایک مجھے چِتا کا خیال آیا اور میں نے رُک کر ترسیم سے پوچھا۔ اُس نے جو بات بتائی وہ قابلِ ہمدردی تھی اور حیران کُن بھی۔ چند دن پہلے گونداراَم کی بیوی گر وِتی مر گئی۔ گونداراَم اُس کی استیاں چُننے گیا اور مسان پر مُنہ کے بل گر پڑا۔ اُس کے پوتے موہن سنگھ نے اُسے اُٹھایا اور مرا ہوا پایا۔

میں حویلی میں پہنچا۔ تائی اور میری ماں تایا جی کو سہارا دے کر بستر پر سے اُٹھا رہی تھیں۔ مجھے دُور سے آتے دیکھ کر ماں نے تایا جی کو میرے آنے کی خبر دی۔ وہ دُوسری طرف دیکھ رہے تھے، میری طرف پلٹے جیسے وقتِ سحر سُورج مُکھی، سُورج کی طرف گھوم جاتی ہے۔ میں بھاگ کر اُن کے پاس پہنچا۔ اُنھوں نے بچّے کی طرح ہُمک کر باہیں پھیلائیں اور میں باہیں تھام کر اُن سے گلے مِلا۔ اُنھوں نے میرا چہرہ، ہاتھوں میں لے کر دیر تک میری آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کے ہاتھوں میں موت کی سردی تھی اور آنکھوں میں نااُمیدی کی تیرگی۔ جب تک اُنھوں نے میرا مُنہ چُوما، ہونٹوں میں ٹھنڈی سی گرمی آ گئی اور آنکھوں میں اندھیری سی روشنی۔ اُنھوں نے اعتماد سے کہا، "ہیرو، اِن بیساکھیوں کو اُٹھا دو! اب اِن کی ضرورت نہیں ہے۔"

تایا جی شہتوت کے سائے میں مُونج کی چارپائی پر لیٹے تھے، جس پر پُرانا بستر بچھایا ہوا تھا۔ اُن کی ذاتی حوائج کے لئے پاس ہی پردہ کیا ہوا تھا، جہاں سے بدبو آ رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اُس پردے کو اُکھاڑا، اُسے حویلی کے باہر کے کونے میں لگایا، گندگی کو صاف کیا اور وہاں چونا چھڑکایا۔ میں نے اندر سے نواڑی پلنگ نکالا اور اُس کے لئے تائی سے نیا بچھونا مانگا۔ اُس نے جیسے انکار کیا، وہ اُس کی زندگی کا ذلیل ترین چلن تھا۔ پلنگ وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو اور اِس کے لئے زمین پر بستر بچھاؤ۔ اِس کے مرنے کے دِن ہیں نہ کہ پلنگ پر سونے کے!

اُس کے دُربچن سُن کر میرا خُون کھول گیا۔ میں کچھ بکنے ہی والا تھا کہ ماں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "بھابی! اشبھ کیوں بولتی ہو؟ بستر نہیں دینا ہے، نہ دے، میں اپنے گھر سے دے دیتی ہوں۔"

ماں کی بات سُن کر میرا اُبال ٹھنڈا پڑ گیا لیکن میں اُسے معاندانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں

گھر سے نیا بستر لایا، پلنگ پر بچھایا، گرم پانی سے تایا جی کو کھیسا کیا اور دُھلا ہوا لباس پہنایا۔ میں انھیں لٹا کر سر کے نیچے سرہانہ ٹھیک کر رہا تھا کہ وہ فرطِ جذبات سے رو پڑے۔ اُن کے سارے اعضا بوڑھے ہو کر ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن دِل اُسی گرمیِ محبّت سے تھرکتا تھا جیسے وہ تھرکا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی میرے احسان مند نہ ہوئے تھے۔ اُن کی عادت کی طرح داری جوں کی توں تھی ورنہ وہ میری چھوٹی سی خدمت کا صلہ اُسی وقت کیسے چُکاتے! اُن کے نزدیک لینے کی خو ڈالنا، دریا لانا تھا۔ اُن کی رفاقت اُن کی سخاوت تھی۔ اُن کا دامن سرچشمے کی طرح تھا جس کا بھرا ہونا روایت ہے۔ اُن کا قول تھا کہ لینے والے سے دینے والا بڑا ہوتا ہے۔ لینا خالی ہونے کی علامت ہے اور دینا بھرے ہوئے کی۔ کوئی اُن کی تھوڑی سی بھی مدد کرتا تو وہ اُس کا بھرپور اور بے تکلّف شکریہ ادا کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ انھوں نے ذرا سا لے کر ڈھیر سا لوٹایا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کسی کی مدد لینی ضروری ہے تو اُس کا اعتراف کرنا اُس سے زیادہ ضروری۔ چوں کہ وہ حسّاس تھے اِس لیے زیادہ دُکھ اُٹھاتے تھے اور تلخی کو کام کی چاشنی سے مٹاتے تھے۔

دُلہن کا سنورنا، پرندے کا پر تولنا، پھول کا کھلنا، خوشبو کا اُڑنا، پودے کا لہرانا۔۔۔ آدمی کا کام کرنا، اِس کے حُسن میں اضافہ کرتا ہے۔ تایا جی کام کرتے ہوئے واقعی بہت خوب صورت لگتے۔ اُن کی سانسوں کی تیزی، گالوں کی گرمی، آنکھوں کی چوکسی، ہونٹوں کی طرفداری، پیروں کی پھرتی، ہاتھوں کی مشّاقی، اوزار کی خوش حرکتی۔۔۔ اُن سب اداؤں کو کام سے وہ ہم آہنگی اور نسبتِ تام تھی جو جزو کو کُل سے ہے۔

میں جتنا خوش تھا اُتنا ہی غم زدہ۔ میں خوش تھا کہ شہر کے اندھیرے سے گاؤں کے اُجالے میں لوٹ آیا تھا غم زدہ تھا کہ تایا جی کی صحت گر چکی تھی اور اُن کے بچنے کی اُمید نہ تھی۔ دُوسروں کو زندگی دینے والا، زندگی ہار رہا تھا۔

میرے قارئین! میں اپنی مُصیبت و مسرت، نفرت و محبّت، نشیب و فراز۔۔۔ کی کہانی کہیں بھول گیا ہوں تو اِس کا اِمکان ہے! لیکن جہاں تک تایا جی کی رفاقت کا تعلّق ہے، مجھے اُس ہر سانس اور لمحے کا زندہ اِحساس ہے جو میں نے اُن کے ساتھ گزارا ہے۔ میں اُن کی آواز سُنتا ہوں اور اُن کے اُسلوبِ بیاں سے محظوظ ہوتا ہوں۔ وہ میری رُوح کی آسودگی ہیں اور میرے خون کی روانی، مباح، مطمئن، خالص پُر سکون لیکن سرگرم۔۔۔ میں جس وقت اُن کا خیال کرتا ہوں، انھیں اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں۔

میں اُن کے پاؤں دبا رہا تھا کہ انھوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے ہاتھ تھام کر پوچھا،

کچھ چاہیے ؟

وہ ہلکا سا مسکرائے اور میرا ہاتھ ٹٹولنے لگے۔ میں اُن کی بات سمجھ گیا اور فخر سے ہاتھ کھول دیا۔ وہ میرے ہاتھ کے گٹّے رگڑ کاتے رہے اور پھر اپنی مخصوص کھلاوٹ کے ساتھ بولے " ہاتھوں میں ہنر ایسے مُضمر ہے جیسے کتابوں میں علم ! لیکن ہنر کی حقیقت ، علم سے الگ ہے۔ ہنر ، عمل سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ عمل کا عملی پھیلاؤ ماورائے سخن ہوتا ہے اس لئے الفاظ کتنے ہی مفصّل ہوں ! نامکمّل ہوتے ہیں۔ ہاتھ عملاً کتابوں سے مقدّم ہیں ، ہنر ، علم سے اور عمل ، سخن سے ۔"

وہ ہاتھوں کو طرح طرح سے سراہتے تھے۔ اُن کے ہاتھ غیر معمُولی جسامت کے تھے ، یہی وجہ ہوگی کہ وہ ہر کام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ کوئی انھیں پہلی بار دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا اور حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہتا۔ کوئی پُوچھتا تو وہ فخر سے کہتے " میرے ہاتھ اِس لئے اِتنے بڑے ہیں کہ یہ کئی ہنروں کے دفینے ہیں ۔"

وہ کسی مدرسے میں نہیں پڑھے تھے اور زندگی ہی کو مدرسہ مانتے تھے۔ " مدرسے سے بڑھ کر بھی مدرسہ ہے اور وہ ہے زندگی۔ یہاں الفاظ بولتے ہیں ، محسُوس کرتے ہیں ، معنی بدلتے ہیں ، پھیلتے ہیں اور عینِ ادراک بن کر اپنی ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہیں ۔"

ہنر سیکھنے کے لئے اُن کی صلاحیت کی سرشت دھرتی جیسی تھی جس پر قطرہ گرتے ہی جذب ہوجاتا ہے۔ وہ کام کرتے ہوتے تو کام ایجاد کرتے لگتے۔ کام کے بارے میں اُن کا رویّہ راہبرانہ تھا " وُہی خُوش قسمت ہے ، جس کے ہاتھ میں کام ہے۔ نہ اُسے کسی کی حمایت کی ضرورت ہے اور نہ رحمت کی کیوں کہ نہ کوئی اِنسان کام کا نعم البدل ہے اور نہ کوئی بھگوان !"

لکڑی کے کام میں توڑ ممکن ہے اور جوڑنا ممکن لیکن وہ لکڑی جوڑنے میں اِختراعی لیاقت رکھتے تھے۔ انھوں نے حویلی کے دروازوں کے لئے گھر کی شیشم کے پُرانے گولے چیرے۔ بالے اور تختے چوڑائی اور موٹائی میں ٹھیک تھے لیکن لمبائی میں کم۔ انھوں نے باہیوں (دروازے کے لمبے تیر) کو ڈوچول لگائی اور تختوں کو لیپ جوڑ ، جن کی مضبوطی کے لئے اُن میں سُرسُرے (دو مونہے بکور کیل جنھیں گول چھید میں میں لگاتے ہیں) بٹھائے۔ جوڑ ، پُشتی بالوں سے ڈھک دیئے ، پُشتی بالوں اور بینی پر منبّت کاری کردی۔ اِس کام کے لئے اُن کے پاس اتنی قسم کی رکھانیاں تھیں کہ میں چاہتے ہُوئے اُن کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ کوئی کام اُن کی سمجھ میں نہ آتا ، وہ جسمانی ضرورتوں سے بے خبر اپنے خیالات میں ڈوبے رہتے جیسے اُن کا مقصد نظامِ نفسی کا محوَر ہو۔ کوئی انھیں کھانا کھانے کے لئے بلاتا ، وہ اڈے سے ایسے اُٹھتے جیسے

کام کو اَدھورا چھوڑنا، اُن کی تکلیف کا سبب ہو۔ چُوں کہ وُہ کام مست تھے، کام اُن کا رُوحانی فیضان تھا اَور جسمانی وِجدان۔ وُہ کبھی بیکار نہ بیٹھتے، کبھی بیٹھے ہوتے تو مُشاہدۂ نفس میں محو لگتے۔ اُنھیں کام پر اِس قدر عبُور تھا کہ جو شے اُن کے مَصرف میں ہوتی، لگتا کہ وُہ اپنی اندرُونی شکتی سے قلب ماہیت میں مصروف ہیں اَور تایا جی، اُس کے معرضِ تعمیر میں اُس کی صرف مدد کر رہے ہیں۔

"کام کی نفسیات بچّے کی طرح ہے جسے دیکھ کر اُس کی ضرورت کو سمجھنا پڑتا ہے۔ اِسے جِتنا سمجھو، یہ اُتنا ہی کُھلتا اَور اپنے بارے میں حیرت ناک اِنکشافات کرتا ہے۔" ایک بار اُنھوں نے کام کی فِطرت بیان کرتے ہُوئے کہا۔

"وُہ کیسے؟" مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"وہاں جگہ کیسی ہونی چاہیئے؟"

ہم طویلے میں کھڑے تھے، اُنھوں نے مویشیوں کی ناند کی طرف اِشارہ کیا۔

"صاف سُتھری!" مَیں نے اُدھر دیکھ کر کچُھ سوچ کر کہا۔

"مویشی گوبر روند رہے ہوں تو تُمھیں کیسا لگے گا؟"

اُن کا سوال صاف تھا۔

"گوبر صاف کرنا چاہیئے!" مَیں نے اِعتماد سے جواب دیا۔

"اِس کا مَطلب ہے کہ گوبر کو دیکھ کر تُم نے سمجھا ہے کہ اِسے صاف کرنا چاہیئے۔ یہ سمجھ کی اِبتدا ہے، جِس کی اِنتہا تُمھاری کاری گری پر موقوف ہے۔"

اُن کے پاس کام کے معنی، اِرتقائے شوق اَور افزُونی حیات کی تاویل تھی۔

"ہر کام کا اپنا طریقِ کار ہے۔ کارِندہ بقدرِ صلاحیّت کام کی دُشواریاں سمجھتا ہے اَور اُنھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے اِس لیے ہر کِسی کے کام کا کمال الگ ہے۔ کام، اِنسان ایجاد ہے، اِسی بِنا پر دونوں ایک دُوسرے کی طاقت اَور نفاست ہیں۔ اِسی تنوّع سے وحدتِ ذہنی مُتصوّر ہُوئی اَور معیارِ حُسن کی طرح نکلی۔ چُوں کہ ہر چیز اِنفرادی شعُور سے ظہُور میں آئی ہے، دُنیائے حیات، اِنفرادی شعُور کی مجمُوعی حقیقت ہے۔ اَور شعُور اِرتقا پذیر ہے۔ جہاں میرا کمال ختم ہوتا ہے، دُوسرے کا شرُوع اَور اِس طرح یہ سِلسِلہ جاری رہتا ہے۔"

وُہ میری ماں کے کام کی تعریف یُوں کرتے، "بیٹا! تُو جو کام کرتی ہے، اُس میں رُوح نظر آتی ہے"

"بھائیا جی! رُوح کیا چیز ہے؟" ایک بار میری ماں نے رُوح کی وضاحت چاہی۔

"روح کو بیان کرنا مشکل کام ہے۔ کام کی روح، نفاست ہے، اوزار کی روح، دھار ہے اور انسان کی روح، ذکاوت ہے۔ انسان کی روح، اخلاق بھی ہو سکتی ہے لیکن روح وہی ہے، جس کا تعلق خوبیِ حیات سے ہے۔"

کچھ لوگوں نے امرت چھک رکھے تھے اور وہ سنساری لوگوں کے ہاتھ سے پدارتھ لے کر نہ کھاتے تھے۔ تایا جی اُن کے رویّے پر گربانی میں سے طنز کرتے،

سُوچے ایہہ نہ آکھیئے، بہن جو پنڈا دھوئے
سُوچے سہ ہی نانکا، جن من وسیا سوئے
(انسان نہانے اور دُھلے کپڑے پہننے سے پاک نہیں ہوتا)
(وہ انسان پاک ہوتا ہے، جو اپنے عمل سے خُدا کا ہم سر ہوتا ہے۔ تایا جی، خُدا کے ارتھ مکمّل انسان کے لیتے تھے)

گرچرن سنگھ گرنتھی تھا۔ اُس کے جینے کا حیلہ وسیلہ پوجا پاٹھ تھا۔ وہ اپنے طرزِ حیات پر فخر کرتا تھا اور دُنیا داروں پر اپنی برتری جتاتا تھا۔ تایا جی اُسے حُجرہ نشین کتابی کیڑا کہتے تھے۔ وہ شاستروں کی تفسیر اُس سے الگ طریقے سے سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔ "شاستر، دھرم نہیں ہے، دھرم سمجھانے کا سادھن ہے۔ شاستر کی اصل، شستر ہے۔ جو کوئی اِسے روزگار کا وسیلہ بناتا ہے، وہ اِسے نہتّوں کے خلاف ہتھیار کی طرح برتتا ہے اور انھیں لُوٹتا ہے۔ دھرم، فرد اور سماج کو مِلانے کی کڑی ہے اور دیانت دارانہ زندگی جینے کا طریق عمل۔ دھرم، پوجا پاٹھ اور شاستروں کا رٹنا نہیں، اصول ہیں جو اچھے، بُرے کام میں فرق بتاتے ہیں۔"

وہ گرنتھ میں سے حوالہ دیتے،

مہر، مسیت، صدق، مصلہ، حق حلال، قُرآن
سرم، سنّت، سیل، روزہ، ہو ہو مُسلمان
کرنی، کعبہ، سچ پیر، کلمہ، کرم نواج
تسبیح، ست سبھاؤ دی نانک رکھے لاج
حق پرایا نانکا، اُس سور، اُس گائے
گر پیر ہاما تاں بھرے، جاں مردار نہ کھائے
(رحم و کرم کی مسجد بنا، صدق کا مصلّیٰ بچھا، حق کی کمائی کو قُرآن سمجھ)

(شرم و حیا کو سنت مان، اچھے اطوار کا روزہ رکھ اور یوں مسلمان بن)
(نیک عمل تیرا کعبہ ہو، صداقت تیرا پیر ہو اور بخشش تیری نماز ہو)
(رواداری تیری تسبیح ہو تبھی اے نانک تیرا خدا تیری لاج رکھے گا)
(دوسرے کا حق غصب کرنا مسلمان کے لئے سور اور ہندو کے لئے گائے
کھانے کے برابر ہے)
(خدا اسی حالت میں تیرے انسان ہونے کی حامی بھرے گا جب تو اچھے کرم
کرے گا۔)

ایک بار گرچرن سنگھ، تایا جی سے اپنی بات منوانے لگا کہ گیان، جہان ہے، اس لئے گیانی سنساری سے بڑا ہے۔ تایا جی نے ان شبدوں کے ارتھ جیسے بیان کئے، انھیں کی طبع سلیم کا کمال ہے۔ "گیان، جانکاری ہے اور وچار، بھیدن کاری۔ غور کرو تو ان دو لفظوں میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ گیان، ماضی کی طرح جہاں کا تہاں رہتا ہے جب کہ وچار، حال کو مستقبل کی طرف بڑھاتا ہے۔ وچار، وقت کا معیار ہے اور کبھی خود کو نہیں دہراتا۔ گیانی سے وچاری ممتاز ہے، پہلا تاریخ گو ہے اور دوسرا تاریخ ساز۔"

تایا جی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اٹھ کر ٹہلنے لگے گویا اپنی بات پر مزید غور کرنے لگے۔ وہ لفظوں میں ایسے تمیز کرتے تھے جیسے کاشت کار تخموں سے تخموں میں اور پھر تخموں، تخموں میں۔ انھوں نے ان دو لفظوں کو اس طرح بیان کیا۔ و، وشیش (زیادہ) کا پرتی ندھی (ترجمان) ہے اور چار، چرو، کا، ارتھ ہے چلنا اور کھوج کرنا۔ مویشی، چراگاہ میں ہوتا ہے تو وہ چارہ چرتا ہے اس لئے کہ اسے چارہ تلاش کرنا پڑتا ہے لیکن وہ ناند پہ بندھا ہو تو چارہ کھاتا ہے کیوں کہ اس کے عمل سے تلاش کا عنصر غائب ہوتا ہے۔ اسی طرح گیان صرف گیان ہے، ارتھ ہے جاننا۔ اس کے ساتھ 'و' بڑھانے سے یہ وگیان بنتا ہے، یعنی جاننے کی کریا۔ کریا، گیان کا سوتا ہے اور اتپادک (پیدا کرنے والا) بھی۔"

"یہ غلط ہے، وگیان، گیان سے بڑا نہیں ہوتا!"
گرچرن سنگھ نے تایا جی کی بات کو جھٹلانے کے لئے جھٹلایا۔
"کیوں غلط ہے؟"
انھوں نے وضاحت چاہی۔
"یہ میرے عقیدے کے خلاف ہے۔ وگیانی، گیانی سے بڑا ہوتا تو شاستر اس کی سراہنا کرتے!"

اُس نے اپنے کٹر پن کا مظاہرہ کیا۔

"اوہ!" اُنھوں نے متاسفانہ لہجے میں کہا اور اپنی بات کو جاری رکھا، "روایت پرست خوبصورتی اور بدصورتی میں فرق کرنے کے نااہل ہوتے ہیں۔ شاستروں کے موئیف گیانی تھے نہ کہ وچاری۔ اور وچاری سے گیانی جگوں پیچھے ہوتا ہے۔"

جو لوگ ویدوں کو ہر گیان کا خزانہ مانتے تھے، تایاجی اُنھیں اگیانی کہتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے، "وید کا ارتھ ہے، گیان۔ اُس وقت گیانیوں کو جتنا گیان تھا، اُنھوں نے اُسے لکھ دیا اور اُسے لکھے ہوئے ہزاروں سال بیت گئے ہیں۔ جب سے گیان بڑھا ہے اور لگاتار بڑھ رہا ہے۔ وہ گیان آج کے مقابلے میں دقیانوسیت (پرانا) ہے اور زیادہ تر ناکارہ۔ جو کوئی اُسے کلّی طور پر سود مند سمجھتا ہے، وہ بے ہنر ہے۔ ارتقائی نکتہ نظر سے بے ہنر، بے وجود ہوتا ہے۔ ہنرور، معراجِ آدم ہے اور ہنر، اصلِ عالم۔"

وہ رسوم و روایات کو پُرکھا روگ کہتے تھے اور اپنے صحت مند رویے کی صراحت یوں کرتے تھے، "انسان، حسنِ آفرینش کا نام ہے۔ میرے بزرگوں میں سے کسی نے جنیو پہنا اور کسی نے لنگوٹ، کسی نے پیلا لباس پہنا اور کسی نے گیروا، کسی نے نیلا، سفید ... اور سب سے پرانے بزرگ تو ننگے رہتے تھے۔ کیا میں اُن کے احترام میں ننگا رہنے لگوں؟ زندگی کی حقیقت، زندگی ہے! یہ دھرتی زندوں کی ملکیت ہے اور ہنرورں کی سلطنت۔"

وہ ہنرورں کو دانش وروں سے ممتاز سمجھتے تھے۔ "دانش وروں کی زندگی انسان کے اقتصادی سماجی اور اخلاقی مسئلوں کو سمجھنا ہے اور انسانی ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اُن کا حل نکالنا ہے۔ اِن کا اول فریضہ اپنے خیالوں پر عمل کرنا ہے، چاہے انھیں آگ کے دریا سے گزرنا پڑے تاکہ دوسرے، اِن کے خیال کو اپنے فائدے کے لئے اپنائیں اور خود کو آنے والی مصیبتوں سے بچائیں۔ دانش وری، دانش وروں کی وراثت ہے، جو ہنر کے برعکس ناپائدار ہے کیوں کہ یہ صرف ذاتی خوبی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ کے ختم ہوجاتی ہے۔ جو دانش ور اپنے قول و قرار پر پورے نہ اُتریں وہ ریاکار اور رذیل انسان ہیں۔"

اُسی طرح وہ ہنرورں کے نکتہ چیں تھے۔ "کسی کا گھر سونے سے بھرا پڑا ہو، وہ مٹی کے برابر ہے اگر اُس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں۔ یہی حقیقت ہنر کی ہے۔ جو ہنر انسانی زندگی میں پراگندگی پھیلاتا ہے، اُس سے بے بہرہ ہونا اچھا ہے۔"

میں نے انھیں چیزوں سے ہم کلام دیکھا تھا اور اُن کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے سنا تھا۔

وہ پھلوں کے گنوں کو انسانوں سے ملاتے تھے، جیسے ستوگن، تموگن، رجوگن۔
ستوگن۔ وہ گن جو ہنرور میں ہوں۔ پھلوں میں یہ گن آم، انگور، سیب وغیرہ میں ہیں۔
تموگن۔ وہ گن جو سدھارن انسان میں ہوں۔ پھلوں میں یہ گن کدو، گھیا، ککڑی وغیرہ میں ہیں۔
رجوگن۔ وہ گن جو راجے میں ہوں۔ پھلوں میں یہ گن بادام، اخروٹ، ناریل وغیرہ میں ہیں۔

وہ ستوگن کو سب سے اتم گن مانتے تھے، اس سے چھوٹا تموگن اور اس سے چھوٹا رجوگن۔ رجوگن کو وہ اس لیے حقیر سمجھتے تھے کہ اس کے گنی کو اپنے گن قائم رکھنے کے لیے پتھر دل ہونا ضروری ہے اور ایسا آدمی جابر، لٹیرا، لالچی، قاتل، جاہل ۔۔۔ ہی ہو سکتا ہے اور بالاتر ہٹی۔

وہ کہتے تھے، "خود آرائی کے لیے خود آگہی ضروری ہے۔ جہاں اس خوبی کا فقدان ہو وہاں اصلاحِ ذات ناممکن بات ہے۔ خود آگہی، پرتی (وہ چادر جس سے ہوا کر کے اناج میں سے بھوسا جدا کرتے ہیں) کی طرح ہے جو کھرے کو کھوٹے سے جدا کرتی ہے۔"

میں نے سکھ اور دکھ کے بارے میں کتنی باتیں سنی تھیں۔ کوئی انھیں تقدیر سے منسوب کرتا تھا اور کوئی کرموں سے، لیکن تایا جی ان کے بارے میں الگ طریقے سے سوچتے تھے۔ "زندگی سکھ اور دکھ کا ایسا دھارا ہے جس کا بہاؤ انسان کے تابع ہے۔ اچھا سوچو، اچھا کرو، سکھی رہو! برا سوچو، برا کرو، دکھی رہو! یہ دونوں عمل دوسرے سے زیادہ اپنے لیے اثر انگیز ہیں کیوں کہ انسان کا دل اس پیالے کی طرح ہے جس میں سے کچھ لینے کے لیے پہلے اسے بھرنا پڑتا ہے اور دوسرے کو اتنا ہی ملتا ہے جتنا چھلکتا ہے۔"

وہ کہتے تھے کہ ہر شے بات کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسے پوری توجہ سے سنو۔ مثلاً یہ کماد کہتا ہے کہ میری آب پاشی کرو ورنہ میں سوکھ جاؤں گا۔ وہ کھیتی کہتی ہے کہ مجھے اڑھایا (سبزہ بیگانہ) سے بچاؤ۔ ان کی سیدھی سادھی بات زندگی کی فلاسفی ہوتی تھی۔ "ہر شے کے بات کرنے کا انداز اس کی حقیقت پر موقوف ہے۔ کانٹا اپنی سفاکی پر نازاں ہے اور پھول اپنی نازکی پر۔ ہر ایک، دوسرے کی حقیقت سے بے نیاز ہے لیکن اپنی حقیقت منوانے کے درپے ہے۔ نظمِ فطرت کی خلاقی، خوبی ہے کہ ہر شے اپنی بے آہنگی میں دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن عقلِ انساں کی ستم ظریفی! یہ اپنی گوناگونی میں بے آہنگ ہے۔ انسانی ماحول میں ہم آہنگی فراست سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان نے عقل سے تلوار بنائی اور فراست نے اسے سمجھایا کہ اسے صرف دفاعِ ذات میں استعمال کرو۔ لگام نے گھوڑے کے

ساتھ جو کیا ، فراست نے وُہی اِنسان کے ساتھ ، ورنہ دونوں آج بھی جنگلی ہوتے "۔

اِنسان ہو کہ حیوان ، جمادات ہو کہ نباتات ، وہ ہر شئے کے معنی اپنے طریقے سے سمجھاتے تھے اور کئی کئی طرح بیان کرتے تھے ۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جو اَدنیٰ سے اعلیٰ بننے کی کوشش کرتا ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جو اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جو کئی ناموں سے پہچانا جاتا ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جو ہر اچھی ، بُری شئے کا معیار ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جِس کا ورثہ نسل کی وضعداری سے الگ ہُنر ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جو اپنے ہُنر کے ذریعہ اپنے آپ کو لافانی بناتا ہے"۔

"اِنسان ایسا حیوان ہے جِس کے وُجود ہی سے کائنات کا وجود ہے"۔

اُن کے دِل و دماغ میں جو کچھ تھا وُہی اُن کے ہاتھوں میں تھا جس کی تصدیق وُہ زبان سے بھی کرتے تھے ، "میری حقیقت وُہی ہے جو میرے عمل سے ظاہر ہوتی ہے ۔ اُس سے مَیں جِتنا زیادہ کہتا ہوں وُہ میرا خیال ہے اور خیال کی بات عمل تک پہنچتی ہے تو اُس کی شکل ہی بگڑ جاتی ہے"۔

اُن کی بات اُن کے کردار پر پُوری اُترتی تھی ۔ وُہ کام کرتے ہوتے کہ بات کرنے کے لئے الفاظ کا اِنتخاب ، لگتا کہ وُہ اُن کی باہری دُنیا سے داخلی دُنیا میں اُترتے ہیں اور اُس کی مضمر حقیقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جائے کام پر اُن کا موجود ہونا اِس بات کی شہادت تھی کہ کام اپنی پُوری نفاست کے ساتھ تمام ہوگا ۔

اُن کی حقیقت پسندی نے اُن پر اِنسانی سچائی کے ایسے پہلو نُمایاں کئے تھے کہ وُہ کہی اور سُنی ہر بڑی بات کی سچائی پر شک کرتے تھے اور حدیث و حکایات ، خاص کر معجزوں کی باتوں کو اِنسانی تصوّر کی خرافات کہتے تھے ۔ " یہ باتیں اُن لوگوں کی فریب کاریاں ہیں جو زندگی کے ہر شُعبے میں ناکام رہے ، وِشوامتر کی طرح ۔ وُہ کوڑھی کے کوڑھ کا عِلاج نہ کر سکا لیکن اُسے جنّت نشینی کا یقین دلاتا رہا ۔ معجزوں اور چمتکاروں کی باتیں وُہ کرتے ہیں جو زِندگی کی اصلیت سے بے خبر ہیں ۔ جن کی اپنی حقیقت ، بے حقیقت ہے ۔ ہر حقیقت ، حقیقت سے خود افشا ہوتی ہے لیکن جاہل لوگ اِسے معجزہ سمجھ لیتے ہیں ۔ اِنسان ، کمالِ فطرت کا مکمل نمونہ ہے اور ہُنر ، کمالِ انساں ہے ۔ وجود ، عدم سے پیدا نہیں ہوتا ۔ جو لوگ ایسی حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں وُہ کلپنا بلاس (ذہنی مباشرت) میں مُبتلا ہیں"۔

نہ کہ علم کی تکرار سے"۔

اُن کا نظریہ تھا کہ دھارمک کتابوں کو شعورِ حیات سے کوئی واسطہ نہیں، اِس لئے اُن کے پڑھنے والوں کی ماہیت خود کو دُہرانے میں ہے۔ چُوں کہ وُہ اختراعی صلاحیّت کی لطافت سے بے بہرہ ہیں، وُہ اپنے جمُود کی کثافت میں نفاست دیکھتے ہیں۔ تایاجی ہر چیز کی سچائی کئی کئی طرح سے بیان کرتے تھے، شاستروں کے بارے میں کہتے تھے، "اُن میں کچھ جوہر ہے لیکن اِتنی خرافات میں دفن ہے کہ اُسے ڈھونڈنا خُود کو گُم کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اِنسانی جوہر کی خصوصیّت ہے کہ یہ وقت کے ساتھ بڑھتے ہُوئے ہُنر میں جذب ہوجاتا ہے اور اپنا اصلی وجُود کھو دیتا ہے۔ اِس کا تاریخ سے کوئی رِشتہ ہو تو ہو، اپنے طور پر اِس کی نہ اہمیّت ہوتی ہے اور نہ آیندہ ترقی سے واسطہ"۔

اُن کی حُسن پرستی کی بصیرت ہی الگ تھی۔ وُہ اُسی چیز کو خُوبصُورت مانتے تھے جسے عملِ تخلیق سے نسبت ہو۔ اِنسان کے حسین ترین اعضا، ہاتھ ہیں۔ ہاتھ نہ ہوتے تو یہ دوُسری انواعِ حیات کی طرح بے ثبات و بے شعُور ہوتا۔ اپنے ہاتھوں کی عملی صلاحیّت ہی سے یہ مرئی دُنیا سے غیر مرئی دُنیا میں پہنچا، اُس کی حقیقت کو پہچانا اور یُوں اپنے حیاتیاتی وُجُود کی حدوں کو بڑھا کر لامحدُود سے مِلایا۔ اِسی احساسِ تکمیل نے اِسے باور کرایا کہ اِس کا حُسنِ دوام اہل و عیال کے برعکس ہُنر سے ہے۔ ہُنر، اِنسانی زندگی کا مرکزہ ہے اور ہُنروَر، ہُنر سے اپنی وابستگی کے عہد و پیماں کا مُجدّد۔"

وُہ کئی بار اپنے ہاتھوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے جیسے اُن میں چھُپے ہُوئے ہُنروں سے معذرت خواہ ہوں، جنھیں ظاہر کرنے میں وُہ ناکام رہے تھے۔

میری ماں کے رُوحانی عذاب میں تایاجی اُسے جیسے سمجھاتے وُہی سمجھا سکتے تھے۔

"بھایا جی، آپ کہتے ہیں کہ دھرتی پر نفرت سے محبّت زیادہ ہے، کیسے؟ مجھے تو اُلٹ لگتا ہے!"

اُس نے تایاجی سے پُوچھا۔

"محبّت، حیات ہے اور نفرت، ممات! یہاں روان آئے، دریودھن آئے، چنگیز آئے، نادر آئے، ابدالی آئے ـــــ کیسے کیسے ظالم آئے اور تباہی مچا گئے لیکن زندگی رواں دواں ہے، بے خلل، بے داغ، بے نیاز! محبّت اور نفرت کی یہی نفسیات ہے۔ محبّت چُپ چاپ پروان چڑھتی ہے اور نفرت اِس کے برعکس! اِس لیے نفرت کتنی ہی کم ہو، زیادہ لگتی ہے۔"

وُہ محبّت اور نفرت کا تقابُل یُوں بھی کرتے تھے، "محبّت، صفائی ہے اور نفرت، گندگی۔ پہلی کے جینے کا انداز مدافعانہ ہے اور دوُسری کا جارِحانہ، اِس لئے نفرت، محبّت سے افزوں دکھائی دیتی ہے

صاف ستھرے گھر میں تھوڑی سی غلاظت پڑی ہو تو سارا گھر بدبُو سے سڑنے لگتا ہے اور وہاں کی ہر شے آلودہ نظر آتی ہے۔"

قارئین! یہ دُنیا ہے، ظالم دُنیا! اِس نے کس کے ساتھ انصاف کیا ہے جو اُن کے ساتھ کرتی۔ لوگ اُن سے ناراض ہوتے تھے، اُنھیں ذلیل کرتے تھے۔ "میں اُنھیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے کہتا لیکن وہ مجھے سمجھاتے، "بُرائی، بھلائی کا اُتنا ہی اہم جزو ہے جتنا بدصورتی، خوب صورتی کا۔ فرق اِتنا ہے کہ بُرائی اپنی حمایت بُرائی سے کرتی ہے اور بھلائی، بھلائی سے۔ میں اُن کی برابری کروں گا تو اپنے کردار کو کیوں کر زندہ رکھ سکوں گا؟"

اُن کے کردار کی یہی خصوصیت تھی جو اُن کے عناصر کی ترتیب کو مزید سنوارنے کے لئے لگاتی تھی۔ وہ اُس کی بھی مدد کر دیتے تھے، جس نے اُن کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہوتا تھا۔ وہ اپنے غیر رسمی رویّے کو جس فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے تھے وہ بھٹکے ہُوئے لوگوں کے لئے چراغِ راہ تھا۔ "ایک سا کردار نبھانا مُشکل ترین کام ہے۔ فرق یہ ہے کہ اچھا انسان گرتا ہے تو پکّے پھل کی طرح گرتا ہے۔ پکا پھل، پیٹ بھرے کے لئے تسلّی اور بھوکے کے لئے توانائی ہوتا ہے۔"

اُن کی فراست بالکل ارضی تھی، "سچ وہ نہیں ہے جو میں کہتا ہُوں، سچ وہ ہے جو میں کرتا ہُوں کہنے اور کرنے میں اندھیرے اور اُجالے کا فرق ہے۔ جو آدمی صرف کہتا اور کہتا ہے وہ اندھیرے میں رہتا ہے" وہ اوتاروں اور پیغمبروں کی جگہ ہُنروروں کی ستائش کرتے تھے، "حیات، اِفراطِ حیات میں گُم تھی۔ اِس کی بازیافت کا ذمّہ دار ہُنرور ہے۔ حیات اور ہُنرور ایک نازک فرق کے ساتھ ایک دُوسرے کے مُماثل ہیں۔ حیات خُود کو دُہراتی ہے اور ہُنرور اپنی تجدید کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ اِس لئے ہُنرور کی روایت ہے کہ شاگرد، اُستاد سے سیانا ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر کی حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ یہ تعلیم و تربیت کی روایت سے بَری ہے کیوں کہ یہ پیدائشی ہمہ بین و ہمہ داں ہے اور اِدراکِ کُل کا سرچشمہ۔ انفس و آفاق کے سارے رُموز اُسی پر عیاں ہیں اِس لئے مُقلّد کا فرض ہے کہ وہ پیغمبر کے بیان و کلام پر ایمان لائے ورنہ اُس کی حمایت سے محرُوم رہے گا۔ مُقلّد کی مُسلّم اِطاعت شعاری اُس کے نشوونما کے حق میں رُکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ خُود افروزی کی خُوبی سے بے فیض رہتا ہے۔ اُس کی نفسیات گُولر کے بھُنگے کی سی ہوتی ہے جو اپنے اندھیرے خول کو کائنات سمجھتا ہے۔"

اِس کے باوجُود وہ ایک کہانی سُناتے تھے جس میں اُستاد کو شاگرد سے سیانا گردانتے تھے لیکن اُس میں مزاح کا پہلو ہے۔ "ایک اُستاد نے اپنے شاگرد کو اپنا سارا ہُنر سکھا دیا اور اُسے جانشیں بنا دیا۔

ہوتے ہوتے شاگرد مغرور ہوگیا اور خود کو دنیا کا سب سے بڑا ہنرور جاننے لگا۔ اُس کے اُستاد نے اُسے سمجھایا کہ ہنر لامحدود ہوتا ہے، جو انسان اِس حقیقت سے غافل رہتا ہے، اُس پر ترقی کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔ شاگرد، اُستاد کی نصیحت کو خاطر میں نہ لایا اور اُس کے منہ پر اُسے بُرا بھلا کہنے لگا۔ تنگ آمد، بجنگ آمد اُستاد نے شاگرد کو تلوار کی لڑائی لڑنے کے لیے للکارا۔ بوڑھے اُستاد کی چنوتی پر شاگرد کو ہنسی آئی اور اُس نے لڑائی کے لیے چنوتی قبول کرلی لیکن اُس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اِدھر اُستاد نے لڑائی لڑنے کی تیاری شروع کردی۔ اُس نے پانچ فٹ کی تلوار بنائی اور یہ خبر اپنے شاگرد تک پہنچادی۔ وہ تلوار کی لمبائی پر حیران ہوا لیکن پھر اپنے لیے چھ فٹ کی تلوار بنانے لگا۔ مقابلے کے دن اُستاد اور شاگرد اپنی اپنی تلوار میاں میں رکھے میدان میں اُترے اور ثالث کے اشارے کا اِنتظار کرنے لگے۔ اِشارہ ہوا اور دونوں اپنی اپنی تلوار کے دستے پر لپکے۔ جب تک شاگرد کو اپنی غلطی کا اِحساس ہوا، اُستاد نے میان میں سے خنجر نکالا اور شاگرد کے سینے پر رکھ دیا۔

اہلِ بیت ہیں کہ اہلِ سیف، اپنی اصل کے شجرے رکھتے ہیں اور اُن کی عظمت پر فخر کرتے ہیں ایسے جذبات پر نایا جی یوں طعن کرتے۔ "جو لوگ خود سے نااُمید اور اپنے حال پر شرمندہ ہیں، وہ اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں اور اُسی طرح اپنے آب و اجداد کے کارناموں کو، جو کم و بیش بے ہنریوں اور خوں خرابوں کے خلاصے ہیں۔ وہ لوگ تخلیقی جوہر سے عاری تھے لیکن مُردہ پرستوں نے اُن کے مرثیے گا گا کر انھیں فوق الانسانی خوبیوں کا مالک بنادیا ہے۔ جیسی کسی کی نفسیاتی کیفیت ہے، وہ ویسی ہی زندگی کا فروغ چاہتا ہے اور اُسی کی بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ آدمی کا اِدعا بڑے خیال کا سا ہوتا ہے جس کی عملی صورت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ چوں کہ علم و بیاں، عملی اسلوب کا بدصورت عکس ہوتے ہیں، اِنسان کی دیانت داری کی پہچان ہنر ہے۔ ہنر، ظہورِ ترتیب کا سلسلہ ہے، اِس لیے تہذیب و تمدّن ہنروروں کے ممنونِ منت ہیں نہ کہ نام نہاد پیغمبروں کے۔ حیوانوں کے شجرے ہوتے ہیں اور اِنسانوں کے ہنر، اُن کا ماضی سے رشتہ ہے اور اِن کا مستقبل سے۔ حیوان کی ماضی سے غیر دوئی ہے اور ہنرور کی مستقبل سے۔"

بیج رکھدا آیا جی جگو جگ واہگرو (جب جب پاپ بڑھتا ہے، تب تب بھگوان، اوتار دھارتا ہے، پاپیوں کا ناش کرتا ہے اور بھگتوں کی رکشا۔ سرشٹی کا توازن بھگتوں کے تپ سے ہے اِس لیے بھگوان، بھگتوں کا اِحساس مند ہے) دھارمک گرنتھوں کی اِس بات پر اُن کا ردِ عمل بڑا کڑا تھا۔ "ایسلیے دلیل دعویٰ کرکے اوتاروں نے اِنسانوں کو بہکایا ہے اور دنیاوی ذمّہ داری سے فرار سکھایا ہے اور اُس آفاقی نظام پر ایمان لانے پر اُکسایا ہے جس کی حقیقت نامعلوم ہے۔ کیا خوب؟"

انسان جلدی جلدی اپنی رُوحانی اَور اَخلاقی نفی کو پہنچے تاکہ بھگوان اُس کی مُکتی اَور دُرستی کے لیے اَوتار دھارن کرے! اَوتاروں کے اِس دعوے کو تسلیم کرنا اِس جھوٹ کو سچ ماننا ہَے کہ اِنسان کے جسم میں رُوح نام کی کوئی چیز ہے۔ اِنسان، ہست و بُود کا حِصّہ ہے جیسے نباتات و حیوانات۔ چُوں کہ اِنسان اِشتراکی قدروں کا مُوجِد ہَے اَور حقوقِ حیات کا مُدوّن، اِنسان کا رِشتہ اِنسان سے ہَے اَور یہی ایک دُوسرے کے دُکھ سُکھ کا سبب۔ اَوتار اَور بھگت، ریاکاروں کے سِلسلے کی کڑیاں ہیں۔"

اِنسانی زِندگی کی اَصل وُہ اِس طرح بیان کرتے، "زِندگی ایک ہُنر ہَے۔ اِنسان پر لازم ہَے کہ یہ اپنی ترقّی کے لیے مُسلسل تجدیدِ عہد کرے۔ کمالِ عزم تک پہنچنے کے لیے جتنی کوشش ننانوے فیصد کامیابی پر خرچ ہوئی ہَے اُتنی ہی باقی ایک فیصد پر۔ اِس جدّ و جُہد میں کون کہاں رہ جاتا ہَے؟ یہ اُس کی اپنی بِساط پر ہَے ورنہ جمالِ کمال دعوتِ دِید دیتا ضرور ہَے۔ زِندگی کی تعمیر چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے جو ایسی باتوں پر توجّہ دیتا ہَے، وُہی بڑا آدمی ہَے۔ فِطرت اِس لیے بڑی ہَے کہ یہ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں پر سمپُورن دھیان دیتی ہے اَور اِس کے بڑے بڑے کام اپنے آپ پُورے ہو جاتے ہیں۔"

وُہ ایک کہانی سُنایا کرتے تھے جس کا عُنوان تھا 'پرے سے پرے'۔ وُہ ایسے کاریگر کی کہانی تھی جسے اپنے کمالِ فن پر ناز تھا اَور وُہ ہر کِسی کو حقیر سمجھتا تھا۔ اُس کے ساتھ ہونی یہ ہُوئی کہ اُس کے گھر میں ایک مُسافر مہمان ہُوا جو میمانسک (مشّاق) تھا۔ کاریگر نے بارا گاتے ہُوئے اُسے ڈھینکلی چلا کر دکھائی اَور داد چاہی۔ چُوں کہ کاریگر کے پُرکھے، ڈال اَور بیڑی سے کھیتوں کو سیراب کرتے تھے، وُہ اپنے نئے اَور کارگر ہُنر پر نازاں تھا۔

"ڈھینکلی کا جنتر بیڑی سے اَچھا ہَے! لیکن اِس سے بہتر جنتر بھی ہَے، رہٹ۔"

چاہیئے تو تھا کہ وُہ مشّاق سے رہٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کرتا لیکن اُس کی ہیکڑی نے اُسے ایسا کرنے سے رُوک دیا اَور وُہ اُس کی ہنسی اُڑانے لگا۔ "میاں، تُو نے خواب دیکھا ہَے! مُجھے بتا دیا ہَے، ٹھیک ہَے! کِسی اَور سے مت کہنا، وُہ تُجھ پر ہنسنے گا۔"

"مَیں نے سوچا تھا کہ تیرا اناج کھایا ہَے، بدلے میں تُجھے کُچھ دیتا چلوں لیکن تیری قِسمت میں نہ تھا۔ خیر، اِس میں تیرا قصُور نہیں ہَے! اِنسانی زِندگی عجیب آئینہ ہَے! اِس میں گدھا مُنہ دیکھتا ہَے تو اُسے اِنسان نظر آتا ہَے۔"

مشّاق کا انداز اُس کاریگر سے بھی طنزیہ تھا۔

"دُنیا میں بے وقُوف زِیادہ ہیں اَور ہوشیار کم، اِس لیے تیرے جیسوں کو بہت مل جاتے ہیں۔"

کاریگر نے اپنا معاندانہ رویّہ برقرار رکھا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ کاریگر ڈھینکلی سے اُوب گیا۔ اُس نے رہٹ کے جنتر پر غور کیا جو اُسے اپنے جنتر سے بہتر لگا۔ اُس کا جذبۂ تلاش عود کر آیا جو اُسے ایک راج سے دُوسرے راج میں اور وہاں سے تیسرے راج میں لے گیا۔ وہاں بھی رہٹ نہ دیکھا، وہ مایُوس ہوگیا اور مسّتاتی کو بُرا بھلا کہتا ہُوا گھر واپس لوٹنے لگا۔ اچانک اُس نے سوچا کہ میں اِتنی دُور تک آیا ہُوں کیوں نہ اگلے راج تک جا آؤں۔ وہ اُس راج میں پُہنچا اور رہٹ دیکھ کر حیرانی و خُوشی کے جذبے سے سرشار ہوگیا۔ اُس کا نِکاس ڈھینکلی سے بسیار اور لگاتار تھا۔ بیل رہٹ چلا رہے تھے اور کِسان گاہدی (پاٹ) کی کرسی پر بیٹھا گیت گا رہا تھا۔ وہ مُطمئن مگر نئی بصیرت لئے گھر لوٹا اور رہٹ بنانے میں مصرُوف ہوگیا۔ اُس نے جو رہٹ بنایا اُس کی مال پر دوہرا ڈول بٹھایا اور اُس کا نام دورہٹا رکھا۔

اُنھیں کم مایہ کام کرتے دیکھ کر لگتا کہ زِندگی کی خُوب صورتی اَدنیٰ عمل سے ظاہر ہوتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے۔ کام شرُوع کرنے سے پہلے وہ اُسے ایسے تاڑتے جیسے کوئی سرکش بچّے کی آنکھوں میں تاکے۔ وہ کہتے تھے کہ کام کی نفسیات آدمی کی طرح ہے۔ اِس سے ڈرو تو یہ ڈراتا ہے ورنہ رام ہوجاتا ہے۔

جو اِنسان اپنے مقدُور سے زیادہ جیتا ہے، وہ اپنی دیکھ بھال کے لئے دُوسرے کا محُتاج ہوتا ہے۔ اکیلا معذُور اِنسان، حیوان کی طرح ہے۔ وہ جہاں ڈھے پڑتا ہے، مرجاتا ہے۔ مَیں سارا وقت اُن کی خدمت میں گزُارتا اور اُن سے طرح طرح کی باتیں کرتا، باتیں سُنتا۔ اُن کے کہنے پر مَیں نے اُن کے بیٹوں کو خط لکھ دیا کہ وہ تندُرست ہیں اور اُنھیں کسی قسم کی ضرُورت بھی نہیں ہے۔ اُن کو پیروں پر بیٹھ کر حاجت رفع کرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اُن کی ضرُورت کو مدّ ِنظر رکھتے ہُوئے، مَیں نے تختوں سے کھڑا پاخانہ بنایا۔ برتن کا مقام خالی رکھا۔ نیچے آدھا گز چوڑا، ایک گز گہرا گڑھا کھودا اور چند گُبریلے پکڑ کر اُس میں ڈال دیئے۔ اُن کو گُبریلوں والی بات بہت پسند آئی۔ میری ایجاد اور مُشاہدے کی داد اُنھوں نے اِس طرح دی، "صحیفۂ فطرت میں آغاز کے معنی ہیں، اصل کی جہد ِتکمیل اور صحیفۂ ہُنر میں آغاز، مُشاہدے سے مُنسلک ہے۔ ہُنر ہی ایک طریق ِعمل ہے جو اپنا پارکھ آپ ہے اور ایسا بے لوچ پارکھ ہے کہ دائم صحیح پرکھتا ہے اور یُوں اِرتقا سے اِرتقا کی ضمانت بنتا ہے۔ ہُنر کے عِلاوہ ہر صنف ِعمل عمُومیت کا شکار ہے جو عوام کا ورثہ ہے۔"

عام طور پر ناتوانی کی معذُوری اور موت کا خوف آدمی کو جھگڑالو اور بے رُوح بنا دیتا ہے۔ تایا جی بُڑھاپے کی اِس لعنت سے بری تھے۔ وہ موت کے بارے میں جیسی باتیں کرتے تھے، اُن سے موت، حیات کا اِحیا جان پڑتی تھی۔ "زِندگی ایک توانائی ہے جو صرف ہوجانے پر تجدید چاہتی ہے۔ اِس کی یہ

ضرورت فقط موت سے پوری ہوتی ہے۔ ممات، حیات کا معرضِ شہود ہے۔"

میں اُن کی خدمت کرتا اور باتوں سے محفوظ ہوتا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں پوری طرح اُن کے پاس تھا اور ساتھ بھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے معمولی سے معمولی بات کے جو معنی بیان کرتے اُس کی بلاغت ہمہ جہت ہوتی ۔"کائنات کی اصل جوہر ہے اور انسان کی اصل، ہُنر۔ یعنی ایک وجود سے دوسرے وجود کو پیدا کرنے کے طریقۂ کار کو ہُنر کہتے ہیں۔ چوں کہ اِس کا معیار مقرر ہے، انسان کا روپ سروپ ہُنر ہی سے سنورتا ہے۔ جیسے قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے، اینٹ اینٹ مکان، لیک لیک کھیت، قدم قدم منزل... ویسے ہی ہُنر ہُنر انسان بنتا ہے۔ بے ہُنری، پراگندگی ہے۔ کوئی ہُنر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اُس کے پیچھے ان کہی کوشش کا جہان ہوتا ہے، جس کے لئے سارے حواس ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کی طاقت بنتے ہیں۔"

صحیفوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتے، "اِن کتابوں میں سے دُعاؤں، عبادتوں، جنّتوں، دوزخوں، سزاؤں، جزاؤں ... کی باتوں کو نکال دو تو یہ اچھی کتابیں ہیں!"

"اِن کتابوں میں سے اُن باتوں کو نکال دیا گیا تو اِن میں باقی کیا بچے گا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جو ہم کھاتے ہیں کیا اُسے پورا پچاتے ہیں؟ اُس کا زیادہ تر حصّہ فُضلے کی شکل میں خارج کر دیتے ہیں۔ اُس کا صرف جوہر رکھتے ہیں اور وُہی حیات آفریں جُزو ہے۔ اِسی طرح بھائی چارے کی زندگی گزارنے کے لئے ایک دو اخلاقی باتیں ہی کافی ہیں، جو اِن کتابوں میں موجود ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو، جو تم چاہتے ہو کہ تم سے ہو۔ اپنے عیب پر ملامت کرو، دوسرے کے ہُنر کو سراہو۔" اُنھوں نے صحیفوں کا نچوڑ بیان کیا۔

تہواروں پر جلسے ہوتے اور ڈھاڑی رزمیہ گا کر سناتے۔ اُن کا جوشیلا اندازِ بیاں! سننے والے ویر رس سے سرشار ہو کر جیکارے بُلاتے اور مرنے مارنے پر آمادہ لگتے۔ عوام کے اُس جذباتی ہیجان پر تایا جی یوں تبصرہ کرتے، "جو قوم دوسری قوم کو نیست و نابود کرنے میں اپنی عظمت خیال کرتی ہے، وہ جاہلوں اور قاتلوں کا انبوہ ہے۔ جنگ کو جائز سمجھنا جُرم ہے اور اسلاف کے جنگی کارناموں پر فخر کرنا مجرمانہ خصلت. باہمی عداوت انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر روک لگاتی ہے اور اپنی انتہا میں اُنھیں مجہول بناتی ہے۔ جنگ بھڑکے ہوئے جذبات کا ٹکراؤ ہے۔ یہ کتنے ہی اخلاقی اُصولوں پر پڑی جائے، انسانیت کی بربادی ہوتی ہے۔ جو لوگ جنگ کی بات کرتے ہیں وہ فسادی ہوتے تھے۔ وہ ایسے ہی انسان نُما درندے تھے،

جنھوں نے انسانوں کو انسانوں کے خلاف نبرد آزمار کھا ہے۔ جنگ اور نیکو کاری کو خدا واسطے کا بیر ہے جب کہ ہنر اور نیکو کاری ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ہمیں علم و ہنر کی باتیں کرنی چاہیں۔ صرف علم و ہنر ہی ایسا اندازِ حیات ہے جو انسان کی حیوانی جبلّت کو تخلیقی سمت دیتا ہے۔ ماضی کے جنگ بازوں کے قصیدے پڑھنا لاشعوری طور پر حال کے جنگی عناصر کو بڑھاوا دینا ہے۔ ہمیں ایسے بھیانک کرداروں کو بھلا کر عالموں، فن کاروں اور ہنروروں کو یاد کرنا چاہیے، جن کی روشن خیالی نے ذہنِ انساں کو اجاگر کیا اور اُسے خود آرائی کا فن سکھایا۔ جنگ باز، خون کے بھیانک دریاؤں اور لاشوں کے ہولناک انباروں کے ذمہ دار ہیں اور انسان سے انسان کی نفرت کو تازہ کرتے ہیں۔ جب کہ ہنرور، سُندر کلاؤں اور راحت رساں جنتروں کے موجد ہیں اور انسانی رشتوں کو نئے عنوان دیتے ہیں۔"

وہ 'کرتا سنگھ' کو 'توتا سنگھ' سے ایسے جدا کرتے تھے۔ "اِن دونوں میں خوبیاں اور خرابیاں یکساں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کرتا سنگھ کی کارپردازی اُس کی خوبیوں کو بڑھاتی ہے اور توتا سنگھ کی کارگزاری اُس کی خرابیوں کو۔"

اُن کو کتنے ہنروں پر ملکہ حاصل تھا لیکن وہ کہتے تھے، "میں سیکھ رہا ہوں۔" اُن کے کھردرے ہاتھ کیسی خوبصورت چیزیں تخلیق کرتے تھے! وہ میرے بچپن میں میرے چہرے کو سہلاتے، اُن کے سخت ہاتھ میرے کومل ماس میں چبھتے اور مجھے بُرے لگتے۔ میں اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑتا، سامنے پھیلاتا اور استفسار کرتا۔

"تایا جی، یہ کیا ہے؟"

میں گٹّوں کو چھو کر اُن کی سختی پر حیران ہوتا۔

"محنت کے پھول ہیں!"

وہ گٹّوں کو دیکھ کر میری طرف دیکھتے اور مسکراتے۔

"پھول نرم ہوتے ہیں اور پودوں پر لگتے ہیں؟"

میں اُن کی بات پر شک کرتا اور وضاحت چاہتا۔

"محنت کے پھول سخت ہوتے ہیں اور ہاتھوں پر لگتے ہیں!"

اُن کا چہرہ ایسے روشن ہو جاتا جیسے وہ کوئی دل پذیر چیز دیکھ رہے ہوں۔

"یہ پھول نہیں، گٹّے ہیں!"

میں اپنی سوجھ بوجھ کی روشنی میں اپنی بات منوانی چاہتا۔

"یہ پھول ہی ہیں، محنت کے پھول! تم بڑے ہوگے، ہنرور بنوگے تب میری بات سمجھو گے۔ یہ ایسے پھول ہیں جن کا ثمر، ہنر ہے۔"

وہ اُن ٹھنٹھ نما پھولوں کی اصل بیان کرتے۔

مَیں چاہتا کہ مَیں اُسی وقت بڑا ہو جاؤں اور وہ سب کچھ جان جاؤں جو تایا جی جانتے تھے۔ وہ بے نظیر ترکھان، لوہار، معمار، کاشت کار۔۔۔۔ حکیم تھے۔ وہ جو کام کرتے تھے، اُسے دیکھ کر رشک آتا تھا۔ دراصل وہ صیقل گر تھے جو اپنی نکتہ رسی اور طرح نو سے معمولی سے معمولی چیز کو سنوار کر نفاست کی نظیر بنا دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھ متحرک ہوتے اور وہ ہر حرکت جسے اختراعیت، تجدیدیت، نزاکت ۔۔۔ سے نسبت ہے، ظہورِ مقصود کی آئینہ دار ہوتی۔ وہ لوہے کو ٹھوک بجا کر پرکھتے اور اُس کی اِفادیت کے لحاظ سے اُسے برتتے۔ اُسے ضروری شکل میں بدلنے کے لئے کتنے تاؤں کی ضرورت ہے، اُس کا اندازہ وہ شروع ہی میں لگاتے اور اُس سے کم تاؤ دینے کی کوشش کرتے۔ اِس میں باریک نقطہ یہ ہے کہ لوہا جتنی زیادہ بار گرم کرو اُتنا ہی زیادہ جھڑکتا ہے اور اپنی اساسی خوبی زیادہ گنواتا ہے۔ لوہے کو گھن سے کوٹنا مقصود ہوتا۔ وہ گھن بردار کو اپنی ہتوڑی سے چوٹ کی نشاندہی اور صحیح شدّت کا اشارہ کرتے تاکہ وہ ٹھیک چوٹ لگائے اور تال میل برقرار رکھے۔ گرم لوہا ٹھنڈا ہونے لگتا اور اُن کا اِشارہ ہلکے سے ہلکا اور پھر ساز کی جھنکار کی طرح ڈوبتے ڈوبتے ڈوب جاتا۔ کئی اوزار وہ خود بناتے اور انھیں زنگ سے بچانے کے لئے سیاہ تاب کرتے۔ وہ اُن کی دھار لگاتے۔ اَبرِ میں دھار کی جھلک، برق کی لپک کی طرح نظر آتی۔ وہ اوزار خوبی میں سٹینلے کے اوزار کا مقابلہ کرتے تھے۔ اُن کا یقین تھا کہ جو کاریگر اوزار بنانے اور مرمّت کرنے کا فن نہیں جانتا، وہ فن کی باریکیاں نہیں پا سکتا۔ اپنے سوہان، وہ آپ ٹکا کرتے تھے۔

برتن اور اوزار کی بدیہی خوبصورتی اپنی جگہ نشاط انگیز ہے لیکن وہ اوزار کی اندرونی خوبی ہے جو اِسے برتن سے الگ کرتی ہے۔ وہ عمدگی گرم اوزار کو پانی میں بجھانے سے حاصل ہوتی ہے۔ کم بجھانے سے اوزار نرم رہتے ہیں اور سخت کام کے آگے ٹھہر نہیں سکتے ہیں۔ زیادہ بجھانے سے اوزار شیشے کی طرح بے لوچ اور خستہ ہو جاتے ہیں اور دھار قائم نہیں رکھ پاتے ہیں۔ تپائے ہوئے اوزار کو پانی کی نپی تُلی مقدار ملے تبھی فولاد اپنے جوہر کو اوزار میں منتقل کرتا ہے۔ اُن کے آب دینے کے عمل کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔ وہ گرم اوزار کے منہ کو آہستہ آہستہ پانی کے قریب لاتے اور اُسے پانی پلا کر فوراً اُٹھا لیتے۔ اُس طویل عمل میں اُن کی وہی چھوٹی سی حرکت عینِ منتہائے کمال ہوتی جو اوزار کے خاطر خواہ

جمال کا باعث بنتی۔

وُہ کسی کام کو دوبارہ کرنے کے سخت خلاف تھے۔ اُن کا اُصول تھا کہ کام پہلے ہی ہاتھ میں ٹھیک ہونا چاہیئے۔ وُہ کہتے تھے کہ ایک کام خراب ہونے سے سو کام خراب ہوتے ہیں۔ ایک بار مَیں نے پُوچھا، کیسے؟ وُہ بولے، اِس لوہے کو لو۔ اِسے کان سے کھودا گیا، اُٹھایا گیا، کارخانے میں لے جایا گیا، ڈھالا گیا اور کاٹا گیا۔ یہ اَور کتنے ہاتھوں اَور عملوں سے ہوکر مُجھ تک پُہنچا ہے۔ مَیں اپنی بے ہُنری سے اِسے خراب کر دُوں تو مَیں کتنے لوگوں کی محنت کا جواب دِہ ہُوں۔ فِطرت کا کارخانہ ایک خزانہ ہے، اِسے سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہیئے۔

عام طور پر کاریگر اپنے اَوزار ایک پیٹی میں رکھتے ہیں جیسے کسان ٹوکرے میں آلُو، پیاز۔ تایا جی کے پاس اَوزار کے لئے باقاعدہ صندُوق تھا جس کے آٹھوں کونے پیتل کے کلیٹوں سے مڑھے ہُوئے تھے۔ جس دن وہ اُنھیں نمک اَور نیبُو سے صاف کرکے راکھ سے چمکاتے، وُہ سونے کے ٹکڑے لگتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کے پاس چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے وقت تھا۔ صندوق کا تالا تختے کے اندر تھا جس کا مُنہ، مُکھ پان کے نیچے چُھپا ہُوا تھا۔ صندُوق کا ڈھکن اَور اُس کا قبضہ لمبائی میں برابر تھے۔ اُس کی چاروں دیواروں اَور ڈھکن کے اندرون تسمے لگے ہُوئے تھے جن میں وُہ دھار والے اَوزار ٹانک کر رکھتے تھے اَور دُوسرے اَوزار فرش پر ترتیب سے قطاروں میں۔ صندُوق کھولتے ہی ہر اَوزار اپنی مخصُوص جگہ پر ایسے نظر آتا جیسے حکیم کے مطب میں ہر دوا کی شیشی۔ اُسی طرح اُن کا پربچوں (کیلوں) کا بکس تھا جس میں ہر سائز کی پریچیں الگ الگ خانے میں رکھی رہتی تھیں۔ وُہ کام کرکے ہٹتے، اَڈّے پر احتیاطاً چُمبک پھیرتے اَور گری پڑی پریگ اُٹھاکر وہاں رکھ دیتے جہاں اُس کی جگہ ہوتی۔ اُن کا وُہ چُمبک میرے بچپن کا بڑا ہی پیارا کھلونا تھا۔ صندُوق کے سامنے کی دیوار پر ایک آنکڑا لگا ہُوا تھا جس میں جھوٹا لگا کر وُہ اَوزار کے دم کی آخری دُرستی کرتے تھے۔

اُنھوں نے میرے لئے چاقُو بنایا۔ پھل پر آکر کام رُک گیا۔ اُن کے پاس لوہے میں چھید کرنے کا برما نہیں تھا۔ ویسے تو سُنبے سے چھید ہو سکتا ہے لیکن بالکل گول چھید برمے ہی سے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے پُرانا تکونا سوہان لیا اَور اُس سے برما بنانا شرُوع کیا۔ کام کٹھن نہ تھا، وقت کھپاؤ تھا۔ اُنھوں نے دُھرے کا ماپ لے کر سوہان کے ضلع کا ناپ نِکالا اَور مُجھے اُس کام پر لگا دیا۔ پھر کیا تھا! جب تک مَیں نے سوہان کو رگڑ رگڑ کر حسبِ ضرورت نہ بنا لیا، پتھری سے سر اُوپر نہ اُٹھایا۔ اُس میں کُچھ کام اَور تھا جس کا مُجھے اندازہ نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس کے سرے کو نئے زاویے پر رگڑ کر اُس میں سے عمُودی نوک نِکالی اَور یُوں لوہے

میں چھید ڈالنے کا برما بنایا۔ باقی کام بھی خیال خیز تھا لیکن وقت لیوا نہیں تھا، انہوں نے ایک چوکور لکڑی میں گول چھید کیا اور اُس میں برمے کو ٹھوکا۔ چُوں کہ چھید، دائرے میں برمے سے کم تھا۔ اُس نے اُسے تکون میں بدل دیا۔ اُنھوں نے لکڑی شکنجے میں پکڑی، برمے پر ہلکی سی چوٹ لگائی اور یُوں برمے کے زائد حصّے کو توڑ کر الگ کر دیا۔ اُنھوں نے لکڑی کو تیشے سے پھاڑ کر اُس میں سے برما نکالا، اُسے کمانی میں جڑا، پھل میں جہاں چھید ڈالنا تھا وہاں سُتبے سے نشان پکّا کیا، چھید ڈالا، برا اُٹھایا اور دُھرّا لگایا۔ اُنھوں نے دستے میں دُھرے سے کم قُطر کا چھید کیا تھا۔ اُس کا فائدہ یہ ہُوا کہ دُھرّا اپنی جگہ جم گیا اور اُس پر ٹوپی بٹھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ اُنھوں نے اُسے گھما پھرا کر دیکھا۔ اُس کی روانی کہہ رہی تھی کہ اُس میں نہ لٹک ہے اور نہ ہی پکڑ۔ میں نے اپنی بے قراری میں چاقو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اُنھوں نے کہا، "ذرا ٹھہرو! اِس میں کچھ اور ضروری کام ہے۔"

"کیا ضروری کام ہے؟" مَیں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہُوئے کہا۔

"تھوڑا صبر کرو اور دیکھو!"

اُنھوں نے ایک تنکا لیا، اُس کے ایک سرے سے موبل آئیل اُٹھایا، دُھرے پر گرایا، پھل کو رمایا اور بند کر کے مجھے دے دیا۔ مَیں چاقو لے کر بہت خُوش ہُوا اور پھر اُس سے زیادہ حیران، جب اُنھوں نے کہا، "اِسی کام کو سانچے سے کرنے سے اِتنے وقت میں درجن چاقو بنائے جا سکتے ہیں۔"

وُہ لکڑی سُونگھ کر، یا چھیل کر، یا ایک سے ایک ٹکرا کر اُس کی قسم پہچان لیتے تھے۔ مکان کے لیے وُہ سِرس کی لکڑی کو سب سے اہم مانتے تھے، دُوسرے درجے پر کیکر کو، تیسرے درجے پر ساگوان کو اور چوتھے درجے پر شیشم کو۔ اِس کے باوجُود وُہ کالی شیشم کو سونا کہتے تھے اور رکھائی کے کام کے لیے نہایت موزُوں سمجھتے تھے۔ سِرس اور کیکر کی لکڑی میں ایک کسیلا پن ہوتا ہے جو اُسے دیمک اور گھن سے بچاتا ہے۔

تھانیدار نے اپنے نئے گھر کے لیے سِرس کٹوایا جس کا عملہ ترلوچن سنگھ اور کرتار سنگھ نے چیرا۔ لکڑی سُوکھنے پر دروازے اور کھڑکیاں بنانے کا کام اُنھیں کو سونپا گیا۔ کام پر جانے کے لیے وُہ اوزار اِکٹھے کر رہے تھے کہ تایا جی نے اُن سے کہا، "سِرس کی لکڑی کڑوی ہوتی ہے۔ کام کرتے وقت اُڑتی ہے اور خارش پیدا کرتی ہے۔ تُم رُوئی کے پھاہے اور ڈھاٹے باندھ کر کام کرنا ورنہ چھینکتے چھینکتے مر جاؤ گے۔"

"اُسے چیرتے وقت ایسا کُچھ نہیں ہُوا تھا!"

کرتار سنگھ نے اپنے تجربے کا خُلاصہ بیان کیا۔

"کڑیاں اور تختے گیلے تنے سے چیرتے ہیں، جن کا بُرادہ نہیں اُڑتا۔"

تایا جی نے اُسے گیلے اور سوکھے برس کے رویّے میں فرق بتایا۔

"کچھ نہیں ہوتا، چلو! دیکھا جائے گا۔"

اُن دونوں میں سے ترلوچن سنگھ ہٹیلا تھا۔ اُس نے کرتار سنگھ کو ٹھوکا دیا اور اُن ضروری چیزوں کے بغیر کام کرنے چلے گئے۔ وُہ کام کرنے لگے اور چھینک چھینک کر بے حال ہونے لگے۔ ترلوچن سنگھ چُپکے سے آیا اور پھاہے اور ڈھاٹے لے گیا۔

تایا جی کے حافظے کا پُورا گاؤں قائل تھا۔ ہاڑھی ہو کہ ساونی، پٹواری اُن کے پاس آتا اور وہ جہاں بیٹھے ہوتے وہاں خسرہ لے کر بیٹھ جاتا۔ وُہ وہیں بیٹھے بیٹھے پُورے گاؤں کی گرداوری (ہر فصل پر پٹواری کھاتا کرتا ہے کہ کون سا کھیت کس نے بویا ہے اور کیا بویا ہے) کروا دیتے۔ کھیتوں کے رقبے انھیں کھتونی کے مُطابق یاد تھے۔ کوئی پُوچھتا کہ فلاں کھیت کے لئے فلاں بیج کتنا درکار ہے؟ وُہ اُسے یُوں بتا دیتے جیسے وُہ اعداد و شُمار اُن کی نوکِ زباں پر ہوں۔

راج مل آہرن کے لئے فُٹ بھر موٹی لوہے کی سلاخ لایا۔ وُہ لمبائی میں بڑی تھی اِس لئے کام میں لانے کے لئے زمین میں گاڑنی ضروری تھی۔ تایا جی نے اُسے رائے دی، "اِسے گاڑتے کیوں ہو؟ کاٹ کر دو بنا لو۔"

"واہ، یہ لکڑی ہے کہ اِسے کاٹ کر دو بنا لُوں! اسپات ہے، اسپات!" وُہ مسکرایا اور تضحیک پر مبنی لہجے میں بولا۔

"اِسپات، لکڑی سے آسانی سے کٹتا ہے! تُم لوہار ہو اور خُود ماہر ہو، ایسا کیوں کہتے ہو؟" اُنھوں نے فنکارانہ انداز میں کہا۔

"یہ لکڑی سے آسانی سے کٹتا ہے! اِس میں سے ایک آہرن اپنے لئے کیوں نہیں کاٹ لیتے؟"

"تمہاری یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے!"

راج مل معمُولی کاریگر نہ تھا۔ اُس کی ساری عمر آہن گری میں گُزری تھی۔ وُہ خان فلاّت کی ورکشاپ میں فورمین تھا اور خُود کو فلاطون کا اُستاد سمجھتا تھا۔ ویسے وُہ ایسا ویسا نہ تھا، ماہرِ فن تھا۔ تقسیمِ وطن کے بعد اُس پر روزگار تنگ ہو گیا اور وہ ممنوع ہتھیاروں کا کاروبار کرنے لگا۔ اُس نے تایا جی کا لوہا مانا تھا تو مُضائقہ نہ تھا۔

اُس کی تیز فہمی کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ جِسے مَیں نے اُسی کی زبانی سُنا تھا۔ "مَیں نے بارہ سنگھا

کو بارہ بور کا پستول بنا کر دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نہ اُسے پستول چلانا آتا تھا اور نہ ہی مجھے۔ وہ ضد کرنے لگا کہ میں اُسے پستول چلا کر دکھاؤں ورنہ بیعانہ واپس کر دوں۔ میں پورے بیعانے کا دارُو پی چکا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا! میں اُسے کانگڑی کے باغوں میں لے گیا اور ایک ایسا پیڑ تلاش کیا جو میرے کاندھے کے برابر دو شاخے میں بدلا ہوا تھا۔ میں نے کارتوس بھرا، گھوڑا پیچھے ہٹایا، پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑا دو شاخے میں رکھا اور تنے کی آڑ میں جھک گیا۔ بارا سنگھ میرے پیچھے کھڑا تھا اور بے قراری سے بار بار پوچھتا تھا، کیا دیر ہے؟ جلدی کرو! مجھے حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ گھوڑا دباؤں۔ اُسی کشمکش میں میرے دل میں خیال آیا کہ اگر پستول اُلٹا چل گیا اور میرا ہاتھ جاتا رہا تو میں کیا کروں گا؟ اپنی روزی کیسے کماؤں گا؟ میں نے جھٹ کھبّے ہاتھ میں پستول لیا اور داغ دیا۔ گولی ہی جانے کہ وہ کدھر گئی! بارا سنگھ گرجدار آواز سُن کر خوش ہو گیا۔ وہ پستول لے گیا اور پیازوں کا ٹوکرا مُفت دے گیا۔"

تایا جی کی ہُنر بیں نظر بڑی خیال آرا تھی۔ "ہُنر ماورائے اِدراک ترنگ کی حقیقت ہے۔ یہ گوش رَس، دیدہ رَس، اِحساس رَس لطافت کا طریقِ ظہور ہے، جو غائب کو حاضر سے ملاتا ہے۔ حالاں کہ یہ جِسمانی حرکت سے پیدا ہوتا ہے، یہ اپنے وجود میں رُوحانی ہے۔ چُوں کہ یہ جمالیاتی قدروں کا داعی ہے، یہ ہر ادنیٰ چیز کو اعلیٰ بنانے اور اُس کی کایا پلٹنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔"

وہ اپنے فانے، ہتوڑے، چھینیاں، سنسیاں، راج مل کے لوہار خانہ میں لائے اور ایک کٹوری میں موبل آئیل۔ اُس کام کے لئے اُنھیں گھن کی بھی ضرورت تھی، راج مل نے اپنا گھن دیا۔ اُنھوں نے اُس کے پھل اور دستے کا مُعائنہ کیا اور اُسے رہنے دیا اور مجھ سے اپنا گھن منگوایا۔ اُس گھن کا پھل راج مل کے گھن کے مقابلے میں سپاٹ تھا اور دستہ لمبا۔ تایا جی کے اوزار میں سے چھینیاں قابلِ ذکر ہیں۔ چار اِنچ لمبی، ایک اِنچ چوڑی چھینیوں کے دَم، مُنہ سے لے کر سَر تک ملے تھے۔ دَم کو مُنہ سے سَر کی سمت متوازی چیرنے سے خط کے دونوں اطراف ساڑھے سات ڈگری کا برابر زاویہ بنے۔ میں اُن چھینیوں کی باڑھ کو کیسے بیان کروں؟ وہ نہ تیشے کی طرح تیز تھی اور نہ ہی پھانے کی طرح ٹھس، اِن دونوں کے درمیان ایک لکیر تھی۔ ہاڑھی قریب تھی اور لوہار خانہ میں کسانوں کی بھیڑ تھی جسے دیکھو اپنی ہانکتا تھا اور گھوم پھر کر اسی نتیجے پر آتا تھا۔ اِتنی موٹی سلاخ کاٹنی ناممکن ہے! اور وہ بھی چھینی سے!

"اِسے نئے طریقے سے کاٹنی ہے، موبل آئیل سے!"

رام سنگھ نے پھبتی کسی۔ کچھ لوگ ہنس پڑے اور اُس کا جُملہ دُہرانے لگے۔

"ٹھیک ہی تو ہے! یہ موبل آئیل ہی سے کاٹنی ہے۔ سب کے سامنے، یہیں! آپ لوگ

دیکھتے رہیے۔ جہاں حرکت ہے، وہاں پُرزہ ہے اور جہاں پُرزہ ہے، وہاں چکنائی ہے۔"

اُنھوں نے اُس کی بات ایسے دُہرائی جیسے تحقیق اور صُلح جوئی اُن کے ہُنر کی سَرشت ہو۔

وُہ کام کرتے ہُوئے خاموش رہتے تھے لیکن غور کرو تو بولتے محسُوس ہوتے تھے۔ اُن کا رُوپ سرُوپ، روم روم، انگ انگ۔۔۔ اپنی زبان آپ تھا۔ اُن کی نَقل وحرکت موسیقی تھی جو آنکھوں سے سُنی جاتی تھی۔ مَیں نے انھیں لکڑی خرادتے ہُوئے دیکھا تھا۔ اُن کے پاس نہ کوئی نقشہ ہوتا تھا اور نہ کوئی نمُونہ لیکن وُہ اپنے ہاتھوں اور پیروں اور آنکھوں اور اوزار کی مدد سے لکڑی میں سے جیسی شکل نکالتے، اُسے دیکھ کر چھُونے کو جی چاہتا۔ وُہ جس آسانی سے لکڑی کی لمبائی اور چوڑائی اور گہرائی کو کھولتے، اُس سے لگتا کہ وُہ شکل وہاں پہلے ہی سے موجُود ہے جس کی رُونمائی کے لیے اُنھوں نے صرف بھرتی ہٹائی ہے۔

فِطرت اس لئے خُوبصُورت ہے کہ رواں دواں ہے اور محوِ تخلیق بھی۔ اِس لحاظ سے ایک فن کار ہی ہے جو فطرت کا ہم صِفت ہے۔ اِس کے تخلیقی لمحوں میں اِسے دیکھنا سُہانے اور تھرکتے منظر کا نظارہ کرنا ہے کیوں کہ اُس وقت یہ عام زندگی سے زیادہ ثابت اور سیّار ہوتا ہے۔

تایا جی نے سَلاخ کا وسط شمار کیا، کوئلے سے اُسے محیط پر بڑھایا اور بُستے سے پکّا کر دیا۔ اِدھر اُنھوں نے سَنسی میں چھینی اُٹھائی اور اُدھر اکی چند نے ہتوڑا سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے اعضا اور کام میں وُہ تال میل آ گیا جِس کا ذکر مَیں نے اُوپر کیا ہے۔ ہر ضرب کے بعد وُہ چھینی اُٹھاتے، سلاخ گھُماتے، چھینی کا مُنہ تیل میں ڈُباتے اور اُسے اُٹھا کر سلاخ پر رکھتے۔ ہتوڑے کے اُوپر اُٹھنے اور چھینی پر برسنے کا وقفہ، دِل کے دھڑکنے کی طرح تھا جو ایک مخصُوص لمحے میں اپنا عمل نہ دُہرائے تو نظامِ عناصِر انتشار کا شکار ہو جائے۔ مَبادا چھینی زیادہ تیل لے اُنھوں نے کٹوری میں ٹاٹ کا ٹکڑا رکھ دیا۔ کاٹ آدھا انچ گہری ہونے پر اُنھوں نے چھینی رکھی، سلاخ گھُمائی اور دائرے کا وُہ حصّہ اُوپر لایا جسے خاص منصُوبے کے تحت کھُڑا رکھا تھا۔ اب اُنھوں نے فانہ اُٹھایا۔ اُس کے مُنہ اور گالوں پر تھُوکا اور اُلٹ پلٹ کر مٹّی میں رگڑا۔

ہمارے پاس اوزار پوجنے کی پَرم پرا (روایت) ہے۔ اوزار پر تھُوکتا اِس کی پوِترتا بھنگ کرنا ہے۔ مَیں اُسے کاریگر نہیں مانتا جو اوزار کی بے حُرمتی کرتا ہو۔

رام سِنگھ خاندانی لوہار تھا۔ وُہ تایا جی سے مخاصمت رکھتا تھا اور اُنھیں نیچا دکھانے کی تاک میں رہتا تھا۔ دیکھنے والوں میں وُہ موجُود تھا، اُس نے اُن پر الزام لگایا۔ اُس کا بے ساختہ لہجہ اِس بات کی چغلی کھاتا تھا کہ اُسے کام کے بننے سے زیادہ بگڑنے میں دِل چسپی ہے۔

"اور کچھ؟" تایا جی نے اُس سے سُوال کیا۔

اُن کے مِزاج کی خصُوصیّت تھی کہ وُہ کہنے والے کی پُوری بات سُنتے تھے اور اُسے کاٹتے نہ تھے

اُن کی توجّہ میں اُن کی خاموشی اِس فِراست کی گواہ تھی کہ فطرت کا خاموش ضمیر اُس کے تخلیقی وِجدان کی سنجیدگی کا ردِّعمل ہے۔

"اِتنا کیا کم ہے؟ اور ..."

اُس نے حسبِ عادت بات بڑھانی چاہی لیکن وریام سنگھ کی کُہنی کھا کر چُپ سادھ لی۔

"جیسے جُلاہے کا تھُوک اُس کے لئے سریش ہوتا ہے ویسے ہی کاریگر کا تھُوک، جنتر۔ جنتر کا وقار اسی میں ہے کہ اِسے ٹھیک طور سے اِستعمال کیا جائے۔"

اِتنا کہہ کر وُہ رُک گئے اور فانے کی طرف دیکھنے لگے جیسے اپنے خیال کے بارے میں اُس سے کچھ پُوچھ رہے ہوں۔ پھر بھرے پُرے لہجے میں بولے، "کاریگر کا ہُنر، کاریگر کی پہچان ہے۔ یہ نہ کسی کی تصدیق کا مرہُونِ اِحسان ہے اور نہ ممنونِ بیاں کیوں کہ یہ اپنا صداقت نامہ آپ ہے۔ دھرتی پر صرف اِنسان کا کینہ ناپاک ہے! دُوسری ہر شَے اپنی جگہ پاک ہے۔"

اُنھوں نے فانے پہ پھر تھُوکا، مٹّی میں رگڑا، اُٹھا کر سلاخ پر مار کر فاضل مٹّی جھاڑی اور اُسے اَن کٹ گھیرے کے ایک طرف لگایا اور اُسی طرح دُوسرا فانہ دُوسری طرف۔ فانے کاٹ میں جم گئے تو امی چند نے گھَن اُٹھایا۔ وُہ ایک چوٹ اِس فانے پر لگاتا اور دُوسری اُس پر۔ چند بھرپور چوٹیں لگا کر وُہ گھَن نیچے رکھ کر سلاخ پر جُھکا اور اُسے اُسی طرح پا کر نااُمید سا ہو گیا۔ اُس کی مایُوسی سے فائدہ اُٹھا کر تماشائی آگے بڑھے اور سلاخ کی مضبُوطی کو سراہتے ہُوئے تایا جی کو ایسے دیکھنے لگے جیسے اُن کی ناکامی پر دِل ہی دِل میں ہنس رہے ہوں۔ تایا جی جوش سے اُٹھے، اُنھیں پرے دھکیلا اور امی چند کی ہمّت بندھاتے ہُوئے اُونچی آواز میں بولے "جوانا! پہاڑ توڑنے کے لئے پہاڑ کی سی ہِمّت چاہیے! ایک کراری تڑی دے!"

امی چند نے گھَن اُٹھایا، اُس کی مرضی میں نئی سرگرمی تھی۔ وُہ لہک کر چوٹ کرتا جیسے سلاخ کو دھمکاتا۔ سلاخ زمین کے اندر دھنستی دھنستی رُک گئی تھی جیسے چوٹ کا مُقابلہ اپنی ہٹ سے کر رہی ہو۔ ناگہاں ایک چوٹ کی آواز بدل کر آئی گویا سلاخ کی طرف سے اعلانِ تسلیم کر گئی۔ امی چند نے پنجوں پر اچھل کر گھَن لہرایا اور کچکچا کر بولا، "چل بھی پیاری!"

اُدھر وُہ وار ہُوا اور اِدھر سلاخ ٹُوٹ کر دو ٹُکڑے ہو گئی۔

واہ واہ کا شور اُٹھا۔ وُہی لوگ جو گھڑی بھر پہلے بدظن اور طنزاً خوش نظر آ رہے تھے، اُس کام کو ناممکن سمجھ رہے تھے آپس میں ہاتھ مِلانے لگے جیسے اُس کامیابی کا سہرا اُن کے سر ہو۔

تایا جی لسان الدہر تھے اور ایسی باتیں کرتے تھے جو وقتی تقاضوں اور سماجی مُشکلوں کا کھرا حل

تھیں۔ وہ کہتے تھے، "عام آدمی کے لیے سچ کا متقابل جھوٹ ہے اِس لئے کہ سچ پرکھنے کے لیے ہُنروری کی ضرورت ہے اور عام اِنسان اِس لیاقت سے بیگانہ ہے۔ ہُنرور کے لیے سچ کا متقابل سچ ہے جس کا دُوسرا نام ہُنر ہے۔ کہاں اور کب کون سا ہُنر کام میں لاتا ہے یہ ہُنرور کی ضرورت ایجاد پر موقوف ہے۔ اوزار اور ہُنر میں حرکی توازن ہے اور یہی اِن کے نشو ونما کا راز ہے۔ اوزار جرِ ثقیل ہیں! اوزار سمتُ الراس کی دلیل ہیں! اوزار نوعِ اِنساں کی بہبودگی کے کفیل ہیں۔ اہلِ مذہب کے اِدّعا کے برعکس اِنسان کے جسم میں رُوح نام کی کوئی چیز نہیں ہے جسے کہ بچایا جائے کسی کو بچانے کی ضرورت ہے تو وہ ہُنرور ہے کیوں کہ اِس کا ہُنر، وقت کا تسلسل ہے اور اِس پر آنے والی نسلوں کا قرض۔ ہر دور کا ہُنرور وہ راہ بر ہے جو آیندہ نسل کے لئے زِندگی کی نئی راہ دِکھاتا ہے اور تا حدِّ اِمکاں اِسے قابلِ سفر بناتا ہے۔"

اوزار ایجاد کرنا اُن کی صلاحیت کی اُپج تھی اور اُنھیں صاف، سر تیز رکھنا اُن کی ضرورت کی مصلحت۔ وہ کہتے تھے، "خُوب صُورتی تا حدِ خُوب صُورتی، بدصُورتی کو نُمایاں کرتی ہے۔ یہی خُوبی ہُنرور کی بھی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ اپنے آپ کو عوامُ الناس سے الگ نہ کر سکتا۔ جس طرح خُوب صُورتی کی زِندگی خُوب صُورتی سے ہے اُسی طرح ہُنرور کی زِندگی ہُنر ہے۔ خُوب صُورت اوزار ہُنرور کی مہارت کی شہادت ہے اور دماغی چوکسی کی علامت۔ کج دِماغ تخلیق کرنے کے نااہل ہوتا ہے اور جو اِس خُوبی سے ناچار ہے، نظامِ اِنساں میں اُس کی ہستی بے کار ہے۔ اُس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔ فطرت اور ہُنرور کا تخلیقی رویّہ ہی اِن دونوں کی ہمیشگی کا ضامن ہے۔ نازک فرق یہ ہے کہ فطرت کی تخلیقی یکسانیت اُس کی خُوبی ہے اور ہُنرور کی ہُنری یکسانیت اِس کا انحطاط۔ ہُنرور پے در پے بہتر سے برتر تخلیق کرتا ہے اور یُوں اپنے تخلیقی رُجحان کو تازہ دَم رکھتا ہے۔ جو کوئی اِس سطحِ حیات کو نہیں سمجھتا، ہُنرور کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔"

راج مل کی قدر شناسی میں آگہی کا جزو تھا۔ وہ اُٹھ کر سلاخ کے ٹکڑوں کے پاس بیٹھ گیا اور اُن کا مُعاینہ کرنے لگا۔

"سادھوسیاں! دائرے کے آدھا اِنچ نہ کاٹنے کی وجہ کیا ہے؟" اُس نے سلاخ کے اُس حصّے پر اُنگلی پھیرتے ہُوئے پُوچھا جو پُوری کاٹ میں سے الگ نظر آرہا تھا۔

"یہ ہُوئی ناں بات!"

اُنھوں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی گویا اُس کے تحقیق طلب رویّے کی داد دی۔

"اِس کام میں یہی نکتہ ہے! تم نہ بھی پُوچھتے تو میں تمہیں ضرور بتاتا۔ یہ حصّہ کاٹ دینے سے فانہ فانے کے برعکس چھینی کا کام کرتا اور دو فانے ایک ساتھ نہ لگائے جا سکتے۔ سلاخ فانوں کے دباؤ سے ٹوٹی

ہے نہ کہ چھینی کی کاٹ سے۔ کاٹ نے اتنا کام کیا ہے کہ درز کو سیدھ دکھائی ہے ورنہ سلاخ ٹیڑھی ٹوٹ سکتی تھی۔“

وہ کہتے تھے کہ فانہ ٹھیک جگہ لگانے سے پہاڑ کو پھاڑا جا سکتا ہے۔

وہ ایسے ہنرور تھے جو ہنر کی باریکیاں چھپاتے نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہنر ہی ایسی دولت ہے جو بانٹنے سے بڑھتی ہے۔ انھوں نے راج مل سے لاڈ سے کہا، ”میرے مل! میں ایک بات تجھے اور بتاتا ہوں۔ فانے کو مٹی لگانے کا مطلب یہ ہے کہ چھینی کی کاٹ کے اطرافی کنارے شیشے جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سے فانہ پھسل کر اچھل سکتا ہے۔ مٹی نہ لگانی ہو تو کناروں کو سُنے سے کھردرا کر لینا چاہیئے۔“

وہ ہر کام کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ زندگی سے ان کا رویّہ فطرت کی تقلید تھا، ”فطرت کے حسنِ دوام کا راز یہی ہے کہ فطرت معتقدِ جمال ہے۔ یہ اپنے ہنر کی پیروی میں جزو و کُل کا خیال رکھتی ہے اور جسے اس کے جمال تک پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔ اسے بے تکلف تلف کر دیتی ہے۔“

اور یہ طرزِ حیات ان کی بڑائی تھی کہ وہ کسی سے بلا ضرورت کبھی کچھ نہ لیتے تھے۔ وہ راج مل کی پیٹھ ٹھونک کر چلے آئے اور اپنے حصے کی سلاخ اسے دے آئے۔

”سادھو سیاں! تجھے سلاخ کا آدھا حصہ نہیں لینا تھا تو اسے کاٹا کیوں تھا؟ اس کاروبار میں تجھے کیا ملا؟“ بوٹا سنگھ نے حیران ہو کر ان سے پوچھا۔

”نئی خود آگہی!“ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

”نئی خود آگہی؟“

بوٹا سنگھ کو کچھ اور نہ سوجھا اور اس نے ان کا جواب، سوال کی طرح دہرایا۔

”اتنی بڑی سلاخ میں نے پہلے کاٹی نہ تھی۔ مجھے خیال تھا کہ ایسے کاٹی جا سکتی ہے۔ راج مل نے مجھے موقع دیا تبھی میں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکا۔ ورنہ میرا خیال، خیال ہی رہتا اور مجھے اس کی سچائی ناسچائی کا علم نہ ہوتا۔ اپنے خیال کو ہنر کے درجے تک پہنچانے کے لیے میں، اس کا احسان مند ہوں۔ میں آدھی سلاخ لے آتا تو اس کا احسان کیسے چکاتا؟“

انھوں نے اپنی بات کھول کر بیان کی تو اس کی عملی اور اخلاقی حجت بھی سامنے آگئی۔

”اپنے ہنر کو چھپا کر رکھنا چاہیئے! تم نے اسے باریکیاں تک بتا دیں“۔ بوٹا سنگھ اپنی بات پر اڑا رہا اور اس نے انھیں لتاڑنے کے سے انداز میں جتایا۔

ایک چراغ دوسرے چراغ کو جلاتا ہے تو اُس کا اُجالا کم نہیں ہوتا ہے۔ اِس سے بڑھ کر دُنیاوی اثاثے کو پانے کی خوشی عارضی اور خود کو پانے کی دائمی ہے۔ کسی نئے ہُنر کا پانا اپنی تجدید کرنا ہے۔" انھوں نے احساس سے چھلکتے ہوئے کہا۔ ہم اوزار سنبھال کر گھر جانے لگے لیکن وُہ وہیں کھڑا رہا۔ بے سروپا، بے فیض، بے پیرا۔

مَیں نے کتنے ایسے ہُنرور دیکھے تھے جو کام جانتے تھے لیکن اُس کی فنّی باریکیاں نہ بتا سکتے تھے تایا جی ایسے ہُنروروں کو دست کار کہتے تھے، "وُہی دست کار، ہُنرور کے مرتبے کو پہنچتا ہے جو عمل کے ردِ عمل کو سمجھتا ہے۔ ردِ عمل کا تجزیہ ہی باعثِ ارتقائے ہُنر ہے۔" وُہ ہُنروروں کو دُنیا کے ہر خیال کا موجد مانتے تھے اور جس طرح اُنھیں پیغمبروں اور اوتاروں پر فوقیت دیتے تھے وُہ اُنھیں کا حق ہے۔ "ہُنرور اور پیغمبر میں نُمایاں فرق یہ ہے کہ ہُنرور اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا کر اُس کے صحیح ہونے کی ذِمّہ داری نبھاتا ہے جب کہ پیغمبر اپنے خیال کو قرض بنا کر مُسلّط کرتا ہے۔ وُہ خیال پرستی جو اپنی سچائی کی ضمانت نہ دے سکے، وہم پرستی ہے۔ اور وہم پرستی، خودکشی سے زیادہ مُہلک ہے کیوں کہ اِس کا حلقۂ اثر، ذاتی ہوتے ہوئے سماجی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا ترکہ بلا وصیت نامہ ہے جو وُرثا کو اُن کے حصّے سے زیادہ ملتا ہے۔"

وُہ کہتے تھے، "سماجی قدروں کی یکساں روی کا نام اخلاق ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ ہُنر، زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا آلۂ کار ہے اور مُسلسل کاوشوں کے سلسلے کی پے در پے تجدید۔ اِس کے تشریحی و توضیحی پہلو نت نئے رُجحانوں کو جنم دیتے ہیں اور اپنی ترقّی کی تیزی بنتے ہیں۔ ہُنرور ایک بار ناکام ہو سکتا ہے، دو بار ناکام ہو سکتا ہے بالآخر کامیاب ضرور ہوگا۔ ناکامی، کامیابی کا سُراغ ضرور دیتی ہے۔ سوچو تو ناکامی ہی کامیابی کی سیڑھی ہے۔ فطرت اور ہُنرور مُتقابل ہیں لیکن وُہ ہُنرور ہے جو حُسنِ فطرت کو آئینہ دکھاتا ہے اور اُس پر اپنی برتری جتاتا ہے۔"

میرے بچپن کی بات ہے، وُہ بیلن خراد رہے تھے اور مَیں پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ میرا شوق مُجھے یقین دلا رہا تھا کہ مَیں اُن سے بہتر خراد سکتا ہوں۔ وُہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور مَیں وہاں اکیلا رہ گیا۔ مَیں خراد پر جا بیٹھا اور اپنا خام ہُنر آزمانے لگا۔ مُجھے جس ترسیلِ ہُنر کا خیال تھا وُہ ممکن نہ ہُوا، لہٰذا بیلن کیا سے کیا ہو گیا۔ میری آنکھیں مُجھے میری غلطی جتا رہی تھیں لیکن میرے ہاتھ اُسے دُرست کرنے میں ناکام رہے۔ اِتنے میں وُہ واپس آئے اور سامنے کھڑے ہو گئے۔ مَیں ڈر گیا اور اُٹھ کر بھاگا۔ اُنھوں نے مُجھے پکڑ لیا اور پُچکار کر کہا، "اِدھر بیٹھ، میرے پاس۔" میرا ڈر ایک دم جاتا رہا اور مَیں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اُنھوں نے میرا بگاڑا ہُوا کام سنوارا۔ بیلن کو چوب میں اُلٹ کر لگایا اور اُس پر کام کرنا شروع کیا۔ وُہ رکھانی کو مُسلسل دباتے ہوئے اچانک اُٹھاتے جیسے

لکڑی انھیں اپنی حقیقت سمجھاتی ہو اور ساتھ ہی ساتھ ہدایت بھی دیتی ہو۔ لکڑی چوب پر تھرک رہی تھی جیسے اپنے بدلتے ہوئے روپ کو سراہ رہی ہو اور اُسے ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مَیں لکڑی ہی کی طرح بے قرار تھا لیکن اُس کے برعکس محوِ حیرت تھا۔ انھوں نے بیلن کی گھٹائی کر کے مجھے دیا۔ جسے دیکھ کر مَیں خوش ہو گیا۔

اُنھوں نے مجھے سمجھایا، "کوشش ایک ذاتی معیار ہے اور اپنی جگہ درست ہے۔ تُو نے جو بنایا تھا وہ ٹھیک ہی بنایا تھا۔ وہ تیری کامیابی تھی اور یہ میری کامیابی ہے۔ عمل کے اسی فرق سے ادنیٰ و اعلیٰ کی روایت ہے۔ ہنروَرانہ بصیرت کے لحاظ سے کامیابی، ناکامی کی اگلی سیڑھی ہے اور غلطی، صحیح استدلال کی قوّتِ ادراک"۔

اُن کی حویلی گرودوارے کے پاس تھی۔ وہاں سنت لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور کیٹیوں کے ساتھ اُن کے مذاکرات چلتے تھے۔ سنتوں کی بات بے زنگار آئینے کی سی رہتی جس کا اُلٹا سیدھا ایک ہوتا ہے تایا جی کے اسلوبِ بیاں کے ساتھ اُن کے چہرے کے بھید بھاؤ بدلتے اور اُن کی زبان سے نکلتے ہوئے الفاظ صحیفۂ حکمت کے ورق در ورق لگتے۔ اُن کی سوچ وچار کے وقفے میں اُنھیں دیکھنا سرودِ خاموش سے لطف اٹھانا تھا۔ اُن سنتوں کا اکثر موضوع رُوح ہوتا تھا اور اُن کا ہر بیان شاستروں کی تقلید۔ تایا جی رُوح کی اصل اِس طرح پرکھتے تھے۔ "ہنروَر کی طرح عالِم بھی صلاحیتِ ایجاد سے رُوشناس ہے لیکن عالِم، ہنروَر کے برعکس ریاکار ہوتا ہے اور بیکاری پسند بھی۔ اُس نے آدمی کو اپنی زندگی کا وسیلہ اور حیلہ بنایا۔ وہ یوں کہ اُس نے اِس کے فانی وجود کو لافانی رُوح کا تحفہ دیا اور اِس کی غلطی کو گُناہ بنا کر پیش کیا۔ آدمی غلطیوں کے ذریعے ہی بڑھتا پھُولتا ہے۔ اِس عیب سے کوئی بَری نہ تھا۔ چوں کہ رُوحانیت کے نظام کا سربراہ، عالِم ہی تھا، گُناہ گار، گُناہوں کا کفّارہ دینے کے لئے آنے لگے اور اُسے نان و نفقہ بہم پہنچانے لگے۔ جسے عُلما رُوح کہتے ہیں وہ دراصل قوّتِ حیات ہے جو کبھی محقّق کے شوقِ تحقیق اور کبھی ہنروَر کے حُسنِ تدبیر کی صُورت عیاں ہوتی ہے"

"زندگی کے کئی پہلو ہیں، دو نمایاں ہیں، تخریبی اور تعمیری۔ جو کوئی جسے اچھا جانتا ہے اسی کی تعریف کرتا ہے۔ غاصبوں نے خود کو مجاہد اور دوسروں کو کافر قرار دیا۔ جنگ جیسے ناپاک عمل کو مقدّس بنایا اُس میں مرنے والوں کو شہید کہا اور لوٹ مار کے مال کو مالِ غنیمت۔ اپنے خیال کی حمایت کی خاطر اُنھوں نے جنگ کے دیوتا بنا لئے، اُن کی پُوجا کرنے لگے اور اُن سے بَل مانگنے لگے۔ ایسے لوگ جنگل کی آگ کی طرح آئے اور اپنے جوشِ جنوں کی طرح مٹی میں مِل گئے۔ اُن کی تخریبی کارروائی سے اِنسانی ترقّی عارضی طور پر رُکی لیکن ہنروَروں کی تعمیری صلاحیت اُسے پھر حرکت میں لے آئی۔ ہنروَر زمانے کے ساتھ رواں دواں ہے اور ہر شے

سے کسی نہ کسی شکل میں عیاں ہے ۔ میں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر مجھے ہُنرور نظر آتا ہے ۔"

"جس کے پاس جو کچھ ہے ، وُہ اُسی کی بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے ۔ جو اپنی روزی روٹی ، دست کاری سے کماتے ہیں ، اُن کے پاس شاستروں کے لئے وقت کہاں ہے ؟ لیکن شاستر ، سنتوں کا ذریعۂ معاش ہیں ! وُہ اُنھیں غلط کہیں گے تو گھاس چریں گے ! گمراہ لوگ پتھر پُوجتے ہیں ، مُردوں سے نعمتیں مانگتے ہیں اور برکتیں چاہتے ہیں ۔ قدامت پرستی اور بیکاری پسندی اختراعی جبلّت کو مفلُوج کرتی ہے ۔ جیسے آنکھ آئینے کے بغیر چہرہ دیکھنے سے قاصر ہے ، مُردہ پرست ، حیات پرستی کے بغیر اپنی نفی دیکھنے سے ۔ جدّت طراز جبلّت ' زندگی کا آئینہ ہے جس میں ہُنرور اپنی پُراسرار صلاحیتوں کا نظّارہ لباسِ حقیقت میں کرتا ہے ۔"

وُہ دھرتی کو حکیم زمانہ مانتے تھے اور اپنے نظریے کی وضاحت یُوں کرتے تھے ۔ "ناکارہ سے ناکارہ چیز کو عُمدہ بنا کر پیش کرنا دھرتی ہی کا کسبِ کمال ہے ۔ موجُودات میں موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے کیوں کہ موت سکوُنی توازن کی نمائندگی کرتی ہے ۔ حیات کی نجات ، حیات میں ہے ۔ ہر ذرّہ قُوّتِ حیات سے چھلکتا ہے اور احساسِ حیات سے نکھرتا ہے ۔ جو بظاہر مُردہ نظر آتا ہے وُہ سرگرمِ عمل ہے اور کایا پلٹتا ہے ۔ کایا کی کیمیا گری اور ہُنرور کی ہُنروری مُتقابل ہیں ۔ انسانی زندگی ترقیِ نفس کا عمل ہے ۔"

تایا جی مُراقبے کے خلاف تھے لیکن میں نے اُنھیں اُس حال میں دیکھا تھا ۔ اُن کا مُراقبہ غور و فکر کی بُلندی تھی اور میلانِ خاطر کی پاکیزگی ۔ وُہ بیان کرتے تھے ، "ہر اسرارِ دُنیا تجربے اور مشاہدے سے مُنکشف ہُوا ہے ۔ انسان جتنا دیکھتا ہے ، سوچتا ہے ، اُس کا عشرِ عشیر ہی سمجھتا ہے اور اُس عشرِ عشیر کی تفسیر بیان کرتا ہے ۔ حالاں کہ حرفِ آغاز انسان ہے لیکن انسان ، حرفِ آخر نہیں ہے ۔ انسان کی یہی سچائی ، ناسچائی ہے جسے شاستر گول مول طریقوں سے سمجھاتے ہیں اور انسان کو دھرتی سے جُدا کر کے خُدا کا حصّہ بتاتے ہیں اور اسی بنا پر خُدا کو حرفِ آغاز اور حرفِ آخر سے موسُوم کرتے ہیں ۔"

میرے جنم سے پہلے کی بات ہے ۔ وُہ ایک سنت سے اتنے مرعُوب ہُوئے کہ سچ کی تلاش میں اُس کے ساتھ ہو لئے ۔ وُہ چند ہی دِنوں میں گھر لوٹ آئے اور اُس سے یہ از خُود سیکھ کر آئے ، "جو آدمی اپنی روٹی محنت سے نہیں کماتا اور دُوسروں کی محنت پر جیتا ہے ، وُہ جینے کے لئے ڈھکوسلے کرتا ہے ۔ پوِتر بانا پہنتا ، نام جپنا ، نام کی آڑ میں ٹھگنا اُس کے تین بڑے حربے ہیں ۔ بیکاری ، جُرم ہے اور بیکار ، مُجرم ۔ اِس کا واضح نمُونہ سادھو سنت ہیں اور دھارمک استھان اُن کے اڈّے ہیں ۔"

ایک بار اُنھوں نے ایک واقعہ بتایا کہ میرے پاس ایک آدمی آیا جو تیرتھ یاترا سے لوٹا تھا ۔

اُس نے اپنی بڑائی بتائی کہ اُس نے ایک برہمن کو نئی دھوتی دان میں دی ہے ۔ میں نے پُوچھا کہ کیوں ؟ اُس نے کہا کہ اُس کی پُرانی دھوتی پھٹی ہُوئی تھی ۔ میں نے کہا ، تیرا جذبہ اپنی جگہ دُرست ہے لیکن وُہ نئی دھوتی نہیں پہنے گا ! کیوں ؟ اُس نے حیران ہو کر پُوچھا ۔ میں نے کہا ، وُہ جانتا ہے کہ اُس کی پھٹی ہُوئی دھوتی اُس کے جینے کا وسیلہ ہے ۔

وُہ کہتے تھے ، " چند اخلاقی باتوں کو چھوڑ کر ، صحیفے جس خُرافات سے پُر ہیں ۔ وُہ ہے آتما اور پرماتما ۔ اِن دونوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے رُوحانیت کے قائل ہزاروں سالوں سے جتن کر رہے ہیں ۔ اُن کی یہ کوشش کولھو کے بیل کی سی ہے ، وُہ زندگی بھر چلتا ہے ، چلتا ہے اور چلتا ہے لیکن اُسی دروازے سے باہر نکلتا ہے ، جس سے وُہ اندر جاتا ہے ۔ جیسے بیماری کے کیڑے بیماری ہی کے حامل ہیں ، پیر فقیر ، پیروں فقیروں کے سفیر ہیں ۔ یہ بیکار لوگ کسانوں ، ہُنروروں اور کامگاروں کی محنت پر پلتے ہیں ۔ کیا کسی صحیفے میں اُن کا ذکر آیا ہے ؟ اِن کی احسان فراموشی کی حد دیکھئے ! کوئی دانی اِن کے لئے کُچھ کرے یہ ممنُون بھگوان کے ہوں گے کیوں کہ یہ ادّعا کرتے ہیں کہ بھگوان کی کرپا ہی سے دانی کے دِل میں دان داتاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ورنہ وہ اِس اچھے کام کے قابل نہیں ہوتا ۔ دانی اُن کی تُہمت میں عزّت دیکھتا ہے اور اُن پر مرحبا کہتا ہے ۔ ذِلت خواہی ایک نفسیات ہے ۔ اِس کا شکار پیروں اور فقیروں کی گندگی تک کو تبرّک اور پرساد سمجھتا ہے ۔"

" فطرت کے جاری و ساری رہنے کا راز تخم و مرکزہ میں ہے اور نوعِ انسان کے نشوونما کی حقیقت علم و ہُنر میں ۔ کہیں جاؤ ، علم و ہُنر کی صداقت ایک ہے ۔ خُدا ایک ہے تو ملہموں کو مختلف زبانوں میں الہام کیوں کرمُوا ؟ اُس نے ہر کسی کو پُوجا پاٹھ کے طریقہ الگ الگ کیوں بتائے ؟ اور اُن سے انحراف کرنے والوں کو کافر کیوں ٹھہرایا ؟ ہر مذہب والے کو خواب میں اُس کے دیوی دیوتا اور دھرم استھان کیوں نظر آتے ہیں ؟ آدمی جس مشاہدے سے گُزرتا ہے اُسی کا انعکاس دیکھتا ہے ۔ دِماغ بذاتِ خُود تخلیق کرنے کے نااہل ہے یہ مادی مظاہر اور جبلّی ضرُورتوں کی ترجمانی کرتا ہے ۔ اِسی نفسیاتی کیفیّت سے خواب ظہُور میں آتے ہیں اور وجُود پاتے ہیں ۔ جیسے بچّہ ، ماں کے دُودھ کا خواب دیکھتا ہے ، جوان لڑکا ، لڑکی کا اور بُوڑھا ، موت کے فرشتے کا ۔"

" ہُنرور کا ذہن سب سے نازُک ہوتا ہے ۔ وُہ ہُنر کی لطافت و نفاست کو پہچانتا ہے اور بوقتِ ضرُورت اِصلاح کُن رویہّ اختیار کرتا ہے ۔ اِس کے برعکس خُدا پرست کٹھور ہوتا ہے اور کم نظر بھی ۔ اِس کا کھرا ثبُوت یہ ہے کہ وُہ خُود کو زمین سے زیادہ آسمان کا حِصّہ مانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وُہ اپنے اعمال کا بندے

کے بجائے خدا کو جواب دِہ ہے۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں فنونِ لطیفہ کو ممنوع قرار دیا گیا کہ یہ مذہب کے خلاف ہے۔ اُس نے سنگیت کا جنازہ نکالا اور جمنا کے کنارے دفن کر دیا۔ لیکن سنگیت زندہ ہے اور اُس وقت سے ہزار گنا ترقی پر ہے۔ معتقد، اورنگ زیب کی مذہبی فراست کے قصیدے گاتے ہیں۔ لاعلمی سے ناروا داری پیدا ہوتی ہے اور ناروا داری سے ناحق شناسی۔"

"سنگیت، رچنا ہے اور رچنا، سرشٹی۔ دھرتی کا گھومنا، سورج کا ڈوبنا، اُبھرنا، ستاروں کا گردش کرنا، پرندوں کا اُڑنا، بادلوں کا برسنا ۔۔۔ بیجوں کا اُگنا، فصلوں کا لہلہانا، جھرنوں کا بہنا، لہروں کا مچلنا، مچھلیوں کا تیرنا ۔۔۔ کرت کرنا ۔۔۔ جیون، کارن ہے اور کام، سُرتال۔ کلاآتمک رُچی (فنکارانہ بصیرت) سے دیکھو! شانتی بھی سنگیت ہے، گمبھیر آلاپ کی مدھرتا۔"

"مذہب کی بنیاد فلسفے کے برعکس تکذیبِ نفس پر ہے۔ اپنی نفی اور خدا کی بڑائی! ہر مذہب کی کتاب خدا کی مدح سے بھری پڑی ہے اور بندے کی ہجو سے۔ لیکن سچائی اِس کے اُلٹ ہے۔ خدا اپنے وجود کے لئے بندے کا محتاج ہے۔ اور جو محتاج ہو وہ حاجت روا کی ذمّہ داری ہوتا ہے۔ کتنے اوتار، پیغمبر ہوئے ہیں! اُن میں سے کوئی انسان کی دُنیاوی مشکلوں کا عملی حل نہ دے سکا۔ اِدّعا ہر کسی نے کیا ہے کہ وہ ذرّے ذرّے کی حقیقت سے واقف ہے! لیکن کوئی، ایک ذرّے کی حقیقت بیان نہ کر سکا، جس کی تفسیر مستند اور قابلِ تصدیق ہو۔"

"ہنرور سے ترجیح جنس ہے نہ کہ اوتار سے۔ کیوں کہ ہنرور اختراعی زندگی بسر کرتا ہے اور اوتار نقلی۔ نقل کتنی ہی اصل ہو، طبع زاد سے کم ہوتی ہے۔ ہنر سے اِنسان کی تکوینی ماہیت بنتی ہے۔ اوّل، بُرے عمل سے باز رکھتا ہے، دوم، معیشت فراہم کرتا ہے، سوم، قیمت کو روایت سے جُدا کرتا ہے۔"

"ذاکر ایسی بات کرتا ہے جس کی سچائی پرکھنا ناممکن ہے۔ وہ اپنی شوکتِ اظہار میں جذبات کو معنی پر ترجیح دیتا ہے۔ اُس کے حُسنِ تقریر میں عنصرِ حقیقت ڈھونڈنا پانی میں آگ کھوجنے کے مماثل ہے۔ کہنے والے کی صداقت وہیں تک ہوتی ہے جہاں تک عالم و معلوم میں تمیز باقی رہے۔ ذاکر اِس تمیز سے اس لئے جُدا رہا ہے کہ آزرہِ احترام کسی نے اُس سے اُس کی بات کا ثبوت نہیں مانگا ہے، ورنہ وہ کب کا معدوم و فنا ہو گیا ہوتا۔ وہی کیوں؟ اُس کے ساتھ کتنے اور بڑے نام ایسے مٹ گئے ہوتے جیسے گھُپ اندھیرے میں اشیا کا وجود۔ ہنرور کا ہنر اپنی سچائی کا تصدیق نامہ ہوتا ہے، اور افادہ عام کا معتبر۔ نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّب کو مٹانے کے لئے ایک ہی وحدت کارگر ہے، ہنر کی وحدت! اِنسان کے اِس علاقہ عمل میں نہ فریب ممکن ہے اور نہ ہی ناقابلیت کو دخل۔ ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کی نفی ہوتا ہے لیکن ایک ہنرور دوسرے ہنرور کا

مُعاون، اِس لئے دو ہُنرور مِل کر تیسرے کی ترقّی کی طاقت بن جاتے ہیں"۔

"ہر خُدا رسیدہ کی سچائی ہُنر کے برعکس مفروضوں پر مبنی ہے جس کی سچائی کی کسوٹی بھی مفروضہ ہی ہے۔ وُہ افزائشِ حیات کے ہُنر سے بے بہرہ اور آرائشِ ذات کے کسب میں ماہر ہوتا ہے۔ وُہ اپنے آپ کو کسی کا جواب دِہ سمجھتا ہے تو وُہ اُس کا آسمانی خُدا ہے۔ اِس طرح وُہ نظمِ دُنیا سے الگ ہو جاتا ہے جس کا وُہ اٹوٹ حصّہ ہے۔ ہُنرور کی وُسعتِ احساس اِسے عالمی برادری کا عامل رُکن بناتی ہے اور اس سے نت نئے بُلند و برتر فکر و ہُنر کا مُطالبہ کرتی ہے۔ یہ ہر مُشکل کو آنکتا ہے، جانچتا ہے اور اُس کا حل نکالتا ہے۔ چیچک اور ہیٹرک کے ٹیکے کچھ ہُنروروں نے ایجاد کئے، جن سے پُوری نوعِ اِنسان فیض یاب ہُوئی ہے۔ کپڑا کوئی بُنتا ہے اُس سے تن مَیں ڈھانکتا ہُوں۔ آپس میں مِل کر جینے کا سلیقہ ہُنرور کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہے، ورنہ اِنسان اپنے فعل میں حیوان کی طرح اکیلا ہوتا"۔

وُہ اوتاروں کے اِس خیال کی تردید کرتے تھے کہ سنسار ایک سپنا ہے۔ "زندگی مکمّل حقیقت ہے اور اِنسان اِس حقیقت کا ترجمان۔ اگر زندگی بے حقیقت ہے تو اُن کو اِس حقیقت کا اِحساس کیوں کر ہُوا؟ اور جب اِحساس ہُوا تو وُہ اِس کی سلامتی کے درپے کیوں ہیں؟ اور سب سے تحقیق طلب بات یہ ہے کہ وُہ اپنی بے حقیقی کو دُوسروں کی حقیقت پر کیوں لادتے ہیں؟ چُوں کہ اِنسان زندگی کی ہر حقیقت کا ترجمان ہے میرے نزدیک وُہ لوگ ریاکار ہیں"۔

وُہ اپنی حقیقت اِس طرح بیان کرتے تھے۔ "احساسِ نفس، حُسنِ عمل کی تحریک ہے اور حُسنِ عمل حُسنِ ضرورت کی۔ یہ ایک لکڑی ہے۔ مَیں کلہاڑے سے پھاڑ کر اِس کا ایندھن بناؤں، آری سے چیر کر بالے بناؤں خراد پر چڑھا کر پایہ بناؤں، یہ میری ضرورت اور میرے ہُنر پر مُنحصر ہے۔ یہ لکڑی اِس لئے ہے کہ مَیں نے اِسے لکڑی کا نام دیا ہے۔ مَیں اِسے کوئی دُوسرا نام دیتا تو یہ وُہی ہوتی۔ اب یہ وُہ سب کچھ ہے جو میرے اِدراک میں موجود ہے۔ مَیں وُہ عزم ہُوں جو ہر دُوسری شے کی تقدیر ہے۔ یہ دُنیائے موجودات میرے فکر و فن کی تفسیر ہے"۔

"مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ کے پیامبر، فاضل جاہل تھے، فرار پرست تھے اور عمداً کاہل۔ مَیں مسبّب الاسباب ہُوں اور ہر سبب کا ذمّہ دار۔ میری مرضی میں کسی کو دخل ہے تو فقط مجھے۔ شاستر ایک ہی بات پر زور دیتے ہیں، بندے اپنی 'مَیں' کو مار۔ میری 'مَیں' مر گئی تو مَیں مر گیا، میرا احساسِ تقاضا مر گیا"۔ وُہ اِحساسِ تقاضا پر زور دیتے۔ اُن کے نزدیک اِحساس کے بغیر 'مَیں' سراسر اِنتشار تھا۔ "وُہ سب کچھ مر گیا جو میرے ہمہ رنگ اِحساس کی تحریک اور تصدیق ہے۔ میری 'مَیں' ترکھان ہے، لوہار ہے، معمار ہے، حکیم ہے، جُلاہا موچی ہے، شاعر ہے، ہَل ہے، درانتی ہے اور بالاتر حسّاس اِنسان ہے، میری 'مَیں' توحیدِ ہُنر کا نمائندہ ہے۔

اِس نے کائنات در کائنات نئے نئے جوہر پیدا کر کے 'ہمہ از اوست' کے فلسفے کی تردید کی ہے۔ چوں کہ 'یہ' تخلیق کار ہے، اِس کے متضاد پہلو ہیں اور جو پہلو مسلکِ انسانیت کی نفی کرتا ہے وہ باعثِ ملامت ہے۔"

شاید اسی لئے وہ کہتے تھے کہ جو کوئی 'انسان کی مشکل کا حل، دعا بتاتا ہے، وہ فریبی ہے اور بازارو بھاؤ تاؤ کا آدمی، بھول کر بھی ایسے آدمی کی بات نہ سنو۔ مشکل، انسان کا آفاقی اور لاثانی ورثہ ہے۔ یہ ایسا اوزار ہے جو انسان کے اندرونی انسان کی تشکیل کرتا ہے۔

پپڑائے کھیتوں (بیج اُگنے سے پہلے کاشت کردہ کھیتوں پر پانی برس جائے تو روئے زمیں سخت ہو جاتا ہے۔ سوئیاں اُسے توڑ کر اوپر اُٹھنے میں ناکام رہتی ہیں اور مر جاتی ہیں) کا ایک ہی ممکن حل ہے کہ کھیت دوبارہ بیجے جائیں۔ اِس میں بیج اور محنت کا خسارہ جو ہے، سو ہے، بڑا نقصان یہ ہے کہ کھیتی پچھڑ جاتی ہے اور بارانی کھیتی سے کچھ بھی پلّے نہیں پڑتا۔ تایا جی کی اختراعی صلاحیّت، حرفِ آخر کا مرتبہ رکھتی تھی۔ اِس کام کے لئے انھوں نے پچھنا بنایا۔ وہ ایسا آلہ ہے جسے کھیت میں گھمانے سے پپڑی ٹوٹ جاتی ہے اور کسان فصل دوبارہ بیجنے کی زحمت سے بچ رہتا ہے۔ اُن کی یہ ایجاد اِس قدر فائدہ مند ثابت ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہوگئی۔ دُور دراز کے گاؤں سے کسان آتے، اپنے ساتھ بڑھئی لاتے اور پچھنے کا نقشہ نکال کرلے جاتے۔ وہ چھوٹی سی اور سادہ سی ایجاد تین انچ مربع لکڑی کا ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا چوکھٹا تھا جس کی باہیوں میں آدھا انچ موٹی اور چھ انچ لمبی سلاخیں گاڑی ہوئی تھیں۔ سلاخ سے سلاخ میں چار انچ کا فاصلہ تھا۔ ایک باہی کے دونوں سروں پر دو کنڈے تھے جن سے جوت باندھے جاتے تھے۔ اُس آلے میں مخصوص خوبی یہ تھی کہ اُس کے چاروں کونوں پر چار پہیّے تھے جو اوپر نیچے کئے جا سکتے تھے اور آلے کی کارکر گہرائی کو حسبِ ضرورت رکھنے میں مدد کرتے تھے۔

سین پور سے بھگتا سینی آیا اور اپنا پچھنا گڈّے پر لاد کر لایا۔ اُسے شکایت تھی کہ اُس نے پچھنا اُن کے آلے کے مطابق بنایا ہے لیکن پاڑا (دو لیکوں کے درمیان بے جُتی مٹّی) چھوڑتا ہے۔ انھوں نے دیکھتے ہی نقص پکڑ لیا۔ اصل کی پچھلی باہی کی سلاخیں اگلی باہی سے دو انچ ہٹی ہوئی تھیں جب کہ نقل کی سیدھ میں تھیں۔ اصل کی بناوٹ میں ایک فائدہ اور تھا۔ اگلی اور پچھلی سلاخیں متوازی نہ ہونے کی وجہ سے خراش مکرّر نہ پڑتی تھی اور یوں بیج کے اکھڑتے اور نکو کے ٹوٹنے کا امکان معدوم تھا۔

اُن کے وجدان کو تحقیق و تخلیق سے یکساں نسبت تھی۔ وہ زور دے کر کہتے تھے، "جو ہے وہی ہے! جو نہیں ہے، وہ نہیں ہے!! جو ہوگا، وہ کرنے سے ہوگا!!! انسان قضیّۂ منفیہ کا قاطع ہے اور قضیّۂ مثبتہ

کا مصدّق"۔

کوئی انھیں عبادت میں شامل ہونے کو کہتا، وہ اُسے صاف لفظوں میں کہتے، "مجھے کام ہے! کسی کے اصرار کرنے پر وہ کہتے، "تم خدا کے بندے ہو۔ تمہارا یہاں اور وہاں محفوظ ہے اس لئے شکریہ ادا کرنا تم پر فرض ہے۔ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، مجھے اس سے نباہنا ہے۔ مجھے اسے صاف کرنا ہے، کھودنا ہے، بونا ہے، نلانا ہے، سنبھالنا ہے اور جینے کا ڈھنگ نکالنا ہے۔ آپ کی اصل اور ہے اور میری اصل اور۔ میں اپنا آغاز بھی ہوں اور انجام بھی"۔

وہاں کوئی نہ تھا جو اُن کے خیالوں سے اتفاق کرتا ہو لیکن وہ کسی کی پرواہ کرتے تھے اور اپنے خیالوں پر اپنے بچّوں کی سی توجّہ دیتے تھے، انھیں صحت مند سے صحت مند اور خوب صورت سے خوب صورت بناتے تھے۔ وہ کہتے تھے، "میں اپنے خیالوں کی پرورش پر اپنے بچّوں سے زیادہ دھیان دیتا ہوں اور یہ عین فطری عمل ہے۔ آدمی کسی کو تعلیم و تربیت دے سکتا ہے، اُس کے نشو و نما کا سبب نہیں بن سکتا! خود آگاہی، خود آرائی ہے، جس پر یہ ظاہر ہے، وہ اپنا راہبر ہے"۔

وہ رسوم و روایات سے بالاتر تھے۔ اُن کا کردار اُن کے عمل کا حمل خانہ تھا۔ وہ خدا کا نام لیتے تھے، اُس کی باتیں کرتے تھے لیکن اپنے طریقے سے۔ "خدا نے مجھے ننگا پیدا کیا۔ میں نے تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بنالیا۔ اُس نے میرے لئے بیماری بنائی، میں نے اپنے لئے دوائی۔ سوکھا پڑنے پر میں نے دھرتی پھاڑ کر کنواں کھودلیا۔ طوفاں نے کھیت اُجاڑے، میں نے دوبارہ کاشت کر لیے۔ اُس نے ہزاروں طریقوں سے میرے رزق پر امتناع لگایا، میں نے لاکھوں وسیلوں سے رزق حاصل کیا، اُس کی ہر سازش کو ناکام بنایا اور اپنی ہمّت و فراست سے اُسے حقیر ثابت کیا، بھگوان، انسانوں کے برعکس حیوانوں کا ہے۔ وُہی ایک نوعِ فطرت ہے، جو راضی بہ رضا رہتی ہے۔ میں ممکن الوجود ہوں! میں ممکن الوقوع ہوں!! میں ممکن الحصول ہوں!!! اور میں ہی حاصل۔ جو کوئی توکّل پہ جیتا ہے، اُس کا وجود و عدم برابر ہے"۔

آپ ہی آپ میں آپ ہے، آپ میں رہے بیاپ
نہیں سُرگ، نہیں نرک ہے، نہیں پُن، نہیں پاپ

اُس جُتاد تھی کہ تایا جی بیمار پڑ گئے۔ اُنھوں نے بیل اپنے دیئے اور کھیت ٹھیکے پر جتا لئے۔ کھیتی خصم سیتی مشہور ہے، وُہی بات ہُوئی۔ نام دیو سنگھ نے شیاڑ (لیک) موٹا رکھا اور سہاگہ ٹھیک سے نہ دیا۔ سوائی دھرتی، باراتی بھی تھی، ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ صحت مند ہو کر کھیتوں کا جائزہ لینے گئے اور پریشان ہو گئے۔ دوہر (دُوسری بار ہل چلانا) ڈالنے سے ڈھیلے اور نمایاں ہو گئے۔ کھیت کمانے کے لئے ڈھیلوں کا توڑنا ضروری

تھا۔ اِس کام کے لئے اُنھوں نے لکڑی کا ہتھوڑا بنایا۔ اُس کا دستہ چھوٹا تھا اس لئے بیٹھے بیٹھے کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کی ڈھیلی رفتار سے متاثر ہوکر اُنھوں نے اُسے لمبا دستہ ڈالا اور کھڑے ہوکر کام کرنا شروع کیا۔ اُس سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور اُنھوں نے کام چھوڑ دیا۔ اُس مصیبت سے نپٹنے کے لئے اُنھوں نے سُہاگے میں ترمیم کی، جو پچھنے ہی کی طرح مقبول ہُوئی۔ اُس سہاگے نے ڈھیلے ایسے مسل دیئے جیسے وُہ مکھن کے ڈلے ہوں۔ اُس ترمیم کی تفصیل یہ ہے کہ سُہاگے کا پچھلا سرا، پُشتے کی مدد سے دو انچ نیچے بڑھا دیا تھا اور اگلے سرے سے اندر کی طرف دو انچ موٹی روک کا اِضافہ کر دیا تھا۔

اُن کی آنکھوں کی چوکسی، شرارے کی لپک کی سی تھی جو اپنی نمود کا اِعلان دُور سے کرتی ہے۔ اُن کی نظر محسُوس کرتی تھی، بات کرتی تھی، اوزار کی طرح ہر شَے کے اندر کی گہرائی تک پہنچتی تھی۔ اُن کی بیل گاڑی میں فنّی خصُوصیّت یہ تھی کہ اُس کے دُھرّے، دائرے کا ایک چوتھائی گھمائے جا سکتے تھے۔ رائج گاڑی کا تلاوا جامد ہونے کے سبب دُھرّے ایک ہی جانب سے گِھستے تھے، یعنی نیچے سے۔ وُہ ہر ہاڑھی اور ساونی پر تلاوے کی سمت بدلتے اور دُھرّوں کو کالی گریس سے چکنا دیتے۔ کوئی کام آرمبھ کرنے سے پہلے وُہ اوزار کا مُعاینہ کرتے اور ضرورت سمجھتے تو اُن کی مرمّت کرتے۔ اوزار اُن کا قصدِ تخلیق تھے۔ "میرا ہُنر میرا جسم ہے، میرے اوزار میرے اعضا ہیں اور اُن کا عمل میرا حاصِل"۔ اُن کی اِس بات پر کوئی حیران ہوتا تو وُہ کہتے، "میں زندگی کو نئے معنی نہ دیتا تو لیک سے بے لیک نہ ہوتا اور بزرگوں کی حماقتوں اور جہالتوں کو تبرّک سمجھ کر پُوجتا رہتا۔ وہیں پڑا رہتا جہاں وُہ مجھے چھوڑ گئے تھے"۔

شاستر بتاتے ہیں کہ اِنسان، پانچ عناصِر کا پُتلا ہے۔ تایاجی کہتے تھے، "ہر شَے کِن عناصِر سے بنی ہے وہی جانے! اِنسان، وِجدانِ عناصِر کا نام ہے۔ اپنے وُجُود سے باہر اِس کا کوئی وُجُود ہے تو وُہ اِحساس اور ہُنر سے ہے۔ کون ہے جو اپنے پُرکھوں ۔۔۔ اور اُن کے پُرکھوں کا نام بتا سکتا ہے۔ یہ دعویٰ ہر کوئی کر سکتا ہے کہ اُس کے پُرکھے اِنسانی برادری کے رُکن تھے۔ پھر نیچ کون ہُوا؟ اِنسان کی اُونچ نیچ اِس کے اِحساس سے ہے! ہُنر سے ہے! اِنسان کے سوائے ہر شَے کی حقیقت مکمّل حقیقت ہے۔ اِس کی حقیقت اِس لئے مکمّل نہیں ہے کہ اِس کی فِطرت، نشوونما سے عِبارت ہے۔ اِنسان کا موجُودہ اِرتقا اِس کی جُگ جُگ کی محنت و بصیرت کا حاصِل ہے۔ اِس کی مفلوک الحالی! اِس کے تنزُّل کی رفتار بے اختیار ہے۔ اِس کے بچّے کو حیوانوں میں پالو پوسو۔ وُہ اُنھیں کے طور طریقے سیکھ لے گا اور اُنھیں کی بولی بولنے لگے گا۔ تعلیم و تربیت اِنسان کا قلب ہے۔ عقیدے، اِنسان کا مدفن ہیں اور اِستدلال، کُل زمین۔ تصوّف سب سے مُہلک ہتھیار ہے جو خُود ساختہ خُداؤں اور خُدا رسیدوں نے نوعِ اِنساں کے خلاف اِستعمال کیا ہے"۔

وُہ بچّوں کو مہما سے مُلاتے تھے اور اُنھیں کبھی نہ ڈراتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہوتے تو عُمر کے فاصلے مِٹا کر بچّے بن جاتے۔ وُہ کہتے تھے، "بچّہ، نازک آیئنے کی طرح ہوتا ہے۔ اِس پر جو خراش پڑ گئی ہو پڑ گئی۔ بچّے کی فطرت بڑے سے زیادہ پُر خلوص ہوتی ہے۔ اُسے نہ اچھے سے مطلب ہوتا ہے اور نہ بُرے سے۔ اُسے سیکھنا ہے اور بس سیکھنا ہے۔"

بچّوں کے بارے میں وُہ ایک بات اور بتاتے تھے جو اُن کی فطرت پسند طبیعت کی فراست ہے۔ "پھُول کو دیکھو! حاملِ زر، کیسۂ تُخم کو تخم دے کر جھڑ جاتا ہے، پھر تخم جانے اور کیسۂ تخم! لیکن بچّے کی پرورش میں پہلے ماں کو دخل ہے اور پھر ماحول کو، دونوں جِتنے معقول ہوں گے، بچّے اُتنے ہی بُردبار۔"

وُہ بچّوں کی اچھی پرورش کے یہاں تک قائل تھے کہ سمجھتے تھے کہ ماں کو گربھ کے دوران اچھی خوراک مِلنی چاہیئے، اِس کے ساتھ اچھی باتیں کرنی چاہیں کیوں کہ ماں کی نفسیاتی کیفیت، بچّے کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ "نفسِ مادری، نفسِ تخم کے برعکس ہے۔ ماں اپنے بچّے کو احساسِ شعور سے سنوارتی ہے۔"

مہاں مری، پلیگ کی نشانیاں، کھیڑوں کی صُورت میں باہر کھیتوں میں موجود تھیں۔ اُن دِنوں لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے۔ تایا جی اُس صُورتِ حال کو یُوں بیان کرتے تھے۔ "بُخار چڑھتا گردن یا بغل میں گلٹی نِکلتی جو مریض کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی۔ انگریزوں پر تھُوکنے والے بتا سکتے ہیں کہ ستی کی رسم کو کِس نے روکا؟ ٹھگی کا بیج ناش کِس نے کیا؟ علم و ہُنر کے نظام کو عصری طریقے سے کِس نے سنوارا؟ پہلے مدرسے کہاں تھے؟ جو کہیں تھا روایتی قسم کا تھا۔ ہریانہ میں انگریز ڈاکٹر آئے اور تنبوتان کر رہنے لگے۔ وہاں کا ہسپتال اُنھیں دِنوں بنایا گیا تھا۔ وُہ ڈاکٹر گاؤں گاؤں گھُومتے، لوگوں کو کھُلی فضا اور دھُوپ میں رہنے کے مشورے دیتے، نالیوں پر چُونا چھڑکنے کو کہتے اور چُوہے مارنے کی مُہم چلاتے۔ وُہ جو پھندا گھر میں ہے، مَیں نے اُن دِنوں بنایا تھا (وہ رات کو مُوش کُش لگا کر سوتے تھے) اور جِس نے مانگا تھا اُسے بنا کر دیا تھا۔ چُوہے اِتنے موٹے تھے کہ اُنھیں مارنے کے لئے تختے پر وزن رکھنا پڑتا تھا۔ حکومت نے پنجرے دیئے تھے لیکن پنجرے میں پکڑے ہُوئے چُوہے مارنا مُشکل کام ہے۔ اُنھیں پانی میں ڈبو کر مارو تو وُہ مرتے ہیں، ورنہ بھاگ جاتے ہیں۔ کون سا گھر تھا جو پلیگ کی مار سے باہر تھا۔ غریب ہِندوؤں کے پاس اناج خریدنے کے لئے پیسہ نہ تھا، وُہ مُردوں کو جلانے کے لئے بالن کہاں سے لاتے؟ وُہ مُردے دفنانے لگے۔ اِس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ پلیگ خطرناک حدتک مُتعدّی ہے۔ زندہ، مُردوں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ کِتنوں نے ڈر کر گھر بار جلا دیئے۔ وُہ پہلا موقعہ تھا جب زِندوں نے مُردوں کو نہ نہلایا اور نہ کفنایا!

جُوں ہی کوئی مرتا، اہلِ خانہ اُسے ڈنڈوں سے دھکیل کر ارتھی پر رکھتے اور ارتھی سمیت گاؤں سے دُور گاڑ آتے۔ برہمن گلی گلی چلاتے پھرتے۔ اے مانس!! یہ تیرے بُرے کرموں کا پھل ہے! پاپوں کی سزا ہے! یہ کل جُگ کی نشانی ہے! وہ ڈنڈ دینے لگے۔ جو ہندو اپنے مرے ہُوئے کو دفنائے گا وہ اپنی سات کُلوں سمیت نرک میں جائے گا۔ دان کرو، پُن کماؤ، اپنے پُرکھوں کو مُکتی دلاؤ۔"

وُہ کہتے تھے،"ہُنر ور کسی نہ کسی طریقے سے انسان کا مُعاون رہا ہے۔ پجاری، آدمی کا دائمی جانی دُشمن ہے۔ یہ آدمی کی ذلیل ترین قسم ہے، گدھ سے بھی بدتر! یہ زندوں اور مُردوں کو برابر کھاتا ہے جس کا ثبوت ہے شرادھ کی رسم! انسان کی زندگی میں کون سا مقام ہے جہاں پجاری کو دخل نہیں ہے؟ شاستروں میں کیا لکھا ہے؟ کس کو معلوم ہے! اور جو لکھا ہے اُس کی صداقت کی ضمانت کیا ہے؟ وُہ سب پجاری ہی کے کسی پُرکھے کا اپنی آل اولاد کے لئے سوارتھ ہے۔"

"پجاری کی نفسیات، چچڑی جیسی ہے! وُہ تھن پر بیٹھتی ہے لیکن خُون چُوستی ہے حالاں کہ تھن دُودھ کا سوتا ہے۔"

تایا جی کہتے تھے کہ شاستروں میں کہیں کہیں بھولوں بھٹکوں کو راستہ دکھایا ہے، جیسے

پاتھر پُوجیاں ہر ملے، تاں میں پُوج پہاڑ

نہیں تاں، یہہ چکی بھلی، پیس کھائے سنسار

"لیکن پجاری یہ بات کسی کو نہیں سمجھائے گا! اس میں اُس کا پول کھلتا ہے۔ وُہ اِس بات پر زور دے گا۔"

جو سر سائیں نہ نیھے، سو سر کیجیے کاٹے؟

کُنّے ہیٹھ جلایئے، بالن، سندھی تھائے

(جو سر سائیں کے آگے نہ جُھکے، اُس سر کو کیا کریں؟ اُسے ہانڈی کے نیچے بالن کی جگہ جلاؤ)

اور کبھی جابر خود کو مُجاہد جان کر واقعی اُس راہ پر نکل پڑے اور کمزور قوموں پر پل پڑے۔ جب بابر ہندوستان پر حملہ آور ہُوا، مُمتاز انسان نواز نانک نے خدا پر طعن کیا۔

خُراسان کھسمانیا، ہندوستان ڈرایا

آپے دوس نہ دے ای کرتا، جم کر مُغل چڑھایا۔

اے تی مار پئی کرلانے، تیں کی درد نہ آیا

(اے خُدا! تُو نے خُراسان کا ساتھ دیا اور ہندوستان کے لئے خطرہ پیدا کیا۔)

(کیا تو یہ الزام لیتا ہے؟ کہ تو نے مغل کو ملک الموت بنا کر بھیجا ہے۔)
(ظلم وستم کی تالاب نہ لا کر انسان، چیخ چیخ اُٹھے! کیا تیرے دِل میں ذرا بھی ترس نہ آیا؟)
تایا جی بیان کرتے تھے، "لفظ، انسان کی ایجاد ہے اور انسان، لفظ کی۔ دونوں اِس قدر لازم وملزوم ہیں کہ ایک، دُوسرے کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی ست ہے اور یہی اَست ہے۔ ہر انسان اِنھیں دو طاقتوں کے دائرۂ اثر میں جیتا ہے اور جیسا کسی کا نفس ہے، کرتا ہے۔ قائل اپنے آپ کو مُجاہد کہہ سکتا ہے، کافر، مُسلمان، بھکاری، جوگی، ریاکار، اوتار اور حیوان، انسان۔"
وُہ اپنے اِس خیال کی سند، گُربانی میں سے دیتے تھے۔

ماِنس کھانے کریں نواج ، چُھری وگائن تن گل تاگ
متھے ٹِکا تیڑ دھوتی ککھائی ، ہتھ چُھری جگت قصائی

(آدم خور اور ظالم، نماز پڑھتے ہیں اور اُسی طرح لیٹروں نے جنیو پہن رکھے ہیں۔)
(ماتھے پر تلک ہے، کمر میں گیروے رنگ کی دھوتی ہے لیکن ہاتھوں میں چُھری ہے اور پیشہ، قصائی ہے۔)

تایا جی الفاظ کے بارے میں مزید کہتے تھے، "لفظ اور بیج اپنی جگہ مُکمّل ہیں لیکن پہلے کی تقدیر دُوسرے کے برعکس ہے۔ دھرتی بیج کو جنم دے کر اُس کے اوصاف قائم رکھتی ہے اور انسان، لفظ کے معنی بدل دیتا ہے۔ کوئی کچھ کہے، اُس پر غور کرو پھر اپناؤ۔ غور زندگی کی کسوٹی ہے۔ یہ پُرانے خیال کو رد کرتا ہے اور نئے خیال کی بُنیاد رکھتا ہے۔ فاضل، جاہل ہو سکتا ہے! ضروری نہیں کہ اوزار رکھنے والا ہُنرور بھی ہو۔ غور کرو! مَیں نے زندگی کو کیا دیا ہے؟ قدریں وُہی ہیں، اوزار وُہی ہیں، الفاظ وُہی ہیں، اِن سے میرا علاقہ بس اِتنا ہے کہ مَیں نے اِن کو پہچانا ہے اور تا حدِ ظرف اِن کا ٹھیک استعمال کیا ہے۔ صحیح معنوں میں بہت کم لوگ زندگی میں اضافہ کرتے ہیں اور صرف وُہی قابلِ التفات ہوتے ہیں۔"
اُن کی اِنکساری سے مرعُوب ہو کر مَیں نے حیرت سے پُوچھا، "وُہ سلاخ کاٹنے کا طریقہ بالکل آپ کا تھا۔ کیا وُہ بھی کچھ نہیں ہے؟"
"حُسن وخُوبی کی طرح عِلم وہُنر لامحدُود ہے۔ ہُنرمندوں کے پاس اِس سے کہیں بڑے ہُنر موجُود ہیں۔ مَیں نے نہیں دیکھا ہے تو کیا ہے! مجھے معلوم ہے۔ لوہا، کالی مٹّی (آئرن اور) سے بنتا ہے۔ جو ہُنرور اِسے بنانے کے جنتر بناتے ہیں، وُہ بڑے صاحبِ کمال ہیں۔ اُن کے سامنے مَیں کیا ہُوں؟ منطق، اِنسانی زندگی کی بُنیاد ہے۔ مَیں ترکھان کا ہُنر جانتا ہُوں، ترکھان ہُوں۔ لوہار کا کام جاننے والا، لوہار ہے۔

پودوں اور لونوں کے گُن پہچاننے والا، حکیم ہے۔ ہنر ہمہ پہلو ہے اور ایک انسان کی گرفت سے باہر ہے جس نے جو تلاش کیا وہی پایا۔ جُلاہے نے کرگہ، ہل دار نے ہل، درزی نے سوئی، کاتب نے قلم ـــــ اور خدا پرستوں نے دُوسروں کو گُمراہ کرنے کا فن۔"

اُنھوں نے اپنی انکساری کی تائید میں دلیل دی اور ایک نئی بات بتائی "سیتلا کی روک تھام کے لیے ٹیکے ہونے لگے۔ 'سیتلا ماں' کے مندروں سے پجاری آنے لگے اور لوگوں کو اُس کا شراپ دینے لگے جنھوں نے ٹیکے کروائے وہی بچے، دوسرے سیتلا کا شکار ہوئے اور پھر دیکھا دیکھی ٹیکوں کا رواج پڑا۔"

قارئین! اب جب کہ سیتلا کا نام ونشان مٹا دیا گیا ہے، ماتا کے مندروں کی گہما گہمی ویسی ہی ہے جیسی کہ تھی۔ آدمی کی فرزانگی کی انتہا ہے لیکن دیوانگی لاانتہا ہے۔ جہالت کی ہٹ دھرمی کو فتح کرنا سب سے کٹھن کام ہے۔ اقبال اپنے بزرگوں کی عظمت کا چرچا یُوں کرتا ہے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں، خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دِیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں، کبھی افریقہ کے تپتے ہُوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

وہی مجاہد اپنی جہالت سے جہاد کرتے تو یقیناً ہار جاتے۔ مَیں اتنے وُثُوق سے اِس لئے کہہ رہا ہوں کہ مَیں تایا جی کی اس بات پر یقین کرتا ہُوں "آدمی اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے اپنی زندگی کی ہر بات ناپاک دکھائی دیتی ہے۔ یہ اپنے تزکیۂ نفس کے بارے میں سوچتا ہے، جو مر کر نئی زندگی پانے کے برابر ہے۔ فرار پرست، عبادات و مناجات کی جانب راغب ہوتے ہیں اور سفّاک' دارالحرب کو متمدّن بنانے کے منصوبے بناتے ہیں اور جو شعورِ ذات سے آراستہ ہوتے ہیں وُہی اپنی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو نشانہ بنانا جتنا مشکل ہے دوسرے کو نشانہ بنانا اُتنا ہی آسان، جو یہ سمجھتا ہے وُہ اپنا راہبر آپ ہوتا ہے۔"

اُن کی اِس بات کا ثبوت بھائیا جی کے کردار میں ملتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ماں کے ساتھ نہایت شرمناک سلوک کیا، وُہ مر گئی تو اُس کے مُردے کو گلاب جل میں نہلایا، چِتا میں چندن کا لکڑ رکھا اور اُس کے اَستوں کو گنگا میں بہایا۔ تایا جی کہتے تھے، "زندوں کو احترام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مُردوں کو! مُردوں کو گھر سے ہٹانا ضروری ہے، اُنھیں کیسے بھی ہٹاؤ! زندوں کو گھر میں پالنا پوسنا لازم ہے، اِسے ذمّہ داری سے نبھاؤ! مُردوں کو مقدّس بنانے کا فریبِ مصلحت آمیز اُن لوگوں کا تجدّد ہے جو اِن کی ہڈیوں کا بیوپار کرنا چاہتے تھے۔ نظری اعتبار سے غیر مرئی مخلوق کا وجود نہیں ہے لیکن عملی نظریے سے ہے اور ہر مُردہ پرست کا اُس سے رشتہ ہے"

عمل اُن کی زندگی کا چلن تھا۔ اُن کے باپ اُتم سنگھ بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے اور تائی نے اُن کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا تو تایا جی نے پانچ سال تک اُن کی دایہ کا فریضہ نبھایا۔

دھرم شاستر، انسانی رشتوں کو جھٹلا کر بھگوان کو ماتا پتا بناتے ہیں اور اُسی کی حمد و ثنا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ تایا جی اِس خیال کی تردید کرتے تھے "پتھر دِل سے پتھر دِل ماں باپ بھی یہ نہ چاہیں گے کہ اُن کے بچّے لنگڑے، لُولے، اندھے اور بد شکل ہوں۔ شاستر بھگوان کو دیاونت سے دیاونت ماں باپ سے دیاونت بتاتے ہیں اور پُورن کلاکار۔ پھر یہ کام کس کا ہے؟ کوئی مجھے بد طینت کہے لیکن انسانی رشتوں کے بارے میں شاستروں کی تفسیر یہی ہے کہ اپنے ماں باپ پر وقت پڑے تو انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو لیکن بھگوان کے نام پر اپنی جان دے کر بھی اپنی احسان مندی کا ثبوت دو۔ تیرا تینوں سونپیا کیا ہے لاگا مورا!"

میرے قارئین! جس کے کامل عقیدے کی صداقت یہ ہو کہ وہ حقیقت کو نظر انداز کر کے کسی غیر حقیقی کام کے لئے اپنی جان دے سکتا ہو، اُس کے نزدیک کسی دُوسرے کی جان کی کیا وقعت ہے؟ خُدا نہ کرے! ایسا کٹّر کسی قوم کا سرپرست بن جائے تو وہ اپنے نظریے کو مُسلّط کرنے کے لئے اُس وحشیانہ طاقت کا استعمال کرے گا جس سے بُوچڑ خانے کی روایت حقیر لگے گی۔

لکڑی کے کام میں چُولوں اور چھیدوں کو اِتنا دخل ہے، جتنا لکڑی کو۔ کس چول اور کس چھید میں کتنی چھوٹ ہونی چاہیئے؟ یہ بھید اُن کی آنکھوں میں تھا۔ وہ ایسا پیمانہ نہیں جو تسُو سے تسُو کا فرق کسرِ اعشاریہ تک بتا سکتی تھیں۔ دُوسرے کاموں کی طرح وہ چُول کی صفت بیان کرتے تھے "انسان سانس لیتا ہے تو زندہ رہتا ہے چُول سانس لیتی ہے تو مر جاتی ہے۔"

کوئی غلطی کر کے مان لیتا تو وہ اُس کی داد یُوں دیتے "ہُنر اور اخلاق کا غلطی سے اٹوٹ تعلق ہے۔ جو کوئی اپنا تجزیہ دیانت داری سے کرتا ہے، وہ خرابی سے خُوبی کی طرف مُڑتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا، وہ لیک سے بے لیک نہیں ہوتا۔ اُس کی فطرت کا رُجحان ہجوم کی طرح ہے، جسے نہ اپنے راستے کا گیان ہوتا ہے، نہ مکان کا، نہ پاگل پن کا۔"

جس طرح بیج سے انکُور قریب ہے اُسی طرح وہ دھرتی سے تھے۔ اگیتی کھیتی ہوتی کہ پچھیتی (اگیتی موسم سے پہلے بولی گئی کھیتی۔ پچھیتی، موسم کے بعد بولی گئی کھیتی) زمین چاہی ہو کہ بارانی، سوائی ہو کہ ریتلی، جو کوئی اُنھیں نمی دکھا کر بیج بوتا، اُس کی فصل کا حاصل عام فصل سے زیادہ ہوتا۔ اِس حیرت انگیز نتیجے کا راز یہ ہے کہ اُنھیں اِس بات کا پُورا گیان تھا کہ کونسی زمین میں کتنی نمی ہونی چاہیئے، کہاں بیج پور پرنا چاہیئے۔ کہاں کیرنا چاہیے کہاں پور (اکری) سے بونا چاہیئے، کہاں بو کر لیک کو کھلا رکھنا چاہیئے اور کہاں سُہاگا دینا چاہیئے۔ کئی بار وہ

بچوں کو بھو کر بیجنے کا سمجھاؤ بھی دیتے تھے۔ اُن کھیتوں کی فصل اِس دہقانی قول پر پوری اُترتی تھی۔ "مینڈھ کو دھکّا مارو تو کھیت ہلتا ہے!"

کوٹھے جٹّاں کے شام سنگھ سے اُن کا یارانہ تھا۔ وُہ اُنھیں دھرتی کا سپُوت کہتا تھا۔ اُس نے اُن کے مشورے پر جہاں رہٹ لگایا تھا وہاں پانی کی پوٹ تھی۔ اُسے دن رات جوتے رکھنے سے بھی پانی ٹوٹتا نہ تھا۔ تایا جی کہتے تھے کہ دھرتی میں سمندر دفن ہے، جس کا پانی کھلے سمندر کے برعکس صاف اور میٹھا ہے۔

ایک بار بھائیا جی نے میرے ہاتھ شام سنگھ کو سندیسا بھیجا۔ تایا جی پاس ہی بیٹھے ہُوئے تھے، اُنھوں نے کہا کہ وُہ گھر میں نہیں ہے۔

"آپ کو کیسے خبر ہے؟"

"ایسے ہی جیسے کہ تُم یہاں بیٹھے ہُوئے ہو!"

"کہاں گیا ہے وُہ؟"

"شاید لامبڑے کو جا رہا ہے۔"

اُن کی بات سُن کر میں حیران نہ ہُوا۔ وُہ کئی بار عالمِ غیب کی باتیں کرتے تھے جیسے اُنھیں اشراقِ ضمیر ہو۔ اُنھوں نے بھائیا جی سے کہا، "اِسے وہاں مت بھیجو، وُہ یہاں آنے والا ہے۔"

بھائیا جی کب ماننے والے تھے! میں کوٹھے جٹّاں گیا اور یہ خبر لایا کہ وُہ بگّے وال (لامبڑے سے جُڑا ہُوا گاؤں ہے) گیا ہے اور وہاں سے ڈِڈیانہ جانے والا ہے۔

کوئی اُن سے بھوِشّ بانی کرنے کے لئے کہتا، وُہ اِنکار کر دیتے۔ میں اُن سے اُن کی غیر معمولی شکتی کے بارے میں پُوچھتا جو اُن کے ارضی وجُود کو ماورائیت سے ہم آہنگ کرتی تھی۔ وُہ کہتے، "اِنسان کا دِماغ ایسی بڑی شکتی ہے جو حیرت کُن کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ محبّت و نفرت، شادی و غم، رِقّت و ہمّت ---- چند ایسے رنگ ہیں جو آدمی کھُلے طور پر دیکھ سکتا ہے۔ آدمی کا رُواں رُواں طاقت ور محاس ہے۔ اپنی وِجدانی کیفیت سے آدمی غیر مرئی دُنیا کی حقیقت جان سکتا ہے۔ آدمی کی ماہیت تکونی ہے، دماغی، عملی، کائناتی۔ اِنسان دھرتی کی حقیقت ہے لیکن اپنے اِحساس، عمل اور دلیل سے فوق الافطرت ہے۔" وُہ اِس تکون کو یُوں بیان کرتے تھے۔ "اِحساس، ناقابلِ ادراک حقیقت کی بصیرت ہے، عمل، بصیرت کی تفسیر ہے اور دلیل تفسیر کی توثیق ہے۔ دھرتی اُسی زِندگی کے دوام پر مُلتفت ہے جو اپنے اِرتفاع پر مائل ہے۔ آدمی نئی زِندگی پیدا کرتا ہے، اُس میں نئی خُوبیاں بھرتا ہے اور ناپسند ہو تو اُسے تلف کر کے اُس سے بہتر زِندگی تخلیق کرتا ہے۔"

اُن کی باتیں تصوّرِ کُلّی کی ترجمانی کرتی تھیں۔ وُہ اِنسان اَور حیوان میں جیسے موازنہ کرتے تھے لوگ اُس پر حیران ہوتے تھے۔ "حیوان کی میراث اُس کی نَسل کا وِرثہ ہَے اَور اِنسان کی میراث، ہُنر، کیوں کہ اِس نے اپنی زندگی خُود تخلیق کی ہَے۔ اِس کا عمل اَپنے سے زِیادہ دُوسرے کے فائدے کے لیے ہَے اَور یہی اِس کا حقیقی صِلہ ہَے۔"

وُہ نہ کِسی کو دُعا دیتے تھے اَور نہ ہی دُعا مانگتے تھے۔ زِیادہ سے زِیادہ کہتے تھے تو بَس اِتنا "جاؤ اَپنے کام پر دھیان دو اَور خُوش بسو۔"

ایک بار اُودھم سِنگھ نے حسرت آمیز اِشتیاق سے تایا جی سے کہا، "بھاپا جی! کوٹلے کے شاہوں کو زمین کھودتے ہُوئے اُس کھیت میں سے خزانہ ملا تھا، جس کا ڈانڈا میرے کھیت سے لگتا ہَے۔ سَب قِسمت کا کھیل ہَے!"

"اُودھم سِیاں! تُم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ تُم بَدقِسمت ہو؟ بَدقِسمت وُہ ہَے جسے مُفت کا دَھن مِلتا ہَے۔ وُہی سَب سے دَھن وان ہَے جسے دَھن پَیدا کرنے کا ہُنر آتا ہَے۔ مُفت کا دَھن، بَھنور ہوتا ہَے جو اپنے ساتھ آنے والی نَسلوں کو بھی لے ڈُوبتا ہَے۔"

اُن کی بات سُن کر اُس کے چہرے پر رَوشنی سی پھیل گئی جیسے اُس نے زندگی کا اہم سُراغ پالیا ہو۔

وُہ کہتے تھے، "جو کچھ ہوتا ہَے، کرنے سے ہوتا ہَے۔ دُعاؤں سے ہوتا تو سَنت اَلکھ نہ جگاتے اَور نہ ہی صَدقے سِلّے پر جیتے، اُن کے لئے آسمان سے پَدارتھ برستے۔ یہ غیر حقیقی باتیں اَیسے لوگوں نے گھڑی ہیں، جن کے پاس محنت کا نظریہ مفقُود ہَے۔"

مَیں اُن کی مالش کرتا اَور اُنھیں گرم پانی سے غُسل کرواتا۔ وہ غُسل نہ کرنا چاہتے تو گرم گیلے کپڑے سے اُن کا بَدن صاف کرتا۔ اُن کے ہاتھوں اَور پَیروں کی ٹھنڈک کم نہ ہوتی تھی۔ مَیں تشویش ظاہر کرتا، وُہ مُسکرا کر کہتے، "میرا وقت آگیا ہَے!" اُن کی زبان سے وقت کے مخصُوص معنی سُن کر مَیں حیران ہوتا۔ وُہ کہتے تھے، "وقت، ماں کی ممتا ہَے، بچّے کی معصُومیت، بُوالہوس کی ہوس، بُوڑھے کی سَنک، دولت مَند کی حرص ــــــ اَور کاریگر کا جَنتر ہَے۔ وقت ہر کِسی کے لئے الگ معنی رکھتا ہَے، صرف ہُنرور کے لئے اِس کے ایک معنی ہیں، ہُنر کی پَیروی۔ وقت، غارت گرِ اِنسان ہَے لیکن مُحافظِ ہُنر ہَے۔ ہُنر وُہ تحریک ہَے جس میں وقت قَید ہَے۔"

ایک دِن مُجھے رنجیدہ دیکھ کر اُنھوں نے کہا، "زِندگی اَپنی حفاظت نہ کرسکے تو چولا بدل لیتی ہَے اَور پھر نئی تاب و تاب سے شرُوع ہوتی ہَے۔ میرے چولا بدلنے کا وقت آگیا ہَے! وُہ دیکھو!" اُنھوں نے

آڑوؤں کے خزاں زدہ بے برگ و بار درختوں کی طرف اشارہ کیا اور بولے، "پرانے پتّے جھڑ گئے ہیں اور نئے پتّے اُگنے کے لئے ہُمک رہے ہیں۔"

کام (جسے وُہ انسانی زندگی کی نعمت مانتے تھے) اُن پر الگ طرح اثر انداز تھا۔ اُن کے ہاتھ، ریگمال کی طرح کھُردرے تھے اور پاؤں کی چھنگلیوں کے گوکھرو بڑے اور بھدّے، جن کے برابر جوتا کاٹنا پڑتا تھا ورنہ پہننے سے تکلیف دیتا تھا۔ پنڈلیوں کی نسیں پُرپیچ سپولیوں کی طرح پٹھوں پر بیٹھی ہُوئی تھیں۔ کوئی ناخن ثابت نہ تھا۔ بدن کے بال کُنڈلوں کی طرح مُڑے ہُوئے تھے۔ داڑھی کی سفیدی پیلی پڑ گئی تھی۔ گندمی رنگ جل کر مٹیالا ہو رہا تھا اور یہ اُن کی فراست کے عین مطابق تھا۔ "انسان، فطرت کی سب سے بدصورت تخلیق ہے کیوں کہ اِس کا حُسن، حُسنِ تعمیر سے عبارت ہے، جو اِس کا حالات کے خلاف مُسلسل جدل کا حاصل ہے۔ اِس نے جہاں جتن چھوڑ دیا یہ وہیں رہ گیا۔"

میرے بھائیا جی اپنی جسمانی خوب صُورتی پر ناز کرتے تو تایا جی کہتے، "رتن سیاں! انسانی اصطلاح میں خوبصُورتی کے معنی ہیں، خُود آگہی۔ یہ ضمیرِ حیات کے لئے بصارت ہے اور تنگ ظرفی کے لئے وُسعت۔"

وُہ بہُت حد تک اپنی دیکھ بھال کر سکتے تھے لیکن میں خدمت کرنے پر مُصر رہتا۔ میں اُن کے ناخن اور گوکھرو رکھانی اور ریتی سے اُس وقت کاٹتا جب وُہ نہا چُکتے۔ وُہ میری دُور اندیشی اور کاریگری کو نئے معنی دیتے۔ "ہُنرور نت نئے تجربوں سے اپنے ہُنر کی تجدید کرتا ہے اور اپنے اوزار کے معنی کو پھیلاتا ہے۔"

معدہ کمزور ہو جانے کی وجہ سے وُہ کم کھانے لگے تھے۔ ماں دال اور سبزی کا زُود ہضم شوربا بناتی اور وُہ اُس میں نوالہ بھگو کر کھاتے۔ وُہ کھانا کھا چُکتے، میں اُنھیں وہیں پانی اور سلفچی اور تولیہ مہیّا کرتا۔ اُن کے دانت پُورے تھے۔ بُوڑھوں کی طرح نہ گال اندر کو پچکے تھے اور نہ ہونٹ، مُنہ میں دھنسے تھے۔ وُہ بلاناغہ کیکر کی مسواک کرتے تھے اور میں اُن کی عادت سے واقف تھا۔ میں کیکر کی تازہ شاخ کاٹ کر لاتا، کُوٹ کر اُس کا برُش بناتا اور اُنھیں دیتا۔ وُہ مسواک کرتے اور ہاتھ منُہ دھو کر داڑھی مُوچھ سنوارتے۔ اگر داتن کا کوئی ریشہ ٹُوٹ کر دانتوں میں رہ گیا ہوتا، میں اُسے نکالتا۔ وُہ میرا ہاتھ چُوم کر دھن بھاگ کہتے۔ وُہ گنّا چُوسنے کے شوقین تھے لیکن گنّا چھیل نہ سکتے تھے۔ میں نے بانک سے گنّا چھیلا، سروتے سے گنڈیریاں بنائیں اور اُنھیں چُوسنے کو دیں۔ اُنھوں نے دو گنڈیریاں پھاڑ کر مشکل سے چُوسیں اور کہا، "بیٹا، یہ تیرا ہی بھوجن ہے! تُو ہی اِس سے مزہ لے۔" میں اُن کے پاس بیٹھ کر گنڈیریاں چُوسنے لگا۔ میرے بچپن کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وُہ بروٹے (گنّے کے ٹکڑے جو بوئے جاتے ہیں) کاٹتے اور لمبی پوریوں میں سے گنڈیریاں بھی نکالتے۔ میرا اتنی

گنڈیریاں جمع کرلیتا کہ جیب تو خیر جیب ہے، میرا دامن بھی چھلک جاتا لیکن میں اچھی گنڈیری پر بھوکے کی طرح جھپٹتا۔ وہ میرے حریصانہ رویّے کو پیار کرتے لیکن اُس کا اظہار غُصّے سے کرتے، "جتنی چاہے گنڈیریاں اُٹھا لیکن گنڈاسے کی طرف ہاتھ نہ بڑھا۔ مجھ سے دُور بیٹھ، وہاں!" میں اُن کے پاس سے نہ اُٹھتا تو وہ مجھے اُٹھا کر اپنے سے دُور بٹھا دیتے۔

وہ جسمانی طور پر کمزور سہی، اُن کی آواز حیرت انگیز طور پر صحت مند تھی۔ میں اُن کی باتیں سُنتا اُن سے باتیں کرتا، وہ سوتے تو اُن کے پاس بستر لگا کر سو رہتا۔ ایک دِن میں مُنہ اندھیرے اُٹھا اور جنگل پانی کے لئے وریام سنگھ کے رہٹ پر جا نکلا۔ اُس کے باغیچے سے میں گُلاب کے پھول لایا اور اُنھیں کوزے میں ڈال کر اُن کے پاس میز پر رکھ دیا۔ کوزے کا مُنہ بڑا تھا اور پھول کم، اُس پر میرا بھونڈا پن، وہاں اُن کی حیثیت بے ترتیب انبار کی سی تھی۔ میری بد مذاقی اُنھیں بُری لگی۔ کیوں نہ لگتی؟ وہ دُنیا کی اِس ریت سے واقف تھے کہ دُنیا بدصُورت کو اپنی غفلت سے مارتی ہے اور خوبصورت کو محبّت سے۔ اُنھوں نے مُجھے سمجھاتے اور یاد دلاتے ہُوئے کہا، "پھول کا صحیح ٹھکانا پودے پر ہے۔ یہ نظر باز کو دعوتِ نظّارہ دیتا ہے اور اُس کی فرحت افزائی کا سبب بنتا ہے۔ تم اپنے بچپن میں ایک نظم سُنایا کرتے تھے، پھول کی فریاد، یاد ہے؟"

"یاد ہے!" میں نے قائل ہو کر شرمساری سے کہا۔

"پھول کی زِندگی گردشِ افزائش سے جُڑتی ہے۔ اِسے اِس کے ماحول سے جُدا کرو تو اِس کے وجود کو معنی ضرور دو۔ جیسے پُجاری اِسے پُوجا سمگری بنا لیتا ہے اور سُندری اپنی سُندرتا کا حِصّہ! تُم ہُنر ور ہو، اِسے ایسے سجاؤ کہ کوئی نئی بات پیدا ہو!" اُنھوں نے دعوتِ فکر و نظر دیتے ہُوئے کہا۔

اُن کی بات دانش، رمز، ہُنر کی تثلیث تھی۔ اُس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہ آیا اور میں مجبور و معذور اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُن کے سجھاؤ پر میں نے کوزے کے پیٹ کے برابر لکڑی کا سوراخ دار ڈھکن بنایا، کوزے میں پانی بھر کر میز پر رکھ دیا اور اُن کی ضرورت کے مُطابق سامان فراہم کرنے لگا۔ سب سے پہلے اُنھوں نے ڈھکن کے درمیانی چھید میں ایک سرکنڈا کھڑا کیا اور پھر اُس کے اطراف خار و خس اِس طرح لگائی کہ وہ ویران و بریاں خطّے کی صُورت نظر آئی۔ اُنھوں نے اُس میں سے سرکنڈا نِکال دیا اور اُس کی جگہ پھول ڈال دیا۔ اُس منظر کے کھُلتے ہی میں نے اُس کا مفہوم پا لیا اور میں بے اختیار چِلّایا، "یہ بالکل لالۂ صحرا لگتا ہے!"

وہ مُسکرا دیئے اور کہنے لگے، "میں نے بھی اِسے اِسی سے مِلتے جُلتے معنی دیئے ہیں۔ ہنگامۂ فنا کے درمیان زِندگی ایسے سربلند ہے جیسے اِس ویرانے میں پھول!"

زندگی کے بارے میں وہ ایک بصیرت افروز بات کہتے تھے، "شوق میں احساس کا عنصر ہو تو زندگی اپنے معنی بدل لیتی ہے اور اس کی سختی، نرمی میں ڈھل جاتی ہے۔ پودے کے لئے پھول اور انسان کے لئے محبت ایک ہی بات ہے۔ ان کی خوشبو دوسروں تک پہنچتے ہی بنتی ہے۔"

وہ علم کی ایسی لغت تھے، جس میں لفظوں کے الگ معنی تھے۔ لیکن افسوس! کسی کو ان کے لفظوں کی حقیقی اہمیت کی وقعت نہیں تھی۔ میں ایک بدخو کی طرح دوسروں کو نشانہ بنا رہا ہوں۔ میں خود سے پوچھتا ہوں۔ جب تم خود ویسے ہی تھی، دوسروں کے نکتہ چیں کیوں ہو؟ ہاں قارئین! میرے اس متعصب رویے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میری انانیت مجھے اپنے طریقے سے بہکائے رکھتی تھی کیوں کہ وہ میری تکمیلِ انفرادیت اپنے انداز سے کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ہاتھوں میں اس کے میلانِ اختراع کا آلۂ کار تھا۔ انانیت کی نفسیات جمِ غفیر کی سی ہے۔ جو کوئی اس سے بچنے اور سمت چننے میں ناکام رہتا ہے، وہ روندا جاتا ہے۔ میں کم و بیش مردود تھا۔

تایا جی کہتے تھے، "انانیت کا سانچہ احساس ہے اور احساس کا عمل۔"

عملاں باجھوں آدمی جیوں پانی بن مین

جیسے چولہا آگ بن، اکھیاں جیوتی بین

(بے عمل انسان کی حالت جل بن مچھلی، بے آگ چولہے اور جیوتی ہین آنکھوں کی سی ہوتی ہے۔)

وہ بیکاری کو انسانی خرابیوں کی جڑ کہتے تھے اور اپنا کام اس لگن سے کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ اور اوزار اور کام میں تکونا تال میل ہوتا تھا۔ کسی وجہ سے وہ کام کرنا بند کرتے، وہ تال میل ٹوٹ جاتا، لگتا کہ کام کھینچ کر سیدھی لکیر کی طرح لمبا ہو گیا ہے۔ وہ کام کرتے ہوئے زیرِ لب گنگناتے تھے۔ ان بے الفاظ سرود و نغمہ کا لطف بادۂ شبانہ کا سا تھا۔

ایک دن ماں نے ان سے پوچھا، "بھایا جی! ہمارے گرو جہاں گئے، برے آدمیوں کے پاس ہی گئے، کیوں؟ کبھی اچھے آدمیوں کے پاس کیوں نہ گئے؟"

"جو زمین کمزور ہو، کسان اس میں زیادہ ہل چلاتا ہے، زیادہ کھاد ڈالتا ہے، زیادہ محنت کرتا ہے لیکن پیداوار کم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟"

انھوں نے پوری تفصیل سمجھا کر سوال کیا جیسے انھیں امید ہو کہ وہ اس سے صحیح جواب اخذ کر سکے گی۔ لیکن ماں نے کہا، "آپ ہی بتائیے!"

"کمزور زندگی کو راہنمائی اور پشتی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور بُرا آدمی ایسی ہی زمین کی طرح کمزور ہوتا ہے۔" اُنھوں نے اپنے سوال کا جواب آپ ہی دیا۔

"گیان کے پتا مجھ پر اِتنا ظلم کرتے ہیں، کیا وہ کمزور ہیں؟"

میری ماں پر میرے بھائیا جی کا تازہ تازہ عتاب ٹُوٹا تھا۔ اُس نے اپنے دِل کی تسکین کے لئے بات کی تہ تک پہنچنا چاہا۔

"ظلم و تشدّد، بے بصیرتی اور اخلاقی کمزوری کی پیداوار ہے۔ اِنسان کی طاقت، دردمندی میں ہے نہ کہ بے دردی میں۔ لیکن عام اِنسان کی جہالت مُسلّم ہے اور وہ اپنے معنی سے بے خبر ہے۔" تایا جی نے اُسے دِلاسا دیا۔

وُہ اِس بارے میں ایک اور مثال دیا کرتے تھے، "اُستاد اُن بچّوں پر زیادہ دِھیان دیتے ہیں جو نالائق ہوں۔"

اُس بڑھاپے میں اُن کی صحت بھلا کیا سنبھلتی، میری خِدمت گزاری سے اُن کے چہرے پر مرجھائی سی تازگی آگئی۔ موت کس پر ٹلی ہے، جو اُن پر ٹلتی، اُن کا انجام آپہنچا، جو اُن کے وِچاروں ہی کی طرح خُوب صُورت تھا۔

بسنت کی کیمیا گری نے گندم کو سونے میں تبدیل کر دیا تھا۔ چند دنوں میں درانتی پڑنے والی تھی۔ بادلوں کا نام و نشان نہ تھا گویا آسمان کا دِل، دھرتی ہی کی طرح صاف تھا۔ امریوں میں مور آگیا تھا اور اُسی طرح کوئل کے گلے کا سوز و گداز۔ وُہ فطرت کی ثروت و سخاوت کا راگ الاپتی نہ تھکتی تھی۔ شہد کی مکھیاں تتلیاں، بھونرے پھولوں کو ایسے چُوم رہے تھے جیسے پڑوسی شُبھ تیوہاروں پر ایک دُوسرے کو نیوتے دیتے گلے مِلتے ہیں۔ کاروانِ حیات پُوری شان و شوکت سے رواں دواں تھا۔ عین اُس وقت جب سُورج کی کرنیں کاروانِ حیات کی راہ روشن کرنے کے لئے بیدار ہُوئیں، مَیں جنگل جاکر واپس آیا۔ تایا جی جاگ رہے تھے۔ مَیں نے دیکھا، وُہ کچھ سوچنے لگے۔ تاکہ اُن کا دِھیان نہ ٹُوٹ جائے، مَیں اُن کے سر کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور اُن کا چہرہ پڑھنے لگا۔ مَیں نے محسُوس کیا، وُہ اپنے اِس خیال کا جائزہ لے رہے ہیں کہ مَیں نے نوعِ اِنساں کو کیا دیا ہے اور کیا لیا ہے؟

آڑوؤں کے درختوں پر گلدستوں کا گُمان ہو رہا تھا۔ وُہ نرم ہوا سے ہلتے، دھڑکتے لگتے تھے۔ اُن کی کُنواری پوتر تا سے سارا ماحول مہکا ہُوا تھا اور گلابی عکس، تایا جی کے بستر کی رونق بنا ہُوا تھا۔ وُہ مُسکرائے، اُن کے چہرے کی روشنی رنگین سحر کو بڑھاوا دیتی جان پڑی۔ مَیں آگے بڑھا اور تسلیم بجا لایا۔

اُنھوں نے گلدستوں کو دیکھتے ہُوئے مجھ سے کہا، "اِحساسِ لطیف ایسا مُظہر ہے جو اپنے ساتھ دُوسرے کو سنوارتا اور مہکاتا ہے، موسمِ بہار کی طرح۔ دیکھو! وُہ درخت کل سُوکھے اور مُرجھائے ہُوئے لگتے تھے لیکن آج لہک، مہک رہے ہیں اور ہمارے دیدہ و دِل کی راحت بنے ہُوئے ہیں۔"

پُورے گاؤں میں وُہ اپنی پیڑھی کے آخری فرد تھے اور اپنی دانش و حکمت کی واحد نشانی۔ میں اُن کے سامنے طِفل سہی، جاہل سہی، بدعمل سہی لیکن میرا دِل سراپا محبّت تھا۔ میں ایسا نہ ہوتا تو اُس گزرے اور گُونگے وقت کو زبان نہ دے سکتا۔

اُن کی محبّت بھری بات سُن کر میرے دِل و دِماغ مہک اُٹھے جیسے پُوری فضا میں پھُول کھِل اُٹھے ہوں۔ میرے جی میں آئی کہ وُہ باتیں کرتے رہیں اور اُن کے الفاظ خُوشبُو کے جھونکوں کی طرح آتے رہیں۔ مَیں کچھ نہ کہوں، بس سنُوں تاکہ وُہ بے روک بولتے جائیں اور وُہ جاں فزا جوہر لُٹاتے جائیں جو کبھی تیز تیز اور کبھی بھینا بھینا تھا۔ لیکن وُہ خاموش ہو گئے اور وُہ جادُو ٹُوٹ گیا۔ اُنھوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وُہ جادُو پھر چل نِکلا لیکن اِس بار اُس کی زنبیل میری زبان تھی۔ "آپ کہتے ہیں کہ انسان مرتا نہیں پُورا ہوتا ہے، کیسے؟"

"اِنسان اکیلا حیوان ہے جو دوہری زِندگی جیتا ہے، ایک حیوان کی اور دُوسری تخلیق کار کی۔ پہلی زندگی پُوری ہوجاتی ہے تو کایا پلٹ لیتی ہے اور دُوسری تخلیق کی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ یہی وُہ حقیقت ہے جس میں پانچوں عناصِر (مٹّی، پانی، آگ، ہوا، آکاش) اپنی اِنفرادیت کھوتے ہیں اور امر ہوتے ہیں تخلیق نظریۂ وحدتِ اَصل کی دیدہ صُورت ہے۔"

اِتنے میں بُوٹا سنگھ آیا اور اُن کی عیادت کے لئے پلنگ کی باہی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھتے ہی باہی تڑاخ سے ٹُوٹی اور وُہ نیچے گر پڑا۔ وُہ پگڑی سنبھالتا ہُوا اُٹھا اور ترکھانوں پر برسنے لگا، "سبزی فروش اور ترکھان کی خصلت ایک سی ہے۔ وُہ گلی سڑی ترکاری کھاتا ہے اور یہ گلی سڑی لکڑی سے گھر کا سامان بناتا ہے۔ کیوں سادھو سیاں؟"

اُس کی عادت تھی کہ وُہ وقت بے وقت طعنے، مہنے دیتا تھا اور اپنی ہانکتا تھا۔ ایک دِن وُہ وریام سنگھ کے ساتھ تیمار داری کے لئے آیا تھا۔ وریام سنگھ نے تایا جی کا حوصلہ بندھاتے ہُوئے کہا، "بھا تایا جی! کب تک بیمار رہو گے؟ جلدی تندرست ہوجایئے اور غُسلِ صحّت کیجیے!"

اِس سے پہلے کہ تایا جی کچھ کہتے، بُوٹا سنگھ بولا، "غُسلِ صحّت کی بجائے، غُسلِ میّت کی بات کر، وریام سیاں! دھرتی کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہو!"

تایاجی اُس کی بات سُن کر مُسکرا دیئے اور گویا ہُوئے "ہاں بُوٹا سیاں! غسلِ صحت کی طرح غُسلِ میّت بھی روایت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آخری دوہرائی نہیں جاتی۔ اور کوئی دھرتی پر بوجھ نہیں ہوتا! آدمی، آدمی پر بوجھ ہوتا ہے! اور کئی تو خود پر بوجھ ہوتے ہیں۔"

مَیں نے غُصّے سے اُسے دیکھا لیکن چُپ رہا۔ اِس میں مصلحت یہ تھی کہ اُسے روکنے سے وُہ ضِد پکڑ لیتا تھا ورنہ بھونک بھانک کر چلا جاتا تھا۔

مَیں جلدی سے تایاجی پر جُھکا۔ اُن کا سر ایک طرف گرا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُسے سیدھا کیا لیکن وُہ دُوسری طرف لڑھک گیا۔ مَیں نے گھبرا کر اُنھیں آواز دی، "تایاجی! تایاجی!!"

بُوٹا سنگھ سنجیدہ ہو گیا اور کسی ناگہانی حادثے کا خیال کرتے ہُوئے، اُن کی نبض دیکھنے لگا۔

"نبض نہیں ہے۔" وُہ میری طرف دیکھ کر پتّھر سے لہجے سے بولا۔

"کیا کہا؟" مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا اور سمجھا کہ وُہ ٹھٹّھا کر رہا ہے۔

"سورگ باس ہو گیا ہے!" اُس نے اُن کے پپوٹے سرکا کر دیکھے اور اُسی بے حسی سے تصدیق کر دی، جس بے حسی سے اُس نے پہلی بات کہی تھی۔

مَیں جیسے تھا ویسے ہی جم گیا۔ مَیں نے نہ چیخ ماری اور نہ آہ بھری لیکن میرے آنسو ایسے رواں ہُوئے جیسے لبالب تالاب سے ڈھلوان کی طرف لکیر کھینچ دی جائے تو وُہ بہنے لگتا ہے۔

بُوٹا سنگھ نے سنت گُرچرن سنگھ کو آواز دی۔ وُہ کھڑاؤں پہنے ٹھپ ٹھپ کرتا آیا اور تایاجی کے سرہانے کھڑا ہو کر چلانے کے شلوک پڑھنے لگا۔ میں نے بُوٹا سنگھ کے کہنے پر زمین پر کھیس بچھایا اور اُس کی مدد سے تایاجی کو پلنگ پر سے اُٹھا کر کھیس پر لٹا دیا۔ مَیں نے اُسے وہیں رُکنے کے لئے کہا اور گھر میں اطلاع دینے کے لئے بھاگا۔ ماں دُودھ دوہ کر بالٹی اُٹھائے آنگن میں کھڑی تھی۔ مجھے بھاگتے ہُوئے آتے دیکھ کر اُس نے تشویش سے پُوچھا، "کیا ہُوا؟ سُکھ تو ہے؟"

"تایاجی سُرگ باس ہو گئے!"

اُس کے ہاتھ سے بالٹی گر گئی اور وُہ لڑھکنے کے سے انداز میں پیروں پر ڈھے پڑی۔ مَیں نے اُسے سنبھالا اور پکارا، "ماں! کیا ہُوا اماں؟ تُم ٹھیک ہو؟"

وُہ پتھرائی ہُوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد بولی، "ہے واہگرو! ہے واہگرو!!"

اُس کی آواز میں اشکوں کا سیلاب دکھائی پڑا۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا جیسے سارا لہُو، پانی بن

کر آنکھوں میں چڑھ آیا ہو۔ اپنی نئی ذمّہ داری کا خیال کرتے ہُوئے، مَیں نے اپنی بہن ترسیم کور کو بُلایا، ماں کو اُس کے حوالے کیا اَور واپسی قدموں سے حویلی پہنچا۔ کچھ دیر کے بعد تائی، تائی ماں اَور ماں روتے پیٹتے وہاں پہنچیں۔ تائی کو جُوں ہی خبر ہُوئی کہ تایا جی پلنگ پر پُورے ہُوئے ہیں، وُہ رونا بھُول گئی اَور مجھ پر برس پڑی، "بچہ پیٹے! یہ مر رہا تھا تو تُو نے اِسے نیچے زمین پر کیوں نہ اُتارا؟ ہائے، یہ نرک باسی ہُوا! یہ پلنگ بھی ٹُوٹ گیا، پیارا سنگھ کے جہیز کا پلنگ تھا۔ وُہ کیا کہے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہُوا!"

وُہ حرفِ مَلامت کی طرح مجھ پر برستی رہی اَور اُس نازک صُورتِ حال میں اپنی کٹھور دِلی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ وُہ بظاہر رو رہی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خُشک تھیں۔ اُس نے میری پیٹھ پر دو ہتّڑ مارا اَور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وُہ ہولے ہولے اَور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلا کرتی تھی۔ وُہ دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہُوئی سامان اُٹھانے لگی اَور اَندر رکھنے لگی۔ اُس نے مجھے مدد کے لئے بُلایا لیکن مَیں دِل ہی دِل میں کُڑھتا ہُوا وہیں کھڑا رہا۔

وُہ عورت، میری تائی ایک عُمر تایا جی کے ساتھ رہی تھی، اُس فِکر و عمل کے سرچشمے کی تھاہ تک نہائی تھی لیکن سُوکھی کی سُوکھی رہی تھی۔ اُس کی سختی کانٹے کی طرح مُسلّم تھی! وُہ پھُول کے سایے میں پلتا ہے لیکن اپنے اوصاف برقرار رکھتا ہے اَور اپنے حریف سے لمبی عُمر پاتا ہے۔

میری ماں، تایا جی کے پیروں میں بیٹھی، سر گھُٹنوں پر رکھے خاموش رو رہی تھی۔ وُہ اپنے غم میں بالکل اکیلی تھی جیسے وُہ اُس کا ذاتی سوگ ہو۔

بھایا جی لامبڑے میں ٹِک پر تھے۔ مَیں نے امی چند کو بھایا جی کو بُلانے کے لئے بھیجا اَور خُود دِلّی کو تار دینے کے لئے ہریانہ جانے لگا۔ رام کشن وہیں کھڑا تھا، اُس نے کہا، "مَیں ہریانہ جا رہا ہُوں تار مَیں دے دُوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے! ایکسپریس دینا"

مَیں نے اُسے دس کا نوٹ اَور سرنامہ جیب سے نکال کر دیا۔

تایا جی کو ڈھانپنے کے لیے بُوٹا سنگھ نے تائی سے چادر مانگی۔ وُہ بولی، "نلیشی کو اکھری کر لو اَور اُسی سے ڈھانپ دو۔ نہیں تو بستر کی دری لے لو، اَب اِسے پھینکنا ہی تو ہے۔"

ماں نے گھُٹنوں پر سے سر اُٹھایا اَور تائی کو حیرت سے دیکھا۔ اُس نے رِقّت سے کہا، "بھابی! مَیں اِس بستر کو پھینکوں گی نہیں! یہ میرے لئے بھایا جی کی آخری نشانی ہے۔"

تائی نے جیسا کہا تھا، بُوٹا نے ویسا ہی کیا۔ سنت کو کچھ یاد آیا اَور وُہ چلا گیا۔ حویلی کے ایک

کونے میں نرسل کے پولے رکھے تھے۔ وہ اُن میں سے ایک لمبا نرسل نکال کر لایا اور مجھے دے کر بولا "اِسے سُرگباسی کے قد کے برابر کاٹ کر اُس کے ساتھ رکھ دے اور ڈور سے پاؤں کے انگوٹھے ایک ساتھ باندھ دے۔"

اُس کی بات کا رُوحانی پہلو میری سمجھ میں نہ آیا لیکن مَیں نے وُہی کیا جو اُس نے کہا تھا۔ غم کی شدّت بقدرِ توجّہ ہے، توجّہ بٹ جائے تو یہ اپنے آپ کم ہو جاتا ہے۔ پرسہ دینے والوں کا ہجوم چھٹنے لگا اور اِس طرح کے سوال جواب شروع ہو گئے۔

کریا کرم کب ہے؟

کیا کہہ سکتے ہیں!

دلّی والوں کو تار دے دیا ہے؟

دے تو دیا ہے!

بے چاری امر کور نہ آ سکے گی!

کوئی سگا پاس ہوتا تو بے چارہ یُوں نہ مرتا!

بھائیا جی کے آنے پر بزرگوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے مُردے کا کریا کرم ضروری ہے۔ اِس نتیجے پر پہنچتے ہی تایا جی کے آخری سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ بھائیا جی نے بودو رام سے کہا، "گھر جاؤ اور بالن میں سے موٹی موٹی لکڑیاں نکالو، مَیں گڈّا لے کر آتا ہوں۔"

"پندرہ مَن سے کم بالن نہ ہو! گوندا رام اور ہری سنگھ آدھے جلے رہ گئے تھے، اُنھیں گاڑنا پڑا تھا۔" وہاں کئی لوگ کھڑے تھے۔ اُن میں سے کچھ نے لگ بھگ یک زبان کہا۔

"ہم نے کون سا بازار سے خریدنا ہے؟ جو کنجوسی کریں گے! گھر کا بالن ہے جتنا چاہو ڈالو" بھائیا جی نے لاپروائی سے کہا۔

بھائیا جی ارتھی بنانے لگے اور مَیں گھٹ (وہ کوزہ جس میں چِتا جلانے کے لئے گرہ پتی اگنی لیتے ہیں) تیار کرنے لگا۔ اُس کام سے فارغ ہو کر تایا جی کو نہلانے کے لئے اوٹ کھڑی کی گئی۔ اُن کا لباس اُتارا گیا اور تختے پر لِٹا دیا گیا۔ اُن کے بدن کی تازگی مرجھائے ہوئے پھول کی سی تھی۔ پھولوں کے بارے میں وہ کیسی کیسی باتیں کرتے تھے! "پھول دھرتی ماں کی محبّت کے سچّے پیامبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر دل کو بھاتے ہیں اور مرجھانے پر بھی نرمی اور خوشبو پوری نہیں گنواتے ہیں!" وہ پھول توڑتے نہ تھے، اُنھیں محافظ کی نظر سے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے جیسے وہ دولت مشترکہ املاک ہو اور اُسے ذاتی تصرّف میں لانا بد دیانتی

اور بد وضعی۔ وہ ہر کسی سے الگ الگ انداز سے محبّت کرتے تھے۔ سماجی قدروں کے لحاظ سے اُن کی محبّت تعمیری قدروں اور تجویزِ عمل سے عبارت ہے۔ وہ ضرورت مندوں کو قرض، قرضِ حسنہ کی شکل میں دیتے تھے، کسی کو ہنر سکھاتے تھے تو اُس کی محنت کی کچھ نہ کچھ تلافی ضرور کرتے تھے۔ وہ پورے گاؤں کو اپنا کُنبہ مانتے تھے، اِس کے باوجود کسی کو بھیک نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے، "ہر کسی کو محنت سے کما کر کھانا چاہیے۔ خیرات کی روٹی ایک طوق ہے! یہ جس کے گلے میں پڑتا ہے، اُس کے مرنے پر اُترتا ہے۔"

اَرڈھ جل (غُسلِ میّت) کے بعد لاش ارتھی پر رکھی گئی تو بھائیا جی یکایک دھاڑ مار کر رو پڑے۔ میں نے اُنھیں اُس نازک حالت میں دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ماں کے دِل میں اُبال اُٹھا جسے وہ دبا نہ سکی۔ اُس نے دوپٹّے سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو سنبھال کر کہا، "بھائیا جی کی زندگی میں تیری آنکھ کا پانی مرا رہا، اب یہ آنسو کیسے!"

وہ سُنتے ہی لال انگارا ہو گئے۔ اُنھوں نے اُچھل کر پاس ہی پڑا ڈنڈا اُٹھایا، اوپر لہرایا اور پھر کسی جذبے کے تحت ہاتھ نہ چلایا۔ اُنھوں نے کپکپا کر گہری سانس لی اور روک لی جیسے رگوں میں جذب کر لی ہو۔ اُن کے نتھنے پھولے کے پھولے رہے، ہونٹ کُھلے کے کُھلے رہے، ابرو تنے کے تنے رہے، دیدے پھٹے کے پھٹے رہے اور آنسو بہتے بہتے رُک گئے۔ وہ اپنے شکار کو ناگواری سے گھورتے رہے اور گھورتے رہے جیسے اُن کا جذبہ اَمِٹ اور اٹل ہو۔

اتفاقاً یہ بیساکھ کا مہینا ہے اور وہ واقعہ چھتّیس سال پُرانا۔ میں اُنھیں ویسے ہی دیکھ رہا ہوں جیسے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اُس آتش فشاں کی طرح نظر آ رہے ہیں جو پھٹے، اوپر لپکے اور جم جائے۔ وہ پہلا موقع تھا جب اُنھوں نے اپنے حیوانی جذبے کو قابو میں رکھا تھا۔

بھائیا جی نے 'رام نام ست ہے' کا نعرہ لگایا اور گھٹ سنبھالا۔ لوگ جنازہ اُٹھانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اُنھوں نے اُن کے شبدوں کو دُہراتے ہوئے جنازہ اُٹھایا اور اُن کے پیچھے ہو لیے۔ ارتھی کی پائنتی سامنے رکھی گئی جیسے کسی ملعون کی لاش کو گھر سے نکال رہے ہوں۔ زمانے کی دو رنگی! تایا جی زندہ تھے تو اُن کا بیرا مُبارک سمجھا جاتا تھا۔ ہر کوئی جنازے کو کاندھا دینے کے لیے بیتاب تھا اور یہ جذبے سے زیادہ اِس روایت کا احترام لگتا تھا کہ جنازے کو کاندھا دینا ثواب ہے۔ بوٹا سنگھ دُور دُور چل رہا تھا اُس نے جنازے کو چھُوا تک نہ تھا۔ ایشر سنگھ نے طنزاً کہا، "بوٹا سیاں! تو بھی ثواب کما لے۔ اب تیری باری ہے، تیرے بھی سارے دِلّی میں ہیں۔"

"ایشر سیاں! تو چنتا نہ کر۔ تم لوگوں نے اپنے سُکھ کے لئے مجھے اُٹھا کر مسان میں پہنچانا ہے اور

پھر جلانا ہے۔ ورنہ یوں سڑ دوں گا کہ گاؤں خالی کروا دوں گا!"

اُس نے ایشر سنگھ کے ساتھ ہر کسی کا مُنہ چڑایا۔

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو!" سنت گرچرن سنگھ نے پاٹھ کرتے کرتے رُک کر کہا۔

"بھگوان ایسا کیوں کرے؟ مجھ سے اُسے کیا تکلیف ہے؟ اُس نے مجھے پیدا کیا، میں پیدا ہُوا، جیسا دماغ دیا ویسا جیا، وہ جب بُلائے گا چلا جاؤں گا۔ لیکن ہاں! اگر وہ بتا دے کہ وہ مجھے فلاں دن بُلانے والا ہے تو میں اُسے بتا دوں گا کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

بوٹا سنگھ نے آخری الفاظ ایسے کہے جیسے کوئی معمار مقابلے کے ردّے میں آخری اینٹ لگاتے ہُوئے اپنے ہارتے ہُوئے حریف کو دیکھے۔

"کون بد بخت اُٹھائے گا تُجھے؟" گرچرن سنگھ نے آخری زور لگانے کے سے انداز میں کہا۔

"تیرے سوائے ہر کوئی! کیوں کہ تیرے لئے یہ گھاٹے کا سودا ہوگا!"

"رام رام! رام رام!! دھرم ریتی کی کیا بے حُرمتی ہے!"

بوٹا سنگھ کی بات سے سبھی لُطف اُٹھانے جان پڑے۔ اُن کے ردّیے سے لگا کہ وہ اُس کی بات پر یقین کرتے ہیں لیکن کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ہیں۔

شمشان آنے پر ہر کسی نے جُوتا اُتار دیا جیسے وہ پوتر استھان تھا۔ بھایا جی نے کِریا کرم کا کام سنبھالا، چِتا پر کریا سامگری ڈالی، گھٹ سے اگنی لے کر چِتا سُلگائی اور گھٹ توڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں آگ کی لپٹیں اُٹھنے لگیں اور بھایا جی چِتا سے کچھ دُوری پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اُن کی یہ عادت غیر معمولی ہے! وہ ایک ہی استھان پر پاؤں گاڑے پہروں بیٹھ سکتے ہیں۔ اُن کے ساتھ تایا جی کا کُتّا جوگی بھی بیٹھا ہُوا تھا۔ بھایا جی چِتا جلانے لگے تو وہ انھیں زور زور سے بھونکا تھا اور دُھتکارنے پر ہی چُپ ہُوا تھا۔ وہ جیسے بیٹھا تھا اُسی طرح بیٹھ رہا تھا، اپنا سر اگلے پاؤں پر ڈالے ہُوئے جیسے اُس کی سر اُٹھانے کی طاقت جاتی رہی ہو۔ ایک ایک کر کے سارے چلے گئے۔ شام سنگھ، ملکھی رام، بھایا جی اور میں جلتی چِتا کے سامنے بجھے سے بیٹھے رہے جیسے اُس پُر تاثیر ماحول سے عبرت اندوز تھے۔

شام کا وہ وقت کس قدر بھیانک تھا! سُنسان مسان، جلتی چِتا، ڈوبتا سُورج، لال گوں اُفق جیسے خون کا سیلاب اُمڈ رہا ہو۔ پھر ہر منظر ڈوبتے ڈوبتے ڈُوب گیا جیسے بڑھتے ہُوئے اندھیرے میں سا یہ۔

کپال کریا کے بعد ہم وہاں سے اُٹھے، گرودوارے پہنچے، نہائے، کپڑے بدلے اور گھر گئے

ماں چولہا چوکا لیپ پوت چکی تھی اور گھڑوں کا پرانا پانی گرا کر تازہ پانی بھر رہی تھی۔

باب ۵۹

وہ شخص ہے جہاں کا تنک ظرف تنگ حال
جس نے متاعِ دردِ محبت کو کھو دیا (شاطر)

تایا جی کی آل اولاد پیچھے پر گاؤں پہنچی۔ اسی دن پھول چنے جانے تھے۔ اُن کے کریا کرم پر اُن تمام رسوم و روایات کا لحاظ رکھا گیا جن کے وہ خلاف تھے۔ میں نے زندگی کے بارے میں اُن کے کئی وچار لکھے ہیں، ایک یہ بھی ہے۔ "اپنے پاپوں کی کاٹ کے لئے عبادت کرنا، تیرتھ نہانا، امر ہونے کی خواہش میں نام جپنا، دان دینا اور پُن کمانا مانس جاتی کا سب سے بڑا وبال اور بدھی کا زوال ہے۔ مانس، کرم وادی ہے! اس کا سمبندھ اچھے کرم سے ہے یا بُرے سے۔ اِس پر لازم ہے کہ یہ جس کے ساتھ بُرا کرے، اُس سے معافی چاہے، اُس کے زخم پر مرہم لگائے اور اپنے بے فیض دل کو فیض پہنچائے۔ پاپ کا شبد کپٹی گیانیوں کی رچنا ہے۔ انھوں نے پہلے گرہ دشا بنائی، پھر گرہ پتر اور پھر گرہ دیکھنے کی پرم پرا۔ اِس کے بعد انھوں نے نئے ڈھکوسلے نکالے جن سے وہ گناہوں کو ثوابوں میں بدلنے لگے اور گناہ گاروں کو اپنے جینے کا وسیلہ بنانے لگے۔"

اُن کا تیرھواں ہونے کی دیر تھی کہ دنیاوی باتیں پھر سے زندگی کا رکھ رکھاؤ بن گئیں۔ کیرتن سوہلے کی جگہ لوک گیت گائے جانے لگے۔ دنیائے فانی کے ٹھہرے ٹھہرے فلسفے دریائے حیات کی روانی میں بہہ گئے۔ رکے رکے اعتراض چل نکلے، مرجھائے مرجھائے چہرے کھل اٹھے، سہمے سہمے تبسم کھلے قہقہے بننے لگے اور بات بات میں خیالات کے تضاد اُبھرنے لگے۔ مرحوم کے قصیدوں کی جگہ زندوں کی ضرورتوں کا ماتم ہونے لگا۔ کارخانے میں اوزار اور رسوئی گھر میں برتن کھنکنے، کھٹکنے لگے۔ فرش پر سے بوریئے اٹھا دیئے گئے ماتمی پہراوے بدل لئے گئے۔ اپنے ہنر اور دوسروں کے عیب، بات چیت کا موضوع بن گئے۔ انکساری سے غرورِ نفس اور لب و لہجے سے کڑواہٹ جھلکنے لگی۔ ہر کوئی خود رائے، خود آگاہ، خود غرض نظر آنے لگا موقتی اور ظاہری سمجھوتا ٹوٹ گیا۔ تو تو اور میں میں سنائی دینے لگی گویا زندگی معمول پر آگئی۔

اور پھر وُہ ہُوا جس کی تہمت صرف آدمی ہی کے سر آتی ہے!

وُہ بیٹے جو تاریخی سکھ جودھوں اور انسان دوستوں کی قربانیوں کا ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر کیا کرتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنا نسب اُن سے جوڑتے تھے، ماں کا بٹورا (وُہ یوں کہ ماں تینوں بیٹوں کی مُشترکہ ذِمّہ داری ہے) کر کے اثاثے کے بٹوارے پر رُجُوع ہُوئے۔ وہاں بانٹنے کے لئے اتنا تھا ہی کیا؟ پھر بھی اپنے ڈھب سے ہر کوئی بڑے نوالے کی فکر میں تھا۔ بات بڑھا ہی چاہتی تھی کہ میری ماں کی مُصالحت کام آئی اور جیسا بے انت کور چاہتی تھی، بٹوارے کی پردھان بنا دی گئی۔

خانگی بُحران میں اپنوں کے انتقامی جذبے اصلی رنگ دکھاتے ہیں اور اُن کی تنگ دِلی اور کم ظرفی کے ایسے چہرے سامنے لاتے ہیں جو عام حالات میں دِکھاوے اور سمجھوتے کے پردے میں چھُپے رہتے ہیں۔

اجناس بٹے، نقدی بٹی، مویشی بٹے، زمین بٹی اور پھر وُہ بٹا جس کے خیال ہی سے مَیں کانپ جاتا ہُوں۔ میرا کلیجہ میرے سینے سے اُچھلتا ہے اور جلتے ہُوئے ڈھیلے کی طرح حلق میں اٹک جاتا ہے۔ مَیں سانس لینے کے لئے تڑپتا ہُوں، نہ مَیں کُچھ سوچ سکتا ہُوں اور نہ مَیں کُچھ سمجھ سکتا ہُوں۔ نوعِ انساں سے میری نفرت! مَیں اسے دھرتی کی حقیر ترین چیز سمجھتا ہُوں۔ مَیں اِس کی خُوبیوں سے مُنکر ہوتا ہُوں تو اِس کے بارے میں ہر بڑی بات کو نفرت سے دیکھتا ہُوں اور نفرت کے اِس ہنگامے میں یُوں گھِرتا ہُوں کہ خُود سے بھی نفرت کرتا ہُوں۔

وُہ بٹوارا! وُہ ذِلّت آمیز بٹوارا!! اِس ذلیل حد تک ہُوا کہ تایا جی کی پگڑیاں پھاڑ کر تقسیم کی گئیں۔ اُس اندوہ ناک حادثے کا جگر فگار پہلُو یہ ہے کہ حاضرین میں سے کسی نے بے انت کور کو وُہ شرمناک کام کرنے سے نہ روکا۔ سبھی چُپ چاپ دیکھتے رہے۔ اُن کی خاموشی اِس بات کی گواہی تھی کہ وُہ وُہی چاہتے تھے، جو وُہ کر رہی ہے۔

کاش! مَیں اپنی ہولناک کیفیت کا اضطراب الفاظ میں بھر سکُوں، جلتے اور تڑپتے آنسُوؤں کو کسی رِقّت خیز شے سے تعبیر کر سکُوں، آہِ سوزاں کو آہِ رسا بنا سکُوں، سینہ چیر کر وُہ زخم دکھا سکُوں جو ابھی تک تازہ ہیں اور درد سے مجھے دیوانہ بنائے ہُوئے ہیں۔ مَیں ایسا کر سکُوں تو یہ رُوئے کاغذ، فرشِ ماتم کدہ ہو اور میرے قارئین ایسے تڑپیں جیسے تڑپتے ہُوئے مَیں نے یہ عبارت لکھی ہے۔ اُس لمحۂ جاں کاہ میں مَیں شدّتِ غم سے بے ہوش نہ ہوتا تو شاید خُودکشی کر لیتا۔

تایا جی کھیتوں میں ہوتے کہ گھر میں، جوگی کو اپنی روٹی میں سے روٹی دیتے تھے، وُہ لاوارث

ہوگیا۔ وُہ گھر سے حویلی، حویلی سے کھیتوں، کھیتوں سے مسانوں میں جاتا جیسے اُنھیں ڈھونڈتا۔ وُہ گلیوں اور گھروں میں سُونگھتا ہُوا حویلی میں پہنچتا اور ٹُوٹے ہُوئے پلنگ پر نظریں جمائے کھڑا رہتا۔ وُہ اپنے تجسُّس میں کبھی پلنگ کے اندر گہرائی تک دیکھتا اور کبھی دُور خلاء میں۔ وُہ تھک کر بیٹھتا تو اپنا مُنہ پلنگ کی طرف رکھتا جیسے اپنے مالک کی تلاش اُس کی زندگی کا آخری مقصُود ہو۔ حویلی سے باہر جاتے ہُوئے وُہ سرحد پار کرنے سے پہلے رُکتا، کان گھما پھرا کر سُنتا جیسے کسی نے اُسے بُلایا ہو۔ کوئی اُسے روٹی کا ٹکڑا پھینکتا، وُہ اُسے سُونگھ کر چھوڑ دیتا۔ وُہ مُجھ سے زیادہ غم زدہ اور اُداس تھا۔ کوئی اُسے آواز دیتا۔ وُہ خالی خالی آنکھوں سے اُسے تکتا لیکن دُم نہ ہلاتا۔ تایاجی کی بیماری کے دوران وُہ اُن کے پاس سے ہِلا نہ تھا۔ وُہ بِستر سے اُٹھ کر نرم نرم قدموں سے ٹہلتے، جوگی سائے کی طرح اُن کے آگے پیچھے رہتا جیسے اُن کا نگہبان ہو۔ وُہ لیٹے لیٹے کراہتے۔ جوگی اپنا اگلا پاؤں اُٹھا کر اُنھیں لگاتا گویا اُن کا حال پُوچھتا اور درد بانٹتا۔ بھائیاجی کے معتُوب پلّوں میں سے وُہ بیسا پلّا تھا جسے تایاجی نے تالاب کے کنارے پر ڈُوبنے سے بچایا تھا اور پال لیا تھا۔

ایک صُبح میں کھیتوں کو جا رہا تھا، مَیں نے جوگی کو شمشان میں لیٹے دیکھا۔ مَیں نے اُسے اُس کے نام سے بُلایا، وُہ ویسے ہی بے حِس و بے حرکت پڑا رہا۔ مَیں نے دوبارہ پُکارا وُہ نہ ہِلا تو مَیں تشویشناک قدموں سے اُس کے پاس پہنچا۔ مَیں نے اُسے سہلایا تو اُسے مرا ہُوا پایا۔ مَیں بے اختیار رو پڑا۔ میرے غم کا غُبار چھٹا، مَیں گھر سے کسّی لایا اور وہیں گڑھا کھود کر اُسے دفنایا۔ مَیں گھر لوٹتا ہُوا اُس وفادار جانور کے بارے میں سوچنے لگا مجھے محسُوس ہُوا کہ اُسے دفن کرکے مَیں نے اُس کے کسی جذبے کا پاس نہیں رکھا ہے۔ آخر میرے احساس نے اُس کے جذبات کی وضاحت کردی۔ مَیں اُلٹے پاؤں مسان میں گیا۔ مَیں نے جوگی کی قبر کھولی اور اُس میں تایاجی کی راکھ ڈال کر پھر سے پاٹی۔

مَیں اِس وقت سوچتا ہُوں کہ حیوان کا اپنا کوئی فلسفہ ہے تو اِنسان کے برعکس ہے! جس کا کھاؤ، اُس کے وفادار رہو۔

باب ۶۰

خُوبیاں لاکھ اپنی ذات میں ہوں
عیب لازم ہے ہو بھلے کم کم (شاطر)

سبھی قصدِ سفر کرنے لگے۔ مَیں نادان نہیں تھا کہ مجھے ترغیب و راہبری کی ضرورت تھی۔ مَیں نے تایا جی کے کنبے کے ساتھ دِلّی کے لئے سامانِ سفر باندھ لیا۔ مَیں دُنیاوی رشتوں کو جتنا قریب سے دیکھتا تھا اُتنا ہی ریاکار اور سخت ہوتا جاتا تھا، یُوں نہ ہوتا تو مَیں کسی سے میل جول نہ رکھ سکتا۔

او انسانی رشتو! تُم نے مجھے کیسے کیسے جاں کاہ چرکے دیئے ہیں! تمہاری وجہ سے مَیں کتنے عذابوں کا شکار ہُوا ہُوں! تمہارے مُسلّم فریبوں کو بے نقاب کر کے ہی مَیں نے اپنا بھرم کھویا ہے۔ تم مجھے اور دھوکا نہیں دے سکتے تھے! مَیں مجرّد مرنے پر مُصر تھا لیکن میری نفس پرستی! اس نے مجھے متزلزل کر دیا اور مَیں بیاہ کے بندھن میں بندھ گیا۔ اُس پر میری مجبُوری اور ابن الوقتی! مَیں نے اُن مقدّس رسموں کا احترام کیا، جنھیں مَیں ذلیل سمجھتا تھا۔ ریت (وُہ کلمات، جن کے تحت آدمی اور عورت بیاہ کے بندھن میں باندھے جاتے ہیں) کے لحاظ سے میری ماں کو مجھے سُوربیر اور پنڈت جننا چاہیے تھا لیکن اُس نے مجھے بُزدل اور جاہل پیدا کیا۔ ان خُوبیوں کے گھاٹے کو پُورا کرنے کے لئے مَیں نے سَر پر کلغی لگائی اور شمشیر زیبِ کمر کی۔ اُن رشتوں کو سراہا جن سے مَیں نفرت کرتا تھا۔ اِس کی وجہ! عورت کے لئے میری بھُوک مُسلسل تھی جسے مُستقل طور پر حاصل کرنے کا کوئی دُوسرا طریقہ نہ تھا۔ یہ جو کچھ ہُوا، ضرورت کے تحت ہُوا لیکن سُریندر کور سے اِس مفاہمت پر ہُوا کہ مَیں بچّوں کے خلاف تھا۔ اب مجھے اِس کی بھی وجہ بتانی ہوگی! مَیں نہ چاہتا تھا کہ میرے بچّے میری ہی طرح جسمانی و رُوحانی صدمے اُٹھائیں۔ لیکن! لیکن مَیں پھر انسانی رشتوں کے جھانسے میں آ گیا۔ او ذلیل رشتو! مَیں ہرگز تمہارے جھانسے میں نہ آتا لیکن میری مجبُوری! وائے میری کمزوری! مَیں بھٹک گیا، نہیں نہیں، مَیں بہک گیا، مَیں شاید نہ بہکتا! لیکن سُریندر کی اِلتجاؤں نے مجھے بے بس کر دیا اور اُس سے مَیں نے ایک بچّے کی حد تک سمجھوتا کر لیا۔

تایا جی کی موت کے بعد مَیں ایک نئے تغیرؔ سے رُوشناس ہُوا تھا۔ میرے پڑھنے والے مجھے کوسیں گے کہ مَیں رہ رہ کر تغیّر، تغیّر کی گیارٹ لگا رہا ہُوں! مَیں مجبُور ہُوں۔ زیرِ بحث موضُوع آدمی ہے جس کا حسبِ سرشت نام، تغیّر ہے۔ جو آدمی تغیّر کے اثر سے متاثّر نہیں ہے، وُہ اُس متقابل ماحول میں ہے جہاں جمُود اپنی زنجیر آپ ہے۔ تغیّر کے ہزاروں چہرے ہیں! جسے مَیں دکھانا چاہتا ہُوں وُہ یہ ہے کہ مَیں بھائیا جی کی اذیّت دہی کو کسی حد تک جائز سمجھنے لگا۔ میرا دِل ٹوٹنے کی حد تک اُن سے کھچا رہتا تھا، اُس میں کچھ ڈھیل آ گئی۔ مجھ میں یہ تبدیلی کیوں اور کیسے آئی؟

اجیت سنگھ یوت مال میں تھا اور درشن سنگھ ہریانہ میں۔ بھائیا جی کھیتی باڑی تیاگ کر اور زمین بھاڑے پر دے کر صرف ٹال کرتے تھے۔ گھر میں دُوسرے کام دھام نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک نوکر لگا

یا بھینس جو آٹھ نو ماہ دودھ دے چکی ہو اور آگے گابھن نہ ہو) اور ایک تازہ بیائی بھینس تھی، جس
بھال ماں کے لئے معمولی بات تھی۔ میرا کمرہ لیپا پوتا اور الگ تھلگ تھا لیکن میں خیالوں کی یک رخی
بچنے کے لئے برآمدے میں اٹھتا بیٹھتا۔ اس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اسے کھلا رکھنے سے تازہ ہوا آ
اور آنے جانے والوں میں سے کسی کسی سے بات ہوتی رہتی۔ اس پر بچوں کا شور، ایک روتا ہوا گھر میں آ
دوسرا ہنستا ہوا گھر سے باہر جاتا۔ اسی برآمدے میں بیٹھے ہوئے میں نے ایک تماشا سال ہا سال دیکھ
لیکن اس بصیرت سے نہیں جس کی تفسیر بیان کر رہا ہوں۔

وہاں چڑیاں رہتی تھیں۔ وہ اپنے چینگے بوٹے کس محنت اور محبت سے پالتی تھیں! ان
دنوں میں وہ انھیں اجیوکا (معدے سے اگلی ہوئی خوراک) کھلاتیں، پھر زود ہضم کیڑے مکوڑے اور پھ
ہوا دانا دنکا۔ انھیں جو کچھ ملتا اس کا بیشتر حصہ بچوں کے پالن پوسن پر خرچ ہوتا، اس کے باوجود
وہ گھونسلوں میں لوٹتیں، اپنے بچوں کو چونچیں کھولے پاتیں۔ ان کے بال و پر نکلتے ہی وہ انھیں ا
سکھاتیں۔ وہ کہیں خطرہ دیکھتیں، شور مچاتیں، انھیں اڑنے پر اکساتیں اور ان پر سے خطرہ ٹلنے تک از
غافل نہ ہوتیں۔ ہوتے ہوتے ان کی پرواز متوازن ہوتی، چونچوں پر سے دال جھڑتی اور وہ دیکھنے میں س
نظر آتے لیکن وہ اپنے بڑوں کے اتنے دست نگر ہو گئے ہوتے کہ سامنے پڑا چوگا نہ چگتے۔ وہ یہی چاہتے
کے ماں باپ ہی دانہ بھرائیں۔ وہ چونچیں کھولے، گردنیں سکیڑے، بیکسوں کی سی صورت بنائے چوگ
دیکھتے، چوں چوں کرتے اور اپنے ماں باپ کو اپنی جانب مائل کرتے کے لئے ان کے آگے پیچھے گھومتے۔
کے ساتھ ماں باپ کے جذبات بدلتے وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے ان سے جنگ کرتے۔

میں اپنے باپ کے شجرے پر غور کرتا۔ خوشحال سنگھ کی اولاد کتنے کنبوں میں بٹی تھی! اس
مہندر سنگھ، اودھم سنگھ، لال سنگھ، ہری سنگھ، دریام سنگھ، عطر سنگھ، ایشر سنگھ، رام سنگھ، راج
دولت رام، بیلی رام، ملکھی رام، سادھو سنگھ، رتن سنگھ ـــ ان سب کے بچوں کے بچے تھے۔ یہ سار
ایک ہی گھر میں رہتے، ایک ہی چولہے میں پکاتے، ایک ہی چوکے میں کھاتے، ایک ہی کام کرتے تو یقہ
بھوکے مر جاتے۔ ہر کوئی اپنے انداز میں جیتا تھا اور یہ اختلاف و انحراف کا ہدیہ تھا۔ اب رہا میرے بھا
کی بدخلقی کا سوال؟ انسانی اور آسمانی سختی سے بچنے کے لئے جفاکشی، زندگی کا تقاضا ہے۔ پیشہ اور
دو تہم زاد ہیں جو ایک دوسرے کے میلان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کے متواتر سخت کام نے انھیں کٹھ
چت بنا دیا تھا۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ بھر ساون تھا اور اب جو پر طوفانی دریا کا گمان ہو رہا تھا۔

جُو کے اُس پار کی زمین اُونچی سطح پر تھی اور اِس پار کی کناروں کے برابر۔ بھایا جی کاندھے پر کسّی رکھے کھیتوں کی مینڈھوں پر گھوم رہے تھے۔ وُہ وہاں سے آب جُو کے کنارے تک جاتے۔ گگن کھیلتے پانی پر ایک نظر دوڑاتے، واپس لوٹتے، کھیت میں نیچے جُھک کر مینڈھ اور آب جُو کے کنارے کو ایک ساتھ دیکھتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں سطحوں کا مُقابلہ کرتے اور جہاں مینڈھ نیچی لگتی وہاں مٹّی ڈال کر پیروں سے دباتے۔ وُہ کئی گھنٹوں سے مُوسلا دھار بارش میں گھُوم رہے تھے۔ اُن کا جُھول بہہ رہا تھا اور کچھا، کُرتہ، جلد تک بھیگا ہُوا تھا۔ سردی سے اُن کے رونگٹے کھڑے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں، رُوئی کے گالے سے سفید ہو رہے تھے جو بدن کا حصّہ نہ لگتے تھے۔ تکلیف اور مُصیبت میں اُن کی قوّتِ برداشت اِنسانی حدوں کو پھلانگ جاتی تھی۔ وُہ اپنی ضرورت سے کم سوتے اور کم کھاتے۔ مَیں اُن کے لئے پوست اور بنفشے کا گرم کاڑھا لے کر گیا۔ اُنھوں نے بے پرواہی سے کہا، "اِس کی کیا ضرورت تھی؟" مَیں نے کوئی جواب نہ دیا اور کاڑھا لئے اُن کی جانب دیکھتا رہا۔ اُنھوں نے میرا دِل رکھنے کے سے انداز میں کہا، "لایا ہے تو لا، پی لیتا ہُوں۔" اُنھوں نے مجھ سے جگ لیا، مُونچھوں پر ہاتھ مار کر اُن پر سے پانی جھاڑا، پھر سنوارا اور بڑے بڑے گھُونٹ بھرتے ہُوئے کاڑھا پیا، خالی جگ مجھے دیا اور اِحساسِ خاطر سے کہا، "تو گھر جا، یہاں ٹھنڈ ہے، بیمار ہو جائے گا۔"

فطرت اپنی غضبناکی میں وحشت خیز ہے لیکن حیرت انگیز حد تک گُل ریز ہے۔ مَیں بپھری ہُوئی آب جُو کا نظّارہ کرنے کے لئے رُک گیا۔ کالی گھٹا، طُوفانی پانی، اندھی دُھند، کڑکتی بجلی، سنسناتی ہوا، فسادی فضا، پھُسپھُسی دھرتی ـــــ ماقبل تاریخ کا منظر پیش کرتی اور بھایا جی اُن بھیانک حالات کا بھیانک مُعجزہ۔ جب وُہ تھکتے مینڈ پر اکڑوں بیٹھ جاتے، کسّی کے دستے پر بوجھ ڈال کر ٹانگوں کا تناؤ دُور کرتے جُوں ہی اعضا کچھ ڈھیلے پڑتے، اُٹھ کر گھُومنے لگتے۔ ناگہاں سڑک کے پاس آب جُو کے دریٹوں نے باندھ توڑ دیا۔ پانی کوندے کی طرح لپکا اور لاوے کی طرح پھیل گیا۔ ہم دونوں بیک زبان چِلّائے، "باندھ ٹُوٹ گیا!" اُنھوں نے مجھے دُور اُونچی جگہ پر بھگایا اور خود وہیں کھڑے رہے۔ دُم پر کھڑے اور پھُنکارتے ہُوئے سانپ کی طرح بڑھتی ہُوئی دھار کے سامنے جو چیز آرہی تھی، وُہ اُسے نگلتی جارہی تھی۔ لیکن بھایا جی وہیں کھڑے تھے کسّی لہرائے ہُوئے، سینہ تانے ہُوئے، پاؤں جمائے ہُوئے، آنکھیں پھاڑے ہُوئے جیسے وُہ اُس تباہی کی تُندی سے ٹکرا کر اُس کا مُنہ موڑ دیں گے۔ اُن کی سرکشی دھرتی کی اصلیت کی طرح بُنیادی اور کثرتِ حیات کی طرح ناقابلِ تسخیر تھی۔ اُن کی جدّوجہد کی سرگرمی اِس حقیقت کی ترجمانی کرتی تھی کہ مُصیبت کتنی ہی مردافگن کیوں نہ ہو، اِنسان کو نہیں مِٹا سکتی!

اُن کی اپنی کتنی ضرورت تھی؟ اپنا ایک پیٹ وُہ کسی طرح بھی پال سکتے تھے۔ وُہ ایسے خطرے

مول لیتے تھے! اپنا لہو، پسینہ ایک کرتے تھے اِس کے لئے ؟ وُہ دِن کو دِن اَور رات کو رات کیوں نہ سمجھتے تھے ؟ کسّی کاندھے پر رکھے اَور برچھا ہاتھ میں تھامے وُہ رات رات بھر کانگڑی سے پیر پھلاہی، پیر پھلاہی سے مقام اَور وہاں سے کانگڑی کا چکّر لگاتے اَور بھٹیوں کے موکھے (جُوں جُوں لکڑی جلتی ہے، بھٹّی بیٹھتی ہے اور سرپوش مٹّی میں دراڑ پڑتی ہے۔ اُسے وقت پر بند نہ کرنے سے کوئلہ، راکھ ہو جاتا ہے) بند کرتے وُہ جتنا کماتے تھے اُس میں سے زیادہ نہ سہی، مَیں اُتنی مقدار کا حصّے دار تھا جو میری پرورش اَور پوشش کے لئے کافی تھا۔ اِتنی کڑی مشقّت کے بعد وُہ چُولہے کی گرمی سے مکمّل لُطف اُٹھانے کے لئے اُسے پُورا گھیر لیتے اَور ہر کسی کو وہاں سے دُور بھگا دیتے تو اُس میں کیا بُرائی تھی ؟ اُن کی سردی کھائی اَور محنت سے چُور ہڈیوں کو گرمی اور آرام کی زیادہ ضرورت تھی۔ مَیں جب گھر میں لحاف کے گُداز میں محوِ خواب ہوتا تھا، وُہ جنگل کے خطروں سے اکیلے لڑتے اَور برف بار ہوا سے بچنے کے لئے بھٹّی کی گرم مٹّی سے لگ کر رات گزارتے۔ میری ماں اُنھیں زیادہ گھی اَور زیادہ دُودھ دیتی، تھال میں کٹوریاں سجا کر اہتمام سے کھانا کھلاتی تو اُنھیں اُس خاص رعایت کی ضرورت تھی۔ مَیں ہی تھڑ دلا تھا جو اُن کے منفرد حقُوق پر جل مرتا تھا۔ پُورے کُنبے کا بار وُہ اکیلے اُٹھاتے تھے۔ اُن کی سلامتی کُنبے کی سلامتی کی علامت تھی اَور ضمانت بھی۔ عورتوں میں یہی مصلحت کارفرما ہے کہ وُہ اَپنے بچّوں کی ضرورتوں اَور ہٹوں سے تنگ آکر اُنھیں بُری بھلی بد دُعا دے دیتی ہیں لیکن اَپنے مردوں کی بدمزاجی پر الگ طریقے سے برہم ہوتی ہیں۔ وُہ روتی ہیں، سر پیٹتی ہیں، ڈُوب مرنے کی سوگند کھاتی ہیں لیکن اُنھیں ایسے بول نہیں بولتی ہیں جو اُن کے زوال کی ترجمانی کرتے ہوں۔

زیادہ نہ سہی، کم کم ہی سہی، مَیں اَپنے بدلے ہُوئے احساس سے مُصالحت کر چُکا تھا۔

باب ۶۱

کتنی بے لُطف! کتنی بے معنی
زِندگی میں نہ کوئی پیچ نہ خم (شاطر)

آدمی کا سب سے زوال پذیر فطری فعل کام سے جی چُرانا ہے۔ جس کسی کی ایسی فطرت ہے،

وہ داغ دار پھل کی طرح ہے جسے اپنی بڑھتی ہوئی فرسودگی کا علم نہیں ہوتا۔

میری ماں کا ذوقِ نظر کام طلب تھا۔ اُس کے پاس کام نہ ہوتا تو وہ کام ایجاد کر لیتی۔ اُن امورِ خانہ داری میں سے ایک کام خاص طور پر قابلِ ستائش ہے کیوں کہ اُس میں اُن بے زبانوں کی بھلائی کا جذبہ کارفرما ہے جن کی خاموش خدمات گھر کے ہنگامے میں نظر انداز رہتی تھیں۔ طویلے کے ایک طاق میں سرسوں کے تیل کی کٹوری رکھی رہتی تھی۔ جوں ہی ماں اُس کٹوری کو اُٹھاتی، مویشی سر ہلاتے اور اڑاتے جیسے پہلے ہیں پہلے ہیں کی دُہائی دیتے ہوں۔ وہ جس مویشی کے بدن پر ہاتھ رکھتی، وہ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے انداز میں خیر مقدم کرتا لگتا۔ وہ اُس کی چچڑیاں توڑتی اور انھیں تیل میں ڈبو کر مارتی۔ ایک ایک کر کے وہ ہر کسی کے پاس جاتی، اُسے اُس کی نحوست سے نجات دلاتی، چمکارتی اور پچکارتی جیسے اُس سے اپنی بے توجہی کی معافی چاہتی ہو۔ اُس انسانی رشتے میں درد مندی کے ایسے پہلو پوشیدہ ہیں، جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ماں طویلے سے جانے لگتی، مویشی دُم ہلاتے، کان پھٹ پھٹاتے اور پیارے پیارے آوازے نکالتے جیسے اُس کے ہمدردانہ رویّے کی داد دیتے ہوں۔

فالتو وقت میں بھایا جی اپنے ڈھنگ سے مصروف رہتے تھے۔ وہ بھینس مونڈتے، بیل نہلاتے، درانتیاں تیز کرتے، رمبے چنڈتے (کسی ہتھیار کو ہتھوڑے سے پیٹ کر تیز کرنا)، جالیاں اور جال مرمّت کرتے، جب کوئی گھریلو کام نہ ہوتا، پھندیت لے کر جنگل میں نکل جاتے اور تیتر، بٹیر پکڑ لاتے۔

مَیں دلّی میں گاؤں کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے وہاں کی ہر چیز ٹھہری لگتی تھی لیکن یہاں کتنی تبدیلیاں آئی تھیں! جوگندر سنگھ کی بیوی نے اُٹھ سال کی بانجھ زندگی گزارنے اور اپنے سُسرال کی ملامتیں جھیلنے کے بعد 'وارث' کو جنم دیا تھا، جس کا نام گلزار سنگھ رکھا گیا تھا۔ جس گھر میں اُسے بیگار کا مگار سے بدتر سمجھا جاتا تھا، وہاں اُسے پلنگ پر بٹھا کر پنجیری کھلاتے تھے اور کام کرنے سے روکتے تھے۔

ایشر سنگھ کے پانچ لڑکے تھے، جنھیں وہ اپنے دس بازو کہتا تھا۔ اُس کا بڑا لڑکا، جو میرا ہمنام تھا، دلّی میں کسی فساد میں مارا گیا تھا۔ ایشر سنگھ نے اپنے لڑکے دیوان سنگھ سے سُرجیت کور (گیان سنگھ کی بیوہ) پر چادر ڈلوا دی تھی۔ دیوان سنگھ عمر میں مجھ سے کچھ مہینے چھوٹا تھا لیکن ڈیل ڈول میں پورا آدمی تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہنے لگا اور جائداد سے دو حصّے مانگنے لگا۔ ایشر سنگھ نے ایک حصّہ دینا چاہا تو وہ ساری فصل زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ ایشر سنگھ مجھ سے ملا۔ اُس کا رویّہ پہلے سے بدلا ہوا تھا۔ اُس نے مجھ سے

جذباتی انداز میں کہا "کاکا ، میں جن بچّوں کو بازو سمجھتا تھا وہ آخر کار سانپ ثابت ہُوئے! میں تجھے کمزور دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ تُو بھیک مانگے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے سانڈ جیسے لڑکوں نے مجھے بھکاری بنا دیا"

اُس نے اپنی سچائی کا اعتراف کیا۔ مجھے اُس پر ترس آیا۔ میں اُس کی ایک اور کڑوی سچائی جانتا تھا۔ میں نے اُس سے پُوچھا، "ویرجی! جو آپ نے اپنے ماں باپ کے ساتھ کیا وُہی آپ کی اولاد نے آپ کے ساتھ، آپ کو بُرا کیوں لگا؟"

میرے غیر متوقع سُوال سے وہ اُلجھ سا گیا اور کچھ دیر کے بعد کہنے لگا "میں سمجھتا تھا کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ میں اُن سے بدلہ لینے کا جذبہ پالتا تھا۔ میں نے خود سے منا کیا تھا کہ میں اپنے بچّوں کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا لیکن اب مجھے اچھے، بُرے میں فرق نہیں لگتا ہے۔ اچھا کیا ہے؟ بُرا کیا ہے؟ سامنے والے کی سُوجھ بُوجھ پہ ہے۔"

"میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ میرے بارے میں ایسا سوچتے تھے؟"

اُس کے خود بیں رویّے سے فائدہ اُٹھا کر میں نے اُس کے جذبے کی ٹوہ لگانی چاہی۔

"جلن، اور کیا! ہم سب ایک دُوسرے سے جلتے ہیں۔ کوئی مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے، کسی کو میں خواہ مخواہ! اور اُس کشاکش کا حاصل ہے یہ گلی سڑی زندگی۔ ہم جتنا جتن ایک دُوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے کرتے ہیں اُس کا کئی ماتر ایک دُوسرے کے سہائے ہوتے تو اپنی اپنی جگہ سارے ہنسی خُوشی رہتے۔ سادھو سنگھ کتنا بھلا مانس آدمی تھا! اُس کے بچّوں نے اُس کی عزّت مٹّی میں ملا دی۔ کون جانے میرے ساتھ کیا ہوگا؟ میں نے ہر کسی سے کہہ دیا ہے، میرے مرنے پر جو پاٹھ کروائے، نرک میں جائے! زندوں کو روٹی نہیں دے سکتے، مردوں کے شرادھ کرواتے ہیں۔"

اِتنے میں اُس کا لڑکا دھیان سنگھ وہاں آگیا اور ایشر سنگھ چُپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔

تایا جی کہتے تھے، "جس کسی نے عدم رواداری کا بیج بویا، وُہ آخر پچھتایا اور خُود بھی اُسی کا شکار ہُوا۔ چوں کہ اِنسان، حیوان ہے اور عدم رواداری اِس کی فطرت، اِسے رواداری کا سبق پڑھانا لازم ہے ویسے اِنسان مثال سے زیادہ سیکھتا ہے۔ جس طرح اوزار، ہُنر کا اوّل و آخر چارۂ کار ہے اُسی طرح رواداری اِنسانی رشتوں کا۔"

دِلّی سے لوٹ کر میرے ہم عصروں میں میرا مرتبہ اُس گدھے کی مانند بڑھ گیا تھا جو کاشی ہو آئے۔ وُہ مجھے درآمد شُدہ شے کی طرح عزّت اور حیرت سے دیکھتے تھے۔ میں نے ریاکاری اور خاموشی دونوں ہی سے کام لیا۔ کہیں وُہ جان لیتے کہ میں دِلّی میں طویلے سے بدتر مکان میں رہتا ہُوں اور گندے سڑے

ڈھابے میں کھانا کھاتا ہوں، وہ ضرور مجھے ذلیل کرتے اور ملعون سمجھتے۔ وہ میرے صاف ستھرے کپڑوں سے مرعوب تھے اور دِلّی کو عیش و اِفراط کی سرزمین مانتے تھے۔ وہ مجھ سے دِلّی کی دوشیزاؤں کے بارے میں پوچھتے جو من گھڑت کہانیوں کے مطابق مانگ پٹّی سجائے گاؤں کے پٹّھوں کا انتظار کرتی ہیں اور اُن سے اپنی جنسی بھوک مٹواکر انھیں مالامال کردیتی ہیں۔

قارئین، احساس کی نفسیات دریا کی طرح ہے! یہ کمالِ جوش میں ہو تو دُور دُور تک اثر انداز ہوتا ہے ورنہ اپنے ہی کناروں کو پیاسا رکھتا ہے۔

میں پھرتے پھراتے گھاٹ پر جا نکلا۔ لاجونتی پٹڑے پر بیٹھی تھی اور اُس کا مرد رُلیا رام کچھ دُوری پر مچگان باندھ رہا تھا۔ لاجونتی کے بارے میں شیر سنگھ کی دونوں باتیں غلط تھیں، پہلی یہ کہ چلتی عورت اور چلتی راہ ہری نہیں ہوتی، دوسری یہ کہ اوندھے گھڑے کو دریا بھی نہیں بھر سکتا۔ لاجونتی پیٹ سے تھی اور گول مٹول ہو رہی تھی۔ اُس کی جِلد گدرائے پھل کی طرح چمکتی تھی اور رنگت نکھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسے خوش ہوئی جیسے دریا طغیانی میں کناروں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ میری اُمنگ، ترنگ میں بدل گئی اور میں نے اُسے آنکھ ماری۔ وہ شرما گئی۔ اُس کی شرم کچے میوے سے لدی ٹہنی کی لرزش تھی جو آس دِلاکر نراش کرتی ہے۔

"کیسی ہو؟"

میرے لہجے میں پوشیدہ اُمید کا ہلکا سا عکس تھا۔

"میں ماں بننے والی ہوں!"

اُس نے میرے گمراہ کُن انداز کو نظر انداز کردیا اور اپنی حالت پر فخر کیا۔

"کس کا ہے؟"

چوں کہ اُس سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا، میں نے اُسے اُڑانا چاہا۔

"میرا ہے!"

اُس کے جذبات کے ساتھ چہرے کا رنگ بدلا جسے میں نے اڑتے اور مجھ پر منڈلاتے دیکھا۔

"آپ کیسے ہیں سردار جی؟" رُلیا رام نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"ٹھیک ہوں!" میں نے کھیتوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے چند قدم آگے جاکر پیچھے مُڑ کر کہا۔ لاجونتی ویسے ہی تنی کھڑی تھی اور مجھے غصّے سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا گھمنڈ، فطرت کے تخلیقی رُجحان کی ایسی نظیر تھی جس پر غور کرنا، یقین کرنا ہے۔

پودا دھتورے کا ہو کہ سنگترے کا، اپنے پھل پر ناز کرتا ہے اور اُسے اُس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ اور یہی نفسیات آدمی کی ہے! جو جسے ٹھیک سمجھتا ہے، اُسی کا تحفّظ کرتا ہے اور اُسی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ تہذیبِ نفس کا معیار، ذاتی معیار ہے۔ مَیں کیا ہُوں؟ مَیں زور دے کر کیسے کہہ سکتا ہُوں! ہاں، مَیں یہ ضرور کہوں گا کہ کسی کا تجزیہ کرنا آسان ہے اور اپنا مشکل، اور اُس سے مُشکل ہے اپنی سرشت کو بدلنا۔

درشن سنگھ سائیکلوں کی دُکان اکیلا ہی سنبھالتا تھا۔ اُس نے اپنے شاگرد پیشہ رتن چند کو چوری کے اِلزام میں نکال دیا تھا۔ اُسے ہمیشہ کسی مددگار کی ضرورت رہتی تھی، خاص کر اُس وقت جب اُسے کل پرزے خریدنے کے لئے باہر جانا ہوتا تھا۔ دُکان بند رکھنا، دُکان داری کی اُدھار سے بڑی لعنت ہے۔ اُس نے دُکان پر یہ تختی لٹکا رکھی تھی۔

آج نقد کل اُدھار

خواہ ہو واقف خواہ ہو یار

اِس کے باوجود گربچن سنگھ ٹائر اور ٹیوب اُدھار لے گیا تھا اور دام چکانے کا نام نہ لیتا تھا۔

درشن سنگھ نے میری موجودگی سے فائدہ اُٹھایا، دُکان مجھے سونپ کر لدھیانہ چلا گیا اور جاتے ہُوئے تاکید سے کہا، "کوئی میری بابت پُوچھے تو کہنا کہ مَیں ننھیال گیا ہُوں"۔ اُس کے اِس جھُوٹ کا مقصد تھا کہ اُس کے لدھیانہ جانے کا راز چُنگی محرّر پر نہ کھُلے اور وُہ کل پرزوں پر محصُول بچا سکے۔ درشن سنگھ نے دُکان کے سامان میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔ اُس نے دُکان کے دروازے کے متوازی دو آنکڑوں پر ایک بانس لٹکا رکھا تھا جو نئے ٹائروں سے بھرا رہتا تھا۔ کچھ نئے اوزار بھی خریدے تھے، اُن میں سے جال پانا قابلِ ذکر ہے۔ اُس ایک پانے میں چودہ پانے تھے اور ایک پیچ کس۔

رکھا مر گیا تھا۔ وُہ زندہ تھا تو درشن سنگھ اُسے دُکان سونپ کر رات کو گھر آجاتا تھا، مجھے وہیں سونا پڑا۔ پہلے دِن مَیں بیدار ہُوا ہی تھا کہ ایک سائیکل سوار اڈّے کی جانب سے پیدل چلتا ہُوا آیا۔ وُہ مجھے دیکھتے ہی بولا "شُکر ہے کہ تُم مِل گئے! اڈّے کی دونوں دُکانیں بند ہیں۔ اِسے دیکھ، کیا ہُوا ہے اِسے؟ یہ چلتے چلتے رُک گیا اور مَیں گرتے گرتے بچا۔" اُس نے سائیکل، سٹینڈ پر کھڑی کی، اگلے پہیے پر جھُکا اور اپنی بات کو جاری رکھا۔ "یہ ٹُوٹ گیا ہے، کیا کہتے ہیں اِسے؟"

"چمٹا!"

مَیں جب تک سارے نقص کا جائزہ لے چُکا تھا۔ بریک ٹیڑھا ہو کر فورک سے نِکلا ہُوا تھا اور فورک بیرنگ غائب تھی۔

"آپ یہاں بیٹھیئے۔ مَیں باہر جاکر آتا ہُوں پھر اِسے دیکھتا ہُوں۔ کام لمبا ہے اَور مَیں ابھی اُٹھا ہُوں۔"

مَیں نے چارپائی پر بِستر تہ کرتے ہُوئے، اُسے وہاں بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔

"ذرا جلدی آنا! مجھے دُور جانا ہے، ہوشیارپُور سے آگے، پُرہیراں۔"

وُہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے بِستر اُٹھاکر اندر رکھا اَور باہر چلا گیا۔ مَیں واپس آیا، وُہ بڑی بے قراری سے میری راہ دیکھ رہا تھا، دیکھتے ہی بولا، "بڑی دیر کردی؟"

"گھر اَور باہر کی ٹٹّی میں یہی فرق ہے!" مَیں نے دیر کا جواز پیش کرتے ہُوئے کہا۔

"خُدا جانے، شہر کے لوگ چُولہوں میں کیسے ہگ لیتے ہیں؟ مجھے تو سوچ کر گھِن آتی ہے۔ یہ رواج انگریزوں کا چلایا ہُوا ہے۔ وُہ آپ چلے گئے اَور اپنی ساری بُرائیاں پیچھے چھوڑ گئے۔"

حالاں کہ اُسے جلدی تھی لیکن مجھے لگا کہ وُہ چاہتا ہے کہ میں کام چھوڑ کر اُس کی بات سُنوں۔

"کیا خیال ہے تُمہارا؟" مجھے مُتوجّہ نہ پاکر اُس نے سوال کیا۔

اگلا پہیہ اَور چمٹے کی نالی کھولنے کے لئے مَیں سائیکل کو جُگاڑ (جنتر) میں پکڑ رہا تھا اَور اُس کام میں اُلجھا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہُوئے کہا، "اِدھر آیئے، جلدی ہے تو تھوڑی مدد کیجئے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں!" اُس نے آگے بڑھتے ہُوئے تیزی سے کہا۔

اُس کی مدد سے مَیں نے سائیکل کو جُگاڑ لگایا، ایکسل کے نٹ کھولے اَور جُوں ہی گز اَور مڈگارڈ کے تار نکالے، پہیا اپنے آپ نیچے گر گیا۔ وُہ سائیکل ہرکولیس کا پُرانا ماڈل تھا جِس کے چمٹے کی آنکھیں بند ہوتی تھیں۔ مَیں نے چمٹے کو اُس کی ٹانگوں سے کھینچ کر ایکسل میں سے نکالنا چاہا لیکن نکال نہ سکا میری ناکامی سے مُتاثّر ہوکر گاہک نے کہا، "نہ انگریز سائیکل بناتے نہ مَیں یہ مُصیبت خریدتا!"

اُس کی حُجّت سُن کر مَیں جھلّا گیا، "آپ وہاں آرام سے بیٹھیئے اَور انگریزوں کے پیچھے مت پڑیئے۔ یہ عقل کا کام ہے، عقل سے ہوگا، نہ کہ انگریزوں کو گالیاں دینے سے!"

"ٹھیک ہے! تُو اپنی عقل لڑا، مَیں وہاں بیٹھتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر وُہ چارپائی پر بیٹھ گیا اَور مَیں پھر اپنے کام میں مصرُوف ہوگیا۔ ایک کون ڈھیلی کرتے ہُوئے اَور دُوسری کستے ہُوئے، مَیں ایکسل کو ایک طرف لایا اَور اُس میں سے چمٹے کو آسانی سے باہر نکال لیا۔ گاہک گردن ڈالے بیٹھا تھا اَور کبھی کبھی کانی آنکھ سے مجھے بھی دیکھتا تھا۔ وُہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا

اور بولا ، "واہ ، تُو انگریزوں کا باپ ہے!"

"شکریہ! ایک بات کہوں ، انگریز اِتنے پاگل نہ تھے جِتنا آپ سمجھتے ہیں ۔ سمجھدار کی بات سمجھنے کے لئے سمجھدار ہونا ضروری ہے!" مَیں نے ہینڈل کی ڈِھبری کھولتے ہُوئے ناصحانہ طور سے کہا۔

جیسے مذہبی اساطیر میں ہر فتنے کا ماخذ شیطان کو گردانتے ہیں ، اُسی طرح آزادی کے بعد لوگ اپنی ہر مُصیبت کا باعث انگریزوں کو مانتے ہیں ۔ ایک بار ٹڈی دَل آیا ، کِسی نے مشہور کر دیا کہ انگریزوں نے اُسے ہندوستان کی معیشت تباہ کرنے کے لئے افریقہ سے بھیجا ہے تاکہ وُہ پھر ہندوستان پر قبضہ جما سکیں

بَند آنکھوں والے چِمٹے کا رَواج بند ہو چُکا تھا ، اُس کی جگہ کُھلی آنکھوں والا چمٹا آتا تھا ۔ مَیں نے چمٹے کی بند آنکھیں کاٹ کر کھول دیں اَور رِیتی سے چِراؤ کی بَر کو صاف کر دیا ۔ گاہک جو میرے ساتھ ساتھ گھُوم رہا تھا ، میری پیٹھ تھپک کر بولا ، "مَیں تو سمجھتا تھا کہ تُو موٹا موٹا کام جانتا ہوگا ، تُو تو ماہِر نکلا کیا نام ہے تیرا ؟"

"گیان سنگھ!" مَیں نے اگلی اَور پچھلی بریک کو ہینڈل سے جُدا کرتے ہُوئے کہا۔

"جیسا نام ویسا کام!" اُس نے خُوش ہو کر کہا۔

"شکریہ ، آپ بیٹھیے!"

مَیں نے اُس کے جذبے کا اِحترام نہایت سادگی سے کیا لیکن میرے دِل میں ولولہ خیز خیال آیا کہ کیوں نہ کوئی ایسی ایجاد کی جائے جو رہتی دُنیا تک میرے نام سے پہچانی جائے ۔

"تُمہیں کام کرتے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔" اُس نے بغیر کِسی بناوٹ کے کہا۔

مَیں نے اُسے مُسکرا کر دیکھا اَور اپنے کام میں لگ گیا ۔ ہینڈل ، نالی میں اٹکا ہُوا تھا ۔ مَیں نے ہینڈل بولٹ کھولا ، اُس پر ہتھوڑی سے ضرب دی ، کون فِری کی اَور ہینڈل اُوپر کھینچتے ، گھماتے ہُوئے نِکالا ۔ اُس کے بعد ہر کام آسان تھا ۔ مَیں نے بھٹّی جلائی ، چمٹے میں نئی نالی بٹھائی اور سائیکل فِٹ کر دی ۔ گاہک اِتنا خُوش ہُوا کہ مَیں نے جِتنی مزدُوری مانگی ، ہنس کر دے گیا ۔

میری ہریانہ کی زِندگی دُکان کے گرد گھُومتی ہے اَور ہر طرح کی یاد اُس سے جُڑتی ہے ۔ ایک یاد جادُو بھری ہے ، جِس کا تعلّق صرف رات سے ہے ۔ وہاں رات پڑتی نہیں ، چڑھتی تھی اَور اُس رات کا چاند ، سادُھو رام تھا ۔ مَیں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا ، اپنے دِلی منشے بدلتا گیا ۔ اُس روا روی میں وُہ وقت بھی آیا جب مَیں سادُھو رام کے طرزِ حیات پر فِدا تھا ۔ اُس کی خُوش خلقی اَور خُوش اِلحانی پر بھایا جی طنز کیا کرتے تھے ، "جیسے بیٹی بیاہنی نہ ہو اَور بہو لانی نہ ہو ۔ اُسے دونوں طرف سے گانا چاہیئے! اِس میں

کوئی خرابی ہے جو ایک ہی طرف سے گاتا ہے"۔

سادھو رام باغیچے کی آمدنی پر جیتا تھا اور تانگا شوقیہ چلاتا تھا۔ دُوسرے تانگا وانوں کے بر عکس، وُہ بم کے بجائے اگلی سیٹ پر سواری کے برابر بیٹھتا اور سمائی سے ایک سواری کم لیتا۔ وُہ نہ کبھی 'پوش پوش' رولا مچاتا اور نہ کبھی چابک پہیّے کے تیروں سے ٹکرا کر راہ گیروں کو خبردار کرتا۔ اُس کام کے لیئے تانگے کے چھاج میں گھنٹی تھی جو پاؤں سے دبانے سے بجتی تھی۔ اُس کے گھوڑے کے سر دوال میں لال رنگ کا پھُندنا لگا ہوتا جس سے اُس کا تانگا دُور سے پہچانا جاتا۔ وُہ تانگے پر سیدھے ہاتھ کی جانب بیٹھتا جہاں چونگے میں چابک کھڑا ہوتا جسے وُہ کبھی کبھار استعمال کرتا اور زیادہ تر گھوڑا لگام سے ہانکتا۔ وُہ اپنے گھوڑے کو جیسے صاف ستھرا رکھتا، کوئی سُگھڑ ماں اپنے بچے کو رکھتی ہوگی۔ گھوڑے کو تانگے سے نکال کر وُہ پہلے دُمچی سے اُس کی دُم نکالتا، زیر بند کھولتا اور پھر ساز اُتارتا۔ وُہ اُسے ریت میں لٹا کر لاتا، پانی پلاتا اور لے جا کر کھُونٹے سے باندھ دیتا۔ وُہ اپنے آپ کو گھوڑوں کا اِمام سمجھتا تھا اور سبق آموز انداز میں کہتا تھا، "گھوڑا سفر سے آئے تو اُسے لٹانا ضروری ہے، تکان اُترتی ہے، لٹانے سے پہلے پانی ہرگز نہ پلانا چاہیے، پیٹ میں گانٹھ پڑتی ہے"۔

چنے اور جو، وُہ سویرے بھگو دیتا اور شام کو اُنھیں اوکھلی میں دردرا کر کے حسبِ ضرورت بھُوکرٹ ملاتا اور توبڑے میں ڈال کر گھوڑے کے منہ پر چڑھا دیتا۔ حُقّہ تازہ کر کے وُہ ایک چلم تمباکو پیتا جب تک گھوڑا دانہ کھا چکتا۔ وُہ توبڑا اُتار کر گھوڑے کو آگاڑی، پچھاڑی لگا دیتا، ایک ہاتھ میں کھرکھرا لیتا، دُوسرے میں جیب اور ملائی کرتا، آخر کار گھوڑے کا بدن شیشے کی طرح چمکنے لگتا۔ وُہ گھوڑے کو چمکارتا ہُوا، اُس کا پاؤں اُٹھاتا، کریلنی سے سُم کریدتا، پوٹلی سے چُونا چھڑکتا، نعل کا مُعاینہ کرتا اور اُسے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر فخر سے کہتا، "جس کے گھوڑے کے سُم پر نعل اور گرہ میں مال ہے، اُس کے لیئے سفر رختِ کمال ہے"۔ وُہ گھوڑے کے ایال اور دُم ماہ بماہ دھوتا لیکن اُن پر کنگھی ہر روز کرتا اور بگھی ہر وقت مارتا۔

باغیچے میں کُچھ قابلِ کاشت زمین تھی، جس میں وُہ چوٹالہ، برسیم اور گندم اُگاتا تھا۔ جس فصل کا موسم ہوتا، وُہ اُسے اپنے ہاتھ سے کاٹ کر لاتا اور گھوڑے کو کھلاتا، لگتا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو نوالہ دیتی ہے اور اُس کی ناز برداری کرتی ہے۔

اُس کا باغیچہ، شہر کے محیط پر آخری مسکن تھا جس کے اطراف رات کی رانی اور جُوہی لگائی ہُوئی تھی۔ جھاڑیوں کی سیاہ پوشی میں کلیاں، ستاروں کی طرح چمکتی تھیں اور اُس آبادی کے خُوش نُما ماحول کو لطیف بناتی تھیں۔ سُدی کے پاکھ میں خُوشبُو کا ردیّہ اُس کُنواری کا سا ہوتا جو آنکھیں ملائے،

مسکرائے، گرمائے اور کل کی آس میں بہکا جائے۔ مہنت گہرا سانس لے کر کہتا، "کھترانی آرہی ہے"۔ وہ اپنے تصوّر سے لطف لیتا اور موٹی، بھدّی آواز میں گاتا،

نرم دیہ کھترانی دی (کھترانی کا بدن ایسا نرم ہوتا ہے
جدّاں گڑوی بھری ہوئی پانی دی (جیسے ٹھلیا میں تھل تھل کرتا پانی۔
سخت دیہ ہے جٹّی دی (جٹّی کا بدن چٹان کی طرح سخت ہوتا ہے
جیہڑی سبّل دے نال پٹّی دی (جسے سبّل سے کھودنا پڑتا ہے۔

سادھو رام کی آواز، جذبات کا ریلا تھا جو آدمی کو اڑا لے جاتا تھا۔ وہ اپنی شام کا آغاز اِن سطروں سے کلیاں چنتے ہوئے کرتا،

"دِلبرا دِل دے نال رِل جا (دے دِلبر آ، میرے دِل سے مِل جا
جدّاں رانجھڑے نال جٹّی ہیر مل گئی (جیسے رانجھے یار سے ہیر ملی تھی۔
شاہ برام نوں ملی سی حُسن بانو (شاہ برام کو حُسن بانو ملی تھی۔
عالم گیر نوں بدرِ منیر رِل گئی (اور عالم گیر کو بدرِ منیر۔

جُوں جُوں رات گہری ہوتی جاتی اُس کی آواز چاندنی کی طرح نکھرتی جاتی۔ وہ پھولوں کے چار گجرے بناتا تھا لیکن ایک خاص ترتیب سے۔ پہلے دو گجرے بنا کر وہ کلائیوں پر باندھ لیتا اور پھر دو بڑے گجرے بنانے شروع کرتا اور اُس کے ساتھ پھولوں اور محبوب کی کبھی نہ ختم ہونے والی مدح سرائی۔ وہی جانے وہ کب سوتا تھا؟ جب میری آنکھ کھلتی، میں اُسے گاتے ہوئے سنتا۔ کہتے تھے کہ اُس کا منسو باہمنی سے یارانہ ہے۔ وہ دونوں کب ملتے تھے؟ وہی جانیں! میں نے منسو کو دیکھا تھا۔ اُس کے کاندھوں کی ڈھلائیں اور پیروں کی کمانیں دیدنی تھیں اور اُسی طرح دوسرے انگوں کی سُندرتائی۔ اُس کی چال، خوش خرامی کا وہ غنائی نغمہ تھا جس میں دل رُبائی کا حسین پیام ہوتا ہے۔ جسم کی خوب صورتی تناسب اعضا سے ہے لیکن نازکی قوسوں سے۔ یہ اُنھیں کا کرشمہ تھا کہ منسو کے خط و خال پگھل کر ایک دوسرے میں بہتے لگتے۔ روانی کی خوبی ہے کہ اِس کا رُخ اوپر سے نیچے کو ہوتا ہے، منسو اِس چلن سے مستثنیٰ تھی۔ وہ اُس ندی کی طرح تھی، جو دونوں طرف بہتی ہو۔ اُس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے تایا جی کی ایک بات یاد آرہی جو بڑی کلاپورن ہے"۔ فطرت کی تخلیق میں پرکار کو بڑا دخل ہے۔ یہ پرکار ہی کی پرکاری ہے کہ ہر شے اپنی سادگی میں تا حدِ کمال خوبصورت ہے"۔

منسو کوئی ایسا لفظ بولتی جس میں 'س' یا 'ش' کا حرف ہوتا تو سیٹی بجتی سنائی دیتی۔

اُس کے ہونٹوں کی سرکشی اُن لبوں کی سی تھی جو چُومنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو تھوڑا آگے بڑھ آتے ہیں اور بے اختیار لگتے ہیں۔

رُت کا کوئی پاکھ ہو، سادھورام کے نغمے کی اُڑان مُدام تھی لیکن اُس کے لئے رات شرط تھی۔ اُسے ہزاروں بیت یاد تھے اور وہ اکثر موسم کے لحاظ سے گاتا تھا۔ ایشرداس کا بارہ ماسہ اُسے زبانی یاد تھا۔ وہ ہر ماس کے پہلے نُور کے تڑکے ماس گاتا گویا اُسے خُوش آمدید کرتا۔ ایک نمُونہ مُلاحظہ ہو۔

١ چڑھے بیساکھ خبر لے گھر دی، پاغ پکے پھل تیرے
٢ کدتک مَیں ہٹھ کرساں دِل دا، وس ناہیں کُچھ میرے
٣ تیتّر، توتے، مور، جانور، جُھک جُھک پین چو پھیرے
٤ لاگو لاگ طُفانی دُشمن، چاکھو چور لُٹیرے
۵ توڑی مرجّھی پھٹکاواں، آون جلدی گھیرے
٦ اَمب، امرُود اجائیں جاندا، سیب انار چنگیرے
٧ جے توُں سچ پچھیندا سانوں، تینتوں دُکھ ودھیرے
٨ سو سو باری یاد کراں مَیں، ہر چرخے دے پھیرے
٩ سیّو کہو اساڈا جیون، کدوں کرن گے پھیرے
١٠ ایشر داس بناں جند میری، جائے سانجھ سویرے

ترجمہ

١ بیساکھ چڑھا ہے۔ گھر کی خبر لے، تیرے باغ میں پھل پک گئے ہیں۔
٢ مَیں کب تک اپنے دِل کو بھٹکنے سے روکوُں؟ میرے بس میں نہیں ہے!
٣ تیتر، توتے، مور، جانور چاروں طرف سے حملے کرتے ہیں۔
٤ اُن کی دیکھا دیکھی کئی دُوسرے بھی دُشمن ہوگئے ہیں۔
۵ اُن کو کتنا ہی پھٹکاردں، وُہ گھیرے ہی رہتے ہیں۔
٦ آم، امرُود برباد ہو رہے ہیں اور اُسی طرح سیب، انار۔
٧ تُو سچ پُوچھے تو میرے سارے دُکھوں کا سبب تُو ہی ہے۔
٨ چرخے کے ہر پھیرے کے ساتھ میں تُجھے سو سو بار یاد کرتی ہُوں۔
٩ سکھیو، کہو! میرا پریتم کب لوٹ کر آئے گا؟

۱۰ اے ایشر داس! تیرے بغیر میری جان سانجھ سویرے جاتی ہے۔

منسو کے جسم کی ہر حرکت کسی ایسے شعر یا خیال کی نمائندگی کرتی جس کا رشتہ شہوانیت سے ہو۔ اُس کی ایک نظر طویل مُلاقات کا مزہ دیتی کیوں کہ وہ رگوں میں جو رس گھولتی وہ دیر تک اپنا اثر بنائے رہتے اور زائل ہو کر از سرِ نو تازہ ہوتے کا ظرف رکھتے۔ اُس کی دید سے پورا لطف لینے کے لئے من ہی من میں یا کھلے طور پر ایسے الفاظ بولنا ضروری تھا جو جذبات کو بھکنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ بھکے ہوئے جذبات حظِّ نفس کی جائے نزول ہیں جو اصلی صورت کی مماثلت پیدا کر دیتے ہیں۔ مہنت میرے بھائیا جی کا ہم عمر تھا لیکن مجھ سے یاروں کی سی باتیں کرتا تھا۔ وہ منسو پر مرتا تھا اور اُسے دیکھ کر کلیجہ تھام کر کہتا تھا، "تو مدن بان کی طرح میرے یہاں گھسی ہوئی ہے۔" مہنت چھڑا چھانٹ تھا، منسو پر بال بچّوں والے مرتے تھے اور اُس کے بارے میں بداخلاقی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے رویّے سے لگتا تھا کہ بداخلاقی، جنسی زندگی کی مثبت خصوصیّت ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کی جنسی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو آشکار ہو گا، مرد اپنے آپ کو طویلے کا سانڈ سمجھتا ہے۔ اِس کی اِس شہوانی کج روی کی وجہ کیا ہے؟ مرد، بیج کی طرح ہے۔ وہ اپنی ہر حالت میں دُوسرے کی پوری ذِمّہ داری ہوتا ہے۔

تایا جی مرد کو 'اردھانگا' اور عورت کو 'اردھانگنی' کہتے تھے۔ (اردھ انگا اور اردھ انگنی اِس نظریے کی تاویل ہے کہ افزائشِ نسل کے تعلّق سے ہر جاندار آدھی خوبیوں کا حامل ہے جو اُس کے متقابل سے رل کر پوری ہوتی ہیں۔) اِس کے باوجود وہ عورت کو مرد سے افضل مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے، "عورت، مرد کا رفیق ہے لیکن اِس کے غاصبانہ رویّے سے حظِّ نفس کی علامت بنی رہتی ہے۔ عورت تعلیم و تربیّت سے آراستہ ہو تو گھر مکمّل ادارہ ہے اور نوعِ انسان کے نشاۃِ ثانیہ کی ضمانت۔ بچّے کورے کاغذ سے ہوتے ہیں جس پر کچھ بھی لکھنا ممکن ہے۔ ماں، بچّے کی دایہ ہے، دوست ہے، معلّم ہے، یہاں تک کہ نفس ہے۔ ایک ماں ہی ہے جو ایک ہی نسل میں روایتوں اور اوہام پرستیوں کو مٹا کر اُن قدروں کو روشن کر سکتی ہے جن کی جلا دائمی ہے۔ لیکن عورت کی تقدیر! یہ اُس لفظ کی طرح ہے جو اپنے معنی سے ناآشنا ہے۔ اور انسان کی ستم ظریفی! یہ نت نئی دنیاؤں کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن اِس کے گھر میں جو کائنات پوشیدہ ہے، اُس سے بے خبر ہے۔"

چوتھی کتاب

۶۶ توڑنا اِس سے جوڑنا اُس سے ۶۰۳
زِندگی کے یہ تانے بانے ہیں

۶۷ کم زوریِ اَخلاق جہاں پلتی ہے ۶۱۷
ہلکی سی بھی تنقید وہاں کھلتی ہے
ہر سانس پہ ہوتا ہے تناؤ ایسا
لگتا ہے کہ آری سی کوئی چلتی ہے

۶۸ چہرے کی ہر لکیر ہے تاریخ کی صدا ۶۲۰
دِل کا ہر ایک زخم ہے اُمید کی کرن

۶۹ جیسا مرا سروپ ہے ویسا نہیں ہوں میں ۶۲۶
اِنسان کے لباس میں کیا کیا نہیں ہوں میں

باب ۶۲

دوستی بے ہنر سے اے شاطر!
خام آغاز اور خام انجام (شاطر)

میرا دوسرا سفر اندھیروں کی سمت تھا۔ دستِ وقت نے میری بساطِ معیشت پر کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے تھے۔ انہیں چننے کا ایک ہی طریقہ تھا، انہیں جھیلنا۔ ماما جی کسی سے کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔ انھوں نے یہ حرکت ماں سے بچنے کے لئے کی تھی جو اُن کے بھیجے ہوئے منی آرڈر سے ایڈریس لے کر دلی پہنچ گئی تھی۔ مَیں کیا کروں؟ کیا نہ کروں، کی حالت میں تھا کہ امر سنگھ کو تین مورتی میں ایم۔ پی ہیڈ کوارٹرز کا پیٹی کنٹریکٹ مل گیا۔ چوں کہ اُسے جلدی مدد لگانی تھی، اُس نے مجھے بلا بھیجا۔ جن کامگاروں سے مجھے وہاں واسطہ پڑا! وہ چیونٹی کی طرح محنتی تھے مگر تھے بے وقوف۔ وہ مجھ پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے چیونٹیاں اپنے قبیلے کی ناکارہ چیونٹی پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

کامگاروں کی ایک خصلت نرالی ہے۔ کوئی اُن کی برتری نہ مانے تو وہ بزور منواتے ہیں جو آپس میں جوڑے ہوں، وہ سامنے والے حریف کو زک دینا توقیرِ ہنر مانتے ہیں۔ میرے ساتھی ہنر کی باریکیوں کے ساتھ ہنر کے حربے بھی جانتے تھے۔ اُن کی ہر حرکت یک لفظ فرہنگ تھی۔ وہ اکسار ہاتھ ایسے تھے کہ نہ ساہل، ڈوری دیکھتے تھے اور نہ سادھنی سے ردا سادھتے تھے، صرف کونے کی اینٹ احتیاط سے لگاتے تھے جیسے جُلاہا بانے کی نئی نلی کا دھاگا ترتیب دیتا ہے، پھر چل سو چل، ٹھک ٹھک۔ اُن کی نظر اُن کی ساہل تھی، سادھنی تھی۔ ڈوری تھی اُن کی آنکھوں، ہاتھوں، جنتروں میں توصیفی تال میل تھا۔ اُن کے اعضا اور معاون اعضا تک ماہر اور قائم انداز تھے اِس لئے اُن کی تدبیر و تکمیل میں اختلاف نہ تھا۔ صریحاً ہر کوئی اپنی کوشش میں اکیلا لگتا لیکن درپردہ دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ اُن سب کی ذاتی خوبیوں کا مجموعی حاصل کمالِ ہنر تھا۔ اُن کے جسم میں ایک رگ ایسی نہ تھی جو اُن کے اِشارے پر صحیح طور پر متحرک نہ ہو۔ اُن کا ایک سانس ایسا نہ تھا جو بے مصرف ہو۔ اُن کی ایک چال ایسی نہ تھی جو مناسبِ موقع نہ ہو۔ وہ سروں سے پیروں تک اور کاندھوں سے ہاتھوں تک کاوش ہی کاوش تھے۔ کام کی جامدِ حقیقت کا حرکی تصور تھے، ایک ساز تھے جس کے پردے جدا جدا آہنگ سے تھرکتے لیکن معجزاتی طور سے رزمیہ راگ بن جاتے، جس کی موزونیت کی کمالیت معرکہ آرائیِ حیات کی منظر کشی کرتی۔

ہر مقصودِ نظر کے اپنے نشیب و فراز ہوتے ہیں اور اپنے راستے، اِس لئے ہر متلاشی الگ طریقے سے

جھیلتا ہے۔ میرے اینٹ جمانے، ساہل دیکھنے اور سُوت باندھتے تک وہ دو تین اینٹ لگا لیتے اور اپنے آدھے حصّے سے ایک اینٹ آگے زر رکھتے۔ وہ سُوت باندھ کر مجھ پر احسان جتلاتے کہ وہ میری سہولت کی خاطر ویسا کرتے ہیں ورنہ اُنہیں ضرورت نہیں ہے۔ میں اینٹ اینٹ پچھڑتا پچھڑتا پُورا ردّا پچھڑ جاتا۔ میرے ساتھی میری نا اہلی پر فقرے کستے،

"پہلے کرنی پکڑنی سیکھو اور درز بند کیا کرو تاکہ ہاتھ صاف ہو!"

"تو نے چنائی کی ہے کہ لبٹر سبٹر کھیر کھائی ہے؟"

"مصالح سے ہاتھ ایسے سان لیتے ہو جیسے رنگ ریز، رنگ سے۔ راج وہ ہے جو اپنے ہاتھ بزّاز کی طرح صاف رکھے!"

"ہر اینٹ میں صحیح زاویہ، صحیح گوشہ، صحیح سیدھ، صحیح آثار پوشیدہ ہے! لیکن یہ سب دیکھنے کی بصیرت اُستاد سے ملتی ہے۔ کسی کو اُستاد بناؤ، دان دکشنا دو، پھر اوزار پکڑو، ہنر اپنے آپ آجائے گا۔ بے اُستاد، اُستاد نہیں بنتے!"

اُن کی طعنہ زنی اور میری کم نظری ہم سَر تھی ورنہ میں کسی کو اُستاد بنانے کے بارے میں سوچتا اور اُس ناقابلِ برداشت صُورتِ حال سے نجات پانے کی راہ نکالتا۔ جہاں تک آپنے طور پر اصلاحِ ذات کا سُوال ہے، نئے خیال کو قبول کرنا شعُورِ خام کے لئے جتنا تکلیف دہ ہے، اُس سے زیادہ اذیّت پذیر طنز نُما دلیل ہے۔

اجیروں اور اجرتیوں میں اِمتداد زمانہ سے اِستحصال کا رشتہ نئے نئے طریقے اِختیار کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ناقابلِ تغیّر شکل اجرتیوں کے ہاتھوں اُجرتیوں کی غارت گری ہے۔ امر سنگھ چوگڈے (چار کاریگروں کا گروہ) میں سے ایک کا خیال رکھتا۔ وہ ایک باقی تینوں کو ایسے دوڑاتا پھراتا جیسے اُن کی نکیلیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ چاق چوبندی کو جینے کا حق ہے، میں وہ حق کھو بیٹھا۔ میں اُن کا مُقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ مجھے طعنے دیتے، میرے خاکے اُڑاتے، یہاں ذلّت، وہاں ذلّت، اِدھر ذلّت، اُدھر ذلّت، اپنی ذلّت آمیزی اور ہر کسی کی ذلّت پسندی سے مُتاثر ہو کر مجھے لگتا کہ آدمی کمالِ فطرت کے برعکس اِسقاطِ فطرت کا نتیجہ ہے۔

تایا جی عبادت اور صنعت میں فرق کرتے تھے۔ "عبادت کے طور طریقے لاحاصل ہیں، کوئی بھی احمق اِس میں شرکت کر سکتا ہے لیکن ہنر اور ہنر ور ایک دُوسرے سے مہارت سے مُنسلک ہیں اِس لئے کہتے ہیں، تجربہ کار پر بھروسہ کرو! تجربہ زندگی کی کسوٹی ہے۔ ہُنر ثمر آور ہے اور نفسِ نفیس کا مظہر۔ یہ ایک ہی اعلان ہے۔ تو راست ہے تو ہے ورنہ نہیں ہے۔"

میری کم آمیزی میری خُود اعتمادی کو مغلوب کر لیتی اور میں زندگی کی سچائی سے گھبرا جاتا۔ میری تن آسانی

جھیلتا ہے، میرے اینٹ جمانے، سالی دیکھنے اور سُوت باندھتے تک وُہ دو تین اینٹ لگا لیتے اور اپنے آدھے حصّے سے ایک اینٹ آگے نہ رکھتے۔ وُہ سُوت باندھ کر مجھ پر احسان جتلاتے کہ وُہ میری سہولت کی خاطر ویسا کرتے ہیں ورنہ اُنہیں ضرورت نہیں ہے۔ مَیں اینٹ اینٹ پچھڑتا پچھڑتا پُورا ردّا پچھڑ جاتا۔ میرے ساتھی میری نا اہلی پر فقرے کستے،

"پہلے کرنی پکڑنی سیکھو اور درز بند کیا کرو تاکہ ہاتھ صاف ہو!"

"تو نے چنائی کی ہے کہ لبٹر سبٹر کھیر کھائی ہے؟"

"مصالح سے ہاتھ ایسے سان لیتے ہو جیسے رنگ ریز، رنگ سے۔ راج وُہ ہے جو اپنے ہاتھ بزّاز کی طرح صاف رکھے!"

"ہر اینٹ میں صحیح زاویہ، صحیح گوشہ، صحیح سیدھ، صحیح آثار پوشیدہ ہے! لیکن یہ سب دیکھنے کی بصیرت اُستاد سے ملتی ہے۔ کسی کو اُستاد بناؤ، دان دکشنا دو، پھر اوزار پکڑو، ہنر اپنے آپ آجائے گا۔ بے اُستاد، اُستاد نہیں بنتے!"

اُن کی طعنہ زنی اور میری کم نظری ہم سر تھی ورنہ مَیں کسی کو اُستاد بنانے کے بارے میں سوچتا اور اُس ناقابلِ برداشت صُورتِ حال سے نجات پانے کی راہ نکالتا۔ جہاں تک اپنے طور پر اصلاحِ ذات کا سوال ہے، نئے خیال کو قبول کرنا شعورِ خام کے لئے جتنا تکلیف دِہ ہے، اُس سے زیادہ اذیّت پذیر طنز نُما دلیل ہے۔

اُجروں اور اُجرتیوں میں امتدادِ زمانہ سے استحصال کا رشتہ نئے نئے طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ناقابلِ تغیّر شکل اُجرتیوں کے ہاتھوں اُجرتیوں کی غارت گری ہے۔ امر سنگھ چوگڈے (چار کاریگروں کا گروہ) میں سے ایک کا خیال رکھتا۔ وُہ ایک باقی تینوں کو ایسے دوڑاتا پھرتا جیسے اُن کی نکیلیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ چاق چوبند ہی کو جینے کا حق ہے، مَیں وُہ حق کھو بیٹھا۔ مَیں اُن کا مُقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وُہ مجھے طعنے دیتے، میرے خاکے اُڑاتے، یہاں ذِلّت، وہاں ذِلّت، اِدھر ذِلّت، اُدھر ذِلّت! اپنی ذِلّت آمیزی اور ہر کسی کی ذِلّت پسندی سے متاثر ہو کر مجھے لگتا کہ آدمی کمالِ فطرت کے برعکس اسقاطِ فطرت کا نتیجہ ہے۔

تایا جی عبادت اور صنعت میں فرق کرتے تھے۔ "عبادت کے طور طریقے لاحاصل ہیں۔ کوئی بھی احمق اِس میں شرکت کر سکتا ہے لیکن ہنر اور ہنروَر ایک دُوسرے سے مہارت سے منسلک ہیں اِس لئے کہتے ہیں، تجربہ کار پر بھروسہ کرو! تجربہ زِندگی کی کسوٹی ہے۔ ہنر ثمر آور ہے اور نفسِ نفیس کا مظہر۔ یہ ایک ہی اعلان ہے۔ تو راست ہے تو ہے ورنہ نہیں ہے۔"

میری کم آمیزی میری خود اعتمادی کو مغلوب کر لیتی اور مَیں زِندگی کی سچّائی سے گھبرا جاتا۔ میری تن آسانی

سر اُٹھاتی اور مَیں جینے کے لئے کسی آسان وسیلۂ روزگار کے بارے میں سوچتا۔ تارکُ الدُنیا کے پیشے کے سوائے مجھے کوئی دُوسرا پیشہ نظر نہ آتا لیکن مَیں کسی طرح ایسا کرنے سے باز رہتا۔ میرے کتنے ساتھی اُن کٹھور حالات کا مقابلہ شراب کی بوتلوں اور قحبہ خانوں کے سہارے کرتے اور مجھے اُکساتے، سمجھاتے کہ یہی ٹھیک راستہ ہے۔ مَیں اُن کے ساتھ نہ چلتا۔ وہ مجھ پر آوازے کستے "تیرا، ہمارا کیا ساتھ؟ تو کمر کا ڈھیلا ہے"۔ اپنی نااہلی اور نامردی کو مَیں نے کیسے کیسے بھگتا، کہاں کہاں جھیلا! صُبح کام پر جاتے ہُوئے، دِن بھر کام کرتے ہُوئے، چھُٹی کے دوران کھانا کھاتے ہُوئے، رات گھر لوٹتے ہُوئے، یہاں تک کہ اپنے خوابوں میں، میری آسائش کی خاطر وہ ہر جگہ موجود تھی۔

میرے ساتھی جیسے بھی تھے، مزے کے لوگ تھے! اُن کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تو کئی ورقے سیاہ کروں گا۔ مَیں صرف دو باتوں پر اکتفا کرتا ہُوں۔

ہربنس سنگھ آئے دِن پی کر گرتا، چوٹ کھاتا اور حادثہ یوں بیان کرتا۔ دلّی کی سڑکیں لااُبالی اور غیر ذمّہ دار سڑکیں ہیں، کہیں بھی کیسے بھی مڑ جاتی ہیں! کل مَیں کشمیری گیٹ سے سبزی منڈی جا رہا تھا، سڑک اچانک قدسیہ گارڈن کی طرف مُڑ گئی اور مَیں اپنے دِھیان میں سیدھا نکل گیا۔ سڑکوں کو مُسافروں سے پُوچھ کر مُڑنا چاہیئے۔"

اپنی شراب نوشی کی وجہ سے ہربنس سنگھ بالکل کنگال رہتا اور آئے دن باوا سنگھ سے پیشگی مانگتا۔ ایک دِن باوا سنگھ نے اُسے سمجھایا بلکہ ڈرایا، "ہربنس! تُو جانتا ہے کہ شراب دیر اثر زہر ہے؟"

ہربنس بلا کا ظریف تھا۔ اُس نے ترنت کہا، "مستری جی! جانتا ہُوں۔ اِسی لئے تو پیتا ہُوں۔ مَیں خود زُود اثر چیز سے نفرت کرتا ہُوں۔"

سردن سنگھ قُطب روڈ کا ایک واقعہ بڑی بے باکی سے بیان کرتا تھا۔ "میری جیب میں آٹھ آنے تھے، مَیں نے سوچا، چلو کسی سے دِل لگی کرتے ہیں۔ بڑی مُشکل سے ایک پٹائی۔ باتوں باتوں میں، مَیں نے کہا، "مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے، ذرا سا دُودھ چُونگھنے دو۔" وہ بدذات بڑی منہ زور نکلی، بولی، کیوں نہیں! بیٹا، ماں کا دُودھ نہیں چُونگھے گا تو کیا باپ کا تھن چُونگھے گا؟" مَیں خُود کو بڑا جگادری سمجھتا تھا لیکن اُس نے میری بولتی بند کر دی اور مجھے بھاگتے ہی بنی۔

تین مُورتی کے کام کا ایگزیکٹو انجنیئر پُورن چند تھا، جس کی سختی کی دُھوم تھی۔ اینٹیں تر، کنستیاں اُوپر گل سنڈے بھرے ہُوئے اور متوازی نہ ہوتے تو وہ چھت تک تیار دِیوار گروا دیتا۔ دِیوار اندر سے کھوکھلی ہے کہ بھری ہُوئی، وہ آپ مُعاینہ کرتا۔ چنائی کا اندرونی حِصّہ دیکھنے کے لئے اُس کے پاس دو طریقے تھے، ایک تھا معمُولی اور دُوسرا غیر معمُولی۔ معمُولی جانچ کے لئے وہ دِیوار کو ٹھونکتا، اُٹھتی ہُوئی آواز کو سُنتا اور اُس سے اپنا مطلب نکالتا۔

غیر معمولی جانچ کے لئے وُہ چھڑی کا ایک سرا دیوار سے لگاتا، دوسرا کان سے اور اِس طرح ہاتھوں اور کانوں اور آنکھوں کے اِتحاد سے جو فیصلہ کرتا وُہ ننانویں عشاریہ ننانویں فیصدی دُرست ہوتا۔ چُوں کہ چُنائی میں مصالح بھرنے میں وقت لگتا تھا اِس لئے مصالح پتلا رکھا جاتا تھا جو پھیلاتے ہی بہہ کر درزوں میں بھر جاتا تھا۔ پُورن چند کے آنے کی خبر ملتے ہی کام رینگنے کے سے خرام سے چلتا۔ ریت چھاننے والا ریت اِحتیاط سے چھانتا، مصالح ملانے والا مصالح ذمہ داری سے ملاتا۔ بہشتی اینٹیں سلیقے سے تر کرتا، مزدُور چھانٹ کر چوکور اینٹیں اُٹھاتا اور اِنجانے میں طنابِ معمار کی اِبتدائی ذمہ داری نباہتا۔ پُورن چند کے جاتے ہی وُہ عارضی گٹھ جوڑ ٹُوٹ جاتا اور ہر سُست کام دوڑنے لگتا۔ کرنیوں، بسولوں، اینٹوں، تسلوں، پیروں اور ہاتھوں کی دوڑ میں بظاہر بھگدڑ نظر آتی لیکن اندرونی طور پر پُورا تال میل تھا، ایسا نہ ہوتا تو ایک دُوسرے کی بے تحاشگی سے مارا جاتا۔

تر اینٹیں اُٹھاتے اور تر سیمنٹ پھیلاتے ہُوئے لگتا کہ اُنگلیاں، ریگمال پر گھس رہی ہیں۔ ہوتے ہوتے اُنگلیاں زخمی ہوگئیں اور ضرُورت سے زیادہ پکے پھل کی طرح پلپلی۔ ماس کو سخت بنانے کے لئے مَیں ہاتھوں کو گرم توے پر جلاتا۔ اُس سے اُن کی صُورت ہی بگڑ گئی، وُہ پرانے مسکے ہُوئے کپڑے کے سے ہوگئے۔ مَیں اُنگلیوں پر پٹیاں باندھ کر کام کرتا اِس سے اُن کی حرکت پزیری متاثر ہوتی۔ ہم آہنگی اِنتشار کا شکار ہوجاتی اور اِنتشار صنعتی نفسیات کے مُغایر ہے۔ ماماجی کے پاس سیکھے ہُوئے کام کی قیمت تجربے کے میدان میں لڑکھڑاتے قدم کی سی اہمیت رکھتی تھی۔ پاڑ پر چلنا، کرنی پکڑنا، مصالح چھاننا، بسُولی اُٹھانا، ڈلی توڑنا، اینٹ جمانا، سُوت باندھنا، ساہل کرنا، ٹھانس لگانا۔۔۔۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا کام نہ کہ مُکمل ہُنر کا منصوبہ ہے بلکہ طاقت و نزاکت کا ایسا اِتحاد ہے جو کامل مہارت ہی سے عمل در آمد ہوتا ہے۔ مَیں جس کام کو راحتِ جاں سمجھا تھا وُہ بلائے جاں نکلا۔ میرے تصوُّر کی قلعی یوں اُتری کہ مَیں اپنے ادھُورے پن کو اپنی رگوں تک دیکھنے لگا۔

میں سچّا سنگھ کو پرایا سمجھتا تھا اور اُسے اِلزام دیتا تھا لیکن یہاں میرا سگا میرے خلاف تھا۔ کوئی مشورہ دینے کے بدلے وُہ مُجھے دھتکارتا، "مسٹر میٹرک لیٹ! پُورے کاریگر جتنا کام کرے گا تو آدھا ریٹ ملے گا۔ بیٹھ بیٹھ کر تیرے چوتڑ، تربُوز کی طرح موٹے ہوگئے ہیں۔ کام کرتے ہُوئے پیچھے سے ہلا کر، تاکہ گُودا گلے۔ موٹے چوتڑ کھتری کی پہچان ہیں اور تُو ترکھان ہے۔ یہ تیرے پیچھے اچھے نہیں لگتے۔"

میرے کام کی خرابی کا میری تعلیم سے کیا رِشتہ ہے؟ لیکن ہر کوئی مُجھے اُسی کا طعنہ دیتا۔ میری بے اصلی اُس بھولی کنواری کی سی تھی جو کسی کے پیار میں پیٹ سے ہوجائے لیکن آخر اُسے پتا چلے کہ اُس کے پیار کا پھل جائز نہیں ناجائز ہے اور اُس کے پیار پر تہمت۔

امر سنگھ کی غلیظ سی پچکی ہُوئی ناک ہمیشہ بند رہتی اور وُہ مُنہ سے سانس لیتا۔ وُہ میرے سامنے مُنہ

پھاڑے، اُلجھے اُلجھے سانس کھینچتا تو مجھے لگتا کہ وہ خاموش گالیاں دے رہا ہے۔

یہاں سائیکل مرمّت کرنے کا تجربہ بروئے کار آیا۔ میں نے پرانی ٹیوب سے انگلیوں کے لئے خول بنائے، اُن کی نرمی اور لچک سے انگلیوں کی کارروائی اور خوش اسلوبی بحال ہوگئی۔ میری وہ ایجاد مقبول ہوئی اور کئی دوسرے بیمار مجھ سے خولوں کی فرمائش کرنے لگے۔ وہ اپنی ضرورت میں میری پژمردہ خیالی کو تازگی اور بے حوصلگی کو دلیری دے گئے۔ میرا وجدان ایجاد میرے لئے یوں تھا جیسے غیر مانوس ماحول میں بھٹکے ہوئے مسافر کے لئے خطِ جادہ۔ اِس سے ملتی جلتی روحانی تاثیر سے میں ایک بار پہلے بھی فیض یاب ہوا تھا۔ اُس کی تفصیل اِس طرح ہے۔ تڑکے کا اندھیرا تھا، پانی برس رہا تھا اور میں دکان میں سویا ہوا تھا۔ کسی ادھیڑ عمر کے کسان نے مجھے نیند سے جگایا اور سائیکل کے کُتّے مرمّت کرنے کے لئے کہا۔ میں نے صاف اِنکار کیا اور دروازہ اُس کے منہ پر بند کر دیا۔ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھے پکارا "بیٹا، ایک بات سنو!"

"کیا ہے؟" میں نے آدھا دروازہ کھولا اور اُس میں سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔

بیٹا، کوئی اور موقع ہوتا، میں تجھے تکلیف نہ دیتا! میرا بھائی سُرگباس ہوگیا ہے اور میں اپنی بہن کو بُلانے بڑی بسی جا رہا ہوں۔"

اُس کے الفاظ کی سچائی میں نے رندھے لہجے میں دیکھی اور میں جھٹ پٹ بدل گیا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ہمدردی سے اُسے اندر بلایا اور فری وھیل دیکھا۔ کُتّے ٹھیک تھے لیکن اُن کے مددگار تار ناکارہ تھے۔ میں تار بدلنے لگا۔ مجھے تار کا گچھا نہ ملا، میں پریشان ہوگیا اور وہ مصیبت زدہ، بدحواس۔ میں نے اُسے نیا فری وھیل لگانے کا سمجھاؤ دیا لیکن اُس غریب کے پاس اِتنے پیسے نہ تھے۔ عین اُس وقت میری صلاحیتِ ایجاد کام کر گئی۔ میں نے کُتّوں کے نیچے موٹر ٹیوب کے ٹکڑے رکھ دیئے جو تار کا کام کر گئے۔ پورا عمل جو ہر ذات کی مباہات ہے۔ کچھ احساسِ دردمندی اور کچھ جوشِ کامیابی سے سرشار ہو کر میں نے اُس کسان سے مزدوری نہ لی۔

بڑے بڑے کام اِنسان کے ایسے ہی عارضی جذبے کی دائمی مثال ہیں۔ لاکھوں ایسا سوچتے ہیں لیکن اُن میں سے ایک اپنے جذبے کی پیروی کرتا ہے اور اُسے کمال تک پہنچانے کے لئے مر مٹتا ہے۔ غور کرو تو وہ ایسا ہی ہنرور تھا جس نے تہذیبِ ایثار کا پہلا چراغ جلایا، دوسرے نے دوسرا اور جب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

جس دن پہلی ہندری بٹی، میری بے قراری دیدنی تھی! باوا سنگھ چٹھا بانٹتا اور میں بھیڑ میں کھڑا اِدھر جھک کر، اُدھر جھک کر مسٹر رول دیکھنے کی کوشش کرتا۔ پہلے ورقے پر مجھے اپنا نام نظر نہ آیا، میں ورقہ پلٹنے کا اِنتظار کرنے لگا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے کنکھیوں سے باوا سنگھ کو دیکھتا اور سوچتا کہ میرا نام مسٹر رول کے آغاز میں ہونا چاہیئے تھا، ایسا کیوں نہیں ہوا۔ میرے دل کا زیر و بم بڑھتا گیا لیکن پہلا ورقہ پلٹتا نظر نہ آیا۔

آخر کار پہلا ورقہ پلٹا۔ مَیں اِس کے اِس پہلو سے اور اُس کے اُس پہلو سے سُکڑ کر آگے بڑھا، مسٹر رول دیکھا اور اپنا نام نہ پا کر حیران ہُوا۔ مسٹر رول کے ورقے اُلٹتے رہے اور کامگار، پکار لے کر جاتے رہے۔ آخر باوا سنگھ نے مسٹر رول گول کیا، تلوے میں رکھا اور میری طرف دیکھا۔ امر سنگھ، پیارا سنگھ اور باوا سنگھ کنٹریکٹر شپ میں پارٹنر تھے اور اِس بات کے لیے مشہور کہ جہاں وہ دونوں کوئی ناخوشگوار کام کرتے ہیں، باوا سنگھ کو آگے کر دیتے ہیں اور باوا سنگھ اُن دونوں کو۔ باوا سنگھ آنکھیں جھکائے، میری نظر کو ٹالتے، کچھ ہاتھ میں چھپائے، آگے بڑھا، میرے پاس پہنچا، اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈالا، نکالا اور جلدی سے پیچھے مُڑا جیسے اُسے ڈر ہو کہ مَیں اُس کا تعاقب کرنے والا ہُوں۔ اُس کی ذلالت ڈھکی چھپی نہ تھی لیکن میری توجہ جیب پر رہ گئی۔ توجہ کی نفسیات، خواہش کے برعکس ہے، اِس لئے کہ یہ حاضر سے متاثر ہوتی ہے۔ میری آنکھوں نے اُس کا وہاں تک پیچھا کیا جہاں تک وہ نظر آتا رہا۔ میری جیب کا نظارہ غم ناک تھا، وہاں دس روپے کا نوٹ تھا۔

چرن سنگھ سائیکل سنبھالے کھڑا تھا۔ وہ باوا سنگھ کے ساتھ سڑک تک گیا اور لوٹ آیا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ وہ میرے پاس آیا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سادگی نما چالاکی سے بولا "میری رائے مانو گے!"

"کیا؟" مَیں نے غصّے سے پُوچھا۔

"کل سویرے آتے ہی اِس نوٹ کی بتّی بنا کر باوا سنگھ کے گھسا دو۔ پندرہ دِن میں بھکاری اِس سے زیادہ کما لیتا ہے۔" اُس نے دانت پیس کر انتقام آمیز لہجے میں کہا۔

اُس کارخانۂ حیات کا دروازہ صرف سازش گھر میں کھلتا تھا اِس لئے ہر قدم سازشیوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ چرن سنگھ کی طرح وہاں کتنے اور تھے جو مجھے ورغلاتے تھے، اُلٹا سیدھا پڑھاتے تھے اور سچے دِل سے چاہتے تھے کہ مَیں اُن راستوں پر چل نکلوں جو تنزّلِ حیات کی جانب مُڑتے ہیں۔

مَیں اپنے دِل میں کچھ ویسا ہی سوچ رہا تھا۔ اُس کے مشورے سے میری شرمِ ناکسی کو جُرأت مِلی اور میں نے باوا سنگھ کو موٹی سی گالی دے کر کہا، ٹھیک ہے، مَیں کل ایسا ہی کرتا ہُوں!"

"یہ ہے مردوں والی بات!" اُس نے میری دلیری کی تائید کی اور پیٹھ ٹھونکی۔

چرن سنگھ کی باہوں کے بال اِتنے کھردرے تھے کہ آستینوں میں سے کانٹوں کی طرح باہر نکلے رہتے تھے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہُوئے اُس کا بازو میرے گال کو چھُو گیا۔ مَیں نے اُسے حقارت سے دیکھا۔ اُس کی ہمدردی کا اثر! وہ منفی جذبہ اُٹھتے ہی دب گیا اور میں نے پُر اُمید ہو کر پُوچھا، "مانا کہ مَیں نے کام چھوڑ دیا، مجھے کہیں اور کام مل جائے گا؟"

"ارے، کام کا کیا ہے! عِزّت ہے تو کام بہت!" اُس نے مفر سے کام لیا۔

"پھر بھی! مجھے یہی کام بڑی مشکل سے مِلا ہے اور امر سنگھ نے مجھے خود بلایا ہے۔"

اُس کے ادھورے جواب سے میری گرمی کسی حد تک کم ہوگئی اور میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی۔ مَیں نے اُسے یقین و گمان کے مِلے جُلے جذبے سے دیکھا۔

"تُو بزدل ہے! تُو خاک ترقی کرے گا!"

اُس نے مجھے اُکسایا اور جوش دلایا۔

"مجھے نہیں کرنی ایسی ترقی!"

اُس کے خلاف میرا عتاب بڑھنے لگا اور نتھنے پھڑکنے لگے۔

"تو مَیں جاؤں؟"

اپنی بات نہ بنتی دیکھ کر اُس نے جانے کا اشارہ کیا۔

"مَیں نے تجھے پکڑا ہوا ہے کیا؟" مَیں چلّا کر بولا تو مجھے لگا کہ میرے الفاظ خونِ دل میں ڈوب کر زبان پر آئے ہیں۔

وہ مجھ پر چڑھ آنے کے سے انداز میں کھڑا تھا، مَیں نے اُسے ہلکا سا دھکّا دیا۔ اُس کا پاؤں پیچھے روڑے پر پڑا، وہ پھسلا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس نے منہ بنا کر مجھ پر خفگی ظاہر کی، سائیکل اٹھائی اور گھر کی راہ لی۔ اُس کے چلے جانے سے میرا دبا ہوا اُبال اُبھرا اور مَیں زور سے چلّایا، "رذیل کہیں کا! حرام زادہ!"

اُس کی پیٹھ کے پیچھے گالی دے کر مجھے وُہی تسلّی ہوئی جو اپنے دشمن کو پورے طور پر کچلنے سے ہوتی ہے۔ میری زندگی میں اِس رویّے کو بڑا دخل رہا ہے۔ گالی کمزور آدمی کا سامانِ جنگ ہے۔ یہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے اِس ہتھیار کو برتتا ہے اور اپنے طاقت ور دشمن کو زیر و زبر کرتا ہے جو بصورتِ دیگر ناممکن ہے۔

مَیں کتنی دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے محنت زائیدہ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ رات کی خاموشی اور میری سنجیدگی کی وجہ سے اُس بے منفعت کام کا مفہوم ہی بدل گیا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ دیکھنے کو میری طرح مجبور ہے لیکن در پردہ سُود مندی سے بھرپور ہے۔ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آیا،

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مَیں نے اِس شعر کو ہر پہلو سے سمجھا اور مُہمل پایا۔ ایسی بات ادھورے انسان کرتے ہیں۔ پورے انسان اپنی ساری توانائی، ساری لیاقت، ساری پونجی، یا مال اِدارے میں لگاتے ہیں۔ اُسے بچاتے ہیں اور کمال تک پہنچاتے ہیں۔ ایڈیسن ہنر پیشہ کئی بار دیوالیہ ہوا لیکن ہنر سے منہ نہ موڑا۔ اپنے عزم سے اُس نے ہنر کو اُس مقام پر پہنچا دیا کہ

اِنسانی زِندگی کا ناگزیر حِصّہ بنا دیا۔

ریزہ پھر بھی ریزہ ہے، میری اُجرت مزدور سے بھی کم تھی اور تایا جی کی اِس بات کا برحق ثبوت کہ اُدھورا ہُنرور، معذور اِنسان سے بدتر ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے عمل کا جواب دِہ ہوتا ہے۔

مَیں ہوٹل سے کھانا کھا کر دیر سے گھر پہنچا اور جگت سنگھ کو اپنا مُنتظر پایا۔ پچھلے دو مہینے سے مَیں نے اُسے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ اُدھار کے بارے میں اُس کا خیال نرالا تھا جسے وہ پنجابی محاورے میں سُناتا تھا۔ پنجابی زبان جتنی میٹھی ہے اُس سے لاکھ گُنا کڑوی ہے۔ مَیں اپنے قارئین کے مُنہ کا مزہ خراب نہیں کروں گا۔ میر نے اپنے محبوب کی شیریں زبانی کا ذکر اِس طرح کیا ہے۔

کُشتہ ہُوں مَیں تو شیریں زبانیِ یار کا

اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیچ!

کاش وہ اپنے محبوب کی تلخ زبانی کا بھی ذکر کرتا! جس سے مُجھے اپنی بات سلیقے سے کہنے کا اِشارہ ملتا۔

میری زندگی سکون نُما بے سکونی سے گزرنے لگی۔ مَیں کوئی دوسرا کام سیکھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ بلدیو سنگھ الیکٹرک ویلڈر تھا اور اپنے کام کو بڑا سراہتا تھا۔ مَیں نے مِنّت سماجت کر کے اُسے کام سکھانے کے لئے منایا۔ میری خیالی مہم کو جو عملی تجربہ ہُوا اُس سے میرا دِل ٹُوٹ گیا۔ میری آنکھوں کو الیکٹرک سپارک سے الرجی تھی، اُن میں ترپائی سے ملتے ڈورے اُبھر آئے اور چُبھنے لگے۔ اپنے مخصوص پیشے سے غیر حاضر رہنا، مُصیبت مول لینا ہے۔ اپنی پیدا کردہ صُورتِ حال سے چھٹکارا پانے کے لئے مُجھے تین چار دِن لگ گئے اور وہ دِن مَیں نے جیسے کاٹے مَیں ہی جانتا ہُوں۔ مَیں اپنے گرد و نواح اور وسائل کا تجزیہ کرتا، مُجھے لگتا کہ مَیں اُسی کام کے لئے بنا ہُوں جسے حالات نے میرے اُوپر لاد رکھا ہے۔ مَیں نے اُس کام میں کمال حاصِل کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے لئے مشقّت اور مہارت کی ضرورت تھی۔ یہ دونوں چیزیں ریزے کے لئے ایسے ہیں جیسے بیج کے لئے پانی اور دھرتی۔ پانی میں بیج رکھنے سے پھوٹ پھلے آئے لیکن جڑ نہیں پکڑتا جب تک اُسے دھرتی نہ ملے۔

میرے ساتھ جتنے لوگ تھے، مجموعۂ اضداد تھے۔ کسی پر بھروسا کرنا اپنی بے ہُنری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تایا جی کے پاس ہُنرور کا اعلیٰ تصوّر تھا۔ "جو ہُنرور، ہُنر بانٹنے میں پس و پیش کرتا ہے یا ہُنر کا غلط اِستعمال کرتا ہے، وہ سماج دُشمن ہے۔"

اُن کے معیار سے وہاں ہر کوئی سماج دُشمن اور بے رحمی کی حد تک خُود غرض تھا۔ ہُنرور ہُنر کی باریکیاں چُھپاتے تھے۔ وہ احساسِ تناسُب سے عاری تھے اور کسی کی رُسوائی میں اپنی بڑائی سمجھتے تھے۔ اُن کی زِندگی فہم و فراست سے دُور تھی، ایک مشین تھی جو اُن کے لئے معیشت فراہم کرتی تھی۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر کسی مُشکل کا حل نہ نکال سکتے تھے، اپنی اپنی

ہانکتے تھے، ایک دوسرے کو نشانہ بناتے تھے اور لڑ جھگڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی جس ضرورت پر مرتے تھے، دوسرے کی اسی ضرورت پر ہنستے تھے۔ اپنے لئے جو اچھا سمجھتے تھے، دوسرے کے لئے وہی برا جانتے تھے۔ ان کی کسی بات پر اعتماد کیا جا سکتا تھا تو وہ ارتکابِ ہنر تھا۔ ان کی ہر مصیبت اپنی پیدا کردہ تھی لیکن وہ ذمہ دار دوسرے کو ٹھہراتے تھے۔ ان کے پاس اخلاق کا ایک ہی معیار تھا، دوسرے کو کیا کرنا چاہیئے۔ وہ بھول کر نہ سوچتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے! چوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں۔ وہاں تصحیح ذات کی بات خارج از بحث تھی۔ وہ اپنے سے آگے بڑھنے والے کی ٹانگ کھینچتے تھے اس لئے باہم تنے رہتے تھے۔

میرے قارئین یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر وہاں ہر کوئی اپنی غرض کا بندہ تھا تو جیون کا دھندا کیسے چلتا تھا؟

کوئی کسی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے، اپنے لئے برا نہیں کرتا ہے اور اس کا یہ رویہ ضمناً دوسرے سے جڑتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مفاہمت کے برعکس مزاحمت سے منسلک ہیں اور اہل ظرف ہو کر اپنی کم ظرفی کا شکار ہیں۔ زندگی سرگرمی کا نام ہے، نہ کہ سرد مہری کا! جو کوئی اسے پوری گرمی نہیں دے سکتا، وہ اس کی نیم رخ صورت ہی دیکھتا ہے جو بنتے بنتے اس کی نفسیات بن جاتی ہے، نا کسی بھگوڑے سپاہی کی طرح۔

جگت سنگھ صاف لفظوں میں مجھے سمجھا چکا تھا، "تم جو ہو، سو ہو! ایک بات یاد رکھو، تمہیں جو بننا ہے اپنے آپ بننا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو پلّے باندھ لیا لیکن وہ جو قول ہے کہ خام کو کام سکھا لیتا ہے، مجھ پر پورا نہ اترا۔ تایا جی کہتے تھے، "ہنر کا نعم البدل بیش تر ہنر ہے اور مہارت کا بیش تر مہارت" میری بے مقدوری! میرے پاس ہنر کا بدل بے ہنری تھی اور مہارت کا ناقابلیت۔ میں اپنے سامنے ہاتھوں کو غلطی کرتے دیکھتا لیکن انہیں صحیح سمت نہ دے پاتا، روک سکتا، ولے اس سے میری مشکل کا حل نہ نکلتا۔ جہاں کہیں پہلا ردا ٹیڑھا لگ جاتا اس کا عکس آخری ردے میں نظر آتا جو اس کہاوت کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتا۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج (اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی لگاتا ہے)
تا ثریا می رود دیوار کج (وہ دیوار ثریا تک جائے، ٹیڑھی رہے گی)

ایک دن کام سے واپس آتے ہوئے، میں شنکر روڈ کی چڑھائی سائیکل پر سے اتر کر پیدل چڑھ رہا تھا کہ پیچھے سے اجیت سنگھ سائیکل پر آیا۔ وہ کاٹھی سے اٹھ کر پیڈلوں پر کھڑا ہو کر زور لگا رہا تھا، مجھے دیکھ کر حیرت و مسرت کے ملے جلے لہجے میں بولا، "اوہ، تم!" اور سائیکل پر سے اتر پڑا۔ وہ ایمبیسیڈر ہوٹل کے پاس کام کرتا تھا اور کبھی کبھار یوں ہی آتے جاتے مل جاتا تھا۔ اس ہنسوڑ کو گمبھیر دیکھ کر میں نے پوچھا، "کیوں، کیا بات ہے؟ چہرہ اترا ہوا ہے؟"

کیا بتاؤں ؟ مَیں گاؤں گیا تھا اور بھائیے کو ساتھ لے آیا۔ وُہ آتے ہی بیمار پڑ گیا اور واپس جانے کی رٹ لگا رہا ہے۔" اُس نے بلغمی کھانسی کھانستے اور تھوکتے ہُوئے کہا۔

"اِس موسم میں کھانسی! کیا ہُوا؟" مَیں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہُوئے پُوچھا۔

"زُکام ہُوا تھا، وُہ جاتے جاتے کھانسی ہِک گیا۔"

اُس نے کھنکار کی وَضاحت کی۔

ہاں، تُم کہہ رہے تھے کہ تایا جی کو گاؤں سے لے آئے ہو۔ کیوں؟"

مَیں نے بات کا رُخ پہلے کی جانب موڑا۔

"تم تو جانتے ہو کہ وُہ زمین کی ساری کمائی دُوسروں کو کھلاتا ہے اور۔۔۔"

تُم دِلّی میں پڑے ہو، اُس کی دیکھ بھال کون کرے؟ وُہ جنہیں کھلاتا ہے، وُہ اُس کا پُورا خیال رکھتے ہیں۔"

"مَیں نے اُسے بیچ میں ٹوکا اور اُس راز کی طرف اِشارہ کیا جو راز نہ تھا۔

"یار، کمائی کھلاتا ہے تو چلتا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ جوگندر سنگھ کے نام زمین لکھنے کا اِرادہ رکھتا ہے، اس لئے یہاں لے آیا ہُوں۔ وُہ گاؤں میں رہتا تو کچھ نہ کچھ کر گُزرتا۔"

اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے وُہ مُجھ سے ہمدردانہ تبصرے کا خواستگار ہو۔

"لیکن وُہ یہاں کرے گا کیا؟ کام کا آدمی بیکار کیسے رہ سکتا ہے؟"

مَیں نے اُس صُورتِ حال کی جانب اشارہ کیا جو کام دار کے لئے سرطان کا درجہ رکھتی ہے۔

"مَیں نے سوچا تھا اِس کے بارے میں! اُسے پیپسی کولا میں گیٹ کیپر رکھوانے کا بندوبست کیا ہے۔ اُس کے بیمار ہونے سے سارا کام بگڑ گیا اور اَب وُہ گاؤں واپس جانے کی ضِد کر رہا ہے۔ تُم میرے ساتھ چلو اور اُسے سمجھاؤ، وُہ تمہاری بات مان لے گا۔

ہم باتیں کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے جہاں سے گڑ گاؤں کو سڑک پھُوٹتی ہے اور چڑھائی ختم ہوتی ہے۔ مَیں نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔

اجیت سنگھ، شیر سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا اور مجھ سے تین چار سال بڑا تھا۔ وُہ سکُول کا بھگوڑا تھا لیکن ممّاری کے میدان کا جنگ جُو۔ شیر سنگھ نے یہ سوچ کر اُس کی شادی جلدی کر دی تھی کہ اُس کی بیوی گاؤں میں رہے گی اور گھر بار دیکھے گی لیکن وُہ اپنی بیوی کو دلّی لے آیا۔ شیر سنگھ اپنے بڑے بھائی گردِتّے کے ساتھ رہتا اور جو کماتا اُسی کے گھر ڈالتا۔

وُہ اپنے بیٹے کے بارے میں کہتا، "اُس سے میرے مویشی اچھے ہیں۔ یہ میرے لئے دن رات کام کرتے ہیں اور بُرے

میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ایسی اولاد کس کام کی ؟ جو اپنے ماں باپ کے کام نہ آئے۔" وہ کھلے عام کہنے لگا تھا، "وراثت پر اُسی کا حق ہے جو اپنے ماں باپ کی خدمت کرکے اُسے پانے کا حق حاصل کرتا ہے۔"
ہریانہ میں ایسی مثال موجود تھی۔ گیان سنگی کھتری کے بچے اُس کے بڑھاپے میں اُس کے ساتھ نہایت شرمناک سلوک کرنے لگے۔ ہنسراج چمار نے اُس کی جی جان سے خدمت کی اور اُس نے اپنی ہٹی ہنسراج کے نام کردی۔

اجیت سنگھ شادی پور میں مندر کی گلی میں دو خانہ چوبارے میں رہتا تھا اور نیچے کے مکان کی آدھی چھت کو بطور صحن برتتا تھا۔ شادی پور گاؤں تھا جو بڑھتی ہوئی دلّی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ روپیہ کمانے کی ہوس میں وہاں کے مکان مالکوں نے ہر ممکن الحصول زمین پر جیسے تیسے مکان بنالئے اور وہ بھی کسی جاننے پہچاننے کی سفارش سے بھاڑے پر دیتے۔ گلیوں اور نالیوں کے رقبے پرانی آبادی کے لئے موزوں تھے، نئی آبادی اور گندگی سے اُن کی حالت حلق تک بھرے پیٹ کی سی تھی۔

شیر سنگھ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اجیت نے جوں ہی اُسے بتایا کہ گیان آیا ہے، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، جیسے اچھا بھلا ہو۔ میں نے اُس کے پاؤں چھوئے۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور دعا دیتے ہوئے کہا، "جیتے رہو! اچھا ہوا، تم آگئے ہو! مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے، تایا جی!" میں نے اُسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ اُس کا ہاتھ بخار سے جل رہا تھا اور آنکھیں گرمی سے چڑھی ہوئی تھیں۔

"آپ آرام سے لیٹئے، میں آپ کی بات سنتا ہوں۔"

میں نے اُسے بستر پر لٹایا، اُس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور بستر کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہاں بیٹھو!"

اُس نے سرہانے کے پاس باہی پر ہاتھ مارا اور مجھے بلایا۔ وہ دلّی کو ملونوں کا شہر سمجھتا تھا اور اُس کے بارے میں حقارت آمیز خیالات رکھتا تھا۔

"دلّی کے لوگ گھروں میں چولہوں میں ہگتے ہیں اور وہیں پکاتے کھاتے ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے!"

"دلّی کے لوگ لوہے کی بھینس کا دودھ پیتے ہیں اس لئے لوہے کا دل رکھتے ہیں۔"

"دلّی میں پڑوسی، پڑوسی سے بے خبر ہے، یہاں میں سارے گاؤں کو جانتا ہوں! اور یہ بھی جانتا ہوں فلاں گھر میں کیا پکا ہے؟"

"بولیے، کیا بات ہے؟" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"تُم اِسے کہو کہ یہ مجھے گاؤں بھیج دے!" اُس نے اجیت سنگھ کی جانِب آنکھوں سے اِشارہ کر کے کہا اَور اپنی بات جاری رکھی۔ "مَیں اِسے کئی بار کہہ چُکا ہُوں لیکن یہ میری ایک نہیں سُنتا! یہ جِس دِن پَیدا ہُوا تھا، مَیں نے شریکوں میں بادام بانٹے تھے اَور فخر کیا تھا کہ میرا وارِث پَیدا ہُوا ہے۔ یہ اُسی بُری پہل کا نتیجہ ہے کہ اِس کا دِل بادام کی طرح کڑا ہے۔ مَیں شیرینی بانٹتا تو ہو سکتا ہے یہ نرم دِل ہوتا۔"

"تایا جی، آپ اس حالت میں سفر کیسے کریں گے؟ پہلے تندرُست ہو جایئے پھر جانے کی بات کیجئے"
اُس کی بات کی حکمت اَور خواہش پر مُسکراتے ہُوئے، مَیں نے سمجھاؤ دیا۔

"سفر کا کیا ہے؟ جیسے یہاں تڑپتا ہُوں ویسے گاڑی میں تڑپوں گا لیکن گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ تُو اِسے کہہ دے کہ یہ مجھے گاڑی میں بٹھا آئے۔"

وُہ گرم گرم سانس چھوڑتا تھا اَور قریب قریب ہانپتا تھا۔

"راستے میں کُچھ ہو گیا تو؟"

اجیت سنگھ میرے اُوپر سے اُسے دیکھ رہا تھا، اُس نے غُصّے کا اِظہار کیا۔

"راستے میں مجھے کُچھ نہیں ہوگا۔ کُچھ ہو گا تو تیرے پاس، یہاں!"

اُس کی بات سے واضح تھا کہ اجیت اُس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے جسے وُہ جانتا ہے۔

"آپ گاؤں کیوں جانا چاہتے ہیں؟ وہاں آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

مَیں نے اُس کی ہٹ کا راز جاننا چاہا۔

"مُجھے دیکھ بھال کی ضرُورت ہے اَور نہ دوا دارُو کی، اَب مَرنا ہے مجھے! لیکن گاؤں میں مَرنا ہے۔ مَیں یہاں مرا تو اڑوسی پڑوسی کہیں گے، اجیت کا باپ مَرا ہے۔ کون؟ یہ کِسی کو معلوم نہ ہوگا! دِلّی میں میرا مرنا اَور کسی جانور کا مَرنا ایک برابر ہے۔ میری کیا پہچان ہے یہاں؟ گاؤں میں میری پہچان ہے۔ کھیوٹ کھتونی میں میرا نام چلتا ہے۔ مَیں شیر سنگھ ہُوں اَور شیر سنگھ ہی جینا چاہتا ہُوں۔" وُہ جُوں جُوں بولتا گیا، اُس کا لہجہ قوی سے قوی تر ہوتا گیا جیسے دورانِ اِظہاریت ترقّی اِظہار کا عَمل ہوتا ہے۔ اچانک وہ بستر پر سے دھن سے اُٹھا اَور اپنے اطراف نگاہِ نُوزائیدہ سے دیکھنے لگا، جس میں اسمِ اعظم کا تاثّر تھا، جِس کے اِشارے سے عَدم نے وُجُود پایا تھا۔ وُہ منظر ہُو بہُو میری آنکھوں میں ہے۔ شیر سنگھ کی مِٹّی کو مٹّی میں مِلے دہے گزر گئے ہیں لیکن مَیں اُسے زِندہ و تابندہ دیکھ رہا ہُوں، نقشِ مُدام کی طرح! ایک مُقدّس آثار کی طرح!

مَیں وہاں سے گھر آیا، وقت کافی ہو چُکا تھا۔ جگت سنگھ، کرتار سنگھ اَور سومِتر سنگھ خلافِ معمُول جاگ رہے تھے اَور میری راہ دیکھ رہے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے ڈھنگ میں مُجھ پر برس پڑا۔

"اتنی رات گئے تم کہاں سے آئے ہو؟" جگت سنگھ نے ڈانٹ کر پُوچھا۔

"کہیں جانا ہو تو بتا کر جانے میں کیا ہرج ہے؟ تجھے دیکھنے کے لئے میں دس بار ستت نگر کے موڑ تک گیا ہُوں! دِلّی میں اتنی گردی ہے کہ جب تک گھر سے جانے والا گھر میں نہ آجائے، وسوسے لگے رہتے۔"

کرتار سنگھ نے ہمدردی سے اُس خطرے کی جانب اشارہ کیا جو اِثنائے سفر منڈلاتا رہتا ہے۔

"کہیں مشاعرے میں چلا گیا تھا کیا؟" سومتر سنگھ نے اِستہزائیہ انداز میں پُوچھا۔

اِتنے میں بھابی بے انت کور اندر سے نکلی اور اپنی تیز طرّار آواز میں بولی، "تو ایسے دیر سے آئے گا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا! تُو دیر سے آتا ہے تو میری جان گھُل گھُل کر آدھی رہ جاتی ہے! کچھ اَن ہونی ہو گئی تو میں چاچی کو کیا مُنہ دِکھاؤں گی؟ کیا جواب دُوں گی؟"

بے انت کور کے ناگہاں نرم رویّے کے پیچھے ایک نیا جذبہ چھپا ہُوا تھا۔ اُن کی بہن پرسنی کچھ دِن پہلے دلّی آئی تھی، مجھے اپنی بیٹی کے لئے پسند کر گئی تھی اور بے انت کور مجھے ہونے والے داماد کے رُوپ میں دیکھنے لگی تھی۔

جب ہر کوئی اپنا اپنا اُبال نکال چکا، میں نے دیر سے آنے کا سبب بتایا اور پھر ہمیشہ کام سے سیدھے گھر آنے کا وعدہ کیا۔ میں بستر پر لیٹا اور اُن کے احساسِ تعلّق پر حیران ہوا۔ اُنہیں میری ذات سے ذرا سی بھی ہمدردی نہ تھی لیکن وہ میری ممات پر کیسے فکرمند تھے! کیوں؟ کیا وہ میری ناداری سے لُطف اُٹھاتے تھے؟ اُسے مُسلسل دیکھنا چاہتے تھے جو میرے مرنے کی صُورت میں ختم ہو سکتی تھی! اذیت خواہی کا جذبہ دُوسروں کی نسبت اپنوں میں مزید شدید ہوتا ہے کیوں کہ یہاں راست مقابلہ ہوتا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے باپ کی آنکھیں نکلوا کر اُسے زندگی بھر قید رکھا۔ وہ چاہتا تو اُسے جان سے مار کر اُس کی اذیت ختم کر سکتا تھا۔

وہاں ایک یُوسف مُراد آبادی تھا۔ بڑے ناموں کی آڑ میں جتنے ذلیل پناہ لیتے ہیں اُن کی تعداد مُصدّقہ مجرموں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ شاعر اور خوش طبع آدمی تھا لیکن اُس کی شاعری اور خوش طبعی یکساں طور پر مُتعدّی تھیں۔ میرے اذیت خواہوں میں وہ سب سے آگے تھا۔ وہ نہایت مذہبی تھا۔ اگر مذہب ملت کا حا؟ ہے تو وہ ملت کی کم اصلی کا مکمل نمونہ تھا۔ ایک دن میں نے اُس سے کہا، "میاں! تم اِتنے پاک باز بنتے ہو پھر بھی مُغلظات بکتے ہو! اِن دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟"

"وُہی رِشتہ ہے، جو ہمارا تجھ سے ہے۔ جو جیسا ہوتا ہے، اُس کے لئے ویسا ہی جذبہ رکھتے ہیں اور ویسے ہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تجھے فخر کرنا چاہیے کہ ہم اتنے بڑے کاریگر ہیں لیکن تجھ جیسے نو آموز پر مرتے ہیں۔"

وہ مجھ سے بات کر کے ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اپنی خیالی خواہشوں کا عملی مظاہرہ کرتا۔ وہ سیوا سنگھ

مستری کی ناک کا بال تھا۔ وہ مراد آباد جاتا تو اُس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا۔ اُس سے اُلجھنا مصیبت کو بلانا تھا۔ تفریح کے دَوران وہ کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ہو جاتا۔ ایک دن ہزاری لال کا ایس۔ڈی۔او اودھورام وہاں آ نکلا جہاں سارے معمار تفریح میں اکٹھے ہوتے تھے۔ یوسف اُنہیں شعر سُنانے لگا۔ ایک دو شعر سلیقے کے سُنا کر وہ اپنی اصلیت پر آ گیا۔

دِل میں آتی ہے کہ تیری مار دُوں
منہ کی مکھّی ریشمی رُومال سے

اُس نے مصرعہ اُولا کنایتاً لُڑھکا لُڑھکا کر یُوں سُنایا کہ بس! میرا مقدُور ہوتا تو مَیں اُس حرامی کا منہ نوچ لیتا۔ اُردو کے بے ہُودہ اشعار سے میری جان پہچان یُوسف ہی کے ذریعہ ہُوئی تھی ورنہ میرا خیال تھا کہ اُردو ایسی شائستہ اور متمدّن زبان ہے جس میں ہرزہ سرائی اور بدگوئی ناممکن ہے۔ میرا یہ جذبہ میری رُوح کی سادگی کی دلیل ہے۔ مَیں اُردو کی طرف اِسی لئے رجُوع ہُوا تھا کہ مَیں اِس کی نفاست و لطافت کا دِلدادہ تھا۔ پنجابیوں میں رواج ہے کہ وہ اچھے معاملے اُردو زبان میں نپٹاتے ہیں اور جھگڑے کھری پنجابی میں۔ اور جہاں دو پنجابی ہوتے ہیں وہ زیادہ تر جھگڑتے ہیں۔ میری نئی تہذیب نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔ مَیں اپنے لوگوں میں بیٹھ کر بات کرتا ہُوں تو میری ہر بات بے محل لگتی ہے۔

مَیں اپنے ایک مخصوص مزاج کا ذِکر کرتا ہُوں جسے مَیں بھُول گیا تھا حالاں کہ وہ میری کئی مصیبتوں کا پیش کار ہے۔ مَیں بُنیادی طور پر اِس قدر شرمیلا تھا کہ وجہ بے وجہ مُسکرا دیتا تھا۔ اِس طفلانہ مُسکراہٹ کا نتیجہ یہ نِکلتا کہ دُوسرے کسی نہ کسی خوش فہمی میں مُبتلا ہو جاتے اور خاص کر چھچھلا ذوق رکھنے والے حضرات اپنے تصوّر میں کچھ زیادہ ہی آگے نِکل پڑتے۔ مَیں اُس پھُول کی طرح تھا جو نظر باز کو دعوتِ دید کے ساتھ ضیافتِ طبع بھی دیتا ہے۔

یُوسف کی بدتمیزی وہیں ختم نہ ہُوئی۔ اُس نے مجھ سے کہا، "صاحب زادے، سُنا ہے آپ ادبی ذوق رکھتے ہیں! کچھ ہو جائے۔"

مَیں اپنی بدنصیبی کے غم میں خاموش رہتا، اور میرا رویّہ میرے بودے پن کی علامت بنا ہُوا تھا۔ مَیں نے خاموشی پر معاملہ ٹالنا چاہا لیکن اودھورام نے اِصرار کیا۔ اُن گلے سڑے لوگوں میں وُہی میرا ہمدرد تھا جو مجھ سے کہتا تھا، "کاکا! چاشنی اور پانی مِلانے سے نہیں ملتے۔ یہ کام لچّوں لفنگوں کا ہے۔ اِس میں کھپنا ہے تو ویسا ہی بننا پڑے گا۔"

میں نے ساحر کی نظم 'مادام' سُنائی۔ کہاں اُس نظم کا پُردرد مفہوم اور کہاں اُن نامعقولوں کا ہجوم! اودھورام نے اُن سب کو پنجابی میں دھر لیا۔ اُسے میری قلیل اُجرت کے بارے میں خبر ہو چکی تھی اور اُن تینوں کی جھنڈلی

وہاں بیٹھی تھی۔ اُس نے اُن پر لعنت، ملامت کی اور میری دہاڑی تین رُوپے مقرّر کروادی۔ مجھے محسُوس ہُوا کہ میرے رُکے رُکے شب و روز چل پڑے ہیں۔

جس آرام سے گریشم گزری، کچھ اُسی طرح برکھا گزر گئی لیکن شرد نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ ہیم اور شِشِر کے لئے مُستعد رہو۔ مَیں نے پانچ روپے میں پُرانا اُونی کوٹ خریدا جو گھِس گھِس کر نمدے کا سا ہو گیا تھا۔ مَیں کبھی اُسے صاف کرتا، اُس پر سے پھُوسڑ چُننا پڑتا ورنہ میں جتنا پھوسڑ جھاڑتا اُس سے زیادہ نکل آتا۔ صُبح کے وقت ہوا کا چلن سائیکل کی رفتار کا مرہُون ہوتا۔ نمدہ کسی حد تک چھاتی کی حفاظت کرتا لیکن دُوسرے اعضا کی حالت غیر ہوتی۔ ناک اور گال برف کے ڈلے بن جاتے اور گھٹنوں کے علاوہ ہر جوڑ جُڑ جاتا۔ سائیکل سے اُترنا، پا بانسے گرنا تھا۔ ٹخنے ایک دم بوجھ نہ لیتے اور اُن کو گرمانے کے لئے چند قدم اِدھر اُدھر ہولے ہولے لینے پڑتے۔ مَیں سُو سُو کرتا، ہاتھ رگڑتا، پاؤں جھٹکتا، چہرہ ملتا اور ناک پکڑ کر اُس کا جماؤ پگھلاتا۔ میری ریڑھ کی ہڈی کی حالت دُوسرے اعضا سے بالکل دیگر ہوتی۔ وہ اپنی پستی سے جیسے اُبھرتی اُسی کی بڑائی ہے۔

قارئین! میرے روز و شب کے نشیب و فراز پُرانے تھے، عنوان بدل گئے تھے۔

باب ۶۳

حالات نے ہر گام اُٹھایا مجھ کو
جو اُن کو تھا مقصُود بنایا مجھ کو
جب دستِ خزاں نے مجھے مسمار کیا
نادیدہ بہاروں نے بُلایا مجھ کو (شاطر)

کام شُروع ہوتا اور کام بند ہوتا، میری حالت کولھو کے بیل کی سی تھی جو صُبح سے چلتا اور چلتا اور چلتا ہے لیکن شام کو اُسی دروازے سے باہر نکلتا ہے، جس سے وہ اندر جاتا ہے۔ میرے بُوٹ سیمنٹ نے کھا لئے اور اُن کے تلے پھُول کر دُوگنے ہو گئے۔ اُن کی حالت گیلی لیدروں کے ڈھیر کی سی تھی جس میں مُردہ چُوہے گاڑے لگتے ہیں۔ ایک بُوٹ کے اگلے ٹانکے ٹُوٹ گئے اور اُس کا پنجہ اُونٹ کے نچلے ہونٹ کی طرح لٹک گیا۔ چلتے ہُوئے پاؤں زمین سے اُلجھتا، اُسے ضرورت سے زیادہ اُٹھا کر چلنا پڑتا جس سے چال میں لنگ پیدا ہوتا۔ وقت کا ٹنے کے لئے مَیں نے تلے کو پنجے سے رسّی سے باندھ لیا۔ وہ عارضی گٹھ جوڑ میری جان پر آیا۔ تلا، پاڑھ کی دراڑ میں پھنسا، پاؤں اُکھڑا اور مَیں سر کے بَل گرا۔ حُسنِ تقدیر! میرا ہاتھ پاڑھ کے بانس پر پڑا جسے مَیں نے دبوچ لیا۔ پریتم سنگھ پاس ہی کھڑا

تھا۔ پہلے وہ مُردہ بے حسی سے دیکھتا رہا پھر زور سے ہنسا اور اُسی ترنگ میں بولا، "واہ! وہ قلابازی ماری ہے کہ بازی گر کی ایسی تیسی کر دی ہے!"

مَیں صدمے سے مفلوج ہو گیا اور پاڑھ کے اُوپر چڑھنے میں ناکام رہا۔ مَیں نے پریتم سنگھ کو مدد کے لئے پکارا، اُس نے اُوپر ہاتھ اُٹھا کر کہا، "بھگوان، تیرا بھلا کرے!" مَیں نے نیچے کُود جانا چاہا لیکن پاڑھ کے نیچے ملبہ پڑا تھا جس پر گرنا ہاتھ پاؤں تڑانا تھا۔ رتن سنگھ مسالے کا تغارہ لئے پاڑھ پر چڑھ رہا تھا، وہ اُسے پھینک کر میری طرف بھاگا، مجھے باہوں سے کھینچ کر اُوپر اُٹھایا اور بٹھایا۔ مَیں جوں ہی بیٹھا، سر چکرا گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور مَیں اپنے گھٹنوں پر ڈھے پڑا۔ مَیں سنبھلا نہیں تھا کہ پریتم سنگھ مجھ پر جُھکا اور اپنا منہ میرے منہ کے برابر لا کر بولا، "چھوٹے بھائی! اُوپر جانا آسان ہے کہ نیچے؟"

"بڑے بھائی! میرے لئے دونوں ہی مشکل ہیں۔" مَیں نے تلملا کر کہا جیسے میرے سانس کی سلک ٹوٹ کر جُڑی ہو۔ واقعی، اُوپر جانے کے لئے حوصلہ درکار ہے اور نیچے رہنے کے لئے ہُنر آنا چاہیے۔ مجھ میں دونوں کی کمی تھی۔

مَیں پریتم سنگھ سے نفرت کرتا تھا جس پر میری مردُودیت کا ملمّع چڑھا رہتا تھا۔ اُس وقت وہ مجھے منہ میں پڑی گندگی کی طرح گھناؤنا لگا۔ ایسی صُورت سے نفسیاتی طور پر نجات پانے کے لئے آدمی کئی بار تھوک لیتا ہے لیکن مَیں ویسا بھی نہ کر سکا۔ وہ میرے ساتھ رہا اور مَیں اُس غلاظت کو نگلتا رہا۔ کسی ناتہذّب عمل کو حدِ برداشت سے زیادہ برداشت کرنا خود تردیدی کی نشانی ہے اور ندرتِ ضمیر کی ترقی کی نفی۔ جو کوئی اِس منحوس صُورتِ حال کا عادی ہو جاتا ہے، وہ ہزیمت ہی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

پریتم سنگھ اشاروں اور کنایوں میں جو کہتا تھا، سُجھا دیتا تھا وہ دراز دستی کی حد تک ہتک آمیز ہے۔ اپنی ذلیل حرکتوں اور بُرے ارادوں کے باوجود وہ گھر جاتے ہُوئے گُردوارہ بنگلہ صاحب میں ماتھا ٹیکنا اور بُھول چُوک کی معافی مانگنا نہ بھُولتا۔ چُوں کہ اہلِ مذہب عبادت گاہوں کو مقامِ مُطہر سمجھتے ہیں وہ مقام سب سے گندے ہیں۔ کبیر کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ میرے بیان کا ثبوت ہے۔

تیرتھ تیرتھ ہم پھرے پایا نہ کچھ بن پانی
مندر میں پاتھر ملے پر بھو صُورت نہیں جانی

اِنسان کی نفسیات اُس کے ماحول سے مُطابقت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا پرست اولیاؤں اور اوتاروں کے سوائے صرف مُردوں کو اچھا گردانتے ہیں۔ اُن کی زوال پرستی! وہ حیات کی بات نفرت سے کرتے ہیں کیوں کہ وہ زندوں کو مقہُور اور مُردوں کو مغفُور جانتے ہیں۔ اُن کے وجُود کی حقیقت، غلاظت کی ہی ہے جو تا حد

رسائی ہر چیز کو مُغلط کر دیتی ہے۔

میری بے ہُنری پُوری تھی! اَور راوی کا بیان ہے کہ بھیک مانگنا ہُنر ہے۔ کوئی جاٹ سویرے سویرے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے نِکلتا، اُسے ایک بھکاری مِلتا جو 'بھلا ہو ججمان!' کہہ کر آگے نکل جاتا۔ اِتفاق یُوں ہوتا کہ اُدھر جاٹ دوپہر کو بھتّا کھانے کے لئے رہٹ پر آتا اَور اِدھر وُہ بھکاری۔ ایک دن جاٹ نے بھکاری سے پُوچھا، کیوں بے! مَیں صُبح سے شام تک مرتا ہُوں، کام کرتا ہُوں اَور رُوکھا سُوکھا ہڑپتا ہُوں! تُو سارا دِن گھُومتا پھرتا ہے، تِنکا نہیں توڑتا ہے اَور بھانت بھانت کا مزہ لیتا ہے۔"

"بھلا ہو ججمان! آپ کو ایسا لگتا ہے تو وُہی کیجئے جو مَیں کرتا ہُوں" بھکاری نے اِحترام سے کہا۔

"ٹھیک ہے! اِس کے لئے کیا کرنا ہوگا مُجھے؟" جاٹ نے ڈانٹ کر پُوچھا۔

"کرنا کیا ہے ججمان! اپنے تہمد کو گیروا رنگوا کر چولا سِلوا لیجئے اَور گھر گھر جا کر اَلکھ جگائیے! بھکاری نے ہاتھ جوڑ کر سمجھا دِیا۔

جاٹ اپنے پیشے سے دُکھی تھا۔ اُس نے تہمد گیروا رنگوا کر چولا سلوایا اَور پہن کر بھیک مانگنے چل پڑا۔ اُس نے پہلی ہی جگہ جہاں الکھ جگائی، ایک عورت چارپائی پر لیٹی آرام کر رہی تھی، بولی، "جاؤ، مُعاف کرو! ہاتھ خالی نہیں ہے۔"

"تُو سامنے پسری پڑی ہے اَور کہتی ہے ہاتھ خالی نہیں ہے؟" بھکاری نُما جاٹ نے اکڑ کر پُوچھا۔

"ابے تو کون ہوتا ہے ایسا کہنے والا؟"

"مَیں کون ہوتا ہُوں؟ تیرا یار!"

اپنی عادت سے مجبُور جاٹ نے گالی دے دی۔ وُہ عورت اُس کا سیاپا کرنے لگی اَور اپنی عزت کی دہائی دینے لگی۔ گلی کوچہ اکٹھا ہو گیا۔ جس نے اپنے بچّے کے چٹکی نہ بھری تھی اُس نے جاٹ کے لات جما دی۔ وُہ گرتا پڑتا جان بچا کر بھاگا۔ جیسا کہ بھکاری کا معمُول تھا وُہ جاٹ کے رہٹ پر آیا اَور جٹی کو اُس کی مرہم پٹّی کرتے پایا۔ "بھلا ہو ججمان!" بھکاری نے اُسے دُعا دی اَور اُس دُرگت کی وجہ پُوچھی۔ جاٹ نے کراہتے ہُوئے اُسے ساری کتھا سُنائی۔ بھکاری نے خُدا لگتی کہی، "آپ کی غلطی تھی ججمان!"

"غلطی اَور میری! تیری تو ماں کی ..."

جاٹ غصّے میں اپنا دَرد بھُول گیا اَور اُسے مارنے کے لئے اُٹھا۔

"شانتی ججمان! شانتی!!" اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بھیک مانگنا ہُنر ہے ججمان! اِس کے اپنے اُصُول ہیں، ججمان!! بھیک نہ دینے والے کو بھی دُعا دیتے ہیں اَور آگے چل پڑتے ہیں۔"

مَیں اپنے ہُنر اور اپنے حریفوں کے ہُنر کا تجزیہ نئے سِرے سے کرتا ہُوں۔ میرا ہُنر، خارا شگافی تھا اور اُن کا ہُنر، شیشہ گری۔

مَیں نے جیسے تیسے چھُٹّی تک وقت گانٹھا اور بُوٹوں کو اُتار کر دیکھا، ٹانکے ٹُوٹے نہ تھے، بودے پتّے کو پھاڑ کر نکل گئے تھے اور تلے میں جُوں کے تُوں محفوظ تھے۔ ایڑی کے ٹانکے ہلتے ہُوئے دانتوں کی طرح تھے جو ہاتھ لگاتے ہی اپنی غیر یقینی کا سُراغ دیتے ہیں۔

"گیان!"

پریتم سنگھ ہاتھ مُنہ دھو کر اپنے کپڑے جھاڑتا ہُوا میری طرف بڑھا اور تیکھی نظر سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہے؟"

مَیں نے بُوٹوں پر سے آنکھیں اُٹھائیں اور ناگواری اور بے بَسی کے مِلے جُلے جذبے سے اُس تیر کا اِنتظار کرنے لگا جو میرے اذیّت خواہ کے کمان کی طرح کھِچے ہونٹوں سے چھُوٹنے والا اور میری رگِ ہستی کو لہولہان کرنے والا تھا۔

"اِن بُوٹوں کو سنبھال کر رکھ لے، آنے والی نسلوں کی اِطلاع کے لئے! وہ دیکھیں گی اور فخر کریں گی کہ اُن کے پُرکھے کس شان سے رہتے تھے!"

اُس نے اپنی قیمتی رائے دی۔ 'میری قیمتی رائے ہے' اُس کا تکیہ کلام تھا۔

"ٹھیک ہے، ایسا ہی کروں گا!"

اپنی غارت گرانہ معیشت کا بھرم باندھنے کے لئے مَیں نے اُس کی بات کو یکسر تسلیم کر لیا۔

"ایسا کرنا ضروری ہے! ورنہ تیرے ساحر کے عقیدے کا بھرم نہ رہے گا۔ ڈی۔ ایم۔ سی۔ کو جھگیوں اور جھونپڑیوں کے بجائے کوٹھیوں اور بنگلوں کو مِسمار کرنا چاہیے کیوں کہ جھگیاں جھونپڑیاں آنے والے وقتوں کے آثارِ شریف ہیں اور کوٹھیاں بنگلے منحوس تعمیرات۔"

میرے دِل میں ٹیس اُٹھی، خالص اپنی ناداری کی ٹیس۔ مَیں نے اُس کے بُوٹوں کو حسرت سے دیکھا، اُس جذبے کو بڑی مُشکل سے کچلا جو اُس کے طعنے کا رَدِّ عمل تھا اور میری رقابت کا حاصل۔ مَیں کچھ نرم پڑا۔ میرے دِل نے مُجھے سمجھایا "تُو جن لوگوں کا حِصّہ ہے، وہ متواتر تجھے مُسترد کرتے ہیں اور تو ہے کہ اُن سے لگا پھرتا ہے۔ اُنہیں چھوڑ کر تو ہم مشرب لوگ کیوں نہیں تلاش کرتا؟" مَیں نے اپنے دِل کے جُرأت آمیز سُوال کا جواب، ترحم آمیز مُسکراہٹ سے دیا اور اپنے ٹُوٹے ہُوئے بُوٹوں کو دیکھا، اُنہیں پھینکنا چاہا لیکن پھینک نہ سکا اور اُٹھا کر سائیکل کے کیریئر میں اڑس لیا۔ مَیں سائیکل لئے پیدل چلنے لگا، ابھی تین مُورتی مارگ کے بیچ ہی تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے موٹر

کیڈ کی پائلٹ کار شور مچاتی گزری اور سڑک پر گشت لگاتے سپاہیوں نے ٹریفک روک دیا۔ میں وہاں کھڑا کھڑا سوچنے لگا، "جو لوگ عوام کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، عوام کے بل بوتے پر اپنے کمال کو پہنچتے ہیں، وہ اُن کی نفی کس بے رحم شوکت سے کرتے ہیں۔" میرے خیال کی شدت! میرے سامنے سے وہ قافلہ گزر گیا لیکن مجھے ہیولا سا نظر آیا۔

شنکر روڈ پر بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک موچی بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے کیریئر سے بوٹ نکال کر اُسے گانٹھنے کو دیئے۔ وہ اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور پرانے بوٹ کی ایڑی مرمت کر کے اُسے شیشے کے ٹکڑے سے پالش رہا تھا۔ اُس نے میرے بوٹ دیکھے اور سمجھا کہ میں اُسے بنا رہا ہوں۔ اُس نے کچھ کہے سُنے بغیر غصے سے بوٹ اُٹھائے اور پرے ایک طرف پھینک دیئے۔ اُن کی حالت ڈھکی چھپی نہ تھی۔ میں موچی کے رویئے پر ہنس پڑا اور اُس شرم ناک حالت میں بھی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میں نے اپنے پھٹے ہوئے پاتابے جھولے میں سے نکالے اور بوٹوں پر پٹخ دیئے۔ مجھے سنجیدہ پا کر موچی کا غصہ حیرت میں بدل گیا۔ اُس نے مُنہ کھولا لیکن چُپ رہا۔ میں وہاں سے سیدھا صدر بازار پہنچا اور نئے بوٹ، اور نئے پاتابے خرید کر پہنے۔ مجھے لگا کہ میں نے اپنے گلے سڑے پاؤں کاٹ کر پھینک دیئے ہیں اور نئے لگا لئے ہیں۔ دُوسرے دن میں کام پر گیا، پریتم سنگھ کے آنکھیں مٹکانے کا انداز ہی الگ تھا۔ اُس کی "ہوں ہوں، جی جی" کے جتنے معنی تھے، وُہی بہتر جانتا ہو گا۔ کاریگروں کی بھیڑ میں وہ اکیلا تھا جو نئے بوٹ خریدتا تھا اور دھوبی دُھلے کپڑے پہنتا تھا۔

اُدھر وہ بلندی اور اِدھر یہ پستی! اور اس پستی سے زیادہ پستی بھی تھی۔ مجھے نئے بوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر رتن سنگھ یوں خوش ہوا جیسے کسی حسرت گزیدہ کی زندگی میں اُمید جھلک آئے۔ اُس نے اُمیدوارانہ انداز میں پوچھا، "سردار جی، آپ نے پُرانے بوٹ کیا کئے؟"

"اُن کو کیا کرنا تھا؟ پھینک دیئے!"

میری بے نیازی میں شانِ تونگری تھی۔

"آہ! کیوں؟"

اُس کی آہ میں ڈوبا ہوا سوال جواب طلب نہ تھا۔ میں چُپ رہا۔

"مجھے دے دیتے!" اُس نے مِنّت طلب لہجے میں کہا۔

"وہ تو بالکل خراب تھے!" اُس کی ضرورت کی تاب نہ لا کر میں اُسے ٹالتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے!" اُس نے اپنی ضرورت کی اہمیت جتلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے! میں آج شام کو دیکھتا ہوں۔ وہ جہاں پھینکے تھے وہیں پڑے ہوں گے۔ کون لے جائے گا

"نہیں؟" میرے احساس نے مجھے، اُسے دلاسا دینے پر مجبور کیا۔
اُس کی اُس نے اُس کے چہرے کو جگمگا سا دیا۔ اُس نے تغارہ اُٹھایا تو اُس کی حرکت میں موسیقی کا سا لوچ تھا۔ اُسے خوش دیکھ کر میں خود بھی کسی حد تک مہک گیا۔
کام کے بعد گھر جاتے ہوئے میں اُسی راستے سے گزرا اور وہاں بوٹ نہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ ضرور موچی نے اٹھا لئے ہیں۔ میرا ایسا سوچنا عین طبیعت تھا۔ جو گاہک سائیکل کے نئے پرزے ڈلواتے تھے وہ پرانوں کو کسی بھی قیمت پر بیچنا چاہتے تھے۔ اُن سب کے لئے ہمارا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ یہ ہمارے کس کام کے! آپ لے جاؤ، کہیں بک سکتے ہیں تو بیچ لو۔ شاید ہی کوئی گاہک ہوتا جو پرانے پرزے لے جاتا۔ اُن پرانے پرزوں میں سے کئی کم قیمت پر بک جاتے اور باقی وزن کے لحاظ سے کواڑی خرید لیتا۔
میں نے موچی کی طرف دیکھا۔ وہ پیروں میں جوتا پکڑے سیتا اور بیچ میں مجھے بھی دیکھتا جیسے اپنے کسی تحقیق پسند جذبے کی رواداری میں مصروف ہو۔ وہ جیسے ٹوچنی گھساتا، اُس کے مُنہ میں دھاگا اُڑستا، اُسے کھینچ کر کستا، اُس سے لگتا کہ وہ کوئی اناڑی ہے۔ اُس کی ساری کاریگری اُس کی بے توجہی کھا گئی لیکن اُس کی مجھ میں دلچسپی بدستور رہی جیسے وہ میرے بارے میں کوئی ناپاک راز جاننے پر مُصر ہو۔ بوٹوں کی جگہ کالے بھورے رنگ کے گولے سے پڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور میری سمجھ میں آیا۔ وہ گولے میرے بوٹ تھے جو دن کی دھوپ کھا کر کیا سے کیا ہو گئے تھے۔
"کیا بات ہے؟" موچی نے مہک کر پوچھا جیسے اُس نے میرا عزم جان لیا ہو لیکن مجھ سے تصدیق چاہتا ہو۔
"وہی جو تم سمجھ رہے ہو!" میں نے اُسے شہ دیتے ہوئے کہا۔
"لگتا ہے خریدار مل گیا ہے کوئی؟"
"بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے!"
"زیادہ کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے جائیو۔"
"ضرور، ضرور! اپنے بھائی کا خیال بھائی نہ کرے گا تو کون کرے گا!"
میں نے اپنی خوش طبعی سے اُس کی زندہ دلی کو بڑھا دیا۔
"تم سچ مچ رودی دا بیئے ہو!؟"
میرے ایجاد کردہ رشتے نے اُسے میرے بارے میں سنجیدہ بنا دیا۔ اُس نے اپنے پیچھے سے پٹڑا اٹھا کر آگے رکھا، مجھے بیٹھنے کو کہا اور پہلے سے بھی آہستہ روی سے کام کرنے لگا۔

اپنے آپ کو بڑی شخصیتوں سے منسوب کرنا خبطِ عام ہے اور یہ خبط اُن میں شدید تر ہے، جن کی اپنی حقیقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ منسوب کردہ انفرادیت، فریبِ نفس سے عبارت ہے اور آدمی کی سب سے بڑی مردُودیّت۔ کئی ریاکار سادہ آدمی کے اِس جذبے سے جیسے فائدہ اُٹھاتے ہیں اُس کی مثال عالم گیر ہے۔

"ہاں بھئی، مَیں روی داسیا ہی ہُوں!"

اُسے مکمّل مرعُوب کرنے کے لئے مَیں نے جھُوٹ بولا۔

"ہمارے بزرگ روی داس کتنے بڑے بھگت تھے! اُن کی سِل کے نیچے گنگا بہتی تھی۔"

اُس نے اپنی سِل کو احترام کی نظر سے دیکھا جیسے ناگہاں اُسے اُس کی تقدیس کا علم ہُوا ہو۔

اِتنے میں کوئی گاہک آیا، اُس نے اپنا جُوتا اُسے مرمّت کرنے کے لئے دیا اور جلدی کرنے کو کہا۔

"اچھّا تو مَیں چلتا ہُوں!" مَیں نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"آتے جاتے مِلتے رہنا، بھائی صاحب!" جُوتے کا مُعاینہ کرتے ہُوئے موچی تپاک سے بولا۔

"کیوں نہیں، ضرور!" مَیں نے آگے جاتے ہُوئے پیچھے دیکھ کر کہا۔

مَیں گنگا رام ہوسپیٹل روڈ سے ہوتا ہُوا اجمل خاں روڈ پر پہنچا اور وہاں سے ریگرھ پورہ کی جانب مُڑا۔ رتن سنگھ کا چہرہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ مَیں نے بڑا کڑا فیصلہ کیا، صدر بازار کا راستہ لیا اور رتن سنگھ کے لئے بُوٹوں کا جوڑا خریدا۔ اُس حالت میں میرے لئے ایسا کرنا، حاتم کی گور پر لات مارنا تھا لیکن میرا جذبہ اِس قدر بھرپُور اور خالص تھا کہ مَیں نے بُوٹوں کے ساتھ پاتابے بھی خریدے۔ دُوسرے دِن مَیں معمُول سے پہلے کام پر پہنچا اور حسبِ اُمید رتن سنگھ کو میرا منتظر پایا۔ مَیں نے اُسے وُہ تحفہ دیا جس کا اُسے اندازہ تھا اور نہ مجھے۔ پہلے تو اُس نے یقین نہ کیا، کیا تو بے اختیار رو دیا۔ اُس کے آنسو میرے جذبے کی طرح کتنے طبعی اور اصلی تھے! وُہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ اُس نے مجھے پرنام کیا تو میرا دِل بھر آیا۔ حُسنِ بیاں اور حُسنِ معنی الفاظ کو دائم الاثر بنا دیتے ہیں لیکن رتن سنگھ کی خاموش خُوش خلقی کی سحر طرازی وُہی ہے جو کہ تھی۔

وُہ مجھے راستے میں مِلتا تو راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور پرنام کرتا۔ میرے ساتھ کام کرتا ہوتا تو میری ضرورت بن کہے سمجھ لیتا اور جہاں تک ممکن ہوتا، میرا ہاتھ بٹاتا۔ میرے لئے یہ رُوح افزا اور انوکھا تجربہ تھا۔ آج تک کسی نے نہ میری اِتنی عزّت کی تھی اور نہ ایسی صُورتِ حال سے پیدا شُدہ کیفیّت سے میری واقفیّت تھی۔ مَیں اپنے تایا جی اور ماں سے ایسا برتاؤ کرتا تھا لیکن اُس جذبے کا ردِّعمل الگ ہوتا تھا۔ مَیں دونوں جذبوں کا ازسرِنو تجزیہ کرتا ہُوں، پہلا جذبہ خود نُما تھا اور دُوسرا خُود آرا۔

مَیں اُس ہجوم میں واحد فرد تھا جو تعلیم میں کوئی درجہ رکھتا تھا۔ میرے وُہ ہم عصر جو اُستادوں کے ڈنڈوں کی تاب نہ لاکر فصلوں میں چھپتے تھے، موٹے دماغوں کی وجہ سے فیل ہوتے تھے، کم عُمری میں گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہُوئے تھے، وُہ تمام کامیاب بڑھئی، کامیاب وائنڈر، کامیاب موٹر مکینک کامیاب ٹرنر، کامیاب ٹیلر، کامیاب معمار ـــ نابغۂ روزگار تھے۔ وُہ میرے لحاظ سے اُدھورے سہی، اپنے لحاظ سے پُورے تھے۔ اُن کی پو بارہ ہی پو بارہ تھی او وُہ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور اچھا رہتے۔ وُہ مجھ سے چالاک تھے اور اذیّت رساں بھی۔ وُہ اپنی تعلیمی شکست کا بدلہ مجھ سے یُوں لیتے کہ مجھے 'میٹرک صاحب' کے خطاب سے بُلاتے۔ یہ دو لفظ، رذالت کا کتنا بڑا صحیفہ ہے! مَیں ہی جانتا ہُوں۔ وُہ زندگی کا ایک معرکہ ہار گئے تھے لیکن جنگ جیت گئے تھے۔ وُہ میری ہار سے وُہی تسکین لیتے جو کسی وقت اُن کی ہار سے مَیں، وُہ مجھے ویسا ہی پھسڈّی سمجھتے، جیسا مَیں اُنھیں۔ اُن کی آنکھوں سے وُہی حقارت آمیز بے نیازی برستی جس پر کبھی مَیں ناز کرتا تھا۔ مزید برآں وُہ ساری باتیں جو برسوں پُرانی اور میری بدنامیاں تھیں، اُن کی وجہ سے تر و تازہ تھیں۔ تہذیب و تمدّن کی مزیّن آرائش کے پیچھے آدمی اپنے وحشی اجداد سے زیادہ مصنُوعی، زیادہ قدیم ـــ زیادہ ننگا ہے کیوں کہ پہلے یہ جو کُچھ تھا، تھا، اذیّت خواہی کے جذبے سے بے بہرہ تھا۔

میری مظلُومیت نے مجھے انسان بیزار اور حیوان پسند بنا دیا تھا۔ حیوان کے سینے میں جیسا قابلِ اعتبار دِل ہے اُس کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے اُسے آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اِتنا سادہ لوح اور بے ٹوک ہے کہ اِسے جیتنا بے حد آسان ہے۔ اِس کی قُربت مسرّت ہے اور مسرّت کے سوائے کُچھ اور نہیں ہے۔

تایا جی کہتے تھے، "آدمی کی زندگی اپنے لئے فرض شناسی اور دُوسرے کے فیض رسانی ہے۔ جو کوئی اِس معیار پر پُورا نہ اُترے، وُہ سماج کا ناکارہ انگ ہے۔ وُہ خُود پر بوجھ ہے اور دُوسرے کے لئے مضرّت رساں۔" یہ بات مجھ پر سو فیصد پُوری اُترتی تھی۔

اِخراجات کم کرنے کے لئے مَیں ہوٹل پر 'ماہواری روٹی' کھانے لگا۔ مَیں روٹی کھاتا ہُوا چند نوالے چُرا کر جیب میں رکھ لیتا اور اپنے محلّے کی گلی میں پہنچ کر کُتّوں کو آواز دیتا۔ ایک کے پیچھے ایک، وُہ بھاگتے آتے، مجھے گھیر لیتے اور دُم ہلاتے، کرلاتے، چاٹتے، لوٹتے، مجھے مہکا دیتے۔ مَیں نے ہر کسی کو اُس کے رنگ کی نسبت سے نام دے رکھا تھا۔ مَیں اِسے مُنہ میں لُقمہ دیتا، اُسے لُقمہ دکھا کر دُور پھینکتا، باری باری ہر کسی سے پیار کرتا اور اُن سب کو مسرُور دیکھ کر اپنا غم بھُول جاتا۔ مَیں خُوش و خرّم گھر پہنچتا، بستر پر لیٹتا اور خیالوں کی دُنیا بساتا اور سونے تک اُسی کیفیّت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا۔

باب ۶۴

ہر اک زمین پہ ہوتا قتلِ انساں کا
یہ کیا ضرور زمین وہ زمینِ مقتل ہو (شاطر)

میری زندگی بدصورتی کی طرح ناقابلِ برداشت تھی۔ معمول وہی تھا لیکن عذاب جدا جدا۔ رینگتی رینگتی جوئیں، سڑے سڑے کپڑے، گھاؤ گھاؤ ہاتھ، کرو ہیاں کرو ہیاں پیر (کرہی، پاؤں گیلا اور گندہ رہنے سے گھائیوں کا زخمی ہونا)، اُجڑا اُجڑا چہرہ، تھکے تھکے سانس، اُداس اُداس جذبات ... میری ہر مصیبت میرے لئے جگن ناتھ رتھ تھی۔ (جگن ناتھ رتھ کے بارے میں روایت ہے کہ جو آدمی اُس بوجھ کو ڈھوتا ہے اور پھر اُس کے نیچے آ کر مرتا ہے، وہی بیکنٹھ سدھارتا ہے) متواتر نرم گرم سننے سے میں اِک نئے طریقے سے بدلا تھا۔ میں بظاہر بُردبار تھا لیکن اندر چڑچڑا۔ ایسے آدمی کا اپنے آپ سے برتاؤ، بدپانی کا سا رہتا ہے، جو بدرَو سے زیادہ غلیظ ہوتا ہے۔

پریتم سنگھ کا چوگِڑیا ہربنس لال غیر حاضر تھا۔ میری شامت آئی اور مجھے اُس کی جگہ جھونک دیا گیا دُوسرے تینوں پورے کاریگر تھے۔ وہ اینٹ اُٹھانے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا جائزہ لیتے، اُس کے ٹیڑھے اور سیدھے پاسے کا فیصلہ کرتے، اُسے اُٹھاتے، ہوا میں اُچھالتے، ویسے ہی واپس پکڑتے جیسے سُوت میں ہوتی۔ اُن کی آنکھیں، ہاتھوں ہی کی طرح ہُنر پروردہ تھیں۔ اِدھر ہاتھ، اینٹ توڑنے کے لئے بسُولی اُٹھاتا اُدھر آنکھ چوٹ لگانے کا نشان چُنتی، چوٹ کی سختی طے کرتی اور ہاتھ کو مکمل ہدایت دے کر پلکوں کے پیچھے چُھپ جاتی پھر جیسے کام پر نظر رکھتی وہ اُسی کی ہُنرورزی تھی۔ ہاتھوں اور نظروں میں جو رِدَم تھا وہ مشقِ ہُنر کا کمالِ بلوغ تھا۔ بایاں ہاتھ اینٹ کو چیٹا پکڑتا، دایاں اُس کے درمیان ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک بسولی چلاتا جُوں ہی عمودی حصّے پر پہنچتا، بایاں اُس کا پاسا اُس سے زیادہ تیزی سے پلٹتا جس تیزی سے دایاں کام کرتا ہوتا۔ جب بسولی چپٹے سے کھڑے، کھڑے سے چپٹے اور چپٹے سے کھڑے حصّے پر پہنچتی، وہ گھڑی ایجاز و اِطناب کی مِلی جُلی تصویر ہوتی۔ ایک ہلکی سی چوٹ اس سرے پر، دُوسری اُس سرے پر اور اینٹ دو ڈِھلیوں (ڈِلی، آدھی اینٹ جسے درز کا تسلسل توڑنے کے لئے لگاتے ہیں) میں چِر جاتی۔ دونوں

میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور درستی کی مثال ہوتی۔ اُن کاریگروں کے اعضا غلط حرکت شاذ ہی کرتے اور اگر کرتے تو اُن کی مقتدی حرکت اُسے درست کرنے کی صلاحیت رکھتی۔ اُن کا فخرِ پیشہ کمالِ مقصود کا حامی تھا اس لئے دونوں ایک دوسرے کے دردمند اور بہی خواہ تھے۔

میری بے ہنری میری جاں کنی تھی۔ میری آنکھوں میں کرچیں پڑتیں اور ہاتھوں پر چوٹیں لگتیں۔ میرا ہر عمل میرا خیر مقدم یوں کرتا جیسے سنگِ راہ، راہ گیر کا کرتا ہے۔ میں کئی بار ہمّت کر کے اپنے حریفوں کے برابر کام کرتا۔ وقتی طور پر ایسا کرنا آسان تھا لیکن اُس مقام پر ڈٹے رہنا مشکل۔ جہاں مجھ سے کوتاہی ہوتی میں پیچھے رہ جاتا۔ مقابلے کے کام میں کسی عمل کو دُہرانا دورانِ سفر رُک رُک کر چلنے کے مساوی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اڑے رہنے کا ایک ہی مؤثر طریقہ ہے۔ جو قدم اُٹھاؤ، نپا تُلا اُٹھاؤ اور آگے بڑھو لیکن میری حالت اُس بچّے کی سی تھی جو ہاتھ پاؤں نکالتا ہے تو ہر گام پر سہارا مانگتا ہے۔

بیرونی سامان اندرونی وجدان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اجزائے تغیّر کو جنم دیتے ہیں۔ یہ شوقِ ظہور میں حُسنِ ترکیب سے گزرتے ہیں، لہو کی نفسیات بدلتے ہیں جو اعضا کو نئے سِرے سے ترتیب دیتا ہے، اُن میں وہ خوبیاں بھرتا ہے جو ضرورتِ وقت کی متحمل ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ خوبی پیدا کرنے کے بارے میں سوچتا، جس کی عدم موجودگی میری خواری اور بدنامی تھی۔ میرے داخلی وجدان اُدھورے تھے شاید اسی لئے میرے ہاتھ جیسے تھے ویسے کے ویسے رہے۔ میرے ساتھی اپنی چُنائی کی درزیں ساتھ ساتھ بھرتے اور یوں ایک کام ختم کر کے دوسرا شروع کرنے تک کچھ آرام کر لیتے۔ میری اُلجھن بدستور تھی جسے میں اپنی اُنگلیوں کو ہڈیوں تک گھسا کر سُلجھا نہ سکتا۔ میرے خوب صورت ہاتھ، بدصورت انگ تھے مزید میرے لئے باعثِ ننگ تھے۔ میری آنکھیں اچھے، بُرے کام میں فرق کرتیں لیکن اپنے کردار میں ناقابلِ ارتکاب رہتیں۔ ایک آنکھ مُوند کر کام پر نظر ڈالنا ایک ہُنر ہے۔ میں اِس ہُنر سے بھی فائدہ نہ اُٹھا پاتا۔ کیوں؟ میں کیسے تشریح کروں! بنتے بنتے میرا عمل پُجاری کی جبّہ سائی کی طرح طریق بن گیا جسے میں بے فائدہ دُہراتا۔ میں مکمّل، نامکمّل تھا جس کی تلافی کامل عمل تھا۔

چوں کہ میں بے ہُنر تھا ممکن ہے کہ میرے قارئین مجھے اپنے ساتھی ہُنروروں کے بارے میں متعصّب سمجھیں، ایسا ہرگز نہیں۔ میں نے انھیں بھگتا ہے اِس لئے اُن کی نفسیات کو متعدّد پہلوؤں سے سمجھا ہے۔ وہ بڑھ چڑھ کر کام کرتے تھے، مجھ سے زیادہ کماتے تھے لیکن اِس میں اُن کی باطنی خوبی کو دخل نہ تھا۔ اُن کی صلاحیت درپردہ بربریت تھی۔ تمدّن نے اِنسان کی رذیل جبلّتوں اور ادنیٰ جذبات کو نہایت اعلیٰ نام دیئے ہیں اور انھیں زندگی کی رُوحِ رواں کہا ہے۔ اُس دِن لگاتار دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آگے دوڑ اور پیچھے

چوڑ ہو گیا۔ مَیں دیوار کے اَندر کی جانب تھا اَور پریتم سنگھ باہر۔ وُہ اپنی وَرزیں بنا کر اَندر آیا اَور میرے کام پر نظر بازی کرنے لگا۔ مَیں نے کُچھ گھبرا کر کام کی جانچ کی اَور اپنی ناتجربہ کاری کے پھل کو دیکھا اَور اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا تاکہ اُسے اُس کی تجربہ کار نظروں سے بچا سکوں۔

"واہ! گیان تیرا پانسہ ایسا ہے جیسے بَیل پیشاب کرتا ہُوا گزرا ہو۔"

پریتم سنگھ کی تضحیک پرور داد کا ڈنک اُس مستانہ قہقہے سے کم تھا جو اُس نے بعد میں مارا۔ وُہ مظلوم کے زخموں کی دِل کشی ہے جو ظالِم کو تشدّد پر اُکساتی ہے اَور اُسے گہری سے گہری چوٹ لگانے پر آمادہ کرتی ہے، وَرنہ اُن کی مکروہیّت اُسے ایسے نابُود کر دیتی جیسے پیپ، صحّت مَند پٹھے کو۔ آدمی ایسا نامہ نگار ہے جو وقت بے وقت اپنے بارے میں اچھی اَور دُوسرے کے بارے میں بُری خبر سُناتا ہے۔ سیوا سنگھ اُدھر سے گُزر رہا تھا، پریتم سنگھ نے اُسے وَرغلاتے ہُوئے کہا، "مستری جی، آیئے، ایک نظّارہ دیکھئے!"

"کیا ہے؟" اُس نے سرسری اَنداز سے پُوچھا۔

"دیکھنے کی چیز ہے!" اُسے مُتوجّہ کرنے کے لئے پریتم سنگھ تجسّس بھرے لہجے میں بولا۔

وُہ اُس سے مُتاثّر نہ ہُوا اَور بُلاوے کو نظر اَنداز کر کے آگے چلا گیا لیکن لوٹ آیا۔

"کیا بات ہے؟ خواہ مخواہ میرا وقت برباد نہ کیا کرو۔" اُس نے پریتم سنگھ کو ڈانٹ کر کہا۔

"اُدھر دیکھئے!"

اُس نے دیوار کی طرف اِشارہ کیا اَور اُدھر مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سیوا سنگھ اُس کا مطلب نہ سمجھ سکا اَور دیوار کے پیروں میں پڑے مسالے کو دیکھ کر غُصّے سے بولا، "کِس کا کام ہے؟"

"جی میرا!" مَیں نے جھینپ کر نہایت میٹھے لہجے میں کہا۔ وُہ کسی حد تک پسیجتا نظر آیا۔

"کِتنا مسالا نیچے گرایا ہے! پُورا اُٹھاؤ اَور ہودہ میں ڈال کر آؤ۔ دیوار کے پیروں میں بوریاں بچھا لیا کرو، مسالا اُٹھانے میں آسانی رہتی ہے۔"

وُہ یہ نصیحت کر کے جانے لگا اَور مَیں تسلے میں مسالا اُٹھانے لگا۔ پریتم سنگھ نے اُسے آگے بڑھ کر روکا اَور بے کم و کاست کہا، "وُہ تو ہے جو ہے! یہ دیکھئے مستری جی!" اُس نے دیوار کو ہاتھ لگایا اَور ایک آنکھ مُوند کر دیکھا۔

اِنسان کی حیوانی جبلّت مائل بہ کمال ہو کر کیفیّتی تبدیلی سے شناسائی پیدا کرتی ہے اَور اپنے طرۂ اِمتیاز میں قوّتِ ایجاد بنتی ہے اَور ہُنر کہلاتی ہے۔ اِسی طرح عوامل اَور مظاہر کے اختلاط سے اِنسان ظہور میں

آتا ہے جو بقدرِ ظرف اِنسانیت سے رِشتہ نبھاہتا ہے۔

سیوا سنگھ دیوار کے برابر کھڑا تھا، اُس نے وہیں سے اُدھر دیکھا اَور ایک ہی نظر میں سارا مُعاملہ سمجھ لیا۔ وُہ گالیاں دینے لگا اَور مَیں مسالا اُٹھاتے ہُوئے نیچی نظر کئے سُننے لگا۔ کاش، بات وہیں ختم ہوجاتی! لیکن میری بدبختی کو بھی تو آنا تھا۔ یہ اپنے جلو میں اپنے سارے ارکانِ خاندان، بربادیوں، دُکھوں آنسوؤں، محرُومیوں، ذِلتّوں، فاقوں۔۔۔ کے ساتھ آتی ہے۔

سیوا سنگھ کو کیا سُوجھی! وُہ کَنْولی لے کر دیوار سیدھی کرنے لگا۔ سیمنٹ کی چُنائی گیلی گوبر اَور سُوکھی پتھر مشہُور ہے۔ ٹھونکنے اَور پیٹنے سے گُل سنڈے بہہ گئے، دیوار کُبڑی ہوگئی اَور وُہ بَلا بھی میرے ہی سَر آئی۔

"تُو یہاں سے دفع ہوجا!"

اُس کی آواز باریک اَور تیز تھی، غُصّے سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وُہ ہاتھ سے اِشارہ نہ کرتا تو اُس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آتا۔ مَیں کہاں دفع ہوتا! وہیں کھڑا رہا۔

"تُو نے سُنا نہیں! کہیں مَر رہنا، اِدھر مُنہ نہ کرنا!"

مَیں شرم سے گڑھا جارہا تھا جب کہ میرے ساتھی سَربُلند محسُوس کر رہے تھے اَور کئی مُنہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک رہے تھے۔ سیوا سنگھ کے مُنہ میں جو آیا، بکتا گیا۔ اُس کا لہجہ اُس کے اِرادے کی طرح صاف تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ سَو بات سے ایک چُپ بھلی! مَیں اِسی پر عمل کرتا رہا۔

"تُو اپنے آپ جاتا ہے کہ چوکیدار سے دھکّے مَرواکر نکلوانا پڑے گا؟"

میری خاموشی سے وُہ کُچھ نرم پڑ گیا اَور دیوار کو ایسے دیکھنے لگا جیسے اُس ناگوار مسئلے کا حل سوچ رہا ہو۔ اُس نے بےاِرادہ میرے دُشمن سے پُوچھا، "اِس کا کوئی عِلاج ہے؟"

"سیوا سیاں! کہتا ہے اِس پندری پر پُوری دِہاڑی لُوں گا!" میری بات بنتی دیکھ کر اُس نے سے بہکایا۔

"اَچھّا! یہ گانڈمَرواکر دو روپے نہیں لاسکتا اَور پُوری اُجرت کی بات کرتا ہے!"

وُہ پِھر بِپھر گیا اَور جیسے مارنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ اُس نے ہاتھ روک لیا لیکن مجھے ایسا ذلیل کیا کہ بس! مجھے لگا کہ کاریگر کی اَولاد کو اَوزار برتنے کا ہُنر اپنی ماں کے پیٹ ہی میں سیکھنا چاہیئے ابھیمنیو کی طرح۔ وُہ لمحہ بڑا نازک تھا! میری رگوں میں بغاوت کا جذبہ لاوے کی طرح دوڑ گیا۔ اِنسان اِس لئے شریف نہیں ہے کہ شرافت کی اِہانت کے خیانت سے زیادہ اِمکان ہیں۔ کِسی نے خُوب کہا، ننگے سے بھگوان بھی ڈرتا ہے۔ اُن ننگ خلائق میں میری کیا بِساط ہوسکتی تھی؟

میری بے کسی میں کوئی مجھ سے میٹھا بول بولتا تو میری تقصیرِ ذات سے تحقیرِ ذات کا جذبہ ابُھرتا میرا اگرتا ہُوا حوصلہ سنبھلتا اور مَیں مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔ دُوسری صُورت میں میری حالت ریت کی دیوار کی سی ہوتی جو اڑنگا ہٹاؤ تو اپنے ہی بوجھ سے ڈھے پڑتی ہے۔ مَیں اپنے بے سروپا حالات میں ایک نرالے تجربے سے فیض یاب ہُوا تھا جس کا بیان ضروری ہے کیوں کہ اُس نے مجھے کسی حدتک بے دلی کے اندھیرے میں گم ہونے سے بچایا تھا۔ مَیں رُوحانی پستی کے پاتال میں تھا۔ مَیں رکاب گنج کے پاس سے گزر رہا تھا جہاں ڈھاڑی، بندہ بہادر کی رزمیہ سُنا رہے تھے۔ اُن کے طرزِ بیاں سے نفسِ مضمون اِس قدر پُر اثر ہو رہا تھا کہ میری کایا ہی پلٹ گئی۔ مَیں "جے گوبند، جے گوبند" کا نعرہ لگاتا ہُوا دوڑنے اور مُکّا اُوپر لہرانے لگا۔ میرے چلن کا خُفیہ ردِّ عمل یہ تھا کہ مَیں بھلے مر جاؤں لیکن میرے جذبے کا خروش ہوا کی موجوں میں دائم قائم رہے گا جیسے حیاتِ موجودہ کے بعد حیاتِ آیندہ۔ راہ گیر مجھے حیرت سے تک رہے تھے۔ چُوں کہ مجھے نُصرت کی عظمت اور اُس سے منسوب عزّت کا جذباتی تجربہ نہیں تھا، تماشائیوں کے مُتجسّس رویّے سے میرے ہیجان کی تحریک کو تقویّت ملی اور میری رفتار میں مزید تیزی آگئی۔ پکّی سڑک پر ننگے پاؤں دوڑنے سے میرے تلوے گھس گئے اور آبلوں کی طرح جلنے لگے۔ میری تکلیف میرے جوشِ عمل کے لئے اکسیر ثابت ہُوئی۔ مَیں ایسٹ راجندر نگر کے قریب پہنچا اور وہاں ایک سدِّ راہ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مَیں اُسی سرگرمی سے اُٹھا لیکن میرے مجروح پیروں نے میرا ساتھ نہ دیا۔ یہ وُہ مقام تھا جہاں میرے جنُونی جذبے کا جادُو ٹُوٹا۔ مَیں اپنی پستی میں اُن جیالوں کے کارنامے یاد کرتا جو اپنے حوصلے سے ہر مُصیبت سے گزر گئے تھے۔ اُس نفسیاتی کیفیّت کی ایک سُوئی جذبات کی بے تصریح تُندی تھی جس کا افکارِ تخلیق سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ میری یہ حالت میرے جذبۂ انتقام کو بھڑکاتی اور مجھے تشدّد پر اُکساتی، جس کا حاصل صرف ابطال ہے، اپنا یا پرایا۔ وُہ لوگ جو اپنا مُقابلہ پُر اتنک بیر پُرشوں سے کرتے ہیں، وُہ سب سے زیادہ کھوکھلے اور قابلِ مذمّت ہیں۔

میرا اڑیل پن! مَیں لتاڑا اور پھٹکارا ہُوا وہیں کھڑا رہا۔ میرے ضدّی رویّے نے سیوا سنگھ پر اُلٹا اثر کیا۔ اُس نے میرے اوزار لے جا کر چوبچّہ میں ڈال دیئے اور چلا گیا۔ مَیں پکّا ارادہ کر چکا تھا کہ وُہ مجھے دھکّے دے کر نکالے گا تبھی نکلوں گا۔ مَیں چوبچّے کے کنارے پر سے اندر جُھک کر اوزار نکالنے لگا۔ ہاتھ تھاہ تک نہ پہنچا، مَیں جُھکتے جُھکتے اپنا ہی پاسنگ بن گیا۔ پریتم سنگھ میرے پیچھے سے چُپکے سے آیا اور میرے چوتڑوں میں پاؤں گُھسا گیا۔ مَیں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر سنبھلا لیکن توازن کھو بیٹھا، پانی میں گرا اور ڈُوب کر اُبھرا۔ مَیں قہقہوں اور طعنوں کی بوچھار میں اوزار لے کر باہر آیا، میری حالت پانی سے نکالے ہُوئے اِسفنج کی سی تھی۔

مَیں نے کپڑے نچوڑ کر پہنے، کیش جھٹک کر پھیلائے، پگڑی پاڑھ پر ڈالی اور اپنی بے غیرتی کا ثبوت دیتے کے لئے چوگڈّے سے جا ملا۔

میری بے ہُنری میری بیماری تھی، میری تپ دِق تھی جو مجھے اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ مجھے اُس کا اِحساس تھا لیکن مَیں اُس کے سامنے بے بَس تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میرے ہونٹ سُوکھنے لگے۔ اُس بے قراری سے نجات پانے کے لئے مَیں ہونٹوں پر زبان پھیرتا اَور کچھ آرام محسُوس کرتا۔ وُہ صُورتِ حال زیادہ دیر نہ رہی اَور میری حالت مجھ پر واضح ہو گئی۔ مَیں کانپنے لگا، بُخار میں جلنے لگا۔ اَور کام چھوڑ کر گھر روانہ ہُوا۔ بُخار کی غنُودگی میں راستہ نہ سُوجھتا وُہ میری کپکپی تھی جو میری بے ہوشی کا تسلُّط توڑتی تھی۔ شنکر روڈ کی اُترائی اَور مجھے گھر پہنچنے کی جلدی، سائیکل تیز ہوتی گئی لیکن مَیں نے بریک نہ لگائی۔ جیسے صحّت مند رہنے کے لئے آدمی کی انتڑیوں کا صاف ہوتا ضرُوری ہَے اُسی طرح شہر کے لئے سڑکوں کا۔ سڑک میں گہرا گڑھا تھا، پہیّا اُس میں گھُسا اَور اٹک گیا۔ مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ مَیں کاٹھی پر سے اُچھلا ہینڈل کے اُوپر سے اُڑ کر نیچے گرا اَور دُور تک گھسٹتا گیا۔ کوئی انگ ایسا نہ تھا جس پر کھونچا نہ لگا ہو۔ مُنہ میں خُون کا لُون محسُوس کرتے ہُوئے، مَیں اُٹھا لیکن سَر سنّنا گیا۔ کچھ لمحوں کے لئے مَیں جہاں کا تہاں رُک گیا پھر سنبھلا۔ مَیں گرتا پڑتا پگڑی اُٹھا رہا تھا کہ چند سائیکل سوار ایک ساتھ گزرے۔ اُن میں سے ایک بے ادب نے سائیکل روک کر رحم آمیز حقارت سے مجھے دلاسا دیا، "سکھڑے! رام کا شُکر کر، جس نے تجھے نیا جیون دان دیا ہَے! تیرا گرُو تو تجھے مار ہی چُکا تھا!"

اُس بے درد ٹھٹّے کی رُوحانی چوٹ! مَیں پل بھر کے لئے جسمانی تکلیف بھُول گیا۔ مَیں نے اُس کٹھور دِل کو حیرانی سے دیکھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مَیں کیسے گھر پہنچا!

میرے شب و روز صبر آزما حد تک بے رحم تھے۔ اُن کی ہر یاد آج بھی آنسُوؤں کے کُہرے میں ڈُوبی ہُوئی ہَے۔ مَیں نے بُخار سے چھُٹکارا پایا تو میرا مُنہ آ گیا۔ میری حالت اُس پرندے کی سی تھی جو عقاب کے پنجوں سے چھُوٹ کر کیڑوں مکوڑوں کے بھَون پر جا گرے۔ کام پر طعنوں اور بدنامیوں کا درد تھی، مصرُوفیت میں وقت گزر جاتا تھا۔ بیکاری اور اُس پر بیماری! مَیں خلا میں لٹک گیا۔ مَیں تایا جی کو یاد کرتا جو کام کی حمد و ثنا کرتے نہ تھکتے تھے۔

"کام، زندگی کا آرام ہَے!

"کام، ہر روگ کا دارُو ہَے!"

"کام، اصلِ حیات ہَے! جو لوگ دِل لگا کر کام کرتے ہیں وُہی تسکینِ نفس کے معنی سمجھتے ہیں۔"

لیکن میرا کام میرے لئے کلفتِ حیات تھا، حسرتِ حیات تھا، لعنتِ حیات تھا۔ ایک ناتوانی کی بے کسی اور دوسرے تنہائی کی اُداسی، زندگی دباؤ میں پھندے کی طرح کسنے لگی۔ مَیں نے خسّت کی اور دوا نہ کھائی۔ بُخار اُترتے اُترتے اُتر گیا لیکن مجھے لگتا کہ اُس کے بُخارات دماغ میں چڑھ گئے ہیں۔ اوچھی پونجی کتنے دِن رہتی ؟ سرکتے سرکتے سرک گئی۔ ایک میری کمزوری، دُوسرے غریبی، تیسرے بے اَصلی، میری مظلومیت کی ٹھہری تباہی آدھمکی اور اپنا منفی رنگ دکھانے لگی۔ میری رُوح، میرے جِسم میں ایسے رہنے لگی جیسے بند زخم میں پیپ، اُس کا ٹپکنا اُس کے وُجود سے زیادہ تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ میری کوئی دانائی اور ہوشیاری کام نہ آئی۔ میری قُوّت یابی کی صلاحیّت مر گئی۔ میرے قارئین، مجھے دوبارہ سوچنے دیجئے! مَیں اِس صلاحیّت سے عاری تھا۔ صلاحیّت، مبذول نہیں متوار د توانائی ہے جو اپنے عمل سے اپنی تجدید کرتی ہے اور خود کو پہلے سے زیادہ کارگر بناتی ہے۔ مَیں باہر دُھوپ سینکتا اور گاہے گاہے آسمان کو تکتا۔ میرا بیمار خیال! مجھے وُہ سنگ سار کردہ گُناہ گار کی طرح نظر آتا۔ مَیں زوال کی اِنتہائی کیفیّت میں تھا۔ میری دماغی حالت گندگی کے کیڑے کی سی تھی! وُہ رینگتے رینگتے گندگی سے باہر سر نکالتا ہے لیکن تازہ ہوا لگتے ہی اپنا مُنہ اندر کی طرف گھما لیتا ہے۔

مَیں پیروں اور فقیروں کی دانش پر حیران ہوتا! اُنھوں نے ناداری، بیماری اور نفس کُشی کو رُوحانیت کا درجہ دیا ہے اور اِن تینوں گندی سڑی چیزوں کو رحمت جان کر سراہا ہے اور نجات کا راستہ بتایا ہے۔ اپنی حالت پر غور کرتے ہُوئے، مَیں اُن کے "مُقدّس اِرشادات" پر غور کرتا جو مجھے کِذب آفریں لگتے۔ اُس نازک گھڑی میرا زخم خُوردہ وجُود حقیقت سے زیادہ حقیقی لگتا۔

باب ۶۵

جب بُھوک کا سانسوں میں دُھواں ہوتا ہے
جب درد کا احساس جواں ہوتا ہے
پھر چاند نظر آتا ہے روٹی کی طرح
تاروں پہ بتاشوں کا گُماں ہوتا ہے (شاطر)

مَیں حیران ہُوں کہ جِس ماحول میں اِنسان صاف سانس نہ لے سکے اُس میں جِسمانی صحت کے ساتھ رُوحانی فراغت کیسے حاصل ہوسکتی ہے ؟ غریبی سے بڑھ کر کوئی لعنت ہے تو وُہ غریبی ہی ہے ۔ غریبی اِنسانی زِندگی کا سراپ ہے ۔ بے عملی ، بیماری ، خواری ، بے کسی ، بیزاری ..... ساری تنزّل پریرتوتیں اِسی کے پھل پھول ہیں ۔ یہ ایسا انوکھا درخت ہے جو دھرتی سے پاتال کی طرف بڑھتا ہے ۔

میرے دُشمن میرے بُخار کو جوانی کی گرمی کہتے اور میری ناتوانی کو بیکار پسندی ۔ وُہ مرگ آشنا ماحول ، انجانے راستے ، منزلِ لامعلوم ، اُمید کی روشنی نابود ، محرُومی کا اندھیرا مُحیط ..... اندھیرے کی فطرت ہے کہ یہ دہشت ، وحشت ، اندیشے ، کھٹکے کے بغیر کِسی دُوسرے جذبے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا ۔ میرا خیال ہے کہ اِنھیں منفی اثرات کو زیر کرنے کے لئے آدمی نے آگ ایجاد کی اور پھر اس کی تُندی کو سدھانے کی نئی نئی تراکیب ۔ ایجاد کی وُہ گھڑی ، فکروفن کی ترقّی میں اُس چوٹ کی سی اہمیّت رکھتی ہے جو لوہار ، لوہے کو اوزار بنانے کے لئے عینِ آغاز میں لگاتا ہے ۔

میرے مُنہ کا مزہ نہایت خراب تھا ۔ اُس پر پپڑائے ہونٹ ، زہر بُجھی سانس ، مجرُوح سماعت اور دُھندلائی بصارت کی چہرہ دستی الگ تھی ۔ میرپستی نے ہر لفظ کے معنی بدل دیئے اور ہر خیال میں تردید کا جُزو پیدا کردیا ، بالکل ایسے جیسے گندگی کو یکدم صاف نہ کیا جائے تو وُہ اپنی فرسُودگی کی اِنتہائی طرف حیرت انگیز تیزی سے بڑھتی ہے اور تاحدِ رسائی صاف سُتھری چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اُنھیں مائل بہ زوال بناتی ہے ۔ مجھے یادِ وطن آتی ، سُلگتی اور تڑپتی ہُوئی یاد ! میری افسردگی اور بڑھ جاتی ۔ وہاں کون تھا میرا درد بانٹنے والا ! میرے زخموں پہ پیار کا پھاہا رکھنے والا ! بھائیا جی کا وُجود اِتنا سر چڑھا تھا کہ اُن کی مرضی کے خلاف دم لینا مُشکل تھا ۔ مَیں بھری بہار میں اُس پھُول کی طرح تھا جو طُوفانی موسم میں ٹہنی سے ٹُوٹے اور یہاں ٹکراتا وہاں اُلجھتا ، ریشہ ریشہ ٹُوٹتا ختم ہوجائے ۔

مَیں گھر سے نِکل پڑا ، کھویا کھویا ، اُداس اُداس ، زخمی زخمی ، بِکھرا بِکھرا ، آنسُو آنسُو ، بوجھل بوجھل ، اکیلا اکیلا کا نوٹ (ہرنوں کی لڑائی میں ہارا ہُوا ہرن ، وُہ غول کی سرپرستی کھوکر اکیلا گھومتا ہے ۔ دُوسرے کے مُقابلے میں اُس کے مارے جانے کا اِمکان زیادہ ہوتا ہے) کی طرح ۔ ریگڑھ پُورہ اور پٹیل نگر کے درمیان ارضِ فاصل تھی ، مَیں اُدھر چل پڑا ۔ وُہ جگہ دُور سے خوب صُورت نظر آتی تھی ۔ مَیں وہاں پُہنچا ، مُجھے لگا جیسے میں قوسِ قزح کا پیچھا کرتے کرتے اُس کے اندھیرے سِرے پر پُہنچ گیا ہُوں ۔ مَیں جہاں تھا وہاں کوئی سمت نہیں تھی ۔ میرا غم اور بڑھ گیا ۔ مَیں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور بے خیالی میں کنکر اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگا ۔ مَیں سوچنے لگا کہ زِندگی اِن کنکروں کی طرح بے معنی شَے ہے جسے وقت کا ہاتھ اُٹھاتا گراتا اور گراتا اُٹھاتا ہے ۔

میں پیروں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پیر جو سارا دن چلتے پھرتے کوئی تکلیف نہ دیتے تھے، چند منٹ کی نشست میں بلبلا اٹھے اور طرزِ نشست بدلنے کی دہائی دینے لگے۔ مہمل خیالی اور بے ہودہ دھیانی کام کے دوران دماغ کے کسی گوشے میں بندر رہتی تھی، وہ اپنی تمام کج روی کے ساتھ ہنگامہ آرا تھی۔ میری رگیں الجھی ہوئی آنٹی کی طرح تھیں جس کا آغاز ہوتا ہے اور نہ انجام، کوئی اسے سلجھائے تو اس میں گرہ در گرہ پڑتی جاتی ہے۔ ویسے ہولناک لمحے مجھ پر پہلے آئے تھے اور میری بدصورتی مجھے دکھا گئے تھے۔

جیساکہ مذہبی تصوّر ہے، انسانی زندگی چوراسی لاکھ جونوں کے درمیان برائے نجات وقفہ نہیں بلکہ دو وجودوں میں باہم تصادم ہے۔ جو انسان پہلے فلسفۂ حیات پر یقین رکھتے ہیں اور عبادت سے عاقبت سنوارتے ہیں، وہ نادان اپنی دنیا و عاقبت دونوں کو خراب کرتے ہیں۔

اِس نقدِ دل سے اِفادہ کروں تو میں کروڑوں لمحوں میں سے چند ہزار لمحے جیا ہوں۔ میں روحانی مسرّت کے لمحات کو ٹھیک سے جانچوں تو میرے حصّے میں مشکل سے چند لمحے پڑتے ہیں۔ اِن روحانی لمحوں کا انوکھاپن! یہ آسودگیِ نفس کے برعکس وِجدان تخلیق کی معراج ہیں۔

ڈوبتے ڈوبتے سورج ڈوب گیا اور ڈھلتے ڈھلتے دن ڈھل گیا۔ جھینگروں کی اداس لے سے رات دَرد کی کسک کی طرح ابھری۔ میری وحشت و دہشت اور بے حوصلگی و بے دلی بڑھنے لگی۔ ہوا سانس سے نازک تھی اور سانس، دھڑکن سے۔ کسی قسم کا کوئی شور نہ تھا، بالکل ٹھہراؤ تھا۔ کہیں تھوڑی زندگی تھی تو میری آنکھوں میں تھی۔ میں اُس حادثے کی طرح تھا جو وقوع پذیر ہوا چاہتا ہو۔ میں نے رو کر خود کو بحال کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میرے احساس کا رویّہ جوؤں کا سا تھا جو آدمی کے مرنے پر اُس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ میں اپنی بے حسی پر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے آپ کو مجروح کروں تو مجھے درد نہ ہوگا۔ میں نے زور سے پتھر پر مُکّا مارا۔ میرا ہاتھ جھنّا گیا۔ اُسے تھپکتے اور سہلاتے ہوئے، میں اُٹھ کھڑا ہوا اور گھومنے لگا۔ اِس بار میں نے جہاں بیٹھنے کا اِرادہ کیا وہ گھاٹی کے پیروں میں جگہ تھی۔ چوٹی سے گھاٹی میں اُترنا زمین کے اندر پہاڑ پر چڑھنا ہے۔ میری آنکھیں میرے پیروں میں سکڑ گئیں اور میرے مختصر وجود کو بالکل مختصر کر گئیں۔ مجھے بیٹھتے ہی لگا کہ یہ دنیا کا آخری سرا ہے۔ میں نے ڈر کر دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ پتھروں اور جھنڈوں کے سائے ڈراؤنے ہیولوں سے رینگتے ہوئے مجھ پر آنے لگے۔ میں خوف سے کانپ گیا۔ میری کپکپاہٹ تپِ لرزہ کی اینٹھن کی طرح لمبی اور ہٹیلی تھی۔ اپنی بے کسی سے میں اپنے آپ میں زائل ہونے لگا۔ میرا رنگ بدلنے لگا اور بدلتے بدلتے میرے کپڑوں جیسا پیلا پڑ گیا۔ میرے کپڑوں کا رنگ اُن کی فرسودگی کا نتیجہ تھا اور میرا رنگ میری جان کنی کا۔ سوکھی ہوئی برساتی گھاس اندھیرے میں آگ کی طرح چمکی اور میری

طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس موت کے سیلاب سے میں نے نہ بچ نکلنے کی خواہش کی اور نہ کوشش۔ نہ مجھے حیات سے رغبت تھی اور نہ موت سے نفرت، نہ اپنی ذات کا سوز و گداز اور نہ تعلّقِ دُور و دراز، نہ کوئی شورِ ماتم اور نہ کوئی شریکِ غم، ایک ہُو کا عالم! میری حالت نوعِ آدم کے اُس بشر کی سی تھی جس کا سارا قبیلہ کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہو اور اُس کا اپنا انجام اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو۔

بُرا اپنی بُرائی، نیک اپنی نیکی، حرصی اپنی حرص، فیّاض اپنی فیّاضی، بے حس اپنی بے حسی اور حسّاس اپنی حس کا شکار ہوتا ہے۔ میں مفلوج سا بے حرکت پڑا رہا اور اپنے نابود ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس وقت موت اپنی حقیقت میں سامنے آتی تو میں خوشی سے اُسے گلے سے لگا لیتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس بھیانک زندگی سے حسین ہوتی جس کا میں تصوّر کئے ہوئے تھا۔

ایک پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور تیزی سے میرے پاس سے گزر گیا۔ اُس کے پیچھے ریزے، ذرّے، تنکے گھسٹتے آئے اور لکیر سی بنا گئے۔ میں چونک کر جھٹکے سے اُٹھا۔ میرے گھٹنے زور سے چٹخے جیسے آئینہ ٹوٹتا ہے۔ میں نے احتیاط سے قدم اُٹھایا، مجھے لگا کہ گھٹنے ٹوٹ کر معجزاتی طور سے جُڑ گئے ہیں۔ میں نے اُوپر دیکھا ایک جنگلی بِلّا جھاڑی میں کھوتا نظر آیا۔ میں پھر سے بیٹھ گیا۔ میں نے کسی جانور کے چیخنے کی آواز سُنی۔ بلّا، خرگوش کو دبوچ کر اُسے جھنجھوڑتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اُس کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی وہی سکوت لوٹ آیا لیکن کچھ الگ طریقے سے، میری بھوک کا احساس تازہ ہو گیا۔ میں نے اُسے کچلنا چاہا لیکن کچل نہ سکا۔ وہ دوپہر ہی سے مجھ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ نریندر سنگھ نے ہوٹل کا اُدھار بند کر دیا تھا اور میری منّت سماجت سے پسیجا نہ تھا۔ اُس کے بے دَرد رویّے سے میرے دِل میں نفرت بھڑک اُٹھی تھی۔ مجھے کپکپی آئی اور متلی ہوئی تھی جیسے میں نے نہایت گندی چیز دیکھ لی ہو۔ میں تے بے قابو ہو کر تھوکا۔ جبھی اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔ اُس شہری سے لُباں دیہاتن اچھی تھی جو بوقتِ ضرورت "جھنگے دی چُنگ" (گاؤں میں رواج ہے کہ کسی کے پاس دانے نہ ہوں، وہ بھٹیارن سے کہے تو وہ اُسے اپنے پاس سے دانے بھون دیتی ہے اور پھر کبھی بھاڑے کے ساتھ وصول کر لیتی ہے) بھون دیتی تھی۔ اُس نازک گھڑی وہ مکروہ صورت بوڑھی کتنی پیاری لگتی! ایک بار میں نے خوشی سے اُس کی بپّی لے لی اور وہ کنواری کی طرح شرما گئی۔ اِس دِل پذیر یاد کے ساتھ بھٹّی کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ میری بھوک کے درد کو میرے خیال کی نکہت اُڑا لے گئی اور میں بولی گانے لگا۔ یہ بولی نہایت فحش ہے۔ اِسے قابلِ تسلیم بنانے کے لئے میں نے چند لفظ حذف کر دیئے ہیں۔

دانے بھُن دے جھیریئے ساڈے

بُھکھیاں دے ۔۔۔۔۔ ہڑدے

(او بھٹیارن ، جلدی سے ہمارے دانے بھون دے! بھوک کے مارے
....کھڑے ہو رہے ہیں۔)

میرے احیا کا کمال! میرے مُنہ کا ذائقہ ہی بدل گیا جیسے بولی کے الفاظ مزیدار نوالے تھے۔ میرے خون میں مزے کی ہلچل دوڑ گئی۔ میری کمزوری جاتی رہی اور لے اونچی ہو گئی۔ میری خوش خیالی، حسن حقیقت میں ڈھل گئی، سانس میں تازہ بھنے دانوں اور جلتی مٹّی کی خوشبو ناچ اٹھی۔ گاؤں کی بھٹّی کی کہانی، جوانی کی اُمنگ اور ترنگ ہے۔ جس دن شنکر کی سالی سیتا دانے بھونتی، بھٹّی پر معمول سے زیادہ بھیڑ ہوتی۔ کئی یار لوگ دو دو بار، تین تین بار دانے بھُناتے اور جب تک وہاں کھڑے رہتے اُس کے مَمّوں پر نظریں گاڑے رکھتے۔ اُس کے ممّے، ٹھوڑی کی رعُونت کو بچھاڑ کر اپنی سر بلندی کا اعلان ایسے کرتے جیسے اُس کاروبار کی ساری ذِمّہ داری اُن کے سر ہو۔ لُبّاں دانوں کا چوتھائی بھُنوائی لے لیتی تو وُہ اُس سے لڑ پڑتے لیکن سیتا آدھے سے زیادہ بھُنوائی رکھتی اور وُہ اُس کے رویّے پر خُوش ہوتے جیسے اُس نے رعایت کی ہو۔

ایک بولی یاد آ رہی ہے جس کا مفہوم مندرجہ بالا مضمون پر بھاری ہے۔

میتوں کوئی دُدھ نہ لوے
پانی وِکدا ننانے تیرا

(کوئی گوالن بھاوج اپنی نند کے جوبن پر طنز کرتی ہے۔ جو لوگ مجھ سے دُودھ کے بھاؤ دُودھ نہیں لیتے، وُہ تجھ سے دُودھ کے بھاؤ پانی خریدتے ہیں)

مَیں ٹیڑھا میڑھا چلتا، ڈھیلے پتّھروں سے پاؤں بچاتا، کہیں چٹانوں کہیں جھاڑیوں کا سہارا لے کر کھڈ کے اُوپر چڑھنے لگا اور ایک جھاڑی کے پاس رُک گیا، تھک کر نہیں، جھک کر۔ میرے اِس خلاف توقّع رویّے کا راز یہ ہے کہ جس جھاڑی کی شاخ کا سہارا لے کر مَیں نے قدم اُٹھایا وُہ اپنی کونپل میرے ہاتھ میں چھوڑ کر میری پکڑ سے نکل گئی اور مَیں دھک سے رہ گیا۔ یہ تجربہ لاجونتی سے اُس مُٹھ بھیڑ کا سا تھا جب وُہ جلدی سے چھوٹا سا چُما دے کر اَصل بات پھر کبھی پر ٹال جاتی تھی۔ اُس مخصوص لمحے کی بے قراری اور بُردباری ایسی ہی ہوتی تھی۔ مَیں اُوپر پہنچا، آنکھوں سے پیروں تک سُکڑا ہُوا منظر ایسے پھیلا جیسے مَیں قید خانہ سے نگار خانہ میں جا نکلا تھا۔ دِلّی پُوری رعنائی سے جلوہ گر تھی۔ میرے مہکتے ہُوئے دِل میں خیال آیا کہ کوئی نادار لڑکی میری ہی طرح آوارہ گھُومتی اِدھر آ نکلے اور ہم ایک دُوسرے کا دُکھ یُوں بانٹیں کہ مُطمئن ہو جائیں۔ اپنی خیالی جنّت بسائے مَیں اب جس پتّھر پر بیٹھا وہاں سے کچھ ہی دور

مسان تھا ۔ بجلی کا آخری کھمبا اُس کے پھاٹک کے آگے گاڑا ہُوا تھا ۔ اُس کے نیچے کوئی سادھو گیروے کپڑے پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا جیسے ٹہل رہا ہو ۔ اُسے دیکھ کر میں بے اختیار گانے لگا ۔

بلّے ، بلّے ، بلّے !
بھئی نکّی ہُندی ہو گئی سادھنی
موجاں لَین گے گرو دے چیلے
(کیا خوب ہے کہ چھوٹی عمر میں سادھنی ہُوئی ہے ! بڑی ہو گی تو گرو کے چیلے موج مزہ کریں گے)

وہ سادھو میری طرف مُڑا جیسے میں نے اُسے اُس کے نام سے پکارا ہو ۔ وہ آگے بڑھنے لگا اور میں کسی ناگوار تاثّر سے ڈرنے لگا ۔ چوں کہ وہ روشنی سے اندھیرے میں آ رہا تھا ، اُس کا سراپا دُھندلایا ہُوا تھا ۔ وہ جیسے جیسے میری جانب آتا گیا ، میرا خوف ، دِل کی دھڑکن کی طرح بڑھتا گیا ۔ میں نے سوچا کہ وہ میری بولی سے برہم ہو گیا ہے اور میرے ساتھ لڑنے آ رہا ہے ۔ میں اُٹھ کر دُوسری طرف چل پڑا لیکن اپنی ٹانگ سُن پا کر رُک گیا اور اُس پر ہلکے ہلکے گھونسے مار کر اُسے ہوش میں لانے لگا ۔ جب تک اُسے ہوش آیا ۔ سادھو میرے قریب آ گیا اور اُونٹ کی طرح ہچکولے مار کر چلتا صاف دکھائی دیا ۔ حُسنِ فطرت کی گوناگونی میں کتنی یکتائی ہے ! ایک سے دو چہرے ڈھونڈنا بڑی بات ہے ، ایک چال دُوسری سے الگ ہے ۔ وہ سادھو بھگت سنگھ کے سوائے کوئی دُوسرا نہیں ہو سکتا تھا ۔ وہ شَے جو مجھے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کے لئے مجبور کرتی وہ سادھو کی صفاچٹ صُورت تھی ۔ اُس نے اپنا بیرا گا پھینکا اور مُصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اُسی طرح میں نے بھی ۔ اُس نے میرے ہاتھوں کو چھُو کر اُنھیں جھٹک دیا ، مجھے باہوں میں لیا ، گلے مِلا ، میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اُوپر اُٹھایا اور گول گھمایا ۔

" تَت تَت تُوں ، مَے مَے مَیں ۔۔۔ "

میں بھگت سنگھ کے نئے رُوپ پر حیران تھا اور وہ میرے وہاں ہونے پر ۔ میں تو بھرا پھوڑا تھا ، اُس کے ذرا چھیڑنے ہی بہہ نِکلا ۔ وہ مجھے غور سے سُنتا رہا لیکن اپنے بارے میں اُس کا ردِّ عمل نرالا تھا ۔ وہ ہنسنے لگا اور اُس کے ساتھ میں ۔ ذرا سی ہنسی نے میری حالت ہی بدل دی ۔ کہتے ہیں کہ ایک ہنسی سَو دُکھوں کا عِلاج ہے ۔ میں کئی ماہ کے بعد دِل کھول کر ہنسا تھا ۔ میں ایسے ہلکا پھُلکا ہو گیا جیسے کوئی کام کرتے کرتے تھک کر ٹھنڈے پانی سے نہا لے ۔ ہنستے ہنستے میں چُپ ہو گیا لیکن وہ ہنستا رہا ۔ وہ چُپ نہ ہُوا تو مجھے لگا کہ وہ میرا ، اپنا ، اپنے گھر والوں کا ، رِشتہ داروں کا ۔۔۔۔ ساری دُنیا کا ٹھٹّھا اُڑا رہا

ہے ۔ اُس کی ہنسی داقعی رشتوں ناتوں اَور رسموں رواجوں کی تقدیس پر گہری چوٹ تھی ۔ اُس کی بیوی سرجیت کور (جسے وُہ شاستروں کے انُسار بیاہ کر لایا تھا) شاستروں کا پالن نہ کر سکی اَور اپنے تن من کی آگ بجھانے کے لئے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے لگی ۔ اُس کے اَور بھگت سنگھ کے بارے میں ہر طرح کی بازاری خبریں پھیلیں ۔

سرجیت کور کچّی ٹُوٹی ہُوئی ہے !

بھگت سنگھ نامرد ہے !

سرجیت کور کا بھگت سنگھ کے بارے میں کیا خیال تھا ؟ یہ وُہی بتا سکتی تھی لیکن بھگت سنگھ اُس کے بارے میں کہتا ، "وُہ ایسی بھٹّی ہے جسے ہر دم تازہ جھوکا چاہیئے !"

قارئین ، ضرورت کی نفاست کو کنُوارے لمس سے نسبت ہے ! جب تک یہ لطافت برقرار رہتی ہے ، ضرورت بصورت قوّتِ حیات پنپتی ہے ۔ جس سے رُوحانی ترقّی کو تقویّت ملتی ہے جُوں ہی یہ نازُک توازُن بگڑ جاتا ہے ، ضرورت مند زوالِ نفس کا شکار ہو رہتا ہے ۔

باب ۶۶

توڑنا اِس سے جوڑنا اُس سے
زِندگی کے یہ تانے بانے ہیں (شاطر)

بھگت سنگھ ، سرجیت کور کی بھٹّی کو جھوک نہ سکا اَور وُہ اُس سے ڈر کر گھر سے بھاگ گیا ۔

ہر کوئی سمجھتا تھا کہ وُہ ندامت سے ڈُوب مرا ہے لیکن وُہ بے غیرت زِندہ تھا اَور شمشان گھاٹ کے ایک گوشے میں رہتا تھا ۔ اُس کا چھوٹا سا حُجرہ بے داغی کی حد تک صاف سُتھرا تھا ۔ کیس اَور داڑھی مُونڈنے سے اُس کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ۔ ٹھوڑی پر گڑھا دکھائی دے رہا تھا جو چہرے کا دلکش منظر بنا ہُوا تھا ۔ گیروے لباس کے پرتو سے جِلد کے نیچے فانُوس جلتا لگتا اَور سُنہری رنگ ٹپکتا دکھائی دیتا ۔ اُس کی باتوں میں شیرینی تھی ہی ، معرفت کے رنگ نے اُن میں خیال آرائی بھی بھر دی ۔ وُہ بات بات پر شاستروں سے حوالہ دیتا اَور بے ریا لگتا ۔ اُس احاطے میں کچھ اَور اُسی قسم کے لوگ رہتے تھے جو ایک

دُوسرے کو مہاتما کہہ کر بُلاتے۔ بھگت سنگھ نے ایک مہاتما سے میرا تعارف اس طرح کروایا، "یہ ہمارے سنساری متر ہیں"۔ وُہ مجھے خیر باد کہنے کے لئے دُور تک آیا اور گلے مِل کر بولا، "جب تک ہم ہیں، فکر نہ کرنا ویسے ہم رمتے جوگی ہیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے چولے کی اندرونی جیب سے سو سو کے کُچھ نوٹ نکالے اور میرے سویٹر اور شرٹ کے درمیان گھسیڑتے ہُوئے بولا، "ست گرو سب دے کاج سنوارے!"

اُس نے یہ سب اِس آسانی سے کیا اور نرمی سے کہا کہ مَیں حیرت و مسرّت سے اُسے دیکھتا رہا۔ وُہ چلا گیا، مَیں وہیں کھڑا رہا اور اپنی اُلجھن میں اُس کا شکریہ تک نہ ادا کر سکا۔ وُہ دس قدم گیا ہو گا کہ لوٹ آیا جیسے کچھ کہنا بھُول گیا ہو۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور رازدارانہ انداز سے کہا، "یہ بات کسی سے نہ کہنا کہ ہم، تُم سے مِلے تھے۔ اِس میں دونوں کی بھلائی ہے"۔

"ٹھیک ہے!" مَیں نے ہولے سے کہا۔

مَیں جس سُود مند صُورت سے دوچار ہُوا، وُہ میرے خیال میں بھی نہ تھی۔ اُس نے مجھے یُوں تذبذب میں ڈال کر مَیں اپنے جذبے کو صحیح سمت نہ دے پایا جس کی وجہ سے وُہ ٹھنڈا اور اَدھورا رہا۔ احسان مندی کا جذبہ احسان گزاری کے برعکس مجہُول ہے۔ اِس کی مجہُولیت کی اِبتدا ہے کہ یہ اپنے محسن کا احسان ماننے سے احتراز کرے اور اِنتہا ہے کہ یہ اُسے بھُول جائے اور لا اِنتہا ہے کہ یہ اُسے اِلزام دے۔

مَیں نے نوٹوں کو ٹھیک سے جیب میں رکھا، سویٹر نیچے کھینچا، دامن دُرست کیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ میرے پیٹ میں بل پڑنے لگا لیکن اُس میں درد کے بدلے خوشگوار ربط تھا۔ میری ناتوانی میری توانائی کو کہاں اور کیسے چھُپائے ہُوئے تھی؟ یہ اُس کے تسلّط سے کیسے آزاد ہُوئی؟ وُہی جانے! وُہ میری رگوں کی زور آفرینی بن گئی اور مَیں بڑھتی ہُوئی سردی میں گرمی محسُوس کرنے لگا۔ مَیں پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا! میرے دِل میں طرح طرح کے خیال اُٹھنے لگے۔

کوئی اِتنے سارے رُوپے دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

یہ سڑک سُونی ہے، کہیں چور نہ چھُپے ہوں!

مَیں نریندر کو دیکھ لُوں! وُہ ذلیل اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟

یہ نوٹ جعلی تو نہیں ہیں؟

یہ کتنے رُوپے ہوں گے؟

میرے جی میں آئی کہ مَیں اُن کی وہیں گنتی کرُوں لیکن مَیں خوف سے ویسا نہ کر سکا۔ خوف

انسان کو بزدل بنا دیتا ہے لیکن بزدلانہ رویّہ کسی صورتِ حال میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ میں نے بھگت سنگھ کو بتایا تھا کہ میں جگت سنگھ (بھگت سنگھ کا چھوٹا بھائی) کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اس نے ایک ہی بات میں سارے رشتوں کا کھنڈن کر دیا۔

بندھن توڑے ہووے مُکت
سوئی بھگت پوجن جُگت

کاش آدمی جانتا کہ کون سا راستہ کہاں ختم ہوتا ہے اور کون سا کہاں شروع! لیکن آدمی کے برعکس راستے کو اپنے نشیب و فراز کا علم ہے۔ جو راستہ مجھے قریب قریب بھیانک موت کے منہ میں لے گیا تھا، وہی مجھے جاں فزا حیات کے دروازے پر لے آیا۔ میرا تجربہ ہے کہ راستہ، راہ رو کو نفسیاتی طور پر متاثّر کرتا ہے۔ اس کے زیرِ اثر کوئی کہاں، کیا کر بیٹھے؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

تایا جی دولتِ ہنر اور دولتِ زر کا مقابلہ کئی طرح سے کرتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے، "ہنر، تجدیدِ ذات کرتا ہے اور زر، تکذیبِ ذات، وہ اسے بڑھاتا ہے اور یہ اسے گھٹاتا ہے۔"

میرے تجربے کی روشنی میں تایا جی کی ہر بات غلط تھی! ہنر نے مجھے گھٹایا تھا اور زر نے بڑھایا تھا۔ چند قدم تیز تیز چلنے کے بعد میں نے تر و تازہ محسوس کیا، میں بھاگنے لگا اور اپنی گلی کے کونے تک بھاگتا رہا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہاں پہنچ کر میں نے گلی کے کتّوں کو آواز دی۔ ان میں سے ایک میری خوشبو پا کر دم ہلاتا ہوا میری جانب لپکا۔ میں نے اسے زور سے دھتکار دیا۔ وہ دم دبا کر رک گیا اور ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا۔ شام، رات کے پہلے مراحل میں تھی اور گلی سنسان۔ کرتار سنگھ، بے انت کور، سومتر سنگھ اور اس کی بیوی اپنے چینگے پوٹے کے ساتھ اپنے اپنے گھر میں نچنت تھے۔ میں چور کی طرح چاہتا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ موسم میرے آڑے آیا۔ جگت سنگھ کی بیوی نے پہلے بچّے، لڑکے کو جنم دیا، جسے دیکھنے کے لئے وہ گاؤں گیا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نوٹ گنے، پورے بیس تھے۔ میں نے ہر ایک نوٹ کو بلب کے مقابل دیکھا اور اس میں عمودی لکیر دیکھ کر خوش ہوا۔ میں نے ایک نوٹ جیب میں رکھا، دوسروں کو سرہانے میں چھپایا اور ہوٹل کا راستہ لیا۔ حالاں کہ میں وہی تھا جو تھا! لیکن میری چال میں غرور اور اعتماد تھا جو پہلے کبھی نہ تھا۔ روپیہ وہ طاقت ہے جو اعتمادِ نفس کی رفعت ہے۔

نریندر سنگھ نے مجھے دیکھا اور ان دیکھا کر کے اپنے کام میں مصروف رہا جیسے اسے یقین ہو کہ میں ادھار کھانے کے لئے پھر منّت سماجت کرنے آیا ہوں۔ میرے جی میں آئی کہ میں نوٹ اس کے منہ پر ماروں، کھڑے کھڑے کھری کھری سناؤں اور اس کے سامنے ساتھ والے ہوٹل پر کھانا کھاؤں۔ میں اسے

اور کئی طرح سے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ چلّا چلّا کر بتانا چاہتا تھا کہ مَیں نہایت اعلیٰ خاندان کا فرد ہُوں امیری غربت میری خُود ساختہ مُصیبت ہے ورنہ مَیں اُس جیسوں کو نوکر رکھ سکتا ہُوں۔ ضرورت پڑے تو خرید سکتا ہُوں۔ لیکن میری ریاکار فطرت نے جو حربہ ایجاد کیا وُہ اُس کی بَرملا رذالت پر خاموش وار تھا۔ میں نے سَو کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں پکڑایا اَور اداے بے نیازی سے اَندر جاکر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل پر خلافِ معمول بھیڑ تھی۔ جیساکہ ایسے ہوٹلوں میں ہوتا ہے، کوئی روٹی کے لئے چلّا رہا تھا، کوئی دال سبزی کے لئے اَور کوئی پانی کے لئے۔ ہر کسی کی ضرورت کو نظر انداز کر کے زیندر سنگھ میرے سامنے آکھڑا ہُوا، مجھے ہکّا بکّا سا دیکھنے لگا اَور بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے کے لئے صاف کئے ہُوئے ٹیبل کو دوبارہ صاف کرنے لگا۔ میری بے رُخی نے اُسے کوئی مناسب موضوع نہ دیا تو اُس نے خُود سے بات کرنے کے انداز میں مجھ سے کہا، "سنگھ صاحب آج میری پسند کا کھانا کھاؤ۔"

ہُنرمند کے سامنے عام آدمی بے ہُنر لگتا ہے لیکن اپنی جگہ وُہ ہُنر سے بھرپُور ہے۔ اِس حقیقت کا اِحساس مجھے زیندر کی بات سُن کر ہُوا۔ وُہ مجھے میرے نام سے بُلاتا تھا۔ اُس کا لہجہ قُدرتی طور پر کھُردرا تھا جو کئی بار سراسر بدتمیزی لگتا تھا لیکن اُسے برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ تھا۔ اُس نے سنگھ کے ساتھ صاحب کی اِضافت لگائی۔ اِس نفاست نے وُہ کام کیا جو پارس، پتّھر کو چھُو کر کرتا ہے۔ میرے نام کی اہمیّت مجھے لے اُڑی۔ مَیں نے اُس غریب، امیر کی طرح محسُوس کیا جسے اچانک دفینہ مِل جائے اَور وُہ اپنی اصَل کی آبرو بڑھانے کے لئے کوئی ایسا کام کرنے کا خیال کرے جس کی عظمت میں شہرت اَور بقائے دوام ہو۔

اُس نے دال اَور سبزی بگھاری، تھالی پُونچھ کر بھٹّی پر سینکی، رفیدہ جھاڑی، ٹگدی میں سے لوئی توڑی، حسبِ معمول سے زیادہ اِحتیاط سے روٹی بنائی اَور تنُور میں سے سِینک پر چڑھی روٹی تھالی میں پروسی۔ اُس کا نوکر روٹی کی تھالی لایا اور پانی کا گلاس لے گیا جسے وُہ پہلے رکھ چُکا تھا۔ زیندر کی ہدایت پر اُس نے صابن سے گلاس دھویا، اُس میں ڈورے سے پانی بھرا اَور اُسے پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیا۔ مَیں حیران ہُوا کہ وُہ جس سلیقے اَور قرینے کو جانتا تھا اُسے برتتا نہ تھا۔ مَیں کھانا کھا کر باہر نِکلا، وُہ اپنے رُوپے کاٹ کر باقی کے رُوپے واپس کرنے لگا۔ مَیں نے شانِ استغنا سے کہا "میرے کھاتے میں جمع کر لیجئے۔"

اُس کی ناشائستگی کا جواب شائستگی سے دینے کے لئے مجھے جس جذبے نے اُکسایا وُہ میرا انکسار نہ تھا بلکہ میری سخت اَذیّت دِہ فطرت کا لطیف اِختراع تھا۔ اُسے درپردہ ذلیل کرنے کی لذّت الگ تھی۔ میری ریاکاری نے اِنسانی جذبے کا جو حیران کُن پہلو دریافت کیا وُہ بظاہر مؤدّب تھا لیکن درپردہ مذلّت۔

مَیں نے اپنا راز چھپایا جیسے لوگ اپنی کمزوریاں چھپاتے ہیں لیکن راز کھل کے رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شفا پانے کے بعد مَیں نے کام پر جانا بند کر دیا۔ مجھے افواہ پھیلاتے ہی بنی کہ بھائیا جی نے مجھے دو ہزار روپے بھیجے تھے کہ مَیں کالج میں داخل ہو جاؤں۔ میرے جانے پہچانے اُن کی تعریف کرتے اور مجھے بدخو کہتے۔ میری خوشی سے بے انت کور سب سے زیادہ دُکھی ہوئی۔ وہ طعنہ زن رہتی، "چاچا نے تجھے گھر سے نکالا ہی اس لئے تھا کہ تجھے پڑے پڑے کھانے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جب تک کالج میں داخلہ نہ لو، کام پر جایا کرو"۔

مَیں اپنے بے جا رویّے کو سراہتا اور لوگوں کی طنزوں کو اُن کی کم ظرفی سے منسوب کرتا۔ اپنی بے وقوفی کو عقل مندی ثابت کرنے کے لئے مَیں بڑی بڑی باتیں بناتا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا، مَیں من پسند کپڑوں کے لئے کسمساتا رہتا تھا۔ من پسند کپڑے میٹھی اور مہکتی ہوئی یادوں کے تحفے ہیں۔ اِس وقت مَیں اُن کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میری رگ جاں میں رس دوڑنے لگا ہے۔ اُن کے کورے پن کی تازگی کورے تن کی سی ہے۔ پہلا ہی اوسر ملا اور میری نگاہِ انتخاب انگریزی لباس پر پڑی۔ میرے رنگ پر سب رنگ کھلتے تھے لیکن مَیں نے رام سنگھ کے مشورے سے ایک کالا وارسٹڈ کا سفید دھاری والا سوٹ خریدا اور دوسرا گیبرڈین کا پلین میرون۔ اُس یادگار لمحے کا ایک منظر اُسی نزاکت سے آنکھوں میں ہے۔ بزاز قمیض کا کپڑا چٹکی لگا کر پھاڑنے لگا لیکن اُس کا ہُنر مجھے پھوہڑ پن نظر آیا۔ مَیں نے اُسے سختی سے روکا "ایسے نہیں، قینچی سے کاٹو!"

وہ رُک گیا اور تھانوں کے نیچے سے قینچی نکالتے ہوئے بولا، "اِس طرح کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے! ہمارے ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے"۔ مَیں نے نہایت نفیس لہجے میں کہا۔

"آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں کیا؟" میری نازک کلامی سے متاثّر ہو کر اُس نے پوچھا اور ساتھ ہی اپنے نوکر سے دو 'کوک' لانے کو کہا۔

"جو ہیں، آپ کے سامنے ہیں"۔ مَیں مسکرایا اور بات گول کر گیا۔

اُن دنوں چوڑے اور اُٹنگے پائنچوں کا رواج تھا جو مجھے پسند نہ تھا۔ کپور ٹیلرز کے اصرار کے باوجود مَیں نے پینٹ کی مُہری اوسط سائز کی رکھوائی اور اُسی طرح لمبائی۔ اُس کام سے فارغ ہو کر مَیں نے دُوسرے سامان کی فہرست تیّار کی جو کچھ اس طرح تھی۔

دو عدد انڈرویئرز، رُومال، جُراب وِدگارٹرز

دو عدد ٹاولز فُل سائز۔

دو عدد باٹا شوز، ایک بلیک، دوسرا میرون۔

دو عدد شوخ رنگ نکٹائیز، ایک میں لال اور دوسری میں کالا رنگ نمایاں۔

دو عدد کنگھے

دو عدد ہینگر

دو عدد لیدر بلٹ، ایک کالی، دوسری میرون۔

صندل سوپ وِد سوپ کیس

لکس سوپ وِد سوپ کیس

ایک عدد ایوننگ اِن پیرس

ایک عدد بینا کا ٹوتھ برش وِد بینا کا گرین ٹوتھ پیسٹ

ایک پیکٹ رنگ برنگے سروں والے آلپین

ایک عدد پورے عکس کا آئینہ

اِس فہرست سے بڑھ کر میں نے دو پگڑیاں چھہتّر کی ململ کی خریدیں اور سوٹوں سے ملتی رنگوائیں گھر میں سرسوں کی تیل کی بوتل تھی، میں نے اُسے گلاب کے پھُلیل کی پُٹھ دے دی۔ جگت سنگھ گاؤں سے واپس آیا اور میری حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے جس دن کپڑے سلنے دیئے، میں چاہتا تھا کہ اُسی دن مِل جائیں لیکن ویسا نہ ہو سکا۔ میری وارفتگی! میں نے ٹیلر کو مقرّرہ ریٹ سے زیادہ ریٹ دینا چاہا، اُس نے اپنے فیصلے کی طرفداری میں کہا، "آپ ڈبل ریٹ دیجئے لیکن جتنا وقت لگتا ہے، اُتنا لگتا ہی ہے"۔

جوئیں مارنے کے لئے میں نے سر میں فلِٹ ڈالی اور پھر نہانے کا اہتمام کیا۔ ایک بار صابن سے نہا کر میں گاہے گاہے بدن بھگوتا رہا اور مساموں میں گہرے جمے میل کو اُگاتا رہا۔ میں نے بدن ملا، میل مروڑیوں کی صورت اُترا بالکل ایسے جیسے گرہستن آٹا گوندھ کر ہتھیلیوں سے آٹا چھٹائے۔ تولیے سے بدن پونچھنے سے پہلے میں نے پانی کے موٹے موٹے قطرے ہاتھوں سے نچوڑے۔ ہاتھ، ماس پر 'کُر کُر کُر' کرتے سنائی پڑے۔ یہ گدگداتی آواز میں نے آگے بھی سُنی تھی لیکن الگ طریقے سے۔ میں گاؤں کی آب جو میں ریت سے دانت صاف کرتا، کلّیاں کر کے دانتوں پر اُنگلی پھیرتا، یہی دِل کش آواز سُنتا اور اُس غیر مرئی آئینے میں دانتوں کی چمک دیکھتا۔ میرا خیال لہک اُٹھا اور رگوں میں ترنگ سی چھیڑنے لگا۔

میں نہا کر دھوپ میں بیٹھا کیس سُکھا رہا تھا کہ میں نے جِلد کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ ماس کی اوپری پرت صابن میں گھُل کر بہہ گئی ہے۔ اُس رنگت میں کھُرچی ہوئی ہنڈیا کی سی سفیدی تھی۔ میں کھُرّی پر

بیٹھے بیٹھے تیل مالش کرنے لگا۔ اُس سادہ سے کام کو مَیں نے جس نفاست سے کیا وُہ دیکھتے ہی بنتی تھی
مَیں تیل لگا کر ملتا اور مل مل کر اُسے ماس میں جذب کر دیتا۔ میں بدن کے اُس حِصّے کو دُوسرے کے مُقابلے
میں دیکھتا وُہ ایسے لگتا جیسے گُل پژمُردہ کے سامنے گُلِ تازہ پڑا ہو۔ میں جُوں ہی اُس کام سے فارغ ہُوا،
میری آنکھوں میں سُرور گھُلنے لگا اور مَیں سوگیا۔ میری نیند کھُلی تو کھڑی کا بان چُبھنے سے جِلد پر چُنّٹ پڑ گئی۔
میری رُوح افزائی! مَیں چُنّٹ کو سہلانے لگا اور دِل ہی دِل میں اُس کی خُوبصُورتی سراہنے لگا۔

خیال کوئی بھی ہو، جذبے کی ہم آہنگی اُسے افزُوں کرتی ہے۔ گاؤں کی آب جُو کا پانی چڑھ
کر اُتر جاتا تو کناروں پر بالُو کی دھاریوں کا منظر ایسا ہی نظر آتا جِسے مَیں دیر، دیر تک دیکھتا رہتا اور
دِل ہی دِل میں تایاجی کی اِس فراست کی تائید کرتا، "خُوبصُورت خیال، خُوبصُورت جذبہ، خُوبصُورت عمل
..... اِنسان کو اِس کے مُشاہدے کا عطیہ ہے۔ خُوبصُورتی اِنسان کو بناتی اور سنوارتی ہے، بدصُورتی
اِنسان کو بگاڑتی اور اُجاڑتی ہے"۔

اِنسانی زندگی سانس سانس تناقض ہے! ایک صُورتِ حال الگ الگ صُورت میں الگ
الگ معنی رکھتی ہے کیوں کہ اُس کا سیدھا رِشتہ اُس مخصُوص وقت کی نفسیات سے ہوتا ہے جو اُس
کا جائزہ لیتی ہے۔

مَیں نے بال دھوکر اُن میں اُسی وقت تیل لگا لیا تھا۔ مَیں نے اُنھیں پہلے اُنگلیوں سے چھڑایا
پھر موٹے کنگھے سے اور پھر باریک سے۔ اِس کے بعد مَیں نے کھڑا نگا (کنگھے کے دندانوں کی جڑوں میں
دھاگا باندھ کر اُن کا فاصلہ کم کرنا) باندھ کر پھیرا، جس نے بالوں پر سے آخری لیکھ تک کھرچ لی۔
مَیں نے جُوڑا باندھا، مُجھے لگا کہ سر پر سبد گُل رکھا ہُوا ہے۔ مَیں نے ناخن کاٹنے چاہے، مُجھے نیل کٹر کی
یاد آئی، جسے مَیں نے اِس لئے نہ خریدا تھا کہ اُسے فہرست میں داخل کرنا بھُول گیا تھا۔ مَیں نے پُرانا
فن آزمایا اور سوہن سے نیل کٹر کا کام لیا۔

سُوٹوں کا ٹرائل شُکروار سویرے ہُوا تھا جو اتوار شام تک تیار ہو گئے۔ لُطف کی بات
یہ ہے کہ وینس ٹیلرز کا مالک کپُور خود سُوٹ لایا۔ مَیں نے سومتر سِنگھ کی مدد سے پگڑی کی پُونی کی، پگڑی
باندھی اور لڑ اِتنے نیچے رکھے کہ وُہ آنکھوں کے بیرُونی گوشوں کو مَس کر رہے تھے۔ جُوڑا پگڑی کے اُوپر
دکھائی دیتا تھا۔ مَیں نے اُسے ڈھیلا کیا، دبایا، پگڑی کا پچھلا لڑ اِحتیاط سے اُوپر کھینچا، جُوڑے پر پھیلا
کر کسا اور موڑ کر ٹانکا۔ پگڑی ہر زاویے سے سنوار کر مَیں نے اپنی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کا نیل گُوں رنگ
نِکھر کر چمک رہا تھا۔ میرا جذبۂ خُود پسندی! مَیں نے محسُوس کیا کہ وُہ رنگ، خُوشبُو کی طرح میرے وجُود

سے پھوٹ نکلے گا اور اِردگرد کے سارے ماحول کو مہکا دے گا۔

خود پسندی عارضی جذبہ ہے لیکن کم ظرف کی زندگی میں دوامی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سراب صفت خوب صورتی ہے جو ناظر میں ہیجانی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اُسے اپنی خرابی میں خوبی دکھاتی ہے۔

میں اپنے خیال سے رس لیتے ہوئے مسکرایا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جگمگاہٹ لیے پگڑی کی چونچ پر الپین سے 'جی' لکھنے لگا۔ سومتر سنگھ نے دیکھا اور میرا ٹھٹھا اڑایا، "دیہاتی کے دیہاتی رہے! انگریزی کا 'جی' اُردو میں لکھتے ہو۔"

اپنے پرانے کپڑوں کے ساتھ میں اِحساسِ کمتری سے نجات پا چکا تھا۔ میں چہک کر دُور کی لایا، "انگریز کے بچّے! یہ 'جی' اُردو ہی کا ہے۔ جی آیاں نُوں!"

"پورا لکھو۔ آدھا کیوں لکھا ہے؟ شرم آتی ہے؟"

میری زبان درازی سے وہ سکتے میں آگیا۔ اُس نے جلدی سے تھوکا اور خود کو سنبھالا۔ اُس کے تھوکنے کا انداز اُس کی دماغی کیفیت کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ کسی اُلجھن میں ہوتا اور کہیں تھوک نہ سکتا تو اپنے آپ پر خفا لگتا۔

"شرم کاہے کی بڑے میاں! جو بات مقدّر ہو، زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔"

اپنی پوری بات کہہ کر میں نے اُسے آنکھ ماری۔ اُس سے بات کرتے ہوئے میں آداب و القاب کا خیال رکھا کرتا تھا، میں نے انھیں یک لخت ترک کر دیا۔

"اوہ!"

میری جرأت نے اُس کی اُلجھن کو حیرت میں بدل دیا۔

"جی ی ی ی، جی آیاں نُوں!"

میں آداب بجالایا جیسے میں واقعی کسی پیاری چیز کے قدم لے رہا تھا۔ میرے قارئین حیران ہوں گے کہ وہ خود اعتمادی مجھ میں کیسے آئی؟ وہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں نے کس سے سیکھی؟ مجھے بھی نہیں معلوم لیکن میں اِتنا اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جب مجھے اُس کی ضرورت پڑی، میں نے اُسے پیش پیش پایا، بالکل ایسے جیسے بند پانی بہنا بھی جانتا ہے۔

میری نفاست پسندی! میں نے چارپائی پر کھڑے ہو کر پتلون پہنی اور اُس میں قمیض اِس سلیقے سے گھسائی کہ بیلٹ کے اُوپر قمیض میں ہلکی سی تہ دکھائی دی۔ نکٹائی کو دوہری گانٹھ لگائی اور اُس کی لمبائی حدِ حُسن تک رکھی۔ یہ میری پہلی جسارت تھی اور کامیاب جسارت تھی۔ سومتر سنگھ اپنی ٹائی کو اکہری گانٹھ

دینا تھا جو مجھے ناپسند تھی کیوں کہ وہ کسی مفلوج کی طرح ایک طرف کو جھکی رہتی تھی۔ اُس کے قمیض پہننے کا انداز بھی مجھے بے لطف لگتا تھا۔ پہلے وہ گلا پہنتا پھر آستینوں کو بازوؤں پر چڑھاتا اور یوں اپنے پھوہڑپن کا مُرقّع لگتا۔ مَیں نے پہلے آستینیں پہنیں، اُس کے بعد گلا اور ساتھ ہی جس نزاکت سے قمیض کو بدن پہ سرکایا اُسے کشیر انیریکا (محبّت کرتے کرتے ایسے لپٹنا کہ دو جسموں کا فرق مِٹ جائے) سے مشابہت ہے۔ گھر میں کُرسی نہ تھی۔ مَیں نے کھرّی پر تولیہ بچھایا اور اُس پہ بیٹھ کر موزے چڑھائے، گارٹرز پہننے اور ڈبّے میں سے بُوٹ نکالے۔ میرے اِطراف نئے کپڑوں کی خوشبو گھوم رہی تھی، اُس میں نئے چمڑے کی بُو سما گئی اور ایک انوکھے جذبے کو جگا گئی۔ مَیں بُوٹ پہننے لگا تو مجھے شوہارن کی ضرورت پڑی۔ مَیں نے اُسے بھی نئی فہرست میں شامل کیا اور وقتی طور پہ اُنگلی سے کام چلایا۔ تسمے پھندنے کی طرح باندھ کر مَیں نے بُوٹ، کپڑے سے صاف کئے، ہاتھ جھاڑ کر کوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہُوا، مَیں خُود کو پہچان نہ سکا۔ میری لبیں اتنی چھوٹی تھیں کہ ہونٹ صاف دکھائی دیتے تھے، اِس کے باوجود مَیں نے چور اور بے محل بال موچنے سے اُکھاڑ پھینکے اور باقی ڈھاٹا باندھ کر چپکائے۔ مَیں نے مُسکرا مُسکرا کر اِس زاویے سے مُنہ دیکھا اور کبھی اُس زاویے سے، ہاتھ پھیر پھیر کر رُخسار سنوارے اور رگڑ رگڑ کر اُن میں رنگ بھرا۔ میرے رُخسار، مُہاسوں سے پاک تھے اور جِلد بے عیب۔ عَلالت سے اُس میں پیلا پن آ گیا تھا، جس میں دِل پزیر رِقّت تھی۔ اُسے پیار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میری گُم شُدہ رُوح نئی آب و تاب سے لوٹ آئی اور مجھے آئینہ چُومنے پر اُکسانے لگی۔ مَیں نے شرماتے اور لجاتے ہُوئے اُسے چُوم ہی لیا۔ اُس کے بوسے میں بے دِل ہونٹوں کی سی گرمی تھی لیکن میری ادا نے مجھے مہکا دیا۔ مَیں دیکھنے لگا کہ اعضاء وُہی ہیں لیکن نُمود الگ ہے۔ جِلد میں نئی جاذبیّت ہے جس میں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ رگیں منوّر ہیں اور اُسی طرح اُن میں خُون کی موجیں۔ میری رُوح، جسم کو پہلی نظر کے گُداز سے دیکھنے لگی، مجھے اُکسانے لگی کہ مَیں اُسے بار بار دیکھوں، بار بار چھُوؤں اور اُسے گہرائی تک محسُوس کروں۔ میری بڑھتی ہُوئی خُود پسندی، خُود انہماکی اور خُود نمائی بنتی جا رہی تھی۔ مَیں اِدھر اُدھر گھُوم کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور خُود کو دیکھتا جیسے کوئی تخلیق کار اپنی بے نظیر تخلیق کے سامنے حیرت زدہ کھڑا ہو۔

مجھے دُولھا کی مانند نکھ سِکھ سے دُرست دیکھ کر ہر کوئی مُسکراتا اور آنکھوں سے چھُوتا۔ آنکھوں کے کِتنے کردار ہیں! اِس بار اُن کا کردار فن شناس کی طرح تھا۔ وہ پتھر میں چھُپے صَنم کو احترام سے دیکھتا ہے اور اُسے قابلِ اَفشا سمجھتا ہے۔

میرے دِل نے مجھ سے کہا، "تُم اجمل خاں روڈ پہ جاؤ اور وہاں آلُو کی ٹِکیاں کھاؤ۔"

ٹیکیوں کی ریڑھی پر سندریوں کا جھرمٹ ہوتا تھا۔ وہ جس نفاست و نزاکت سے ٹکیاں کھاتیں وہ منظر، منظر در منظر در منظر در منظر ۔۔۔۔ ہوتا۔ اُسے لفظوں میں بیان کرنا، مسخ کرنا ہے لیکن میرا قلم اُسے نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں ہے اور میں جسارت کر رہا ہوں۔

وہ دوشیزائیں پلیٹوں کو ہاتھوں میں تیرتا ہوا اٹھاتیں، چمچوں کو انگوٹھے اور اُس کے ساتھ کی دو اُنگلیوں کی مدد سے پکڑتیں، باقی اُنگلیوں سے ایسا نقشہ بناتیں کہ ہاتھوں میں چمچے کوئی دوسری ہی نفیس چیز لگتے۔ وہ ہاتھوں کی ہر حرکت کے ساتھ چمچوں کے زاویے بدلتیں، ٹکیاں قسطوں میں کاٹتیں اپنی مصروفیت میں تاکتیں، جھانکتیں، اٹھکیلیاں کرتیں، چمچوں کو نیم قوسی شکل میں ہلا کر کاٹتے ہوئے ٹکڑے اُٹھاتیں، مُنہ کھول کر چمچوں کو زبان پر لیتیں، دانتوں سے مُنہ میں لقمے سرکاتیں اور جس ادائے ناز سے اُنھیں کھاتیں وہ حُسنِ دلبری سے زیادہ خواہش گدازی تھا۔ اُن کے حُسنِ عمل کا حُسنِ انتظام ایسا تھا کہ وہاں ہر غمزہ جذبۂ خود آرائی سے سرشار تھا۔ جس کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوتی، وہ آہ، اوہ، اوئی، ری کرتی ہوئی ہونے کو تو شرمندہ ہوتی، درحقیقت وہ اپنی کیفیت کی آن بان بڑھاتی۔ اُن کی ادائیں اُن کی مشاطہ تھیں جو اُن کے رُوپ کو نت نئے طور سے سنوارتی تھیں۔ اُن کی لپ سٹک ویسے ہی سجی دھجی اور چمکتی دمکتی ہوتی لیکن اُن کی خود آگاہی! وہ ہونٹوں کو ایک دُوسرے پر جما کر ایسے دلرُبا انداز سے ہلاتیں کہ اپنا بوسہ آپ لیتی لگتیں۔ اُن کے ہونٹ، ناخنوں کے رقیب تھے اور ناخُن، گالوں کے۔ اُن تینوں کی دلبری کے لئے وہ چولیوں کی کٹوریوں میں سے ہلکے پُھلکے خُوش نُما رُومال ایک خاص جھٹکے سے نکالتیں جس سے پستانوں میں لرزش پیدا ہوتی جو میرے اندر طُوفان اٹھا جاتی۔ وہ ذرا سی بے حجابی مکمّل عُریانی کی سی ہوتی جسے دیکھ کر میں آپے سے نکل پڑتا۔ میں جسے پسند کرتا اُسے خواب گاہِ خیال میں اُٹھا لاتا اور وقت ملتے ہی اُسے اپنے وُجود میں تحلیل کر لیتا۔

میں اپنی غریبی میں اُن سندریوں کو دُور سے دیکھتا تھا لیکن اُن کے پاس جانے کی ہمّت نہ کرتا تھا۔ اب میں اُن سے آنکھیں لڑانا چاہتا تھا۔ میں نے سومتر سنگھ کو اجمل روڈ چلنے کے لئے مدعُو کیا لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ میں نے رام سنگھ کو بُلایا، وہ اپنے گاؤں کی لڑکی چرنجیت کور کے پاس گیا ہوا تھا اور رات کو دیر سے لوٹنے والا تھا۔ میں نے اکیلے ہی جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں احاطے کے دروازے تک گیا اور باہر جھانک کر اندر لوٹ آیا۔ میری شرمیلی طبیعت میرے عناصر کی کمزوری تھی۔ میں نے جیسے تیسے اُس احساس پر قابو پایا اور گھر سے باہر نکلا۔ میرے جانے پہچانے مجھے پھر سے جانتے پہچانتے لگے۔ ہر کسی نے اپنے طریقے سے مجھے دیکھا۔

"انگریزی میں بات کرنی پڑے تو مجھے بلا لینا!" سوتر سنگھ طنز آمیز دل لگی سے بولا۔
"چار پیسے کیا آ گئے ہیں، اوقات بھول گیا ہے!؟" بے انت کور کی زبان، کھال کنڈ کی طرح بھبکی۔
"فارس کے کتے فارسی بولتے ہیں! لیکن ہندوستانی کتے انگریزی!"
لابھ سنگھ نے اپنی گندی رائے اسی دن دے دی تھی جس دن اسے اطلاع ملی تھی کہ میں انگریزی طرز کے کپڑے سلوا رہا ہوں۔ کسی نے نصیحت کی تو جگت سنگھ نے۔
"روپے آئے ہیں تو انھیں سنبھال کر رکھ! روپیہ کمانا مشکل ہے اور اڑانا آسان!"
لیکن میرے شعورِ خام نے میری ساری مصیبتوں کا ماخذ، لباس بتلایا اور اس کا فوری اور کارگر علاج بھی لباس۔ جیسے گندے نالے کی پہچان اس کی بدبو ہوتی ہے اسی طرح میرے لئے میرا لباس تھا۔ مجھے دور ہی سے دیکھ کر لوگ میری اصلیت کا اندازہ لگا لیتے اور مجھ سے ویسا ہی سلوک کرتے۔ ایک دن میں راجندر نگر سے گزر رہا تھا۔ کسی آدمی نے خود کو مجھ سے امرجیت سنگھ کے نام سے متعارف کروایا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ سوٹ بوٹ پہنے ہوئے تھا اور کسی کھاتے پیتے گھر کا لگتا تھا۔ اس نے مجھے ایک جگہ روک لیا اور مجھے روشن مستقبل کے خواب دکھانے لگا۔ ممکن ہے کہ لونڈوں کا ایسا مستقبل ہو لیکن میں نے اسے جان بوجھ کر ٹھکرایا ہے۔ قرآنِ حکیم نے امرد دل اور امرد بازوں کو ملعون و مطعون ہی ٹھہرایا ہے۔
سوٹ پہننے سے پہلے میں نے سائیکل دھوئی تھی اور پھر تیل کا ہاتھ لگا کر سوکھے کپڑے سے پونچھی تھی۔ وہ نئی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں اس پر سوار ہوا جیسے عقاب پر مارتا مارتا، بیٹھتا بیٹھتا شاخ پر بیٹھتا ہے۔ میں بوٹوں کے پنجوں سے پیڈل دبا رہا تھا کہ گھٹنے اونچے رہیں اور نقل و حرکت میں حسین لگیں۔ آٹھ دس پیڈل آگے مار کر میں دو چار پیڈل پیچھے گھماتا اور گھنٹی بالکل نہ بجاتا، راہ رو کے عین پیروں کے پاس بریک لگاتا، پہیوں کی اچانک رگڑ سے اسے چونکاتا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اس کے پہلو سے تیزی سے نکل جاتا۔ میں ریگڑھ پورہ سے دیو نگر اور رہتک روڈ کے راستے اجمل خاں روڈ پہنچا۔ ہر کوئی اپنے آپ میں مست تھا۔ کسی نے مجھے قابلِ قدر نظر سے نہ دیکھا۔ مجھ میں وہ جذبہ نہ ابھرا جس سے برتری کا احساس ہو۔ ٹکیوں کے ٹھیلے پر دوشیزاؤں کی چہل پہل تھی۔ ان کی قربت کا لطف اٹھانے کے لئے میں نے ٹکیاں کھائیں۔ میری بے کسی! کسی نے مجھ میں وہ دلچسپی نہ دکھائی جس کی مجھے امید تھی۔ میری سرمستی اور سرخوشی یک طرفہ تھی۔ کسی کو میرے پرانے اور نئے لباس میں تمیز نہ تھی۔ میرے جذبات میرے عمل سے پیش پیش تھے اور یہی وہ صورتِ حال ہے جہاں انتشار کا دور دورہ ہے۔ وقت گزرنے لگا۔ اور میں

زمانے کی ناقدری سے اُداس رہنے لگا۔ مَیں نے تصوّر میں جتنے سبز باغ دیکھے تھے وُہ حقیقت میں ویرانے تھے۔ مَیں پہلے سے بدتر تھا لیکن مجھے تسلیم کرتے ہُوئے ڈر لگتا تھا۔

تایا جی کہتے تھے، "آدمی جو اندر ہے وُہی باہر ہے"۔

مجھ سے باہر میری بے مایگی تھی۔ اَور بے مایگی بھیانک بے قراری ہے، افراتفری ہے جو آدمی کی اَصل پر چوٹ کرتی ہے اَور اُسے تہس نہس کر دیتی ہے۔

میری اُس حالت میں بھی مجھے امرجیت سنگھ جیسے ملے لیکن اُن کی پُہنچ اُس سے الگ تھی۔ اُن کا مُدعا تھا کہ وُہ مجھے اِستعمال بھی کریں اَور مجھ سے فائدہ بھی اُٹھائیں۔ جو کوئی خُود کو نہ بچا سکے گا، زمانہ اُسے کھا جائے گا! یہ قانونِ حیات ہر شعبۂ حیات پر لاگُو ہوتا ہے۔ مَیں جانتا تھا لیکن مَیں نے بھُلا دیا تھا۔ مَیں خام کار تھا اَور خام کار رہا۔ میرے شناساؤں پر میری اِمارت کا اثر میری اُمید کے بر عکس تھا۔ پہلے وُہ حریف، ہمدرد تھے اَور اب حریف، حاسد۔

تعجّب کی بات یہ ہے کہ میرے خُوبصورت لباس کا اثر مجھ پر اُلٹا ہُوا تھا۔ نرم و نازک جذبے جو بصورتِ دیگر میرا اوڑھنا بچھونا رہتے تھے یکسر غائب ہو گئے اَور علم و ہُنر بڑھانے کے خیالات غارت۔ ذاتی خُوبیوں کو بڑھانے کی آگ میرے اندر مُتواتر جلتی رہتی تھی، وُہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ خواہش اپنے سے الگ کسی دُوسری چیز میں اپنی تکمیل دیکھتی ہے اِس لئے اپنی مُصیبت بنی رہتی ہے۔ مجھ پر حرص و ہوس مُسلّط ہو گئی۔ بداخلاقی زُود اثر زہر کی طرح میرے کردار میں نفُوذ کر گئی اَور اُسے مفلُوج کر گئی۔ مَیں اِس سوچ میں مَست رہنے لگا، "میرے پاس کار ہو، کناٹ پلیس میں بنگلہ ہو اَور دِل بہلانے کے لئے خُوب رُو کنواریاں مجھے دولت ملے"۔ چُوں کہ محنت، دولت کا سرچشمہ نہ تھا، مَیں مُجرمانہ طریقوں سے دولت بٹورنے کا خیال کرنے لگا۔ محنت کے برعکس دولت، حیات کا ایسا حاصِل تھا جو ہر چیز کا نعم البدل تھا۔ یہ جادُوگرنی تھی جو ہر سُندر چیز کا رُوپ دھارن کر سکتی تھی۔ میری بے حِسی! مجھے ساحِر کا کلام بے معنی لگنے لگا اَور اپنے کپڑے پُرانے جو ایک شوب نہ پڑے تھے۔ مجھے لگتا کہ دُوسرے مجھ سے بہتر کپڑے پہنتے ہیں بلکہ اُن پر کپڑے زیادہ پھبتے ہیں۔ جب سہل پسندی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے تو زندگی ایک ڈھرّے پر چلتی ہے اَور ایسی جبلّتوں کا دَم بھرتی ہے جو اپنی نفی آپ ہوتی ہیں۔

جب مَیں کام کرتا، پُوری نیند سوتا، سویرے بیدار ہوتا تو جسم مزے دار بے کیفی سے چھلکتا جو انگڑائی لیتے ہی تر و تازگی میں بدل جاتی۔ سخت کامی میری رگوں کو وُہ توانائی فراہم کرتی جو خُود کار و خُود پرور تھی اَور میری مُستعدی کا دستِ راست۔ میرے مجہُول معمُول نے میری حِسوں کی جمعیّت بندی کو ڈھکے

چھپے بکھیرا لیکن اُس کی شدت سرگرم مخالفت سے زیادہ تھی۔ دِن سے رات لمبی اور مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ تھی لیکن میری نیند پوری نہ ہوتی۔ نیند سے تکان اُترنے کے لئے بجائے تکان بڑھنی جیسے وُہ طاقت کا تحلیل خانہ ہو۔ مَیں تندرست بیمار تھا۔ مَیں جتنا وقت کام پر جانے آنے میں لگاتا تھا اُس سے زیادہ بننے سنورنے میں گزارتا اور پھر گھر سے باہر نکلتا۔ ایک دِن مَیں گھومتا ہُوا ٹالکٹورا گارڈن میں جا نکلا اور مایا کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ وُہ مجھے پہچان نہ سکی اور دیکھ کر انجان ہوگئی۔ مایا اور لالی نے مجھے میری آواز کے آئینے میں دیکھا اور پہچانا۔ لالی مجھ پر لپکی اور اپنی اُمنگ اور ترنگ میں سمت کھو بیٹھی اور پانی کی کیاری میں اُتر گئی۔ اُس سے اُس کا خروش ٹھنڈا نہ پڑا۔ وُہ بدن جھٹک کر میری جانب دوڑی۔ مَیں نے سائیکل آگے رکھ کر اُسے روکا اور مایا نے اُسے جھڑک کر بھگایا تو مجھے اطمینان ہُوا۔ وُہ مجھ سے کچھ دُور ہو کر بیٹھ گئی لیکن بے چین رہی۔ مایا نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور چہک کر کہا، "ایک دم لاٹ صاحب لگتے ہو۔"

اُس کا جذبہ میرے جذبے کی تجدید کر گیا۔ مَیں چاہنے لگا تھا کہ دُوسرے میری آرزو کو پہلے ہی سے جان لیں اور اُسے نہایت سلیقہ مندی سے پُوری کریں۔ چُوں کہ لوگ ایسا نہ کرتے تھے میرے جذبے سے وُہ لطافت غائب رہتی جو ستائش گر کی ثنا گوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے جذبۂ نام و نمود نے میری تمیزِ خود پسندی اِس قدر بڑھا رکھی تھی کہ مجھے پھُولوں کا حُسن پھیکا لگا۔ مایا نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ مَیں جس سبزے کے لمس کو ترسا کرتا تھا، اُس پر تاول بچھا کر بیٹھا۔ مَیں اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھاتا ہُوا سبزے کو چھُو لیتا تو ہاتھ جھاڑ کر صاف کرتا جیسے کسی گندی چیز کو چھُو لیا ہو۔ لالی ہمکتی اور کُوں کُوں کرتی وہیں بیٹھی رہی اور مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وُہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے اُسے پیار نہ کیا۔ مایا سے بھی میرا رویّہ بے تکلف نہ تھا مَیں کیسا بدل گیا تھا۔ رُوح افزا ٹھنڈک، راحت آمیز نرم دھُوپ، سوسنِ نوخیز سا آسمان، صحنِ گلستاں سی دھرتی، بُلبل کے نغمے کی نشاطِ سرمدی، جادُو جگاتی نکھری سُتھری فضا، نفس پرستی کے جذبے کی طرح کیف پرور ہوا جس کی عشرت سامانی پاک باز کنواروں اور کنواریوں کو ورغلاتی ہے اور اُنھیں ہوَس پسند بناتی ہے۔ سب کچھ بہار سامان تھا لیکن کسی شے میں وُہ دِل رُبائی نہ تھی جو پہلے خاص کر ہوتی تھی۔ اُسی جگہ بیٹھ کر مَیں ساحر کا کلام پڑھتا اور گاتا تھا اور ہر لفظ زندگی سے بھر کتا ہُوا پاتا تھا۔ عہدِ رفتہ کی تجدید کے لئے مَیں نے ساحر کے اشعار گنگنانے شرُوع کئے لیکن بند کر دیئے۔ وُہ اُس دردو کرب سے خالی تھے جو میرے دِل کو پگھلا کر اشکِ رواں بنا دیتے تھے۔ مایا خود مجھے بدشکل دکھائی دے رہی تھی۔ مَیں اُکتا کر وہاں سے جانے لگا۔ مایا نے ادھ کھلے گلاب کی کلی توڑی اور میرے کوٹ کے پھُول کاج میں لگا دی

اُس کا یہ ناز مجھے پسند آیا اور مَیں نے خوشی سے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ میری خود پرستی کی رعونت! دُوسروں کے تعلّق سے میرے سارے جذبے ایک ہی جذبے میں ڈھل گئے۔ جو کوئی مجھے دیکھے، میری عزّت کرے اور مجھے سراہے۔

مَیں وہاں سے تین مورتی پہنچا۔ کاریگر کام بند کر چکے تھے، امر سنگھ اور پیارا سنگھ پروگرس نوٹ کر رہے تھے۔ اِس سے پہلے کہ مَیں سائیکل کھڑی کر کے آگے بڑھتا اور کوئی بات کرتا، امر سنگھ نے ناک سُڑک کر کہا، "اینٹ سیدھی نہیں لگا سکتا اور سُوٹ پہن کر دِکھانے آیا ہے!"

مجھے دھچکا لگا اور مَیں ایسے رُکا جیسے کسی غیر مرئی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔

"اِنگلینڈ میں بھنگی بھی سُوٹ پہنتے ہیں!"

امر سنگھ کی طنز و تحقیر کی کسک دبی نہ تھی کہ پریتم سنگھ نے مہنا مارا۔ مہنا، بھالے کی طرح ہے جسے دِل پھٹ کر ہی برداشت کرتا ہے۔

اُن کے نرم گرم رویّے کے برعکس مَیں اُن کی عزّت کرتا تھا اِس لئے میرے دِل میں کچھ جھجک اور کچھ حیا تھی، وہ اُڑ گئی اور میری رگوں میں آتشِ سیّال دوڑ گئی۔ مَیں نے کسی طرح اپنے آپ پر قابو پایا لیکن اُن کے غیر ضروری مخاصمانہ رویّے پر حیرت زدہ کھڑا رہا۔ مجھے معلوم ہونے لگا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ میرے کپڑے پھاڑ کر مجھے ننگا کر رہا ہے۔

"اپنے رشتے داروں سے مِلنے کے لئے اِنگلینڈ جانے کا اِرادہ ہے کیا؟" بچتر سنگھ نے مسکرا کر زہر اُگلا۔

مَیں نے اُسے اُس بے کلی سے دیکھا جو ہتھیار بند کے سامنے نہتّے کی بے کسی ہوتی ہے۔

"باپ کے چُوتڑوں میں بُرادا گھسا ہوا ہے اور بیٹا انجنیئر بننے کا خواب دیکھتا ہے۔"

پریتم سنگھ نے میری اَصل پر چوٹ کی اور مجھ پر حقارت بھری نظر ڈالی۔

اِنسان کے بننے اور بگڑنے کا سِلسِلہ اِس کے جنم سے شروع ہوتا ہے اور مرن تک جاری رہتا ہے۔ ادھورا پن اِنسان کی سرشت کا جزوِ ناگزیر ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہر فرد اسے اپنے حق میں مُبارک اور دُوسرے کے حق میں نامُبارک خیال کرتا ہے۔ میری ناکامیاں، کمزوریاں اور بدنامیاں زِندہ چیزوں کی طرح میرے ساتھ لگی پھرتیں اور مجھ سے اِس قدر نُمایاں رہتیں کہ مَیں جہاں ہوتا میری جگہ لوگوں کو وُہی نظر آتیں۔

مَیں پُوری اُونچی آواز سے چِلّایا، "میرے ہی باپ کے کیوں؟ تم سب کے باپوں کے چُوتڑوں میں

بُرا داگھسا ہُوا ہے۔ تُمہارے اپنے گھسا ہُوا ہے! تم اِس لئے جَل مرے ہو کہ میرے جُوتوں میں سے وُہ فاسد مال کیوں نکل گیا؟ اپنے جلال میں مجھے لگا کہ میری آواز دُور آسمان تک پُہنچی ہے اور اُس سے ٹکرا کر ساری دھرتی پر پھیل گئی ہے اور میری پُوری ذات برادری نے سُن لی ہے۔ وُہ اپنی تندی میں اُن کے جنم میں تھوک گئی ہے اور اُنھیں جنم جنم تک ذلیل کر گئی ہے۔ خُود کو اُن سے الگ پاکر میں نے سربلند محسُوس کیا۔

اَمر سنگھ رُکتا ہوا آگے بڑھا میرے قریب آیا اور کاندھے پر ہاتھ رکھنے لگا۔ مَیں نے اُسے جھٹک دیا، اپنا ہاتھ رُومال سے صاف کیا جیسے گندی چیز کو چُھو لیا ہو۔ اُس نے مُجھ سے کُچھ کہا لیکن مَیں نے کُچھ نہ سُنا۔ میری قُوّتِ حقارت، قُوّتِ سماعت پر غالب آگئی۔ اور جب ایک حِس اپنے عرُوج پر ہو، یہ دُوسری ساری حِسوں کو مفلُوج کر دیتی ہے۔ علاوہ بریں نفسیات کا یہ پہلُو بڑا خطرناک ہے کہ یہ صرف اپنے مطلب کا لحاظ کرتی ہے۔ جب مُخاطب کا ارادہ صاف ہو تو اُس کا اپنے حریف سے کُچھ کہنا نہ کہنا برابر ہے کیوں کہ وُہ جانتا ہے کہ اُس کے الفاظ بظاہر کُچھ اَور ہیں لیکن اندرونی طَور پر کُچھ اَور۔ میری ہیجانی کیفیت نے میری مجرُوح ذات کو اُکسایا، "تُم اپنے ذلّت آمیز ماضی کو مِٹا دو، جس نے تُمہاری ہر خُوشی غارت کر رکھی ہے اُن سارے افراد کو قتل کر دو جو تُمہاری کمزوریوں اَور بدنامیوں سے واقف ہیں۔ تُم کسی ایسے فرقے کا نام اپنا لو جس کی اصل آفاقی اَور تاریخی ہو اَور یُوں نئی زندگی کا آغاز کرو جس کے سب ستائش گر ہوں۔"

باب ۶۷

کمزوری اَخلاق جہاں پلتی ہے
ہلکی سی بھی تنقید وہاں کھلتی ہے
ہر سانس میں ہوتا ہے تناؤ ایسا
لگتا ہے کہ آری سی کوئی چلتی ہے (شاطر)

میری رُوحانی تکلیف اپنی ہی نوعیّت کی پریشانی تھی اَور اُسی طرح اِس سے پیدا شُدہ ذہنی

اذیت۔ بھگت سنگھ کی وجہ سے میرے نو ندھ اور بارہ سدھ ہوئے لیکن میں اُس سے ملنے سے کترانے لگا۔ مجھ پر وہی جذبہ مسلّط تھا، جو احسان فراموش مقروض کے دِل میں اپنے محسن کے بارے میں ہوتا ہے۔

جوانی کی صحت چاند کی طرح ہے، جسے گھٹتے دیر لگتی ہے اور نہ بڑھتے۔ میرے رُخسار دمکنے، ہونٹ دہکنے اور سانس مہکنے لگے۔ میری اداؤں میں بے باکی اور باتوں میں شوخی آگئی۔ میں کبھی رام سنگھ کے ساتھ سیر کرنے جاتا اور کبھی سومتر سنگھ کے۔ میں جس کے ساتھ ہوتا اُس پر پیسے خرچ کرتا۔ اپنی دریا دِلی کی دھاک جمانے کے لئے میں کہیں بڑا نوٹ تڑاتا، جڑاتا اور ریزگاری گنے بغیر ہی جیب میں رکھتا۔ میرے اچھّے حالات نے مجھے نئے طریقے سے خراب کر دیا ورنہ میں کار آمد دوستوں اور فضول جذبوں میں فرق کرتا، اپنے بے کار ذہن کے اوباشانہ ولولے کو سمجھتا۔ ایسے جذبے اور ولولے ریاکار دوستوں سے زیادہ زیاں کار ہیں کیوں کہ اُن کے طریقۂ عمل پر شک کرنا اپنی دیانت داری کو جانچنا ہے اور ایسی جُرأت بالغ نظر ہی کر سکتا ہے۔ دِکھاوے کی زندگی جینے کے لئے میرے پاس ایسی چیزیں جمع ہونے لگیں جن کی مجھے ضرورت نہ تھی۔ میں فراغِ خاطر کے لئے سج دھج کر بازاروں میں گھومتا، نظر بازی کرتا، پارکوں میں بیٹھتا، ہوٹلوں میں کھانا کھاتا لیکن میرا دِل نہ بہلتا۔ رگ و ریشہ کی ساری گرمی میری رگِ جاں میں اکٹھی رہتی، وہ وہاں ایسے جلتی جیسے موم بتّی میں فتیلہ۔ میری طبیعت میں ایک اِضطراب تھا جو کسی صُورت کم نہ ہوتا۔ اِس کا کیا سبب تھا؟ میں جذباتِ رفتہ کا سُراغ لگاتا ہوں۔ میں حدِ خود آگاہی سے نکل چلا تھا اور اپنے آپ کو ہر کسی سے مُمتاز سمجھتا تھا اور صرف اپنے جیسوں سے ملنا چاہتا تھا اور میرے جیسے کم یاب تھے۔ کوئی کردار میرے مطمحِ نظر پر پُورا اُترتا تو وہ فلمی ہیرو کا تھا۔ میں خود کو ہیرو سمجھتا اور ہر لڑکی کو ہیروئن۔ ضبطِ نفس اور مشاہدۂ نفس جو ترقّیِ نفس کے سرچشمے ہیں، میرے وُجود میں ایسے سُوکھ گئے جیسے موسمِ گرما میں برساتی نالے۔ میرے سارے کردار مر گئے، ایک بوالہوس زندہ رہا۔ اور بوالہوس کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ اُصول کی جگہ بے اُصولی نبھاتا ہے اور انجانے میں احساس کی پاکیزگی سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اپنے کھوکھلے پن میں وہ ہیجانی جذبے کا پیچھا کرتا ہے، اُسے ہر دوسرا جذبہ پہلے سے زیادہ بھرپُور اور سچّا لگتا ہے جو اُسے اُس پُر اسرار مسرّت کا یقین دلاتا ہے، جو اُس کے پہلے جذبے سے غائب ہوتی ہے۔

میں اجمل خاں روڈ پر کھڑا نظر بازی کر رہا تھا، سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ میں ہوس مست نے اُسے آنکھ ماری، وہ جواباً مُسکرا پڑی۔ وہ پاس سے گزری، میں نے اُس کے کولہے

پر چٹکی بھرلی ، وہ بپھر گئی اور شور مچانے لگی ۔ میری قسمت اچھّی تھی ! جب تک کسی نے اُس کا مطلب سمجھا میں شاطر لو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ۔

مجھے یاد ہے کہ پُشپا کو دیکھ کر میرا دل دھک دھک دھڑکتا تھا ۔ میں اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتا تھا ، اُس سے کوئی بات کرتا تو میرا دل ٹھہر سا جاتا ۔ میرا رویہ معصوم بچّے کا سا تھا ۔ وہ ماں کی گود میں رہ کر کسی کو دُور سے دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے لیکن اُس کے پاس جانے سے ہچکچاتا ہے ۔ کچھ ایسی ہی نفسیات شریف آدمی کی ہوتی ہے ! وہ پہلا جرم کرتا ہُوا ڈرتا ہے اور کسی حد تک اپنی جسارت سے نفرت بھی کرتا ہے لیکن جب جرم ، سُبھاؤ کے مرتبے کو پہنچ جائے تو وہ بے شرم اور بے رحم ہو جاتا ہے اور جرم کے تحفّظ کو اپنا دھرم سمجھتا ہے ۔ ہر عیب میں خُود تخریب کے عناصر چھُپے ہیں لیکن عیب پرست کو نظر نہیں آتے ہیں ۔

کردار اپنا صلہ آپ ہے اِس لئے اِنسان کا وقار ہے اور اِسے کہیں بھی سرفراز رکھتا ہے ۔ بد اخلاقی ، گندگی ہے ۔ ۔۔ کے سرچشمے کو آلُودہ کرتی ہے اور آخر کار اُسے آبِ مُردہ میں بدل دیتی ہے جیسے آبِ مُردہ میں کوئی ... زندگی نہیں پھولتی پھلتی ، اُسی طرح بدکردار میں انسانی خُوبی ۔

اور جو آدمی اپنی اخلاقی اور سماجی ذمّہ داری کو نفس پرستی ، بے آئینی اور مفرور تمنّا کی نذر کرتا ہے وہ اپنے چلن سے اپنے جنگلی اسلاف سے جا ملتا ہے کیوں کہ اخلاقی اور سماجی قدروں کی پیروی کے لئے ہی وہ اُن سے جُدا ہُوا اور شہری بنا تھا ۔

میرے نرم و نازک جذبات میری سربرآوردہ خواہش کی آگ میں جل چکے تھے ۔ میں حیران ہُوں کہ میں چکلوں کی جانب کیوں متوجّہ نہ ہُوا ؟ میری نفسیاتی ضرورت میری خُود فریبی ہی کی مرہُونِ منّت رہی ۔ بے کاری اور بے مقصدی کی مستی چند دن ہی بھلی لگتی ہے ۔ حالات کا جمُود رنگ دکھانے لگا اور میں کوئی نیا کام کرنے کے اِمکان پر غور کرنے لگا جس میں محنت کم اور حاصل زیادہ ہو ۔ میرا ہر منصُوبہ ، خیال کی حیات پیدا ہوتا اور سرگوشی کی موت مرجاتا ۔ میری مالی حالت بگڑنے لگی اور میں اُسے بحال کرنے کے لئے شرمناک اور مخربِ اخلاق طریقوں پر غور کرنے لگا ۔ میری مجرمانہ جبلّتیں سر اُٹھانے لگیں ۔ میں ایسی تدبیریں سوچنے لگا ، جنھیں کامیاب بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے ، غیر قانُونی زندگی کی روا داری ۔ میں جو کرنا چاہتا تھا ، عملاً نا ممکن تھا اور جو کرتا تھا اُس سے بے زار ۔ میری بے سمتی اور کم ہمّتی نے میری آسُودگی کو گھناؤنی زندگی میں تبدیل کر دیا ۔ جیسے شب پرورده اُجالے میں دیکھ نہیں سکتے ، اُسی طرح تنگ نظر وُسعتِ حیات میں ۔

باب ۶۸

چہرے کی ہر لکیر ہے تاریخ کی صدا
دِل کا ہر ایک زخم ہے اُمید کی کرن (شاطر)

میرا سرمایہ ختم ہونے لگا اور یہ جانتے ہوئے کہ آنے والا حادثہ ٹل نہیں سکتا، مَیں اُسے ٹالنے لگا۔ کب تک ٹالتا؟ مَیں نے اوزار کی جانب دھیان دیا اور اُنھیں زنگ آلود پایا۔ مَیں نے اُنھیں مٹّی سے رگڑا، پانی سے دھویا، پونچھا، سُکھایا اور تلاشِ معاش میں نکل پڑا لیکن اِس بار مَیں اکیلا نہ تھا۔ سومتّر سنگھ کا چاچا امر سنگھ میرا ساتھی تھا، جو دو تین دِن پہلے دِلّی آیا تھا۔ اُس کی اور میری جوڑی ہو گئی اور کام ملنے میں آسانی۔

زندگی اُسی ڈھرّے پر آگئی جِس سے مَیں نفرت کرتا تھا۔ وہی گندے کپڑے، وُہی گھناؤنے فِقرے، وُہی دِل کے دُکھڑے، وُہی جذبے اُکھڑے اُکھڑے۔ کم ہمّت راستے کی گھاس طرح ہوتا ہے جو سَر اُٹھاتے ہی کُچلا جاتا ہے۔

تین مُورتی کا کام جاری تھا کہ ہزاری لال کو پنڈارا روڈ پر نیا کام مِل گیا۔ اُس نے چھوٹی کار بیچ کر بڑی کار خرید لی اور شوفر کو وردی بنوا دی۔ پہلے وُہ کام پر وقت بے وقت آتا تھا اِس لئے اُس کے خیر مقدم کے لئے کوئی موجُود نہ ہوتا تھا۔ اب وُہ کام پر باوقت، بے وقت آتا جب تک اُس کے اہلکار اور چھوٹے ٹھیکیدار اِنتظار کرتے کرتے اُوب جاتے۔ اُس کی کار کبھی اِدھر کھڑی ہوتی اور کبھی اُدھر، اہلکاروں اور ٹھیکیداروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک آگے بھاگ کر کار تک پُہنچتا اور وُہ کام کرتا جو عام طور پر شوفر کی ذِمّہ داری ہوتی ہے۔ اُسے لالہ جی کے نام سے بُلایا جاتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو 'رائے صاحب' کے خطاب سے موسُوم کر لیا اور وُہی اُس کا نام پڑ گیا۔ اگر جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آتا، وُہ پہلے اُسی کو پُوچھتا، آداب وسلام کا جواب نہ دیتا، چیخنے کے سے انداز میں بات کرتا اور بات کرنے والے کی ہر بات میں کیڑے نکالتا۔ کوئی اُسے اہم بات یاد دِلاتا، وُہ بے پروائی سے کہتا، "کوئی اور بات کر، یہ ہم جانتے ہیں" یا "ہم سے کام کی بات کیا کرو، ورنہ چُپ رہا کرو۔"

اُس کی غیبت میں اُودھورام اُسے گالی دے کر کہتا، "سنجے کی اولاد! اِسے ہر بات کی خبر ہے"*
(* سنجے، مہابھارت کا ایک کردار، جو آنکھوں سے دُور ہونے والے حادثے کو دیکھ سکتا تھا)

اُودھورام کی طرح ہر کوئی ہزاری لال کو گالیاں دیتا، اُس کی بدزبانی پر خون پیتا لیکن اُس کے سامنے بھیگی بلّی بنا رہتا، پیچھے فقرے کستا، کردار پر حملے کرتا جب ضرورت ہوتی خوشامد کرتا اور ہاں میں ہاں ملاتا۔

ہزاری لال کو دیکھنے سے لگتا کہ وُہ جو کھاتا ہے کسی طرح خارج نہیں کرتا ہے۔ اُس کے اندرونی اَعضا اُس فاضل مادے کو قبول نہ کرتے اور اُسے باہر دھکیلتے جس کے نتیجے میں وُہ بیرُونی حصّوں پر گرنے کی حالت میں چپکا نظر آتا۔ قد کے لحاظ سے ہزاری لال پہلے ہی بے ڈھب تھا، اب وُہ بے ڈھبے پن کی اِنتہا کو پُہنچ گیا۔ سر پیندا پچکے گھڑے کا سا ہو گیا، گردن پر گوشت کے پھندے نظر آتے اور شانے تختے جیسے چپٹے۔ چھاتی ڈھلک کر ڈھیلے مموں کی طرح لٹک پڑی اور کمر، کولھوں میں دھنس گئی۔ بھرتی ہوئی ٹانگوں کے اُوپر جوتڑ جگالی کرتے اور کپڑا کھاتے لگتے۔ بغلیں بھر گئیں جس سے باہیں، دھڑ سے زاویے بنانے لگیں۔ جوڑ چربی میں دب گئے اور اعضا چربی کے تودے دکھائی دیتے۔ ابرو، آنکھوں پر اور گال، گالوں پر چڑھ گئے۔ ماس چوٹ کھائے ماس کی طرح سُوج گیا۔ کار سے باہر نکلتے نکلتے اُس کا سانس پھُول جاتا۔ وُہ تھکی تھکی حرکت سے اُس رطُوبت کو پونچھتا جو رِستے رِستے ٹپکنے کے قریب ہوتی۔ توازُن قائم رکھنے کے لئے اُسے پیچھے جھکنا پڑتا جس سے اُس کا چھوٹا قد اور بھی چھوٹا نظر آتا۔ وُہ پیٹ کو آگے کی طرف دھکیلتا ہُوا چلتا اور مضحکہ خیز لگتا۔ اُس تھکا دینے والے عمل سے بچنے کے لئے اُس نے کار سے نکلنا بند کر دیا۔ وُہ اندر بیٹھے، باہر کھڑے آدمی سے سوال کرتا جسے جھک کر جواب دینا پڑتا۔ وُہ اُس سے جس طرح کا ہدیۂ احترام وصول کرتا وُہ کسی دُوسری صُورت میں ناممکن تھا۔ اُس کی بے کسی وُہ کام کر گئی جو اکڑبازی نہ کر سکی۔ حالاں کہ اُس کی حالت مفلوج کی سی تھی لیکن صحت مندوں کے غلامانہ چلن سے اُس کی انانیت کو وُہ تسکین ملتی ہو گی جو کسی بدشکل کو اپنے سے زیادہ بدشکل کو دیکھ کر۔

جنگلی لوگوں میں حقُوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس لئے سب برابر تھے۔ لیکن تمدُّن نے متمدّن لوگوں کو حقُوق دے کر اُن کی اپنی ساری ذِمّہ داری، جواب دہی، دِل پذیری، شائستگی ---- کا بوجھ عوام پر ڈال دیا۔ پہلے وُہ جسے بُلاتا اُس کے نام ساتھ 'جی' کی اضافت لگاتا تھا، اب اُس نے وُہ صِفت لگانی چھوڑ دی۔ اُس کے لہجے کی دُرشتی، بدتمیزی کے مُماثل ہو گئی۔ اُس کا اثر اُس کے اہلکاروں اور پٹی کنٹریکٹروں پر الگ نظر آتا۔ وُہ اُن کتّوں کے سے لگتے، جن کی دُمیں سامنے ہوں۔

سُرجن سنگھ، ہزاری لال کے پاس معمار تھا۔ کوئی اُس سے پُوچھتا کہ وہ کیا کرتا ہے تو وہ فخر سے کہتا، "مَیں پیٹی کنٹریکٹر ہُوں"۔ ہوتے ہوتے وہ واقعی پیٹی کنٹریکٹر ہو گیا اور اُس کے ہاتھ کے نیچے دس پندرہ معمار، مزدور کام کرنے لگے۔ وہ اُوپر کا کام دیکھتا اور اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ اُس کی نفسیات ہی بدل گئی۔ اُسے کوئی جانا پہچانا آدمی مِلتا اور اُس سے پُوچھتا کہ کیا کرتے ہو تو وہ تُرنت کہتا، کرنا کیا ہے! مزدوری کرتا ہُوں۔ اُس کی پُورے طور پر صاف گوئی سے لگتا کہ اُس نے مزدوری کی عظمت کے راز کو پالیا ہے جسے وہ عام کر رہا ہے۔ اُس کے طنزیہ انداز کو وہی پہچان سکتا جس نے پہلے اُسے اپنے پیشے کو چھُپاتے دیکھا تھا۔

جُوں جُوں مکان تیّار ہونے لگے، تین مُورتی کے کاریگر اور کامگار پنڈارا روڈ جانے لگے۔ امر سنگھ اور مَیں اور کچھ مزدور پیچھے رہ گئے۔ ہم دریسی کے ساتھ چھوٹے موٹے کام نپٹانے لگے۔ مکانوں پر قبضے ہوتے لگے، آخری مکان پر قبضہ ہونے تک ہم اُسے ذاتی ضرورتوں کے لئے اِستعمال کرتے رہے۔ جس دن اُس پر قبضہ ہُوا، ہم نے جھاڑیوں کی اوٹ سے کام چلایا حالاں کہ ایس۔ ڈی۔ او۔ نے ایسا نہ کرنے کی ہدایت دی تھی لیکن ہم کیا کرتے؟ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں دُور دُور تک پبلک باتھ رُوم نہ تھا۔ دُوسرے دن کھانے کا وقت آیا اور مَیں قریب کے مکان سے پینے کے لئے پانی لینے گیا۔ مَیں نے کال بِل بجائی دروازہ کھُلنے میں دیر لگی تو دوبارہ بجادی۔ جس عورت نے دروازہ کھولا، اُسے دیکھ کر لگا کہ وہ سوتی ہُوئی اُٹھ کر آئی ہے۔

"کیا ہے؟ کون ہے تُو؟" اُس نے کچھ آلکسی سے پُوچھا۔

"جی، مَیں معمار! پینے کے لئے پانی چاہیئے۔"

کچھ اپنی ندامت چھُپانے کے لئے اور کچھ ضرورت کا اِحساس دِلانے کے لئے مَیں نے ڈبّا آگے بڑھایا۔

"یُوں فُول گٹ لوسٹ! یُو ڈسٹربڈ اس! بے وقُوف دفع ہو جا! تُو ہمارے آرام میں مُخل ہُوا ہے۔"

اُس نے میرے ہاتھ سے ڈبّا چھینا اور میرے سَر کے اُوپر سے سڑک میں دے مارا۔

مَیں نفرت و تشدّد کے جذبے سے کانپ گیا لیکن اُس کی شدّت نے مُجھے گُونگا بنا دیا۔ میرے دِل نے مُجھے پُکارا اور جتلایا، "یہ مکان تیری محنت کا نتیجہ ہے! اِس پر تیرا حق ہے! تیری محنت تجھ سے چھین لی گئی ہے! تو اِس عورت کو غارت کر دے اور مکان پر قبضہ جمالے!"

مَیں نے اُس بدتمیز عورت کی آنکھوں میں سختی سے جھانکا اور کُولہوں پر ہاتھ رکھ کر تن کر کھڑا ہو گیا۔

"آئی وِل کال دی پولس اینڈ سی یُو اریسٹڈ، یُو راسکل! میں پولس کو بُلاتی ہُوں اور تجھے گرفتار

کروانی ہُوں، بدمانش!"

اُس نے دروازہ ایسے بند کیا جیسے میرے مُنہ پر مار رہی ہو۔

امر سنگھ میرے پیچھے سے آیا اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "چل چھوڑ! دُکان پر چلتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم نے ووٹ دے کر انھیں پارلیمان بھیجا ہے کہ یہ ہمارے بارے میں سوچیں اور کچھ کریں۔ جو ہمیں پینے کے لئے دو گھونٹ پانی نہیں دے سکتے، وُہ بھلا اور کیا کر سکتے ہیں؟"

مَیں چُپ چاپ اُس کے ساتھ ہولیا۔ اُس نے ڈبّا اُٹھایا، دیکھا اور پچک پر ہاتھ پھیرا گویا اپنی چوٹ کو سہلایا۔ وُہ نہایت ملامت آمیز لہجے میں بولا، "ہمارے لوگ کامگاروں کو حیوان سمجھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہ اپنی ضرورت جیسے تیسے پُوری کرلیں گے۔ آدم پُور کے ہوائی اڈّے کا انچارج انگریز تھا۔ اُس نے پہلے کامگاروں کی ضروری حواجات کا سامان کیا تھا پھر کام چلایا تھا۔"

مَیں نے دِل ہی دِل میں انگریزوں کو سراہا اور ہندوستانیوں کو بُرا بھلا کہا۔ مَیں کتنے کاریگروں کو جانتا ہُوں، جنھوں نے انگریزوں کے ہاتھ کے نیچے کام کیا ہے۔ ہر کسی نے اُن کے حُسنِ انتظام، طریقِ عمل اور دیانت داری کی تعریف کی ہے۔ جو اُنھیں گالیاں دیتے ہیں، وُہ ہمارے سیاست دان ہیں۔

تایا جی کہتے تھے، "کردار اور اوزار ایک دُوسرے کے پابند ہیں لیکن بڑے نازک طریقے سے۔ کردار مُعاشرے کو سنوارتا ہے اور اوزار کردار کا احیا کرتا ہے۔ ایک کی راستی دُوسرے کی راستی کی ضمانت ہے، ورنہ دونوں کی سلامتی کو خطرہ ہے۔ جس آدمی کی زندگی اِس کسوٹی پر پُوری نہ اُترے، وُہ نہ خُود پنپتا ہے اور نہ دُوسرے کو پنپنے دیتا ہے۔"

مَیں تایا جی کی کسوٹی پر پُورا نہ اُترتا تھا اس لئے اپنے لئے اور دُوسروں کے لئے دردِ سر تھا۔

چائے کی دُکان پولیس کی بارکوں کے پاس تھی، جہاں پینے کے پانی کا نل بھی تھا۔ وہاں جانے آنے میں آدھی سے زیادہ چھُٹی خرچ ہوجاتی تھی۔ ٹھیکدار کی جانب سے ہم پر کوئی سُپروائزر مامُور نہ تھا اِس لئے امر سنگھ مُعیّن وقت سے کم چھُٹی کرتا تھا۔ اُس نئی صُورتِ حال سے سمجھوتا کرتے ہُوئے، ہم کچّے نل کا پانی پیتے اور رفعِ حاجت کے لئے جھاڑیوں میں جاتے۔ مجھے سنتا سنگھ یاد آتا۔ اُس کی جن حرکات کو مَیں کسرِ اخلاق سمجھتا تھا، عینِ اخلاق لگنیں۔ شام کا جھُٹ پُٹا تھا۔ مَیں کام بند کرکے ہاتھ مُنہ دھو رہا تھا کہ مَیں نے دیکھا اُس گھر کے مکین کار میں بیٹھ کر باہر جارہے ہیں۔ مَیں کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔ میری دبی دبی نفرت، طُوفان کی طرح اُٹھی اور مجھے اُڑا کر اُس دروازے پر لے گئی جہاں سے مَیں پھٹکارا گیا تھا۔ مجھ پر ایک جُنون سوار ہوگیا، جُنونِ انتقام۔ نہ مجھے پولیس کے ظُلم کا ہراس، نہ اپنی آبرو کا

پاس! میں نے دروازے پر پیشاب کیا اور آخری قطرہ گرنے تک تن کر کھڑا رہا۔ میں واپس ہوتے ہوئے بہت خوش تھا جیسے وُہی میرا مقصودِ حیات ہو۔

نین مورتی سے ہم بنڈارا روڈ پہنچے اور وہاں سے تہاڑ، جہاں بڑی جیل کا سنگِ بُنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اُس کے در و دیوار کی غیر معمولی لمبائی اور چوڑائی اور اُونچائی جو دیکھتا، سراہتا جیسے اُسے اپنے گھر کی گھٹی گھٹی فضا ناپسند ہو۔ ریگڑھ پورہ سے پوسا تک باقاعدہ سڑک تھی اور اُس کے آگے پگڈنڈی، جو سانپ کی لکیر سے مُشابہ تھی اور سیدھے فاصلے سے کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ طُلوع و غرُوب کام کے وقت کا تعیُّن تھا۔ مصروفیت کی طوالت! آرام کے لمحے روندے ہوئے کیڑے کی طرح سُکڑ گئے۔ نیند کی نرمی جتنا بحال کرتی، کام کی سختی اُس سے زیادہ کچل دیتی۔ بدن پانی میں پڑے برف کے ڈلے کی طرح گھلنے لگا۔ راحت کے بعد اذیّت ایسے لگ رہی تھی جیسے زخم پر سے پھاہا اُٹھا کر نمک چھڑک دیا جائے۔

قارئین! میں کام چور نہ تھا، نازک مزاج تھا اور ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس میں جسمانی محنت کم ہو۔ معمار کا کام نہایت سخت کام ہے، جو میرے تن و توش کو راس نہ آتا تھا۔

تہاڑ کی راہ میں پُوسا اسٹیٹ پڑتی ہے۔ وہاں نہر ہے جس کی شاخیں کھیتوں میں انتڑیوں کی طرح پھیلی ہُوئی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں، ہری بھری گھاس، پھُولوں کے تختے، درختوں کی قطاریں، سیدھی روشیں، جہاں بیٹھو ہلکورے لیتا پانی دکھائی دیتا اور سُنائی بھی پڑتا۔ وہاں ہر منظر تحقیق طلبی اور نشاط انگیزی کی حد تک دِل رُبا اور بہار افزا تھا اس لئے ناظر ایک ہی لَے میں گھنٹوں گزار سکتا تھا۔ ایسی پُر اسرار آرائشی خوبی کی وجہ سے وُہ چھوٹا سا رقبہ بڑا لگتا۔ اُس کی حدُود میں داخل ہو کر باہر نکلتے ہُوئے میں محسوس کرتا کہ میں زندگی پا کر کھو رہا ہُوں۔ میرے اندر ایک فن کار تھا اِس لئے میرے پاس حُسنِ تصوّر کی افراط تھی۔ چُوں کہ اُس کی کوئی سمت نہ تھی وُہ میری اُلجھن بنی ہُوئی تھی۔

میری فطرت پسندی ایسی جگہ کے لئے ترستی رہتی تھی جہاں حُسنِ فطرت کی سُتھرائی اور تنہائی ہو۔ اُجالے پاکھ میں وُہ دھرتی ارضِ موعُودہ کا نمُونہ لگتی۔ پٹیل نگر کے خُوش ذوق شہری وہاں سیر و تفریح کے لئے آتے تو اُجلے کپڑوں میں اُجلے بدن لپکتے، چھلکتے اور جھکنے لگتے۔ اُن کے خُوش و خُرّم چہرے مجھ پر اُلٹا اثر کرتے اور میرے تخیّل کی صُورت ہی بگاڑ دیتے۔ ہلکورے لیتا ہُوا پانی، ہلکورے (آہیں) بھرتا جان پڑتا۔ میری محرُومی کا احساس جاگ پڑتا اور میں کسی گوشے میں پڑا حسرت آمیز نگاہوں سے آسمان کو تکتا، کسی شہابِ ثاقب کو دیکھتا تو میرے دِل میں ہول پڑتا۔ مجھے لگتا جیسے وُہ میری تقدیر کا نمائندہ ہو۔

میری رُوحانی پستی کا اثر! میں اُس لکڑی کی مانند ہوتا جو بظاہر بھلی چنگی ہو لیکن اندر سے کِرم خُوردہ۔

جیل سے کچھ فاصلے پر چھاؤنی تھی۔ وہاں سے ایک پھیری والا آتا، جو اشیائے ضرُورت کے ساتھ تھری ایکس رَم سستے داموں بیچتا۔ امر سنگھ رَم کا رَسیا تھا اور ہر ماہ بوتل دو بوتل خریدتا تھا۔ جس دن اُس نے بوتل خریدی اُس دِن بُنیاد، ڈیمپ پرُوف تک لانی ضرُوری تھی۔ کام ختم نہ ہُوا اور اوور ٹائم کرنا پڑا۔ ہم ٹھیرنے کے حق میں نہ تھے لیکن ٹھیکیدار کے حُکم کو ٹال نہ سکے۔ آسمان پر بادل گھر رہا تھا۔ ہم نے اُسے ایسے دیکھا جیسے آڑے وقت میں آدمی غائبانہ مدد کی آس کرتا ہے۔ ہماری مُراد بر آئی لیکن کب، جب اُس کی ضرُورت نہ تھی۔ ہم باد و باراں کا مُقابلہ نہ کر سکے اور ایک پیڑ کے نیچے رُک گئے۔ برق ایسے کڑک رہی تھی جیسے اُس کا نشانہ وُہی پیڑ ہو۔ مَیں نے وہاں سے چلنے کا اِرادہ کیا لیکن امر سنگھ راضی نہ ہُوا۔ مَیں نے گاؤں میں پیپل پر بجلی گرتی دیکھی تھی۔ وُہ آگ کے نیلے گولے کی شکل میں گری، تصادم سے شعلۂ جوالہ بن گئی اور پیپل پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ مَیں ڈر کر وہاں سے نکلا تو امر سنگھ میرے پیچھے ہو لیا۔ اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپتے، پاؤں سے راستہ ٹٹولتے، ہم چلے جا رہے تھے۔ جہاں کہیں پاؤں پگڈنڈی سے نیچے پڑتا، زمین میں دھنس جاتا۔ مَیں نے گُرگابی پہنی ہُوئی تھی، ایک جگہ دایاں پاؤں دَلدل میں رہتے رہتے بچا۔ راستہ پاؤں لگا تھا اِس کے باوجُود اُس سے رابطہ ٹُوٹ گیا۔ اندھیرے میں ہمیں تب خبر ہُوئی جب رَعد کی لپک میں بستی نظر آئی۔ کہاوت ہے کہ تھکا اُونٹ سرائے کو دیکھتا ہے، مَیں نے ایک جھونپڑی میں پناہ مانگی۔ سنجوگ اِسے کہتے ہیں! بسنتی نے اوٹ ہٹا کر باہر دیکھا لیکن میری آنکھوں نے یقین نہ کیا۔ جب تک امر سنگھ اندر آیا، تنگ و تاریک جھونپڑی بسنتی کی مُسکراہٹ کے اُجالے میں پھیل کر حویلی کی وُسعت اِختیار کر چُکی تھی۔

کپڑے بھیگ کر چپک رہے تھے۔ ہم نے اُتار کر نچوڑے اور سُوکھنے کے لئے پھیلا دیئے۔ ہمارے کپڑے گیلے سہی، فضا کی سَردی اور جِسم کی گرمی کے درمیان پردہ تھے، اُس کے اُٹھتے ہی ہم کانپنے لگے۔ ہماری میزبان نے کمبل مارنے کے لئے کھیساں دیں۔ وُہ محنت کی جانی پہچانی خُوشبُو سے اِس قدر بھری پُری تھیں کہ ہم نے لوٹاتے لوٹاتے اوڑھیں۔ ٹھٹھری ہُوئی ہڈیوں کو گرمانے کے لئے امر سنگھ نے رَم کی بوتل کھولی۔ بسنتی کا شوہر بھُوری سنگھ خاموش طبع آدمی تھا، وُہ اپنا گلاس لے کر کونے میں سُکڑ گیا۔ بسنتی نے آگ جلائی، جھونپڑی میں موکھا نہ تھا اور باہر ہوا کا دباؤ زیادہ، دُھواں اندر جمع ہونے لگا اور آنکھوں کو جلانے لگا۔ اُس نے اپنی تکلیف سے ہماری اذیّت کا اندازہ لگایا ہوگا ورنہ وُہ آگ کیوں بُجھاتی؟ بارش

تھمنے اور ہمارے گھر جانے کے لئے تیار ہوتے تک تھوڑی ٹانگیں پسارے سو رہا تھا۔ بسنتی نے ہمیں وہیں رات رہنے کے لئے کہا لیکن امر سنگھ راضی نہ ہُوا۔ مَیں نے بھی سائیکل اٹھالی حالاں کہ میری نیّت اور تھی۔ امر سنگھ چلتے رُکتے اور رُکتے چلتے کچھ آگے نکل گیا لیکن مَیں بسنتی کے پاس کھڑا باتیں کرتا رہا۔ وُہ مجھے روکنا چاہتی تھی اور میرے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ مَیں خود اُس سے اپنی باتیں کرنے اور اُس کی باتیں سُننے کا آرزومند تھا۔ بات راستے کی طرح ہے۔ یہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، کہیں بھی پہنچتی ہے اور اُس ڈھکے چھپے رشتے کو ظاہر کرتی ہے جس پر خاموشی پردہ ڈالے رکھتی ہے۔ آدمی ایسا حصار ہے، جس میں سیندھ لگانے کے لئے بات کا اوزار درکار ہے۔

اِنسان کی نفسیات کی عجیب حالت ہے! اپنی محبت میں جو غم خوار کا کردار نبھائی تھی، وہ چاہت میں اُمنگ بھری تھی۔ اُس وقت اُس کی خوشی اِنسانی ہمدردی سے بھرپور تھی اور اِس وقت گرمیِ نفس سے۔ مَیں نے دونوں صُورتوں میں اُس کے جذبے کا لحاظ کیا۔ اب مَیں نے اُسے باہوں میں لیا، اپنے ساتھ لپٹایا اور محسوس کیا کہ وُہ میرا جزوِ گم شُدہ ہے۔ مَیں نے اُس کی ٹھوڑی پکڑی، ہونٹ مسلے اور آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کا رویّہ تاریک رات کی طرح پُراَسرار تھا۔ وُہ ہر کسی کی حقیقت دیکھتی ہے لیکن اپنا فیصلہ محفوظ رکھتی ہے۔

امر سنگھ اپنی بے قراری کی اِنتہا کو پُہنچ گیا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ کر بلایا۔ مَیں نے دُوسرے دِن ملنے کا وعدہ کیا تو بسنتی نے میرا ہاتھ چھوڑا۔ میری رگوں میں رَس گُھل رہا تھا۔ اُس کے شایانِ الفاظ نے ہیں اور نہ ہی مجھے موزوں طرزِ بیاں سُوجھ رہا ہے ورنہ مَیں اُس لُطف کی تاثیر کی تفسیر لکھتا۔ بادل چھٹے نہ تھے، اندھیرا جُوں کا تُوں تھا لیکن پگ ڈنڈی، چاندنی کی لکیر کی طرح نظر آتی تھی۔

اِنسان کا ہر ہُنر مرہُونِ فراست ہے اِس لئے معیارِ حیات سے عبارت ہے لیکن ہوَس، ناموسِ اُلُوہیت کی طرح خود افروز جبلّت ہے اِس لئے فقط اپنی ہی حقیقت کی ضمانت ہے۔ ہوَس مست سے اِنسانی قدروں کی توقّع رکھنا، مردم آزار سے رحم دِلی کی اِلتجا کرنا ہے۔ ضابطۂ اخلاق، تقدیسِ عمل کی بُلندی ہے اور دُوسری صُورت، پستی۔

باب ۶۹

جیسا مرا سرُوپ ہے ویسا نہیں ہُوں میں
اِنسان کے لباس میں کیا کیا نہیں ہُوں میں (شاطر)

ے سُکھ اَور دُکھ کی کہانی نِرالی ہے۔ مَیں اپنے سُکھ میں اکیلا اَور دُکھ میں میلے میں گھرا ہُوا تھا
ں میری بے سَمتی تھی اَور بے سَمتی بے سروپائی کی تائید ہوتی ہے۔ میری بے سروپائی، سرکشی کی
ا دست گیری کرتی اَور کبھی شرمندۂ وفا نہ ہوتی۔

یہ میری کِتاب کا آخری باب ہے اَور میں اپنے قارئین سے آخری اِعتراف کرتا ہُوں۔ حالات
فراز سے مَیں نے کوئی سبق نہ لیا۔ مَیں وُہی مغلُوبُ الجذبات بے وُقوف تھا، جو تھا۔ بے وُقوف
کے ہُنر سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ وُہ زمانے کو اُوپری نظر سے دیکھتا ہے، سَطحی اَور ادنیٰ جذبوں
ہے، اُنھیں کو زِندگی سمجھتا ہے، یُوں خُود سے پرے دیکھنے کی صلاحیّت پیدا نہیں کر پاتا ہے
ل کی طرح اپنے اُدھورے پن میں منہمک رہتا ہے۔

تایا جی کہتے تھے کہ تنقیدِ ذات سے ضبطِ نفس پیدا ہوتا ہے اَور ضبطِ نفس سے اصلاحِ ذات
قیدِ ذات کا فُقدان تھا۔ دراصل میری سچائی کی نوعیّت دوہری تھی۔ مَیں جیون کے مان
رتا، دُوسروں سے اُن پر عمل پیرا ہونے کی اُمید رکھتا لیکن جہاں مجھے موقع ملتا، اُنھیں رد
ا نہ ہچکچاتا۔

ایک رات مَیں کام سے لوٹا، بے اَنت کور نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "گیان، تیرا خط آیا ہے۔" وُہ
بز پر سے اُٹھی، اندر گئی اَور خط تلاش کرتے لگی، تلاش کرتے کرتے عاجز آگئی اَور اپنی کوتاہی کا
ھرنے لگی۔ اُس کی ڈبل ڈوسی اُسی کی آلکسی تھی جو اُس کی جان کے ساتھ دُوسروں کے لئے
ہنی تھی۔

مجھے کِسی سے مُراسلت نہ تھی اَور نہ ہی کہیں سے مُراسلے کی آس۔ کچھ بے اَنت کور سے ڈر کر
کے پیشِ نظر، مَیں نے خط کو اہمیّت نہ دی اَور بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک رات مَیں سونے
ا تھا کہ مَیں نے سائیکل کھڑی کرنے کی آواز سُنی، پلٹ کر دیکھا اَور اپنے پیچھے مان صاحب کو
انھیں دیکھ کر مَیں خُوش ہُوا اَور حیران بھی۔ خُوش اِس لئے کہ اکیلے وُہی تھے جو میری فلاح و بہبُود
ند تھے اَور حیران اِس لئے کہ وہ میرے پاس پہلی بار آئے تھے۔ مَیں نے جلدی سے چارپائی
ور اُنھیں بیٹھنے کو کہا۔ وُہ کھڑے رہے اَور میری پیٹھ تھپک کر کہنے لگے، "مَیں ست نگر آیا تھا
ا تھا کہ ریگڑھ پُورہ کی تختی پڑھی۔ مَیں نے سوچا کہ کیوں نہ تجھ سے ملتا چلوں!"

"آپ بیٹھیئے!"

مجھے کچھ اَور نہ سُوجھی، مَیں نے اُن کے ہاتھ سے سائیکل لے کر سٹینڈ پر کھڑی کر دی۔

"نہیں! مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ میں بیٹھ گیا تو اور لیٹ ہو جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ انٹرویو کارڈ جاری کر دیئے گئے ہیں۔ تجھے تیرا ..."

"کب؟ مجھے تو نہیں ملا!"

میں اپنی بے قراری پر قابو نہ پا سکا اور انھیں بیچ میں ٹوک دیا۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں! پرسوں انٹرویو ہے۔ کارڈ نہیں ملتا، نہ ملے! تو انٹرویو کے لیے آجا میں نیا کارڈ جاری کروا دوں گا۔ میں نہ آتا تو کیا ہوتا؟ کیسا اتفاق ہے!"

وہ یہ اطلاع دے کر چلے گئے اور مجھے حیران چھوڑ گئے۔ انھوں نے مجھے اپنے تئیں دلی پولیٹیکنک میں داخل کروانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اُن کے والد ہرنام سنگھ میرے بھائیا جی کے دوست تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انھیں مجھے پڑھانے کے لئے راضی کر لیں گے پہلے انٹرویو کا کام ہو جائے۔ مجھے بھائیا جی سے بالکل امید نہ تھی لیکن خیال، خیال ہے!

وہ رات انوکھی رات تھی! میں جگت سنگھ سے باتیں کرتا اور وہ مجھے سونے کی تاکید۔ مجھ سے تنگ آکر اُس نے مجھے جھڑکا، "مجھے سونے دے، ورنہ پیٹوں گا تجھے!"

اُس کی ڈانٹ ڈپٹ سے میں چپ ہو گیا لیکن میری پروازِ شوق میں فرق نہ آیا۔ میں کبھی ٹہلتا کبھی آسمان کی وسعت میں دیکھتا، کبھی لیٹتا، کروٹیں بدلتا اور جاگتا ہوا خواب دیکھتا۔ اُن خوابوں کا اعجاز! میں بے خوابی کی ماندگی اور اعضا شکنی کی آلکسی سے دور اور حیات پرور تازگی سے مہکتا تھا۔ میری آس نے میرے خون کی تاثیر ہی بدل دی، وہ رگوں میں ترنگ کی صورت تھرکتا تھا۔ ترنگ، جذبے سے کہیں زیادہ گہری اور دیرپا ہوتی ہے۔ میں وجہ، بے وجہ مسکراتا اور خوش ہوتا۔ میں اپنے رویّے پر جتنا قابو پاتا میری ترنگ، مجھے اُتنا ہی گدگداتی اور مجھ سے اٹھکیلیاں کرتی۔ میرا متلوّن کردار نکتہ چینی کا مستحق ہی لیکن میری حسّاس طبیعت ایسی ہی تھی! ہر کوئی کام پر تیار ہونے لگا اور میں بے پروا گھومنے لگا۔ کوئی ہوگا جس نے میرے لاابالی پن کو ہدفِ ملامت نہ بنایا ہو۔

"تو جو کرتا ہے، چپ چاپ کئے جا! کولھو کے بیل ہل میں نہیں جوتے جاتے!" ہر بھجن سنگھ نے میرا ٹھٹھا اُڑاتے ہوئے کہا۔

"آگے انجام نہیں دیکھا؟ تو پاگل ہے جو دہاڑی توڑتا ہے!" کرتار سنگھ نے بن مانگے مشورہ دیا۔

"تیری ہڈیوں میں چور گھس آیا ہے!" اپنے خصم سے شہ پاکر بے انت کور لعنت بھرے لہجے میں بولی۔

یرے جیسے انجنیئر بننے لگے تو ہندوستان کا بیڑا غرق ہو جائے گا!" سومتر سنگھ نے اپنے
کی بات سے نئی بات پیدا کی۔
تم جو بھی کرو، کرو، پہلے ریڑھ کی ہڈّی مضبوط کرو! ورنہ ہر جگہ دھوکا کھاؤ گے"! جگت سنگھ
لگایا اور ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔
فارسلین، انسان کی فطرت نرالی ہے! یہ دُوسروں کے بارے میں کچھ بھی کہتا ہے اور کھڑے
سارے مسئلوں کا حل نکال دیتا ہے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ اپنی ذات میں کوئی گُن پیدا کرنے
کے طُوفان سے گزرنا پڑتا ہے۔ تصوّر بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ناموافق صُورت میں مسرّت
فق صُورت میں غم آفریں طریقے سے کام کرتا ہے۔ چُوں کہ یہ حقیقت کی ضد ہے یہ حالات حاضرہ
صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ صانعِ تحیّر عدم کو خیالی وجُود دینے اور اُس کی خُوب صُورتی سے لُطف
ہے۔ لیکن حقیقت میں عدم اور وجُود میں لامتناہی اور ناقابلِ تسخیر خلا ہے۔ ہر انسان اپنی
بق اِس خلا کو بھرتا ہے اور وُہی اُس کا حاصِل ہے۔ جو کم نظر اِبتدا ہی نہیں کرتا، اُس کا
صِل ہے۔
میں نے ہر کسی کی بات سُنی اور نظر انداز کردی۔ وُہ دِن یُوں ہی گزر گیا، کچھ نہانے دھونے اور
کرنے میں۔ دُوسرے دِن میں نے سفید پتلون، قمیض پہنی اور سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھی۔
سامنے کھڑا ہُوتو دھرتی پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جان پڑی۔ میں سائیکل کی سیٹ پر سفید
ار ہُوا تو تن من سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ میں اجمل خان پارک کے پاس سے گزر رہا
نظر گُلاب کے تختے پر پڑی۔ میں رُکے اور اندر گئے بغیر نہ رہ سکا۔ حالاں کہ پھُول توڑنے
مالن پاس ہی کھڑی تھی، میں نے اُس کی نظر بچا کر پھُول توڑا اور ہاتھ میں بھینچ لیا۔ میں نے
ے اُسے ہاتھوں میں مسلا اور سُونگھا اور وہاں اکیلے کھڑے کھڑے محسُوس کیا کہ میں دِلّی کی بے
ں اکیلا ہُوں اور میری الگ سمت ہے، الگ پہچان ہے۔ میں نے اپنے اُمید افزا مُستقبل کو
ے دیکھا اور اُسے چھُو کر مزہ اُٹھایا۔ میں ڈی سی۔ ایم کے قریب جا رہا تھا۔ میں رُوحانی طور
ڈ کے سامنے بیٹھا اُس کے ممبروں کی نگاہِ انتخاب کا مرکز بنا ہُوا تھا کہ میں سڑک پر دائم حاضر
ز اگیا اور شرمندہ ہونے کے بدلے مُسکرا دیا۔ ریڑھی والا دِلدار قسم کا آدمی تھا، رازدارانہ
"سردار جی! کسی پیاری سے ملنے جا رہے ہو جو خُوشی کے مارے راستہ نہیں سُوجھتا ہے"
اُس کے تخیّل کی جولانی میری مُسکراہٹ کو نُمایاں کر گئی۔ میں اُس لطافت آفریں خیال سے

لطف لیتا ہوا آگے بڑھا، اُس پیارے انجانے نے کھلے خزانے کہا، "جاؤ جاؤ، عیش کرو! یہی تو عمر ہے عیش کرنے کی! پھر ہماری طرح بھاڑ ہی جھونکنا ہے"۔

مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اُمید ویاس سے لگا کہ وہ اپنے کسی پرانے ارمان کی تجدید کر رہا ہے۔

سبزی منڈی کے برف کے کارخانے کے قریب پانی ٹھہرا ہوا تھا، جو گاڑیوں کے پہیوں سے اُڑتا تھا۔ مُبادا کپڑے خراب ہو جائیں، مَیں سائیکل سے اُتر کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پیدل چلنے لگا۔ اپنی بیکاری کے دوران میں اُس سڑک پر سے گزرتا تو مجھے لگتا کہ مَیں اکیلا اُس بھیڑ میں بیکار ہوں۔ اب میں نے محسوس کیا کہ سڑک بیکار آدمیوں سے بھری پڑی ہے، جو بے فائدہ اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں اور میرا راستہ روکتے ہیں۔ مَیں اُن سب سے زیادہ مصروف ہوں اور نہایت اہم کام سے جا رہا ہوں۔ مَیں نے سوچا کہ مَیں چِلّا کر اُن پر اپنی اہمیت جتاؤں اور اُنھیں راستہ دینے پر مجبور کروں لیکن میں کسی تہذیب کے زیرِ اثر ایسا نہ کر سکا۔

اِنٹرویو نو بجے تھا۔ مَیں وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور سائیکل، سائیکل سٹینڈ پر رکھ کر دفتر کے پاس مان صاحب کا اِنتظار کرنے لگا۔ وہ آئے اور مجھے ہیڈ کلرک آہلووالیا سے ملوا گئے۔ اُس نے مجھے دوسرا اِنٹرویو کارڈ بنا دیا اور ہاتھ ملا کر گڈلک کہا، مجھے لگا کہ میں اِنٹرویو میں پاس ہو گیا ہوں۔

اُمیدوار چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے کھڑے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ کوئی اِنٹرویو دے کر باہر آتا تو وہ ٹکڑیوں سے ٹوٹتے، اُس کی طرف لپکتے اور اُس پر سوالوں کی بوچھار کر دیتے۔ کوئی اُن کے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا اور کوئی خاموشی سے اُن کا حلقہ توڑ کر نکل جاتا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور اپنی جھلاہٹ سے لڑتے ہوئے پھر نئے ساتھی ڈھونڈ لیتے۔

میری طرح مجھ سے کچھ دُور ہرپال سنگھ الگ تھلگ کھڑا تھا، پورا بانکا جوان! اُس نے داڑھی کو مونچھوں سے موچنے سے بڑے سلیقے سے الگ کیا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہٹلر نام کا ایک خواب رُو تو خیز لڑکا تھا۔ وہ اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور اُس کے گال سہلاتا تھا۔ وہ کبھی زور سے گال توڑتا تو ہٹلر درد سے بلبلاتا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا، "ہولے، درد ہوتا ہے!"

"او۔کے۔ میری جان!"

ہرپال سنگھ پیار بھرے لہجے سے اُس کی طرف دیکھتا اور پھر اُس کے گال سہلانے لگتا۔

کچھ دیر بعد بانسل نام کا ایک بے خط لڑکا آیا۔ وہ ہرپال ہی کی طرح شوخ و شریر تھا لیکن اُس کا چشمہ

بھی پر اثر انداز تھا۔ اُس نے دُور سے بہ آوازِ بُلند کہا، "ہائے ہرپال!
ہائے بانسل!"
"تم کیا سمارٹ ہو! آتے ہی ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لیا۔"
"پرندہ پہلے گھونسلا بناتا ہے پھر انڈہ دیتا ہے۔"
اتنے میں ہرپال سنگھ کا نام انٹرویو کے لئے پکارا گیا۔ اُس نے ہٹلر کو بانسل کے حوالے
جا کر پیچھے ایسے دیکھا جیسے اُسے انٹرویو سے زیادہ ہٹلر کی فکر ہو۔
میں انٹرویو بورڈ کے سامنے حاضر ہُوا تو میں مُسکرا رہا تھا جیسے مجھے اپنے خوشگوار نتیجے کا پہلے
بری مُسکراہٹ میری کمزوری تھی۔ اِس نے مجھے بارہا ناگوار صُورتوں میں اُلجھایا تھا لیکن میں
لنے میں ناکام رہا تھا۔ نفیس لباس پہن کر میری یہ کمزوری اور بڑھ جاتی تھی۔ وہاں سارے
ی میں پُوچھے گئے۔ میں جتنی انگریزی جانتا تھا، جانتا تھا، روانی سے بول نہ سکتا تھا
ے ہر جواب مُسکرا کر دیا۔
"مسٹر سنگھ، یُو سیم ٹُو بی ویری ہیپی! وائی؟ مسٹر سنگھ، آپ بڑے خُوش نظر آ رہے ہیں!
اصاحب نے سُوال کیا جو بورڈ کے چیئرمین تھے۔
"بیکوز آئی ایم ہیپی سر! اس لئے کہ میں خُوش ہُوں جناب!" میں نے مُسکرا کر کہا۔
"او۔ کے۔ تھینک یُو مسٹر سنگھ، یُو کین گو! ٹھیک ہے۔ شکریہ مسٹر سنگھ! تم جا سکتے
ھمرا نے مُسکرا کر نہایت تے پروردہ لہجے میں کہا۔
میں نے بھی تھینک یُو کیا، مُسکراتا ہُوا اُٹھا اور باہر چلا آیا۔ میں وہاں سے سیدھا مان صاحب
نچا اور کچھ احساسِ قصُور سے انٹرویو کا حال سُنایا۔
"تُو سلکٹ ہو گیا ہے!" اُنھوں نے اپنے چہرے جتنی بڑی مُسکراہٹ سے کہا۔ "میں نے
لکھ رکھا ہے اور آج کل میں جواب آیا چاہتا ہے۔ میں خبر کرتا ہُوں۔ جاؤ، خُوش رہو!"
میں گھر پُہنچا۔ اپنوں کو اپنی خُوش بختی کی خبر سُناتے ہُوئے، میں اپنی ہانکتا تھا اور اپنے
ضہ آمیز رُوپ دیکھنا تھا گویا اُن کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو۔ میری شان، ادّعائی و خُود نمائی! میں
یا کہ یہ کیا ہیں! سارا زمانہ میرے لئے ہے، صرف میرے لئے ہے۔ میں اپنے خُوب صُورت
ننگی چارپائی پر لیٹ گیا جیسے لباس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ بے انت کور نے دیکھا اور منہ
یا نواب کی طرح لیٹا ہے، کپڑوں سمیت! ابھی سے تیرا یہ حال ہے تو کالج میں داخل ہو کر کیا کرے گا؟"

"جو کروں گا سو کروں گا ! بھابی، تم کیوں پریشان ہوتی ہو ؟"۔

میرا موجی جیوڑا ! میں پاؤں نیچے رکھ کر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پاؤں اُٹھا کر اُوپر رکھ لیے اور اکڑ کر لیٹ گیا۔

"گدھا، کاشی بھی ہو آئے تو گدھا ہی رہتا ہے ! بڑا چلا کالج میں پڑھنے !"

"بھابی، پانچوں تیرتھ تم نے نہائے ہیں اور تہمت مجھ پر لگاتی ہو"۔

"تو میری عقیدت پر طعن کرتا ہے، لعنت پڑے گی تجھ پر !"

"چُپ کر گیان !" جوگندر کور نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

میں چُپ ہو گیا۔ میری حریف کتنی دیر تک بڑبڑاتی رہی اور پھر سر پر دوپٹا باندھ کر لیٹ گئی جیسے دردِ سر میں مبتلا ہو۔ اُس کا یہ وتیرہ جانا پہچانا تھا۔ وہ جب کسی سے لڑتی اسی طریقے سے کرتار سنگھ کو آگاہ کرتی۔

اپنی انٹرویو کی اُمید پر میں نے کام پر جانا بند کر دیا۔ امر سنگھ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ میں کام پر جایا کروں لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے دِن مان صاحب آئے اور یہ منحوس خبر لائے کہ اُن کے والد میرے بھائیا جی کو منانے کے لئے گاؤں گئے تھے لیکن بےنیلِ مرام آئے تھے۔ اُن کے کہنے پر میں نے بھائیا جی کو خط لکھا۔ جس کا نچوڑ یہ تھا کہ اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو میں زندگی بھر در در کی ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ میرے خط کا جواب واپسی ڈاک آیا۔ میں نے خوشی سے کانپتے ہوئے لفافہ کھولا، اندر کوئی نوشتہ نہ تھا، میرے خط کے ٹکڑے تھے۔

میرا خوش آیندہ مستقبل جسے میں نے چھو کر دیکھا تھا، اپنی بھیانک حقیقت میں میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں اپنی پہچان بناتا بناتا پھر اُسی بھیڑ کا حصّہ بن گیا جس میں کسی کی کوئی پہچان نہیں ہوتی میں تھا اور میرا کام ! اور بے شناخت کام آدمی سے ایسے منسوب ہے جیسے زخم سے کھرنڈ۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہے، ایک نہ رہے تو دوسرا خود بخود مٹ جاتا ہے۔

اِس بار پھر میرے اپنوں نے مجھے اپنے اپنے انداز میں ہدفِ ملامت بنایا۔

"اچھا ہوا ! کبڑے کے لات ہی لگے تو وہ سیدھا ہوتا ہے"۔

بے انت کور دانت نکال کر ہنسی اور اپنی خوشی میں اپنے منہ پر کپڑا رکھنا بھول گئی جو اُس کی مخصوص عادت تھی۔

"چاچا جانتے ہیں، کون کس کام کے قابل ہے!"

سومتر سنگھ نے میرے بھائیا جی کی فراست کی داد دی۔

"تو یہ کام کرنا چھوڑ دیتا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا! اپنے خاندانی ہنر سے دست بردار ہونا اپنے بزرگوں کی بے عزّتی کرنا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے اُن کی روح اُسے کبھی معاف نہیں کرتی۔"

ہر بھجن سنگھ نے مجھے گلے لگایا اور میرے لئے اپنا پیار جتایا۔

"لاکھوں لوگ راج گری کرتے ہیں اور دُنیاداری چلاتے ہیں۔ تیرا بیاہ کر دیتے ہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذمّہ داری گلے پڑے گی تو اپنے آپ کام میں دِل چسپی بڑھے گی۔" کرتار سنگھ نے مجھے بیاہنے لائق کنوارا سمجھا اور ماہرِ نفسیات کا سا سمجھا دیا۔ میرے لئے کوئی کنواری ڈھونڈنے کا وعدہ کیا جیسے زندگی کے تاریک سفر میں کنواری، شمعِ راہ ہو۔

"پڑھنے کا اتنا شوق ہے تو تم دِن کو کام کرو اور ایوننگ کالج میں داخلہ لے لو۔ اپنی زندگی آپ بنانے کا لطف ہی اور ہے!"

جگت سنگھ کی بات حقیقت کے قریب تھی لیکن میرے عیب جو دِل پر گراں گزری۔ آدمی جتنی سرگرمی سے دُوسرے کے عیب پرکھتا ہے اُس کا ایک حصّہ اپنی تنقیح پر خرچ کرتا تو کیا سے کیا ہو جاتا!

اُن کی سرد اور بے مہر باتوں سے میرے مُنہ کا مزہ خراب ہو گیا۔ میرے دِل میں اُن کے لئے نفرت بھر گئی۔ ایسی نفرت جو نفاست پسند انسان کے دِل میں غلیظ ماحول میں جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے تاریک چہروں پر روشنی دیکھ کر مجھے احساس ہُوا کہ وہ میری ہزیمت سے لذّت اُٹھاتے ہیں اور مجھے اُس راستے پر چلنے سے روکتے ہیں، جو میرے کمال کی طرف جاتا ہے۔ اپنی نفرت میں مجھے لگا کہ اُن کی رگوں میں ایسا ناپاک خُون ہے جو اپنے نطفے کی طرح ہر کسی کو پریشان، چاک گریباں اور اسیرِ زنداں دیکھنا چاہتا ہے۔

قارئین، میری کم نظری میری بے زاری کا سبب تھی اور میری بے زاری میری ناخوشی کا۔ میری خوشی کا سامان کسی کے پاس تھا تو بسنتی کے۔

خواہشِ نفسانی نہایت دِل پذیر اور سریع التاثیر جذبہ ہے۔ اِس کی طاقت پر اختیار نہ ہو تو اِس کی نفاست میں رذالت کا جزو پیدا ہو جاتا ہے اور انسان، حیوان سے بدتر۔ حیوان کی نفسانی ضرورت آئینِ افزائشِ حیات کے تابع ہے جب کہ انسان اِس طریق کار سے بری ہے۔ اِس پر لازم ہے کہ

یہ اپنی ضرورت اور چاہت میں توازن پیدا کرے۔ یہ نہایت مشکل کام ہے! رفعت کا راستہ بے لطف اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بسنتی خود اپنے کام اور ماحول سے بے زار تھی۔ ہم دونوں یوں ملے کہ ایک دوسرے کا مقصود بن گئے۔ وہ مجھ سے پانچ چھ سال بڑی اور بانجھ تھی۔ اس کا پتی بھیوری سنگھ اس سے آٹھ دس سال بڑا تھا اور قبل از وقت بوڑھا ہو گیا لگتا تھا۔ بسنتی کے محنت پرور دہ گندمی رنگ پر میل ایسے جما رہتا جیسے سانچے میں تازہ ڈھالے مجسّمے پر جلی مٹّی۔ اس کے اعضا مضبوط اور خوب صورت تھے اور دیکھتے ہی اپنا لحاظ کرنے کی ترغیب دیتے۔ میں شروع میں اُن کا احترام اس طرح کرتا جس طرح مذہبی آدمی تبرکات کو چھوتا ہے۔ ان کا تقدّس مجھے چومنے پر مائل کرتا لیکن تبرکات کے برعکس اس کے اعضا میری گرمی کے مشتاق تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مرئی لذّت کی مانند بہہ نکلتے۔ اس لذّت کی گونا گونی! وہ ماتھے پر الگ، گالوں پہ الگ، ہونٹوں پر الگ، گردن پر الگ، چھاتیوں پہ الگ، ناف پر الگ، رانوں پر الگ ـــ اثر رکھتی۔ لیکن ہاں! ان میں ایک سواد مشترکہ تھا، گدلے پانی کا سواد۔ اس کی نسوں کا رنگ اُن انگوروں سے ملتا جو سائے اور اُمس میں پیدا ہوتے ہیں۔ گردن کے دونوں کی طرف کی رگیں اتنی تحریک خیز تھیں کہ ان پر ہونٹ رکھتے ہی ترنگ اٹھتی کہ انھیں چبا کر اُس نمک کو نچوڑ لوں جو بدن سے زیادہ ان میں بہتا تھا۔ اس کے پستان دنیائے حسن کے سب سے زیادہ خوب صورت اور تندرست باشندے تھے۔ ان کے اثر سے اس کا چھریرا بدن تھوڑا آگے کو جھکا رہتا۔ وہ جس ادا سے اٹھتی بیٹھتی اس سے لگتا کہ وہ اپنی حرکت کی چوکسی سے انھیں سنبھالے ہوئے ہے اور ان کی سرکشی سے پوری طرح مطلع ہے۔ وہ کہیں پاؤں اٹھا کے چلتی تو نازکی لیکن استواری سے آگے پیچھے لہراتے ہوئے پستان اُن خط و خال کو عیاں کرتے جو نہاں ہوتے ہوئے تسکین نفس کی جائے اماں تھے۔ مانا کہ میں ان کے بارے میں لکھ رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی لذّت ضابطے سے بعید اور دل کشی لطافت سے مزید تھی۔ لبریز پستانوں کو دبانے سے لگتا کہ ان میں سے دودھ کا سوتا پھوٹ پڑے گا۔ اس کی سپردگی میری وارفتگی کو بڑھاتی۔ میں ہونٹوں سے چومتا چومتا دانتوں سے کاٹنے لگتا۔ اس کے جذبات میرے ہیجان کی طرح بھرپور تھے۔ وہ اپنے لطف میں کرب آمیز مستی سے چلاتی اور کراہتی ہوئی میرے بھڑکے ہوئے نفس کو خوں خواری پر آمادہ کرتی۔ ہم دو ہوس مست درندوں کی طرح ایک دوسرے پہ جھپٹتے، روندتے ہوئے مجروح کرتے اور وہ سارا دُکھ اس سُکھ کے لیے سہتے جو ہمارے آغاز کے انجام میں ہوتا۔ رات کے اندھیرے ہمارے ناجائز رشتے کی ضمانت ہوتے ہوئے کسی جائز فعل میں

رُکاوٹ نہ ڈالتے۔ جس انگ کو جس انگ کی ضرورت ہوتی وہ اُسے لمس سے محسوس کرتا، آگے بڑھتا، باہم جدوجہد سے کمالِ عمل کو پہنچتا اور یوں مطمئن ہوتا جیسے تازہ گھاؤ میں درد کی لہر۔ اُس کی نشاط کے آخری مراحل میں میں اُس کے اندر گہرا اُتر جاتا۔ وہ لذت انگیز اذیت سے بڑاتی اور دانت بھینچ کر کہتی، "بس! بس! اندر اور جگہ نہیں ہے۔ میں بھری پڑی ہوں"۔

کچھ ہی دنوں میں اُس کی چھاتی پہلے سے زیادہ پُوری، جلد ملائم، آنکھیں خواب آگیں، ہونٹ تازہ اور رنگ سُنہرے کنول کی طرح چمکنے لگا۔ سانس گلاب جل میں نہائی ہُوئی ہوا کی طرح مہکنے اور دُوسرے حواس پر اثر انداز ہونے لگی۔ جیسے آگ کو ظہور پزیر ہونے کے لئے حرارت چاہئیے، زندگی کو حرکت۔ یہ خلقی تحریک چلتی ہے تو اپنی تیزی میں تحلیل ہو کر ہی رُکتی ہے۔ اگر ضرورتِ نفس کی خاطرداری ضمیر ہے تو میں اِس میں حدِ کمال تک ماہر تھا۔

اُس کے جسمانی رشتے نے اچانک رُوحانی سمت اختیار کر لی۔ اُس کے لئے میرے علاوہ دُنیا میں کسی اور شے کا وجود نہیں تھا۔ اُس کی نظروں میں، میں وہ بہترین اور حسین ترین مرد تھا، جو اُسی کے لئے بنا تھا۔ وہ صرف میری خاطر جیتی تھی! اِس غرض سے کہ وہ مجھے نفسانی محبّت کی وہ سوغات دے سکے جو آج تک کسی عورت نے کسی مرد کو نہ دی تھی۔ وہ مجھ سے سچّی محبّت کرنے لگی اور میرے بچّے کی ماں بننے کے سپنے دیکھنے لگی تاکہ جذبات کا نادیدہ رشتہ، دیدہ رشتے میں بدل کر زیادہ مضبوط ہو جائے۔ محبّت کا جذبہ حیرت انگیز جذبہ ہے! یہ انتہا میں اپنی جان دے سکتا ہے، دُوسرے کی لے سکتا ہے۔ وہ مجھے جتلاتی کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ مجھے گندھرب بیاہ کرنے پر اکساتی اور وہاں سے کہیں دُور بھاگ چلنے کی ترغیب دیتی۔ اپنے جذبے کی سنجیدگی ظاہر کرنے کے لئے اُس نے مجھے اپنی سخاوت سے نہال کر دیا لیکن وہ مجھ میں وہ جذبہ پیدا نہ کر سکی جو اُس کے جذبے کا متقابل ہوتا۔

تکمیلِ محبّت، مباشرت نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو میاں بیوی کا رشتہ نہایت بُردبار اور دل آرا ہوتا۔ دردمندی، محبّت ہے۔ کیوں کہ یہی ایک جذبہ ہے جو اپنی نزاکت میں جاں فزا اشتیاق اور بے لاگ انسلاک سے معمور ہے۔ دُوسرے ہر جذبے کی نفسیات غرض پرور ہے، جس کا مجموعی ماحصل نفرت ہے۔ جہاں تک مباشرت کا سُوال ہے یہ جذبہ جتنا سریع الکمال ہے اُتنا ہی سریع الزوال ہے اِس لئے کم ظرف کی بے اصولی اور بے دریغی ہے۔

تایا جی شاستروں کے اِس دعوے کا کھنڈن کرتے تھے کہ امرت، غلاظت پر گرتا ہے تو اُسے امرت بنا دیتا ہے۔ وہ کہتے تھے۔ "امرت نام کی نہ کوئی چیز ہے اور نہ تھی۔ رُوحانی اعتبار سے امرت وہ

جذبہ ہے جو گرتے ہوئے اِنسان کو سنبھالتا ہے اور اُس میں اِنسانی صفات جگاتا ہے۔ رُوحانی جذبے میں اِنسانی وَقار کا اِحساس مَرجائے تو اِس کا اِحیا مُشکل کام ہے۔"

میرے کِردار کے ساتھ میرا اِحساس بھی مَر چکا تھا اور مَیں بسنتی کو نفسانی ضرورت کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ اُس کے پاک جذبے کو محسُوس کرنا بڑی بات ہے، مَیں نے اُس کے دِل میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اُس کا جذبہ اپنی وفاشعاری اور میرا میری بدکاری میں اکیلا تھا۔

قارئین! جہاں تک ممکن ہے، مَیں نے اپنے چلن کا تجزیہ کیا ہے اور اُسے لکھا ہے۔ اب جب کہ مَیں اپنی کہانی کے خاتمے کے قریب ہُوں، میرے دل میں ایک ناممکن خیال آیا ہے۔ کِتنا اچھا ہوتا اگر مَیں کسی کے مجرُوح جذبات کا صحیح ردِّ عمل بیان کرسکتا۔ تایا جی کہتے تھے "حیاتِ اِنسانی کے تین پہلُو ہیں، حُسنِ تجزیہ، حُسنِ ہُنر، حُسنِ اَخلاق۔ حُسنِ تجزیہ اِنسان کو سَنوارتا ہے اور حُسنِ ہُنر اِسے پھیلاتا ہے اور حُسنِ اَخلاق اِس کا تحفُّظ کرتا ہے۔ جہاں یہ تینوں برابر ہیں وہاں خُوب صُورتی کا راج ہے اور اِسی طرز حیات میں اِنسان کا ثبات ہے۔"

چُوں کہ اِس وقت تایا جی کا کردار میری زِندگی کا مِعیار ہے، مجھے گُزشتہ زندگی کا ہر باب ناکارہ، فرسُودہ اور دَریدہ نظر آتا ہے۔

مجھے راہِ راست پر لانے کے لئے بسنتی نے دُوسرا طریقہ آزمایا۔ وُہ مجھ سے دُور رہتی اور مجھے دُور رکھتی، اپنی ران پر سَر تک رکھ کر نہ بیٹھنے دیتی جو میری پیاری طرزِ نشست تھی۔ میرے اکیلے پن کی بدبُو، جو آرزُوئے وَصل کی خُوشبُو میں دبی رہتی تھی، نتھنوں پر بیٹھی رہنے لگی۔ وُہ وجُود جو اپنی فراخ دِلی میں میرے وجُود کا حِصّہ بن جاتا تھا، اپنی بے لحاظی میں مجھ سے الگ ہوگیا۔ وُہ اَعضا جو مجھے دیکھتے ہی گرمیٔ شوق سے پگھل جاتے تھے، مجھ سے مِل کر ویران دھرتی کی طرح سُوکھے رہتے۔ میری مَطلب پرستی اور اُس کی انصاف پسندی کے ٹکراؤ سے ہمارے درمیان جذباتی فاصلے بڑھ گئے اور ہم اپنے اپنے انداز میں بھٹکنے لگے۔

ایک رات ہوا کا رویّہ اُس جھونکے کی طرح تھا جو پانی کی پُھوار میں سے گُزر کر آتا ہے۔ ماحول گرد و غُبار اور آسمان بادلوں سے پاک تھا۔ چاند اپنی پُوری رعنائی سے چمک رہا تھا اور دھرتی کی سادگی کو پُرکاری میں مُنقلب کر رہا تھا۔ خُوب صُورتی خُون میں جوار بھاٹے کی سی کیفیّت پیدا کرتی ہے اور دیوانگی کو بڑھاوا دیتی ہے۔ بسنتی میرے ساتھ گھر بسانے کے لئے گھر سے بھاگ آئی اور اپنے فیصلے پر اَڑ گئی۔ اُس کا دِل متانت سے لبریز تھا اور میرا شرارت سے، اُس کی متانت کا خیال نہ کرتے ہُوئے

اَور اپنی مردانہ خصلت کا دم بھرتے ہُوئے، مَیں نے اُسے کچھ رُوپے دیئے اور گھر لوٹ جانے کی تلقین کی۔ میرے لئے یہ نئی بات نہ تھی۔ مَیں لاجونتی کی رُوحانی مہربانی کا صِلہ دُنیاوی نعمتوں ہی میں چکایا کرتا تھا، اکثر چارے اور کبھی کبھار اَناج کی شکل میں۔ اَجرِ جائز رسم و رواجِ تہذیب و تمدّن ہے۔ جہاں نفس اَجرِ غیر ممنُون ہے وہاں اِنسان، حیوان ہے۔

قارئین! اب مَیں رسم و رواج، تہذیب و تمدّن، اَجرِ جائز، اَجرِ غیر ممنُون۔۔۔۔ بڑی بڑی باتیں کرتا ہُوں جو پُختہ سیرت شریف اِنسان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اِسے پڑھ کر آپ خُوش ہُوں گے کہ ناخُوش، یہ آپ کے اِحساسِ طبیعت پر مُنحصر ہے۔ لیکن یقین جانیئے، اُس خام عُمر میں وُہ خام جذبے اپنی نظیر آپ تھے اور حاصلِ حیات لگتے تھے۔ فِطرت کی اَصلیّت فِطرت جانے! اِنسان کی فِطرت میں تغیّر بڑا تکلیف دِہ طریقِ عمل ہے۔

لاجونتی کی آنکھوں سے چنگاری پھُوٹی، وُہ اپنی بے عزّتی کے دَرد سے تڑپی اور ہیجان پَرور لہجے میں بولی، "تُو اپنی اوقات پر آ ہی گیا آخر! میرے قیاس میں نہ تھا کہ تُو اِس پاکیزہ رِشتے کو گندی نظر سے دیکھے گا اور اِس کا لین دین کرے گا۔"

میرے اِس قطعی اِقرار کا مقصد اُن نشیب و فراز کو ظاہر کرنا ہے، جن سے ہر اِنسان اپنے اَنداز سے گزرتا ہے اور جینے کے طور طریقے اپناتا ہے۔ لیکن ہاں! اَخلاقی پستی رُوح کا زخمِ خُوں چکاں ہے۔ اِس سے جان بچانے کا ایک ہی علاج ہے۔ مُکمّل بے ضمیری! مُکمّل بے حسی!

اُس نے رُوپے میرے مُنہ پر دے مارے اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ جب اُس نے آخری جُملہ کہا تو اُس کی آواز شدّتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ رات کے مَلگجے میں، مَیں نے دیکھا کہ وُہ آنسُوؤں سے لڑ رہی ہے اور اُس ولولے کو روک رہی ہے جو ایسے حالات میں اِنسان کی کمزوری ہوتا ہے۔ بے اَخلاق کے لئے وجُود مُقدّم ہے اور اَخلاق ثانوی اِس لئے وُہ وجُود کو اَخلاق پر ترجیح دیتا ہے۔ میرے اَندر کسی ایسے جذبے نے جنم نہ لیا جو دَرد بھرے حالات کا حاصِل ہوتا ہے۔ مَیں اپنے قیافے پر اٹل رہا کہ یہ سب وقتی جذباتی ہلچل ہے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا اور میرا کام نِکلتا رہے گا۔ میری ضرورت میرے اَندر سے پیدا ہُوئی مگر مجھ مُسلّط ہو گئی۔ اِس کے باوجُود یہ اپنے آپ کو مجھ سے الگ رکھتی رہی اور اپنی اِنفرادیت قائم کرنے کے لئے مطلب پرستی بنی رہی۔ مَیں نے دِکھاوے کے لئے اُسے گلے لگانا چاہا۔ اُس نے مجھے پرے دھکیل دیا اور چھلک کر کہا، "میرے زخم تیرے زخم ہیں۔ اِس وقت تُو مُردہ ہے مُردہ! کبھی زِندہ ہُوا تو یہ زخم دَرد کریں گے اور تجھے تڑپائیں گے۔ تیری حالت قابلِ اَفسوس

ہے، قابلِ افسوس! شاید قابلِ رحم!!

اُس نے سارے قوائے عوامل کو یک جا کیا، اپنے آپ کو سنبھالا اور مجھے نفرت سے دیکھا۔ عام طور پر نفرت انسان کی اپنی شکست اور ذلّت کا عروجِ زوال ہے لیکن خاص حالات میں یہ انسانی وقار کی ڈھال ہے۔ جہاں اِس کی نفسیات دُوسری نوعیّت کی ہے وہاں یہ پہلی سے زیادہ خوں خوار اور خود بردار ہے۔ محبّت کی طاقت کے سوائے کوئی اور طاقت اِس کی مطابقت نہیں کر سکتی کیوں کہ محبّت ہی ایک ایسی سمائی ہے جو انسان کے کھوئے ہُوئے وقار کو بحال کرتی ہے۔ اِس وقت جب کہ مَیں خود بینی وخودگیری میں مصروف ہُوں، مَیں اعتراف کرتا ہُوں کہ اُس وقت مَیں واقعی مُردہ تھا۔ اِس وقت مَیں زندہ ہُوں اور اپنے کئے پر شرمندہ ہُوں۔ مَیں ناقابلِ بیاں ذہنی تکلیف میں مُبتلا ہُوں۔ میرا دِلِ غم دیدہ مجھے رُلاتا ہے اور مَیں خود سے سوال کرتا ہُوں، "اِن بے موقع آنسوؤں اور پچھتاوے کا کیا مطلب ہے؟"

اِنسان عجیب مخلوق ہے! یہ اُسے پاتا چاہتا ہے جو خود کسی کو دے نہیں سکتا، اِس لئے سے احساس لگا رہتا ہے کہ دُنیا بُری ہے۔ دراصل یہ اِس کا اپنا ناتمام نفس ہے جس سے یہ جگہ جگہ ٹکراتا ہے۔ ہوتے ہوتے مَیں اِس غیر مُصدّقہ سچائی کا قائل ہو گیا ہُوں کہ یہاں صرف وُہی اچھا اِنسان ہے جسے مَیں نہیں جانتا ہُوں ورنہ وُہ مجھے ضرور ملتا۔

اِنسان کی قُوّتِ تولید کا ربط حفظِ نفس سے ہے اور قُوّتِ ایجاد کا جمالیاتی تجربے سے۔ یہ دونوں عمل حُسنِ رفاقت اور حُسنِ لذّت کا سرچشمہ ہیں۔ اِن کی افادیّت اور جمالیّت سے مرعُوب ہو کر انسان نے اِن کے ماخذوں (دگر ہستیوں میں لِنگ ارچن اور کاریگروں میں جنترا ارچن کی روایت ہے) کو قابلِ پرستش قرار دیا اور ان پر اپنا پُورا حق جتلایا۔ اِنسان کے نشوونما میں یہی وہ مرحلہ تھا جب اِسے اپنے حقُوق کے تحفُّظ کا خیال آیا اور اِسے اخلاقی وسماجی قدروں کی ضرُورت پڑی۔ فنِ ایجاد میں خود تنقیدی ضروری تھی اور ترقّی کے لئے مُشاورت لازمی۔ جُوں ہی اِنسان نے ترقّی کا یہ راز پایا، اِس نے اِسے زندگی کا نظریہ بنایا اور فیض اُٹھایا۔ لیکن قُوّتِ تولید کی نفسیات خود پرست تھی اور بالآخر یہ کارروائی اپنی جگہ پُوری تھی۔ اِس کے تقدُّس کو برقرار رکھنے اور اِس کی مدافعت کے لئے انسان نے قانُون بنائے اور غیر قانُونی جسمانی رشتوں کو حقارت سے دیکھا، اُنھیں زناکاری سے موسُوم کیا اور اُن سے پیدا شُدہ بچّوں کو حرام زادوں سے۔ حفظِ نفس عین ذاتی قسم کی چیز ہے جیسے رگوں میں خُون۔ جو لوگ ہُنر کی طرح اِس کا برملا اِظہار کرتے ہیں اور خاص کر وُہ جو اِس کا کاروبار کرتے ہیں، اپنی لطیف حسوں کی آبرو ریزی میں

۔وہ تسکینِ نفس کی خاطر داری کے لیے کیا نہیں کرتے لیکن ناتمام رہتے ہیں ۔اور ناتمامی
ح کی موت ہے ۔
اِنٹرویو کے کچھ دِن بعد کالج سے خبر آئی کہ میں اِنٹرویو میں پاس ہوگیا ہوں اور پندرہ دن کے
رہوسٹل کی فیس جمع کروانی ہے ۔ یہ نویدِ سعید میری آرزدگی بن کر آئی ۔ مستقبل کا جامِ خوش وقت
ں تھا لیکن میں اُسے پی نہ سکتا تھا ۔ بھگت سنگھ کی مالی اعانت سے مجھے معاشی فراغت ملی
ی نالائقی اور نا عاقبت اندیشی اُسے پامال کر چکی تھی ۔ میری لاابالی طبیعت میری مصیبت
ِمہ دار میں تھا ، صرف میں جس کام سے میں نفرت کرتا تھا وہ میری قسمت بن کر رہ گیا تھا ۔
ے میں منفی رویّہ خود بُلائی آفت ہے جسے ہزاروں سال کی بے ہمت محنت ، رحمت میں
ی ۔ بس اپنے چلن پر نالاں پچھتانے لگا ۔ میں افسردہ اور بے زار بے زار کام پر جاتا ،
بس آتا اور پوسا پارک میں لیٹ کر ستاروں کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا ۔ ستارے
ے اَنُسار ہر آدمی کی فردِ حیات بنانے اور بگاڑنے میں مصروف ہیں لیکن اُن میں مجھے وہی یکسانیت
ں بچپن سے دیکھتا آیا تھا ۔ مجھے چھجّو رام کی پیش گوئی جھوٹی جان پڑتی اور بھایا جی

چھجّو رام ایک فقیر تھا جو کبھی کبھار بھایا جی کے پاس آتا تھا ۔ میں وہاں ہوتا تو وہ مجھے حیرت
یل آمیز لہجے میں کہتا ، "سردار جی ! آپ کے نورِ چشم کے ستارے بہت اچھے ہیں ۔"
یہ اور نورِ چشم ! مجھے ڈر ہے کہ یہ بڑا ہو کر میری آنکھیں نہ نکلوا دے ۔ اِس کے ستاروں
ں مجھے تیرے سے زیادہ خبر ہے ، چھجّو ! یہ جیسا کم نظر ، کام چور اور نوالہ حاضر ہے ، تیری
مانگتا پھرے گا ۔"
میرے بدخو بھایا جی اُس کا منہ چڑاتے اور اُس پر ہنستے ، میری طرف ایسے دیکھتے جیسے
ت پر پل رہا تھا ۔
میں اُن دونوں کی باتوں پر غور کرتا اور دیانت داری سے اپنا جائزہ لیتا ۔ مجھے لگتا کہ اپنی
ں اور خرابیوں کی جڑ مُول میں ہوں ۔

© Gian Singh Shatir

Published by Gian Singh Shatir, A-501, Satya Apartments, Masab Tank, Hyderabad-500028, Phone 220438 & Printed at Ushnak & Arvind 1303, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi 110 002, Phones 3272990, 3280125

Price: Rs 300

Available at following address:

Prem Gopal Mittal
C/o Modern Publishing House
Gola Market
Darya Ganj
New Delhi-110 002

Janab Asad Yar Khan
Educational Book House
University Market
Aligarh (U.P.)

Dr. Khaliq Anjum
Urdu Ghar
Deen Dayal Uphadaya Marg
New Delhi-110 002